ملفوظات

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی

مسیح موعود و مہدی معہود

بانی جماعت احمدیہ

جلد سوم

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتاب فتح اسلام میں دُنیا کو حق اور راستی کی طرف کھینچنے کے لیے تائیدِ حق اور اشاعتِ اسلام کی جن پانچ شاخوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے تیسری شاخ کے ضمن میں فرماتے ہیں :-

اُس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زبانی تقریریں جو سائلین کے سوالات کے جواب میں کی گئیں یا کی جاتی ہیں یا اپنی طرف سے محل اور موقعہ کے مناسب کچھ بیان کیا جاتا ہے یہ طریق بعض صورتوں میں تالیفات کی نسبت نہایت مفید اور مؤثر اور جلدتر دلوں میں بیٹھنے والا ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام نبی اس طریق کو ملحوظ رکھتے رہے ہیں اور بجز خدا تعالیٰ کے کلام کے جو خاص طور پر بلکہ قلم بند ہو کر شائع کیا گیا باقی جس قدر مقالات انبیاء ہیں وہ اپنے اپنے محل پر تقریروں کی طرح پھیلتے رہے ہیں۔ عام قاعدہ نبیوں کا یہی تھا کہ ایک محل شناس لیکچرار کی طرح ضرورتوں کے وقتوں میں مختلف مجالس اور محافل میں اُن کے حال کے مطابق رُوح سے قوت پا کر تقریریں کرتے تھے۔ مگر نہ اس زمانہ کے متکلموں کی طرح کہ جن کو اپنی تقریر سے فقط اپنا علمی سرمایہ دکھلانا منظور ہوتا ہے۔ یا یہ غرض ہوتی ہے کہ اپنی جھوٹی منطق اور سوفسطائی حُجتوں سے کسی سادہ لوح کو اپنے پیچ میں لاویں اور پھر اپنے سے زیادہ جہنم کے لائق کریں۔ بلکہ انبیاء نہایت سادگی سے کلام کرتے اور جو اپنے دل سے اُبلتا تھا وہ دوسروں کے دلوں میں ڈالتے تھے۔ اُن کے کلماتِ قدسیہ عین محل اور حاجت کے وقت پر ہوتے تھے اور مخاطبین کو شغل یا افسانہ کی طرح کچھ نہیں سناتے تھے بلکہ اُن کو بیمار دیکھ کر اور طرح طرح کے آفاتِ رُوحانی میں مبتلا پا کر علاج کے طور پر اُن کو نصیحتیں کرتے تھے یا حجج قاطعہ سے اُن کے اوہام کو رفع فرماتے تھے اور اُن کی گفتگو میں الفاظ تھوڑے اور معانی بہت ہوتے تھے۔ سو یہی قاعدہ یہ عاجز ملحوظ رکھتا ہے اور واردین اور صادرین کی استعداد کے موافق اور اُن کی ضرورتوں کے لحاظ سے اور اُن کے امراض لاحقہ کے خیال سے ہمیشہ بابِ تقریر کھلا رہتا ہے کیونکہ برائی کو نشانہ کے طور پر دیکھ کر اس کے روکنے کے لیے نصائح ضروریہ کی تیر اندازی کرنا اور بگڑے ہوئے اخلاق کو ایسے عضو کی طرح پا کر جو اپنے محل سے ٹل گیا ہو اپنی حقیقی صورت اور محل پر لانا ۔ جیسے یہ علاج بیمار کے رُوبرو ہونے کی حالت میں متصور ہے اور کسی حالت میں کما حقہٗ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے چندیں ہزار نبی اور رسول بھیجے اور ان کی شرفِ صُحبت میں مشرف ہونے کا حکم دیا تا ہر ایک زمانہ کے لوگ چشمدید نمونوں کو پا کر اور اُن کے وجود کو مجسم کلامِ الٰہی مشاہدہ کر کے اُن کی اقتداء کے لیے کوشش کریں۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم

وعلٰی عبدہ المسیح الموعود

ملفوظات

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

۱۷ر جنوری ۱۹۰۳ء

ایک الہام کی تشریح

۱۷ر جنوری ۱۹۰۳ء کو کچہری جانے سے پیشتر اعلیحضرتؑ نے ہمارے مخدوم جناب خان محمد عجب خاں صاحب آف زیدہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ نے رخصت لی ہے ہمارے پاس بھی رہنا چاہیئے خانصاحب نے دارالامان آنے کا وعدہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد پوچھا کہ اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْکَ پر لوگ اعتراضات کرتے ہیں۔ اس کا کیا جواب دیا جائے؟

فرمایا:۔

اَنْتَ مِنِّیْ تو بالکل صاف ہے اس پر کسی قسم کا اعتراض اور نکتہ چینی نہیں ہوسکتی میرا ظہور محض اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے اور اسی سے ہے۔

دوسرا حصہ اس الہام کا کسی قدر شرح طلب ہے سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا قرآن شریف میں بار بار اس کا ذکر ہوا ہے وحدہٗ لاشریک ہے نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے نہ صفات میں نہ افعال الٰہیہ میں۔ سچی بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان کامل اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک انسان ہر قسم کے شرک سے پاک نہ ہو۔ توحید تب ہی پوری ہوتی ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو کیا باعتبار ذات اور کیا باعتبار صفات کے اور افعال کے بے مثل مانے۔ نادان میرے اس الہام پر تو اعتراض کرتے ہیں اور سمجھتے نہیں کہ اس کی حقیقت کیا

ہے لیکن اپنی زبان سے ایک خدا کا اقرار کرنے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی صفات دوسرے کیلئے تجویز کرتے ہیں جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کو محی اور ممیت مانتے ہیں۔ عالم الغیب مانتے ہیں۔ الحیّ القیّوم مانتے ہیں۔ کیا یہ شرک ہے یا نہیں؟ یہ خطرناک شرک ہے جس نے عیسائی قوم کو تباہ کیا ہے اور اب مسلمانوں نے اپنی بدقسمتی سے اُن کے اس قسم کے اعتقادوں کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا ہے پس اس قسم کے صفات جو اللہ تعالیٰ کے ہیں کسی دوسرے انسان میں خواہ وہ نبی ہو یا ولی تجویز نہ کرے اور اسی طرح خدا تعالیٰ کے افعال میں بھی کسی دوسرے کو شریک نہ کرے۔ دُنیا میں جو اسباب کا سلسلہ جاری ہے بعض لوگ اس حد تک اسباب پرست ہو جاتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ توحید کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ شرک فی الاسباب کا بھی شائبہ باقی نہ رہے۔ خواص الاشیاء کی نسبت کبھی یہ یقین نہ کیا جاوے کہ وہ خواص ان کے ذاتی ہیں بلکہ یہ ماننا چاہیئے کہ وہ خواص بھی اللہ تعالیٰ نے اُن میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ جیسے تربد اسہال لاتی ہے یا سم الفار ہلاک کرتا ہے۔ اب یہ قوتیں اور خواص ان چیزوں کے خود بخود نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ نکال لے تو پھر نہ تربد دست آور ہو سکتی ہے اور نہ سنکھیا ہلاک کرنے کی خاصیت رکھ سکتا ہے نہ اُسے کھا کر کوئی مر سکتا ہے۔ غرض اسباب کے سلسلہ کو حدِ اعتدال سے نہ بڑھاوے اور صفات و افعال الٰہیہ میں کسی کو شریک نہ کرے تو توحید کی حقیقت متحقق ہو گی اور اُسے موحد کہیں گے لیکن اگر وہ صفات و افعال الٰہیہ کو کسی دوسرے کے لیے تجویز کرتا ہے تو وہ زبان سے گو کتنا ہی توحید ماننے کا اقرار کرے وہ موحد نہیں کہلا سکتا۔ ایسے موحد تو آریہ بھی ہیں جو اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایک خُدا کو مانتے ہیں لیکن باوجود اس اقرار کے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ روح اور مادہ کو خدا نے پیدا نہیں کیا۔ وہ اپنے وجود اور قیام میں اللہ تعالیٰ کے محتاج نہیں ہیں گویا اپنی ذات میں ایک مستقل وجود رکھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اَور کیا شرک ہو گا۔ اسی طرح پر بہت سے لوگ ہیں جو شرک اور توحید میں فرق نہیں کر سکتے۔ ایسے افعال اور اعمال اُن سے سرزد ہوتے ہیں۔ یا وہ اس قسم کے اعتقادات رکھتے ہیں جن میں صاف طور پر شرک پایا جاتا ہے مثلاً کہہ دیتے ہیں کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو ہم ہلاک ہو جاتے یا فلاں کام درست نہ ہوتا۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اسباب کے سلسلہ کو حدِ اعتدال سے نہ بڑھاوے اور صفات و افعال الٰہیہ میں کسی کو شریک نہ کرے۔

انسان میں جو قوتیں اور ملکات اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں ان میں وہ حد سے نہیں بڑھ سکتے مثلاً آنکھ اس نے دیکھنے کے لیے بنائی ہے اور کان سُننے کے لیے، زبان بولنے اور ذائقہ کے لیے۔ اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کانوں سے بجائے سننے کے دیکھنے کا کام لے اور زبان سے بولنے اور چکھنے کی بجائے سُننے کا کام لے۔ ان اعضاء اور قویٰ کے افعال اور خواص محدود ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے افعال اور صفات محدود نہیں ہیں اور وہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے غرض یہ توحید تب ہی پوری ہو گی جب اللہ تعالیٰ کو ہر طرح سے واحد لاشریک یقین کیا جاوے اور انسان اپنی حقیقت کو ہالکۃ الذات اور باطلۃ الحقیقت سمجھ لے۔ کہ نہ مَیں اور نہ میری تدابیر اور اسباب کچھ چیز ہیں۔

رعایتِ اسباب بھی ضروری ہے

اس سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہم استعمالِ اسباب سے منع کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے ہم اسباب کے استعمال سے منع نہیں کرتے بلکہ رعایتِ اسباب بھی ضروری ہے کیونکہ انسانی بناوٹ بجائے خود اس رعایت کو چاہتی ہے لیکن اسباب کا استعمال اس حد تک نہ کرے کہ اُن کو خدا کا شریک بنا دے بلکہ اُن کو بطور خادم سمجھے۔ جیسے کسی کو بٹالہ جانا ہو تو وہ یکہ یا ٹٹو کرایہ کرتا ہے۔ تو اصل مقصد اس کا بٹالہ پہنچنا ہے نہ وہ ٹٹو یا یکہ۔ پس اسباب پر کلی بھروسہ نہ کرے یہ سمجھے کہ ان اسباب میں اللہ تعالیٰ نے کچھ تاثیریں رکھی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو وہ تاثیریں بیکار ہو جائیں اور کوئی نفع نہ دیں۔ اسی کے موافق ہے جو مجھے الہام ہوا ہے رَبِّ. کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُکَ۔

اسباب پرستی شرک ہے

بُت پرستوں کا شرک تو موٹا ہوتا ہے کہ پتھر بنا کر پُوجا کرتے ہیں یا کسی درخت یا اَور شئے کی پرستش کرتے ہیں اس کو تو ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ باطل ہے۔ یہ زمانہ اس قسم کی بُت پرستی کا نہیں ہے بلکہ اسباب پرستی کا زمانہ ہے اگر کوئی بالکل ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے اور سُست ہو جاوے تو اس پر تو خدا کی لعنت ہوتی ہے لیکن جو اسباب کو خدا بنا لیتا ہے وہ بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت یورپ دو شرکوں میں مبتلا ہے۔ ایک تو مُردہ کی پرستش کر رہا ہے اور جو اُس سے بچے ہیں اور مذہب سے آزاد ہو گئے ہیں وہ اسباب کی پرستش کر رہے ہیں اور اس طرح یہ اسباب پرستی مرض دِق کی طرح لگی ہوئی ہے اور یورپ کی تقلید نے اس ملک کے نوجوانوں اور نو تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی ایسی مرض میں مبتلا کر دیا ہے وہ اب سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ ہم اسلام سے باہر جا رہے ہیں اور خدا پرستی کو چھوڑ کر اسباب پرستی کے دِق میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ یہ دِق دُور نہیں ہو سکتی اور اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا جب تک انسان کے دل میں خدا کی ایک نالی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے فیض اور اثر کو اس تک پہنچاتی ہے اور یہ نالی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان ایک منکسر النفس ہو جائے اور اپنی ہستی کو بالکل خالی سمجھ لے جس کو فنا نظری کہتے ہیں۔

فنا کی حقیقت

فنا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فنا حقیقی ہوتی ہے جیسے وجُودی مانتے ہیں کہ سب خدا ہی ہیں یہ تو بالکل باطل اور غلط ہے اور یہ شرک ہے لیکن دوسری قسم فنا کی فنا نظری ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا شدید اور گہرا تعلق ہو کہ اس کے بغیر ہم کچھ چیز ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی میں ہستی ہو باقی سب ہیچ اور فانی۔ یہ فنا اتم کا درجہ توحید کے اعلیٰ مرتبہ پر حاصل ہوتا ہے اور توحید کامل ہی اس درجہ پر ہوتی ہے۔ جو انسان اس درجہ پر پہنچتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں کچھ ایسا کھویا جاتا ہے کہ اس کا اپنا وجود بالکل نیست و نابود ہو جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عشق اور محبت میں ایک نئی زندگی حاصل کرتا ہے جیسے ایک لوہے کا ٹکڑا آگ میں ڈالا جاوے اور وہ اس قدر گرم کیا جاوے کہ سُرخ آگ کے انگارے کی طرح ہو جاوے۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۷ نمبر ۳۶ صفحہ ۲ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۳ء

اُس وقت وہ لوہا آگ ہی کے ہم شکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پر جب ایک راستباز بندہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور وفاداری کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ کر فنا فی اللہ ہو جاتا ہے اور کمال درجہ کی نیستی ظہور پاتی ہے اس وقت وہ ایک نمونہ خدا کا ہوتا ہے اور حقیقی طور پر وہ اس وقت کہلاتا ہے۔ اَنْتَ مِنِّیْ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے جو دُعا سے ملتا ہے۔
یاد رکھو دُعا جیسی کوئی چیز نہیں ہے اِس لیے مومن کا کام ہے کہ ہمیشہ دُعا میں لگا رہے اور اس استقلال اور صبر کے ساتھ دُعا کرے کہ اس کو کمال کے درجہ تک پہنچا دے اپنی طرف سے کوئی کمی اور دقیقہ فروگذاشت نہ کرے اور اس بات کی بھی پروا نہ کرے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا بلکہ ؎

شرطِ عشق است در طلب مُردن ❁ گر نباشد بدست راہ بُردن

جب انسان اس حد تک دُعا کو پہنچا تا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس دُعا کا جواب دیتا ہے جیسا کہ اُس نے وعدہ فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن : ۶۱) یعنی تم مجھے پُکارو مَیں تمہیں جواب دوں گا اور تمہاری دُعا قبول کروں گا۔ حقیقت میں دُعا کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔ جب تک انسان پورے صدق و وفا کے ساتھ اور صبر اور استقلال سے دُعا میں لگا نہ رہے تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں جو دُعا کرتے ہیں مگر بڑی بے دِلی اور عجلت سے چاہتے ہیں کہ ایک ہی دن میں اُن کی دُعا مثمر بہ ثمرات ہو جاوے حالانکہ یہ امر سنت اللہ کے خلاف ہے اس نے ہر کام کے لیے اوقات مقرر فرمائے ہیں اور جس قدر کام دنیا میں ہو رہے ہیں وہ تدریجی ہیں۔ اگرچہ وہ قادر ہے کہ ایک طرفۃ العین میں جو چاہے کر دے اور ایک کُنْ سے سب کچھ ہو جاتا ہے مگر دُنیا میں اُس نے اپنا یہی قانون رکھا ہے۔ اس لیے دُعا کرتے وقت آدمی کو اس کے نتیجہ کے ظاہر ہونے کے لیے گھبرانا نہیں چاہیئے۔

اپنی زبان میں دُعا کرنے کی حکمت

یہ بھی یاد رکھو دُعا اپنی زبان میں بھی کر سکتے ہو بلکہ چاہیئے کہ مسنون اَدعیہ کے بعد اپنی زبان میں آدمی دُعا کرے کیونکہ اس زبان میں وہ پُورے طور پر اپنے خیالات اور حالات کا اظہار کر سکتا ہے اِس زبان میں وہ قادر ہوتا ہے۔
دُعا نماز کا مغز اور رُوح ہے اور رسمی نماز جب تک اس میں رُوح نہ ہو کچھ نہیں اور رُوح کے پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ گریہ و بکا اور خشوع و خضوع ہو اور یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حالت کو بخوبی بیان کرے اور ایک اضطراب اور قلق اس کے دل میں ہو اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک اپنی زبان میں انسان اپنے مطالب کو پیش نہ کرے۔ غرض دعا کے ساتھ صدق اور وفا کو طلب کرے اور پھر اللہ تعالیٰ کی محبت میں وفاداری کے ساتھ فنا ہو کر کامل نیستی کی صورت اختیار کرے۔ اس نیستی سے ایک ہستی پیدا ہوتی ہے جس میں وہ اِس بات کا حقدار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے کہے کہ اَنْتَ مِنِّیْ۔

اصل حقیقت اَنْتَ مِنِّیْ کی تو یہ ہے اور عام طور پر ظاہر ہی ہے کہ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم سے ہے۔

اب اس کے بعد ایک اَور حصہ اس الہام کا ہے جو وَ اَنَا مِنْکَ ہے پس اس کی حقیقت سمجھنے کے واسطے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا انسان جو نیستی کے کامل درجہ پر پہنچکر ایک نئی زندگی اور حیات طیبہ حاصل کر چکا ہے اور جس کو خدا تعالیٰ نے مخاطب کر کے فرمایا ہے اَنْتَ مِنِّیْ۔ جو اس کے قرب اور معرفت الٰہی کی حقیقت سے آشنا ہونے کی دلیل ہے اور یہ انسان خدا تعالیٰ کی توحید اور اُس کی عزت و عظمت اور جلال کے ظہور کا موجب ہوا کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایک عینی اور زندہ ثبوت ہوتا ہے۔ اس رنگ سے اور اس لحاظ سے گویا خدا تعالیٰ کا ظہور اس میں ہو کر ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ظہور کا ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اس حالت میں جب اس کا ذکر خدا نما آئینہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اُن کے لیے یہ کہتا ہے وَ اَنَا مِنْکَ ایسا انسان جس کو اَنَا مِنْکَ کی آواز آتی ہے اُس وقت دُنیا میں آتا ہے جب خدا پرستی کا نام و نشان مِٹ گیا ہوتا ہے اس وقت بھی چونکہ دُنیا میں فسق و فجور بہت بڑھ گیا ہے اور خدا شناسی اور خدا رسی کی راہیں نظر نہیں آتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے اور محض اپنے فضل و کرم سے اُس نے مجھ کو مبعوث کیا ہے تا مَیں اُن لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ سے غافل اور بیخبر ہیں اس کی اطلاع دوں اور نہ صرف اطلاع بلکہ جو صدق اور صبر اور وفاداری کے ساتھ اس طرف آئیں انہیں خدا تعالیٰ کو دکھلا دوں۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے مجھے مخاطب کیا اور فرمایا اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْکَ۔

اعتراض پیدا ہونے کی وجہ

اعتراض کرنے کا کیا ہے جب طبیعت میں فساد اور ناپاکی ہو تو وہ نیکی کی طرف آنا کب پسند کرتی ہے بلکہ خلافِ طبع سمجھ کر اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ میرے اس الہام کی سچائی کا ثبوت اس پر اعتراض ہی ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا انکار اور دہریت بڑھی ہوئی نہ ہوتی تو کیوں اعتراض کیا جاتا۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا پاک اور خوشنما چہرہ دُنیا کو نظر نہ آتا تھا اور وہ اب مجھ میں ہو کر نظر آئے گا اور آ رہا ہے۔ کیونکہ اُس کی قدرتوں کے نمونے اور عجائباتِ قدرت میرے ہاتھ پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ جن کی آنکھیں کُھلی ہیں وہ دیکھتے ہیں مگر جو اندھے ہیں وہ کیونکر دیکھ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ اس امر کو محبوب رکھتا ہے کہ وہ شناخت کیا جاوے اور اُس کی شناخت کی یہی راہ ہے کہ مجھے شناخت کرو[1]۔ یہی وجہ ہے کہ میرا نام اس نے خلیفۃ اللہ رکھا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ كُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ

[1] اس جگہ ایڈیٹر الحکم نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مندرجہ ذیل شعر درج کیا ہے جو بہت برمحل ہے۔ (مرتب)

وَلِلّٰہِ دَرُّکَ

آں خدائے کہ از او خلق و جہاں بے خبر اند
برمن او جلوہ نمود است گر اہلی بپذیر

(ایڈیٹر الحکم)

نَخَلَقْتُ اٰدَمَ ۔ اس میں آدم میرا نام رکھا ہے ۔ یہ حقیقت اس الہام کی ہے ۔ اب اس پر بھی کوئی اعتراض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دکھا دے گا کہ وہ کہاں تک حق پر ہے ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

حضرت اقدسؑ جہلم میں

حضرت حجۃ اللہ علی الارض مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب مقدمہ کرم الدین میں جہلم تشریف لائے تھے اور ضلع جہلم اور اس کے گرد و نواح کی مخلوق آپ کی زیارت کے لیے کثیر التعداد جمع ہوئی تھی اور جہلم کی کچہری کے احاطہ میں آدمزاد ہی آدمزاد نظر آتے تھے جس کی تصدیق جہلم کے اخبار نے بھی کی تھی اور جہلم کی کل مخلوق اور احکام بھی اس امر کو جانتے ہیں ۔ اس روز ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو احاطہ عدالت میں آپ کرسی پر تشریف فرما تھے اور ارد گرد مریدان باصفا نہایت ادب کے ساتھ حلقہ زن تھے اور ہزاروں انسانوں کا مجمع موجود تھا ہمارے محترم مخدوم جناب خان محمد عجب خان صاحب آف زیدہ بھی آپ کی کرسی کے پاس ایڈیٹر الحکم کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے ۔ . . . . ذیل میں ہم وہ تقریر لکھنا چاہتے ہیں جو اس وقت احاطہ عدالت میں آپ نے فرمائی تھی ۔ اس وقت جناب محمد عجب خاں صاحب آف زیدہ نے جو اس قدر ہجوم اور رجوع مخلوق کا دیکھا اور حضرت اقدس کے چہرہ پر نگاہ کی تو خوشی اور اخلاص کے ساتھ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اپنی سعادت اور خوش قسمتی کو یاد کر کے (کہ اِس وقت اُس عظیم الشان انسان کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہا اور جس کا آنا اپنا آنا فرمایا ہے) عرض کیا کہ حضور میرا دل چاہتا ہے کہ مَیں جناب کے دستِ مبارک کو بوسہ دوں ۔ اس پر حضرت اقدس نے نہایت ہی شفقت کے ساتھ اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور خاں صاحب موصوف نے بہت ہی متاثر ہو کر اور رقتِ قلب کے ساتھ آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا ۔

اس پر حضرت حجۃ اللہ نے مؤثر تقریر فرمائی ۔ فرمایا:۔

بلند ہمتی

ہمت نہیں ہارنی چاہیئے ۔ ہمت اخلاقِ فاضلہ میں سے ہے اور مومن بڑا بلند ہمت ہوتا ہے ہر وقت خدا تعالیٰ کے دین کی نصرت اور تائید کے لیے تیار رہنا چاہیئے اور کبھی بزدلی ظاہر نہ کرے ۔ بزدلی منافق کا نشان ہے ۔ مومن دلیر اور شجاع ہوتا ہے مگر شجاعت سے یہ مراد نہیں کہ اس میں موقع شناسی نہ ہو موقع شناسی کے بغیر جو فعل کیا جاتا ہے وہ تہور ہوتا ہے ۔ مومن میں شتابکاری نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت ہوشیاری اور تحمل کے ساتھ نصرتِ دین کے لیے تیار رہتا ہے اور بزدل نہیں ہوتا ۔

انسان سے کبھی ایسا کام ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتا ہے ۔ مثلاً کسی سائل کو اگر دھکا دیا تو سختی کا موجب

ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کو ناراض کرنے والا فعل ہوتا ہے اور اُسے توفیق نہیں ملے گی کہ اُسے کچھ دے سکے لیکن اگر نرمی یا اخلاق سے پیش آویگا اور خواہ اُسے پیالہ پانی ہی کا دیدے تو وہ ازالۂ قبض کا موجب ہو جاویگا۔

قبض و بسط

انسان پر قبض اور بسط کی حالت آتی ہے۔بسط کی حالت میں ذوق اور شوق بڑھ جاتا ہے اور قلب میں ایک انشراح پیدا ہوتا ہے۔خدا تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھتی ہے نمازوں میں لذت اور سرور پیدا ہوتا ہے لیکن بعض وقت ایسی حالت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ذوق اور شوق جاتا رہتا ہے اور دل میں ایک تنگی کی سی حالت ہو جاتی ہے۔جب یہ صورت ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ کثرت کیساتھ استغفار کرے اور پھر دُرود شریف بہت پڑھے۔نماز بھی بار بار پڑھے۔قبض کے دُور ہونے کا یہی علاج ہے۔

حقیقی علم

علم سے مراد منطق یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ حقیقی علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔یہ علم اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے اور خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورۃ فاطر: ۲۹)
اگر علم سے اللہ تعالیٰ کی خشیت میں ترقی نہیں ہوتی تو یاد رکھو وہ علم ترقی معرفت کا ذریعہ نہیں ہے[1]

ایمان کیلئے مناسبت شرط ہے

قرآن شریف سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انسان کی فطرت میں سعادت اور ایک مناسبت نہ ہو ایمان پیدا نہیں ہوتا۔خدا تعالیٰ کے مامور اور مُرسل اگرچہ کُھلے کُھلے نشان لے کر آتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان نشانوں میں ابتلاء اور اخفاء کے پہلو بھی ضرور ہوتے ہیں۔سعید جو باریک بین اور دُور بین نگاہ رکھتے ہیں اپنی سعادت اور مناسبتِ فطرت سے اُن اُمور کو جو دوسروں کی نگاہ میں مخفی ہوتے ہیں دیکھ لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں لیکن جو سطحی خیال کے لوگ ہوتے ہیں اور جن کی فطرت کو سعادت اور رُشد سے کوئی مناسبت اور حصہ نہیں ہوتا وہ انکار کرتے ہیں اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس کا بُرا نتیجہ اُن کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

دیکھو مکّہ معظمہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو ابوجہل بھی مکّہ ہی میں تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی مکّہ ہی کے تھے لیکن ابوبکرؓ کی فطرت کو سچائی کے قبول کرنے کے ساتھ کچھ ایسی مناسبت تھی کہ ابھی آپ شہر میں بھی داخل نہیں ہوئے تھے۔راستہ ہی میں جب ایک شخص سے پُوچھا کہ کوئی نئی خبر سُناؤ اور اُس نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو اسی جگہ ایمان لے آئے اور کوئی معجزہ اور نشان نہیں مانگا اگرچہ بعد میں بے انتہا معجزات آپ نے دیکھے اور خود ایک آیت ٹھہرے۔لیکن ابوجہل نے باوجودیکہ ہزاروں ہزار نشان دیکھے لیکن وہ مخالفت اور انکار سے باز نہ آیا اور تکذیب ہی کرتا رہا۔

---

[1] الحکم جلد ۷ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍جون ۱۹۰۳ء

اِس میں کیا سِرّ تھا؟ پیدائش دونوں کی ایک ہی جگہ کی تھی۔ ایک صدّیق ٹھہرتا ہے اور دوسرا جو ابوالحکم کہلاتا تھا وہ ابوجہل بنتا ہے۔ اس میں یہی راز تھا کہ اس کی فطرت کو سچائی کے ساتھ کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ غرض ایمانی امور مناسبت ہی پر منحصر ہیں۔ جب مناسبت ہوتی ہے تو وہ خود معلّم بن جاتی ہے اور امورِ حقہ کی تعلیم دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ مناسبت کا وجود بھی ایک نشان ہوتا ہے۔

مَیں بصیرت اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں اور مَیں وہ قوت اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہوں مگر افسوس مَیں اس دُنیا کے فرزندوں کو کیونکر دکھا سکوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سُنتے ہوئے نہیں سُنتے کہ وہ وقت ضرور آئیگا کہ خدا تعالیٰ سب کی آنکھ کھول دے گا اور میری سچائی روز روشن کی طرح دُنیا پر کُھل جائے گی لیکن وہ وقت وہ ہوگا کہ توبہ کا دروازہ بند ہو جاوے گا اور پھر کوئی ایمان سود مند نہ ہو سکے گا۔

میرے پاس وہی آتا ہے جسکی فطرت سلیم ہے

میرے پاس وہی آتا ہے جس کی فطرت میں حق سے محبت اور اہلِ حق کی عظمت ہوتی ہے جسکی فطرت سلیم ہے وہ دُور سے اُس خوشبو کو جو سچائی کی میرے ساتھ ہے سُونگھتا ہے اور اُسی کشش کے ذریعہ سے جو خدا تعالیٰ اپنے ماموروں کو عطا کرتا ہے۔ میری طرف اس طرح کھنچے چلے آتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف جاتا ہے لیکن جس کی فطرت میں سلامت روی نہیں ہے اور جو مُردہ طبیعت کے ہیں اُن کو میری باتیں سود مند نہیں معلوم ہوتیں ہیں وہ ابتلاء میں پڑتے ہیں اور انکار پر انکار اور تکذیب پر تکذیب کرکے اپنی عاقبت کو خراب کرتے ہیں اور اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے کہ اُن کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

میری مخالفت کرنے والے کیا نفع اُٹھائیں گے؟ کیا مجھ سے پہلے آنے والے صادقوں کی مخالفت کرنے والوں نے کوئی فائدہ کبھی اُٹھایا ہے؟ اگر وہ نامراد اور خاسر رہ کر اس دُنیا سے اُٹھے ہیں تو میرا مخالف اپنے ایسے ہی انجام سے ڈر جاوے کیونکہ مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں صادق ہوں۔ میرا انکار اچھے ثمرات نہیں پیدا کرے گا۔ مبارک وہی ہیں جو انکار کی لعنت سے بچتے ہیں اور اپنے ایمان کی فکر کرتے ہیں۔ جو حُسن ظنّی سے کام لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ماموروں کی صُحبت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ان کا ایمان اُن کو ضائع نہیں کرتا بلکہ برومند کرتا ہے۔

مَیں کہتا ہوں کہ صادق کی شناخت کے لیے بہت مشکلات نہیں ہیں۔ ہر ایک آدمی اگر انصاف اور عقل کو ہاتھ سے نہ دے اور خدا کا خوف مدِّ نظر رکھ کر صادق کو پرکھے تو وہ غلطی سے بچا لیا جاتا ہے۔ لیکن جو تکبّر کرتا ہے اور آیات اللہ کی تکذیب اور ہنسی کرتا ہے اس کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی۔

سِلسلہ احمدیہ کے قیام کی غرض

یہ زمانہ کیسا مبارک زمانہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُن پُر آشوب دنوں میں محض اپنے فضل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار

کے لیے یہ مبارک ارادہ فرمایا کہ غیب سے اسلام کی نصرت کا انتظام فرمایا اور ایک سلسلہ کو قائم کیا۔ مَیں ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں جو اپنے دل میں اسلام کیلئے ایک درد رکھتے ہیں اور اس کی عزت اور وقعت اُن کے دلوں میں ہے وہ بتائیں کہ کیا کوئی زمانہ اس زمانہ سے بڑھکر اسلام پر گذرا ہے جس میں اس قدر سب وشتم اور توہین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کی گئی ہو اور قرآن شریف کی ہتک ہوئی ہو؟ پھر مجھے مسلمانوں کی حالت پر سخت افسوس اور دلی رنج ہوتا ہے اور بعض وقت مَیں اس درد سے بے قرار ہو جاتا ہوں کہ ان میں اتنی حس بھی باقی نہ رہی کہ اس بے عزتی کو محسوس کریں۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ بھی عزت اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھی جو اس قدر سب وشتم پر بھی وہ کوئی آسمانی سلسلہ قائم نہ کرتا اور ان مخالفینِ اسلام کے منہ بند کر کے آپ کی عظمت اور پاکیزگی کو دُنیا میں پھیلاتا جبکہ خود اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درُود بھیجتے ہیں تو اس توہین کے وقت اس صلوٰۃ کا اظہار کس قدر ضروری ہے اور اس کا ظہور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کی صورت میں کیا ہے۔

مجھے بھیجا گیا ہے تاکہ مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر قائم کروں اور قرآن شریف کی سچائیوں کو دُنیا کو دکھاؤں اور یہ سب کام ہو رہا ہے لیکن جن کی آنکھوں پر پٹی ہے وہ اس کو دیکھ نہیں سکتے حالانکہ اب یہ سلسلہ سورج کی طرح روشن ہو گیا ہے اور اس کی آیات ونشانات کے اس قدر لوگ گواہ ہیں کہ اگر اُن کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اُن کی تعداد اس قدر ہو کہ رُوئے زمین پر کسی بادشاہ کی بھی اتنی فوج نہیں ہے۔

اس قدر صورتیں اس سلسلہ کی سچائی کی موجود ہیں کہ ان سب کو بیان کرنا بھی آسان نہیں۔ چونکہ اسلام کی سخت توہین کی گئی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی توہین کے لحاظ سے اس سلسلہ کی عظمت کو دکھایا ہے۔

مَیں ہمیشہ انکساری اور گمنامی کی زندگی پسند کرتا ہوں

کم فہم لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مَیں اپنے مدارج کو حد سے بڑھاتا ہوں۔

مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری طبیعت اور فطرت میں ہی یہ بات نہیں کہ مَیں اپنے آپ کو کسی تعریف کا خواہشمند پاؤں اور اپنی عظمت کے اظہار سے خوش ہوں۔ مَیں ہمیشہ انکساری اور گمنامی کی زندگی پسند کرتا ہوں لیکن یہ میرے اختیار اور طاقت سے باہر تھا کہ خدا تعالیٰ نے خود مجھے باہر نکالا اور جس قدر میری تعریف اور بزرگی کا اظہار اس نے اپنے پاک کلام میں جو مجھ پر نازل کیا گیا ہے کیا یہ ساری تعریف اور بزرگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے احمق اس بات کو نہیں سمجھ سکتا مگر سلیم الفطرت اور باریک نگاہ سے دیکھنے والا دانشمند خوب سوچ سکتا ہے کہ اس وقت واقعی ضروری تھا کہ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قدر ہتک کی گئی ہے اور عیسائی مذہب کے واعظوں اور منادوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اُس سید الکونین کی شان میں گستاخیاں کی ہیں اور ایک عاجز مریم کے بچے کو خدا کی کُرسی پر جا بٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی غیرت نے آپؐ کا جلال ظاہر کرنے کے لیے یہ مقدر کیا تھا کہ آپ کے

ایک ادنیٰ غلام کو مسیح ابن مریم بنا کے دکھا دیا۔ جب آپؐ کی اُمت کا ایک فرد اتنے بڑے مدارج حاصل کر سکتا ہے تو اس سے آپؐ کی شان کا پتہ لگ سکتا ہے۔ پس یہاں خدا تعالیٰ نے جس قدر عظمت اس سلسلہ کی دکھائی ہے اور جو کچھ تعریف کی ہے یہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عظمت اور جلال کے لیے ہے مگر احمق ان باتوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

ظہورِ علاماتِ مسیح موعودؑ

اس وقت صدی میں سے بیس سال گذرنے کو ہیں اور آخری زمانہ ہے۔ چودھویں صدی ہے کہ جس کی بابت تمام اہلِ کشف نے کہا کہ مسیح موعود چودھویں صدی میں آئیگا وہ تمام علامات اور نشانات جو مسیح موعود کی آمد کے متعلق پہلے سے بتائے گئے تھے ظاہر ہو گئے۔ آسمان نے کسوف و خسوف سے اور زمین نے طاعون سے شہادت دی ہے اور بہت سے سعادتمندوں نے ان نشانوں کو دیکھ کر مجھے قبول کیا اور پھر اَور بھی بہت سے نشانات اُن کی ایمانی قوت کو بڑھانے کے واسطے خدا تعالیٰ نے ظاہر کئے اور اس طرح پر یہ جماعت دن بدن بڑھ رہی ہے [1]

کوئی ایک بات ہوتی تو شک کرنے کا مقام ہو سکتا تھا مگر یہاں تو خدا تعالیٰ نے اُن کو نشان پر نشان دکھائے اور ہر طرح سے اطمینان اور تسلی کی راہیں دکھائیں، لیکن بہت ہی کم سمجھنے والے نکلے ہیں۔ حیران ہوتا ہوں کہ کیوں یہ لوگ جو میرا انکار کرتے ہیں۔ ان ضرورتوں پر نظر نہیں کرتے جو اس وقت ایک مصلح کے وجود کی داعی ہیں۔

مسلمانوں کی حالت

وہ دیکھیں کہ رُوئے زمین پر مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ کیا کسی پہلو سے بھی کوئی قابلِ اطمینان صورت دکھائی دیتی ہے۔ شان و شوکت کی حالت تو سلطنت کی صورت میں نظر آسکتی ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت اس وقت روم کی سلطنت ہے لیکن اس کی حالت کو دیکھ لو وہ بتیس دانتوں میں زبان ہو رہی ہے اور آئے دن کسی نہ کسی خرخشہ اور مخمصہ میں مبتلا رہتی ہے۔ علمی حالت کے لحاظ سے سب رو رہے ہیں کہ مسلمان پیچھے رہے ہوئے ہیں اور نت نئی مجلسیں اور کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں کہ مسلمانوں کی علمی حالت کی اصلاح کی جاوے۔ دُنیوی لحاظ سے تو یہ حالت اور دینی پہلو کے لحاظ سے تو بہت ہی گری ہوئی حالت ہے۔ کوئی بدعت اور فعل شنیع نہیں ہے جس کے مرتکب مسلمان نہ پائے جاتے ہوں۔ اعمال صالحہ کی بجائے چند رسوم باقی رہ گئی ہیں۔ جیلخانوں میں جاکر دیکھو تو زیادہ مجرم مسلمان دکھائی دینگے۔ کس کس بات کا ذکر کیا جاوے مسلمانوں کی حالت اس وقت بہت ہی گری ہوئی ہے اور اُن پر آفات پر آفات نازل ہو رہی ہیں۔ مگر کیا مسلمان ابھی چاہتے ہیں کہ وہ اَور پیسے جاویں۔ اس سے بڑھ کر اُن کی ذلیل حالت کیا ہوگی کہ وہ پاک دین

---

[1] اس مقام تک حضرت اقدس ابھی پہنچے تھے کہ خان عجب خان صاحب جو رقتِ قلب کے ساتھ چشم پُرآب تھے، پُرجوش لہجہ میں بول اُٹھے وجودِ جناب خود شہادت است (ایڈیٹر الحکم)

جو بے نظیر دولت اُن کے پاس تھی اور ایمان جیسی نعمت وہ کھو بیٹھے ہیں۔ اور مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے عیسائی ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے اور اسلام کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور یا اگر کُھلے طور پر عیسائی نہیں ہوتے تو عیسائیوں کے علوم فلسفہ وطبیعیات سے متاثر ہو کر مذہب کو ایک بیضرورت اور بیفائدہ شئے سمجھنے لگ گئے ہیں۔

یہ آفتیں ہیں جو اسلام پر آ رہی ہیں اور مَیں نہایت درد اور افسوس سے سُنتا ہوں کہ اس پر بھی کہا جاتا ہے کہ کسی مصلح کی ضرورت نہیں حالانکہ زمانہ خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس وقت ضرورت ہے کہ کوئی شخص آوے اور وہ اصلاح کرے۔
مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا تعالیٰ اس وقت کیوں خاموش رہتا جبکہ اُس نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (سورۃ الحجر: ۱۰) خود فرمایا ہے۔ اسلام پر ایسا خطرناک صدمہ پہنچا ہے کہ ایک ہزار سال قبل تک اس کا نمونہ اور نظیر موجود نہیں ہے۔ یہ شیطان کا آخری حملہ ہے اور وہ اس وقت ساری طاقت اور زور کے ساتھ اسلام کو نابود کرنا چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا کیا ہے اور مجھے بھیجا ہے تا مَیں ہمیشہ کے لیے اُس کا سر کُچل دوں۔

سلسلہ میں داخل ہونے کی ضرورت

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ حاجت نہیں ہے ہم نماز روزہ کرتے ہیں وہ جاہل ہیں انہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ سب اعمال اُن کے مُردہ ہیں ان میں رُوح اور جان نہیں اور وہ آ نہیں سکتی جب تک وہ خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ کے ساتھ پیوند نہ کریں اور اس سے وہ سیراب کرنے والا پانی حاصل نہ کریں۔ تقویٰ اس وقت کہاں ہے؟ رسم وعادت کے طور پر مومن کہلانا کچھ فائدہ نہیں دیتا جب تک کہ خدا کو دیکھا نہ جائے اور خدا کو دیکھنے کے لیے اَور کوئی راہ نہیں ہے۔

(اس سفر میں حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھانسی اور نزلہ کی شکایت تھی۔ یہاں تک پہنچ کر پھر کھانسی کی شکایت ہوئی تو اس پر آپ نے فرمایا کہ)

مَیں چاہتا تھا کہ لوگوں کو کچھ سُناؤں مگر کھانسی کی وجہ سے روک ہوتی ہے)۔

غرض اس قدر ضرورتیں داعی ہیں کہ اُن کے بیان کرنے کے لیے بہت بڑا وقت چاہیئے اور پھر اس قدر نشانات ظاہر ہوئے ہیں کہ اُن کی بھی ایک بہت بڑی ضخیم کتاب تیار ہوتی ہے مَیں نے ایک شعر میں ان دونو باتوں کو جمع کر کے کہا ہے ؎

آسماں بارد نشاں الوقت مے گوید زمیں ؎ ایں دو شاہد از پئے تصدیقِ من استادہ اند[1]

سلسلہ کی مخالفت

خان عجب خان صاحب۔ ایک بار مَیں پادریوں کے اعتراضوں سے بہت ہی تنگ ہو گیا وہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت مَیں نے دعا کی کہ

[1] الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱-۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۳ء

اے اللہ! اسلام کو غالب کر۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وقت اب آگیا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ اس نصرت کے وقت لوگ مخالفت کرتے ہیں۔

حضرت اقدسؑ۔ یہ بالکل سچ ہے۔ عیسائیوں نے اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جس جس طرح سے اُن کا قابو چلا انہوں نے اسلام کے شجر پر تبر چلایا ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ آپ اس کا محافظ اور ناصر تھا۔ اس لیے وہ اپنے ارادوں میں مایوس اور نامراد ہوئے اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس وقت (جب ایسی حالت ہو رہی تھی اور اسلام کی اس قدر مخالفت کی جاتی تھی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے یہ سلسلہ عظمتِ اسلام کو قائم کرنے کے واسطے کھڑا کیا اور اس کی تائید اور نصرت ہر ایک پہلو سے کی) وہ بجائے اس کے کہ اس سلسلہ کی قدر کرتے اور اس پیاسے کی طرح جس کو ٹھنڈے اور برفاب پانی کا پیالہ مل جاوے شکر کرتے، انہوں نے مخالفت شروع کی اور اسی طرح پر جو ہمیشہ سنّت اللہ چلی آتی ہے ہنسی اور استہزاء سے کام لیا۔ خدا تعالیٰ کے نشانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اُن سے منہ پھیر لیا۔ مجھے ان لوگوں کی حالت پر رحم اور افسوس آتا ہے کہ یہ کیوں غور نہیں کرتے اور منہاجِ نبوت پر اس سلسلہ کی سچائی کو نہیں سمجھتے۔

صداقت کے دلائل

وہ دیکھتے کہ اس قدر نصرتیں اور تائیدیں جو اللہ تعالیٰ کر رہا ہے کیا یہ کسی مفتری اور کذاب کو بھی مل سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کوئی شخص نصرت الٰہی کے بغیر اس قدر دعویٰ کب کر سکتا ہے۔ کیا وہ تھکتا نہیں؟ اور پھر اللہ تعالیٰ مفتری کے لیے اس قدر غیرت نہیں دکھاتا کہ اُسے ہلاک کرے؟ بلکہ اس کو مہلت دیا جاتا ہے اور نہ صرف مہلت بلکہ اُس کی پیشگوئیوں کو بھی سچا کر دیتا ہے اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں اسی کی تائید کرتا ہے اور اسی کو فتح دیتا ہے۔ انسانی حکومت کے مقابلہ میں اگر کوئی شخص افتراء کرتا ہے اور جھوٹی حالت بنا کر کہے کہ میں عہدیدار ہوں تو وہ پکڑا جاتا ہے اور اس کو سخت سزا دی جاتی ہے لیکن کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک مفتری اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتا جاوے تو پھر نشان بھی دکھاتا جاوے اور اسے کوئی نہ پکڑے۔ براہین احمدیہ کی اشاعت کو بیس برس کے قریب ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ گاؤں میں بھی ہم کو کوئی شناخت نہیں کرتا تھا۔ گاؤں والے موجود ہیں۔ خود مولوی محمد حسین جس نے اس کتاب پر ریویو لکھا زندہ موجود ہے اُس سے پوچھو کہ اس وقت کیا حال تھا۔ ایسے وقت خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فوج در فوج لوگ تیرے پاس آئیں گے۔ یَاْتُوْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ دُور دراز سے تیرے پاس لوگ آئیں گے اور تحائف آئیں گے۔ پھر یہ بھی کہا کہ لوگوں سے تھکنا مت۔ اب کوئی سوچے اور دیکھے کہ خدا تعالیٰ کے یہ وعدے کس طرح پُورے ہوئے۔ ان فہرستوں کو گورنمنٹ کے پاس دیکھ لے جو آنے والے مہمانوں کی مرتب ہو کر ہفتہ وار جاتی ہیں اور ڈاک خانہ اور ریل کے رجسٹروں کی پڑتال کرے جس سے پتہ لگیگا کہ کہاں کہاں سے تحائف اور روپیہ

آرہا ہے اور قادیان میں بیٹھ کر دیکھیں کہ کس قدر ہجوم اور انبوہ مخلوق کا ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی طرف سے بشارت اور قوت نہ ملتی تو انسان تھک جاوے اور ملاقاتوں سے گھبرا اُٹھے۔ اُس نے یہ الہام کیا کہ گھبرا نانہ۔ ویسے ہی قوت بھی عطا کی کہ گھبراہٹ ہوتی ہی نہیں اور ایسا ہی انگریزی، اُردو، عربی، عبرانی میں بہت سے الہامات ہوتے جو اُس وقت سے چھپے ہوئے موجود ہیں اور پورے ہو رہے ہیں۔ اب خداترس دل لے کر میرے معاملہ پر غور کرتے تو ایک نور اُن کی رہبری کرتا اور خدا کی رُوح اُن پر سکینت اور اطمینان کی راہیں کھول دیتی۔ وہ دیکھتے کہ کیا یہ انسانی طاقت کے اندر ہے جو اس قسم کی پیشگوئی کرے؟ انسان کو اپنی زندگی کے ایک دم کا بھروسہ نہیں ہو سکتا تو یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ تیرے پاس دُور دراز سے مخلوق آئے گی اور ایسے زمانے میں خبر دیتا ہے جبکہ وہ محجوب ہے اور اس کو کوئی اپنے گاؤں میں بھی شناخت نہیں کرتا۔ پھر وہ پیشگوئی پوری ہوتی ہے اس کی مخالفت میں ناخنوں تک زور لگایا جاتا ہے اور اس کے تباہ کرنے اور معدوم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی مگر اللہ تعالیٰ اس کو برومند کرتا اور ہر نئی مخالفت پر اس کو عظیم الشان ترقی بخشتا ہے۔ کیا یہ خدا کے کام ہیں یا انسانی منصوبوں کے نتیجے؟ اصل یہی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے کام ہیں اور لوگوں کی نظروں میں عجیب۔ مولویوں نے مخالفت کے لیے جُہلاء کو بھڑکایا اور عوام کو جوش دلایا، قتل کے فتوے دیئے، کُفر کے فتوے شائع کئے اور ہر طرح سے عام لوگوں کو مخالفت کیلئے آمادہ کیا مگر کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی نصرتیں اور تائیدیں اور بھی زور کے ساتھ ہوئیں۔ اُسی کے موافق جو اُس نے کہا تھا "دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اُس کو قبول نہ کیا مگر خدا تعالیٰ اُسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کرے گا۔"

مہدئ منتظر

جو مولوی مخالفت کے لیے شور مچاتے اور لوگوں کو بھڑکاتے ہیں یہی پہلے منبروں پر چڑھ کر رو رو کر دُعائیں کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اب مہدی کا وقت آگیا، لیکن جب آنے والا مہدی آیا تو یہ شور مچانے والے ٹھہرے اور اسی مہدی کو مضل اور ضال اور دجّال کہا اور یہاں تک مخالفت کی کہ اپنے خیال میں عدالتوں تک پہنچا کر اس سلسلہ کو بند کرنا چاہا، مگر کیا وہ جو خدا کی طرف سے آیا ہے وہ ان لوگوں کی مخالفت سے رُک سکتا ہے اور بند ہو سکتا ہے؟ کیا یہ خدا تعالیٰ کا نشان نہیں؟ اگر یہ اب بھی نہیں مانتے تو آدمؑ سے لے کر اس وقت تک کوئی نظیر دو کہ اس طرح پر بیسؔ برس پہلے ایک آنے والے زمانہ کی خبر دی اور پھر ایسی حالت میں کہ لوگوں نے اس پیشگوئی کو رد کرنے کی بہت کوشش کی وہ پیشگوئی پوری ہو گئی اور لوگوں کا کثرت کے ساتھ رجوع ہوا۔ کیا یہ نشان کم ہے اس کی نظیر دکھاؤ۔

پھر احادیث میں پڑھتے تھے کہ مہدی کے زمانہ میں رمضان کے مہینہ میں کسوف وخسوف ہوگا اور جب تک یہ نشان پُورا نہیں ہوا تھا اس وقت تک شور مچاتے تھے کہ یہ نشان پورا نہیں ہوا، لیکن اب ساری دنیا قریباً گواہ

ہے کہ یہ نشان پُورا ہوا۔ یہاں تک کہ امریکہ میں بھی ہوا۔ اور دوسرے ممالک میں بھی پورا ہوا۔ اور اب وہی جو اس نشان کو آیاتِ مہدی میں سے ٹھہراتے تھے اس کے پُورے ہونے پر اپنے ہی مُنہ سے اس کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہی قابل اعتبار نہیں۔ اللہ تعالیٰ انکی حالت پر رحم کرے۔ میری مخالفت کی یہ لعنت پڑتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کی بھی تکذیب کر بیٹھتے ہیں۔

پھر مسیح موعود کے وقت کا ایک نشان طاعون کا تھا۔ انجیل و توریت میں بھی یہ نشان موجود تھا اور قرآن شریف سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشان مسیح موعودؑ کا خدا تعالیٰ نے ٹھہرایا تھا چنانچہ فرمایا وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا (سورة بنی اسرائیل : ۵۹) یہ باتیں معمولی نہیں ہیں بلکہ غور سے سمجھنے کے لائق ہیں اور اب دیکھ لو کہ کیا طاعون ملک میں پھیلی ہوئی ہے یا نہیں؟ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مَیں نے جب طاعون کے پھیلنے کی پیشگوئی کی تو مُلک میں اس کی ہنسی کی گئی اور اس پر ٹھٹھا کیا گیا۔ لیکن اب مُلک کی حالت اور طاعونی اموات کے نقشوں کو پڑھ کر بتائیں کیا یہ پیشگوئی پُوری ہوئی ہے یا نہیں؟ یہ وہ باتیں ہیں جو سمجھنے کے لائق ہیں اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا اعتراض کرنا کہ ہم اس وقت تسلیم کریں گے جب مغرب کی طرف سے آفتاب نکل آوے گا۔ اس قسم کے اعتراض تو کفار ہمیشہ سے نبیوں پر کرتے آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ماموروں کو ایسی باتیں مخالفوں سے سُننی پڑی تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں ہوں تو پھر قیامت کا نمونہ ہو جاوے اور اس دنیا کو وہ قیامت بنانا نہیں چاہتا۔ ایمان بالغیب بھی کوئی چیز ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر ایمان ایمان نہیں رہتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص سورج پر ایمان لاوے تو بتاؤ یہ ایمان اس کو کیا نفع دیگا؟ ایمان ہمیشہ اسی صورت اور حالت میں مفید اور نتیجہ خیز ہوتا ہے جب اس میں کوئی پہلو اخفاء کا بھی ہو لیکن جب کُھلی بات ہو تو پھر وہ مفید نہیں رہتا۔

اوّلین کا مقام

دیکھو اگر کوئی شخص پہلی رات کے چاند کو دیکھ کر بتا دے تو اُس کی تیز بینی کی تو تعریف ہوگی لیکن اگر چودھویں رات کے چاند کو جو بدر ہوتا ہے دیکھ کر شور مچاوے کہ مَیں نے چاند کو دیکھ لیا ہے تو اس کو تو سوائے مجنون کے اَور کوئی خطاب نہیں ملیگا۔ اسی طرح پر ایمان میں فراست اور تقویٰ سے کام لینا چاہیئے۔ اور قرائن قویہ کو دیکھ کر تسلیم کر لینا مومن کا کام ہے ورنہ جب بالکل پردہ بر انداز معاملہ ہو گیا اور سارے گوشے کُھل گئے اس وقت ایک خبیث سے خبیث انسان کو بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ مَیں اس سوال پر بار بار اس لیے زور دیتا ہوں کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ نشانوں کی فلاسفی کیا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے جیسا مَیں نے ابھی کہا ہے خدا تعالیٰ کبھی قیامت کا نظارہ یہاں قائم نہیں کرتا اور وہ غلطی کرتے ہیں جو ایسے نشان دیکھنے چاہتے ہیں یہ محرومی کے لچھن ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور کتاب لے آئیں تو آپ نے یہی جواب دیا هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۴)

پورے انکشاف کے بعد ایمان لاکر کسی ثواب کی اُمید رکھنا غلطی ہے۔ اگر کوئی مُٹھی کھول دی جاوے اور پھر کوئی بتاوے کہ اس میں فلاں چیز ہے تو اس کی کوئی قدر نہ ہوگی۔

پس پہلے تقویٰ ہے تو کام لو اور قرآن کو دیکھو کہ ثواب اسی میں ہے۔ جب ساری باتیں کُھل گئیں تو پھر کیا؟ جو اس انتظار میں رہتے کہ یہ دیکھوں اور وہ دیکھوں وہ ہمیشہ ایمان اور ثواب کے دائرہ سے خارج رہتے ہیں۔

دیکھو اللہ تعالیٰ نے بعض کا نام سابق مہاجر اور انصار رکھا ہے اور اُن کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ میں داخل کیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے اور جو بعد میں ایمان لائے ان کا نام صرف ناس رکھا ہے جیسے فرمایا۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (سورۃ النصر: ۳،۲) یہ لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے اگرچہ وہ مسلمان تھے مگر اُن کو وہ مراتب نہیں ملے جو پہلے لوگوں کو دیئے گئے۔

اور پھر مہاجرین کی عزت سب سے زیادہ تھی کیونکہ وہ لوگ اس وقت ایمان لائے جب اُن کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کامیابی ہوگی یا نہیں بلکہ ہر طرف سے مصائب اور مشکلات کا ایک طوفان آیا ہوا تھا اور کُفر کا ایک دریا بہتا تھا۔ خاص مکہ میں مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی اور مسلمان ہونے والوں کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی جاتی تھیں، مگر انہوں نے ایسے وقت میں قبول کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی بڑی بڑی تعریفیں کیں اور بڑے بڑے انعامات اور فضلوں کا وارث اُن کو بنایا۔ پس ہر ایک کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جو اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ فلاں وقت آئے گا اور انکشاف ہوگا تو مان لیں گے وہ کسی ثواب کی اُمید نہ رکھے۔ ایسا تو ضرور ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سب حجاب دُور کر دیگا اور اس معاملہ کو آفتاب کی طرح کھول کر دکھا دیگا مگر اس وقت ماننے والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پیغمبروں کو ماننے والوں میں ثواب اَوَّلُوْن کو سب سے بڑھ کر ملا ہے اور انکشاف کا زمانہ تو ضرور آتا ہے لیکن آخر اُن کا نام ناس ہی ہوتا ہے۔

(اس مقام پر مولانا مولوی سیّد محمد احسن صاحب امروہی نے عرض کیا کہ مَتٰی ھٰذَا الْفَتْحُ کے جواب میں یہی کہا کہ تمہارا ایمان اُس دن فائدہ نہ دیگا) فرمایا:۔

بیشک اس بات کو سمجھنا سعادت ہے جس نے اوّل زمانہ میں یہ نہیں پائی اُس کی کوئی قابلیت اور خوبی نہیں۔ جب خدا نے کھول دیا اس وقت تو پتھر اور درخت بھی بولتے ہیں۔ زیادہ قابلِ قدر وہ شخص ہے جو اوّل قبول کرتا ہے جیسے حضرت ابوبکرؓ نے قبول کیا آپ نے کوئی معجزہ نہیں مانگا اور آپ کے مُنہ سے ابھی نہیں سُنا تھا کہ ایمان لے آئے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی تجارت پر گئے ہوئے تھے اور جب سفر سے واپس آئے تو ابھی مکہ میں نہیں پہنچے تھے کہ راستہ میں کوئی ایک شخص آپ کو ملا اور اس سے مکہ کے حالات پُوچھے۔ اُس نے کہا کہ اور تو کوئی تازہ خبر نہیں۔ سب سے بڑھ کر تازہ خبر یہی ہے کہ تمہارے دوست نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ سُنکر کہا کہ اگر اُس نے

نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو وہ سچا ہے۔

اب غور سے دیکھو کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس وقت کوئی نشان یا معجزہ نہیں مانگا بلکہ سنتے ہی ایمان لے آئے اور دعویٰ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے بھی نہیں سُنا بلکہ ایک اَور شخص کی زبانی سُنا اور فوراً تسلیم کر لیا۔ یہ کیسا زبردست ایمان ہے روایت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے سُنکر اُس میں جھُوٹ کا احتمال نہیں سمجھا۔[1]

دیکھو حضرت ابوبکرؓ نے کوئی نشان نہیں مانگا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا نام صدیق ہوا۔ سچائی سے بھرا ہوا۔ صرف مُنہ دیکھ کر ہی پہچان لیا کہ یہ جھُوٹا نہیں ہے۔ پس صادقوں کی شناخت اور اُن کا تسلیم کرنا کچھ مشکل امر تو نہیں ہوتا۔ اُنکے نشانات ظاہر ہوتے ہیں لیکن کور باطن اپنے آپ کو شبہات اور خطرات میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ بڑے ہی بدقسمت ہوتے ہیں جو انتظار ہی میں اپنی عمر گذار دیتے ہیں اور پردہ برانداز ثبوت چاہتے ہیں۔ اُن کو معلوم نہیں کہ جیسا خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ انکشاف کے بعد ایمان نفع نہیں دیتا۔ نفع میں وہی لوگ ہوتے ہیں اور سعادت مند وہی ہیں جو مخفی ہونے کی حالت میں شناخت کرتے ہیں۔

دیکھو جب تک لڑائی جاری ہوتی ہے اس وقت تک فوجوں کو تمغے ملتے ہیں اور خطاب ملتے ہیں لیکن جب امن ہو جاوے اس وقت اگر کوئی فوج چڑھائی کرے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ لُوٹنے کو آئے ہیں۔

شیطان کی آخری جنگ

یہ زمانہ بھی رُوحانی لڑائی کا ہے۔ شیطان کے ساتھ جنگ شروع ہے۔ شیطان اپنے تمام ہتھیاروں اور مکروں کو لے کر اسلام کے قلعہ پر حملہ آور ہو رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اسلام کو شکست دے مگر خدا تعالیٰ نے اس وقت شیطان کی آخری جنگ میں اُس کو ہمیشہ کے لیے شکست دینے کے لیے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ مبارک وہ جو اس کو شناخت کرتا ہے اب تھوڑا زمانہ ہے ابھی ثواب ملے گا لیکن عنقریب وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کی سچائی کو آفتاب سے بھی زیادہ روشن کر دکھائے گا۔ وہ وقت ہوگا کہ ایمان ثواب کا موجب نہ ہوگا اور توبہ کا دروازہ بند ہونے کے مصداق ہوگا۔ اِس وقت میرے قبول کرنے والے کو بظاہر ایک عظیم الشان جنگ اپنے نفس سے کرنی پڑتی ہے۔ وہ دیکھے گا کہ بعض اوقات اس کو برادری سے الگ ہونا پڑیگا۔ اُس کے دُنیاوی کاروبار میں روک ڈالنے کی کوشش کی جائے گی اُس کو گالیاں سُننی پڑیں گی۔ لعنتیں سُنے گا مگر ان ساری باتوں کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملیگا۔

لیکن جب دوسرا وقت آیا اور اس زور کے ساتھ دُنیا کا رجُوع ہوا جیسے ایک بلند ٹیلہ سے پانی نیچے گرتا ہے اور کوئی انکار کرنے والا ہی نظر نہ آیا اُس وقت اقرار کس پایہ کا ہوگا؛ اس وقت ماننا شجاعت کا کام نہیں ثواب ہمیشہ دُکھ ہی کے زمانہ میں ہوتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کر کے اگر مکّہ کی نمبرداری چھوڑ دی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو ایک دُنیا کی بادشاہی دی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی کمبل پہن لیا اور ہر چہ بادا باد، ماکشتی در آب انداختیم کا مصداق ہو کر آپکو قبول کیا تو کیا خدا تعالیٰ نے اُنکے اجر کا کوئی حصّہ باقی رکھ لیا؟ ہرگز نہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے لیے ذرا بھی حرکت کرتا ہے وہ نہیں مرتا جب تک اس کا اجر نہ پالے۔ حرکت شرط ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف معمولی رفتار سے آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دَوڑ کر آتا ہے۔

ایمان یہ ہے کہ کچھ مخفی ہو تو مان لے۔ جو ہلال کو دیکھ لیتا ہے تیز نظر کہلاتا ہے لیکن چودھویں کے چاند کو دیکھ کر شور مچانے والا دیوانہ کہلائے گا۔

حضرت شہزادہ عبداللطیف کابلی کا مقام

اس موقعہ پر مولانا مولوی عبداللطیف صاحب کابلی نے عرض کی کہ حضور مَیں نے ہمیشہ آپ کو سورج ہی کی طرح دیکھا ہے کوئی امر مخفی یا مشکوک مجھے نظر نہیں آیا پھر مجھے کوئی ثواب ہو گا یا نہیں۔ فرمایا:۔

آپ نے اس وقت دیکھا جب کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ آپ نے اپنے آپ کو نشانہ ابتلاء بنا دیا اور ایک طرح سے جنگ کے لیے تیار کر دیا۔ اب بچ جانا یہ خدا کا فضل ہے۔ ایک شخص جو جنگ میں جاتا ہے اس کی شجاعت میں تو کوئی شبہ نہیں اگر وہ بچ جاتا ہے اور اسے کوئی گزند نہیں پہنچتا تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا اور ہر دُکھ اور ہر مصیبت کو اس راہ میں اُٹھانے کے لیے تیار ہو گئے اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔

مخالفوں کا ساحر کہنا

خان عجب خانصاحب:۔ حضور پشاور میں میرے مخالف لوگ جمع ہوئے اور اُنہوں نے میرے والد سے کہا کہ اس کو منع کرو۔ مَیں نے اُن کو یہی جواب دیا کہ مَیں نے جس صداقت کو دیکھ لیا ہے اور خدا کے فضل سے سمجھ لیا ہے اب اُسے سچائی سمجھ کر مَیں کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر اب چھوڑوں تو مجھ سے بڑھ کر خطا کار اور زیاں کار کون ہو گا؟ کیونکہ مجھ پر حجت پوری ہو چکی ہے۔ اس پر اُنہوں نے اَور تو کچھ نہ کہا صرف یہ کہکر ٹال دیا کہ وہ جادُوگر ہے۔ فرمایا:۔

جادُوگر کہلانا قدیم سے انبیاء علیہم السلام کی سنّت چلی آتی ہے۔ ہم کو اگر کسی نے جادوگر کہا تو اُسی سُنّت کو پورا کیا۔

قرآن کریم اور حدیث کا مرتبہ

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم تو قرآن شریف پیش کرتے ہیں جس سے جادُو بھاگتا ہے اس کے بالمقابل کوئی باطل اور سحر نہیں ٹھہر سکتا

ہمارے مخالفوں کے ہاتھ میں کیا ہے جس کو وہ لیے پھرتے ہیں۔ یقیناً یاد رکھو کہ قرآن شریف وہ عظیم الشان حربہ ہے کہ اُس کے سامنے کسی باطل کو قائم رہنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی باطل پرست ہمارے سامنے اور ہماری جماعت کے سامنے نہیں ٹھہرتا اور گفتگو سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ آسمانی ہتھیار ہے جو کبھی کُند نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اندرونی مخالف اُس کو چھوڑ کر الگ ہو گئے ہیں ورنہ اگر قرآن شریف کی رُو سے یہ فیصلہ کرنا چاہتے تو اُن کو اس قدر مصیبتیں پیش نہ آتیں۔ ہم خدا تعالیٰ کا پیارا اور یقینی کلام قرآن شریف پیش کرتے ہیں اور وہ اس کے جواب میں قرآن شریف سے استدلال نہیں کرتے۔ ہمارا مذہب یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کو مقدم کرو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ جو قرآن شریف کے خلاف ہو ہم نہیں مان سکتے خواہ وہ کسی کا کلام ہو۔ اللہ تعالیٰ کے کلام پر ہم کسی کی بات کو ترجیح کس طرح دیں۔ ہم احادیث کی عزت کرتے ہیں اور اپنے مخالفوں سے بھی بڑھ کر احادیث کو واجب العمل سمجھتے ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ ہم دیکھیں گے کہ وہ حدیث قرآن شریف کے کسی بیان کے متعارض یا متخالف نہ ہو اور محدثین کے اپنے وضع کردہ اُصولوں کی بناء پر اگر کوئی حدیث موضوع بھی ٹھہرتی ہو لیکن قرآن شریف کے مخالف نہ ہو۔ بلکہ اس سے قرآن شریف کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ تب بھی ہم اس کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور اس امر کا پاس کریں گے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے۔ لیکن اگر کوئی حدیث ایسی پیش کی جاوے جو قرآن شریف کے مخالف ہو تو ہم کوشش کریں گے کہ اُس کی تاویل کر کے اس مخالفت کو دُور کریں لیکن اگر وہ مخالفت دُور نہیں ہو سکتی تو پھر ہم کو وہ حدیث بہرحال چھوڑنی پڑے گی کیونکہ ہم اس پر قرآن کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اس پر بھی ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ وہ تمام احادیث جو اس معیار پر صحیح ہیں وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ بخاری اور مُسلم میرے دعوے کی تائید اور تصدیق کرتے ہیں جیسے قرآن شریف نے فرمایا کہ مسیح مر گئے اسی طرح بخاری اور مسلم نے تصدیق کی اور اِنِّی مُتَوَفِّیۡکَ (آل عمران: ۵۶) کے معنے مُمِیۡتُکَ کئے۔ جیسے قرآن شریف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسماعیل کو اسی طرح شرف عطا ہوا جیسے بنی اسرائیل کو بزرگی دی تھی ویسے ہی احادیث سے یہ پایا جاتا ہے۔

ان لوگوں پر جو انکار کرتے ہیں افسوس ہے۔ اُن کو رسم اور عادت نے خراب کر دیا ہے ورنہ یہ میرا معاملہ ایسا مشکل اور پیچیدہ نہ تھا جو سمجھ میں نہ آتا۔ قرآن شریف سے ثابت، احادیث سے ثابت، دلائلِ عقلیہ سے ثابت اور پھر تائیداتِ سماویہ اسکی مصدق، اور ضرورتِ زمانہ اسکی مؤید۔ باوجود اسکے بھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ حق پر نہیں۔

قرآن وسنّت کی خلاف ورزی

غور کر کے دیکھو کہ جب یہ لوگ خلاف قرآن وسُنّت کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر بیٹھے ہیں تو پادریوں کو نکتہ چینی کا موقعہ ملتا ہے اور وہ جھٹ پٹ کہہ اُٹھتے ہیں کہ تمہارا پیغمبر مر گیا اور معاذ اللہ وہ زمینی ہے حضرت عیسیٰ زندہ اور آسمانی ہے اور اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کر کے کہتے ہیں کہ وہ مُردہ ہے۔

سوچ کر بتاؤ کہ وہ پیغمبر جو افضل الرسل اور خاتم الانبیاء ہے ایسا اعتقاد کرکے اس کی فضیلت اور خاتمیت کو یہ لوگ بٹہ نہیں لگاتے؟ ضرور لگاتے ہیں اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا ارتکاب کرتے ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ پادریوں سے جس قدر توہین ان لوگوں نے اسلام کی کرائی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مُردہ کہلایا ہے اسی کی سزا میں یہ نکبت اور بدبختی اُن کے شامل حال ہو رہی ہے۔ ایک طرف تو منہ سے کہتے ہیں کہ وہ افضل الانبیاء ہیں اور دوسری طرف اقرار کرلیتے ہیں کہ ۶۳ سال کے بعد مر گئے اور مسیح اب تک زندہ ہے اور نہیں مرا حالانکہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (سورۃ النسآء : ۱۱۴) پھر کیا یہ ارشاد الٰہی غلط ہے؟ نہیں یہ بالکل درست اور صحیح ہے وہ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مُردہ ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی کلمہ توہین کا نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی فضیلت ہے جو کسی نبی میں نہیں ہے۔ میں اس کو عزیز رکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کو جو شخص بیان نہیں کرتا وہ میرے نزدیک کافر ہے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس نبی کی اُمت کہلاتے ہیں اسی کو معاذ اللہ مُردہ کہتے ہیں اور اسی نبی کو جس کی اُمت کا خاتمہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (سورۃ البقرۃ : ۶۲) پر ہوا ہے۔ اُسے زندہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم یہودی تھی اور اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔ اب قیامت تک اُن کو عزت نہ ملے گی۔ اب اگر حضرت عیسیٰ پھر آگئے تو پھر گویا اُن کی کھوئی عزت بحال ہوگئی اور قرآن شریف کا یہ حکم باطل ہوگیا۔ جس پہلو اور حیثیت سے دیکھو جو کچھ وہ مانتے ہیں اس پہلو سے قرآن شریف کا ابطال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین لازم آتی ہے۔ پھر تعجب ہے کہ یہ لوگ مسلمان کہلا کر ایسے اعتقادات رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہود کے لیے فتویٰ دیتا ہے کہ اُن میں نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور وہ ذلیل ہوگئے پھر اُن میں زندہ نبی کیسے آسکتا ہے؟ ایک مسلمان کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ جب اس کے سامنے قرآن شریف پیش کیا جاوے تو وہ انکار کے لیے لب کشائی نہ کرے مگر یہ قرآن سنتے ہیں اور پڑھتے ہیں وہ اُن کے حلق سے نیچے نہیں جاتا ورنہ کیا یہ کافی نہ تھا کہ قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ۔ اور اس سے بڑھ کر خود حضرت مسیح کا اپنا اقرار موجود ہے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (سورۃ المائدۃ : ۱۱۸) اور یہ قیامت کا واقعہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوگا کہ کیا تُو نے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب تک میں اُن میں زندہ تھا میں نے تو نہیں کہا اور میں وہی تعلیم دیتا رہا جو تُو نے مجھے دی تھی۔ لیکن جب تُو نے مجھے وفات دیدی اس وقت تو ہی اُن کا نگہبان تھا۔ اب یہ کیسی صاف بات ہے۔

اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا کہ حضرت مسیح کو دُنیا میں قیامت سے پہلے آنا تھا تو پھر یہ جواب اُن کا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اُن کو تو کہنا چاہیئے تھا کہ مَیں دُنیا میں جب دوبارہ گیا تو اس وقت صلیب پرستی کا زور تھا اور میری اُلوہیت اور ابنیت پر بھی شور مچا ہوا تھا مگر مَیں نے جاکر صلیبوں کو توڑا اور خنزیروں کو قتل کیا اور تیری توحید کو پھیلایا۔ نہ یہ جواب دیتے کہ جب تُو نے مجھے وفات دے دی اس وقت تو خود نگران تھا۔ کیا قیامت کے دن حضرت مسیح جھوٹ بولیں گے؟

ان عقائد کی شناعت کہاں تک بیان کی جاوے جس پہلو اور جس مقام سے دیکھو قرآن شریف کی مخالفت نظر آئے گی۔

پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ دیکھا جاوے حضرت مسیح آسمان پر جاکر کہاں بیٹھے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں جاکر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پاس بیٹھے ہیں اور یحییٰ علیہ السلام بالاتفاق وفات یافتہ ہیں۔ پھر مُردوں میں زندہ کا کیا کام ہے؟

غرض کہاں تک بیان کروں ایک غلطی ہو تو آدمی بیان کرے یہاں تو غلطیاں ہی غلطیاں بھری پڑی ہیں۔ باوجود ان غلطیوں کے تعصب اور ضد بڑھی ہوئی ہے اور اس ضد کے سبب سچ کے قبول کرنے میں عذر کر رہے ہیں۔ ہاں جس کے لیے خدا تعالیٰ نے مقدر کیا ہوا ہے اور اس کے حصہ میں سعادت ہے وہ سمجھ رہا ہے اور اس طرف آتا جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے نیکی چاہتا ہے اس کے دل میں واعظ پیدا کر دیتا ہے۔ جب تک دل میں واعظ نہ ہو کچھ نہیں ہوتا۔ اگر خدا کے قول کے خلاف کوئی قول ہو تو خدا کو اس خلاف قول کے ماننے میں کیا جواب دے گا۔

احادیث کی تصحیح و تغلیط بذریعہ کشف

احادیث کے متعلق خود یہ تسلیم کر چکے ہیں۔ خصوصاً مولوی محمد حسین اپنے رسالہ میں شائع کر چکا ہے کہ اہلِ کشف احادیث کی صحت بذریعہ کشف کر لیتے ہیں اور اگر کوئی حدیث محدثین کے اُصولوں کے موافق صحیح بھی ہو تو اہلِ کشف اُسے موضوع قرار دے سکتے ہیں اور موضوع کو صحیح ٹھہرا سکتے ہیں[1]

جس حال میں اہلِ کشف احادیث کی صحت کے اس معیار کے پابند نہیں جو محدثین نے مقرر کیا ہے بلکہ وہ بذریعہ کشف اُن کی صحیح قرار دادہ احادیث کو موضوع ٹھہرانے کا حق رکھتے ہیں تو پھر جس کو حَکم بنایا گیا ہے کیا اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا؟ خدا تعالیٰ جو اُس کا نام حَکم رکھتا ہے یہ نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ سارا رطب ویابس جو اُس کے سامنے پیش کیا جاوے گا تسلیم نہیں کریگا بلکہ بہت سی باتوں کو رد کر دے گا اور جو صحیح ہونگی اُن کے

[1] الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ صفحہ ۱ تا ۳ مورخہ ۱۰؍ اگست ۱۹۰۳ء

مسیح ہونے کا وہ فیصلہ دے گا ورنہ حَکَمْ کے معنے ہی کیا ہوئے؟ جب اس کی کوئی بات ماننی ہی نہیں تو اُس کے حَکَمْ ہونے سے فائدہ کیا؟

مسیح موعود بطور حَکَمْ و عدل

حَکَمْ کا لفظ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت اختلاف ہوگا اور ۷۳ فرقے موجود ہوں گے اور ہر فرقہ اپنے مسلّمات کو جو اُس نے بنا رکھے ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ جھوٹے ہیں یا خیالی، چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ ہر ایک اپنی جگہ یہ چاہے گا کہ اس کی بات ہی مانی جاوے اور جو کچھ وہ پیش کرتا ہے وہ سب کچھ تسلیم کر لیا جاوے۔ ایسی صورت میں اس حَکَمْ کو کیا کرنا ہوگا۔ کیا وہ سب کی باتیں مان لے گا یا یہ کہ بعض رد کریگا اور بعض کو تسلیم کرے گا۔

غیر مقلد تو راضی نہیں ہوگا جب تک اس کی پیش کردہ احادیث کا سارا مجموعہ وہ مان نہ لے اور ایسا ہی حنفی، معتزلہ، شیعہ وغیرہ کُل فرقے تو تب ہی اُس سے راضی ہوں گے کہ وہ ہر ایک کی بات تسلیم کرے اور کوئی بھی رد نہ کرے اور یہ ناممکن ہے۔ اگر یہ ہو کہ کوٹھڑی میں بیٹھا رہے گا اور اگر شیعہ اس کے پاس جائیگا تو اندر ہی اندر مخفی طور پر اُسے کہہ دیگا کہ تو سچا ہے اور پھر سُنّی اُس کے پاس جائیگا تو اُس کو کہہ دیگا کہ تو سچا ہے۔ تو پھر تو بجائے حَکَمْ ہونے کے وہ پکا منافق ہوا اور بجائے وحدت کی رُوح پھونکنے کے اور سچا اخلاص پیدا کرنے کے وہ نفاق پھیلانے والا ٹھہرا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ آنے والا موعود حَکَمْ واقعی حَکَمْ ہوگا۔ اُسکا فیصلہ قطعی اور یقینی ہے۔

ایک نقل مشہور ہے کہ کسی عورت کی دو لڑکیاں تھیں ایک بیٹ میں بیاہی ہوئی تھی اور دوسری بانگر میں اور وہ ہمیشہ یہ سوچتی رہتی تھی کہ دو میں سے ایک ہے نہیں اگر بارش زیادہ ہوگئی تو بیٹ والی نہیں ہے اور اگر نہ ہوئی تو بانگر والی نہیں ہے۔ یہی حال حَکَمْ کے آنے پر ہونا چاہیئے۔

وہ خود ساختہ اور موضوع باتوں کو رد کر دیگا اور سچ کو لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام حَکَمْ رکھا گیا ہے۔ اسی لیے آثار میں آیا ہے کہ اُس پر کُفر کا فتویٰ دیا جاوے گا کیونکہ وہ جس فرقہ کی باتوں کو رد کریگا وہی اُس پر کُفر کا فتویٰ دیگا۔ یہاں تک کہا ہے کہ مسیح موعودؑ کے نزول کے وقت ہر ایک شخص اُٹھ کر کھڑا ہوگا اور منبر پر چڑھ کر کہے گا اِنَّ ھٰذَا الرَّجُلَ غَیَّرَ دِیْنَنَا۔ اس شخص نے ہمارے دین کو بدل دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اَور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ وہ بہت سی باتوں کو رد کر دیگا جیسا کہ اُس کا منصب اُس کو اجازت دیگا۔

غرض اس بات کو سرسری نظر سے ہرگز نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ غور کرنا چاہیئے کہ حَکَمْ عدل کا آنا اور اس کا نام دلالت کرتا ہے کہ وہ اختلاف کے وقت آئے گا اور اس اختلاف کو مٹائے گا۔ ایک کو رد کریگا اور اندرونی غلطیوں کی اصلاح کریگا۔

وہ اپنے نورِ فراست اور خدا تعالیٰ کے اعلام و الہام سے بعض ڈھیروں کے ڈھیر جلا دیگا اور پکی اور محکم

باتیں رکھ لے گا۔ جب یہ مسلّم امر ہے تو پھر مجھ سے یہ اُمید کیوں کی جاتی ہے کہ میں اُن کی ہر بات مان لُوں قطع نظر اس کے کہ وہ بات غلط اور بیہودہ ہے۔ اگر میں اُن کا سارا رطب و یابس مان لُوں تو پھر میں حَکَم کیسے ٹھہر سکتا ہوں ؟

کشفِ حقیقت کیلئے اللہ تعالیٰ سے توفیق چاہیں

یہ ممکن ہی نہیں۔ افسوس یہ لوگ دل رکھتے ہیں پر سوچتے نہیں، آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں پر سُنتے نہیں۔ اُن کے لیے بہترین راہ اب یہی ہے کہ وہ رو رو کر دُعائیں کریں اور میرے متعلق کشف الحقیقت کے لیے اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق چاہیں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص محض احقاقِ حق کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگے گا تو وہ میرے معاملہ کی سچائی پر خدا تعالیٰ سے اطلاع پائے گا اور اُس کا زنگ دُور ہو جائے گا۔ بجُز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جو دلوں کو کھولے اور کشفِ حقائق کی قوت عطا کرے۔ اسلام اس وقت مصیبت کی حالت میں ہے اور وہ ایک فنا شدہ قوم کی حالت اختیار کر چکا ہے۔ ایسی حالت اور صورت میں ان لوگوں پر مجھے رونا آتا ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام کی اس تباہ شدہ حالت کی اصلاح کے لیے کسی مصلح کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ بیمار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہلاک ہو جائیں۔ ایسے بیماروں سے بڑھ کر کون واجب الرحم ہو سکتا ہے جو اپنی بیماری کو صحت سمجھے۔ یہی وہ مرض ہے جس کو لاعلاج کہنا چاہیئے۔ اور ان لوگوں پر اَور بھی افسوس ہے جو خود حدیثیں پڑھتے اور پڑھاتے تھے کہ ہر صدی کے سر پر مجدد آیا کرتا ہے لیکن اس چودھویں صدی کے مجدد کا انکار کر دیا۔ اور نہیں بتاتے کہ اس صدی پر جس میں سے بیس سال گذر گئے کوئی مجدد آیا ہے یا نہیں ؟ خود پتہ نہیں دیتے اور آنے والے کا نام دجال رکھتے ہیں۔ کیا اسلام کی اس خستہ حالی کا مداوا اللہ تعالیٰ نے یہی کیا کہ بجائے ایک مصلح اور مردِ خدا کے بھیجنے کے ایک کافر اور دجال کو بھیج دیا ؟ یہ لوگ ایسے اعتقاد رکھکر خدا تعالیٰ کی اس پاک کتاب قرآن مجید کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اِن پر رحم کرے۔

اس وقت تقویٰ بالکل اُٹھ گیا ہے۔ اگر مُلانوں کے پاس جائیں تو وہ اپنے ذاتی اور نفسانی اغراض کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مسجدوں کو دوکانوں کا قائمقام سمجھتے ہیں۔ اگر چار روز روٹیاں بند ہو جائیں تو کچھ تعجب نہیں کہ نماز پڑھنا پڑھانا ہی چھوڑ دیں۔ اس دین کے دو ہی بڑے حصے تھے ایک تقویٰ دوسرے تائیدات سماویہ۔ مگر اب دیکھا جاتا ہے کہ یہ باتیں نہیں رہیں۔ عام طور پر تقویٰ نہیں رہا اور تائیدات سماویہ کا یہ حال ہے کہ خود تسلیم کر بیٹھے ہیں کہ مدت ہوئی ان میں نہ کوئی نشانات ہیں نہ معجزات اور نہ تائیدات سماویہ کا کوئی سلسلہ ہے۔ جلسہ مذاہب میں مولوی محمد حسین نے صاف طور پر اقرار کیا تھا کہ اب معجزات اور نشانات دکھانے والا کوئی نہیں اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ تقویٰ نہیں رہا کیونکہ نشانات تو متقی کو ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین کی تائید اور نصرت کرتا ہے مگر وہ نصرت تقویٰ کے بعد آتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات اور معجزات اس لیے عظیم الشان قوت

اور زندگی کے نشانات ہیں کہ آپ سیّد المتقین تھے۔ آپ کی عظمت اور جلال کا خیال کر کے بھی انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اب پھر اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ آپ کا جلال دوبارہ ظاہر ہو اور آپ کے اسم اعظم کی تجلی دُنیا میں پھیلے اور اسی لیے اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ یہ سلسلہ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا ہے اور اس کی غرض اللہ تعالیٰ کی توحید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جلال ظاہر کرنا ہے اس لیے کوئی مخالف اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔

حیاتِ مسیح کا عقیدہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ماننے سے شرک پیدا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اُس کو پسند نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت توحید ہی سے ظاہر ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ مسیح کی موت کے پردہ کو اُٹھا دے اور عالم کو دکھا دے کہ درحقیقت حضرت مسیح عام انسانوں کی طرح تھے اُن میں کوئی خصوصیت اور اُلوہیت نہ تھی وہ وفات پاگئے اور جیسے جسمانی طور پر آپ مرگئے رُوحانی طور پر بھی عیسائی مذہب مر گیا اور اُس میں کوئی قبولیت اور شرف کا نشان باقی نہیں۔ ایک بھی عیسائی نہیں جو کھڑا ہو کر دعویٰ سے کہہ سکے کہ میں ان زندہ آثار اور نشانات سے جو زندہ مذہب کے ہیں اسلام کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

چالیس کروڑ انسان جو مختلف اغراضِ نفسانی کی بناء پر یا اَور وجوہات سے اس کو خدا بنا رہے ہیں۔ وہ وقت آتا ہے کہ اس کی خدائی سے توبہ کریں گے اور اس کو عام انسانوں میں جگہ دیں گے۔

مسلمانوں پر افسوس ہے جنہوں نے عیسائیوں کی ہاں میں ہاں ملائی ہے اور اس کو خدا بنانے میں مدد دی عیسائی کُھلے طور پر خدا مانتے ہیں اور یہ لوگ خدائی کی صفات دیتے ہیں۔ ان کی ویسی ہی مثال ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ فلاں آدمی مرگیا ہے لیکن دوسرا آدمی کہے کہ ابھی مرا تو نہیں مگر بدن سرد ہے اور نبض بھی نہیں چلتی اور حرکت بھی نہیں۔ تو کیا وُہ مُردہ نہ ہوگا؟ یہی حال حضرت عیسیٰ کی خدائی کے متعلق ہے۔ خدائی کے صفات اُن میں تسلیم کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم خدا نہیں مانتے۔ اب غیرت مند مسلمان سوچ کر جواب دیں کہ جب حضرت عیسیٰ کو خالق مانا جاتا ہے۔ مُحیی مانا جاتا ہے۔ غیب دان مانا جاتا ہے۔ شافی مانا جاتا ہے۔ حیّ مانا جاتا ہے تو اَور کیا باقی رہا؟ غرض مسلمانوں کی حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور وہ سوچتے نہیں۔

اس وقت اگر اَور نشانات اور تائیدات ہمارے دعویٰ کی مصدق اور مؤید نہ ہوتیں تب بھی وقت ایسا تھا کہ وہ زبردست ضرورت بتاتا ہے خدا تعالیٰ ہی ان کی آنکھیں کھولے تو بات بنے گی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭
٭ ٭ ٭

۱۸؍ جنوری ۱۹۰۳ء

تقدیرِ معلق و تقدیرِ مُبرم

تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کا نام معلق ہے اور دوسری کو مُبرم کہتے ہیں اگر کوئی تقدیرِ معلق ہو تو دُعا اور صدقات اس کو ٹلا دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس تقدیر کو بدل دیتا ہے اور مبرم ہونے کی صورت میں وہ صدقات اور دُعا اس تقدیر کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں وہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس دعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرایہ میں اس کو پہنچا دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی تقدیر میں ایک وقت تک توقف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔

قضاء معلق اور مُبرم کا ماخذ اور پتہ قرآنِ کریم ہی سے ملتا ہے۔ گو یہ الفاظ نہیں۔ مثلاً قرآن میں فرمایا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) دُعا مانگو میں قبول کروں گا۔ اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دُعا قبول ہو سکتی ہے اور دُعا سے عذاب ٹل جاتا ہے اور ہزار ہا کیا، کُل کام دُعا سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کُل چیزوں پر قادرانہ تصرف ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اسکے پوشیدہ تصرفات کی لوگوں کو خواہ خبر ہو یا نہ ہو مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزار ہا دردمندوں کی دُعاؤں کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اثبات کرتا ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری امر نہیں کہ اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی کُنہ اور کیفیت کو معلوم کرنے کی کوشش کریں جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایک شے ہونے والی ہے۔ اس لیے ہم کو جھگڑے اور بحث میں پڑنے کی کچھ حاجت نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کی قضاء و قدر کو مشروط بھی رکھا ہے جو توبہ خشوع و خضوع سے ٹل سکتی ہیں۔ جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت انسان کو پہنچتی ہے تو وہ فطرتاً اور طبعاً اعمالِ حسنہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسوس کرتا ہے جو اُسے بیدار کرتا اور نیکیوں کی طرف کھینچے لیے جاتا ہے اور گُناہ سے ہٹاتا ہے۔ جس طرح پر ہم ادویات کے اثر کو تجربہ کے ذریعہ سے پالیتے ہیں اسی طرح پر ایک مضطرب الحال انسان جب خدائے تعالےٰ کے آستانہ پر نہایت تذلل اور نیستی کے ساتھ گرتا ہے اور ربّی ربّی کہہ کر اس کو پکارتا اور دُعائیں مانگتا ہے تو وہ رویائے صالحہ یا الہامِ صحیح کے ذریعہ سے ایک بشارت اور تسلی پالیتا ہے۔ مَیں نے اپنے ساتھ بارہا اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ دیکھا ہے کہ جب میں نے کرب و قلق سے کوئی دُعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے رؤیا کے ذریعہ سے آگاہی بخشی۔ ہاں قلق اور اضطرار اپنے بس میں نہیں ہوتا۔

اس کا انشاء بھی فعل الٰہی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب صبر اور صدق سے دُعا انتہا کو پہنچے تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ دُعا، صدقہ اور خیرات سے عذاب کا ٹلنا ایک ایسی ثابت شدہ صداقت ہے جس پر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کا اتفاق ہے اور کروڑہا صلحاء اتقیاء اور اولیاء اللہ کے ذاتی تجربے اس امر پر گواہ ہیں۔

نماز کی لذت اور سرور

نماز کیا ہے؟ یہ ایک خاص دُعا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اس کو بادشاہوں کا ٹیکس سمجھتے ہیں۔ نادان اتنا نہیں جانتے کہ بھلا خدائے تعالیٰ کو ان باتوں کی کیا حاجت ہے۔ اس کی غناءِ ذاتی کو اس بات کی کیا حاجت ہے کہ انسان دُعا اور تسبیح اور تہلیل میں مصروف ہو۔ بلکہ اس میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے کہ وہ اس طریق سے اپنے مطلب کو پہنچ جاتا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ آجکل عبادت اور تقویٰ اور دینداری سے محبت نہیں ہے۔ اس کی وجہ ایک عام زہریلا اثر رسم کا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت سرد ہو رہی ہے اور عبادت میں جس قسم کا مزا آنا چاہیئے۔ وہ مزا نہیں آتا۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں لذت اور ایک خاص حظ اللہ تعالیٰ نے رکھا نہ ہو۔ جس طرح پر ایک مریض ایک عمدہ سے عمدہ خوش ذائقہ چیز کا مزا نہیں اُٹھا سکتا اور وہ اسے بالکل تلخ یا پھیکا سمجھتا ہے اسی طرح سے وہ لوگ جو عبادتِ الٰہی میں حظ اور لذت نہیں پاتے انکو اپنی بیماری کا فکر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جیسا مَیں نے ابھی کہا ہے دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں خدائے تعالےٰ نے کوئی نہ کوئی لذت نہ رکھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عبادت کیلئے پیدا کیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی عبادت میں اس کے لیے ایک لذت اور سُرور نہ ہو؟ لذت اور سُرور تو ہے مگر اس سے حظ اُٹھانے والا بھی تو ہو۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰریات: ۵۷) اب انسان جب عبادت ہی کے لیے پیدا ہوا ہے، ضروری ہے کہ عبادت میں لذت اور سُرور بھی درجہ غایت کا رکھا ہو۔ اس بات کو ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے خوب سمجھ سکتے ہیں مثلاً دیکھو اناج اور تمام خوردنی اور نوشیدنی اشیاء انسان کے لیے پیدا کی ہیں تو کیا اُن سے وہ ایک لذت اور حظ نہیں پاتا ہے؟ کیا اُس ذائقہ اور مزے کے احساس کے لیے اُس کے منہ میں زبان موجود نہیں؟ کیا وہ خوبصورت اشیاء کو دیکھ کر نباتات ہوں یا جمادات، حیوانات ہوں یا انسان حظ نہیں پاتا؟ کیا دِل خوش کُن اور سُریلی آوازوں سے اس کے کان محظوظ نہیں ہوتے؟ پھر کیا کوئی دلیل اور بھی اس امر کے اثبات کے لیے مطلوب ہے کہ عبادت میں لذت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے عورت اور مرد کو رغبت دی ہے۔ اب اس میں زبردستی نہیں کی بلکہ ایک لذت بھی رکھ دی ہے۔ اگر محض توالد و تناسل ہی مقصود بالذات ہوتا تو مطلب پورا نہ ہوسکتا۔ عورت اور مرد کی برہنگی کی حالت میں اُن کی غیرت قبول نہ کرتی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔ مگر اس میں ان کے لیے ایک حظ ہے اور ایک لذت ہے۔ یہ حظ اور لذت اس درجہ تک پہنچی ہے کہ بعض کوتاہ اندیش انسان اولاد کی بھی پروا اور خیال نہیں کرتے بلکہ اُن کو صرف حظ ہی سے کام اور غرض ہے۔ خدائے تعالیٰ کی علتِ غائی بندوں کا پیدا کرنا تھا اور اس سبب کے لیے ایک تعلق عورت اور مرد میں قائم کیا اور ضمناً اس میں ایک حظ رکھدیا جو اکثر نادانوں کے لیے مقصود بالذات ہوگیا ہے۔

اسی طرح سے خوب سمجھ لو کہ عبادت بھی کوئی بوجھ اور ٹیکس نہیں۔ اس میں بھی ایک لذت اور سُرور ہے اور یہ لذت اور سُرور دُنیا کی تمام لذتوں اور تمام حظوظِ نفس سے بالاتر اور بالاتر ہے۔ جیسے عورت اور مرد کے باہم تعلقات میں ایک لذت ہے اور اس سے وہی بہرہ مند ہوسکتا ہے جو مرد ہے اور اپنے قویٰ صحیح رکھتا ہے۔ ایک نامرد اور مخنث وہ حظ نہیں پاسکتا اور جیسے ایک مریض کسی عمدہ سے عمدہ خوش ذائقہ غذا کی لذت سے محروم ہے اسی طرح پر ہاں ٹھیک ایسا ہی وہ کم بخت انسان ہے جو عبادتِ الٰہی سے لذت نہیں پاسکتا۔

عورت اور مرد کا جوڑا تو باطل اور عارضی جوڑا ہے۔ میں کہتا ہوں حقیقی ابدی اور لذت مجسم کا جو جوڑا ہے وہ انسان اور خدائے تعالیٰ کا ہے۔ مجھے سخت اضطراب ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ رنج میری جان کو کھانے لگتا ہے کہ ایک دن اگر کسی کو روٹی یا کھانے کا مزا نہ آئے۔ طبیب کے پاس جاتا اور کیسی کیسی منتیں اور خوشامدیں کرتا اور روپیہ خرچ کرتا اور دُکھ اُٹھاتا ہے کہ وہ مزا حاصل ہو۔ وہ نامرد جو اپنی بیوی سے لذت حاصل نہیں کرسکتا بعض اوقات گھبرا گھبرا کر خودکشی کے ارادے تک پہنچ جاتا ہے اور اکثر موتیں اس قسم کی ہوجاتی ہیں۔ مگر آہ! وہ مریضِ دل وہ نامرد کیوں کوشش نہیں کرتا جس کو عبادت میں لذت نہیں آتی اسکی جان کیوں غم سے نڈھال نہیں ہوجاتی؟ دُنیا اور اس کی خوشیوں کے لیے تو کیا کچھ کرتا ہے مگر ابدی اور حقیقی راحتوں کی وہ پیاس اور تڑپ نہیں پاتا کس قدر بے نصیب ہے۔ کیسا ہی محرُوم ہے! عارضی اور فانی لذتوں کے علاج تلاش کرتا ہے اور پالیتا ہے۔ کیا ہوسکتا ہے کہ مستقل اور ابدی لذت کے علاج نہ ہوں؟ ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر تلاشِ حق میں مستقل اور پویا قدم درکار ہیں۔ قرآن کریم میں ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے صالحین کی مثال عورتوں سے دی ہے۔ اس میں بھی سِرّ اور بھید ہے۔ ایمان لانے والے کو آسیہ اور مریم سے مثال دی ہے۔ یعنی خدائے تعالیٰ مشرکین میں سے مومنوں کو پیدا کرتا ہے۔ بہرحال عورتوں سے مثال دینے میں دراصل ایک لطیف راز کا اظہار ہے۔ یعنی

جس طرح عورت اور مرد کا باہم تعلق ہوتا ہے اسی طرح پر عبُودیّت اور ربُوبیّت کا رشتہ ہے۔ اگر عورت اور مرد کی باہم موافقت ہو اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو تو وہ جوڑا ایک مبارک اور مفید ہوتا ہے ورنہ نظامِ خانگی بگڑ جاتا ہے اور مقصود بالذات حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مرد اَور جگہ خراب ہو کر صدہا قسم کی بیماریاں لے آتے ہیں۔ آتشک سے مجذوم ہو کر دُنیا میں ہی محروم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اولاد ہو بھی جائے تو کئی پُشت تک یہ سلسلہ چلا جاتا ہے اور اُدھر عورت بے حیائی کرتی پھرتی ہے اور عزّت و آبرُو کو ڈبو کر بھی سچی راحت حاصل نہیں کرسکتی۔ غرض اس جوڑے سے الگ ہو کر کس قدر بد نتائج اور فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر انسان رُوحانی جوڑے سے الگ ہو کر مجذوم اور مخذول ہو جاتا ہے دُنیاوی جوڑے سے زیادہ رنج و مصائب کا نشانہ بنتا ہے جیساکہ عورت اور مرد کے جوڑے سے ایک قسم کی بقاء کے لیے حظ ہے اسی طرح پر عبودیّت اور ربُوبیّت کے جوڑے میں ایک ابدی بقا کے لیے حظ موجود ہے صوفی کہتے ہیں کہ یہ حظ جس کو نصیب ہو جائے وہ دنیا اور مافیہا کے تمام حظوظ سے بڑھ کر ترجیح رکھتا ہے۔ اگر ساری عمر میں ایک بار بھی اُس کو معلوم ہو جائے تو وہ اس میں ہی فنا ہو جائے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ دُنیا میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے اس راز کو نہیں سمجھا اور ان کی نمازیں نری ٹکریں ہیں اور اوپرے دل کے ساتھ ایک قسم کی قبض اور تنگی سے صرف نشست و برخاست کے طور پر ہوتی ہے۔

مجھے اَور بھی افسوس ہوتا ہے کہ جب مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ صرف اس لیے نمازیں پڑھتے ہیں کہ وہ دُنیا میں معتبر اور قابلِ عزت سمجھے جائیں اور پھر اس نماز سے یہ بات اُن کو حاصل بھی ہو جاتی ہے یعنی وہ نمازی پرہیزگار کہلاتے ہیں پھر کیوں ان کو یہ کہا جانے والا غم نہیں لگتا کہ جب جھُوٹ موٹ اور بے دلی کی نماز سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے تو کیوں ایک سچے عابد بننے سے اُن کو عزّت نہ ملے گی اور کیسی عزّت ملے گی۔

غرض مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگ نمازوں میں غافل اور سُست اسی لیے ہوتے ہیں کہ اُن کو اس لذّت اور سُرور سے اطلاع نہیں جو اللہ تعالیٰ نے نماز کے اندر رکھا ہے اور بڑی بھاری وجہ کسل کی یہی ہے۔ پھر شہروں اور گاؤں میں تو اَور بھی سُستی اور غفلت ہوتی ہے۔ سو پچاسواں حصّہ بھی تو پوری مستعدی اور سچی محبت سے اپنے مولا حقیقی کے حضور سر نہیں جُھکاتے۔ پھر سوال یہی ہوتا ہے کہ کیوں اُن کو اس لذّت کی اطلاع نہیں اور نہ کبھی اس مزے کو انہوں نے چکھا۔ اَور مذاہب میں ایسے احکام نہیں ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں اور مؤذن اذان دے دیتا ہے۔ پھر وہ سُننا بھی نہیں چاہتے۔ گویا اُن کے دل دُکھتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ہی قابلِ رحم ہیں۔ بعض لوگ یہاں بھی ایسے ہیں کہ ان کی دوکانیں دیکھو تو مسجد کے نیچے ہیں مگر کبھی جا کر کھڑے بھی تو نہیں ہوتے۔

پس مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ سے نہایت سوز اور ایک جوش کے ساتھ یہ دُعا مانگنی چاہیئے کہ جس طرح اَور پھلوں اور اشیاء کی طرح طرح کی لذّتیں عطا کی ہیں نماز اور عبادت کا بھی ایک بار مزا چکھا دے کھایا ہوا یاد رہتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص کسی خوبصورت کو ایک سُرور کے ساتھ دیکھتا ہے تو وہ اُسے خوب یاد رہتا ہے اور پھر اگر کسی بدشکل اور مکروہ ہیئت کو دیکھتا ہے تو اس کی ساری حالت اس کے بالمقابل مجسّم ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی تعلق نہ ہو تو کچھ یاد نہیں رہتا۔ اسی طرح بے نمازوں کے نزدیک نماز ایک تاوان ہے کہ ناحق صبح اُٹھ کر سردی میں وضو کر کے خوابِ راحت چھوڑ کر اور کئی قسم کی آسائشوں کو چھوڑ کر پڑھنی پڑتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اُسے بیزاری ہے وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لذت اور راحت سے جو نماز میں ہے اس کو اطلاع نہیں ہے۔ پھر نماز میں لذت کیونکر حاصل ہو۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ ایک شرابی اور نشہ باز انسان کو جب سرور نہیں آتا تو وہ پَے در پَے پیالے پیتا جاتا ہے یہانتک کہ اس کو ایک قسم کا نشہ آجاتا ہے۔ دانشمند اور زیرک انسان اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور وہ یہ کہ نماز پر دَوام کرے اور پڑھتا جاوے یہانتک کہ اس کو سُرور آجاوے اور جیسے شرابی کے ذہن میں ایک لذت ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا اس کا مقصود بالذات ہوتا ہے اسی طرح سے ذہن میں اور ساری طاقتوں کا رجحان نماز میں اسی سرور کو حاصل کرنا ہو اور پھر ایک خلوص اور جوش کے ساتھ کم از کم اس نشہ باز کے اضطراب اور قلق و کرب کی مانند ہی ایک دُعا پیدا ہو کر وہ لذت حاصل ہو تو مَیں کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ یقیناً یقیناً وہ لذت حاصل ہو جائے گی۔ پھر نماز پڑھتے وقت ان مفاد کا حاصل کرنا بھی ملحوظ ہو جو اُس سے ہوتے ہیں اور احسان پیش نظر رہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ھود: ۱۱۵) نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ پس ان حسنات کو اور لذات کو دل میں رکھ کر دُعا کرے کہ وہ نماز جو صدیقوں اور محسنوں کی ہے وہ نصیب کرے۔

یہ جو فرمایا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ یعنی نیکیاں یا نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے یا دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ نماز فواحش اور برائیوں سے بچاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود نماز پڑھنے کے پھر بدیاں کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں مگر نہ روح اور راستی کے ساتھ۔ وہ صرف رسم اور عادت کے طور پر ٹکریں مارتے ہیں۔ اُن کی رُوح مُردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام حسنات نہیں رکھا اور یہاں جو حسنات کا لفظ رکھا اور الصلوٰۃ کا لفظ نہیں رکھا باوجودیکہ معنی وہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تا نماز کی خوبی اور حُسن و جمال کی طرف اشارہ کرے کہ وہ نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے جو اپنے اندر ایک سچائی کی رُوح رکھتی ہے اور فیض کی تاثیر اس میں موجود ہے وہ نماز یقیناً یقیناً بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہے۔ نماز نشست و برخاست کا نام نہیں۔ نماز کا مغز اور رُوح وہ دُعا ہے جو ایک لذت اور سُرور اپنے اندر رکھتی ہے۔ ارکانِ نماز

دراصل رُوحانی نشست و برخاست کے اظلال ہیں۔

انسان کو خدائے تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا ہے اور قیام بھی آدابِ خدمتگاران میں سے ہے۔ رکوع جو دوسرا حصّہ ہے بتلاتا ہے کہ گویا طیاری ہے کہ وہ تعمیلِ حکم کے لیے کسقدر گردن جھکاتا ہے۔ اور سجدہ کمال ادب اور کمال تذلّل اور نیستی کو جو عبادت کا مقصود ہے ظاہر کرتا ہے۔ یہ آداب اور طرق ہیں جو خدائے تعالیٰ نے بطور یادداشت کے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جسم کو باطنی طریق سے حصّہ دینے کی خاطر اُن کو مقرر کیا ہے۔ علاوہ ازیں باطنی طریق کے اثبات کی خاطر ایک ظاہری طریق بھی رکھدیا ہے۔ اب اگر ظاہری طریق میں (جو اندرونی اور باطنی طریق کا ایک عکس ہے) صرف نقال کی طرح نقلیں اُتاری جاویں اور اُسے ایک بارگراں سمجھ کر اُتار پھینکنے کی کوشش کی جاوے تو تم ہی بتلاؤ اس میں کیا لذّت اور حظ آسکتا ہے۔ اور جب تک لذّت اور سرور نہ آئے اُس کی حقیقت کیونکر متحقق ہوگی اور یہ اس وقت ہوگا جبکہ رُوح بھی ہمہ نیستی اور تذلّل تام ہو کر آستانہ الوہیّت پر گرے اور جو زبان بولتی ہے روح بھی بولے۔ اس وقت ایک سُرور اور نُور اور تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔

مَیں اس کو اَور کھول کر کہنا چاہتا ہوں کہ انسان جس قدر مراتب طے کر کے انسان ہوتا ہے۔ یعنی کہاں نُطفہ بلکہ اس سے بھی پہلے نُطفہ کے اجزاء یعنی مختلف قسم کی اغذیہ اور اُن کی ساخت اور بناوٹ اور پھر نُطفہ کے بعد مختلف مدارج کے بعد بچّہ پھر جوان، بوڑھا۔ غرض ان تمام عالموں میں جو اس پر مختلف اوقات میں گذرے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا معترف ہو اور وہ نقشہ ہر آن اس کے ذہن میں کھچا رہے تو بھی وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ ربُوبیت کے مقابل میں اپنی عبودیت کو ڈال دے۔ غرض مدعا یہ ہے کہ نماز میں لذّت اور سُرور بھی عبودیت اور ربوبیت کے ایک تعلّق سے پیدا ہوتا ہے جب تک اپنے آپ کو عدمِ محض یا مشابہ بالعدم قرار دے کر جو ربُوبیت کا ذاتی تقاضا ہے نہ ڈال دے اس کا فیضان اور پرتَو اس پر نہیں پڑتا۔ اور اگر ایسا ہو تو پھر اعلیٰ درجہ کی لذّت حاصل ہوتی ہے جس سے بڑھ کر کوئی حظ نہیں ہے اس مقام پر انسان کی رُوح جب ہمہ نیستی ہو جاتی ہے تو وہ خدا کی طرف ایک چشمہ کی طرح بہتی ہے اور ماسوی اللہ سے اُسے انقطاع ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدائے تعالیٰ کی محبّت اس پر گرتی ہے۔ اس اتصال کے وقت ان دو جوشوں سے جو اوپر کی طرف سے ربوبیت کا جوش اور نیچے کی طرف سے عبودیت کا جوش ہوتا ہے۔ ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام صلوٰۃ ہے جو سیئات کو بھسم کر جاتی اور اپنی جگہ ایک نُور اور چمک چھوڑ دیتی ہے جو سالک کو راستے کے خطرات اور مشکلات کے وقت ایک منور شمع کا کام دیتی ہے اور ہر قسم کے خس و خاشاک اور ٹھوکر کے پتھروں اور خار و خس سے جو اس کی راہ میں ہوتے ہیں آگاہ کر کے بچاتی ہے اور یہی وہ حالت ہے جبکہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت: ۴۶) کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کیونکہ اُس کے ہاتھ میں نہیں نہیں اُس کے شمعدانِ دل میں ایک

روشن چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے اور یہ درجہ کامل تذلل کامل نیستی اور فروتنی اور پوری اطاعت سے حاصل ہوتا ہے ۔ پھر گناہ کا خیال اُسے آ کیونکر سکتا ہے اور انکار اس میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا ۔ فحشاء کی طرف اس کی نظر اُٹھ ہی نہیں سکتی ۔ غرض اسے ایسی لذّت ایسا سرور حاصل ہوتا ہے کہ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اُسے کیونکر بیان کروں ۔

پھر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ نماز جو اپنے اصلی معنوں میں نماز ہے دُعا سے حاصل ہوتی ہے غیر اللہ سے سوال کرنا مومنانہ غیرت کے صریح اور سخت مخالف ہے ۔ کیونکہ یہ مرتبہ دعا کا اللہ ہی کے لیے ہے جب تک انسان پُورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اسی سے نہ مانگے ۔ سچ سمجھو کہ حقیقی طور پر وہ سچا مومن اور سچا مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ۔ اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں ۔ جس طرح پر ایک بڑا انجن بہت سی کلوں کو چلاتا ہے ۔ پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت و سکون تک کو اسی انجن کی طاقت عظمیٰ کے ماتحت نہ کر لیوے وہ کیونکر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا قائل ہو سکتا ہے ؟ اور اپنے آپ کو اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (الانعام : ۸۰) کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے ؟ جیسے مُنہ سے کہتا ہے دل سے بھی اُدھر کی طرف متوجہ ہو تو لاریب وہ مسلم ہے ۔ وہ مومن اور حنیف ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اور ادھر بھی جُھکتا ہے وہ یاد رکھے کہ بڑا ہی بدقسمت اور محروم ہے کیونکہ اس پر وہ وقت آ جانے والا ہے کہ وہ زبانی اور نمائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف نہ جُھک سکے ۔ ترکِ نماز کی عادت اور کسل کی ایک وجہ یہ ہے کیونکہ جب انسان غیر اللہ کی طرف جُھکتا ہے تو رُوح اور دل اس کی طرف جُھکتا ہے اور رُوح اور دل کی طاقتیں بھی (اس درخت کی طرح جس کی شاخیں ابتداءً ایک طرف کر دی جائیں اور پرورش پالیں) ادھر ہی جُھک جاتی ہیں اور خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک سختی اور تشدد اس کے دل میں پیدا ہو کر اُسے منجمد اور پتھر بنا دیتا ہے ۔ جیسے وہ شاخیں پھر دوسری طرف مُڑ نہیں سکتیں ۔ اسی طرح پر وہ دل اور رُوح دن بدن خدائے تعالیٰ سے دُور ہوتے جاتے ہیں ۔ پس یہ بڑی خطرناک اور دل کو کپکپا دینے والی بات ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے سے سوال کرے ۔ اسی لیے نماز کا التزام اور پابندی بڑی ضروری چیز ہے تاکہ اوّلاً وہ ایک عادت راسخہ کی طرح قائم ہو اور رجوع الی اللہ کا خیال ہو ۔ پھر رفتہ رفتہ وہ وقت آ جاتا ہے کہ انقطاعِ کلّی کی حالت میں انسان ایک نُور اور ایک لذّت کا وارث ہو جاتا ہے ۔

مَیں اس امر کو پھر تاکید سے کہتا ہوں ۔ افسوس ہے مجھے وہ لفظ نہیں ملتے جس میں مَیں غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے کی بُرائیاں بیان کر سکوں ۔ لوگوں کے پاس جا کر منت و خوشامد کرتے ہیں ۔ یہ بات خدائے تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لاتی ہے (کیونکہ یہ تو لوگوں کی نماز ہے) پس وہ اس سے ہٹتا اور اُسے دُور پھینک دیتا ہے ۔

مَیں موٹے الفاظ میں اس کو بیان کرتا ہوں گو یہ امر اس طرح پر نہیں ہے مگر فوراً سمجھ میں آسکتا ہے کہ جیسے ایک مردِ غیور کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ وہ اپنی بیوی کو کسی غیر کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہوئے دیکھ سکے اور جس طرح پر وہ مرد ایسی حالت میں اس نابکار عورت کو واجب القتل سمجھتا بلکہ بسا اوقات ایسی وارداتیں ہو جاتی ہیں ایسا ہی جوش اور غیرت الوہیت کی ہے۔ جب عبُودیت اور دُعا خاص اسی ذات کے مدمقابل ہیں۔ وہ پسند نہیں کرسکتا کہ کسی اَور کو معبود قرار دیا جائے یا پُکارا جائے۔

پس خوب یاد رکھو اور پھر یاد رکھو! کہ غیراللہ کی طرف جُھکنا خدا سے کاٹنا ہے۔ نماز اور توحید کچھ ہی ہو (کیونکہ توحید کے عملی اقرار کا نام ہی نماز ہے) اسی وقت بے برکت اور بے سُود ہوتی ہے جب اس میں نیستی اور تذلّل کی رُوح اور حنیف دل نہ ہو! سُنو وہ دُعا جس کے لیے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن: ۶۱) فرمایا ہے اس کے لیے یہی سچّی رُوح مطلوب ہے اگر اس تضرع اور خشوع میں حقیقت کی رُوح نہیں تو وہ ٹیں ٹیں سے کم نہیں ہے۔

پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسباب کی رعایت ضروری نہیں ہے؟ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ شریعت نے اسباب کو منع نہیں کیا ہے اور سچ پوچھو تو کیا دُعا اسباب نہیں ہے؟ یا اسباب دُعا نہیں؟ تلاشِ اسباب بجائے خود ایک دُعا ہے اور دُعا بجائے خود عظیم الشان اسباب کا چشمہ!!!

انسان کی ظاہری بناوٹ، اس کے دو ہاتھ دو پاؤں کی ساخت ایک دوسرے کی امداد کا رہنما ہے۔ جب یہ نظارہ خود انسان میں موجود ہے پھر کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ وہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدة: ۳) کے معنے سمجھنے میں مشکلات کو دیکھے ہاں مَیں یہ کہتا ہوں کہ تلاشِ اسباب بھی بذریعہ دُعا کرو۔ امدادِ باہمی میں نہیں سمجھتا کہ جب مَیں تمہارے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ کا ایک قائم کردہ سلسلہ اور کامل رہنما سلسلہ دکھاتا ہوں۔ تم اس سے انکار کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اَور بھی صاف کرنے اور وضاحت سے دُنیا پر کھول دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کا ایک سلسلہ دُنیا میں قائم کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا اور قادر ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی قسم کی امداد کی ضرورت ان رسُولوں کو باقی نہ رہنے دے مگر پھر بھی ایک وقت اُن پر آتا ہے کہ وہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا وہ ایک ٹکڑ گدا فقیر کی طرح بولتے ہیں؟ نہیں مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۵۳) کہنے کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ وہ دُنیا کو رعایتِ اسباب سکھانا چاہتے ہیں جو دُعا کا ایک شعبہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ پر ان کو کاملِ ایمان اس کے وعدوں پر پورا یقین ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (المومن: ۵۲) ایک یقینی اور حتمی وعدہ ہے مَیں کہتا ہوں کہ بھلا اگر خدا کسی کے دل میں مدد کا خیال نہ ڈالے تو کوئی کیونکر مدد دے سکتا

ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ حقیقی معاون وناصر وہی پاک ذات ہے جس کی شان ہے نِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ دُنیا اور دنیا کی مددیں ان لوگوں کے سامنے کالمیّت ہوتی ہیں اور مُردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔ لیکن دُنیا کو دُعا کا ایک موٹا طریق بتلانے کے لیے وہ یہ راہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ وہ حقیقت میں اپنے کاروبار کا متولی خدا تعالیٰ ہی کو جانتے ہیں اور یہ بات بالکل سچ ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف: ۱۹۷) اللہ تعالیٰ ان کو مامور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کاروبار کو دوسروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔ ہمارے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مقامات پر مدد کا وعظ کرتے تھے۔ اسی لیے کہ وہ وقت نصرتِ الٰہی کا تھا۔ اس کو تلاش کرتے تھے کہ وہ کس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

یہ ایک بڑی غور طلب بات ہے۔ دراصل مامور من اللہ لوگوں سے مدد نہیں مانگتا۔ بلکہ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کہہ کر وہ اس نصرتِ الٰہیہ کا استقبال کرنا چاہتا ہے اور ایک فرطِ شوق سے بے قراروں کی طرح اس کی تلاش میں ہوتا ہے۔ نادان اور کوتاہ اندیش لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے مدد مانگتا ہے بلکہ اس طرح پر اس شان میں وہ کسی دل کے لیے جو اس نصرت کا موجب ہوتا ہے ایک برکت اور رحمت کا موجب ہوتا ہے۔ پس مامور من اللہ کی طلبِ امداد کا اصل ستر اور راز یہی ہے جو قیامت تک اسی طرح پر رہے گا۔ اشاعتِ دین میں مامور من اللہ دوسروں سے امداد چاہتے ہیں مگر کیوں؟ اپنے ادائے فرض کیلئے تاکہ دلوں میں خدا تعالیٰ کی عظمت کو قائم کریں ورنہ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ قریب بکفر پہنچ جاتی ہے اگر غیر اللہ کو متولی قرار دیں اور ان نفوسِ قدسیہ سے ایسا امکان محالِ مطلق ہے۔

مَیں نے ابھی کہا ہے کہ توحید تبھی پوری ہوتی ہے کہ کُل مرادوں کا مُعطی اور تمام امراض کا چارہ اور مداوا وہی ذاتِ واحد ہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنے یہی ہیں۔ صوفیوں نے الٰہ کے لفظ سے محبوب، مقصود، معبود مراد لی ہے۔ بے شک اصل اور سچ یوننی ہے جب تک انسان کامل طور پر کاربند نہیں ہوتا۔ اس میں اسلام کی محبت اور عظمت قائم نہیں ہوتی۔

اور پھر مَیں اصل ذکر کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ نماز کی لذت اور سرور اُسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مدار اسی بات پر ہے کہ جب تک بُرے ارادے، ناپاک اور گندے منصوبے بھسم نہ ہوں۔ انانیت اور شیخی دُور ہو کر نیستی اور فروتنی نہ آئے خدا کا سچا بندہ نہیں کہلا سکتا۔ عبودیتِ کاملہ کے سکھانے کے لیے بہترین معلّم اور افضل ترین ذریعہ نماز ہی ہے۔

مَیں تمہیں پھر بتلاتا ہوں کہ اگر خدائے تعالیٰ سے سچّا تعلق، حقیقی ارتباط قائم کرنا چاہتے ہو تو نماز پر کاربند ہو جاؤ اور ایسے کاربند نہ ہو کہ نہ تمہارا جسم نہ تمہاری زبان بلکہ تمہاری رُوح کے ارادے اور جذبے سب کے سب ہمہ تن نماز ہو جائیں۔

عصمتِ انبیاء کا ملنا

عصمتِ انبیاء کا یہی راز ہے یعنی نبی کیوں معصوم ہوتے ہیں؟ تو اس کا یہی جواب ہے کہ وہ استغراقِ محبتِ الٰہی کے باعث معصوم ہوتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ان قوموں کو دیکھتا ہوں جو شرک میں مبتلا ہیں جیسے ہندو جو قسم قسم کے اصنام کی پرستش کرتے ہیں۔ یہانتک کہ انہوں نے عورت اور مرد کے اعضاء مخصوصہ تک کی پرستش بھی جائز کر رکھی ہے اور ایسا ہی وہ لوگ جو ایک انسانی لاش یعنی یسوع مسیح کی پرستش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ مختلف صورتوں سے حصولِ نجات یا مکتی کے قائل ہیں۔ مثلاً اول الذکر یعنی ہندو گنگا اشنان اور تیرتھ یاترا اور ایسے ایسے کفاروں سے گناہ سے موکش چاہتے ہیں اور عیسیٰ پرست عیسائی مسیح کے خون کو اپنے گناہوں کا فدیہ قرار دیتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جب تک نفسِ گناہ موجود ہے وہ بیرونی صفائی اور خارجی معتقدات سے راحت یا اطمینان کا ذریعہ کیونکر پا سکتے ہیں جب تک اندر کی صفائی اور باطنی تطہیر نہیں ہوتی ناممکن ہے کہ انسان سچی پاکیزگی طہارت جو انسان کو نجات سے ملتی ہے پا سکے۔ ہاں اس سے ایک سبق لو جس طرح پر دیکھو بدن کی میل اور بدبو بدوں صفائی کے دُور نہیں ہو سکتی۔ اور جسم کو ان آنے والے خطرناک امراض سے بچا نہیں سکتی اسی طرح پر رُوحانی کدورت اور میل جو دل پر ناپاکیوں اور قسم قسم کی بے باکیوں سے جم جاتی ہے دُور نہیں ہو سکتی جب تک توبہ کا مصفّا اور پاک پانی نہ دھو ڈالے۔ جسمانی سلسلہ میں ایک فلسفہ جس طرح پر موجود ہے اسی طرح پر رُوحانی سلسلہ میں ایک فلسفہ رکھا ہوا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس پر غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں۔

گناہ کی حقیقت اور اس سے بچنے کے ذرائع

میں اس مقام پر یہ بات بھی جتلانا چاہتا ہوں کہ گناہ کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب عام فہم الفاظ میں یہی ہے کہ جب غیر اللہ کی محبت انسانی دل پر مستولی ہوتی ہے تو وہ اس مصفّا آئینہ پر ایک قسم کا زنگ سا پیدا کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بالکل تاریک ہو جاتا ہے اور غیریت اپنا گھر کر کے اسے خدا سے دور ڈال دیتی ہے اور یہی شرک کی جڑ ہے لیکن جس قلب پر اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ کی محبت اپنا قبضہ کرتی ہے وہ غیریت کو جلا کر اسے صرف اپنے لیے منتخب کر لیتی ہے۔ پھر اس میں ایک استقامت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اصل جگہ پر آ جاتی ہے عضو کے ٹوٹنے اور پھر چڑھنے میں جس طرح تکلیف ہوتی ہے، لیکن ٹوٹا ہوا عضو کہیں زیادہ تکلیف دیتا ہے جو اسے صرف کر رہے تو ایک وقت آ جاتا ہے کہ اس کو بالکل کاٹنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سے استقامت کے حصول کے لیے اولاً ابتدائی مدارج اور مراتب پر کسی قدر تکلیف اور مشکلات بھی پیش آتی ہیں، لیکن اس کے حاصل ہونے پر ایک دائمی راحت اور خوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ ارشاد ہو فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ

(ھود : ۱۱۳) تو لکھا ہے کہ آپ کے کوئی سفید بال نہ تھا۔ پھر سفید بال آنے لگے تو آپ نے فرمایا۔ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔

غرض یہ ہے کہ جب تک انسان موت کا احساس نہ کرے وہ نیکیوں کی طرف جُھک نہیں سکتا۔ مَیں نے بتلایا ہے کہ گناہ غیر اللہ کی محبت دل میں پیدا ہونے سے پیدا ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ دل پر غلبہ کر لیتا ہے۔ پس گناہ سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لیے یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ انسان موت کو یاد رکھے اور خدائے تعالیٰ کے عجائباتِ قدرت میں غور کرتا رہے کیونکہ اس سے محبتِ الٰہی اور ایمان بڑھتا ہے اور جب خدائے تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے تو وہ گناہ کو خود جلا کر بھسم کر جاتی ہے۔

دوسرا ذریعہ گناہ سے بچنے کا احساسِ موت ہے۔ اگر انسان موت کو اپنے سامنے رکھے تو وہ ان بدکاریوں اور کوتاہ اندیشیوں سے باز آجائے اور خدا تعالیٰ پر اسے ایک نیا ایمان حاصل ہو اور اپنے سابقہ گناہوں پر توبہ اور نادم ہونے کا موقعہ ملے۔ انسان عاجز کی ہستی کیا ہے؟ صرف ایک دم پر انحصار ہے۔ پھر کیوں وہ آخرت کا فکر نہیں کرتا اور موت سے نہیں ڈرتا اور نفسانی اور حیوانی جذبات کا مطیع اور غلام ہو کر عمر ضائع کر دیتا ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ ہندوؤں کو بھی احساسِ موت ہوا ہے۔ بٹالہ میں کشن چند نام ایک بھنڈاری ستر یا بہتر برس کی عمر کا تھا۔ اس وقت اس نے گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا اور کانشی میں جا کر رہنے لگا اور وہاں ہی مر گیا۔ یہ صرف اس لیے کہ وہاں مرنے سے اس کی موکش ہو گی مگر یہ خیال اس کا باطل تھا۔ لیکن اس سے اتنا تو مفید نتیجہ ہم نکال سکتے ہیں کہ اس نے احساسِ موت کیا اور احساسِ موت انسان کو دُنیا کی لذات میں بالکل منہمک ہونے سے اور خدا سے دُور جا پڑنے سے بچا لیتا ہے۔ یہ بات کہ کانشی میں مرنا مکتی کا باعث ہو گا یہ اسی مخلوق پرستی کا پردہ تھا جو اس کے دل پر پڑا ہوا تھا مگر مجھے تو سخت افسوس ہوتا ہے جبکہ مَیں دیکھتا ہوں کہ مُسلمان ہندوؤں کی طرح بھی احساسِ موت نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو صرف اس ایک حکم نے کہ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے ہی بُوڑھا کر دیا۔ کس قدر احساسِ موت ہے۔ آپ کی یہ حالت کیوں ہوئی صرف اس لیے کہ تا ہم اس سے سبق لیں۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مقدس زندگی کی اس سے بڑھ کر اَور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہادیٔ کامل اور پھر قیامت تک کے لیے اور اس پر کُل دنیا کے لیے مقرر فرمایا۔ مگر آپ کی زندگی کے کل واقعات ایک عملی تعلیمات کا مجموعہ ہیں۔ جس طرح پر قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب ہے اور قانونِ قدرت اس کی فعلی کتاب ہے اسی طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی ایک فعلی کتاب ہے جو گویا قرآنِ کریم کی شرح اور تفسیر ہے۔ میرے تیس سال کی عمر میں ہی سفید بال نکل آئے تھے اور مرزا صاحب مرحوم میرے والد ابھی زندہ ہی تھے۔ سفید بال بھی گویا ایک قسم کا نشانِ موت ہوتا ہے۔ جب

بڑھاپا آتا ہے جس کی نشانی یہی سفید بال ہیں تو انسان سمجھ لیتا ہے کہ مرنے کے دن اب قریب ہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس وقت بھی انسان کو فکر نہیں لگتا۔ مومن تو ایک چڑیا اور جانوروں سے بھی اخلاقِ فاضلہ سیکھ سکتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی کھلی ہوئی کتاب اسکے سامنے ہوتی ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں وہ انسان کے لیے جسمانی اور رُوحانی دونوں قسم کی راحتوں کے سامان ہیں۔

مَیں نے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں پڑھا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ مَیں نے مراقبہ بلّی سے سیکھا ہے۔ اگر انسان نہایت پُرغور نگاہ سے دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ جانور کھلے طور پر خُلق رکھتے ہیں۔ میرے مذہب میں سب چرند پرند ایک خلق ہیں اور انسان اس کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ نفس جامع ہے اور اسی لیے عالم صغیر کہلاتا ہے کہ کُل مخلوقات کے کمال انسان میں یکجائی طور پر جمع ہیں اور کُل انسانوں کے کمالات بہیئت مجموعی ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہیں اور اسی لیے آپ کُل دُنیا کے لیے مبعوث ہوئے اور رحمۃً للعالمین کہلائے۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم : ۵) میں بھی اسی مجموعہ کمالات انسانی کی طرف اشارہ ہے۔ اسی صورت میں عظمتِ اخلاقِ محمدیؐ کی نسبت غور کر سکتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ آپ پر نبوتِ کاملہ کے کمالات ختم ہوئے۔

یہ ایک مسلّم بات ہے کہ کسی چیز کا خاتمہ اس کی علتِ غائی کے اختتام پر ہوتا ہے۔ جیسے کتاب کے جب کُل مطالب بیان ہو جاتے ہیں تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح پر رسالت اور نبوت کی علتِ غائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی اور یہی ختمِ نبوت کے معنے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک سلسلہ ہے جو چلا آیا ہے اور کامل انسان پر آکر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

استقامت ہی انسان کا اسمِ اعظم ہے

مَیں یہ بھی بتلا دینا چاہتا ہوں کہ استقامت جس پر مَیں نے ذکر چھیڑا تھا۔ وہی ہے جس کو صُوفی لوگ اپنی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے معنے بھی فنا ہی کے کرتے ہیں۔ یعنی رُوح کے جوش اور ارادے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہو جائیں اور اپنے جذبات اور نفسانی خواہشیں بالکل مر جائیں۔ بعض انسان جو اللہ تعالیٰ کی خواہش اور ارادے کو اپنے ارادوں اور جوشوں پر مقدم نہیں کرتے وہ اکثر دفعہ دُنیا ہی کے جوشوں اور ارادوں کی ناکامیوں میں اس دُنیا سے اُٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے بھائی صاحب مرحوم مرزا غلام قادر کو مقدمات میں بڑی مصروفیت رہتی تھی اور ان میں وہ یہاں تک منہمک اور محو رہتے تھے کہ آخر ان ناکامیوں نے ان کی صحت پر اثر ڈالا اور وہ انتقال کر گئے اور بھی بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو اپنے ارادوں کو خدا پر مقدم کرتے ہیں۔ آخر کار اس تقدیم ہوائے نفس میں

بھی وہ کامیاب نہیں ہوتے اور بجائے فائدہ کے نقصانِ عظیم اُٹھاتے ہیں۔ اسلام پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ ناکامی صرف جھوٹے ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ جب خدائے تعالیٰ کی طرف سے التفات کم ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوتا ہے جو اس کو نامراد اور ناکام بنا دیتا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کو جو بصیرت رکھتے ہیں جب وہ دنیا کے مقاصد کی طرف اپنے تمام جوش اور ارادے کے ساتھ جھک جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو نامراد کر دیتا ہے۔ لیکن سعیدوں کو وہ پاک اصول پیشِ نظر رہتا ہے جو احساسِ موت کا اُصول ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ جس طرح ماں باپ کا انتقال ہو گیا ہے یا جس طرح برادر کوئی بزرگ خاندان فوت ہو گیا ہے اسی طرح پر مجھ کو ایک دن مرنا ہے اور بعض اوقات اپنی عمر پر خیال کر کے کہ بڑھاپا آگیا اور موت کے دن قریب ہیں خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بعض خاندان ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں عمریں علی العموم ایک خاص مقدار تک مثلاً ۵۰ یا ۶۰ تک پہنچتے ہیں۔ بٹالہ میں میاں صاحب کا جو خاندان ہے اُس کی عمریں بھی علی العموم اسی حد تک پہنچتی ہیں۔ اس طرح پر اپنے خاندان کی عمروں کا اندازہ اور لحاظ بھی انسان کو احساسِ موت کی طرف لے جاتا ہے۔

غرض یہ بات خوب ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ آخر ایک نہ ایک دن دُنیا اور اس کی لذتوں کو چھوڑنا ہے تو پھر کیوں نہ انسان اس وقت سے پہلے ہی ان لذات کے ناجائز طریقِ حصول چھوڑ دے۔ موت نے بڑے بڑے راستبازوں اور مقبولوں کو نہیں چھوڑا اور وہ نوجوانوں یا بڑے سے بڑے دولت مند اور بزرگ کی پروا نہیں کرتی۔ پھر تم کو کیوں چھوڑنے لگی۔ پس دنیا اور اس کی راحتوں کو زندگی کے منجملہ اسباب سے سمجھو اور خدا تعالیٰ کی عبادت کا ذریعہ۔ سعدی نے اس مضمون کو یُوں ادا کیا ہے ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است　　　تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

یہ نہ سمجھو کہ خدا ہم سے خواہ مخواہ خوش ہو جائے اور ہم احتظاظ میں رہیں مگر ایسے اندھوں کو اگر خدا کی طرف سے ہی پروانہ آجائے تو وہ ان لذتوں کو جو جسمانی خواہشوں اور ارادوں کی پیروی میں سمجھتے ہیں نہ چھوڑیں گے اور ان کو اس لذت پر جو ایک مومن کو خدا میں ملتی ہے ترجیح دیں گے۔ خدا تعالیٰ کا پروانہ موجود ہے جس کا نام قرآن شریف ہے جو جنت اور ابدی آرام کا وعدہ دیتا ہے مگر اس کی نعمتوں کے وعدہ پر چنداں لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور عارضی اور خیالی خوشیوں اور راحتوں کی جستجو میں کسقدر تکلیفیں غافل انسان اُٹھاتا اور سختیاں برداشت کرتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی راہ میں ذرا سی مشکل کو دیکھ کر بھی گھبرا اُٹھتا اور بدظنی شروع کر دیتا ہے۔ کاش وہ ان فانی لذتوں کے مقابلہ میں ان اَبدی اور مستقل خوشیوں کا اندازہ کر سکتا۔ ان مشکلات اور تکالیف پر فتح پانے کے لیے ایک کامل اور خطا نہ کرنے والا نسخہ موجود ہے جو کروڑہا راستبازوں کا تجربہ کردہ ہے۔ وہ کیا؟ وہ وہی نسخہ ہے

جس کو نماز کہتے ہیں۔

نماز کیا ہے ؟ ایک قسم کی دُعا ہے جو انسان کو تمام برائیوں اور فواحش سے محفوظ رکھ کر حسنات کا مستحق اور انعامِ الٰہیہ کا مورد بنا دیتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ اسمِ اعظم ہے اللہ تعالیٰ نے تمام صفات کو اس کے تابع رکھا ہے۔ اب ذرا غور کرو۔ نماز کی ابتداء اذان سے شروع ہوتی ہے۔ اذان اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی اللہ کے نام سے شروع ہو کر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ یعنی اللہ ہی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ فخر اسلامی عبادت ہی کو ہے کہ اس میں اوّل اور آخر میں اللہ تعالیٰ ہی مقصود ہے نہ کچھ اَور۔ مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس قسم کی عبادت کسی قوم اور ملّت میں نہیں ہے۔ پس نماز جو دُعا ہے اور جس میں اللہ کو جو خدائے تعالیٰ کا اسمِ اعظم ہے مقدم رکھا ہے۔ ایسا ہی انسان کا اسمِ اعظم استقامت ہے۔

اسمِ اعظم سے مراد یہ ہے کہ جس ذریعہ سے انسانیت کے کمالات حاصل ہوں اللہ تعالیٰ نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اس کی طرف ہی اشارہ فرمایا ہے اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا اَلَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (حٰمٓ السجدۃ: ۳۱) یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کے نیچے آگئے اور اس کے اسمِ اعظم استقامت کے نیچے جب بفضلہٖ بشریت رکھا گیا پھر اس میں اس قسم کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ ملائکہ کا نزول اس پر ہوتا ہے اور کسی قسم کا خوف وحزن ان کو نہیں رہتا مَیں نے کہا ہے کہ استقامت بڑی چیز ہے۔ استقامت سے کیا مراد ہے ؟ ہر ایک چیز جب اپنے عین محل اور مقام پر ہو وہ حکمت اور استقامت سے تعبیر پاتی ہے۔ مثلاً دُوربین کے اجزاء کو اگر جُدا جُدا کر کے ان کو اصل مقامات سے ہٹا کر دوسرے مقام پر رکھ دیں۔ وہ کام نہ دے گی غرض وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَحَلِّہٖ کا نام استقامت ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہو کہ ہیئتِ طبعی کا نام استقامت ہے۔ پس جب تک انسانی بناوٹ کو ٹھیک اسی حالت پر نہ رہنے دیں اور اُسے مستقیم حالت میں نہ رکھیں وہ اپنے اندر کمالات پیدا نہیں کر سکتی۔ دُعا کا طریق یہی ہے کہ دونوں اسمِ اعظم جمع ہوں۔ اور یہ خدا کی طرف جاوے کسی غیر کی طرف رجوع نہ کرے خواہ وہ اس کی ہوا و ہوس ہی کا بُت کیوں نہ ہو۔ جب یہ حالت ہو جائے تو اس وقت اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) کا مزا آجاتا ہے۔

پس مَیں چاہتا ہوں کہ آپ استقامت کے حصول کے لیے مجاہدہ کریں اور ریاضت سے اُسے پائیں کیونکہ وہ انسان کو ایسی حالت پر پہنچا دیتی ہے جہاں اُس کی دُعا قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے۔ اس وقت بہت سے لوگ دُنیا میں موجود ہیں جو عدمِ قبولیتِ دُعا کے شاکی ہیں، لیکن مَیں کہتا ہوں کہ افسوس تو یہ ہے کہ جب تک وہ استقامت پیدا نہ کریں دُعا کی قبولیت کی لذّت کو کیونکر پا سکیں گے۔ قبولیتِ دُعا کے نشان ہم اسی دُنیا میں

پاتے ہیں۔ استقامت کے بعد انسانی دل پر ایک برودت اور سکینت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کسی قسم کی بظاہر ناکامی اور نامرادی پر بھی دل نہیں جلتا۔ لیکن دُعا کی حقیقت سے ناواقف رہنے کی صورت میں ذرا ذرا سی نامرادی بھی آتشِ جہنّم کی ایک لپٹ ہوکر دل پر مستولی ہوجاتی ہے اور گھبرا گھبرا کر بے قرار کئے دیتی ہے۔ اسی کی طرف ہی اشارہ ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (الھمزۃ: ۷،۸) بلکہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تپ بھی نارِ جہنّم کا ایک نمونہ ہے۔

اُمّت میں سلسلۂ مجدّدین

اب یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پا جانا تھا۔ اس لیے ظاہری طور پر ایک نمونہ اور خدا نمائی کا آلہ دُنیا سے اُٹھنا تھا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک آسان راہ رکھ دی کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران: ۳۲) کیونکہ محبوب اللہ مستقیم ہی ہوتا ہے۔ زیغ رکھنے والا کبھی محبوب نہیں بن سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی ازدیاد اور تجدید کے لیے ہر نماز میں دُرود شریف کا پڑھنا ضروری ہوگیا تاکہ اس دُعا کی قبولیت کے لیے استقامت کا ایک ذریعہ ہاتھ آئے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ظلّی طور پر قیامت تک رہتا ہے۔ صُوفی کہتے ہیں کہ مجدّدین کے اسماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہی ہوتے ہیں یعنی ظلّی طور پر وہی نام انکو کسی ایک رنگ میں دیا جاتا ہے۔

شیعہ لوگوں کا یہ خیال کہ ولایت کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ختم ہوگیا محض غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کمالات سلسلۂ نبوت میں رکھے ہیں، مجموعی طور وہ ہادیٔ کامل پر ختم ہوچکے۔ اب ظلّی طور پر ہمیشہ کے لیے مجدّدین کے ذریعہ سے دُنیا پر اپنا پرتوہ ڈالتے رہینگے اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو قیامت تک رکھے گا۔

مَیں پھر کہتا ہوں کہ اس وقت بھی خدائے تعالیٰ نے دُنیا کو محروم نہیں چھوڑا۔ اور ایک سلسلہ قائم کیا ہے۔ ہاں اپنے ہاتھ سے اس نے ایک بندہ کو کھڑا کیا اور وہ وہی ہے جو تم میں بیٹھا ہوا بول رہا ہے۔ اب خدا تعالیٰ کے نزولِ رحمت کا وقت ہے۔ دُعائیں مانگو۔ استقامت چاہو اور دُرود شریف جو حصولِ استقامت کا ایک زبردست ذریعہ ہے بکثرت پڑھو۔ مگر نہ رسم اور عادت کے طور پر بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسن اور احسان کو مدِّنظر رکھ کر اور آپ کے مدارج اور مراتب کی ترقی کے لیے اور آپ کی کامیابیوں کے واسطے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قبولیت دُعا کا شیریں اور لذیذ پھل تم کو ملیگا۔

قبولیتِ دُعا کے ذرائع

قبولیتِ دُعا کے تین ہی ذریعے ہیں۔ اوّل اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران: ۳۲) دوم يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب: ۵۷) تیسرا۔ موہبتِ الٰہی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عام

قانون ہے کہ وہ نفوسِ انبیاء کی طرح دُنیا میں بہت سے نفوسِ قدسیہ ایسے پیدا کرتا ہے جو فطرتاً استقامت رکھتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھو کہ فطرتاً انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فطرتاً ظالم لنفسہٖ دوسرے مقتصد یعنی کچھ نیکی سے بہرہ ور اور کچھ بُرائی سے آلودہ۔ سوم بُرے کاموں سے متنفر اور سابق بالخیرات۔ پس یہ آخری سلسلہ ایسا ہوتا ہے کہ اجتباء اور اصطفاء کے مراتب پر پہنچتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا گروہ اسی پاک سلسلہ میں سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری ہے۔ دُنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں۔

بعض لوگ دُعا کی درخواست کرتے ہیں کہ میرے لیے دُعا کرو۔ مگر افسوس ہے کہ وہ دُعا کرانے کے آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ عنایت علی نے دُعا کی ضرورت سمجھی اور خواجہ علی کو بھیج دیا کہ آپ جاکر دُعا کرائیں۔ کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ جبتک دُعا کرانے والا اپنے اندر ایک صلاحیت اور اتباع کی عادت نہ ڈالے دُعا کارگر نہیں ہوسکتی۔ مریض اگر طبیب کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتا۔ ممکن نہیں کہ فائدہ اُٹھا سکے۔ جیسے مریض کو ضروری ہے کہ استقامت اور استقلال کے ساتھ طبیب کی رائے پر چلے تو فائدہ اُٹھائے گا۔ ایسے ہی دُعا کرانے والے کے لیے آداب اور طریق ہیں۔ تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے دُعا کی خواہش کی۔ بزرگ نے فرمایا کہ دُودھ چاول لاؤ۔ وہ شخص حیران ہوا۔ آخر وہ لایا۔ بزرگ نے دُعا کی اور اس شخص کا کام ہوگیا۔ آخر اسے بتلایا گیا کہ یہ صرف تعلق پیدا کرنے کے لیے تھا۔ ایسا ہی باوا فرید صاحب کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک شخص کا قبالہ گم ہوا اور وہ دُعا کے لیے آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے حلوہ کھلاؤ اور وہ قبالہ حلوائی کی دوکان سے مل گیا۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ جب تک دُعا کرنے والے اور کرانے والے میں ایک تعلق نہ ہو۔ متاثر نہیں ہوتی۔ غرض جب تک اضطرار کی حالت پیدا نہ ہو اور دُعا کرنے والے کا قلق دُعا کرانے والے کا قلق نہ ہو جائے کچھ اثر نہیں کرتی۔ بعض اوقات یہی مصیبت آتی ہے کہ لوگ دُعا کرانے کے آداب سے واقف نہیں ہوتے اور دُعا کا کوئی بیّن فائدہ محسوس نہ کرکے خدائے تعالیٰ پر بدظن ہو جاتے ہیں اور اپنی حالت کو قابلِ رحم بنا لیتے ہیں۔

بالآخر مَیں کہتا ہوں کہ خود دُعا کرو یا دُعا کراؤ۔ پاکیزگی اور طہارت پیدا کرو۔ استقامت چاہو اور توبہ کے ساتھ گر جاؤ کیونکہ یہی استقامت ہے۔ اس وقت دُعا میں قبولیت، نماز میں لذّت پیدا ہوگی۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ[1]

---

[1] (منقول از ٹریکٹ ۵؎ بعنوان "حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط" مرتبہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ)

۲۰؍جنوری ۱۹۰۳ء بروز سہ شنبہ

نشانات کی کثرت

بوقتِ عصر فرمایا:

خدا تعالیٰ کیسے تاڑ تاڑ نشان دکھلا رہا ہے۔ ہم ابھی عدالت میں پیش بھی نہ ہوئے تھے اور نہ کسی کو معلوم تھا کہ انجام کیا ہوگا لیکن مواہب الرحمٰن میں لکھا ہوا تھا کہ کرم دین کا مقدمہ خارج ہو جائے گا اور وہ ۱۵؍ تاریخ سے ہی تقسیم ہو رہی تھی بلکہ بعض ہمارے دوستوں نے کرم دین کو دکھلا بھی دیا کہ تمہارے مقدمہ کی نسبت یہ کچھ لکھا ہے۔

مجلس قبل از عشاء

فرمایا: کھانسی کا زور ہو گیا ہے۔

ایک رؤیاء

اس کے بعد ایک رؤیاء دریائے نیل والی سُنائی جو کہ البدر جلد ۲ میں شائع ہو چکی ہے (وہاں غلطی سے ۱۹؍ تاریخ لکھی ہے اصلاح کر لی جاوے[1])

سراج الاخبار جہلم کی دروغ بیانی

اس کے بعد سراج الاخبار کی دروغ بیانی کا ذکر ہوتا رہا کہ اس نے لکھا ہے کہ جہلم میں جسقدر ہجوم لوگوں کا تھا وہ صرف میاں کرم دین کے لیے تھا۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ

---

[1] البدر جلد ۲ نمبر ا و ۲ صفحہ ۷ مؤرخہ ۲۳-۱۶ جنوری ۱۹۰۳ء میں یہ رؤیاء یوں درج ہے کہ

"میں مصر کے دریائے نیل پر کھڑا ہوں اور میرے ساتھ بہت سے بنی اسرائیل ہیں اور میں اپنے آپ کو موسیٰ سمجھتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھاگے چلے آتے ہیں نظر اُٹھا کر پیچھے دیکھا تو معلوم ہوا کہ فرعون ایک لشکر کثیر کے ساتھ ہمارے تعاقب میں ہے اور اس کے ساتھ بہت سامان مثل گھوڑے و گاڑیوں اور رتھوں کے ہے وہ ہمارے بہت قریب آگیا ہے میرے ساتھی بنی اسرائیل بہت گھبرائے ہوئے ہیں اور اکثر ان میں سے بیدل ہو گئے ہیں اور بلند آواز سے چلاتے ہیں کہ اے موسیٰ ہم پکڑے گئے اور میں نے بلند آواز سے کہا کَلَّآ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ اتنے میں میں بیدار ہو گیا اور زبان پر یہی الفاظ جاری تھے۔"

نوٹ:- الحکم جلد ۷ نمبر ۴ صفحہ ۱۵ پر بھی یہ رؤیاء ۱۹؍جنوری کی ہی بیان شدہ لکھی ہے اور البدر جلد ۲ نمبر ۱-۲ صفحہ ۷ پر بھی ۱۹؍جنوری کی بیان کی گئی ہے لیکن البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۴ میں لکھا ہے کہ یہ رؤیا حضور نے ۲۰؍جنوری کی شام کی مجلس میں بیان فرمائی تھی۔ پہلے غلطی سے ۱۹؍جنوری کی تاریخ لکھی گئی ہے واللہ اعلم بالصواب۔ (مرتب)

جب وہ جہلم میں نالش کرنے گیا تھا تو کس قدر گروہ تھا؟ پھر وہ چندہ وغیرہ جمع کرتا رہا تو کسقدر گروہ تھا اور جہلم میں جو کئی سو آدمیوں نے بیعت کی وہ کس کی کی؟ وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر پگیٹ مفتی محمد صادق صاحب نے ایک انگریزی اخبار سنایا جس میں مسٹر پگیٹ کا حال تھا۔ فرمایا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسے کاذب مدعی پیدا ہوئے تھے جو کہ بہت جلد نابود ہوئے یہی حال اس کا ہوگا اس کے متعلق الہام ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۴ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء)

۱۴؍جنوری ۱۹۰۳ء

(مجلس قبل از عشاء)

حضرت اقدس نے حسب دستور نماز مغرب ادا فرما کر مجلس فرمائی۔ ماسٹر عبد الرحمٰن صاحب نومسلم نے ایک مضمون ایک اشتہار کا حضرت اقدس کو پڑھ کر سنایا جو کہ اُن تمام مسلموں کی طرف سے جو کہ حضرت اقدس کے دستِ مبارک پر مشرف باسلام ہوئے ہندو و آریہ کے سر برآوردہ ممبروں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے استدعا کی ہے کہ اگر اُن کے نزدیک یہ نومسلم جماعت مذہب اسلام کے قبول کرنے میں غلطی پر ہے تو وہ اُن کے پیش کردہ معیار صداقت (جو کہ حضرت اقدس کے مضامین مباہلہ و مقابلہ سے اخذ شدہ ہیں) کی رُو سے حضرت مرزا صاحب سے فیصلہ کر کے اُن کا غلطی پر ہونا ثابت کر دیویں۔

حضرت اقدس نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور کہا کہ

مذہب کی غرض یہی نہیں ہے کہ صرف آئندہ جہان میں خدا تعالیٰ سے فائدہ حاصل ہو بلکہ اس موجودہ جہان میں بھی خدا تعالیٰ سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ ان لوگوں کے صرف دعوے ہی دعوے ہیں کوئی کام توکل اور تقویٰ کا ان سے ثابت نہیں ہوتا۔ مصیبت پڑے تو ہر ایک ناجائز کام کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

مصدّق کے پیچھے نماز خان عجب خان صاحب تحصیلدار نے حضرت اقدس سے استفسار کیا کہ اگر کسی مقام کے لوگ اجنبی ہوں اور ہمیں علم نہ ہو

۱؎ الحکم میں اس ڈائری پر ۲۰؍جنوری ۱۹۰۳ء کی تاریخ درج ہے جو سہو معلوم ہوتا ہے۔ ۲۰ کا ہندسہ بھی پورا روشن نہیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ وہ احمدی جماعت میں ہیں یا نہیں تو اُن کے پیچھے نماز پڑھی جاوے کہ نہ؟ فرمایا:۔
ناواقف امام سے پُوچھ لو اگر وہ مصدق ہو تو نماز اس کے پیچھے پڑھی جاوے ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک الگ جماعت بنانا چاہتا ہے اس لیے اس کے منشاء کی کیوں مخالفت کی جاوے۔ جن لوگوں سے وہ جُدا کرنا چاہتا ہے بار بار اُن میں گھُسنا یہی تو اس کے منشاء کے مخالف ہے۔

ایک احمدی کے فرائض

پھر تحصیلدار صاحب نے پوچھا کہ اپنے مقام پر جاکر ہمارا بڑا کام کیا ہونا چاہیئے؟ فرمایا کہ
ہماری دعوت کو لوگوں کو سُنایا جاوے۔ ہماری تعلیم سے اُن کو واقف کیا جاوے۔ تقویٰ اور توحید اور سچّا اسلام اُن کو سکھایا جاوے۔

رؤیاء کے ذریعہ ہدایت

اس کے بعد تین احباب نے بیعت کی۔ ان میں سے ایک صاحب نے حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ مَیں شریر آدمی تھا اور مجھ کو جھُوٹے دعوے کرنے اور لوگوں کے حقوق چھین لینے اور ضبط کرنے کی خوب مشق تھی اور دوسرے بھی جسقدر معاصی مثل شراب وغیرہ تھے اُن تمام میں مَیں مبتلا تھا۔ چند دن ہوئے کہ مَیں نے ایک ہندو سے اسی طرح ظلم کیا اور اس کے حقوق ضبط کئے۔ رات کو جب میں سویا تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی ہندو میرے ساتھ کلام کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یا تو خدا تعالیٰ تجھے ہدایت کرے یا تجھے اس دُنیا سے اُٹھا لیوے تاکہ ہم لوگ تیرے مظالم سے نجات پاویں۔ اس کے بعد وہ نظر سے غائب ہوگیا اور مَیں نے دیکھا کہ

بلکہ ملتا جلتا سا ہے۔ البدر میں ۲۰ - ۲۱ - ۲۲ سب تاریخوں کی مسلسل الگ الگ ڈائری موجود ہے۔ الحکم میں اگر اس ڈائری کو ۲۰ر کی سمجھا جائے تو ۱۲ر کی کوئی ڈائری وہاں درج نہیں۔ قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ۱۲ر جنوری کی ہی ڈائری ہے جس پر الحکم میں سہو کتابت یا سہو طباعت سے ۲۰ر جنوری کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
بہرحال الحکم کی اس ڈائری میں خاں عجب خانصاحب کا استفسار اور حضرت اقدسؑ کا جواب یوُں درج ہے:۔
"جناب خاں عجب خانصاحب آف زیدہ کے استفسار پر کہ بعض اوقات ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے جو اس سلسلہ سے اجنبی اور ناواقف ہوتے ہیں اُن کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں یا نہیں؟ فرمایا:۔ "اوّل تو کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں لوگ واقف نہ ہوں اور جہاں ایسی صورت ہو کہ لوگ ہم سے اجنبی اور ناواقف ہوں تو اُنکے سامنے اپنے سلسلہ کو پیش کرکے دیکھ لیا اگر تصدیق کریں تو اُن کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو ورنہ ہرگز نہیں اکیلے پڑھ لو خدا تعالیٰ اس وقت چاہتا ہے کہ ایک جماعت تیار کرے پھر جان بُوجھ کر ان لوگوں میں گھُسنا جن سے وہ الگ کرنا چاہتا ہے منشاء الٰہی کی مخالفت ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۱۳ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء)

آسمان سے ایک شعلہ نور کا گرا اور جس مکان میں مَیں تھا اس دروازے کی طرف آیا۔ میں اُٹھ کر اُسے دیکھنے لگا تو دیکھا کہ حضور (حضرت مسیح موعود علیہ السلام) کی شکل کا ایک آدمی ہے۔ مَیں نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ کیا تو نام نہیں جانتا؟ اس کے بعد کہا کہ اب بس کر بہت ہوئی ہے۔ پھر مَیں نے نام پوچھا تو تبلایا کہ

"میرزا غلام احمد قادیانی"

اس کے بعد میری آنکھ کُھل گئی اور مَیں اپنے افعال و کردار پر نادم ہوں اور اب اسی خواب کے ذریعہ آپ کے پاس آیا ہوں۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

تم کو خدا تعالیٰ نے خبردار کیا ہے کہ اپنی حالت بدل دو اور سمجھو کہ ایک دن موت آنی ہے۔ خدا تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ گناہگار کو بلا سزا دئے نہیں چھوڑتا۔ توبہ کرنے سے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ بہت ہی رحم کرنے والا ہے مگر سزا بھی بہت دینے والا ہے۔ تمہاری فطرت میں کوئی نیکی ہوگی ورنہ عام طور پر اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے کہ اس طرح سے خبر دیوے اس لیے اپنی زندگی کو بدلو اور عادتوں کو ٹھیک کرو۔

پھر اس تائب نے عرض کی کہ میرا ایک مقدمہ چودہ صد روپے کا داخل دفتر ہو گیا ہے مگر اس میں میرا حق بہت تھوڑا ہے اب اُسے برآمد کراؤں کہ نہ؟

فرمایا:- مدعا علیہ سے مل کر صُلح کر لو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۴-۳۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء)

---

۲۲ جنوری ۱۹۰۳ء بروز پنجشنبہ

فاسد خیالات کا علاج

(بوقتِ ظہر)

ایک شخص نے حضرت اقدس کی خدمت میں ایک عریضہ پیش کیا جس میں یہ تحریر تھا کہ وہ ہر طرف افلاس سے گھرا ہوا ہے اور ایسے ایسے خیالات اس کے دماغ میں آتے ہیں کہ اُسے موت بہتر معلوم ہوتی ہے اور حضرت اقدسؑ سے اس کا علاج چاہا تھا۔ حضور نے فرمایا کہ

ایسے خیالات کا علاج یہی ہوا کرتا ہے کہ آہستہ آہستہ خوفِ خدا پیدا ہوتا جائے اور کچھ آرام کی صورت

بنتی جاوے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے رفتہ رفتہ ہی دُور ہوں گے۔ جو گندے خیالات بے اختیار دل میں پیدا ہوتے ہیں اُن سے انسان خدا تعالیٰ کی درگاہ میں مؤاخذہ کے قابل نہیں ہوا کرتا بلکہ ایسے شیطانی خیالوں کی پیروی سے پکڑا جاتا ہے[2] وہ خیالات جو اندر ہوتے ہیں وہ انسانی طاقت سے باہر اور مرفوع القلم ہیں۔ بے صبری نہ چاہیئے۔ جلدی سے یہ بات طے نہیں ہوا کرتی۔ وقت آئیگا تو دُور ہو نگی۔ توبہ و استغفار میں لگے رہیں اور اعمال میں اصلاح کریں۔ ایسے خیالات کا تخم زندگی کے کسی گذشتہ حصہ میں بویا جاتا ہے تو پیدا ہوتے ہیں اور جب دُور ہونے لگتے ہیں تو یکدفعہ ہی دُور ہو جاتے ہیں خبر بھی نہیں ہوتی جیسے ہچکی کی بیماری کہ جب جانے لگے تو ایک دم ہی چلی جاتی ہے اور پتہ نہیں لگتا۔ گھبرانے سے اور آفت پیدا ہوتی ہے۔ آرام سے خدا سے مدد مانگے۔ خدا کی بارگاہ کے سب کام آرام ہی سے ہوتے ہیں۔ جلدی وہاں منظور نہیں ہوتی اور نہ کوئی ایسی مرض ہے کہ جس کا علاج نہ ہو۔ ہاں صبر سے لگا رہے اور خدا کی آزمائش نہ کرے۔ جب خدا کی آزمائش کرتا ہے تو خود آزمائش میں پڑتا ہے اور نوبت ہلاکت تک آجاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کا بے نظیر نمونہ

جہلم کے مقدمہ کی نسبت فرمایا:۔

خدا کی طرف سے جو معلوم ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اسباب کیا شئے ہے کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری راہ میں جاوگے تو مُرَاغَمًا كَثِيْرًا پاؤگے صحت نیت سے جو قدم اُٹھاتا ہے خدا اُس کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ انسان اگر بیمار ہو تو اس کی بیماری دُور ہو جاتی ہے۔ صحابہؓ کی نظیر دیکھ لو دراصل صحابہ کرامؓ کے نمونے ایسے ہیں کہ کل انبیاء کی نظیر ہیں۔ خدا کو تو عمل ہی پسند ہیں۔ انہوں نے بکریوں کی طرح اپنی جانیں دیں اور اُن کی مثال ایسی ہے جیسے نبوت کی ایک ہیکل آدم علیہ السلام سے چلی آتی تھی اور سمجھ نہ آتی تھی مگر صحابہ کرامؓ نے چمکا کر دکھلا دی اور بتلا دیا کہ صدق اور وفا اسے کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کا تو حال ہی نہ پوچھو۔ موسیٰؑ کو کسی نے فروخت نہ کیا۔ مگر عیسیٰؑ کو اُن کے حواریوں نے تیس روپے لیکر فروخت کر دیا۔ قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ حواریوں کو عیسیٰؑ علیہ السلام کی صداقت پر شک تھا۔ جبھی تو مائدہ مانگا اور کہا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا تاکہ تیرا سچا اور جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ مائدہ سے پیشتر اُن کی حالت نَعْلَمُ کی نہ تھی۔ پھر جیسی بے آرامی کی

---

[1] الحکم میں ہے:۔ "فرمایا:۔ ایسے خیالات کا علاج خدا کا خوف ہے جب یہ پیدا ہو جاوے تو پھر آہستہ آہستہ کوئی صورتِ اطمینان نکل آتی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۱۲ مورخہ ۷ رفروری ۱۹۰۳ء)

[2] الحکم میں یہ فقرہ یوں ہے:۔

"گندے خیالات جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اُن سے کوئی مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔ البتہ جب اُن پر عزم کر لیا جاوے تو وہ قابلِ مؤاخذہ ہو جاتے ہیں۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۱۲ مورخہ ۷ رفروری ۱۹۰۳ء)

زندگی انہوں نے بسر کی اس کی نظیر کہیں نہیں پائی جاتی۔ صحابہ کرامؓ کا گروہ عجیب گروہ قابلِ قدر اور قابلِ پیروی گروہ تھا۔ اُن کے دل یقین سے بھر گئے ہوئے تھے۔ جب یقین ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ اوّل مال وغیرہ دینے کو جی چاہتا ہے پھر جب بڑھ جاتا ہے تو صاحبِ یقین خدا کی خاطر جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

نماز مغرب کے بعد مقدمہ بازی کے اوپر ذکر چلا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ
اب اس وقت دُنیا کا یہ حال ہے کہ لوگوں نے خدا کا کوئی خانہ خالی نہیں رکھا۔ گذشتہ کارروائی کا یہ لوگ خیال نہیں کرتے اور نہ تجربہ کرتے ہیں کہ کیا کسی کو خیال تھا کہ مقدمہ جہلم کا یہ نتیجہ ہوگا۔ پھر جس خدا نے قبل از وقت بتلایا اور ہم نے دو صد سے زائد کتب چھاپ کر فیصلہ سے پیشتر شائع کر دیں جس میں ذکر تھا کہ اس مقدمہ میں ہماری فتح ہے وہی خدا اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ ؎

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است ؎ زیرِ آں گنجِ کرم بنہادہ است

خُدا کی معرفت ضروری ہے

ایک اخبار کی نسبت ذکر ہوا کہ مقدمہ کا نتیجہ قبل از وقت شائع کرنا دُور اندیشی پر دلالت نہیں کرتا۔ فرمایا:-

جب یہ لوگ خدا کے قائل نہیں تو الہام کے کب قائل ہوں گے؟ ان لوگوں کو بے عقل بھی نہیں کہنا چاہیئے بلکہ ان میں نورِ ایمان نہیں ہے۔ کیا وہ کسی ایسے مفتری اور کذّاب کی نظیر پیش کر سکتے ہیں کہ اس کی مخالفت پر ناخنوں تک زور لگایا گیا ہو اور ہمیشہ قبل از وقت اپنے افتراء شائع کرتا رہا ہو پھر وہ اپنے وقت پر پورے ہوتے رہے ہوں، بتلاویں تو سہی۔ جس شدّ و مدّ سے ہم نے خبریں قبل از وقت پیش کی ہیں کسی اَور نے بھی کیں ہیں؟ ان لوگوں کے اعمال کا کوئی فائدہ نہیں جب تک خدا پر یقین نہ ہو۔ خدا کی معرفت ضروری ہے۔ کوئی آسمانی امر اُن کے نزدیک عظمت کے قابل نہیں ہے۔ تعجب آتا ہے کہ ایک طرف طاعون کا یہ حال ہے اور ایک طرف دلوں کی یہ سختی۔ کوئی اَور برتن ہو تو انسان اس میں ہاتھ ڈال کر صاف بھی کر لے مگر ان کے دلوں کے برتن جن کے اندر زنگار بھرا ہوا ہے کیسے صاف ہوں۔ عجیب معاملہ ہے جس قدر ہمیں اُن پر حسرت ہوتی ہے اسی قدر اُن کی نفرت اور بغض اور جوش بڑھتا ہے جیسے کوئی آدمی جس کا معدہ بلغم یا صفرا سے بھرا ہوا ہو تو اسے کھانا کھانے سے تنفر ہوتا ہے کہ وہ کھانے کا نام سُننا بھی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کا جی بیزار ہوتا ہے۔ یہی حال ان کا ہے۔ سچی بات کا نام تک نہیں سُن سکتے۔ کس کس کا نام لیں اور کس کس کی شکایت کریں سب ایک ہی ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے جب سے یہ الہام ہوا ہے۔ "دُنیا میں ایک نذیر آیا مگر دُنیا نے اُسے قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے

قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کردیگا" اب اس کا مفہوم کہ زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کرے گا قابلِ غور ہے بیوقوف جانتے نہیں کہ یہ کاروبار مصنوعی کیسے چل سکتا ہے؟ ہمارے دیکھتے ہوئے ہزاروں چل بسے۔ لیکن ان لوگوں کے نزدیک اب سب کچھ جائز ہوگیا ہے۔ کُل خوبیاں جو کہ صادقوں کے تجویز کرتے تھے۔ اب سب کاذبوں کو دیدی ہیں اور ایسے تہیدست ہوئے ہیں کہ کوئی خوبی صادق کی بیان کرہی نہیں سکتے۔

ایک مبشر رؤیاء

بعض متفرق رؤیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتلاء کے دن ہیں۔ رات کو مَیں نے دیکھا کہ ایک بڑا زلزلہ آیا مگر اُس سے کسی عمارت وغیرہ کا نقصان نہیں ہوا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۵-۳۶ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء)

---

۲۳ جنوری ۱۹۰۳ء بروز جمعہ

ہمیں کسی وکیل کی ضرورت نہیں

(بوقت عصر)

ایک عرب کی طرف سے ایک خط حضرتؑ کی خدمت میں آیا جس میں لکھا تھا کہ اگر آپ ایک ہزار روپیہ مجھے بھیجکر اپنا وکیل یہاں مقرر کردیں تو مَیں آپ کے مشن کی اشاعت کرونگا حضرت اقدس نے فرمایا:۔

ان کو لکھ دو ہمیں کسی وکیل کی ضرورت نہیں ایک ہی ہمارا وکیل ہے جو عرصہ بائیس سال سے اشاعت کررہا ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی اَور کی کیا ضرورت ہے اور اُس نے کہہ بھی رکھا ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔

لہ **ایک مبشر رویاء**

(از الحکم) "فرمایا: مَیں نے دیکھا کہ زارِ رُوس کا سونٹا میرے ہاتھ میں آگیا ہے۔ وہ بڑا لمبا اور خوبصورت ہے۔ پھر مَیں نے غور سے دیکھا تو وہ بندوق ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بندوق ہے بلکہ اس میں پوشیدہ نالیاں بھی ہیں گویا بظاہر سونٹا معلوم ہوتا ہے اور وہ بندوق بھی ہے۔

اور پھر دیکھا خوارزم بادشاہ جو بوعلی سینا کے وقت میں تھا اسکی تیر کمان میرے ہاتھ میں ہے۔ بوعلی سینا بھی پاس ہی کھڑا ہے اور اس تیر کمان سے مَیں نے ایک شیر کو بھی شکار کیا۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۴ صفحہ ۱۵ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء)

(مجلس قبل از عشاء)

مغرب کے بعد مجلس ہوئی تو حضرت اقدس نے عجب خانصاحب تحصیلدار سے استفسار فرمایا کہ آپ کی رخصت کس قدر ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ چار ماہ۔ فرمایا:-

آپ کو تو پھر بہت دیر یہاں رہنا چاہیئے تاکہ پُوری واقفیت ہو۔

عجب حیرت ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ یہاں تازہ بتازہ سامان تقویٰ کے جماعت کے واسطے تیار کر رہا ہے۔ اُس طرف (یعنی منکرین کی طرف) اس کا کوئی نشان بھی نہیں ہے یہ لوگ الہام اور تقویٰ سے دُور ہوتے جاتے ہیں اگر اب ان سے پُوچھا جاوے کہ اہلِ حق کی کیا علامت ہے؟ تو ہرگز نہیں بتلا سکتے اور نہ اس بات پر قادر ہو سکتے ہیں کہ صادق اور کاذب کے درمیان کوئی مابہ الامتیاز کریں۔ ہماری مخالفت میں یہ حالت ہے کہ جو کچھ صادق کے لیے خدا نے مقرر کیا تھا۔ اب اُن کے نزدیک گویا کاذب کو دیدیا گیا ہے جس قدر نکتہ چینیاں بیان کرتے ہیں وہ تمام پیغمبروں پر صادق آتی ہیں۔ کم تر تقویٰ اُن کے لیے یہ تھا کہ خاموش رہتے۔ اگر ہم کاذب ہوتے تو رفتہ رفتہ خود تباہ ہوجاتے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ[1] یہاں علم سے مراد یقین ہے۔ اب ان کی وہی مثال ہے۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ (الاعراف: ۱۸۰)

○ مقدمہ جہلم پر بعض خلاف واقعہ باتیں اخبارات نے لکھی تھیں ان پر فرمایا کہ اس شور وغوغا کا جواب بجز خاموشی کے اَور کیا ہے۔ اُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ اس کے بعد ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ میرے باپ اور قوم کیواسطے دُعا کی جاوے۔ حضرت اقدس نے اُسی وقت دست مبارک اُٹھا کر دُعا کی اور کل حاضرین مجلس بھی شریک ہوئے۔

○ حضرت کی خدمت میں ایک شخص کی شکایت ہوئی کہ دعویٰ تو بیعت کا کرتا ہے مگر اس کی زبان سے بعض ایسے کلمات نکلتے ہیں جس سے کوئی خصوصیت حضور کے دعاوی کی تصدیق کی معلوم نہیں ہوتی۔ فرمایا:-

ایسے مشکوک الحال آدمی کا رکھنا اچھا نہیں۔

---

[1] الحکم میں اس آیت کی تشریح بزبان فارسی یہ لکھی ہے:-

مُراد از علم یقین است۔ ظنون را علم نے گویند۔ ایناں اتباعِ ظن میکنند۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۞ (یونس: ۳۷) (الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۱۴ مورخہ ۷ رفروری ۱۹۰۳ء)

○ مگر جب اس نے معذرت کی اور کہا کہ یہ امر غلطی سے ایسا سمجھا گیا ہے تو فرمایا:-
ایسی باتوں سے انسان بیعت سے خارج ہو جاتا ہے ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے اور اُسے معاف کر دیا۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۶ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء)

---

۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء بروز شنبہ

(مجلس قبل از عشاء)

○ فرمایا۔ اب بارش ہونے کی وجہ سے گرد و غبار کم ہو گیا ہے ایک دو دن ذرا باہر ہو آویں۔ (یعنی سیر کو جایا کریں)

○ کرم دین کے مقدمہ کے حالات پر فرمایا:-
زمینی سلطنت تو صرف آسمانی سلطنت کے اظلال و آثار ہیں بغیر آسمان کے یہ سلطنت کیا کر سکتی ہے۔ انسان بھی کیا عجیب شئے ہے اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق و وفا میں ترقی کرے تو نورٌ علیٰ نُور۔ ورنہ اگر ظُلمت میں گرے تو اس درجہ تک گرتا ہے کہ کوئی حصہ تقویٰ کا اس کے قول و فعل و اخلاق میں باقی نہیں رہتا سب ظُلمت ہی ظُلمت ہو جاتا ہے۔

فرمایا:-
○ آج ایک کشف میں دکھایا گیا تَفْصِیْلُ مَا صَنَعَ اللّٰهُ فِیْ هٰذَا الْبَاْسِ بَعْدَ مَا اَشَعْتُهٗ فِی النَّاسِ۔ اس کے بعد الہامی صورت ہو گئی اور زبان پر یہی جاری تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ کے متعلق جو قبل از وقت پیشگوئی کے رنگ میں بتایا گیا تھا اب اس کی تفصیل ہو گی۔

○ فرمایا کہ۔
جہلم سے واپسی پر یہ الہام ہوا تھا۔ اَفَارِنِیْنُ اٰیَاتٍ

ثناء اللہ کے ذکر پر فرمایا کہ
اگر اس کی نیت نیک ہوتی تو ہمارا پیش کردہ طریق ضرور قبول کرتا۔ ہماری نیک نیتی تھی کہ ہم نے اس کے لیے ایسی راہ تجویز کی کہ امن قائم رہے۔ حق ظاہر ہو جاوے۔ لوگوں میں اشتعال اور فساد نہ ہو۔ عوام الناس کو فائدہ بھی پہنچ جاوے۔ اگر اُس کے دل میں تقویٰ ہوتا تو ضرور مان لیتا۔ اور ہم نے عام اجازت دی تھی کہ ہر گھنٹے کے بعد

پھر اپنے شکوک وشبہات پیش کر دیوے خواہ اس طرح ایک ماہ تک کرتا رہتا۔ اگر اس طرح نیک نیتی سے کوئی اپنی تشفی چاہے تو ہم اُسے چھ ماہ تک اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ اس کا سب بوجھ برداشت کر سکتے ہیں مگر ان لوگوں کی نیت درست نہیں ہوتی اس لیے راضی نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں مطلق نہیں۔ دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔

مردم شماری میں خلافِ واقعہ رپورٹ

مولوی عبدالکریم صاحب نے بیان کیا کہ سول ملٹری گزٹ میں چونکہ حسب دستور مردم شماری پر ریمارک لکھا جا رہا ہے انہوں نے اس غلطی کو شائع کر دیا ہے کہ احمدیہ فرقہ کا بانی مرزا غلام احمد ہے اس نے اوّل ابتدا چوڑھوں سے کی۔ پھر ترقی کرتے کرتے اعلیٰ طبقہ کے آدمی اس کے پَیرو ہو گئے حضرت اقدس نے فرمایا:۔

اس کی بہت جلد تردید ہونی چاہیئے یہ تو ہماری عزت پر سخت حملہ کیا گیا ہے چنانچہ اسی وقت حکم صادر ہوا کہ:

ایک خط جلد تر انگریزی زبان میں چھاپ کر گورنمنٹ اور مردم شماری کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس بھیجا جاوے تاکہ اس غلطی کا ازالہ ہو اور لکھا جاوے کہ گورنمنٹ کو معلوم ہوگا کہ چوڑھے ایک جرائم پیشہ قوم ہے اُن سے ہمارا کبھی بھی تعلق نہیں ہوا۔ ایک شخص نامی مرزا امام دین قادیان میں ہے جس سے ہماری تیس برس سے عداوت چلی آتی ہے اور کوئی میل ملاپ اس کا اور ہمارا نہیں ہے۔ اس کا تعلق چوڑھوں سے رہا اور اب بھی ہے۔ اس کی عادات اور چال چلن کو ہم پر تھاپ دینا سخت درجہ کی دلآزاری ہماری اور ہماری جماعت کی ہے اور یہ عزت پر سخت حملہ ہے اور بڑی مکروہ کارروائی ہے جو کہ سرزد ہوئی ہے اور چوڑھے تو درکنار ہمیں تو ایسے لوگوں سے بھی تعلق نہیں ہے جو کہ ادنیٰ درجہ کے مسلمان اور رذیل صفات رکھتے ہیں۔ ہماری جماعت میں عمدہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک چال چلن کے لوگ ہیں اور وہ سب حسنہ صفات سے متصف ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو ہم ساتھ رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ صاحب ضلع گورداسپور[1] سے اس امر کی تحقیقات کرے اور عدل سے کام لیکر اس آلودگی کو ہم سے دُور کرے۔ ہم خود امام دین کو اسی لیے نفرت سے دیکھتے ہیں کہ اس کا ایسی قوم سے تعلق ہے۔ پنجاب میں یہ مسلّم امر ہے کہ جس شخص کے زیادہ تر تعلقات چوڑھوں سے ہوں اس کا چال چلن اچھا نہیں ہوا کرتا۔ اس گورنمنٹ کا فرض ہے کہ اس غلطی کا ازالہ کرے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۶-۳۷ مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۰۳ء)

---

[1] مُراد ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع گورداسپور (مُرتب)

۲۵؍جنوری ۱۹۰۳ء بروز یک شنبہ

(مجلس قبل از عشاء)

آپ نے یہ تجویز کی کہ

بیعت کا رجسٹر بالکل اطمینان کی صورت میں نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے اب آئندہ اس کے فارم چھپوا کر ایسی طرح سے رکھا جاوے کہ جب چاہیں فوراً تعداد مِل جاوے اور اپنی جماعت کی تعداد معلوم کرنے کے واسطے مردم شماری کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اگر سب بیعت کنندگان کے نام محفوظ ہوں تو اُن کو ضروری ضروری باتیں پہنچائی جا سکتی ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۷ مورخہ ۲۰؍فروری ۱۹۰۳ء)

۲۶؍جنوری ۱۹۰۳ء بروز دوشنبہ

(بوقت ظہر)

جب نماز کے لیے حضور تشریف لائے تو مولوی محمد احسن صاحب امروہی کو فرمایا کہ

مَیں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ آپ میرے سامنے جائفل اور ایک گانٹھ نہیں معلوم سپاری کی یا سونٹھ کی پیش کر کے کہتے ہیں کہ یہ کھانسی کا علاج ہے۔ اس کے دیکھنے کے بعد مجھے دو گھنٹے تک کھانسی سے بالکل آرام رہا حالانکہ اس سے پیشتر مجھے کھانسی دم نہ لینے دیتی تھی۔

مولوی عبدالکریم صاحب نے بیان کیا کہ رات کو مَیں نے خواب دیکھا۔ کہ سلطان احمد (حضور کے لڑکے) آئے ہوئے ہیں۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

میرے گھر میں ایک ایسی ہی خواب آئی تھی اس کی وہی تعبیر بتلائی جو آپ نے سمجھی یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نشان ظاہر ہوگا۔ سُلطان سے مراد براہین اور نشان ہوا کرتا ہے۔

(بوقت عصر)

حضرت اقدس نے تھوڑی دیر مجلس کی اور ثناء اللہ کے قادیان میں آنے کے متعلق ذکر ہوتا رہا۔

آپ نے فرمایا کہ

ہم نے تو اُسے بہت وسعت دی تھی جس قدر چاہتا ہر ہر گھنٹہ کے بعد تین چار سطریں لکھ کر پیش کیا کرتا اور اگر اُسے بیان کرنے کی نوبت دی جاتی تو بھی اس کی شامت تھی کہ اُسے بہرحال جھوٹ سے کام لینا پڑتا۔

اخبار والوں اور عوام الناس کی شرارتوں اور خلاف واقعہ بیانات کی نسبت فرمایا کہ:۔

اب ہماری جماعت کو چُپ ہی رہنا چاہیئے۔ جواب کچھ نہ دیں۔ خدا تعالیٰ ہی ان لوگوں سے سمجھے گا۔ تعجب ہے کہ ثناء اللہ نے بالکل لیکھرام والی چال اختیار کی ہے جس کی غرض مباحثہ سے اظہارِ حق نہ ہو اس سے مباحثہ کرنا لاحاصل ہے۔ یہ کاروبار اب زمین پر نہیں رہا بلکہ آسمان پر ہے۔

مجلس قبل از عشاء

حضرت اقدس مولوی عبد اللطیف خان صاحب سے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر کرتے رہے اور پھر اپنے چند ایک رؤیاء بتلائے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عدالت کی جو کارروائی جیسے زمین پر جاری ہے ویسا ہی طریق خدا تعالیٰ نے بھی اختیار کیا ہوا ہے منجملہ اُن کے ایک خواب تو وہ بیان کی جس میں سُرخی کے چھینٹے آپ کے لباس مبارک پر پڑے تھے[1]

حالانکہ وہ واقعہ آپ نے خواب میں دیکھا تھا اور ایک خواب آپ نے یہ بیان کیا کہ:

مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی عدالت میں ہوں۔ مَیں منتظر ہوں کہ میرا مقدمہ بھی ہے۔ اتنے میں جواب ملا۔

اِصْبِرْ سَنَفْرُغُ یَا مِرْزَا۔

پھر مَیں ایک دفعہ کیا دیکھتا ہوں کہ مَیں کچہری میں گیا ہوں۔ دیکھا تو اللہ تعالیٰ ایک حاکم کی صورت پر کُرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور ایک طرف ایک سررشتہ دار ہے کہ ہاتھ میں ایک مِسل لیے ہوئے پیش کر رہا ہے۔ حاکم نے مِسل اُٹھا کر کہا کہ مرزا حاضر ہے تو مَیں نے باریک نظر سے دیکھا کہ ایک کُرسی اُس کے ایک طرف خالی پڑی ہوئی معلوم ہوئی۔ اُس نے مجھے کہا کہ اس پر بیٹھو اور مِسل اس کے ہاتھ میں لی ہوئی ہے۔ اتنے میں مَیں بیدار ہو گیا۔

پھر فرمایا کہ

جس طرح میرے کُرتے والی خواب ہے جس پر سُرخ روشنائی کے چھینٹے پڑے تھے ویسے ہی ایک خواب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہے کہ ایک دفعہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ جنّت کے باغوں میں سے ایک سیب آپ نے لیا ہے۔ پھر اسی وقت بیدار ہوئے تو دیکھا کہ وہ سیب ہاتھ میں ہی ہے۔

---

[1] البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۷ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء

ایمان کی حالت

فرمایا کہ

کوئی خدا پر ایمان نہیں رکھتا جب تک کہ وہ خود نشان نہ دیکھے یا اس کی صحبت میں نہ رہے جو کہ ان نشانوں کو دیکھنے والا ہے۔ خدا تعالیٰ اگر چاہے تو اِن سب مخالفوں کو ایک دم میں ہی ہلاک کر دے مگر پھر ہم اور ہمارا سلسلہ بھی ساتھ ہی ختم ہو جاتا۔ یہ مخالفین کا شور و غوغا دراصل عمر کو بڑھاتا ہے۔ خدا تعالیٰ بیشک سب کچھ کریگا اُن کو ذلیل و خوار بھی کریگا لیکن وہ مالک ہے خواہ ایک دم کر دے خواہ رفتہ رفتہ کرے۔ خدا تعالیٰ کی عجیب در عجیب قدرت ہے کہ جب ایک شخص کو اپنی طرف سے بھیجتا ہے تو خود بخود دو گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک شقی اور ایک سعید۔ مگر یہ زمانہ گاہے گاہے وہ زمانہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنا چہرہ دکھانا چاہتا ہے۔ دُوسرا زمانہ شکوک و شبہات کا زمانہ ہوتا ہے [1]

ختمِ نبوت

فرمایا۔ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ (سورۃ الجمعۃ : ۴) کے قائمقام توریت کی ایک آیت تھی جس سے مسیح اسرائیلی کا گروہ مراد تھا اور یہاں اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ سے ہمارا گروہ۔

انجیل کے ذکر پر فرمایا کہ

عیسائی لوگ جو حضرت عیسیٰ کو خاتم نبوت کہتے ہیں اور الہام کا دروازہ بند کرتے ہیں حالانکہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ مسیح کے بعد ایک یُوحنا گذرا ہے جس نے نبوت کی اور اس کے مکاشفات کی ایک الگ کتاب انجیلوں میں ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں۔ ختمِ نبوت پر محی الدین ابن عربی کا یہی مذہب ہے کہ تشریعی نبوت ختم ہو چکی ورنہ اُنکے نزدیک مکالمہ الٰہی اور نبوت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں علماء کو بہت غلطی لگی ہے۔ خود قرآن میں اَلنَّبِیّٖن جس پر ال پڑا ہے موجود ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ جو نبوت نئی شریعت لانے والی تھی وہ اب ختم ہو گئی ہے اگر کوئی نئی شریعت کا دعویٰ کرے تو کافر ہے اور اگر سرے سے مکالمہ الٰہی سے اِنکار کیا جاوے تو پھر اِسلام تو ایک مُردہ مذہب ہوگا اور اس میں اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ کیونکہ مکالمہ کے بعد اَور کوئی ایسی بات نہیں رہتی کہ وہ ہو تو اُسے نبی کہا جائے۔ نبوّت کی علامت مکالمہ ہے لیکن اب اہلِ اسلام نے جو یہ اپنا مذہب قرار دیا

---

[1] الحکم میں یہ عبارت یوں ہے :۔

"فرمایا۔ عجیب قدرتِ الٰہی ہے کہ جب ایک شخص کو مامور کر کے بھیجتا ہے تو خود بخود سعید اور شقی دو گروہ بن جاتے ہیں۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنا چہرہ دکھاتا ہے ورنہ اس سے پہلے جو زمانہ ہوتا ہے وہ شکوک و شبہات کا ہوتا ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۱۴ مورخہ ۷ رفروری ۱۹۰۳ء)

ہے کہ اب مکالمہ کا دروازہ بند ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ خدا کا بڑا قہر اسی اُمت پر ہے[1] اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (سورۃ الفاتحۃ:۶،۷) کی دُعا ایک بڑا دھوکا ہوگی اور اُس کی تعلیم کا کیا فائدہ ہوا گویا یہ عبث تعلیم خدا نے دی۔

نبوت کے واسطے کثرت مکالمہ شرط ہے

ہاں نبوت کے واسطے کثرت مکالمہ شرط ہے یہ نہیں کہ ایک دو فقرے گاہ گاہ الہام ہوئے بلکہ نبوت کے مکالمہ میں ضروری ہے کہ اس کی کیفیت صاف ہو اور کثرت سے ہو۔

نماز عشاء پڑھ کر حضرت نے کھڑے ہو کر مکالمہ نبوت پر تقریر کی اور مثال دے کر فرمایا کہ:۔

جب تک کہ یہ فرق نہ ہو نبی تک کیسے پتہ لگ سکتا ہے۔ اب دیکھو جس کے پاس ایک دو روپے ہوں اور اُدھر بادشاہ ہے کہ اس کے پاس خزانے بھرے ہوئے ہیں تو ان دونوں میں فرق ہوگا کہ نہیں؟ اگرچہ زردار وہ بھی ہے اور بادشاہ بھی ہے مگر جس کے پاس ایک دو روپے ہوں اُسے بادشاہ کوئی نہ کہیگا۔ اسی طرح فرق تو کثرت کا ہے اور کیفیت اور کمیت کا بھی۔ نبوت کا مکالمہ اس قدر اعلیٰ اور اصفیٰ ہوتا ہے کہ ہر ایک بشریت اُسے برداشت نہیں کر سکتی مگر وہ جو اصطفاء کے درجہ تک ہو۔

فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ۔ (سورۃ الجن:۲۷،۲۸) اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی اس طرح سے بار بار ظاہر کرتا ہے کہ اول ایک امر کو خواب میں دکھاتا ہے پھر اُسے کشف میں۔ پھر اس کے متعلق وحی ہوتی ہے اور پھر وحی کی تکرار ہوتی رہتی ہے حتّٰی کہ وہ امر غیب اس کے لیے مشہودہ اور محسوسہ امور میں داخل ہو جاتا ہے اور جس قدر تکرار ایک ملہم کے نفس میں ہوتا ہے اسی قدر تکرار اس کے مکالمہ میں ہوا کرتا ہے اور اصفیٰ اور اجلیٰ مکالمہ انہی لوگوں کا ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں اس لیے تقویٰ اور طہارت کی بہت ضرورت ہے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا (سورۃ فاطر: ۳۳) ہم نے کتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے اُن کو بنایا جن کو ہم نے چُن لیا۔ یعنی ان لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے ایک مکان کی کُل کھڑکیاں کُھلی ہیں کہ کوئی گوشہ تاریکی کا اُس میں نہیں اور روشنی خوب صاف اور کُھلی آ رہی ہے۔ اسی طرح اُنکے مکالمہ کا حال ہوتا ہے کہ اجلیٰ اور بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ جیسے ایک تیل ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے کہ دُھواں اور بدبو بہت

---

[1] الحکم میں یہ عبارت یوں ہے:۔

"مکالمہ الٰہی کا اگر انکار ہو تو پھر اسلام ایک مُردہ مذہب ہوگا۔ اگر یہ دروازہ بھی بند ہے تو اس اُمت پر قہر ہوا۔ خیر الامم نہ ہوئی اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ دُعا بیہودہ ٹھہری تعجب ہے کہ یہود تو یہ اُمت بن جاوے اور مسیح دوسروں سے آوے۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۱۴ مورخہ ۷ رفروری ۱۹۰۳ء)

دیتا ہے دوسرا اُس سے اچھا یہی فرق مکالمہ کی کیفیت اور کثرت اور صفائی میں ہوتا ہے۔ کیا ایک لوٹے کو حق پہنچتا ہے کہ اپنے اندر تھوڑا سا پانی رکھ کر کہے کہ مَیں بھی سمندر ہوں کیونکہ اس میں بھی پانی ہی ہوتا ہے حالانکہ کس قدر فرق ہے سمندر میں جو پانی کی کثرت ہوتی ہے اُسکو لوٹے سے کیا نسبت؟ پھر اس میں موتی سیپ اور ہزارہا قسم کے جانور ہوتے ہیں۔

اگر اس پر اعتراض ہو کہ اَور لوگوں کو کیوں خوابیں آتی ہیں جو کہ سچّی بھی نکلتی ہیں حتیٰ کہ ہندوؤں میں بھی اور فاسق سے فاسق گروہ کنجروں میں بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض اوقات اُن کی خوابیں سچّی نکلی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت کے سلسلہ کی تائید ہو۔ کیونکہ اگر ایسے حواس دُنیا میں نہ ہوتے تو پھر امرِ نبوت مشتبہ ہو جاتا۔ ایک نابینا آفتاب کو کیسے شناخت کر سکتا ہے؟ وہی شناخت کریگا جسے کچھ بینائی ہو چونکہ خدا کو منظور تھا کہ اتمامِ حجت ہو اس لیے یہ خواب کا سلسلہ سب جگہ رکھ دیا ہے تاکہ قبولیت کا مادہ ہر ایک جگہ موجود رہے اور اُن کو انکار نہ کرنے دیوے لیکن جو مادہ نبی کا ہوتا ہے اس کی شان اَور ہوتی ہے اور اُسے موہبت اور بہت سی مَوتوں کے بعد تیار کیا جاتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۴ مورخہ ۲۷ رفروری ۱۹۰۳ء)

---

۲۷ رجنوری ۱۹۰۳ء

(بوقت سیر)

حضرت اقدس نے مخالفین کی نسبت فرمایا کہ

مَیں نے اب ان سے اعراض کر لیا ہے کیونکہ جواب تو اس کے لیے ہوتا ہے جس میں کوئی ذرّہ تقویٰ کا ہو مگر جس حال میں کہ ان کے پاس اب سبّ و شتم ہی ہے تو اب حوالہ بخدا کیا۔ اچھا طریق امن کا ہم نے پیش کیا ہے کہ شرافت سے آکر اپنے شُبہات دُور کرا دیں۔ ہمارے مہمان خانہ میں خواہ چھ ماہ رہیں ہم دعوت دیویں گے مگر جو شخص اوّل سے عزم بالجزم کر کے آتا ہے کہ شرارت سے باز نہ آویگا اُسے ہم کیا کریں۔ میرا ہمیشہ ہی خیال ہوتا ہے کہ کوئی گروہ نیک نیتی سے آوے اور مستفید ہو۔ ازالہ شبہات کی نیت ہو۔ ہار جیت کا خیال نہ ہو۔ نیک نیتی تو عجیب شیئ ہے کہ اسکی فوراً بُو آجاتی ہے اور جب جواب کافی ملے تو نیک نیت تو اسی وقت اُسکی خوشبو پا کر بحث سے دستبردار ہو جاتا ہے۔

اور ہم خاص پیشگوئیوں پر بھی حصر نہیں رکھتے۔ کوئی پہلو اس سلسلہ کا لے لیوے۔ ہم ازالۂ شبہات کر دیویں گے۔ اگر گذشتہ پیشگوئیوں کے پہلو کو نہ لیویں تو خدا تعالیٰ قادر ہے کہ آئندہ اَور نشانات دکھلا دیوے۔

فرمایا کہ :۔

کل جو خواب مولوی محمد احسن صاحب کے دوا بتلانے کی نسبت بیان کیا تھا۔ مَیں نے اُسی کے مطابق رات کو جائفل اور سونٹھ مُنہ میں رکھا۔ اب کھانسی کا اس سے بہت فائدہ معلوم ہوتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۴ مورخہ ۲۷؍ فروری ۱۹۰۳ء)

۲۸؍ جنوری ۱۹۰۳ء

مورخہ ۲۷، ۲۸؍ جنوری کے درمیان جو رات تھی۔ اس میں رات کو ایک بجے حضرت اقدس علیہ السلام مولانا محمد احسن صاحب امروہی کی کوٹھڑی میں تشریف لائے۔ دروازہ بند تھا۔ آپ نے کھٹکھٹایا۔ مولوی صاحب نے لاعلمی سے پُوچھا کہ کون ہے؟ حضرت اقدس نے جواب دیا کہ "مَیں ہوں غلام احمد"[۱] آپ کے دست مبارک میں لالٹین تھی آپ نے اندر داخل ہو کر فرمایا کہ

اس وقت مجھے اوّل ایک کشفی صورت میں خواب کی حالت میں دکھلایا گیا ہے کہ میرے گھر میں (یعنی اُمّ المومنین) کہتے ہیں کہ اگر مَیں فوت ہو جاؤں تو میری تجہیز و تکفین آپ خود اپنے ہاتھ سے کرنا۔ اس کے بعد مجھے ایک بڑا منذر الہام ہوا ہے۔ غَاسِقُ اللّٰہِ۔ مجھے اس کے یہ معنے معلوم ہوتے ہیں کہ جو بچہ میرے ہاں پیدا ہونے والا ہے وہ زندہ نہ رہے گا۔ اس لیے آپ بھی دُعا میں مشغول ہوں اور باقی احباب کو بھی اطلاع دے دیویں کہ دُعاؤں میں مشغول ہوں۔

البدر جلد ۲ نمبر ۱، ۲ مورخہ ۲۳ - ۳۰؍ جنوری ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء۔

الہام غاسق اللّٰہ کی شرح

غَاسِقُ اللّٰہِ الہام کی شرح آپ نے فرمائی اور فرمایا کہ:۔

غاسق عربی میں تاریکی کو کہتے ہیں جو کہ بعد زوال شفق اوّل رات چاند کو ہوتی ہے اور اسی لیے لفظ قمر پر بھی اس کی آخری راتوں میں بولا جاتا ہے جبکہ اس کا نُور جاتا رہتا ہے اور خسوف کی حالت میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے قرآن شریف میں مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (سورۃ الفلق: ۴) کے یہ معنے ہیں مِنْ شَرِّ ظُلْمَۃٍ اِذَا دَخَلَ یعنی ظُلمت کی بُرائی سے جب وہ داخل ہو۔ مَیں نے اس سے پیشتر یہ خیال کیا تھا کہ چونکہ عنقریب گھر میں وضع حمل ہونے والا ہے تو شاید مولود کی وفات پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے مگر بعد میں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس سے مراد ابتلا ہے۔ اجتہادی امور ایسے ہی ہوا کرتے ہیں کہ اوّل خیال کسی اَور طرف

---

[۱] (نوٹ از ایڈیٹر البدر) "اس وقت اس اخلاق نے مولوی صاحب کے دل پر کیا اثر کیا ہوگا اس کا اندازہ ناظرین خود لگالیں"۔

چلا جاتا ہے۔ غرضیکہ اس کے معنے ہوئے کہ خداتعالیٰ کی طرف سے کوئی امر بطور ابتلا کے ہے اور اس سے جماعت کا ابتلا مراد نہیں ہے بلکہ منکرین کا جو کہ جہالت۔ نادانی۔ افتراء سے کام لیتے ہیں۔ آدمؑ سے لے کر آخر تک اللہ تعالےٰ کی یہی عادت ہے کہ دشمنوں کو بھی اُن کے افتراء وغیرہ کے لیے ایک موقعہ دیدیتا ہے چنانچہ بعض وقت کوئی شکست بھی ہوجایا کرتی ہے۔ قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے۔ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (سورۃ ال عمران : ۱۴۱) خداتعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو فرماتا ہے کہ اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو تم نے بھی اپنے مخالفین کا ستیاناس کردیا ہوا ہے۔ اگر ہمارا یہ کاروبار قلم کا نہ ہوتا بلکہ تلوار سے کام لیتے تو آخر ہمیں بھی کوئی نہ کوئی شکست ہونی ہی تھی یہ موقع افتراء کے خداتعالیٰ دشمنوں کو اس لیے دیتا رہتا ہے کہ مقدمہ جلد ختم نہ ہو۔ اور یہ سنت اللہ ہے۔ اب غور سے دیکھا جاوے تو اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل میں فتح تھی مگر دشمن کو فضیلت سے کیا مطلب، اُسے تو موقعہ چاہیئے۔

ادھر آتھم کا مقدمہ ادھر مقابلہ پر لیکھرام کا قتل۔ ان کی مثال ٹھیک ٹھیک اُحد اور بدر کی لڑائی تھی۔ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (سورۃ البقرۃ : ۲۱) منافقوں کا کام ہے مگر یہ لوگ قَامُوْا میں داخل ہیں۔ احتیاط سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ تاریکی جب خدا کی طرف منسوب ہو تو دشمن کی آنکھ میں ابتلاء کا موقع اس سے مراد ہوتا ہے اور اس لیے اس کو غَاسِقُ اللّٰہِ کہتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت اقدس نے گھر کے حالات سنائے کہ

رات کو اُن کو بہت تکلیف تھی۔ آخر خداتعالیٰ نے آرام دیدیا مگر میرا ایمان اور یقین ہے کہ یہ تمام کام دعاؤں نے ہی کیا ہے۔

عورتوں کے لیے یہ ولادت کا وقت ایک پہلو سے موت اور ایک پہلو سے زندگی ہوتی ہے گویا ولادت کے وقت اُن کی اپنی بھی ایک ولادت ہوتی ہے۔

گھر میں بھی رات کو ایک خواب دیکھا کہ بچہ ہوا ہے تو انہوں نے مجھے کہا کہ میری طرف سے بھی نفل پڑھنا اور اپنی طرف سے بھی۔ پھر ڈاکٹرنی کو کہا کہ ذرا اسے پیلو تو اس نے جواب دیا کہ لوں کیسے؟ وہ تو مُردہ ہے تو انہوں نے کہا کہ اچھا پھر مبارک کا قدر قائم رہے گا۔ مَیں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ لڑکی اصل میں مُردہ بدست زندہ ہی ہوا کرتی ہے۔

۞ ۞ ۞

ایک الہام اور ایک خواب

آج صبح کو الہام ہوا۔
سَاُکْرِمُکَ اِکْرَامًا عَجَبًا

اس کے بعد تھوڑی سی غنودگی میں ایک خواب بھی دیکھا کہ ایک چوغہ سنہری بہت خوبصورت ہے۔ مَیں نے کہا کہ عید کے دن پہنوں گا۔ اس الہام میں عجب کا لفظ بتلاتا ہے کہ کوئی نہایت ہی مؤثر بات ہے۔ مَیں نے یہی سمجھا کہ چونکہ رات کو بہت منذر الہام ہوا تھا وہ تو پورا ہو گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس کے بالمقابل بشارت دیتا ہے۔ کیسی رحیم کریم ذات ہے۔

خواب اور انکی تعبیریں

رات مَیں نے ایک اَور خواب بھی دیکھا کہ مَیں جہلم میں ہوں اور سنسار چند صاحب کے کمرے میں ہوتا ہوا آگے کوٹھی کے ایک اَور کمرہ کی طرف جا رہا ہوں۔ رؤیاء کے معاملات میں انسانی عقل بالکل اندھی ہے۔ لڑکی دیکھے تو لڑکا ہوتا ہے۔ اسی لیے معبرّوں نے باب بالعکس کا بھی باندھا ہے۔ ہمارے مخالف تمام باتوں کو ظواہر پر حمل کر لیتے ہیں ورنہ وہ عجیب در عجیب باتوں کو دیکھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص قولنج کی بیماری میں مبتلا تھا اسے خواب میں کسی نے دیکھا کہ وہ مر گیا ہے۔ مَیں نے اس کی تعبیر کی کہ وہ اچھا ہو جاویگا آخر وہ اچھا ہو گیا۔

مقدمات کے ذکر پر فرمایا کہ :۔

حاکم بیچارے کیا کریں وہاں تو خدا پکڑ کر سب کچھ کرواتا ہے اصل میں خدا ہی خدا ہے وہ جب کوئی بات دل میں ڈالتا ہے تو دلوں کو ایسا پکڑتا ہے کہ باز اس طرح چڑیا کو پکڑ نہیں سکتا۔ اصل سلطنت اُسی کی سلطنت ہے کیسے سے کیسا دشمن ہو مگر وہ اس کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ رَبِّ کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُکَ بالکل ٹھیک ہے۔ لوگ ملائکہ سے تعجب کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ سب ملائک ہیں۔ ورنہ لقمہ جو اندر ڈالا جاتا ہے اگر وہ نہ چاہے تو کب ہضم ہو سکتا ہے۔ بغیر کامل تصرّف کے خدا کی خدائی چل سکتی ہی نہیں۔ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (بنی اسرائیل: ۴۵) کے یہی معنے ہیں۔ اسلام اَور ایمان وہی ہے جو اس حد تک پہنچے اور اسی کو چھوڑ چھاڑ کر اب صرف رسم اور عادات رہ گئی ہیں۔ جن کی یہ حالت ہے اُن کو دُعاؤں میں کیا مزا آ سکتا ہے [۱]

عقیدہ وحدت الوجود

جالندھر سے ایک صاحب تشریف لائے ہوئے تھے انہوں نے عرض کی کہ وہاں وجودیوں کا بہت زور ہے حضرت اقدس نے فرمایا کہ :۔

اصل میں ان لوگوں کا اباحتی رنگ ہے۔ دہریوں میں اور ان میں بہت کم فرق ہے اُنکی زندگی بے قیدی کی زندگی ہوتی ہے۔ خدا کے حدود اور فرائض کا بالکل فرق نہیں کرتے، نشہ وغیرہ پیتے ہیں، ناچ رنگ دیکھتے ہیں۔ زنا کو

---

[۱] البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۳ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء

اُصول سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک وجودی میرے پاس آیا اور کہا کہ مَیں خدا ہوں۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا مَیں نے اُسکے ہاتھ پر زور سے چٹکی کاٹی حتی کہ اس کی چیخ نکل گئی تو مَیں نے کہا کہ خدا کو درد بھی ہوا کرتا ہے؟

پھر نووارد صاحب نے بیان کیا کہ وہ کہا کرتے ہیں کہ انسان کو خدا نے اپنی صورت پر بنایا ہے۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

توریت میں یہ ذکر ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی خدا نے چاہا کہ انسان خدا کے اخلاق پر چلے جیسے وہ ہر ایک عیب اور بدی سے پاک ہے یہ بھی پاک ہو۔ جیسے اس میں عدل انصاف اور علم کی صفت ہے وہی اس میں ہو اس لیے اس خلق کو احسن تقویم کہا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (سورۃ التین: ۵) جو انسان خدائی اخلاق اختیار کرتے ہیں وہ اس آیت سے مُراد ہیں اور اگر کُفر کرے تو پھر اسفل سافلین اس کی جگہ ہے۔

وجودیوں سے جب بحث کا اتفاق ہو تو اول اُن سے خدا کی تعریف پوچھنی چاہئیے کہ خدا کسے کہتے ہیں؟ اور اس میں کیا صفات ہیں۔ وہ مقرر کرکے پھر اُن سے کہنا چاہیئے کہ اب ان سب باتوں کا تم اپنے اندر ثبوت دو۔ یہ نہیں کہ جو وہ کہیں وہ سُنتے چلے جاؤ اور اُن کے پیچ میں آجاؤ بلکہ سب سے اول ایک معیار خدائی قائم کرنا چاہیئے بعض ان میں سے کہا کرتے ہیں کہ ابھی ہمیں خدا بننے میں کچھ کسر ہے تو کہنا چاہیئے تم بات نہ کرو جو کامل ہو گذرا ہے اسے پیش کرو۔

یہ ایک ملحد قوم ہے۔ تقویٰ، طہارت۔ صحتِ نیت۔ پابندی احکام بالکل نہیں۔ تلاوت قرآن نہیں کرتے ہمیشہ کافیاں پڑھتے ہیں۔ اسلام پر یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ آج کل جس قدر گدی نشین ہیں وہ تمام قریب قریب اس وجودی مشرب کے ہیں۔ سچّی معرفت اور تقویٰ کے ہرگز طالب نہیں ہیں۔ اسی مذہب میں دو شئے خدا کے بہت مخالف پڑی ہیں۔ ایک تو کمزوری دوسرے ناپاکی۔ یہ دونو خدا میں نہیں ہیں اور سب وجودیوں میں پائی جاتی ہیں۔ لُطف کی بات ہے کہ جب کسی وجودی کو کوئی بیماری سخت مثل قولنج وغیرہ کے ہو تو اس وقت وہ وجودی نہیں ہوا کرتا۔ پھر اچھا ہو جاوے تو یہ خیال آیا کرتا ہے کہ مَیں خدا ہوں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۴۹ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

۲۹؍جنوری ۱۹۰۳ء پنجشنبہ

(بوقت سیر)

فرمایا کہ :۔

جھوٹ جیسا لعنتی کام اَور کوئی نہیں اور پھر خصوصاً وہ جھوٹ جو کہ آبرو عزت وغیرہ پر ہوتا ہے جس پیٹ سے ایسی باتیں نکلا کرتی ہیں اُسے نفس کہتے ہیں۔

دشمن کی آبروداری

اس کے بعد اسی آبرو کے مضمون پر حضرت اقدس نے ایک واقعہ بیان کیا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہر ایک کی آبرو حتّٰی کہ اپنے دشمن کی آبروداری کا بھی کس قدر خیال ہے۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ

قتل کے مقدمہ میں ہمارے ایک مخالف گواہ کی وقعت کو عدالت میں کم کرنے کی نیت سے ہمارے وکیل نے چاہا کہ اس کی ماں کا نام دریافت کرے مگر مَیں نے اسے روکا اور کہا کہ ایسا سوال نہ کرو جس کا جواب وہ مطلق دے ہی نہ سکے اور ایسا داغ ہرگز نہ لگاؤ جس سے اُسے مفر نہ ہو۔حالانکہ ان ہی لوگوں نے میرے پر جھوٹے الزام اُٹھائے جھوٹا مقدمہ بنایا۔افتراء باندھے اور قتل اور قید میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔میری عزت پر کیا کیا حملے کر چکے ہوئے تھے اب بتلاؤ کہ میرے پر کونسا خوف ایسا طاری تھا کہ مَیں نے اپنے وکیل کو ایسا سوال کرنے سے روک دیا۔صرف بات یہ تھی کہ مَیں اس بات پر قائم ہوں کہ کسی پر ایسا حملہ نہ ہو کہ واقعی طور پر اس کے دل کو صدمہ دے اور اسے کوئی راہ مفر کی نہ ہو۔[1]

ایک مخلص خادم نے عرض کی کہ حضور میرا دل تو اب بھی خفا ہوتا ہے کہ یہ سوال کیوں اس پر نہ کیا گیا۔

آپ نے فرمایا کہ "میرے دل نے گوارا نہ کیا" اُس نے پھر کہا کہ یہ سوال ضرور ہونا چاہیئے تھا۔آپ نے فرمایا:۔

خدا نے دل ہی ایسا بنایا ہے تو بتلاؤ مَیں کیا کروں۔

ایک صاحب آمدہ از جالندھر نے عرض کی کہ حضور وہاں شحنہ ہند نے بہت سے آدمیوں کو روک رکھا ہے اس کا کیا علاج کریں؟ فرمایا:۔

صبر کرو ایسا ہی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں لوگ تو آپ کی مذمت کیا کرتے تھے مگر آپ ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ اِن کی مذمت کو کیا کروں میرا نام تو خدا نے اوّل ہی محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھ دیا ہوا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے مجھے بھی الہام کیا جو کہ آج سے بائیس۲۲ برس پیشتر کا براہین میں چھپا ہوا ہے۔

---

[1] الحکم میں یہ مضمون یوں ہے:۔

"حضور نے فرمایا کہ ہم اس امر کو نہایت مکروہ سمجھتے ہیں کہ کسی کی نسبت وہ اعتراض کیا جائے جس کی اصلاح اس کے امکان وقدرت میں نہیں" (الحکم جلد ۷ نمبر ۶ صفحہ ۵ مورخہ ۱۴ ؍فروری ۱۹۰۳ء)

یَحۡمَدُکَ اللّٰہُ[1] یعنی خدا تیری تعریف کرتا ہے۔
جھوٹ ایسی شئے ہے کہ آخر ایک دن آکر انسان اس سے تھک جاتا ہے۔ پھر اگر خدا تعالیٰ توفیق دے تو توبہ کرتا ہے ورنہ اسی طرح نامراد مرجاتا ہے۔

(بوقت ظہر)

پتھری کے اخراج کا نسخہ

تھوڑی دیر مجلس کی۔ بعض وقت مثانہ سے جو کنکر وغیرہ تکلیف دیکر نکلتے ہیں اُن کی نسبت فرمایا کہ
نرلسی ۳ رتی اور وائنم اپی کاک کا استعمال اس کے واسطے بہت مفید ہے اور چاول وغیرہ لیسدار اشیاء کا استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ یہی لیس منجمد ہو کر کنکر بن جاتی ہے۔
پھر فرمایا کہ
میرے والد صاحب کو بھی یہ مرض رہی ہے وہ مصبر کی گولیاں استعمال کیا کرتے تھے۔ بہت مفید ہیں۔ اس میں مصبر۔ سہاگہ۔ بذرالبنج۔ فلفل۔ دار فلفل وغیرہ ادویہ ہوتی ہیں۔

(بوقتِ عصر)

ایک خط کے ذریعہ خبر ملی کہ جہلم میں اب پھر کرم دین کا ارادہ مقدمہ کا ہے اور وہ نگرانی کرنا چاہتا ہے۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ
گھبرانا نہ چاہیئے یہ تو خدا کے عجائبات ہیں ؎

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است ٭ زیر آں گنج کرم بنہادہ است

فرمایا:۔
صبح کو ایک الہام ہوا تھا میرا ارادہ ہوا کہ لکھ لوں۔ پھر حافظہ پر بھروسہ کرکے نہ لکھا۔ آخر وہ ایسا بھولا کہ ہر چند یاد کیا مطلق یاد نہ آیا۔ دراصل یہی بات ہے۔ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۰۷)۔

مجلس قبل از عشاء

جہلم سے مقدمہ کی نقل منگوائی گئی تھی۔ حضرت اقدس سُنتے رہے۔ کسی نے کہا کہ اس پر ہم نالش

---

[1] الحکم میں ہے:۔
یَحۡمَدُکَ اللّٰہُ مِنۡ عَرۡشِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے عرش سے تیری حمد و تعریف کرتا ہے۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۶ صفحہ ۵ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء)

کر سکتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ

ہم نالش نہیں کرتے یہ تو اسرارِ الٰہی ہیں۔ ایک برس سے خدا نے اس مقدمہ کو مختلف پیراؤں میں ظاہر کیا ہے۔ اب کیا معلوم کہ وہ اس کے ذریعہ سے کیا کیا اظہار کریگا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل مقدر خدا کی طرف سے تھا۔

قانون کے ذکر پر فرمایا کہ

واضعانِ قانون نے بڑی دانشمندی سے کام لیا ہے کہ مذہبی امور کو دنیاوی اُمور سے الگ رکھا ہے۔ کیونکہ مذہبی عالم کی باتوں کا دار و مدار تو آخرت کے متعلق ہوتا ہے نہ کہ دنیا کے متعلق۔

مقدمات کے فیصلوں کی نسبت فرمایا کہ

میرا اپنا اُصول یہ ہے کہ بدتر سے بدتر انسان بھی اگر مقدمہ کرے تو اس میں تصرف اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے اس سے فیصلہ لکھواتا ہے۔ انسان پر بھروسہ شرک ہے بلکہ اگر ایک بھیڑیئے کے پاس بھی مقدمہ جاوے تو اس کو خدا سمجھ عطا کر دیگا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۴۹-۵۰ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء بروز جمعہ

(بوقت عصر)

ارشاد فرمایا کہ

جو الہام مجھ کو بھول گیا تھا آج یاد آیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ عِبَادِہٖ یُوَاسِیْکَ۔ یعنی اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ہے اور تیری غمخواری کریگا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۰ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء

(بوقتِ عصر[1])

جہلم سے خبر آئی کہ کرم دین نے حضرت اقدس پر ایک اَور مقدمہ مواھب الرحمٰن کے بعض

---

[1] الحکم میں درج نہیں کہ یہ ڈائری کس وقت کی ہے لیکن "البدر" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عصر کے وقت کی ڈائری ہے۔
(ملاحظہ ہو البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۰ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

الفاظ پر کیا ہے۔ فرمایا:۔

اب یہ ان لوگوں کی طرف سے ابتداء ہے کیا معلوم کہ خدا تعالیٰ ان کے مقابلہ میں کیا کیا تدابیر اختیار کریگا۔ یہ استغاثہ ہم پر نہیں اللہ تعالیٰ پر ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مقدمات کر کے تھکانا چاہتے ہیں۔ الہام اِنَّ اللّٰہَ مَعَ عِبَادِہٖ یُوَاسِیْكَ اسی کے متعلق اجتہادی طور پر معلوم ہوتا ہے اور ایسا ہی الہام سَاُکْرِمُكَ اِکْرَامًا عَجَبًا سے معلوم ہوتا ہے۔

خدا زور آور حملوں سے سچائی ظاہر کر دیگا

فرمایا:۔

ہماری جماعت تو ایمان لاتی ہے مگر اصل میں مدارِ ایمان نشانوں پر ہوتا ہے۔ اگرچہ انسان محسوس نہ کرے مگر اس کے اندر بعض کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں اور جب تک وہ کمزوریاں دُور نہ ہوں اعلیٰ مراتبِ ایمان نہیں مِل سکتے اور یہ کمزوریاں نشانات ہی کے ذریعہ دُور ہوتی ہیں اور اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے نشانوں سے ان کمزوریوں کو دُور کرے اور جماعت اپنے ایمان میں ترقی کرے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ (سورۃ الحج : ۴۰) کا نمونہ دکھائے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر سے صادق اور کاذب، خائن اور مظلوم پوشیدہ نہیں ہیں اب ضروری ہے کہ سب گروہ متفق ہو کر میرے استیصال کے درپے ہوں جیسے جنگ احزاب میں ہوئے تھے جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب خدا تعالیٰ نے چاہا ہے۔ مَیں نے جو خواب میں دیکھا کہ دریائے نیل کے کنارے پر ہوں اور بعض چلائے کہ ہم پکڑے گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا وقت بھی آوے جب جماعت کو کوئی یاس ہو مگر مَیں یقین رکھتا ہوں کہ خدا زور آور حملوں سے سچائی ظاہر کر دیگا۔ اس وقت یہ پورا زور لگائیں گے تا کہ قتل کے مقدمہ کی حسرتیں نہ رہ جائیں کہ کیوں چھوٹ گیا۔ یہ لوگ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مَیں پیش کرتا ہوں مگر وہ دیکھ لیں گے کہ اِکْرَامًا عَجَبًا کیسے ہوتا ہے۔

شوقِ تبلیغ

(دربار شام)

فرمایا:۔

سردست بیس جلد مواہب الرحمٰن کی مجلّد کروا کر مصر کے اخبار نویسوں کو بھیجی جاویں اور اگر میری مقدرت میں ہوتا تو مَیں کئی ہزار مجلّد کروا کر بھیجتا۔

فرمایا:۔

یہاں کے لوگوں کا تو یہ حال ہے۔ شاید مصر کے لوگ ہی فائدہ اُٹھالیں جس قدر سعید رُوحیں خدا کے علم میں ہیں وہ اُن کو کھینچ رہا ہے۔

جماعت کو نصائح

بیعت کے بعد ایک شخص نے اپنے گاؤں میں کثرتِ طاعون کا ذکر کیا اور دُعا کی درخواست کی۔ فرمایا:۔

مَیں تو ہمیشہ دُعا کرتا ہوں مگر تم لوگوں کو بھی چاہیئے کہ ہمیشہ دُعامیں لگے رہو نمازیں پڑھو اور توبہ کرتے رہو۔ جب یہ حالت ہوگی تو اللہ تعالیٰ حفاظت کریگا اور اگر سارے گھر میں ایک شخص بھی ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اُس کے باعث سے دوسروں کی بھی حفاظت کرے گا۔کوئی بَلا اور دُکھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے سِوا نہیں آتا اور وہ اس وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور مخالفت کی جاوے۔ایسے وقت پر عام ایمان کام نہیں آتا بلکہ خاص ایمان کام آتا ہے۔جو لوگ عام ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی طرف رجوع کرتا ہے اور آپ اُن کی حفاظت فرماتا ہے مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ ۔بہت سے لوگ ہیں جو زبان سے لا الٰہ الاّ اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور اپنے اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کے لیے دُکھ نہیں اُٹھاتے۔کوئی دُکھ یا تکلیف یا مقدمہ آ جاوے تو فوراً خدا کو چھوڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اس کی نافرمانی کر بیٹھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اُن کی کوئی پروا نہیں کرتا مگر جو خاص ایمان رکھتا ہو اور ہر حال میں خدا کے ساتھ ہو اور دُکھ اُٹھانے کو تیار ہو جاوے تو خدا تعالےٰ اُس سے دُکھ اُٹھا لیتا ہے اور دو مصیبتیں اس پر جمع نہیں کرتا دُکھ کا اصل علاج دُکھ ہی ہے اور مومن پر دو بلائیں جمع نہیں کی جاتیں۔

ایک وہ دُکھ ہے جو انسان خدا کے لیے اپنے نفس پر قبول کرتا ہے اور ایک وہ بلائے ناگہانی۔اس بلا سے خدا بچا لیتا ہے۔پس یہ دن ایسے ہیں کہ بہت توبہ کرو۔اگرچہ ہر شخص کو وحی یا الہام نہ ہو مگر دل گواہی دے دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے ہلاک نہ کرے گا۔دُنیا میں دو دوستوں کے تعلقات ہوتے ہیں۔ایک دوست دوسرے دوست کا مرتبہ شناخت کر لیتا ہے کیونکہ جیسا وہ اس کے ساتھ ہے ایسا ہی وہ بھی اس کے ساتھ ہوگا۔دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔محبت کے عوض محبت اور دغا کے عوض دغا۔خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ میں اگر کوئی حصّہ کھوٹ کا ہوگا تو اسی قدر ادھر سے بھی ہوگا مگر جو اپنا دل خدا سے صاف رکھے اور دیکھے کہ کوئی فرق خدا سے نہیں ہے تو خدا تعالیٰ بھی اس سے کوئی فرق نہ رکھے گا۔انسان کا اپنا دل اس کے لیے آئینہ ہے وہ اس میں سب کچھ دیکھ سکتا ہے پس سچا طریق دُکھ سے بچنے کا یہی ہے کہ سچے دل سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور وفاداری اور اخلاص کا تعلق دکھاؤ اور اس راہِ بیعت کو جو تم نے قبول کی ہے سب پر مقدم کرو کیونکہ اس کی بابت تم پُوچھے جاؤ گے۔جب اسقدر اخلاص تم کو میسّر آ جاوے تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو ضائع کرے۔ایسا شخص سارے گھر کو بچا لیگا۔اصل یہی ہے اس کو مت بھولو۔نِری زبان میں برکت نہیں ہوتی کہ بہت سی باتیں کر لیں۔اصل برکت دل میں ہوتی ہے اور وہی برکت کی جڑ ہے۔زبان سے تو کروڑہا مسلمان کہلاتے ہیں۔جن لوگوں کے دل خدا کے ساتھ مستحکم ہیں اور وہ اس کی

طرف وفا سے آتے ہیں خدا بھی اُن کی طرف وفا سے آتا ہے اور مصیبت اور بلا کے وقت اُن کو الگ کر لیتا ہے یاد رکھو یہ طاعون خود بخود نہیں آئی اب جو کھوٹ اور بیوفائی کا حصہ رکھتا ہے وہ بلا اور وبا سے بھی حصہ لیگا مگر جو ایسا حصہ نہیں رکھتا خدا اُسے محفوظ رکھے گا۔

مَیں اگر کسی کے لیے دُعا کروں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ صاف نہیں وہ اس سے سچا تعلق نہیں رکھتا تو میری دُعا اُس کو کیا فائدہ دے گی؟ لیکن اگر وہ صاف دل ہے اور کوئی کھوٹ نہیں رکھتا تو میری دُعا اس کے لیے نورٌ علیٰ نور ہوگی۔

زمینداروں کو دیکھا جاتا ہے دو دو پیسے کی خاطر خدا کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ خدا انصاف اور ہمدردی چاہتا ہے اور وہ پسند کرتا ہے کہ لوگ فسق فحشا اور بے حیائی سے باز آویں جو ایسی حالت پیدا کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کے فرشتے اُن کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر جب دل میں تقویٰ نہ ہو اور کچھ شیطان کا بھی ہو تو خدا شراکت پسند نہیں کرتا اور وہ سب چھوڑ کر شیطان کا کر دیتا ہے کیونکہ اس کی غیرت شرکت پسند نہیں کرتی۔ پس جو بچنا چاہتا ہے اس کو ضروری ہے کہ وہ اکیلا خدا کا ہو مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ۔ خدا تعالیٰ کبھی کسی صادق سے بیوفائی نہیں کرتا۔ ساری دُنیا بھی اگر اُس کی دشمن ہو اور اس سے عداوت کرے تو اُس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ خدا بڑی طاقت اور قدرت والا ہے اور انسان ایمان کی قوت کیساتھ اس کی حفاظت کے نیچے آتا ہے اور اس کی قدرتوں اور طاقتوں کے عجائبات دیکھتا ہے پھر اس پر کوئی ذلت نہ آوے گی۔ یاد رکھو خدا تعالےٰ زبردست پر بھی زبردست ہے بلکہ اپنے امر پر بھی غالب ہے۔ سچے دل سے نمازیں پڑھو اور دُعاؤں میں لگے رہو اور اپنے سب رشتہ داروں اور عزیزوں کو یہی تعلیم دو۔ پُورے طور پر خدا کی طرف ہو کر کوئی نقصان نہیں اُٹھاتا۔ نقصان کی اصل جڑ گُناہ ہے۔

ساری عزتیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ دیکھو بہت سے ابرار اخیار دُنیا میں گذرے ہیں۔ اگر وہ دُنیادار ہوتے تو اُن کے گذارے ادنیٰ درجہ کے ہوتے کوئی اُن کو پُوچھتا بھی نہ۔ مگر وہ خدا کے لیے ہوئے اور خدا ساری دُنیا کو اُن کی طرف کھینچ لایا۔ خدا تعالیٰ پر سچا یقین رکھو اور بدظنی نہ کرو۔ جب اِس کی بدبختی سے خدا پر بدظنی ہوتی ہے تو پھر نہ نماز درست ہوتی ہے نہ روزہ نہ صدقات۔ بدظنی ایمان کے درخت کو نشو ونما ہونے نہیں دیتی بلکہ ایمان کا درخت یقین سے بڑھتا ہے۔

مَیں اپنی جماعت کو بار بار اس لیے نصیحت کرتا ہوں کہ یہ موت کا زمانہ ہے۔ اگر سچے دل سے ایمان لانے کی موت کو اختیار کرو گے تو ایسی موت سے زندہ ہو جاؤ گے اور ذلت کی موت سے بچائے جاؤ گے۔ مومن پر دو موتیں جمع نہیں ہوتیں جب وہ سچے دل سے اور صدق اور اخلاص کے ساتھ خدا کی طرف آتا ہے پھر طاعُون کیا

چیز ہے؟ کیونکہ صدق اور وفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کا ہونا یہی ایک موت ہے جو ایک قسم کی طاعون ہے۔مگر اس طاعون سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے کیونکہ خدا کا ہونے سے نشانہ طعن تو ہونا ہی پڑتا ہے پس جب مومن ایک موت اپنے اُوپر اختیار کر لیوے تو پھر دوسری موت اُس کے آگے کیا شئے ہے؟ مجھے بھی الہام ہوا تھا کہ آگ سے ہمیں مت ڈراؤ آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے۔

ہر مومن کا یہی حال ہوتا ہے اگر وہ اخلاص اور وفاداری سے اس کا ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کا ولی بنتا ہے لیکن اگر ایمان کی عمارت بوسیدہ ہے تو پھر بیشک خطرہ ہوتا ہے۔ہم کسی کے دل کا حال تو جانتے ہی نہیں۔سینہ کا علم تو خدا کو ہی ہے۔مگر انسان اپنی خیانت سے پکڑا جاتا ہے۔اگر خدا تعالیٰ سے معاملہ صاف نہیں تو پھر بیعت فائدہ دے گی نہ کچھ اَور۔لیکن جب خالص خدا ہی کا ہو جاوے تو خدا تعالیٰ اُس کی خاص حفاظت کرتا ہے۔اگرچہ وہ سب کا خدا ہے مگر جو اپنے آپ کو خاص کرتے ہیں۔اُن پر خاص تجلّی کرتا ہے اور خدا کے لیے خاص ہونا یہی ہے کہ نفس بالکل چکنا چُور ہو کر اُس کا کوئی ریزہ باقی نہ رہ جائے۔اس لیے مَیں بار بار اپنی جماعت کو کہتا ہوں کہ بیعت پر ہرگز ناز نہ کرو اگر دل پاک نہیں ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا کیا فائدہ دیگا جب دل دور ہے جب دل اور زبان میں اتفاق نہیں تو میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر منافقانہ اقرار کرتے ہیں تو یاد رکھو ایسے شخص کو دوہرا عذاب ہوگا مگر جو سچا اقرار کرتا ہے اُس کے بڑے بڑے گُناہ بخشے جاتے ہیں اور اس کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔مَیں تو زبان ہی سے کہتا ہوں۔دل میں ڈالنا خدا کا کام ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھانے میں کیا کسر باقی رکھی تھی؟ مگر ابوجہل اور اس کے امثال نہ سمجھے۔آپ کو اس قدر فکر اور غم تھا کہ خدا نے خود فرمایا لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (سورۃ الشعرآء: ۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر ہمدردی تھی۔آپؐ چاہتے تھے کہ وہ ہلاک ہونے سے بچ جاویں مگر وہ بچ نہ سکے۔حقیقت میں معلّم اور واعظ کا تو اتنا ہی فرض ہے کہ وہ بتا دیوے۔دل کی کھڑکی تو خدا کے فضل سے کُھلتی ہے۔نجات اُسی کو ملتی ہے جو دل کا صاف ہو۔جو صاف دل نہیں وہ اُچکّا اور ڈاکو ہے۔خدا تعالیٰ اُسے بُری طرح مارتا ہے۔اب یہ طاعون کے دن ہیں ابھی تو ابتداء ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ؎ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

آخر کی خبر نہیں مگر جو ابتدائی حالت میں اپنے آپ کو درست کریں گے وہ خدا کی رحمت کا بہت بڑا حق رکھتے ہیں مگر جو لوگ صاعقہ کی طرح دیکھ کر ایمان لائیں گے ممکن ہے کہ اُن کی توبہ قبول نہ ہو یا توبہ کا موقعہ ہی نہ ملے۔ابتداء والے ہی کا حق بڑا ہوتا ہے۔قاعدہ کے موافق ۱۵ یا ۲۰ دن اَور طاعون کے روزہ کے ہیں اور آرام کی شکل نظر آتی ہے مگر وقت آتا ہے کہ پھر روزہ کھولنے کا زمانہ شروع ہوگا۔اب خدا کے سوا کوئی عاصم نہیں ہے۔ایماندار قبول نہیں کر سکتا کہ خدا کے ارادہ کے خلاف کوئی بچ سکتا ہے۔فائدہ اور امن کی ایک ہی راہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

کی طرف ایسا جھکے کہ خود محسوس کرلے کہ اب مَیں وہ نہیں رہا ہوں اور مصفا قطرہ کی طرح ہو جاوے۔

مخالفت کی شدت

خدا کی قدرت ہے کہ جُوں جُوں طاعون کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے شور اور مفسدہ مخالفت کا بڑھتا جاتا ہے اُن کو ذرا بھی خدا کا خوف نہیں ہے۔

آج مجھے خیال آیا کہ شاید یَاْتِیْ عَلَیْکَ زَمَنٌ کَمِثْلِ زَمَنِ مُوْسٰی والا الہام اور محاصرہ والی حدیث اسی طرح پوری ہو کہ مقدمات کثرت سے کردیں جیسے حضرت موسیٰ سامنے نیل سے اور پیچھے لشکرِ فرعون سے محصور ہو گئے تھے اور ایسی خوفناک صورتیں پیدا ہوں کہ بعض کمزور طبیعت والے چلائیں کہ ہم پکڑے گئے۔ اس لیے خدا نے ایسے کمزوروں کو پہلے سے تسلّی دے دی کہ یہ مضبوط اور قوی دل ہو جاویں۔ براہینِ احمدیہ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ ایک وقت ناخنوں تک زور لگائیں گے اس وقت خدا تیرے ساتھ ہوگا۔ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ اب خدا تعالیٰ نے جو دن مقرر کئے ہوئے ہیں وہ اگر نہ آویں تو ثواب کیسے ہے۔ براہین میں اَور بھی بعض خوفناک صورتیں مذکور ہیں اور انجام کار وہی ہوگا جس کی خدا نے خبر دی ہے اور ارادہ فرمایا ہے۔

ایک الہام

فرمایا:-

۳۰ رجنوری ۱۹۰۳ء کی صبح کو جو الہام ہوا تھا لَا یَمُوْتُ اَحَدٌ مِّنْ رِّجَالِکُمْ اس کے معنے ابھی نہیں کھُلے۔ مگر یہاں حقیقی معنے موت کے نہیں ہو سکتے کیونکہ انبیاء پر بھی یہ آتی ہے۔ غالباً اَور کوئی معنے ہوں گے[1]

(الحکم جلد ۷ نمبر ۶ صفحہ ۵ تا ۷ مورخہ ۱۴ رفروری ۱۹۰۳ء)

یکم فروری ۱۹۰۳ء

امتحان کیوقت جماعت کو استقامت کی بہت دُعا کرنی چاہیئے

فرمایا کہ یہ وقت جماعت کے امتحان کا ہے دیکھیں کون ساتھ دیتا ہے اور کون پہلوتہی کرتا ہے۔ اس لیے ہمارے بھائیوں کو استقامت

---

[1] البدر میں مذکورہ الہام کی تشریح کرتے ہوئے کچھ مزید فقرے درج ہیں وہاں لکھا ہے:-

"عشاء سے قبل حضرت اقدس نے یہ الہام سُنایا لَا یَمُوْتُ اَحَدٌ مِّنْ رِّجَالِکُمْ اور فرمایا کہ اس کے حقیقی معنے کہ تمہارے رجال میں کوئی نہ مریگا تو ہو نہیں سکتے کیونکہ موت تو انبیاء تک کو آتی ہے اور نہ قیامت تک کسی نے زندہ رہنا ہے مگر اس کے مفہوم کا پتہ نہیں ہے۔ شاید کوئی اَور معنے ہوں۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶ رفروری ۱۹۰۳ء)

کی بہت دُعا کرنی چاہیئے اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے وسیع حوصلہ ہو کر مال و زر سے ہر طرح سے امداد کے لیے تیار ہونا چاہیئے۔ ایسے ہی وقت ترقی درجات کے ہوتے ہیں۔ اُن کو ہاتھ سے نہ گنوانا چاہیئے[۱]

یکم فروری کو ایک دو سال کا الہام آپ نے اس کے متعلق سُنایا۔ بَلِیَّۃٌ مَّالِیَّۃٌ۔ یعنی مالی ابتلاء

(البدر جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶ر فروری ۱۹۰۳ئ)

۲ر فروری ۱۹۰۳ئ (بوقتِ ظہر)

ایک رؤیاء

حضرت احمد مرسل یزدانی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک رؤیاء ظہر کے وقت سُنائی کہ:۔

مَیں نے میرزا خدا بخش صاحب کو دیکھا ہے کہ اُن کے کُرتہ کے ایک دامن پر لہُو کے داغ ہیں۔ پھر اَور داغ ان کے گریبان کے نزدیک بھی دیکھے ہیں۔ مَیں اس وقت کہتا ہوں یہ ویسے ہی نشان ہیں جیسے کہ عبداللہ سنوری صاحب کو جو کُرتہ دیا گیا ہے اس پر تھے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶ر فروری ۱۹۰۳ئ)

۵ر فروری ۱۹۰۳ئ

اپنی جماعت کیلئے ایک بہت ضروری نصیحت

آج کل زمانہ بہت خراب ہو رہا ہے قسم قسم کا شرک بدعت اور کئی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بیعت کے وقت جو اقرار کیا جاتا ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔ یہ اقرار خدا کے

---

[۱] الحکم میں یکم فروری کی ڈائری بغیر تاریخ کے درج ہے۔ البدر میں درج شدہ یکم فروری کی ڈائری کے مضمون سے اس کی مطابقت ظاہر کرتی ہے کہ یہ ڈائری یکم فروری کی ہے۔ لکھا ہے:۔

"فرمایا براہین میں یہ بھی الہام ہے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَ تَمَّتْ کَلِمَاتُ رَبِّکَ وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ہماری جماعت پر بھی ایک فتنہ ہے۔ صحابہ پر بھی فتنہ ہوا۔ مگر فتنہ کا پتہ نہیں کونسا فتنہ ہے اور کس راہ کا ہے۔ مگر جب انسان خدا کا ہو جاوے تو پھر جان مال اور آبرو کیا شئے ہے کچھ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہی تین چیزیں انسان کو عزیز ہوتی ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (سورۃ العنکبوت:۳)

فرمایا۔ ایک پُرانا الہام بَلِیَّۃٌ مَّالِیَّۃٌ شاید وہ ان ایام کے لیے تھا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۷ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ئ)

سامنے اقرار ہے۔ اب چاہیئے کہ اس پر موت تک خوب قائم رہے ورنہ سمجھو کہ بیعت نہیں کی اور اگر قائم ہو گے تو اللہ تعالیٰ دین و دنیا میں برکت دیگا۔ اپنے اللہ کے منشاء کے مطابق پُورا تقویٰ اختیار کرو۔ زمانہ نازک ہے۔ قہرِ الٰہی نمودار ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق اپنے آپ کو بنالیگا۔ وہ اپنی جان اور اپنی آل و اولاد پر رحم کریگا۔

دیکھو انسان روٹی کھاتا ہے۔ جب تک سیری کے موافق پوری مقدار نہ کھالے تو اُس کی بھوک نہیں جاتی اگر وہ ایک بھورہ روٹی کا کھالیوے تو کیا وہ بھوک سے نجات پائے گا؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر وہ ایک قطرہ پانی کا اپنے حلق میں ڈالے تو وہ قطرہ اُسے ہرگز نہ بچا سکے گا بلکہ باوجود اس قطرہ کے وہ مریگا۔ حفظِ جان کے واسطے وہ قدرِ محتاط جس سے زندہ رہ سکتا ہے جب تک نہ کھالے اور نہ پیوے نہیں بچ سکتا۔ یہی حال انسان کی دینداری کا ہے۔ جب تک اس کی دینداری اس حد تک نہ ہو کہ سیری ہو بچ نہیں سکتا۔ دینداری، تقویٰ، خدا کے احکام کی اطاعت کو اس حد تک کرنا چاہیئے جیسے روٹی اور پانی کو اس حد تک کھاتے اور پیتے ہیں جس سے بھوک اور پیاس چلی جاتی ہے۔

خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی بعض باتوں کو نہ ماننا اس کی سب باتوں کو ہی چھوڑنا ہوتا ہے۔ اگر ایک حصہ شیطان کا ہے اور ایک اللہ کا تو اللہ تعالیٰ حصہ داری کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سلسلہ اس کا اسی لیے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف آوے۔ اگرچہ خدا کی طرف آنا بہت مشکل ہوتا ہے اور ایک قسم کی موت ہے مگر آخر زندگی بھی اسی میں ہے۔ جو اپنے اندر سے شیطانی حصہ نکال کر پھینک دیتا ہے۔ وہ مبارک انسان ہوتا ہے اور اس کے گھر اور نفس اور شہر سب جگہ اس کی برکت پہنچتی ہے لیکن اگر اس کے حصہ میں ہی تھوڑا آیا ہے تو وہ برکت نہ ہو گی جب تک بیعت کا اقرار عملی طور پر نہ ہو بیعت کچھ چیز نہیں ہے۔ جس طرح سے ایک انسان کے آگے تم بہت سی باتیں زبان سے کرو مگر عملی طور پر کچھ بھی نہ کرو تو وہ خوش نہ ہو گا۔ اسی طرح خدا کا معاملہ ہے وہ سب غیرت مندوں سے زیادہ غیرت مند ہے کیا ہو سکتا ہے کہ ایک تو تم اس کی اطاعت کرو پھر ادھر اس کے دشمنوں کی بھی اطاعت کرو اس کا نام تو نفاق ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اس مرحلہ میں زیدؔ و بکرؔ کی پروا نہ کرے۔ مرتے دم تک اس پر قائم رہو۔

بدی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خدا کے ساتھ شریک کرنا۔ اس کی عظمت کو نہ جاننا۔ اُس کی عبادت اور اطاعت میں کسل کرنا۔ دوسری یہ کہ اس کے بندوں پر شفقت نہ کرنا۔ اُن کے حقوق ادا نہ کرنے۔ اب چاہیئے کہ دونو قسم کی خرابی نہ کرو۔ خدا کی اطاعت پر قائم رہو۔ جو عہد تم نے بیعت میں کیا ہے اس پر قائم رہو۔ خدا کے بندوں کو تکلیف نہ دو۔ قرآن کو بہت غور سے پڑھو۔ اس پر عمل کرو۔ ہر ایک قسم کے ٹھٹھے اور بیہودہ باتوں اور مشرکانہ مجلسوں سے بچو۔ پانچوں وقت نماز کو قائم رکھو۔ غرضکہ کوئی ایسا حکم الٰہی نہ ہو جسے تم ٹال دو۔ بدن کو بھی صاف رکھو اور دل کو ہر ایک قسم کے بیجا کینے۔ بغض و حسد سے پاک کرو۔ یہ باتیں ہیں جو خدا تم سے چاہتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کبھی کبھی آتے رہو۔جب تک خدا نہ چاہے کوئی آدمی بھی نہیں چاہتا۔نیکی کی توفیق وہی دیتا ہے۔

دو عمل ضرور یاد رکھو۔ایک دُعا۔دوسرے ہم سے ملتے رہنا تاکہ تعلق بڑھے اور ہماری دُعا کا اثر ہو۔

ابتلاء سے کوئی خالی نہیں رہتا۔جب سے یہ سلسلہ انبیاء اور رُسل کا چلا آرہا ہے جس نے حق کو قبول کیا ہے اس کی ضرور آزمائش ہوتی ہے۔اسی طرح یہ جماعت بھی خالی نہ رہیگی گرد و نواح کے مولوی کوشش کریں گے کہ تم اس راہ سے ہٹ جاؤ۔تم پر کفر کے فتوے دینگے۔لیکن یہ سب کچھ پہلے ہی سے اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے لیکن اس کی پروا نہ کرنی چاہیئے جوانمردی سے اس کا مقابلہ کرو۔

ثابت قدمی دکھاؤ

پھر بیعت کنندگان نے منکرین کے ساتھ نماز پڑھنے کو پوچھا۔ حضرت نے فرمایا کہ

ان لوگوں کے ساتھ ہرگز نہ پڑھو اکیلے پڑھ لو۔جو ایک ہوگا وہ جلد دیکھ لے گا کہ ایک اَور اس کیساتھ ہو گیا ہے۔ثابت قدمی دکھاؤ۔ثابت قدمی میں ایک کشش ہوتی ہے۔اگر کوئی جماعت کا آدمی نہ ہو تو نماز اکیلے پڑھ لو مگر جو اس سلسلہ میں نہیں اس کے ساتھ ہرگز نہ پڑھو ہرگز نہ پڑھو۔جو ہمیں زبان سے بُرا نہیں کہتا وہ عملی طور سے کہتا ہے کہ حق کو قبول نہیں کرتا۔ہاں ہر ایک کو سمجھاتے رہو۔خدا کسی نہ کسی کو ضرور کھینچ لے گا جو شخص نیک نظر آوے سلام علیک اس سے رکھو لیکن اگر وہ شرارت کرے تو پھر یہ بھی ترک کر دو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ صفحہ ۳۱ مورخہ ۱۳ر فروری ۱۹۰۳ء)

۱۰ر فروری ۱۹۰۳ء

یہ وقت دُعا اور تضرّع کا ہے

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

وہ اخبارات جو کہ آپ کی مخالفت میں ہمیشہ خلاف واقعہ باتیں درج کرتے ہیں اور گند اور فحش بیانی ان کا کام ہے ان کو ہرگز نہ لیا جاوے اور نہ اُن کے مقابلہ پر اشتہار وغیرہ دیا جائے۔یہ اُن کو ایک اَور موقعہ گند بکنے کا دیتا ہے۔یہ وقت دُعا اور تضرّع کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم میں اور ہماری قوم میں فیصلہ کر دے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ صفحہ ۲۵ مورخہ ۱۳ر فروری ۱۹۰۳ء)

۱۱؍فروری ۱۹۰۳ء بروز چہار شنبہ

عرش

عرش کے متعلق ایک صاحب نے سوال کیا کہ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے کیا معنے ہیں اور عرش کیا شئے ہے؟

عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث عبث ہے

فرمایا:۔ اس کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں کوئی تو اُسے مخلوق کہتا ہے اور کوئی غیر مخلوق۔ لیکن اگر ہم غیر مخلوق نہ کہیں تو پھر استوٰے باطل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث ہی عبث ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ درجے کی بلندی کو بیان کیا ہے یعنی ایک ایسا مقام جو کہ ہر ایک جسم اور ہر ایک نقص سے پاک ہے اور اس کے مقابلہ پر یہ دُنیا اور تمام عالم ہے کہ جس کی انسان کو پوری پوری خبر بھی نہیں ہے۔ ایسے مقام کو قدیم کہا جا سکتا ہے۔ لوگ اس میں حیران ہیں اور غلطی سے اسے ایک مادی شئے خیال کرتے ہیں اور قدامت کے لحاظ سے جو اعتراض لفظ ثُمَّ کا آتا ہے تو بات یہ ہے کہ قدامت میں ثُمَّ آجاتا ہے جیسے قلم ہاتھ میں ہوتا ہے تو جیسے قلم حرکت کرتا ہے ویسے ہاتھ حرکت کرتا ہے مگر ہاتھ کو تقدم ہوتا ہے۔ آریہ لوگ خُدا کی قدامت کے متعلق اہلِ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ انکا خدا چھ سات ہزار برس سے چلا آتا ہے یہ اُن کی غلطی ہے۔ اس مخلوق کو دیکھ کر خدا کی عمر کا اندازہ کرنا نادانی ہے۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ آدمؑ سے اوّل کیا تھا اور کس قسم کی مخلوق تھی۔ اُس وقت کی بات وہی جانے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ۔ وہ اور اُس کی صفات قدیم ہی سے ہیں مگر اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہر ایک صفت کا علم ہم کو دیدے اور نہ اس کے کام اس دُنیا میں سما سکتے ہیں۔ خدا کے کلام میں دقیق نظر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے ازلی ہونے کی مخالف نہیں ہے اور استعارات کو ظاہر پر حمل کر کے مشہودات پر لانا بھی ایک نادانی ہے۔ اس کی صفت ہے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (سورۃ الانعام: ۱۰۴) ہم عرش اور استوٰی پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حقیقت اور کنہ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں۔ جب دنیا وغیرہ نہ تھی عرش تب بھی تھا جیسے لکھا ہے کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ۔ (ھود: ۸)

عرش ایک مجہول الکنہ امر اور خُدا تعالیٰ کی تجلّیات کیطرف اشارہ ہے

اس کے متعلق خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک مجہول الکنہ امر ہے اور خدا تعالیٰ کی تجلیات کی طرف اشارہ ہے وہ خلق السمٰوت والارض چاہتی تھی اس لیے وہ اوّل ہو کر پھر استوٰی علی العرش ہوا۔ اگرچہ توریت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے مگر وہ اچھے الفاظ

میں نہیں ہے اور لکھا ہے کہ خدا ماندہ ہو کر تھک گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک انسان کسی کام میں مصروف ہوتا ہے تو اس کے چہرہ اور خدوخال وغیرہ اور دیگر اعضاء کا پورا پورا پتہ نہیں لگتا مگر جب وہ فارغ ہو کر ایک تخت یا چارپائی پر آرام کی حالت میں ہو تو اس کے ہر ایک عضو کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح استعارہ کے طور پر خدا کی صفات کے ظہور کو ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ سے بیان کیا ہے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد صفات الٰہیہ کا ظہور ہوا۔ صفات اس کے ازلی ابدی ہیں مگر جب مخلوق ہو تو خالق کو شناخت کرے اور محتاج ہوں تو رازق کو پہچانیں۔ اسی طرح اس کے علم اور قادر مطلق ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ خدا کی اس تجلّی کی طرف اشارہ ہے جو خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے بعد ہوئی۔

اسی طرح اس تجلّی کے بعد ایک اور تجلّی ہو گی جب کہ ہر شئے فنا ہو گی۔ پھر ایک اور تیسری تجلّی ہو گی کہ احیاء اموات ہو گا۔ غرضیکہ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جس کے اندر داخل ہونا روا نہیں ہے۔ صرف ایک تجلّی سے اُسے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرش کو اپنی صفات میں داخل کیا ہے جیسے ذُوالْعَرْشِ الْمَجِیْدُ۔ گویا خدا تعالیٰ کے کمالِ علو کو دوسرے معنوں میں عرش سے بیان کیا ہے اور وہ کوئی مادی اور جسمانی شئے نہیں ہے ورنہ زمین و آسمان وغیرہ کی طرح عرش کی پیدائش کا ذکر بھی ہوتا۔ اس لیے شُبہ گذرتا ہے کہ ہے تو شئے مگر غیر مخلوق اور یہاں سے دھوکا کھا کر آریوں کی طرف انسان چلا جاتا ہے کہ جیسے وہ خدا کے وجود کے علاوہ اور اشیاء کو غیر مخلوق مانتے ہیں ویسے ہی یہ عرش کو ایک شئے غیر مخلوق جُز از خدا ماننے لگتا ہے۔ یہ گمراہی ہے۔ اصل میں یہ کوئی شئے خدا کے وجود سے باہر نہیں ہے۔ جنہوں نے اُسے ایک شئے غیر مخلوق قرار دیا وہ اسے اتم اور اکمل نہیں مانتے اور جنہوں نے مادی مانا وہ گمراہی پر ہیں کہ خدا کو ایک مجسم شئے کا محتاج مانتے ہیں کہ ایک ڈولے کی طرح فرشتوں نے اُسے اُٹھایا ہوا ہے لَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔ (سورۃ البقرہ: ۲۵۶)

چار ملائک کا عرش کو اُٹھانا یہ بھی ایک استعارہ ہے۔ رب۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالک یوم الدین یہ صفات الٰہی کے مظہر ہیں اور اصل میں ملائکہ ہیں اور یہی صفات جب زیادہ جوش سے کام میں ہوں گے تو اُن کو آٹھ ملائک سے تعبیر کیا گیا ہے جو شخص اُسے بیان نہ کر سکے وہ یہ کہے کہ یہ ایک مجہول الکُنہ حقیقت ہے ہمارا اس پر ایمان ہے اور حقیقت خدا کے سپرد کرے۔ اطاعت کا طریق ہے کہ خدا کی باتیں خدا کے سپرد کرے اور ان پر ایمان رکھے۔ اور اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ خدا کی تجلیات ثلٰثہ کی طرف اشارہ ہے۔

کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ کی کُنہ خدا ہی کو معلوم ہے

کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ یہ بھی ایک تجلّی تھی اور ماء کے معنے یہاں پانی بھی نہیں کر سکتے خدا معلوم کہ اس کے نزدیک ماء کے یہاں کیا معنے ہیں۔ اس کی کُنہ خدا کو معلوم ہے۔

جنّت کے نعماء پر بھی ایسا ہی ایمان ہے۔ وہاں یہ تو نہ ہوگا کہ بہت سی گائیں بھینسیں ہوں گی اور دُودھ دوہ کر حوض میں ڈالا جائے گا۔ خدا فرماتا ہے کہ وہ اشیاء ہیں جو نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں اور نہ زبان نے چکھیں، نہ دل میں اُن کے فہم کا مادہ ہے۔ حالانکہ اُن کو دُودھ اور شہد وغیرہ ہی لکھا ہے جو کہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اور ہم اُسے پیتے ہیں۔ اسی طرح کئی باتیں ہیں جو کہ ہم خود دیکھتے ہیں مگر نہ تو الفاظ ملتے ہیں کہ اُنکو بیان کر سکیں نہ اُس کے بیان کرنے پر قادر ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر اُن کو مادی دُنیا پر قیاس کریں تو صدہا اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (سورۃ بنی اسرائیل: ۷۳) سے ظاہر ہے کہ دیدار کا وعدہ یہاں بھی ہے مگر ہم اُسے جسمانیات پر حمل نہیں کر سکتے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۷-۳۸ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء)

---

۱۳ فروری ۱۹۰۳ء

صدقہ اور دُعا سے بَلا ٹل جاتی ہے

بعد ادائگی جمعہ گرد و نواح کے لوگوں نے بیعت کی اور حضرت اقدس نے اُن کے لیے ایک مختصر تقریر نماز روزہ کی پابندی اور ہر ایک ظُلم وغیرہ سے بچنے پر فرمائی کہ اپنے گھروں میں عورتوں لڑکیوں اور لڑکوں سب کو نیکی کی نصیحت کریں اور جیسے درختوں اور کھیتوں کو اگر پُورا پانی نہ دیا جائے تو وہ پھل نہیں لاتے۔ اسی طرح جب تک نیکی کا پانی دل کو نہ دیا جائے تو وہ بھی انسان کے لیے کسی کام کا نہیں ہوتا۔ جو نیک بن جاتا ہے اس پر یہ بَلا طاعون نہیں پڑتی موت تو سب کو آتی ہے اور اس کا دروازہ بند نہیں ہوتا مگر جن موتوں میں ایک قہر کی بُو ہوتی ہے وہ نہیں ہوتی ہنسی اور ٹھٹھے کی مجلسوں سے پرہیز کی تاکید فرمائی۔ انبیاء کی وصیت یاد دلائی کہ صدقہ اور دُعا سے بَلا ٹل جاتی ہے۔ اگر پیسہ پاس نہ ہو تو ایک لوٹا (ڈول) پانی کا کسی کو بھر دو یہ بھی صدقہ ہے۔ اپنے مال اور بدن سے کسی کی خدمت کر دینی یہ بھی صدقہ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۴ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء)

دربارِ شام

ایک نووارد اور حضرت اقدس علیہ السّلام

۱۳ فروری ۱۹۰۳ء کو ایک ڈاکٹر صاحب[1] لکھنؤ سے تشریف لائے بقول اُنکے

---

[1] البدر میں اس نووارد کا نام محمد یوسف درج ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۴ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء)

وہ بغدادی الاصل ہیں اور اب عرصہ سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔اُن کے چند احباب نے اُن کو حضرت حجۃ اللہ علیہ السلام کی خدمت میں بغرض دریافت حال بھیجا ہے۔چنانچہ وہ بعد مغرب حضرت اقدس علیہ السلام کے حضور حاضر ہوئے اور شرفِ ملاقات حاصل کیا۔جو کچھ گفتگو آپ سے ہوئی۔ہم اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر الحکم)

<u>حضرت اقدس</u> ۔ آپ کہاں سے آئے ہیں ؟

<u>نووارد</u> ۔ مَیں اصل رہنے والا بغداد کا ہوں مگر اب عرصہ سے لکھنؤ میں رہتا ہوں۔وہاں کے چند آدمیوں نے مجھے مستعد کیا کہ قادیان جاکر کچھ حالات دیکھ آئیں۔

<u>حضرت اقدس</u> ۔ امرتسر میں آپ کتنے دن ٹھہرے ؟

<u>نووارد</u> ۔ پانچ چھ روز۔

<u>حضرت اقدس</u> ۔کیا کام تھا ؟

<u>نووارد</u> ۔محض یہاں کے حالات کا معلوم کرنا اور راستہ وغیرہ کی واقفیت حاصل کرنا۔

<u>حضرت اقدس</u> ۔کیا آپ کچھ عرصہ یہاں ٹھہریں گے ؟

<u>نووارد</u> ۔ کل جاؤں گا۔

<u>حضرت اقدس</u> ۔آپ دریافت حالات کے لیے آئے اور کل جائیں گے اس سے کیا فائدہ ہوا ؟ یہ تو صرف آپ کو تکلیف ہوئی۔دین کے کام میں آہستگی سے دریافت کرنا چاہیئے تاکہ وقتاً فوقتاً بہت سی معلومات ہو جائیں۔جب وہاں آپ کے دوستوں نے آپ کو منتخب کیا تھا تو آپ کو یہاں فیصلہ کرنا چاہیئے۔جب آپ ایک ہی رات کے بعد چلے جائیں گے تو آپ کیا رائے قائم کرسکیں گے ؟ اب ہم نماز پڑھ کے چلے جائیں گے۔آپ کو کوئی موقعہ ہی نہ ملا۔

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (سورۃ التوبہ : ۱۱۹) کہ صادقوں کیساتھ رہو یہ معیّت چاہتی ہے کہ کسی وقت تک صحبت میں رہے کیونکہ جب تک ایک حد تک صحبت میں نہ رہے وہ اسرار اور حقائق کھل نہیں سکتے وہ اجنبی کا اجنبی اور بیگانہ ہی رہتا ہے اور کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔

<u>نووارد</u> ۔مَیں جو کچھ پوچھوں آپ اس کا جواب دیں۔اس سے ایک رائے قائم ہوسکتی ہے جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے انہوں نے تقیہ[1] تو کیا نہیں کہ جاکر کیا دیکھوں۔آپ چونکہ ہمارے مذہب میں ہیں اور آپ نے ایک

---

[1] اغلباً یہ لفظ تقیید ہے جو سہو کتابت سے تقیہ لکھا گیا ہے۔البدر میں اس کا ذکر یوں ہے کہ :۔
"اگرچہ وہ لوگ جن کی طرف سے مَیں آیا ہوں آپ کا ذکر ہنسی اور تمسخر سے کرتے ہیں مگر میرا یہ خیال نہیں ہے"۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۴ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء)

دعویٰ کیا ہے اس کا دریافت کرنا ہم پر فرض ہے۔
حضرت اقدس۔ بات یہ ہے کہ مذاق، تمسخر صحتِ نیت میں فرق ڈالتا ہے اور ماموروں کیلئے تو یہ سُنّت چلی آئی ہے کہ لوگ ان پر ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں مگر حسرت ہنسی کرنے والوں ہی پر رہ جاتی ہے چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا ہے یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (یٰس: ۳۱) ناواقف انسان نہیں جانتا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ ہنسی اور مذاق میں ایک بات کو اُڑانا چاہتا ہے مگر تقویٰ ہے جو اسے راہِ حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔
میرا دعویٰ ایسا دعویٰ نہیں رہا جو اَب کسی سے مخفی ہو۔ اگر تقویٰ ہو تو اس کے سمجھنے میں بھی اب مشکلات باقی نہیں رہیں۔ اس وقت صلیبی غلبہ حد سے بڑھا ہوا ہے اور مسلمانوں کا ہر امر میں انحطاط ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں تقویٰ کا یہ تقاضا ہے اور وہ یہ سبق دیتا ہے کہ تکذیب میں مستعجل نہ ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت یہود نے جلدی کی اور غلطی کھائی اور انکار کر بیٹھے نتیجہ یہی ہوا کہ خدا کی لعنت اور غضب کے نیچے آئے۔ ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت عیسائیوں اور یہودیوں نے غلطیاں کھائیں اور انکار کر دیا اور اس نعمت سے محروم رہے جو آپ لیکر آئے تھے۔ تقویٰ کا یہ لازمہ ہونا چاہیئے کہ ترازو کی طرح حق و انصاف کے دونو پلّے برابر رکھے۔ اسی طرح اب ایسا زمانہ آیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے دُنیا کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے یہ سلسلہ قائم کیا تو اسی طرح مخالفت کا شور اُٹھا جیسے شروع سے ہوتا آیا ہے۔ یہی مولوی جو اَب منکر ہیں اور کُفر کے فتوے دیتے ہیں میرے مبعوث ہونے سے پہلے یہ لوگ منبروں پر چڑھ کر بیان کیا کرتے تھے کہ تیرھویں صدی بہت خراب ہے جس سے بھیڑیوں نے بھی پناہ مانگی ہے اور اب چودھویں صدی آئی ہے جس میں مسیح اور مہدی آئیگا اور ہمارے دُکھوں کا علاج ہوگا یہاں تک کہ اکثر اکابرینِ اُمت نے آنے والے کو سلام کی وصیّت کی اور سب نے یہ تسلیم کیا کہ جس قدر کشوف اہل اللہ کے ہیں وہ چودھویں صدی سے آگے نہیں جاتے مگر جب وہ وقت آیا اور آنے والا آگیا تو وہی زبانیں انکار اور سبّ وشتم کے لیے تیز ہوگئیں۔ تقویٰ کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر وہ تسلیم کرنے میں سب سے اوّل نہ ہوتے تو انکار کے لیے بھی تو جلدی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ کم از کم تصدیق اور تکذیب کے دونو پہلو برابر رکھتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بدوں نصوصِ قرآنیہ و حدیثیہ اور دلائل قویہ عقلیہ و تائیدات سماویہ کے مان لیں مگر ہم یہ افسوس سے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مسلمان جن کو قرآن شریف میں سورہ فاتحہ کے بعد ہی هُدًى لِلْمُتَّقِينَ سکھایا گیا تھا اور جن کو یہ تعلیم دی گئی تھی إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ (انفال: ۳۵) اور جن کو بتایا گیا تھا إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ان کو کیا ہو گیا کہ انہوں نے اس معاملہ میں اسقدر جلد بازی سے کام لیا اور تکفیر اور تکذیب کے لیے دلیر ہو گئے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ میرے دعاوی اور دلائل کو سُنتے اور پھر خدا سے ڈر کر اُن پر غور کرتے۔ کیا ان کی جلد بازی سے یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ انہوں نے تقویٰ سے کام لیا ہے جلد بازی

اور تقویٰ کبھی دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ نبیوں کو اللہ تعالیٰ نے یہی کہا فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ۔ پھر عام لوگوں کو کس قدر ضرورت تھی کہ وہ تقویٰ سے کام لیتے اور خدا سے ڈرتے۔

باوجودیکہ علماء کی اگر میرے دعویٰ سے پہلے کی کتابیں دیکھی جاتی ہیں تو اُن سے کس قدر انتظار اور شوق کا پتہ لگتا ہے گویا وہ تیرھویں صدی کے علامات سے مضطرب اور بے قرار ہو رہے ہیں مگر جب وقت آیا تو اَوَّلُ الْکَافِرِیْنَ ٹھہرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہمیشہ کہتے آتے تھے کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد اصلاح فساد کے لیے آتا ہے اور ایک رُوحانی طبیب مفاسد موجودہ کی اصلاح کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ صدی کا سر پاکر وہ انتظار کرتے۔ ضرورت کے لحاظ سے ان کو مناسب تھا کہ ایسے مجدد کا انتظار کرتے جو کسرِ صلیب کے لیے آتا کیونکہ اس وقت سب سے بڑا فتنہ یہی ہے۔ ایک عام آدمی سے بھی اگر سوال کیا جاوے کہ اس وقت بڑا فتنہ کونسا ہے؟ تو وہ یہی جواب دیگا کہ پادریوں کا۔ ۳۰ لاکھ کے قریب تو اسی ملک سے مُرتد ہو گیا۔ اسلام وہ مذہب تھا کہ اگر ایک بھی مُرتد ہوتا تو قیامت آجاتی اسلام کیا اور ارتداد کیا؟ ایک طرف اس قدر لوگ مُرتد ہو گئے دوسری طرف اسلام کے خلاف جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کو جمع کریں تو کئی پہاڑ بنتے ہیں۔ بعض پرچے ایسے ہوتے ہیں کہ کئی کئی لاکھ شائع ہوتے ہیں اور ان میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کے سوا اَور کچھ نہیں ہوتا۔ بتاؤ ایسی حالت اور صورت میں اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا وعدہ کہاں گیا؟ اس نے وہ گالیاں سیّد المعصومین کی نسبت سُنیں جن سے دنیا میں لرزہ پڑ گیا مگر اُسے غیرت نہ آئی اور کوئی آسمانی سلسلہ اس نے قائم نہ کیا؟ کیا ایسا ہو سکتا تھا جب چنداں بگاڑ نہ تھا تو مجدد آتے رہے اور جب بگاڑ حد سے بڑھ گیا تو کوئی نہ آیا۔ سوچو تو سہی۔ کیا عقل قبول کرتی ہے کہ جس اسلام کے لیے یہ وعدے اور غیرت خدا تعالیٰ نے دکھائی جس کے نمونے صدرِ اسلام میں موجود ہیں تو اب ایسا ہوا کہ نعوذ باللہ مر گیا۔ اب اگر پادری یا دوسرے مذاہب کے لوگ پوچھیں کہ کیا نشان ہے اس کی سچائی کا تو بتاؤ قِصّہ کے سوا کیا جواب ہے جیسے ہندو کوئی پستک پیش کر دیتے ہیں ویسے ہی یہ چند ورق لیکر آگے ڈال سکتے ہیں۔ بڑی بات یہ کہ معجزات کے لیے چند حدیثیں پیش کر دیں مگر کوئی کب مان سکتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس بعد کے لکھے ہوئے واقعات صحیح ہیں مخالف پر حجت کیونکر ہو۔ وہ تو زندہ خدا اور زندہ معجزہ کو مانے گا۔

اس وقت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اَور خرابیوں کے علاوہ اسلام کو بھی مُردہ مذہب بتایا جاتا ہے حالانکہ نہ وہ کبھی مُردہ[۱] ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے اس کی زندگی کے ثبوت میں آسمان سے نشان دکھائے۔ کسوف خسوف بھی ہوا طاعون

---

[۱] البدر میں ہے:۔ "لیکن اسلام نہ مُردہ ہے نہ مُردہ مذہب ہوگا" (البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۵ کالم اوّل مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء)
ترتیب عبارت کے لحاظ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "نہ وہ مُردہ ہے نہ کبھی مُردہ ہوگا" ہونا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے اس فقرہ کا پہلا حصہ سہواً رہ گیا ہے۔ (مرتب)

بھی آئی ۔ حج بھی بند ہوا ۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (التکویر : ۵) کے موافق ریلیں بھی جاری ہوئیں ۔غرض وہ نشان جو اس زمانہ کے لیے رکھے تھے پورے ہوئے مگر یہ کہتے ہیں ابھی وہ وقت نہیں آیا ۔

ماسوا اس کے وہ نشان ظاہر کئے جن کے گواہ نہ صرف ہماری جماعت کے لوگ ہیں ۔ بلکہ ہندو اور عیسائی بھی گواہ ہیں اور اگر وہ دیانت امانت کو نہ چھوڑیں تو اُن کو سچی گواہی دینی پڑے گی ۔ مَیں نے بارہا کہا ہے کہ صادق کی شناخت کے تین بڑے معیار ہیں ۔ اوّل نصوص کو دیکھو ۔ پھر عقل کو دیکھو کہ کیا حالات موجودہ کے موافق کسی صادق کو آنا چاہیئے یا نہیں ؟ تیسرا کیا اس کی تائید میں کوئی معجزات اور خوارق بھی ہیں ؟ مثلاً پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دیکھتے ہیں کہ توریت انجیل میں بشارات موجود ہیں ، یہ تو نصوص کی شہادت ہے اور عقل اس واسطے موید ہے کہ اس وقت بحر و بر میں فساد تھا گویا نبوت کا ثبوت ایک نص تھا دوسرا ضرورت تیسرے وہ معجزات جو آپ سے صادر ہوئے ۔

اب اگر کوئی سچے دل سے طالب حق ہو تو اسکو یہی باتیں یہاں دیکھنی چاہئیں اور اُس کے موافق ثبوت لے ۔ اگر نہ پائے تو تکذیب کا حق اُسے حاصل ہے اور اگر ثابت ہو جائیں اور وہ پھر بھی تکذیب کرے تو میری نہیں کُل انبیاء کی تکذیب کرے گا ۔

نووارد ۔ اگر ان ضروریات موجودہ کی بناء پر کوئی اَور دعویٰ کرے کہ مَیں عیسیٰ ہوں تو کیا فرق ہوگا ؟

حضرت اقدس ۔ یہ فرضی بات ہے ایسے شخص کا نام لیں ۔ اگر یہی بات ہے کہ ایک کاذب بھی کہہ سکتا ہے تو پھر آپ اس اعتراض کا جواب دیں کہ اگر مسیلمہ کذاب کہتا کہ توریت اور انجیل کی بشارت کا مصداق مَیں ہوں تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کے لیے کیا جواب دینگے ؟

نووارد ۔ مَیں نہیں سمجھا ۔

حضرت اقدس ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا یہ اعتراض صحیح ہو سکتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بھی تو بعض جھوٹے نبی موجود تھے جیسے مسیلمہ کذاب ، اسود عنسی ۔ اگر انجیل اور توریت میں جو بشارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجود ہیں اسکے موافق یہ کہتے کہ یہ بشارات میرے حق میں ہیں تو کیا جواب ہو سکتا تھا ؟

نووارد ۔ مَیں اس کو تسلیم کرتا ہوں ۔

حضرت اقدس ۔ یہ سوال اس وقت ہو سکتا تھا جب ایک ہی جزو پیش کرتا مگر مَیں تو کہتا ہوں کہ میری تصدیق میں دلائل کا ایک مجموعہ میرے ساتھ ہے ۔ نصوصِ قرآنیہ حدیثیہ میری تصدیق کرتے ہیں ۔ ضرورتِ موجودہ میرے وجود کی داعی اور وہ نشان جو میرے ہاتھ پر پُورے ہوئے ہیں وہ الگ میرے مصدق ہیں ۔ ہر ایک نبی ان امور ثلثہ کو پیش کرتا رہا ہے اور مَیں بھی یہی پیش کرتا ہوں ۔ پھر کس کو انکار کی گنجائش ہے ۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ

میرے لیے ہے تو اُسے میرے مقابلہ میں پیش کرو۔
(ان فقرات کو حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے جوش سے بیان کیا کہ وہ الفاظ میں ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نو وارد صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور پھر چند منٹ کے بعد انہوں نے اپنا سلسلہ کلام یوں شروع کیا۔)

نو وارد۔ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے جو آیا ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے کیا یہ صحیح ہے؟[1]

حضرت اقدس۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو آیا ہے کہ آپ مثیلِ موسیٰ تھے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے عصا کا سانپ بنایا ہو۔ کافر یہی اعتراض کرتے رہے۔ فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (الانبیاء: ۶) معجزہ ہمیشہ حالتِ موجودہ کے موافق ہوتا ہے۔ پہلے نشانات کافی نہیں ہو سکتے اور نہ ہر زمانہ میں ایک ہی قسم کے نشان کافی ہو سکتے ہیں۔

نو وارد۔ اس وقت آپ کے پاس کیا معجزہ ہے؟

حضرت اقدس۔ ایک ہو تو بیان کروں۔ ڈیڑھ سو کے قریب نشان مَیں نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں جنکے ایک لاکھ کے قریب گواہ ہیں اور ایک نوع سے وہ نشانات ایک لاکھ کے قریب ہیں۔

نو وارد۔ عربی میں آپ کا دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ فصیح کوئی نہیں لکھ سکتا۔

حضرت اقدس۔ ہاں

---

[1] البدر نے اس پر یہ نوٹ دیا ہے:۔
"چونکہ سائل کا مطلب اس سوال سے یہ تھا کہ آپ جو مسیح موعود ہونے کے مدعی ہیں تو کس قدر مُردے زندہ کئے آپ نے فرمایا کہ:۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مثیلِ موسیٰ کہا گیا تو آپ بتلایئے کہ آنحضرتؐ نے کس قدر عصا کے سانپ بنائے؟ اور کونسے دریائے نیل پر آپ کا گذر ہوا؟ اور کب اور کسقدر جُوئیں مینڈکیں اور خون آپ کے زمانہ میں برسا؟ کیونکہ جب آپ مثیلِ موسیٰ تھے تو پھر آپ کے نزدیک تو تمام نشان موسیٰ والے آنحضرتؐ سے ظاہر ہوتے تو وہ مثیلِ موسیٰ ہوتے۔ کفار نے بھی اس قسم کا سوال آپ سے کیا تھا۔ فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ جیسے موسیٰ اور عیسیٰ کو معجزات دیئے گئے ویسے ہی تم بھی دکھاؤ لیکن آنحضرتؐ نے ایسا نشان نہ دکھایا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ معجزات ہمیشہ حالتِ موجودہ کے موافق ہوتے ہیں جیسے زمانہ کی ضرورت کا تقاضا ہوتا ہے ویسے ہی خوارقِ عادات ہر ایک مرسل من اللہ لیکر آتا ہے۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۵ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء)

نووارد۔ بے ادبی معاف۔ آپ کی زبان سے قاف ادا نہیں ہو سکتا۔

حضرت اقدس۔ یہ بیہودہ باتیں ہیں[1] میں لکھنؤ کا رہنے والا تو نہیں ہوں کہ میرا لہجہ لکھنوی ہو میں تو پنجابی ہوں حضرت موسیٰ پر بھی یہ اعتراض ہوا کہ لَا يَكَادُ يُبِيْنُ اور احادیث میں مہدی کی نسبت بھی آیا ہے کہ اس کی زبان میں لکنت ہو گی۔

(اس مقام پر ہمارے ایک مخلص مخدوم کو یہ اعتراض بحسنِ ارادت اور غیرتِ عقیدہ کے سبب سے ناگوار گذرا۔ اور وہ سُوءِ ادبی کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے کہا کہ یہ حضرت اقدسؑ ہی کا حوصلہ ہے۔ اس پر نووارد صاحب کو بھی طیش سا آگیا اور انہوں نے بخیال خویش یہ سمجھا کہ انہوں نے غصہ سے کہا ہے اور کہا کہ میں اعتقاد نہیں رکھتا اور حضرت اقدس سے مخاطب ہو کر کہا کہ استہزاء اور گالیاں سُننا انبیاء کا ورثہ ہے)

حضرت اقدس۔ ہم ناراض نہیں ہوتے یہاں تو خاکساری ہے۔

نووارد۔ میں تو وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (بقرۃ: ۲۶۱) کی تفسیر چاہتا ہوں۔

حضرت اقدس۔ میں آپ سے یہی توقع رکھتا ہوں مگر اللہ جلّشانہٗ نے اطمینان کا ایک ہی طریق نہیں رکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو اَور معجزات دیئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اَور معجزات دیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اَور قسم کے نشان بخشے۔ میرے نزدیک وہ شخص کذاب ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کی طرف سے آیا ہوں اور کوئی معجزہ اور تائیدات اپنے ساتھ نہ رکھتا ہو۔ مگر یہ بھی میرا مذہب نہیں کہ معجزات ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں اور میں اس کا قائل نہیں کیونکہ قرآن شریف سے یہ امر ثابت نہیں کہ ہر ایک اقتراح کا جواب دیا جاتا ہے۔ مداری[2] کی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کئے گئے کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور وہاں سے کتاب لے آئیں یا یہ کہ تمہارا سونے کا گھر ہو یا یہ کہ مکہ میں نہر آجائے مگر ان کا جواب کیا ملا؟ یہی هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرآئیل: ۹۴)

انسان کو مؤدب بادب انبیاء ہونا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ جو کچھ دکھاتا ہے انسان اس کی مثل نہیں لا سکتا۔ میری تائید میں ایک نوع سے ڈیڑھ سو اور ایک نوع سے ایک لاکھ نشانات ظاہر ہوئے ہیں[3]

---

[1] البدر میں ہے "یہ ایک بیہودہ اعتراض ہے"۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۵ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "معجزات مداری کا کھیل نہیں کہ جو کچھ اس سے مانگا اس نے جھٹ ٹوکرے یا تھیلے میں سے نکال کر دکھا دیا"۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۱ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

[3] البدر میں ہے:۔ "سوا یسے نشان ہم نے نزول المسیح میں لکھے ہیں اور ایک طریق سے دیکھا جاوے تو یہ نشان کئی لاکھ موجود ہیں۔ آپ ایک دو دن ٹھہریں اور دیکھ لیویں"۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت اقدس۔ اچھا کیا آپ نے دو تین روز کا مصمم ارادہ کرلیا ہے؟

نووارد۔ کل عرض کرونگا۔

حضرت اقدس۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ دور دراز سے آئے ہیں کچھ واقفیت ضرور ہونی چاہیئے۔ کم ازکم تین دن آپ رہ جائیں مَیں یہی نصیحت کرتا ہوں اور اگر اَور نہیں تو آمدن بارادت و رفتن باجازت ہی پر عمل کریں۔

نووارد۔ مَیں نے یہاں آکر اوّل دریافت کرلیا تھا کہ کوئی امر شرک کا نہیں۔ اس لیے مَیں ٹھہر گیا کیونکہ شرک سے مجھے سخت نفرت ہے۔

حضرت اقدس نے پھر جماعت کو خطاب کرکے فرمایا کہ

میرے اصول کے موافق اگر کوئی مہمان آوے اور سبّ و شتم تک بھی نوبت پہنچ جاوے تو اس کو گوارا کرنا چاہیئے کیونکہ وہ مریدوں میں تو داخل نہیں ہے۔ ہمارا کیا حق ہے کہ اس سے وہ ادب اور ارادت چاہیں جو مریدوں سے چاہتے ہیں۔ یہ بھی ہم ان کا احسان سمجھتے ہیں کہ نرمی سے بات کریں۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

محمد یوسف صاحب۔ اجی جناب ٹھہر کر کیا کروں گا۔ اکیلا آدمی ہوں اور یہاں یہ جوش خروش۔ مَیں ڈرتا تو کسی سے نہیں مگر ایسا ہی لگتا ہے تو مَیں بھی تار دے کر اپنے دوستوں کو بلا لیتا ہوں۔

ناظرین پر واضح ہو کہ اس اثناء میں جبکہ ہمارے جوشیلے احمدی بھائی نے ان نئے سائل کو غیر تمندانہ جواب دیا تھا تو حضرت اقدس نے ان کو چُپ کروا دیا تھا۔ پھر محمد یوسف صاحب کے اس اعتراض پر فرمایا۔

حضرت اقدس۔ یہ تقاضائے محبّت ہے کچھ اَور نہیں۔ محبّت میں ایسا ہوا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی اس کی نظیر دیکھی جاتی ہے کہ ابوبکرؓ جیسا شخص جو کہ غایت درجہ کا مؤدب تھا جب اس کے سامنے ایک عرب کے سربرآوردہ شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگا کر کہا کہ تونے ان مختلف لوگوں کا جتھا بنا کر جو عرب کی قوم کا مقابلہ کرنا چاہا یہ غلطی ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے اس وقت بڑے غصّہ میں آکر اُسے کہا اُمْصُصْ بِبَظَرِ اللَّاتِ (یہ عرب میں ایک گالی ہوتی ہے) آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ یہ کس قدر نقصان برداشت کرکے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبّت ہے جس نے بٹھایا ہوا ہے۔ آپ نووارد اور یہ قابلِ احترام (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۱ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں ہے:۔

"اگر کوئی مہمان آوے اور سبّ و شتم تک بھی اس کی نوبت پہنچے تو تم کو چاہیئے کہ چُپ کر رہو جس حال میں کہ وہ ہمارے حالات سے واقف نہیں ہے نہ ہمارے مُریدوں میں وہ داخل ہے تو کیا حق ہے کہ ہم اس سے وہ ادب چاہیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ زیارت کرنیوالے کا تیرے پر حق ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر مہمان کو ذرا سا بھی رنج ہو تو وہ معصیت میں داخل ہے۔ اس لیے مَیں چاہتا ہوں کہ آپ ٹھہریں۔ چونکہ کلمہ کا اشتراک ہے جب تک یہ نہ سمجھیں جو کہیں ان کا حق ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۷ صفحہ ۳ تا ۵ مورخہ ۲۱؍ فروری ۱۹۰۳ء)

۱۴؍ فروری ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

چونکہ نووارد کو پوری طرح تبلیغ کرنا حضرت حجۃ اللہ علیہ السلام کا منشا تھا لہٰذا سیر میں بھی اس کو خطاب کرکے آپ نے سلسلہ تقریر شروع فرمایا۔[1] (ایڈیٹر الحکم)

مامور کے آنے پر دو گروہ ہو جاتے ہیں

مَیں نے بہت غور کیا ہے کہ جب کوئی مامور آتا ہے تو دو گروہ خود بخود ہو جاتے ہیں ایک موافق دوسرا مخالف۔ اور یہ بات بھی ہر ایک عقل سلیم رکھنے والا جانتا ہے کہ اس وقت ایک جذب اور ایک نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی سعید الفطرت کھنچے چلے آتے ہیں اور جو لوگ سعادت سے حصّہ نہیں رکھتے ان میں نفرت بڑھنے لگتی ہے۔ یہ ایک فطرتی بات ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

طبیب اس امر کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس سے وہی شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو اوّل اپنے مرض کو شناخت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

جو ایک مرید کو کرنا چاہیئے۔ یہ بھی ان کا احساس ہے کہ نرمی سے بات کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری جماعت پر وہ دن آوے کہ جو لوگ محض ناواقف ہیں اگر وہ آویں تو بھائیوں کی طرح سلوک کریں۔ بھلا ان لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ تکلیف اُٹھا کر کچی سڑک پر دھکّے کھاتے آتے ہیں۔ پیغمبرِ خدا فرماتے ہیں کہ زیارت کرنیوالے کا حق ہے کہ جو چاہے کہے۔ ہمارے لیے تلخی کرنا معصیت ہے ان کو اسی لیے ٹھہراتا ہوں کہ یہ غلطی رفع ہو بھائیوں کی طرح سلوک کیا کرو اور پیش آیا کرو۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۱ مورخہ ۶؍ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں سلسلہ تقریر شروع کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل مکالمہ کا ذکر ہے:۔ حضرت اقدس (سیر کے لیے) تشریف لائے تو آتے ہی آپ نے محمد یوسف صاحب نووارد مہمان سے دریافت فرمایا کہ کیا آپ نے توقف کا ارادہ کر لیا ہے؟

محمد یوسف صاحب۔ آج تو ضرور ہی ٹھہروں گا۔

حضرت اقدس۔ ہم آپ کو کتابیں دیدیں گے خود بھی دیکھنا اَوروں کو بھی دکھانا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۱ مورخہ ۶؍ مارچ ۱۹۰۳ء)

کرے اور محسوس کرے کہ مَیں بیمار ہوں اور پھر یہ شناخت کرے کہ طبیب کون ہے؟ جب تک یہ دو باتیں پیدا نہ ہوں وہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ بھی یاد رہے کہ مرض دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مرض مختلف ہوتا ہے جیسے قولنج کا درد یعنی جو محسوس ہوتا ہے اور ایک مستوی جیسے برص کے داغ کہ ان کا کوئی درد اور تکلیف بظاہر محسوس نہیں ہوتی، انجام خطرناک ہوتا ہے مگر انسان ایسی صورتوں میں ایک قسم کا اطمینان پاتا ہے اور اس کی چنداں فکر نہیں کرتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اوّل اپنے مرض کو شناخت کرے اور اُسے محسوس کرے۔ پھر طبیب کو شناخت کرے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی معمولی حالت پر راضی ہو جاتے ہیں۔[1] یہی حال اس وقت ہو رہا ہے۔ اپنی حالت پر خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ مہدی کی کیا ضرورت ہے حالانکہ خدادانی اور معرفت سے بالکل خالی ہو رہے ہیں۔

خدادانی اور معرفت بہت مشکل امر ہے۔ ہر چیز اپنے لوازمات کے ساتھ آتی ہے پس جہاں خدادانی آتی ہے اس کے ساتھ ہی ایک خاص معرفت اور تبدیلی بھی آجاتی ہے کبائر اور صغائر جو چیونٹیوں کی طرح ساتھ لگے ہوئے ہیں خدا کی معرفت کیساتھ ہی وہ دُور ہونے لگتے ہیں یہانتک کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اب مَیں وہ نہیں بلکہ اَور ہوں۔ خدادانی میں جب ترقی کرنے لگتا ہے تو گناہ سے بیزاری اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے یہانتک کہ اطمینان کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔

نفس کی تین قسمیں

نفس تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک نفسِ امّارہ ایک لوّامہ اور تیسرا مطمئنّہ پہلی حالت میں تو صُمٌّ بُکْمٌ ہوتا ہے۔ کچھ معلوم اور محسوس نہیں ہوتا کہ کدھر جا رہا ہے۔ امّارہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے تو معرفت کی ابتدائی حالت میں لوّامہ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور گناہ اور نیکی میں فرق کرنے لگتا ہے۔ گناہ سے نفرت کرتا ہے مگر پُوری قدرت

---

[1] البدر میں یہ مضمون یوں درج ہے:۔ امراض کی دو قسمیں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"اسی طرح انسان کی حالت ہے وہ دنیا میں آتا ہے۔ برص کی طرح اُسے امراض لگے ہوئے ہوتے ہیں (مگر) اُسے اس بات کا علم نہیں ہوتا۔ سب سے اوّل اُسے چاہیئے کہ مرض کو دریافت کرے جس میں وہ مبتلا ہے۔ بہت لوگ ہیں کہ کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور کلمہ گو بھی ہیں مگر وہ مسیح کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونا ایک مشکل امر ہے اور خدادانی کوئی منہ کی بات نہیں۔ جب سچے طور سے انسان کو آنکھ (عطاء) کی جاتی ہے اس وقت اس کو خدا کا خوف اور خشیت پیدا ہوتی ہے۔ کبائر تو موٹے گناہ ہیں جن کو ہر ایک جانتا ہے لیکن صغائر مثل چیونٹیوں کے انسان کو چمٹے ہوئے ہیں۔ ان کا ترک کرنا ایک مشکل امر ہے۔ ایک نئی تبدیلی جب تک انسان کے اندر نہ ہو تب تک اُسے اُن کا علم ہی نہیں ہوتا۔ جب یہ ہو تو وہ محسوس کرتا ہے کہ مَیں ایک اَور۔ اور نیا انسان ہوں۔ اس وقت تک اس کی ترقی طلب بھی نہیں ہوتی۔ یہ اُس وقت ہوتی ہے جب اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مَیں گناہوں سے بچوں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۱-۵۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

اور طاقت عمل کی نہیں پاتا نیکی اور شیطان سے ایک قسم کا جنگ ہوتا رہتا ہے یہانتک کہ کبھی یہ غالب ہوتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ حالت آجاتی ہے کہ یہ مطمئنہ کے رنگ میں آجاتا ہے اور پھر گناہوں سے نری نفرت ہی نہیں ہوتی بلکہ گناہ کی لڑائی میں یہ فتح پا لیتا ہے اور اُن سے بچتا ہے اور نیکیاں اس سے بلا تکلف صادر ہونے لگتی ہیں پس اس اطمینان کی حالت پر پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے لوّامہ کی حالت پیدا ہو اور گناہ کی شناخت ہو۔ گناہ کی شناخت حقیقت میں بہت بڑی بات ہے جو اُس کو شناخت نہیں کرتا اس کا علاج نبیوں کے پاس نہیں ہے[لہ] نیکی کا پہلا دروازہ اسی سے کُھلتا ہے (کہ) اوّل اپنی کورانہ زندگی کو سمجھے اور پھر بُری مجلس اور بُری صحبت کو چھوڑ کر نیک مجلس کی قدر کرے۔ اس کا یہی کام ہونا چاہیئے کہ جہاں بتایا جائے کہ اُس کے مرض کا علاج ہوگا وہ اس طبیب کے پاس رہے اور جو کچھ وہ اس کو بتاوے اس پر عمل کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو۔ دیکھو بیمار جب کسی طبیب کے پاس جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ طبیب کے ساتھ مباحثہ شروع کر دے بلکہ اس کا فرض یہی ہے کہ وہ اپنا مرض پیش کرے اور جو کچھ طبیب اس کو بتائے[ٹے] اس سے وہ فائدہ اُٹھائے گا۔ اگر اُس کے علاج پر جرح شروع کر دے تو فائدہ کس طرح ہوگا۔

انسان کی پیدائش کی علّتِ غائی

انسان کا فرض ہے کہ اس میں نیکی کی طلب صادق ہو اور وہ اپنے مقصد زندگی کو سمجھے قرآن شریف میں انسان کی زندگی کا مقصد یہ بتایا گیا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (الذّاریات: ۵۷) یعنی جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں جب انسان کی پیدائش کی علّت غائی یہی ہے تو پھر چاہیئے کہ خدا کو شناخت کریں۔ جب کہ انسان کی پیدائش کی علّت غائی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرے اور عبادت کے واسطے اوّل معرفت کا ہونا ضروری ہے۔ جب سچّی معرفت ہو جاوے تب وہ اس کی خلاف مرضی کو ترک کرتا۔ اور سچا مسلمان ہو جاتا ہے۔ جب تک سچا علم پیدا نہ ہو کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھو جن چیزوں کے نقصان کو انسان یقینی سمجھتا ہے اُن سے بچتا ہے مثلاً سم الفار ہے جانتا ہے کہ یہ زہر ہے اس لیے اس کو استعمال کرنے کیلئے جرأت اور دلیری نہیں کرتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس کا کھانا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔ ایسا ہی کسی زہریلے سانپ کے بِل میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یا طاعون والے گھر میں نہیں ٹھہرتا۔ اگرچہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے

لہ (البدر سے) یہ بات غلط ہے کہ کسی نبی یا ولی کے پاس جانے سے ایک دم میں ہی ایک پھُونک سے سب کچھ ہو جاتا ہے اور وہ ہدایت پاتا ہے۔ ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے یہ نہ نبی کا کام ہے نہ کسی اَور کا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

ٹے (البدر سے) "اگر علاج اچھا ہو تو اس کے پاس رہے ورنہ نہیں کیا اگر ایک بچہ ابتدا ہی میں اُستاد سے الف پر بحث کرے کہ یہ الف کیوں ہے تو وہ کیا حاصل کریگا یہ تو بدبختی کی نشانی ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

اللہ تعالیٰ کے منشاء سے ہوتا ہے۔ تاہم وہ ایسے مقامات میں جانے سے ڈرتا ہے اب سوال یہ ہے کہ پھر گناہ سے کیوں نہیں ڈرتا؟[1]

انسان کے اندر بہت سے گناہ ایسی قسم کے ہیں کہ وہ معرفت کی خوردبین کے سوا نظر ہی نہیں آتے۔ جُوں جُوں معرفت بڑھتی جاتی ہے انسان گُناہوں سے واقف ہوتا جاتا ہے بعض صغائر ایسی قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ اُن کو نہیں دیکھتا لیکن معرفت کی خوردبین اُن کو دکھا دیتی ہے۔

غرض اوّل گناہ کا علم عطا ہوتا ہے پھر وہ خدا جس نے مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ (الزلزال: ۸) (فرمایا ہے) اس کو عرفان بخشتا ہے۔ تب وہ بندہ خدا کے خوف میں ترقی کرتا اور اس پاکیزگی کو پالیتا ہے جو اس کی پیدائش کا مقصد ہے۔

جماعت کے قیام کی غرض

اس سلسلہ سے خدا تعالیٰ نے یہی چاہا ہے اور اس نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ تقویٰ کم ہوگیا ہے۔ بعض تو کھلے طور پر بےحیائیوں میں گرفتار ہیں اور فسق و فجور کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ایک قسم کی ناپاکی کی مُلونی اپنے اعمال کے ساتھ رکھتے ہیں مگر انہیں نہیں معلوم کہ اگر اچھے کھانے میں تھوڑا سا زہر پڑ جاوے تو وہ سارا زہریلا ہو جاتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو چھوٹے چھوٹے (گناہ) ریاکاری وغیرہ جن کی شاخیں باریک[2] ہوتی ہیں اُن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ دنیا کو تقویٰ اور طہارت کی زندگی کا نمونہ دکھائے۔ اسی غرض کیلئے اس نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے۔ وہ تطہیر چاہتا ہے اور ایک پاک جماعت بنانا اس کا منشاء ہے۔

ایک پہلو تو میری بعثت اور ماموریت کا یہ ہے۔ دوسرا پہلو کسرِ صلیب کا ہے۔ کسرِ صلیب کیلئے جسقدر جوش خدا نے مجھے دیا ہے اس کا کسی دوسرے کو علم نہیں ہوسکتا۔ صلیبی مذہب نے جو کچھ نقصان عورتوں، مردوں اور جوانوں کو پہنچایا ہے اس کا اندازہ مُشکل ہے[3]۔ ہر پہلو سے اسلام کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہے تو وہ طبابت کے رنگ

---

[1] (البدر سے) "صرف یہی ہے کہ اس کو یقین نہیں ہے اور اس کو اس بات کا مطلق علم نہیں کہ گناہ مُہلک ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] (البدر سے) "ایک وہ ہیں جو کہ باریک گناہوں کے مرتکب ہیں۔ اگرچہ ظاہری طور پر ہر انسان سمجھتا ہے کہ یہ بڑے دیندار ہیں، لیکن عُجب اور ریا اور باریک باریک معاصی میں مبتلا ہیں جو کہ عارفانہ خوردبین سے نظر آتے ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

[3] (البدر سے) پادریوں کا فتنہ کسقدر ہے۔ کیا کچھ نقصان انہوں نے اسلام کو پہنچایا ہے۔ ۳۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان ان کے ہاتھوں پر مُرتد ہو چکے ہیں۔ ہر گاؤں میں ہر محلہ میں انہوں نے ڈیرہ لگایا ہے کروڑہا رسالہ جات، کتابیں اسلام کی تردید میں انکی طرف سے نکل کر مفت شائع ہوتی ہیں اور یہ اس قسم کے فتنے ہیں کہ اسکی نظیر شروع سے لیکر ابتک کسی زمانہ میں نہیں ملتی اور انکے حملے مختلف طور پر ہیں۔"

(حوالہ ایضاً)

میں یا صدقات وخیرات کے رنگ میں، عہدہ دار ہو تب ولیم میور کی طرح اپنے رنگ میں بغرض صدہا شاخیں ہیں جو اسلام کے استیصال کے لیے انہوں نے اختیار رکھی ہیں۔ یہ دل سے چاہتے ہیں کہ ایک فرد بھی اسلام کا نام لینے والا باقی نہ رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والا کوئی نہ ہو۔ ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن میں اُن کے جوش کو بیان کر سکیں۔

ایسی حالت میں خدا تعالیٰ نے مجھے وہ جوش کسرِ صلیب کے لیے دیا ہے کہ دُنیا میں اس وقت کسی اُور کو نہیں دیا گیا پھر کیا یہ جوش بدوں خدا کی طرف سے مامور ہو کر آنے کے پیدا ہو سکتا ہے؟

جس قدر توہین اللہ تعالیٰ کی اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کی گئی ہے کیا ضرور نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو غیور ہے آسمان سے مدد کرتا۔

غرض ایک طرف تو یہ صلیبی فتنہ انتہاء کو پہنچا ہوا ہے دوسری طرف صدی ختم ہو گئی۔ تیسری طرف اسلام کا ہر ایک پہلو سے ضعیف ہونا۔ کسی طرف نظر اُٹھا کر دیکھو طبیعت کو بشاشت نہیں ہوتی ایسی صورت میں ہم چاہتے ہیں کہ پھر خدا کا جلال ظاہر ہو۔ مجھے محض ہمدردی سے کلام کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ مَیں جانتا ہوں کہ غائبانہ میری کیسی ہنسی کی جاتی ہے اور کیا کیا افتراء ہوتے ہیں مگر جو جوش خدا تعالیٰ نے مجھے ہمدردی مخلوق کا دیا ہوا ہے وہ مجھے ان باتوں کی کچھ بھی پروا نہیں کرنے دیتا۔ مَیں تو خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں نہ لوگوں کو۔ اس لیے مَیں اُن کی گالیوں اور ٹھٹھوں کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ میرا مولیٰ میرے ساتھ ہے۔ ایک وقت تھا کہ ان راہوں میں مَیں اکیلا پھرا کرتا تھا۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے مجھے بشارت دی کہ تو اکیلا نہ رہے گا بلکہ تیرے ساتھ فوج در فوج لوگ ہوں گے اور یہ بھی کہا کہ تو ان باتوں کو لکھ لے اور شائع کر دے کہ آج تیری یہ حالت ہے پھر نہ رہے گی۔ مَیں سب مقابلہ کرنیوالوں کو پست کر کے ایک جماعت کو تیرے ساتھ کرونگا وہ کتاب موجود ہے مکہ معظمہ میں بھی اس کا ایک نسخہ بھیجا گیا تھا۔ بخارا میں بھی اور گورنمنٹ کو بھی اس میں جو پیشگوئیاں ۲۲ سال پیشتر چھپ کر شائع ہوئی ہیں وہ آج پوری ہو رہی ہیں کون ہے جو ان کا انکار کرے۔ ہندو مسلمان اور عیسائی سب گواہی دیں گے کہ یہ اس وقت بتایا گیا تھا جب مَیں اَحَدٌ مِّنَ النَّاس تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تیری مخالفت ہو گی مگر مَیں تجھے بڑھاؤنگا یہانتک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ اب ایک آدمی سے پونے دولاکھ تک تو نوبت پہنچ گئی۔ دوسرے وعدے بھی ضرور پورے ہوں گے۔

لیکھرام کے متعلق نشان

پھر آریوں کے مقابل میں ایک نشان مجھے دیا گیا جو لیکھرام کے متعلق تھا وہ اسلام کا دشمن تھا اور گندی گالیاں دیا کرتا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتا تھا۔ یہاں قادیان آیا اور اُس نے مجھ سے نشان مانگا۔ مَیں نے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی۔

چنانچہ مَیں نے اس کو شائع کردیا اور یہ کوئی بات نہیں کُل ہندوستان اس کو جانتا ہے کہ جس طرح قبل از وقت اس کی موت کا نقشہ کھینچ کر دکھایا گیا تھا اسی طرح وہ پورا ہوگیا۔ اس کے علاوہ اَور بہت سے نشانات ہیں جو ہم نے اپنی کتابوں میں درج کیئے ہیں اور اس پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں کہ ہمارا خدا تھکنے والا خدا نہیں۔ وہ تکذیب کرنے والوں کیلئے ہر وقت تیار ہے۔ مَیں نے پنجاب کے مولویوں اور پادریوں کو ایسی دعوت دی ہے کہ وہ میرے مقابل میں آکر نشانات کو جو ہم پیش کرتے ہیں فیصلہ کرلیں اگر ان کو نہ مانیں تو دُعا کرسکتا ہوں اور اپنے خدا پر یقین رکھتا ہوں کہ اور نشان ظاہر کردیگا لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ وہ صدقِ نیت سے اس طرف نہیں آتے بلکہ لیکھرامی حیلے کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کسی کی حکومت کے نیچے نہیں ہے۔

مَیں بار بار یہی کہتا ہوں کہ پہلے ان خوارق کو جو مَیں پیش کرتا ہوں۔ دیکھ لو اور منہاجِ نبوت پر سوچو۔ اگر پھر بھی تکذیب کے لیے جرأت کروگے تو خدا کی غیرت کے لیے زیادہ جنبش ہوگی اور وہ قادر ہے کہ کوئی امر انسانی طاقت سے بالاتر ظاہر کرے۔

لیکھرام کی نسبت جب پیشگوئی کی گئی تھی تو اس نے بھی میرے لیے ایک پیشگوئی کی تھی اور یہ شائع کردیا تھا کہ تین سال کے اندر ہیضہ سے ہلاک ہوجاوے گا مگر اب دیکھ لو کہ اس کی ہڈیوں کا بھی کہیں نشان پایا جاتا ہے؛ مگر مَیں خدا تعالیٰ کے فضل سے اسی طرح زندہ ہوں۔

یہ امور ہیں۔ اگر حق پسند توقف سے ان میں غور کرے تو فائدہ اُٹھاسکتا ہے۔ مگر نرے بحث کرنے والے جلدباز کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا[۲]

منجملہ میرے نشانوں کے طاعون کا بھی ایک نشان ہے۔ اس وقت مَیں نے خبر دی تھی جبکہ ابھی کوئی نام ونشان بھی اس کا نہ پایا جاتا تھا اور یہ بھی الہام ہوا تھا یا مسیح الخلق عدوا نا اب دیکھ لو کہ یہ وبا خطرناک طور پر پھیلی ہوئی ہے اور گاؤں کے گاؤں اس طرف رجوع کررہے ہیں اور توبہ کرتے جاتے ہیں۔ کیا یہ باتیں انسانی طاقت کے اندر ہیں؟ یہی اُمور ہیں جو خارق عادت کہلاتے ہیں۔

---

[۱] (البدر سے) "اس طرح کے سوال کرتے ہیں کہ زمین کو اُلٹ کر دکھا دو۔ ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ اس طرح کے سوالات تو کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۳ مورخہ ۶ رمارچ ۱۹۰۳ء)

[۲] (البدر سے) "یہ اُمور ہیں جو ایک صالح اور شریف کے واسطے قابلِ غور ہیں بشرطیکہ وہ اپنے نفس کا علاج کرنیوالا ہو۔ اس کو یہ موقعہ نہیں ہے کہ بحث کرے۔ اسے خیال کرنا چاہیئے کہ خدا کا ایک قہری نشان موت (طاعون) سر پر ہے کسی کو کیا علم کہ اس نے کہاں تک سیر کرنا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۳ مورخہ ۶ رمارچ ۱۹۰۳ء)

تجدیدِ دین کی ضرورت

نووارد۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر صدی پر مجدّد ہونا چاہیئے[1]

حضرت اقدس۔ ہاں یہ تو ضروری ہے کہ ہر صدی کے سر پر مجدّد آئے۔

بعض لوگ اس بات کو سُنکر پھر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جبکہ ہر صدی پر مجدّد آتا ہے تو پھر تیرہ صدیوں کے مجدّدوں کے نام بتاؤ۔ مَیں اس کا پہلا جواب یہ دیتا ہوں کہ اُن مجدّدوں کے نام بتانا میرا کام نہیں۔ یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرو جنہوں نے فرمایا ہے کہ ہر صدی پر مجدّد آتا ہے اس حدیث کو تمام اکابر نے تسلیم کر لیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس کو مانتے ہیں کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور حدیث کی کتابیں جو موجود ہیں ان میں یہ حدیث پائی جاتی ہے۔ کسی نے کبھی اس کو پھینک نہ دیا اور نہ کہا کہ یہ حدیث نکال دینی چاہیئے جبکہ یہ بات ہے تو پھر مجھ سے فہرست کیوں مانگی جاتی ہے۔

میرا یہ مذہب ہے کہ عدمِ علم سے عدمِ شیئ لازم نہیں آتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو منسوب ہو اگر وہ قرآن شریف کے برخلاف نہ ہو تو مَیں اس کو مانتا ہوں۔ خود ہی ان لوگوں سے پُوچھو کہ کیا یہ حدیث جھوٹی ہے؟ تو پہلے اس کو نکالو اور اگر شکّی ہے تو پھر تقویٰ کا تقاضا تو یہ ہے کہ کم از کم حدیث کی رُو سے مجھے بھی شکّی ہی مان لو۔ عجیب بات ہے حدیث کو شکّی کہو اور مجھے کذاب! یہ تو تقویٰ کا طریق نہیں۔ اگر بفرضِ محال جُھوٹی ہے تو پھر جان بوجھ کر جھوٹ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا تو لعنتی کا کام ہے۔ سب سے پہلا کام تو علماء کا یہ ہونا چاہیئے کہ اس کو نکال ڈالیں مگر مَیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ حدیث جھوٹی نہیں ہے صحیح ہے۔ یہ عام طور پر مشہور ہے کہ ہر صدی پر مجدّد آتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں وغیرہ نے ۱۳ مجدّد گن کر بھی دکھائے ہیں مگر مَیں اُن کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس حدیث کی صحت کا یہ معیار نہیں بلکہ قرآن اس کی صحت کا گواہ ہے۔ یہ حدیث اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ (سورۃ الحجر: ۱۰) کی شرح ہے صدی ایک عام آدمی کی عمر کی ہوتی ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ سَو سال بعد کوئی نہ رہے گا۔ جیسے صدی جسم کو مارتی ہے اسی طرح ایک رُوحانی

---

[1] البدر میں نووارد کے اس سوال سے پہلے ایک اَور سوال اور اسکا جواب منجانب سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یوں درج ہے۔

"محمد یوسف صاحب۔ یہ امور تو سب ٹھیک ہیں اور آپ کوئی امر خلاف قرآن نہیں کہتے ہیں لیکن مَیں صرف اپنی عقل کے موافق رفع شکوک چاہتا ہوں اور جہالت سے متنفر ہوں۔

حضرت اقدس۔ دیکھئے ایک طریق وکلاء کا ہوتا ہے کہ اُن کو حق ناحق سے غرض نہیں ہوتی جس فریق کا مقدمہ لے لیا اب اسی کی بات کرتے ہیں اور ایک خیال انسان کے اندر ہوتا ہے جس سے وہ خوشبو اور بدبو کا پتہ لے لیتا ہے۔ وہ ایک قسم کا نُور ہوتا ہے جس سے انسان معصیت سے بچا رہتا ہے۔ اب ان عیسائی آریہ وغیرہ کو دیکھا گیا ہے کہ سب اپنے مذہب کی پچ کرتے ہیں ورنہ اُن کے پاس کوئی دلائل حقانیت کے نہیں ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۵۳ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء)

موت بھی واقع ہوتی ہے اس لیے صدی کے بعد ایک نئی ذُرّیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اناج کے کھیت اب دیکھتے ہیں کہ ہرے بھرے ہیں۔ ایک وقت میں بالکل خشک ہوں گے پھر نئے سرے سے پیدا ہو جائینگے اس طرح پر ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پہلے اکابر سو سال کے اندر فوت ہو جاتے ہیں اس لیے خدا تعالیٰ ہر صدی پر نیا انتظام کر دیتا ہے جیسے رزق کا سامان کرتا ہے پس قرآن کی حمایت کے ساتھ یہ حدیث تواتر کا حکم رکھتی ہے۔

کپڑا پہنتے ہیں تو اسکی بھی تجدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طریق پر نئی ذریت کو تازہ کرنے کیلئے سنت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر صدی پر مجدد آتا ہے۔ غرض مجھ سے ایک حدیث کے موافق گذشتہ مجددوں کا مؤاخذہ نہیں ہو سکتا۔ مَیں اپنی صدی کا ذمہ دار ہوں۔ ہاں چونکہ میں اس حدیث کو صحیح سمجھتا ہوں اور قرآن شریف کی حمایت سے صحیح مانتا ہوں پس اگر یہ لوگ اس حدیث کو جھوٹا کہہ دیں اور حدیث کی کتابوں سے نکال دیں پھر مَیں خدا سے دُعا کرونگا اور یقیناً وہ میری دُعا کو سنے گا اور مَیں کشف سے نام بھی بتا دُونگا لیکن اگر یہ حدیث خود اُن کے مسلمات کے موافق ہی جھوٹی نہیں اور نہیں ہے تو پھر خدا سے ڈرو اور لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل: ۳۷) پر عمل کرو اور بیہودہ حیلے اور حجتیں نہ تراشو۔ یہ حدیث جن کتابوں میں درج ہے اور باوجود جھوٹی ہونے کے اس کو رکھا گیا ہے تو پھر کیوں نہیں بابا نانک کے شبد اُن میں داخل کر لیتے اور موضوعات کے مجموعہ میں لکھ لیتے۔ پس کسی صورت میں یہ مؤاخذہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ ہزاروں اولیاء گذر چکے ہیں تو کیا مجھے لازم ہے کہ مَیں اُن کی بھی فہرست دوں۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کا علم ہے۔ ہاں خدا نے مجھ پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور قرآن شریف اس کی تصدیق کرتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مسیح موعود بقول نواب صدیق حسن خاں صاحب کے صدی کے سر پر ہوگا اور یہ بھی وہ کہتے ہیں کہ چودھویں صدی سے آگے نہ ہوگا، مگر اب تو اس صدی سے بیس۲۰ سال گذر گئے۔ پانچواں حصہ صدی کا گذر چکا اگر اب تک بھی نہیں آیا تو پھر سو سال تک انتظار کرتے رہیں۔ اس صدی میں اسلام اہلِ صلیب سے کچلا جاوے گا۔ جب پچاس سال میں یہ حال ہو گیا ہے کہ تیس لاکھ آدمی مُرتد ہو چکے ہیں اور جیسی جیسی شوکت بڑھتی ہے اُن کی شوخی بڑھتی گئی ہے یہاں تک کہ اُمہات المومنین جیسی گندی کتاب شائع کی گئی۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے اسکے خلاف گورنمنٹ کے پاس میموریل بھیجا۔ اس کے میموریل سے پہلے مجھے الہام ہو چکا تھا کہ یہ میموریل بھیجنا بیفائدہ ہے چنانچہ میرے دوستوں کو جو یہاں رہتے ہیں اور اُنکو بھی جو دوسرے شہروں میں ہیں معلوم تھا کہ مَیں نے یہ الہام قبل از وقت اُن کو بتا دیا تھا آخر وہی ہوا اور گورنمنٹ نے اس پر کوئی کارروائی انجمن کے حسب منشا نہ کی۔

مہدی اور جہاد

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا مہدی آنا چاہیئے جو جہاد کا فتویٰ دے اور انگریزوں اور دوسری غیر قوموں سے لڑائی کرے۔ مَیں کہتا ہوں یہ بھی غلط ہے اور حدیث سے بھی پایا جاتا ہے کہ آنے والا موعود یَضَعُ الْحَرْبَ کرکے دکھائے گا یعنی لڑائیوں کو موقوف کریگا۔ دیکھو

ہر چیز کے عنوان پہلے ہی سے نظر آجاتے ہیں جیسے پھل سے پہلے شگوفہ نکل آتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کا یہی منشا ہوتا کہ مہدی آکر جہاد کرتا اور تلوار کے زور سے اسلام کی حمایت کرتا تو چاہیئے تھا کہ مسلمان فنونِ حربیہ اور سپہ گری میں...... تمام قوموں سے ممتاز ہوتے اور فوجی طاقت بڑھی ہوئی ہوتی مگر اس وقت یہ طاقت تو اسی قوم کی بڑھی ہوئی ہے اور فنونِ حرب کے متعلق جس قدر ایجادات ہو رہی ہیں وہ یورپ میں ہو رہی ہیں نہ کسی اسلامی سلطنت میں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے اور یضع الحرب کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے واسطے یہی ہونا بھی چاہیئے تھا دیکھو مہدی سوڈانی وغیرہ نے جب مخالفت میں ہتھیار اٹھائے تو خدا تعالیٰ نے کیسا ذلیل کیا یہانتک کہ اس کی قبر بھی کھدوائی گئی اور ذلت ہوئی اس لیے کہ خدا کے منشا کے خلاف تھا۔ مہدی موعود کا یہ کام ہی نہیں ہے بلکہ وہ تو اسلام کو اس کی اخلاقی اور علمی و عملی اعجازات سے دلوں میں داخل کرے گا اور اس اعتراض کو دُور کرے گا جو کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا۔ وہ ثابت کر دکھائے گا کہ اسلام ہمیشہ اپنی عملی سچائیوں اور برکات کے ذریعہ پھیلا ہے۔ ان تمام باتوں سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا منشا تلوار سے کام لینا ہوتا تو فنونِ حرب اسلام والوں کے ہاتھ میں ہوتے۔ اسلامی سلطنتوں کی جنگی طاقتیں سب سے بڑھ کر ہوتیں۔ اگرچہ حقیقی خبر تو خدا تعالیٰ سے وحی پانے والوں کو ملتی ہے مگر مومن کو بھی ایک فراست ملتی ہے اور وہ علامات و آثار سے سمجھ لیتا ہے کہ کیا ہونا چاہیئے۔ جب عیسائی قوموں کے مقابل آتے ہیں تو زک اُٹھاتے ہیں اور ذلت کا منہ دیکھتے ہیں۔ کیا اس سے پتہ نہیں لگتا کہ خدا تعالیٰ کا منشا تلوار اُٹھانے کا نہیں ہے۔ یہ اعتراض صحیح نہیں غلط ہے۔

مسیح موعود کا یہی کام ہے کہ وہ لڑائیوں کو بند کر دے کیونکہ یَضَعُ الْحَرْبَ اس کی شان میں آیا ہے۔ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کو باطل کر دیگا؟ معاذ اللہ۔ قرآن شریف سے بھی ایسا ہی پایا جاتا ہے کہ اس وقت لڑائی نہیں ہونی چاہیئے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جب دل اعتراضوں سے بھرے ہوئے ہوں تو اُن کو قتل کر دیا جاوے یا تلوار اُٹھا کر مسلمان کیا جاوے۔ وہ اسلام ہوگا یا کُفر جو ان کے دلوں میں اس وقت پیدا ہوگا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں محض دفاعی تھیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مذہب کیلئے تلوار نہیں اُٹھائی بلکہ اتمامِ حجت کے بعد جس طرح پر خدا نے چاہا منکروں کو عذاب دیا۔ وہ جنگیں دفاعی تھیں۔ تیرہ برس تک آپ ستائے جاتے رہے اور صحابہؓ نے جانیں دیں۔ انہوں نے (منکروں نے) نشان پر نشان دیکھے اور انکار کرتے رہے۔ آخر خدا تعالیٰ نے اُن کو جنگوں کی صورت میں عذاب سے ہلاک کیا۔ اس زمانہ میں طاعون ہے۔ جُوں جُوں تعصب بڑھے گا طاعون بڑھے گی۔ قرآن شریف میں اس کی بابت خبر دی گئی ہے وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا۔ (بنی اسرائیل: ۵۹)

پس اگر مَیں خدا کی طرف سے ہوں اور وہ بہتر جانتا ہے کہ مَیں اسی کی طرف سے ہوں تو اس کے وعدے پورے ہو کر

جو بشارت کی پیشگوئیوں کو نہیں مانتے۔ تو اس طاعون کی پیشگوئی کو دیکھ لیں۔ سعادت سے انہیں کو حصّہ ملتا ہے جو دُور سے بُلا کو دیکھتا ہے۔

خدا تعالیٰ پر تقوّل کرنیوالا ہلاک ہو جاتا ہے

صادق کے لیے خدا تعالیٰ نے ایک اور نشان بھی قرار دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر تو مجھ پر تقوّل کرے تو مَیں تیرا دہنا ہاتھ پکڑ لوں۔ اللہ تعالیٰ پر تقوّل کرنیوالا مفتری فلاح نہیں پاسکتا بلکہ ہلاک ہو جاتا ہے اور اب پچیس[۲۵] سال کے قریب عرصہ گذرا ہے کہ خدا تعالیٰ کی وحی کو مَیں شائع کر رہا ہوں۔ اگر افتراء تھا تو اس تقوّل کی پاداش میں ضروری نہ تھا کہ خدا اپنے وعدہ کو پورا کرتا؟ بجائے اس کے کہ وہ مجھے پکڑتا اس نے صدہا نشان میری تائید میں ظاہر کئے اور نصرت پر نصرت مجھے دی۔ کیا مفتریوں کے ساتھ یہی سلوک ہوا کرتا ہے؟ اور دجالوں کو ایسی ہی نصرت ملا کرتی ہے؟ کچھ تو سوچو۔ ایسی نظیر کوئی پیش کرو اور مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں ہرگز نہ ملیگی۔

ہاں مَیں یہ جانتا ہوں کہ طبیب تو مریض کو کلوروفارم سُنگھا کر بھی دوائی اندر پہنچا سکتا ہے۔ روحانی طبابت میں یہ نہیں ہے بلکہ باتوں کو مؤثر بنانا اور دل میں ڈالنا خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ جب چاہتا ہے تو شوخی کو دُور کر کے خود اندر ایک واعظ پیدا کر دیتا ہے۔

<u>نووارد</u>۔ مَیں اہل اسلام کی زیادتی پر تعجب کرتا ہوں۔ آپ کے کلمات میں مَیں کوئی وجہ کفر کی نہیں دیکھتا۔

<u>حضرت اقدس</u>۔ آپ کتابیں بھی دیکھ لیں تا کوئی شک آپ کو باقی نہ رہے کہ کون سے ایسے کلمات ہیں جو قال اللہ اور قال الرسول کے خلاف ہیں۔ مَیں اُن کے کُفر کی پروا نہیں کرتا۔ ضرور تھا کہ ایسا ہی ہوتا کیونکہ اُن کے ہی آثار میں لکھا ہوا تھا کہ مسیح موعود جب آئیگا تو اُس پر کفر کے فتوے دیئے جائیں گے۔ یہ پیشگوئیاں کیسے پوری ہوتیں؟ یہ تو اپنے ہاتھ سے پوری کر رہے ہیں۔ مجدد صاحب اور نواب صدیق حسن خان صاحب کہتے ہیں کہ جب وہ آئے گا تو علماء مخالفت کرینگے اور محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ جب وہ آئیگا تو ایک شخص اُٹھ کر کہے گا اِنَّ ھٰذَا الرَّجُلَ غَیَّرَ دِیْنَنَا۔ اب جبکہ پہلے سے یہ باتیں ہیں تو ہم خوش ہوتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے ہاتھ سے پُورا کر رہے ہیں۔ اب جبکہ یہ باتیں پہلے سے یہ ہیں تو یہ بھی صداقت کا نشان ہے اس لیے ہم ان باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔

یہ جو کہتے ہیں کہ آسمان سے مسیح آئیگا وہ اتنا نہیں دیکھتے کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام وفات پا گئے[۱]

---

[۱] نوٹ:۔ یہاں حضرت اقدس نے آیت شریفہ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ اور حدیث معراج سے استدلال کر کے ایک جامع تقریر فرمائی جو ہم بارہا شائع کر چکے ہیں اور اپنے وجود پر سورہ نُور سے استدلال فرمایا اور ایسا ہی مسیح کی قبر کشمیر کے متعلق بیان فرماتے رہے اور وفاتِ مسیح پر صحابہ کے اجماع کا ذکر فرمایا۔ (ایڈیٹر الحکم)

آخر میں فرمایا کہ

اگر وہ صحابہؓ کا سا مذاق اور محبت ہوتی جو صحابہؓ کے دل میں تھی تو یہ عقیدہ نہ رکھتے کہ وہ زندہ ہیں حضرت عیسیٰؑ کو خالق بھی نہ مانتے اور غیب دان بھی (نہ مانتے) خدا تعالیٰ ان فسادوں کو روا نہیں رکھتا اور اس نے چاہا ہے کہ اصلاح کرے۔ ہمارا کام اللہ کیلئے ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ کاروبار ہے اور اسی کا ہے تو کسی انسان کی طاقت میں نہیں کہ اس کو تباہ کر سکے اور کوئی ہتھیار اس پر چل نہیں سکتا، لیکن اگر انسان کا ہے تو پھر خود ہی تباہ ہو سکتا ہے انسان کو زور لگانے کی بھی کیا حاجت ہے۔

دربار شام

نووارد صاحب کی وجہ سے تحریک تو ہو رہی تھی۔ اس لیے بعد ادائے نماز مغرب حضرت حجۃ اللہ نے ایک مختصر سی جامع تقریر فرمائی۔ جس کا ہم فقط خلاصہ دیتے ہیں۔ فرمایا:۔

حقیقتِ اسلام

لوگ حقیقتِ اسلام سے بالکل دُور جا پڑے ہیں۔ اسلام میں حقیقی زندگی ایک موت چاہتی ہے جو تلخ ہے لیکن جو اس کو قبول کرتا ہے آخر وہی زندہ ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ انسان دنیا کی خواہشوں اور لذتوں کو ہی جنّت سمجھتا ہے حالانکہ وہ دوزخ ہے اور سعید آدمی خدا کی راہ میں تکالیف کو قبول کرتا ہے اور وہی جنّت ہوتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ دُنیا فانی ہے اور سب مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں آخر ایک وقت آجاتا ہے کہ سب دوست آشنا عزیز واقارب جُدا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت جسقدر ناجائز خوشیوں اور لذتوں کو راحت سمجھتا ہے وہ تلخیوں کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ سچّی خوشحالی اور راحت تقویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور تقویٰ پر قائم ہونا گویا زہر کا پیالہ پینا ہے۔ متقی کے لیے خدا تعالیٰ ساری راحتوں کے سامان مہیا کر دیتا ہے مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ (سورۃ الطلاق: ۳،۴) پس خوشحالی کا اصول تقویٰ ہے لیکن حصولِ تقویٰ کیلئے نہیں چاہیئے کہ ہم شرطیں باندھتے پھریں۔ تقویٰ اختیار کرنے سے جو مانگو گے ملیگا۔ خدا تعالیٰ رحیم وکریم ہے تقویٰ اختیار کرو جو چاہو گے وہ دیگا۔ جسقدر اولیاء اللہ اور اقطاب گذرے ہیں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا تقویٰ ہی سے حاصل کیا۔ اگر وہ تقویٰ اختیار نہ کرتے تو وہ بھی دنیا میں معمولی انسانوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے۔ دس بیس کی نوکری کر لیتے یا کوئی اور حرفہ یا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ مگر آج جو عروج اُن کو ملا اور جس قدر شہرت اور عزّت انہوں نے پائی۔ یہ سب تقویٰ ہی کی بدولت تھی۔ انہوں نے ایک موت اختیار کی اور زندگی اُس کے بدلہ میں پائی۔

عبادت اللہ تعالیٰ کی محبتِ ذاتی سے رنگین ہو کر کرو

مَیں دوزخ اور بہشت پر ایمان لاتا ہوں کہ وہ حق ہیں اور انکے

عذاب اور اکرام اور لذائذ سب حق ہیں، لیکن مَیں یہ کہتا ہوں کہ انسان خدا کی عبادت دوزخ یا بہشت کے سہارے سے نہ کرے بلکہ محبت ذاتی کے طور پر کرے۔ دوزخ بہشت کا انکار مَیں کفر سمجھتا ہوں اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا حماقت ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کی محبتِ ذاتی سے رنگین ہو کر کرے جیسے ماں اپنے بچّہ کی پرورش کرتی ہے کیا اس اُمید پر کہ وہ اُسے کھلائے گا۔ نہیں بلکہ وہ جانتی ہی نہیں کہ کیوں اس کی پرورش کر رہی ہے یہانتک کہ اگر بادشاہ اس کو حکم دیدے کہ تو اگر بچّہ کی پرورش نہ کرے گی اور اس سے یہ بچّہ مر بھی جاوے تو تجھ کو کوئی سزا نہ دی جاویگی بلکہ انعام ملیگا تو وہ اس حکم سے خوش ہوگی یا بادشاہ کو گالیاں دے گی؟ یہ محبت ذاتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیئے نہ کہ کسی جزا سزا کے سہارے پر۔

محبتِ ذاتی میں اغراض فوت ہو جاتے ہیں اور خدا تو وہ خدا ہے جو ایسا رحیم و کریم ہے کہ جو اس کا انکار کرتے ہیں ان کو بھی رزق دیتا ہے۔ کیا سچ کہا ہے ؎

دوستاں را کجا کُنی محروم ⁂ تو کہ با دُشمناں نظر داری

جب وہ دشمنوں کو محروم نہیں کرتا تو وہ دوستوں کو کب ضائع کر سکتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کا قول ہے کہ مَیں جوان تھا اب بُوڑھا ہو گیا ہوں مگر مَیں نے متقی کو کبھی ذلیل و خوار نہیں دیکھا اور نہ اُس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے دیکھا۔ یہ اخلاص کا نتیجہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ اسی دنیا میں ظاہر کرتا ہے اور اخلاص ایک کیمیا ہے اور اگر اُس میں اَور باتیں نکالیں تو اس پاکیزہ اور مصفّٰی چشمہ کو گندے چھینٹوں سے ناپاک کر دیتے ہیں وہ خود ہماری حاجتوں سے آگاہ اور واقف ہے اور خوب جانتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں جلا دینے کی کوشش کی گئی اس وقت انکے پاس فرشتے آئے اور کہا کہ نہیں کوئی حاجت ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کو یہی جواب دیا بلیٰ وَ لٰکِنْ اِلَیْکُمْ فَلَا یعنی ہاں حاجت تو ہے لیکن تمہاری طرف نہیں۔ ایسے مقام پر دُعا بھی منع ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام اس مقام کو خوب سمجھتے ہیں ؎

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

غرض اصل غرض انسان کی محبّتِ ذاتی ہونی چاہیئے۔ اس سے جو کچھ اطاعت اور عبادت ہوگی وہ اعلیٰ درجہ کے نتائج اپنے ساتھ رکھے گی۔ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے مبارک بندے ہوتے ہیں وہ جس گھر میں ہوں وہ گھر مبارک اور جس شہر میں ہوں وہ شہر مبارک اس کی برکت سے بہت سی بَلائیں دُور ہو جاتی ہیں۔ اس کی ہر حرکت و سکون، اس کے در و دیوار پر خدا کی برکت اور رحمت نازل ہوتی ہے۔ مَیں اسی راہ کو سکھانا چاہتا ہوں۔ اسی غرض کیلئے خدا تعالیٰ نے مجھے مامور کیا ہے۔

یقیناً یاد رکھو کہ پوست کام نہیں آتا بلکہ مغز کی ضرورت ہے لکھا ہے کہ ایک یہودی سے کسی مسلمان نے کہا کہ

تومسلمان ہوجا۔ کہا کہ مَیں تیرے قول کو تیرے فعل کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں مَیں نے اپنے بیٹے کا نام خالد رکھا تھا حالانکہ شام تک میں اسکو قبر میں بھی دفن کر آیا۔ نام کچھ حقیقت اپنے اندر نہیں رکھتا جبتک کام نہ ہو۔

اسی طرح پر خدا تعالیٰ مغز اور حقیقت کو چاہتا ہے۔ رسم اور نام کو پسند نہیں کرتا۔ جب انسان سچے دل سے سچے اسلام کی تلاش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کو اپنی راہیں دکھا دیتا ہے جیسے فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۷۰) خدا تعالیٰ بخیل نہیں۔ اگر انسان مجاہدہ کریگا تو وہ یقیناً اپنی راہ کو ظاہر کر دیگا۔ ہماری مخالفت میں افترا کرتے اور گالیاں دیتے ہیں۔ اگر تقویٰ سے کام لیتے۔ اگر زمانہ کی اندرونی و بیرونی ضرورتیں ان کی راہنمائی نہ کر سکتی تھیں تو خدا تعالیٰ کی جناب میں تضرع اور ابتہال سے کام لیتے اور رو رو کر دعائیں مانگتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُن کی راہ نمائی کر دیتا اور حق کھول دیتا۔ مومن حقیقی مسیح کے وقت وہی ہوگا جو اس کے تابع ہوگا۔ اگر مَیں صادق ہوں اور ضرور ہوں تو پھر آپ سمجھ لیں کہ میرے مکذب کا کیا حال ہے؟

نووارد۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔

حضرت اقدس۔ دُعا تو مَیں ہندو کے لیے بھی کرتا ہوں مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ امر مکروہ ہے کہ اس کا امتحان کیا جاوے مَیں دُعا کرونگا۔ آپ وقتاً فوقتاً یاد دلاتے رہیں اگر کچھ ظاہر ہوا تو اس سے بھی اطلاع دونگا مگر یہ میرا کام نہیں۔ خدا تعالیٰ چاہے تو ظاہر کرے۔ وہ کسی کے منشاء کے ماتحت نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے اور غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ (یوسف: ۲۲) ایمان کو کسی امر سے وابستہ کرنا منع ہے۔ مشروط بشرائط ایمان کمزور ہوتا ہے۔ نیکی میں ترقی کرنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمدردی کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے لیے شرائط کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہوگا کہ آپ ہنسی ٹھٹھے کی مجلسوں سے دُور رہیں۔ یہ وقت رونے کا ہے نہ ہنسی کا۔ اب آپ جائیں گے موت حیات کا پتہ نہیں۔ دو تین ہفتہ تک تو سچے تقویٰ سے دعائیں مانگو کہ الٰہی مجھے معلوم نہیں تو ہی حقیقت کو جانتا ہے مجھے اطلاع دے۔ اگر صادق ہے تو اس کے انکار سے ہلاک نہ ہو جاوں اور اگر کاذب ہے تو اس کی اتباع سے بچا۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اصل امر کو ظاہر کر دیگا۔

نووارد۔ مَیں سچ عرض کرتا ہوں کہ مَیں بہت بُرا ارادہ کرکے آیا تھا کہ مَیں آپ سے استہزاء کروں، مگر خدا نے میرے ارادوں کو رد کر دیا۔ مَیں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو فتویٰ آپ کے خلاف دیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے اور مَیں زور دیکر نہیں کہہ سکتا کہ آپ مسیح موعود نہیں ہیں بلکہ مسیح موعود ہونے کا پہلو زیادہ زور آور ہے اور مَیں کسی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ آپ مسیح موعود ہیں۔ جہانتک میری عقل اور سمجھ تھی مَیں نے آپ سے فیض حاصل کیا ہے اور جو کچھ مَیں نے سمجھا ہے میں ان لوگوں پر ظاہر کروں گا جنہوں نے مجھے منتخب کرکے بھیجا ہے۔ کل میری اَور رائے تھی اور آج اَور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک پہلوان بغیر لڑنے کے زیر ہو جائے تو وہ نامرد کہلائے گا۔ اس لیے مَیں نے مناسب نہیں سمجھا کہ بدوں اعتراض کئے تسلیم کر لیتا۔ چونکہ مَیں معتمد اُن لوگوں کا ہوں جنہوں نے مجھے بھیجا ہے اس لیے مَیں نے ہر ایک بات کو

بغیر دریافت کئے ماننا نہیں چاہا۔

دُعا کے لیے مَیں نے جو لکھا تھا دنیا کی خواہش سے نہیں کہا تھا۔ مَیں اس دادا کا پوتا ہوں جسکے ہندوستان میں اڑھائی سو مُرید ہیں مگر مَیں آزاد طبیعت آدمی ہوں اور اس میں انصاف ہے۔

نیکی ضائع نہیں ہوتی

حضرت اقدس۔ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی ہو تو اس کا ثمرہ دیتا ہے۔ مَیں نے ایک کتاب میں نقل دیکھی کہ ایک شخص نے اپنے ہمسایہ آتش پرست کو دیکھا کہ چند روز کی برسات کے بعد وہ اپنے کوٹھے پر جانوروں کو دانے ڈال رہا تھا۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ تو کیا کر رہا ہے؟ اس نے کہا کہ جانوروں کو دانے ڈال رہا ہوں۔ مَیں نے کہا کہ تیرا عمل بیکار ہے۔ اس گبر نے کہا کہ اس کا ثمرہ مجھے ملیگا۔ پھر وہی بزرگ کہتے ہیں کہ جب دوسرے سال مَیں حج کرنے کو گیا تو دیکھا کہ وہی گبر طواف کر رہا ہے۔ اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ ان دانوں کا ثواب مجھے مِلا یا نہیں؟

ایسا ہی ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ مَیں نے زمانہ جاہلیت میں سخاوت کی تھی مجھے اس کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُسی سخاوت نے تو تجھے مسلمان کیا۔

ہزاروں آدمی بغیر دیکھے گالیاں دینے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن جب آتے ہیں اور دیکھتے ہیں تو وہ ایمان لاتے ہیں۔ میرا یہ مذہب نہیں کہ انسان صدق اور اخلاص سے کام لے اور وہ ضائع ہو جائے۔

پھر حضرت حجۃ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا قصّہ بیان کیا جو کئی بار ہم نے الحکم میں درج کیا ہے اور اس بات پر آپ نے تقریر کو ختم کیا ؎

مردانِ خدا خدا نہ باشند ✿ لیکن از خدا جُدا نہ باشند

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ صفحہ ۵ تا ۹ مورخہ ۲۱؍ فروری ۱۹۰۳ء)

۱۵؍ فروری ۱۹۰۳ء

نو وارد صاحب اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام

صبح کی سَیر

اعلیٰ حضرت حجۃ اللہ علی الارض مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ مقصود تھا کہ جس طرح ممکن ہو اس شخص کو پُورے طور پر تبلیغ ہو اس لیے اس کی ہر بات اور ہر ایک اعتراض کو نہایت توجہ سے سُنکر

اس کا مبسوط جواب فرماتے آج جب آپ سیر کو تشریف لے چلے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصہ سے سلسلہ تقریر شروع ہوا۔ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرۃ: ۲۶۱) فرمایا کہ

رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کی لطیف تفسیر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت آپ سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کو یہ ارشاد ہوا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تو اس پر ایمان نہیں لاتا؟ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا یہی جواب دیا بَلٰی۔ ہاں میں ایمان لاتا ہوں مگر اطمینانِ قلب چاہتا ہوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا سوال نہ کیا اور نہ ایسا جواب دینے کی ضرورت پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے ہی سے ایمان کے انتہائی مرتبہ اطمینان اور عرفان پر پہنچے ہوئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ اَدَبِیْ۔

تو یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے۔ ہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی ایک خوبی اس سے پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (البقرۃ: ۲۶۱) تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اس پر ایمان نہیں رکھتا بلکہ یہ کہا کہ ایمان تو رکھتا ہوں، مگر اطمینان چاہتا ہوں۔

پس جب ایک شخص ایک شرطی اقتراح پیش کرے اور پھر یہ کہے کہ میں اطمینانِ قلب چاہتا ہوں تو وہ اس سے استدلال نہیں کرسکتا کیونکہ شرطی اقتراح پیش کرنیوالا تو ادنیٰ درجہ بھی ایمان کا نہیں رکھتا بلکہ وہ تو ایمان اور تکذیب[1] کے مقام پر ہے اور تسلیم کرنے کو مشروط بہ اقتراح کرتا ہے پھر وہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ میں ابراہیم کی طرح اطمینانِ قلب چاہتا ہوں ابراہیم نے تو ترقیٔ ایمان چاہی ہے انکار نہیں کیا اور پھر اقتراح بھی نہیں کیا بلکہ احیاء موتی کی کیفیت پوچھی ہے اور اس کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اس مُردہ کو زندہ کرکے دکھا یا یُوں کر اور پھر اسکا جواب جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ بھی عجیب اور لطیف ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو چار جانور لے اُن کو اپنے ساتھ ہلا لے یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ ذبح کرلے کیونکہ اس میں ذبح کرنے کا لفظ نہیں بلکہ اپنے ساتھ ہلا لے جیسے لوگ بٹیریا تیتر یا بلبل کو پالتے ہیں اور اپنے ساتھ ہلا لیتے ہیں پھر وہ اپنے مالک کی آواز سُنتے ہیں اور اُس کے بُلانے پر آجاتے ہیں۔ اس طرح پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو احیاء اموات سے انکار نہ تھا بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مُردے خدا کی

---

[1] سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔ فقرہ یوں ہونا چاہیئے "بلکہ وہ تو ایمان اور تکذیب کے درمیانی مقام پر ہے" لفظ "درمیانی" چھُوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ (مرتب)

آواز کس طرح سُنتے ہیں اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ ہر چیز طبعاً اور فطرتاً اللہ تعالیٰ کی مطیع اور تابع فرمان ہے۔

نووارد۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن شریف میں ایسا فرمایا ہے جیسے حضرت ابراہیم کو خلیل فرمایا۔

سب انبیاءؑ کے وصفی نام آنحضرتؐ کو دیئے گئے

حضرت اقدس۔ مَیں قرآن شریف سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ سب انبیاء کے وصفی نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے کیونکہ آپ تمام انبیاء کے کمالات متفرقہ اور فضائل مختلفہ کے جامع تھے اور اسی طرح جیسے تمام انبیاء کے کمالات آپ کو ملے۔ قرآن شریف بھی جمیع کتب کی خوبیوں کا جامع ہے چنانچہ فرمایا فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ : ۴) اور مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ (الانعام : ۳۹) ایسا ہی ایک جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ تمام نبیوں کی اقتدا کر۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ امر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک امر تو تشریعی ہوتا ہے جیسے یہ کہا کہ نماز قائم کرو یا زکوٰۃ دو وغیرہ اور بعض امر بطور خلق ہوتے ہیں جیسے يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰٓى إِبْرَاهِيْمَ (الانبیاء : ۷۰) یہ امر جو ہے کہ تو سب کی اقتدا کر یہ بھی خلقی اور کونی ہے یعنی تیری فطرت کو حکم دیا کہ وہ کمالات جو جمیع انبیاء علیہم السلام میں متفرق طور پر موجود تھے اس میں یکجائی طور پر موجود ہوں اور گویا اس کے ساتھ ہی وہ کمالات اور خوبیاں آپ کی ذات میں جمع ہو گئیں۔

آیت خاتم النبیین کا حقیقی مفہوم

چنانچہ ان خوبیوں اور کمالات کے جمع ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ پر نبوت ختم ہو گئی اور یہ فرمایا کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب : ۴۱) ختمِ نبوت کے یہی معنے ہیں کہ نبوت کی ساری خوبیاں اور کمالات تجھ پر ختم ہو گئے اور آئندہ کے لیے کمالاتِ نبوت کا باب بند ہو گیا اور کوئی نبی مستقل طور پر نہ آئے گا۔

نبی عربی اور عبرانی دونو زبانوں میں مشترک لفظ ہے جس کے معنے ہیں خدا سے خبر پانے والا اور پیشگوئی کرنے والا۔ جو لوگ براہ راست خدا سے خبریں پاتے تھے وہ نبی کہلاتے تھے اور یہ گویا اصطلاح ہو گئی تھی مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بند کر دیا ہے اور مُہر لگا دی ہے کہ کوئی نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے بغیر نہیں ہو سکتا جب تک آپ کی اُمت میں داخل نہ ہو اور آپ کے فیض سے مستفیض نہ ہو وہ خدا تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف نہیں پا سکتا۔ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں داخل نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا ہے کہ وہ بدوں اس اُمت میں داخل ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پانے کے بغیر کوئی شرفِ مکالمہ الٰہی حاصل کر سکتا ہے تو اسے میرے سامنے پیش کرو۔

٭ ٭ ٭

آیت خاتم النبیین حضرت عیلیٰؑ کے دوبارہ نہ آنے پر زبردست دلیل ہے

یہی ایک آیت زبردست دلیل ہے اس امر پر جو ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ نہیں آئیں گے بلکہ آنیوالا اس اُمت میں سے ہوگا۔ کیونکہ وہ نبی ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبوت کا فیضان حاصل کرسکتا ہی نہیں جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ نہ کرے جو صاف لفظوں میں یہ ہے کہ آپ کی اُمت میں داخل نہ ہو۔ اب خاتم النبیین والی آیت تو صریح روکتی ہے پھر وہ کس طرح آسکتے ہیں۔ یا اُن کو نبوت سے معزول کرو اور ان کی یہ ہتک اور بے عزتی روا رکھو اور یا یہ کہ پھر ماننا پڑے گا کہ آنیوالا اسی اُمت میں سے ہوگا۔

نبی کی اصطلاح مستقل نبی پر بولی جاتی تھی مگر اب خاتم النبیین کے بعد یہ مستقل نبوت رہی ہی نہیں۔ اسی لیے کہا ہے ؎

خارقے از ولی مسموع است ؛ معجزہ آں نبی متبوع است

پس اس بات کو خوب غور سے یاد رکھو کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت عیلےٰ علیہ السلام کو نبوت کا شرف پہلے سے حاصل ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پھر آئیں اور اپنی نبوت کو کھو دیں۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مستقل نبی کو روکتی ہے البتہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بڑھانے والا ہے کہ ایک شخص آپ ہی کی اُمت سے آپ ہی کے فیض سے وہ درجہ حاصل کرتا ہے جو ایک وقت مستقل نبی کو حاصل ہو سکتا تھا لیکن اگر وہ خود ہی آئیں تو پھر صاف ظاہر ہے کہ پھر اس خاتم الانبیاء والی آیت کی تکذیب لازم آتی ہے اور خاتم الانبیاء حضرت مسیح ٹھہریں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا بالکل غیر مستقل ٹھہر جاویگا کیونکہ آپ پہلے بھی آئے اور ایک عرصہ کے بعد آپ رخصت ہو گئے اور حضرت مسیح آپ سے پہلے بھی رہے اور آخر پر بھی وہی رہے غرض اس عقیدہ کے ماننے سے کہ خود ہی حضرت مسیح آنیوالے ہیں بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور ختمِ نبوت کا انکار کرنا پڑتا ہے جو کفر ہے۔

اسکے علاوہ قرآن شریف کی ایک اور آیت بھی جو صاف طور پر مسیح کی آمدِ ثانی کو روکتی ہے اور وہ وہی آیت ہے جو کل بھی مَیں نے بیان کی تھی یعنی فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (سورۃ المائدۃ : ۱۱۸) اگر حضرت مسیح قیامت سے پہلے دُنیا میں آئے تھے اور چالیس برس تک رہ کر انہوں نے کفار اور مشرکین کو تباہ کیا تھا جیسا کہ اعتقاد رکھا جاتا ہے۔ پھر کیا خدا تعالیٰ کے سامنے ان کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (المائدۃ : ۱۱۸) یا یہ کہنا چاہیئے تھا کہ مَیں نے تو کافروں اور مشرکوں کو ہلاک کیا اور ان کو جا کر اس شرک سے نجات دی کہ تم مجھ کو اور میری ماں کو خدا نہ بناؤ۔

اس آیت پر خوب غور کرو یہ ان کی دوبارہ آمد کو قطعی طور پر رد کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ختمِ نبوت والی آیت بھی ان کو دوبارہ آنے نہیں دیتی۔ اب یا تو قرآن شریف کا انکار کرو یا اگر اس پر ایمان ہے تو پھر اس باطل خیال کو چھوڑنا پڑیگا اور اس سچائی کو قبول کرنا پڑے گا جو مَیں لے کر آیا ہوں۔

یہ پکی بات ہے کہ آنے والا اسی اُمت سے ہوگا اور حدیث عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص مثیل مسیح بھی تو ہو۔ اگرچہ محدثین اس حدیث کی صحت پر کلام کرتے ہیں مگر اہلِ کشف نے اس کی تصدیق کی ہے اور قرآن شریف خود اس کی تائید کرتا ہے۔ محدثین نے اہلِ کشف کی یہ بات مانی ہوئی ہے کہ وہ اپنے کشف سے بعض احادیث کی صحت کر لیتے ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح نہ ہوں اور بعض کو غیر صحیح قرار دے سکتے ہیں۔ یہ حدیث اہلِ کشف نے جن میں رُوحانیت اور تصفیہ قلب ہوتا ہے صحیح بیان کی ہے اور جیسا کہ مَیں نے کہا ہے قرآن شریف بھی اس کا مصدق ہے کیونکہ اس حدیث سے بھی سلسلہ موسوی کی طرح ایک سلسلہ کے قائم ہونے کی تصدیق ہوتی ہے اور قرآن شریف بھی سلسلہ موسویہ کے بالمقابل ایک سلسلہ قائم کرتا ہے۔ اسی کی طرف علاوہ اَور آیات قرآنی کے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ بھی اشارہ کرتی ہے یعنی جو پہلے نبیوں کو دیا گیا تھا ہم کو بھی عطا کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ چودہ سو برس تک رکھا گیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو نابود کرنا چاہا اور اس قوم کو ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ (آل عمران : ۱۱۳) کا مصداق بنا دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کر کے یہ کہا اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمّل:۱۶) یعنی یہ سلسلہ موسوی سلسلہ کے بالمقابل ہے اور یہ عمارت موسوی عمارت کے مقابلہ پر ہے۔ جیسے اس میں اخیار ہیں ویسے ہی اس میں بھی اخیار ہیں۔ ایسا ہی اشرار بھی بالمقابل پائے جاتے ہیں یہانتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی یہودی نے ماں سے زنا کیا ہوگا تو تم میں سے بھی ایسے ہوں گے اور اگر کوئی سوسمار کے بِل میں گُھسا ہوگا تو مسلمان بھی گُھسیں گے۔

یہ کیسی مشابہت اور مماثلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہے اب تعجب ہے مسلمانوں پر کہ وہ یہ تو رَوا رکھتے ہیں کہ اس اُمت میں سے یہود بن جاویں اور یہ پسند نہیں کر سکتے کہ اس اُمت میں سے کوئی مسیح بھی ہو جاوے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں مسیح کو بھیجا گیا تھا۔ اس مماثلت کے لحاظ سے ضروری تھا کہ اس اُمت میں بھی اس صدی پر مسیح آئے تا کہ اس اُمت کا فضل ظاہر ہو۔ اولیاء اللہ کے کشوف بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں اور جو نشانات اس وقت کے لیے رکھے ہوئے تھے وہ بھی اپنے اپنے وقت پر پورے ہو گئے۔ واقع شدنی اُمور ہو جاتے ہیں جو نہیں ہونیوالے ہوتے وہ نہیں ہوتے۔ اگر علماء کے معنے سچے ہوتے تو جو کچھ انہوں نے مانا ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ تو پورا ہوتا۔ اعانتِ اسلام کا زمانہ تو یہی تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خدا نے بقول اُن

کے کچھ بھی نہ کیا۔ انگریزوں کا تسلط مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (الانبیاء : ۹۷) کا مصداق ہوگیا اور وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (التکویر : ۵) کے موافق اونٹنیاں بیکار ہوگئیں جو اس آخری زمانہ کا ایک نشان ٹھہرایا گیا تھا عشار حاملہ اونٹنیوں کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اس لیے اختیار کیا گیا ہے تا یہ وہم نہ رہے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کے متعلق ہے قیامت میں تو حمل نہ ہوگا اور انکا بیکار ہونا یہاں تو الگ رہا، مکہ مدینہ کے درمیان بھی ریل تیار ہورہی ہے۔ اخبارات نے بھی اس آیت اور مُسلم کی حدیث سے استنباط کرکے مضامین لکھے ہیں۔ پس یہ اور دوسرے نشان تو پورے ہوگئے ہیں۔ مَیں اگر صادق نہیں ہوں تو دوسرے مدعی کا نشان بتاؤ اور اس کا ثبوت دکھیو۔ بات یہ ہے کہ افتراء اور کذب کی عمر نہیں ہوا کرتی یہ جلد فنا ہوجاتے ہیں۔ مفتری کے ہلاک کرنے کے لیے خارجی قوت اور زور کی حاجت ہی نہیں ہوتی خود اُن کا افترا انکو ہلاک کر دیتا ہے اور مفتری کے مقابل میں کبھی جوش نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل جس قدر جوش ہوا کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کے مقابل میں بھی ہوا تھا۔

صادق مدّعی کے خلاف ہی شیطان جوش دکھاتا ہے

صادق کے مقابل اس لیے جوش ہوتا ہے کہ شیطان سمجھتا ہے کہ اب مجھے ہلاک کیا جائیگا اور وہ اس سے ناراض ہوتا ہے اس لیے جہانتک ممکن ہو وہ ان کی مخالفت میں زور لگاتا ہے اور یہ جوش پھیل جاتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی بہت سے آدمیوں نے دعوے کئے تھے مگر اب کوئی ان کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ اسی طرح ہوتا رہا ہے کہ صادق کے مقابل میں بعض کاذب مدّعی بھی ہوتے رہے ہیں مگر کسی مقابلہ کے لیے اسقدر جوش نہیں دکھایا گیا جو صادق کے لیے دکھایا جاتا ہے اس لیے کہ مفتری تو شیطان کے منشا کے موافق ہوتا ہے اس لیے وہ اس کے خلاف جنگ کرنی نہیں چاہتا اور صادق اس کے سینہ پر پتھر ہوتا ہے اس کو تباہ کرنے کیلئے زور لگاتا ہے مگر آخر خود ہی شیطان اس جنگ میں ہلاک کیا جاتا ہے۔

ابوجہل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالمقابل کس قدر زور لگایا یہانتک کہ مباہلہ بھی کر لیا اور یہ دُعا کی کہ جو شخص ہم میں سے کاذب ہے اور پھوٹ ڈالتا ہے اس کو ہلاک کر۔ چنانچہ خود اسی روز ہلاک ہوگیا۔ یاد رکھو کوئی نبی دنیا میں نہیں آیا جو اس کے آنے سے پھوٹ نہ پڑی ہو۔ اس کو اصلاح کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک پھوٹ پڑے۔ کیونکہ جس شخص کا جوڑ یا ہڈی اپنی جگہ پر نہ رہے تو وہ اسے اُتار کر نئے سرے سے لگاتا ہے۔ اکثر مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ آریوں عیسائیوں کو دشمن بنالیا ہے مگر ان کو معلوم نہیں جو خدا کی طرف سے آتا ہے وہ ضرور اپنے دشمن بنالیتا ہے۔ کیونکہ اس کو پاک جماعت تیار کرنی پڑتی ہے جن میں سچا تقویٰ و طہارت ہو اور سچی اخوت ہو۔ مگر سفلی

زندگی کے عادی نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک صلاحیت قائم ہو وہ دُنیا سے دل لگا کر خدا تعالیٰ کی طرف سے غافل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے ۔ عاقبت کی خبر خُدا جانے

یہی ان کا مذہب اور مشرب ہوتا ہے حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ یہ مُردار زندگی کیا چیز ہے۔ انسان اگر خدا تعالیٰ سے قوت پاوے تو وہ اس مُردار زندگی سے مرنا بہتر سمجھے گا دُنیا کے دوست مطلب کے دوست ہوتے ہیں۔ حقیقی محبت اور اخوت خدا تعالیٰ میں ہو کر ملتی ہے۔ ان لوگوں کو دیکھو جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر توبہ کی۔ کیا ان کے باہم تعلقات نہ تھے لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت میں آنکھ کھلی تو پھر یہانتک متاثر ہوئے کہ نہ بیٹے کو بیٹا سمجھا نہ باپ کو باپ بلکہ وہ تعلقات بالکل قطع ہو گئے اور سارے تعلقات خدا میں ہو کر قائم ہوئے۔ خدا کے لیے دشمن ہو جاتے۔ دنیا کی دوستیں جس میں خدا درمیان نہیں ہوتا وفاداری سے نہیں نباہ سکتے۔ اسی طرح اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری جماعت میں جب کوئی داخل ہوتا ہے تو اس کے اپنے متعلقین میں اگر خدا تعالیٰ ہدایت نہ کرے ایک شور قیامت برپا ہو جاتا ہے بعض گھر سے تعلقات رکھنے والوں کو قطع تعلق کرنا پڑا ہے۔

دُنیا انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی

یاد رکھو دنیا انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ اس کی اپنی کمزوری ہے کہ اپنے جیسی مخلوق کو نافع یا ضار سمجھتا ہے نفع اور ضر اللہ ہی کی طرف سے ملتا ہے۔ ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ انسان معرفت کی آنکھ سے خدا کو شناخت کرلے۔ جب تک عملی طور پر خدا شناسی کو ثابت کر کے نہ دکھائے تو دہریہ ہے۔

جھوٹ کے تمام شعبوں سے پرہیز کرو

مَیں نے غور کیا ہے۔ قرآن شریف میں کئی ہزار حکم ہیں ان کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں میں خلاف ورزی کر لی جاتی ہے۔ یہانتک دیکھا جاتا ہے کہ بعض جھوٹ تو دکاندار بولتے ہیں اور بعض مصالحہ دار جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ نے اس کو رجس کے ساتھ رکھا ہے مگر بہت سے لوگ دیکھے ہیں کہ رنگ آمیزی کر کے حالات بیان کرنے سے نہیں رُکتے اور اس کو کوئی گناہ بھی نہیں سمجھتے۔ ہنسی کے طور پر بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ انسان صدیق نہیں کہلا سکتا جب تک جھوٹ کے تمام شعبوں سے پرہیز نہ کرے۔

گناہ کے چھوڑنے کا طریقہ

انسان جب فسق و فجور میں پڑ جاتا ہے تو پھر اُن لذات کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اس کے چھوڑنے کی ایک ہی راہ ہے کہ گناہ کی معرفت انسان کو ہو اور یہ معلوم ہو جاوے کہ اللہ تعالیٰ گناہ پر سزا دیتا ہے۔ حیوان بھی جب معرفت پیدا کر لیتا ہے کہ یہ کام کرونگا تو سزا ملے گی تو وہ بھی اس سے بچتا ہے۔ کُتے کو بھی اگر ایک چھڑی دکھائی جائے تو وہ بھاگتا ہے اور دہشت زدہ

ہو جاتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسان انسان ہو کر خدا تعالیٰ سے اتنا بھی نہ ڈرے جتنا ایک حیوان سوٹے سے ڈرتا ہے بھیڑیئے کے پاس اگر بکری باندھ دی جائے تو وہ گھاس نہیں کھا سکتی۔ کیا اس بھیڑیئے جتنی دہشت بھی خدا کی نہیں ہے؟

انسان کے پیدا ہونے کی غرض و غایت تو یہ ہے کہ وہ سچا ایمان پیدا کرے۔ اگر یہ ایمان وہ پیدا نہیں کرتا تو پھر اپنی پیدائش کو عبث سمجھتا ہے اور اگر اس مجلس میں وہ ایمان نہیں ہے تو اس پر حرام ہے کہ دوسری مجلس کو تلاش نہ کرے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے اسی لیے مامور کیا ہے کہ تقویٰ پیدا ہو اور خدا پر سچا ایمان جو گناہ سے بچاتا ہے پیدا ہو۔ خدا تعالیٰ تاوان نہیں چاہتا بلکہ سچا تقویٰ چاہتا ہے۔ مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ توبہ کرتے وقت گواہ رکھ لیتا تھا۔ مَیں نے اس سے پُوچھا کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس نے کہا: مَیں نے اس لیے یہ کیا ہے کہ شاید اس توبہ کو توڑتے وقت اس گواہ سے ہی کچھ شرم آجائے لیکن آخر دیکھا کہ وہ انکی بھی پروا نہ کرکے توبہ توڑتا۔ کیونکہ اصل شرم تو خدا تعالیٰ سے ہونی چاہیئے۔ جب خدا سے نہیں ڈرتا اور شرم کرتا تو اَور کسی سے کیا کرے گا۔ ایسے لوگوں کی وہی مثال ہے ؎

چہ خوش گفت درویش کوتاہ دست ✿ کہ شب توبہ کرد و سحر گاہ شکست

مامور کی دُعاؤں کا اثر

جو لوگ اس سلسلہ میں داخل ہوتے ہیں ان کو سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مَیں اُن کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ دُعا ایسی چیز ہے کہ خشک لکڑی کو بھی سرسبز کر سکتی ہے اور مُردہ کو زندہ کر سکتی ہے۔ اس میں بڑی تاثیریں ہیں۔ جہاں تک قضا و قدر کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کوئی کیسا ہی معصیت میں غرق ہو دُعا اسکو بچالیگی۔ اللہ تعالیٰ اس کی دستگیری کریگا اور وہ خود محسوس کریگا کہ مَیں اب اَور ہوں۔ دیکھو جو شخص مسموم ہے کیا وہ اپنا علاج آپ کر سکتا ہے اس کا علاج تو دوسرا ہی کریگا اس لیے اللہ تعالیٰ نے تطہیر کے لیے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور مامور کی دُعائیں تطہیر کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہیں۔

اسمِ اعظم

دُعا کرنا اور کرانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ دعا کے لیے جب درد سے دل بھر جاتا ہے اور سارے حجابوں کو توڑ دیتا ہے اس وقت سمجھنا چاہیئے کہ دُعا قبول ہو گئی یہ اسمِ اعظم ہے۔ اس کے سامنے کوئی اَن ہونی چیز نہیں ہے۔ ایک خبیث کے لیے جب دُعا کے ایسے اسباب میسر آجائیں تو یقیناً وہ صالح ہو جاوے اور بغیر دُعا کے وہ اپنی توبہ پر بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ بیمار اور محجوب اپنی دستگیری آپ نہیں کر سکتا۔ سنت اللہ کے موافق یہی ہوتا ہے کہ جب دُعائیں انتہا تک پہنچتی ہیں تو ایک شعلہ نُور کا اس کے دل پر گرتا ہے جو اس کی خباثتوں کو جلا کر تاریکی دُور کر دیتا ہے اور اندر ایک روشنی پیدا کرتا ہے۔ یہ طریق استجابت دعا کا رکھتا ہے۔

ضرور ہے کہ انسان پہلے حالتِ بیماری کو محسوس کرے اور پھر طبیب کو شناخت کرے سعید وہی ہے جو اپنے مرض اور طبیب کو شناخت کرتا ہے۔ اس وقت دنیا کی حالت بگڑی ہوئی ہے۔ جن باتوں پر خدا نے چاہا تھا کہ

قائم ہوں اُن کو چھوڑ دیا گیا ہے. باہر سے وہ ایک پھوڑے کی طرح نظر آتے ہیں جو چمکتا ہے مگر اس کے اندر پیپ ہے یا قبر کی طرح ہے کہ جس کے اندر بجز ہڈیوں کے اَور کچھ نہیں۔

ایسا ہی حال اخلاقی حالتوں کا ہے۔غیظ و غضب میں آکر گندی گالیاں دینے لگتا ہے اور اعتدال سے گذر جاتا ہے۔

نفسِ مطمئنّہ کی حالت والا ہی بڑا سعید اور بامُراد ہے

اصل مدعا تو یہ ہونا چاہیئے کہ انسان نفسِ مطمئنّہ حاصل کرے نفس کی تین قسمیں ہیں۔امّارہ۔ لوّامہ مطمئنّہ۔بہت بڑا حصّہ دنیا کا نفسِ امّارہ کے نیچے ہے اور بعض جن پر خدا کا فضل ہوا ہے وہ لوّامہ کے نیچے ہیں۔یہ لوگ بھی سعادت سے حصّہ رکھتے ہیں۔بڑا بدبخت وہ ہے جو بدی کو محسوس ہی نہیں کرتا یعنی جو امّارہ کے ماتحت ہیں اور بڑا ہی سعید اور بامراد وہ ہے جو نفسِ مطمئنّہ کی حالت میں ہے۔

نفسِ مطمئنّہ ہی کو خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر: ۲۸،۲۹) یعنی اے وہ نفس جو اطمینان یافتہ ہے۔اس حالت میں شیطان کے ساتھ جو جنگ ہوتی ہے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور خطاب کے لائق تو مطمئنّہ ہی ٹھہرایا ہے اور اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطمئنّہ کی حالت میں مکالمۂ الٰہی کے لائق ہو جاتا ہے "خدا کی طرف واپس آ" کے معنے یہی نہیں کہ مَر جا بلکہ امّارہ اور لوّامہ کی حالت میں جو خدا تعالیٰ سے ایک بُعد ہوتا ہے مطمئنّہ کی حالت میں وہ مہجوری نہیں رہتی اور کوئی غبار باقی نہ رہ کر غیب کی آواز اس کو بلاتی ہے۔تو مجھ سے راضی اور مَیں تجھ سے راضی۔یہ رضا کا انتہائی مقام ہوتا ہے۔پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب میرے بندوں میں داخل ہو جا۔اللہ تعالیٰ کے بندے دنیا ہی پر ہوتے ہیں مگر دنیا اُن کو نہیں پہچانتی۔دنیا نے آسمانی بندوں سے دوستی نہیں کی وہ اُن سے ہنسی کرتی ہے۔وہ الگ ہی ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رِداء کے نیچے ہوتے ہیں۔غرض جب ایسی حالتِ اطمینان میں پہنچتا ہے تو الٰہی اکسیر سے تانبا سونا ہو جاتا ہے۔ وَادْخُلِي جَنَّتِي اور تو میرے بہشت میں داخل ہو جا۔بہشت ایک ہی چیز نہیں وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ۔ (الرحمٰن: ۴۷) خدا سے ڈرنے والے کے لیے دو بہشت ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۸ صفحہ ۳ تا ۶ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء)

---

۱۵ فروری ۱۹۰۳ء

(قبل از ظہر)

ایک صاحب گوڑگاؤں سے تشریف لائے ہوئے تھے۔حضرت اقدس سے شرف بیعت حاصل کیا

بعد از بیعت حضرت اقدس نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

مسنون طور سے خُدا کا فضل تلاش کرو

ہماری طرف سے تو آپ کو یہی نصیحت ہے کہ مسنون طور سے اللہ تعالیٰ کے فضل کو تلاش کرو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر کے یہ امر صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ انکی پیروی کے سوا کوئی راہ اس کی رضاجوئی کی باقی نہیں ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے فضلوں کا جویاں ہو اسی دروازہ کو کھٹکھٹائے اس کے لیے کھولا جائے گا۔ بجز اس دروازہ کے تمام دروازے بند ہیں۔ نبوت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی۔ شریعت قرآن شریف کے بعد ہرگز نہیں آئے گی۔ انسان کو کشوف اور وحی اور الہام کا بھی طالب نہ ہونا چاہیئے بلکہ یہ سب تقویٰ کا نتیجہ ہیں۔ جب جڑ ٹھیک ہوگی تو اُس کے لوازم بھی خود بخود آجائیں گے۔ دیکھو جب سُورج نکلتا ہے تو دھوپ اور گرمی جو اس کا خاصہ ہیں خود بخود ہی آجاتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان میں تقویٰ آجاتا ہے تو اس کے لوازم بھی اس میں ضرور آجاتے ہیں۔ دیکھو جب کوئی دوست کسی کے ملنے کے واسطے جاوے تو اس کو یہ اُمید تو نہ رکھنی چاہیئے کہ میں اس کے پاس جاتا ہوں کہ وہ مجھے پلاؤ، زردے اَور قورمے اور قلیئے کھلائے گا اور میری خاطر تواضع کریگا نہیں بلکہ صادق دوست کی ملاقات کی خواہش ہوتی ہے بجز اس کے اَور کسی کھانے یا مکان یا خدمت کی پروا اور خیال بھی نہیں ہوتا مگر جب وہ اپنے صادق دوست کے پاس جو اُس سے مہجور تھا۔ جاتا ہے تو کیا وہ اس کی خاطر داری کا کوئی دقیقہ باقی بھی اُٹھا رکھتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ جہانتک اس سے بَن پڑتا ہے وہ اپنی طاقت سے بڑھ کر بھی اس کی تواضع کے واسطے مکلّف سامان کرتا ہے۔

غرض یہی حال رُوحانیت اور اس دوست اعلیٰ کی ملاقات کا ہے۔ الہامات یا کشوف وغیرہ چیزوں کے سہارے والا ایمان، ایمانِ کامل نہیں۔ وہ کمزور ایمان ہے جو کسی چیز کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ انسان کی غرض اور اصل مدعا صرف رضاء الٰہی اور وصول الی اللہ چاہیئے۔ آگے جب یہ اس کی رضا حاصل کرلے گا تو خدا تعالیٰ اس کو کیا کچھ نہ دیگا۔ خود اس امر کی درخواست کرنا سُوءِ ادب ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1] خدا کے محبوب بننے کیواسطے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی ایک راہ ہے اور کوئی دوسری راہ نہیں کہ تم کو خدا سے ملا دے۔ انسان کا مدعا صرف اس ایک واحد لاشریک خدا کی تلاش ہونا چاہیئے۔ شرک اور بدعت سے اجتناب کرنا چاہیئے رسوم کا تابع اور ہوا و ہوس کا مطیع نہ بننا چاہیئے۔ دیکھو میں پھر کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی راہ کے سوا اَور کسی طرح انسان کامیاب نہیں ہوسکتا۔

---

[1] آل عمران: ۳۲

ہمارا صرف ایک ہی رسُولؐ اور ایک ہی کتاب ہے

ہمارا صرف ایک ہی رسول ہے اور صرف ایک ہی قرآن شریف اس رسُول پر نازل ہوا ہے جس کی تابعداری سے ہم خدا کو پا سکتے ہیں۔ آج کل فقراء کے نکالے ہوئے طریقے اور گدی نشینوں اور سجادہ نشینوں کی سیفیاں اور دُعائیں اور درود اور وظائف یہ سب انسان کو مستقیم راہ سے بھٹکانے کا آلہ ہیں۔ سو تم اُن سے پرہیز کرو۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کی مہر کو توڑنا چاہا گویا اپنی الگ ایک شریعت بنالی ہے۔ تم یاد رکھو کہ قرآن شریف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی پیروی اور نماز روزہ وغیرہ جو مسنون طریقے ہیں ان کے سوا خدا کے فضل اور برکات کے دروازے کھولنے کی اَور کوئی کُنجی ہے ہی نہیں۔ بھُولا ہوا ہے وہ جو ان راہوں کو چھوڑ کر کوئی نئی راہ نکالتا ہے۔ ناکام مریگا وہ جو اللہ اور اس کے رسُول کے فرمودہ کا تابعدار نہیں۔ بلکہ اَور اَور راہوں سے اُسے تلاش کرتا ہے۔

ہر قسم کے گناہوں سے بچو

دیکھو گناہ کبیرہ بھی ہیں اُن کو تو ہر ایک جانتا ہے اور اپنی طاقت کے موافق نیک انسان اُن سے بچنے کی کوشش بھی کرتا ہے مگر تم تمام گناہوں سے کیا کبائر اور کیا صغائر سب سے بچو۔ کیونکہ گناہ ایک زہر ہے جس کے استعمال سے زندہ رہنا محال ہے۔ گناہ ایک آگ ہے جو رُوحانی قویٰ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے پس تم ہر قسم کے کیا صغیرہ کیا کبیرہ سب اندرونی بیرونی گناہوں سے بچو۔ آنکھ کے گناہوں سے، ہاتھ کے گناہوں سے، کان ناک اور زبان اور شرمگاہ کے گناہوں سے بچو۔ غرض ہر عضو کے گناہ کے زہر سے بچتے رہو اور پرہیز کرتے رہو۔

نماز گناہوں سے بچنے کا آلہ ہے

نماز بھی گناہوں سے بچنے کا ایک آلہ ہے۔ نماز کی یہ صفت ہے کہ انسان کو گناہ اور بدکاری سے ہٹا دیتی ہے سو تم ویسی نماز کی تلاش کرو اور اپنی نماز کو ایسی بنانے کی کوشش کرو۔ نماز نعمتوں کی جان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیض اسی نماز کے ذریعہ سے آتے ہیں سو اس کو سنوار کر ادا کرو۔ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کے وارث بنو۔

ہمارا طریق نرمی ہے

یہ بھی یاد رکھو ہمارا طریق نرمی ہے۔ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ اپنے مخالفوں کے مقابل پر نرمی سے کام لیا کرے تمہاری آواز تمہارے مقابل کی آواز سے بلند نہ ہو۔ اپنی آواز اور لہجہ کو ایسا بناؤ کہ کسی دل کو تمہاری آواز سے صدمہ نہ ہووے۔ ہم قتل اور جہاد کے واسطے نہیں آئے بلکہ ہم تو مقتولوں اور مُردہ دلوں کو زندہ کرنے اور اُن میں زندگی کی رُوح پھُونکنے کو آئے ہیں۔ تلوار سے ہمارا کاروبار نہیں نہ یہ ہماری ترقی کا ذریعہ ہے ہمارا مقصد نرمی سے ہے اور نرمی سے اپنے مقاصد کی تبلیغ ہے۔ غلام کو وہی کرنا چاہیئے جو اس کا آقا اس کو حکم کرے جب خدا نے ہمیں نرمی کی تعلیم دی ہے۔ تو ہم کیوں سختی کریں۔ ثواب تو فرماں برداری میں ہوتا ہے

اور دین تو سچی اطاعت کا نام ہے نہ یہ کہ اپنے نفس اور ہوا و ہوس کی تابعداری سے جوش دکھادیں۔

مغلوب الغضب غلبہ و نصرت سے محروم ہوتا ہے

یاد رکھو جو شخص سختی کرتا اور غضب میں آجاتا ہے اُس کی زبان سے معارف اور حکمت کی باتیں ہرگز نہیں نکل سکتیں۔ وہ دل حکمت کی باتوں سے محروم کیا جاتا ہے جو اپنے مقابل کے سامنے جلدی طیش میں آکر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ گندہ دہن اور بے لگام کے ہونٹ لطائف کے چشمہ سے بے نصیب اور محروم کئے جاتے ہیں۔ غضب اور حکمت دونو جمع نہیں ہو سکتے جو مغلوب الغضب ہوتا ہے اس کی عقل موٹی اور فہم کند ہوتا ہے۔ اس کو کبھی کسی میدان میں غلبہ اور نصرت نہیں دیئے جاتے۔ غضب نصف جنون ہے جب یہ زیادہ بھڑکتا ہے تو پورا جنون ہو سکتا ہے۔

ہماری جماعت کو چاہیئے کل ناکردنی افعال سے دُور رہا کریں۔ وہ شاخ جو اپنے تنے اور درخت سے سچا تعلق نہیں رکھتی وہ بے پھل رہ جاتی ہے۔ سو دیکھو اگر تم لوگ ہمارے اصل مقصد کو نہ سمجھو گے اور شرائط پر کاربند نہ ہو گے تو اُن وعدوں کے وارث تم کیسے بن سکتے ہو جو خدا تعالیٰ نے ہمیں دیئے ہیں۔

نصیحت کا پیرایہ

جسے نصیحت کرنی ہو اُسے زبان سے کرو۔ ایک ہی بات ہوتی ہے وہ ایک پیرایہ میں ادا کرنے سے ایک شخص کو دشمن بنا سکتی ہے اور دوسرے پیرایہ میں دوست بنا دیتی ہے۔ پس جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل : ۱۲۶) کے موافق اپنا عمل درآمد رکھو۔ اسی طرز کلام ہی کا نام خدا نے حکمت رکھا ہے چنانچہ فرماتا ہے یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ (البقرة : ۲۷۰) مگر یاد رکھو جیسی یہ باتیں حرام ہیں ویسے ہی نفاق بھی حرام ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا کہیں پیرایہ ایسا نہ ہو جاوے کہ اس کا رنگ نفاق سے مشابہ ہو۔ موقعہ کے موافق ایسی کارروائی کرو جس سے اصلاح ہوتی ہو۔ تمہاری نرمی ایسی نہ ہو کہ نفاق بن جاوے اور تمہارا غضب ایسا نہ ہو کہ بارُود کی طرح جب آگ لگے تو ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ بعض لوگ تو غصہ سے سودائی ہو جاتے ہیں اور اپنے ہی سر میں پتھر مار لیتے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی گالی دیتا ہے تب بھی صبر کرو۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ جب کسی کے پیر و مُرشد کو گالیاں دی جاویں یا اس کے رسول کو ہتک آمیز کلمے کہے جاویں تو کیسا جوش ہوتا ہے مگر تم صبر کرو اور حلم سے کلام کرو۔

مسلوب الغضب بن جاؤ

ایسا نہ ہو کہ تمہارا اس وقت کا غصہ کوئی خرابی پیدا کر دے جس سے سارا سلسلہ بدنام ہو یا کوئی مقدمہ بنے جس سے سب کو تشویش ہو۔ سب نبیوں کو گالیاں دی گئی ہیں۔ یہ انبیاء کا ورثہ ہے۔ ہم اس سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ ایسے بن جاؤ کہ گویا مسلوب الغضب ہو تم کو گویا غضب کے قویٰ ہی نہیں دیئے گئے۔

دیکھو اگر کچھ بھی تاریکی کا حصہ ہے تو نُور نہیں آئے گا۔ نُور اور ظلمت جمع نہیں ہو سکتے۔ جب نُور آجائے گا تو ظلمت

نہیں رہے گی۔ تم اپنے سارے ہی قویٰ کو پورے طور سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگا دو جو کمی کسی قوت میں ہو اُسے اس پان والے کی طرح جو گندے پان تلاش کر کے پھینک دیتا ہے اپنی گندی عادات کو نکال پھینکو اور سارے اعضاء کی اصلاح کر لو۔ یہ نہ ہو کہ نیکی کرو اور نیکی میں بدی ملا دو۔ توبہ کرتے رہو۔ استغفار کرو۔ دُعا سے ہر وقت کام لو۔

ولی اللہ

ولی کیا ہوتے ہیں۔ یہی صفات تو اولیاء کے ہوتے ہیں۔ اُن کی آنکھ، ہاتھ، پاؤں غرض کوئی عضو ہو منشاء الٰہی کے خلاف حرکت نہیں کرتے۔ خدا کی عظمت کا بوجھ ان پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زیارت کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتے پس تم بھی کوشش کرو۔ خُدا بخیل نہیں۔ ؎

ہر کہ عارف تر است ترساں تر

دربارِ شام

قرآن شریف کی ایک برکت

ایک شخص نے عرض کی کہ حضور میرے واسطے دُعا کی جاوے کہ میری زبان قرآن شریف اچھی طرح ادا کرنے لگے۔ قرآن شریف ادا کرنے کے قابل نہیں اور چلتی نہیں۔ میری زبان کھل جاوے۔ فرمایا کہ:۔

تم صبر سے قرآن شریف پڑھتے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری زبان کو کھول دیگا۔ قرآن شریف میں یہ ایک برکت ہے کہ اس سے انسان کا ذہن صاف ہوتا ہے اور زبان کھُل جاتی ہے۔ بلکہ اطباء بھی اس بیماری کا اکثر یہ علاج بتایا کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۷ تا ۹ مورخہ ۱۰ ر مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۲۲ فروری ۱۹۰۳ء

کچھ حصہ رات کو آرام ضرور کرنا چاہیئے

ایک مخلص کی بدخوابی کے تذکرہ پر فرمایا:۔

دیکھو قرآن شریف سورۂ مزمل میں صاف تاکید ہے کہ انسان کو کچھ حصہ رات آرام بھی کرنا چاہیئے۔ اس سے دن بھر کی کوفت اور تکان دُور ہو کر قویٰ کو اپنا خرچ شدہ مادہ بہم پہنچانے کا وقفہ مِل جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل یعنی سنّت بھی اسی کے مطابق ثابت ہے چنانچہ فرماتے ہیں اُصَلِّی وَ اَنُوْمُ۔

اصل میں انسان کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے۔ اگر ہم ایک گھوڑے سے ایک دن اس کی طاقت

سے زیادہ کام لیں اور اُسے آرام کرنے کا وقفہ ہی نہ دیں تو بہت قریب ایسا وقت ہوگا کہ ہم اس کے وجود کو ہی ضائع کرکے تھوڑے فائدہ سے بھی محروم ہو جائینگے نفس کو گھوڑے سے مناسبت بھی ہے۔

بہترین وظیفہ

سیالکوٹ کے ضلع کا ایک نمبردار تھا۔ اس نے بیعت کرنے کے بعد پوچھا کہ حضور اپنی زبان مبارک سے کوئی وظیفہ بتادیں۔

فرمایا کہ نمازوں کو سنوار کر پڑھو کیونکہ ساری مشکلات کی یہی کنجی ہے اور اسی میں ساری لذات اور خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ صدق دل سے روزے رکھو۔ صدقہ و خیرات کرو۔ درُود و استغفار پڑھا کرو۔ اپنے رشتہ داروں سے نیک سلوک کرو۔ ہمسایوں سے مہربانی سے پیش آؤ۔ بنی نوع بلکہ حیوانوں پر بھی رحم کرو۔ اُن پر بھی ظُلم نہ چاہیئے۔ خُدا سے ہر وقت حفاظت چاہتے رہو کیونکہ ناپاک اور نامراد ہے وہ دل جو ہر وقت خدا کے آستانہ پر نہیں گزارتا وہ محروم کیا جاتا ہے۔ دیکھو اگر خدا ہی حفاظت نہ کرے تو انسان کا ایک دم گذارہ نہیں۔ زمین کے نیچے سے لے کر آسمان کے اوپر تک کا ہر طبقہ اس کے دشمنوں کا بھرا ہوا ہے۔ اگر اسی کی حفاظت شامل حال نہ ہو تو کیا ہو سکتا ہے۔ دُعا کرتے رہو کہ اللہ تعالیٰ ہدایت پر کاربند رکھے۔ کیونکہ اس کے ارادے دو ہی ہیں۔ گمراہ کرنا اور ہدایت دینا جیسا کہ فرماتا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ پس جب اس کے ارادے گمراہ کرنے پر بھی ہیں تو ہر وقت دُعا کرنی چاہیئے کہ وہ گمراہی سے بچاوے اور ہدایت کی توفیق دے۔ نرم مزاج بنو کیونکہ جو نرم مزاجی اختیار کرتا ہے خدا بھی اس سے نرم معاملہ کرتا ہے۔ اصل میں نیک انسان تو اپنا پاؤں بھی زمین پر پھونک پھونک کر احتیاط سے رکھتا ہے تا کسی کیڑے کو بھی اس سے تکلیف نہ ہو۔ غرض اپنے ہاتھ سے، پاؤں سے، آنکھ وغیرہ اعضاء سے کسی کو کسی نوع کی تکلیف نہ پہنچاؤ اور دُعائیں مانگتے رہو۔

تعدد ازدواج

مرزا خدابخش صاحب مالیر کوٹلہ سے تشریف لائے تھے ان سے وہاں کے جلسہ کے حالات دریافت فرماتے رہے۔ انہوں نے سُنایا کہ ایک شخص نے یوں اعتراض کیا کہ اسلام میں جو چار بیویاں رکھنے کا حکم ہے یہ بہت خراب ہے اور ساری بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

چار بیویاں رکھنے کا حکم تو نہیں دیا بلکہ اجازت دی ہے کہ چار تک رکھ سکتا ہے۔ اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ چار ہی کو گلے کا ڈھول بنالے۔ قرآن کا منشاء تو یہ ہے کہ چونکہ انسانی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اس واسطے ایک سے لیکر چار تک کی اجازت دے دی ہے ایسے لوگ جو ایک اعتراض کو اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں اور پھر وہ خود اسلام کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مَیں نہیں جانتا کہ ان کا ایمان کیسے قائم رہ جاتا ہے۔ وہ

تو اسلام کے معترض ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ایک مقنن کو قانون بناتے وقت کن کن باتوں کا لحاظ ہوتا ہے۔ بھلا اگر ایک شخص کی بیوی ہے اُسے جذام ہوگیا ہے یا آتشک میں مبتلا ہے یا اندھی ہوگئی ہے یا اس قابل ہی نہیں کہ اولاد اس سے حاصل ہوسکے وغیرہ وغیرہ عوارض میں مبتلا ہو جاوے تو اس حالت میں اب اس خاوند کو کیا کرنا چاہیئے کیا اسی بیوی پر قناعت کرے؟ ایسی مشکلات کے وقت وہ کیا تدبیر پیش کرتے ہیں۔ یا بھلا اگر وہ کسی قسم کی بدمعاشی زنا وغیرہ میں مبتلا ہوگئی تو کیا اب اس خاوند کی غیرت تقاضا کرے گی کہ اُسی کو اپنی پرعصمت بیوی کا خطاب دے رکھے؟ خدا جانے یہ اسلام پر اعتراض کرتے وقت اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ مذہب ہی کیا ہے جو انسانی ضروریات کو ہی پورا نہیں کرسکتا۔ اب ان مذکورہ حالتوں میں عیسویت کیا تدبیر بتاتی ہے؟ قرآن شریف کی عظمت ثابت ہوتی ہے کہ انسانی کوئی ایسی ضرورت نہیں جس کا پہلے سے ہی اس نے قانون نہ بنا دیا ہو۔ اب تو انگلستان میں بھی ایسی مشکلات کی وجہ سے کثرت ازدواج اور طلاق شروع ہوتی جاتی ہے۔ ابھی ایک لارڈ کی بابت لکھا تھا کہ اُس نے دوسری بیوی کر لی آخر اُسے سزا بھی ہوئی مگر وہ امریکہ میں جا رہا۔

غور سے دیکھو کہ انسان کے واسطے ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں یا نہیں کہ یہ ایک سے زیادہ بیویاں کرلے۔ جب ایسی ضرورتیں ہوں اور انکا علاج نہ ہو تو یہی نقص ہے جس کے پُورا کرنے کو قرآن شریف جیسی اتم اکمل کتاب بھیجی ہے۔

شراب کی مضرّت

اسی اثنا میں شراب کا ذکر شروع ہوگیا۔ کسی نے کہا کہ اب تو حضور شراب کے بسکٹ بھی ایجاد ہوئے ہیں فرمایا:۔

شراب تو انسانی شرم۔ حیا۔ عفت۔ عصمت کی جانی دشمن ہے۔ انسانی شرافت کو ایسا کھو دیتی ہے کہ جیسے کُتے۔ بلّے۔ گدھے ہوتے ہیں۔ اس کا پیکر بالکل انہی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ اب اگر بسکٹ کی بلا دُنیا میں پھیلی تو ہزاروں ناکردہ گناہ بھی ان میں شامل ہو جایا کریں گے۔ پہلے تو بعض کو شرم و حیا ہی روک دیتی تھی اب بسکٹ لیے اور جیب میں ڈال لیے۔ بات یہ ہے کہ دجّال نے تو اپنی کوششوں میں تو کمی نہیں رکھی کہ دنیا کو فسق و فجور سے بھر دے مگر آگے خدا کے ہاتھ میں ہے جو چاہے کرے۔ اسلام کی کیسی عظمت معلوم ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اسلام پر کوئی اعتراض کیا۔ اس سے شراب کی بدبُو آئی۔ اس کو حد مارنے کا حکم دیا گیا کہ شراب پی کر اسلام پر اعتراض کیا۔ مگر اب تو کچھ حد و حساب نہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ زنا کرتے ہیں۔ غرض کوئی بدی نہیں جو نہ کرتے ہوں مگر با ایں ہمہ پھر اسلام پر اعتراض کرنے کو تیار ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ صفحہ ۱۴-۱۵ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۳ء)

۲۳ر فروری ۱۹۰۳ء

(ظہر سے پہلے)

بنی اسرائیل اور انکے مثیل

فرمایا:۔
جس طرح اللہ تعالیٰ نے فضائل میں اس قومِ اسلام کو اُمّتِ موسیٰ کا مثیل بنایا ہے ایسے ہی رذائل بھی کل وہ اس قوم میں جمع ہیں جو اُن میں پائے جاتے تھے۔ یہ قوم تو یہود کے نقشِ قدم پر ایسی چلی ہے جیسے کوئی اپنے آقا و مولیٰ مطاعِ رسول کی پیروی کرتا ہے یہود کے واسطے قرآن شریف میں حکم تھا کہ وہ دو دفعہ فساد کریں گے اور پھر اُن کی سزا دہی کے واسطے اللہ تعالیٰ اپنے بندے ان پر مسلط کرے گا۔ چنانچہ بخت نصر اور طیطوس دو تو نے ان لوگوں کو بُری طرح ہلاک کیا اور تباہ کیا۔ اس کی مماثلت کے لیے اس قوم میں نمونہ موجود ہے کہ جب یہ فسق و فجور میں حد سے نکلنے لگے اور خدا کے احکام کی ہتک اور شعائر اللہ سے نفرت ان میں آگئی اور دُنیا اور اس کی زیب و زینت میں ہی گُم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اسی طرح ہلاکو، چنگیز خاں وغیرہ سے برباد کرایا۔ لکھا ہے کہ اس وقت یہ آسمان سے آواز آتی تھی اَيُّهَا الْكُفَّارُ اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ۔ غرض فاسق فاجر انسان خدا کی نظر میں کافر سے بھی ذلیل اور قابلِ نفرین ہے۔ اگر کوئی کتاب قرآن شریف کے بعد نازل ہونے والی ہوتی تو ضرور ان لوگوں کے نام بھی اسی طرح عِبَادًا لَّنَآ میں داخل کئے جاتے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آخر کار بخت نصر یا اسکی اولاد بت پرستی وغیرہ سے باز آکر واحد خدا پر ایمان لائی ہے۔ اسی طرح ادھر بھی چنگیز خاں کی اولاد مسلمان ہو گئی۔ غرض خدا نے مماثلت میں طابق النَّعْلِ بِالنَّعْلِ والا صاف معاملہ کر کے دکھا دیا ہے۔

عادل گورنمنٹ

بعض بادشاہوں کی معدلت گستری کے متعلق ذکر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ:۔
ہماری گورنمنٹ ہم نے اُسے غور سے دیکھا ہے کہ نازک معاملات میں بھی بلا تحقیق کے کوئی کارگذاری نہیں کرتی۔ بغاوت جیسے خطرناک معاملات میں تو بلا تحقیق اور فرد جرم اور ثبوت کے سوا گرفت نہیں کی جاتی تو دوسرے معاملات میں بھلا کہاں ایسا کرنے لگی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اور حکامِ وقت ہیں کہ اُنکے نزدیک انسان تو گاجر مولی کی طرح بنے ہوئے ہیں۔ کسی نے شکایت کی بس پکڑا اور قتل کر دیا۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ثبوت کافی بہم پہنچایا جاوے یا کوئی لمبی تحقیقات کی جاوے۔ دیکھئے ہمارا مقدمہ پادری والا ابھی تو ایک بغاوت کے ہی رنگ میں تھا کیونکہ ایک پادری نے جو اُن کے مذہب کا لیڈر اور گرو مانا جاتا تھا اس نے ظاہر کیا تھا کہ گویا ہم نے اس کے قتل کا منصوبہ کیا ہے اور پھر اس پر بڑے بڑے لوگ پادریوں کی سفارشیں بھی تھیں مگر بلا تحقیق کے ایک قدم بھی نہ اُٹھایا گیا اور

آخر کار قوم کی پروا نہ کرکے ہمیں بری کیا گیا۔غرض یہ بھی ہم پر خدا کا ایک فضل ہے کہ ایسی عادل گورنمنٹ کے ماتحت ہیں۔
(دربار شام)

مسیح کی آمدِ ثانی

امریکہ کے ایک انگریز کا اشتہار سنایا گیا جس میں اس نے لکھا ہے کہ مسیح کی دوبارہ آمد کا وقت یہی وقت ہے۔ وہ کل نشانات پورے ہوگئے جو آمدِ ثانی کے پیش خیمہ تھے اور اُس نے اس بیان کو بڑے بشپوں اور فلاسفروں کی شہادتوں سے قوی کیا ہے۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

اصل میں ان کی یہ بات کہ مسیح کی آمدِ ثانی کا وقت یہی ہے اور اس کے آنے کے تمام نشانات پورے ہوگئے ہیں بالکل ہمارے منشاء کے مطابق ہے اور راستی بھی اس میں ہے۔ اُن کی وہ بات جو حق ہو اور جہاں تک وہ راستی کی حمایت میں ہو اُسے ردّ نہ کرنا چاہیئے یہ لوگ ایک طرح سے ہماری خدمت کر رہے ہیں۔ اس ملک میں جہاں ہماری تبلیغ بڑی محنت اور صرفِ کثیر سے بھی پوری طرح سے کما حقہٗ نہیں پہنچ سکتی۔ وہاں یہ ہماری اس خدمت کو مفت اچھی طرح سے پورا کر رہے ہیں۔ انہوں نے وقت کی تشخیص تو بالکل راست کی ہے مگر نتائج نکالنے میں سخت غلطی کرتے ہیں جو آنیوالے کی انتظار آسمان سے کرتے ہیں۔

ہر سچے نبی کیساتھ کوئی نہ کوئی جھوٹا نبی بھی آتا ہے

اب آئے دن سُنا جاتا ہے کہ کسی نے دعویٰ کیا ہے کہ مَیں ہی مسیح ہوں جو آنیوالا تھا یا مَیں مہدی ہوں جس کا انتظار کیا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے مضر نہیں ہیں یہ تو بلکہ ہماری صداقت کو اَور بھی دوبالا کر کے دکھاتا ہے کیونکہ مقابلہ کے سوا کسی کی بھلائی یا بُرائی کا پورا اظہار نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے اور چند روز پانی اور جھاگ والا معاملہ کرکے دُنیا سے رُخصت ہوجاتے یا پاگل خانہ کی سیر کو روانہ کئے جاتے ہیں۔ یہ ہماری صداقت پر مُہر ہیں۔ ہر نبی کے ساتھ کوئی نہ کوئی جھُوٹا نبی بھی آتا ہے چنانچہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں چار شخص ایسے تھے۔ اسی طرح اس زمانہ کے لیے بھی لکھا تھا کہ بہت سے جھُوٹے نبی آویں گے سو یہ لوگ خود ہی اس پیشگوئی کو پورا کرتے ہیں۔ بھلا کوئی بتا دے کہ وہ مہدی سوڈانی اب کہاں ہے؟ یا پیرس کا مسیح کیا ہوا! انجام نیک صرف صادق ہی کا ہوتا ہے۔ سارے جھوٹے اور مصنوعی آخر تھک کر رہ جاتے یا ہلاک ہو جاتے ہیں اور جھوٹ کے انجام کا پتہ دوسروں کے لیے بطور عبرت کے چھوڑ جاتے ہیں۔

---

۶ رمارچ لیکھرام کے قتل کا دن

لاہور کے آریہ پتر کا نے لکھا ہے کہ ہمارا شہید مارچ کی ۶ رکو ایک بزدل مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اس

دن کی یادگار قائم کرنی چاہیئے کہ وہ دن بڑا متبرک جاننا چاہیئے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:۔
اصل میں ہمارے یہاں کے آریہ بھول گئے ان کو بھی چاہیئے تھا کہ ۶؍مارچ کا دن جلسہ کے واسطے مقرر کرتے اور اِن لوگوں کو تو خصوصیت سے اس دن کی تعظیم کرنی چاہیئے کیونکہ لیکھرام اصل میں اس جگہ سے یہ تبرکات لے گیا تھا۔

تمباکو نوشی کی مضرت

ایک شخص نے امریکہ سے تمباکو نوشی کے متعلق اس کے بہت سے مجرب نقصان ظاہر کرتے اشتہار دیا۔ اس کو آپ نے سُنا۔ فرمایا کہ:۔
اصل میں ہم اس لیے اسے سُنتے ہیں کہ اکثر نوعمر لڑکے، نوجوان تعلیمیافتہ بطور فیشن ہی کے اس بلا میں گرفتار و مبتلا ہو جاتے ہیں تا وہ ان باتوں کو سُنکر اس مضر چیز کے نقصانات سے بچیں۔
فرمایا۔ اصل میں تمباکو ایک دھُواں ہوتا ہے جو اندرونی اعضاء کے واسطے مضر ہے اسلام لغو کاموں سے منع کرتا ہے اور اس میں نقصان ہی ہوتا ہے لہٰذا اس سے پرہیز ہی اچھا ہے۔

پیشگوئیاں ہستی باریتعالیٰ کے متعلق معرفت بخشتی ہیں

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت جس طرح سے پیشگوئی دلاتی ہے ایسا اَور کوئی سچا علم نہیں معرفت کو زیادہ کرنے کا صرف یہی ایک طریق ہے۔ ہماری نسبت بھی اللہ تعالیٰ نے براہینِ احمدیہ میں فرمایا ہے کہ تیری صداقت کو پیشگوئی کے ذریعہ سے ظاہر کروں گا۔

پنڈت دیانند اور نیوگ

مجھے ایک دفعہ یہ خیال آیا کہ کیا وجہ تھی کہ دیانند نے بے حیائی اور بے غیرتی کا مسئلہ نکالا جسے کوئی شریف آریہ بھی بطیب خاطر پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا نام سُنکر گردن نیچی کر لیتا ہے اور چاہِ ندامت میں غرق ہو جاتا ہے تو میری سمجھ میں آیا کہ چونکہ وہ شخص بغیر بیوی کے تھا اس واسطے وہ سارے اخلاق جو بیوی کے ہونے سے وابستہ ہیں ان سب سے وہ محروم تھا۔ غیرت اور حمیت بھی ایک بیوی والے شخص کا ہی حصہ ہے۔ چونکہ وہ بیوی سے محروم تھا اس واسطے وہ نیوگ کی خرابی کو محسوس نہیں کر سکا اور نہ سمجھا کہ اس طرح سے مَیں ہزاروں شریف لوگوں کے گلے پر چھُری پھیرتا ہوں۔ یہی وجہ تھی ورنہ اگر اس کے عیال ہوتے وہ ہرگز ایسی بے عزتی کو روا نہ رکھتا۔ اب بھی بہت سے شریف آریہ ہیں جو اسے گلے پڑا ڈھول سمجھ کر ہی صرف زبان سے مان لیتے ہیں ورنہ عملدر آمد بہت کم ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ صفحہ ۱۵-۱۶ مورخہ ۲۸؍فروری ۱۹۰۳ء)

۲۷ فروری ۱۹۰۳ء

(قبل از عصر)

مولوی عبدالکریم صاحب نے عرض کی کہ حضور اُردو کتابوں کا تو کبھی بھی پروف نہیں آتا۔ فرمایا:۔

اُردو میں پنجابی الفاظ کا استعمال

اُردو کیا بھیجنا ہوتا ہے وہ تو صاف ہوتا ہے۔ ہاں بعض نادان اتنا اکثر اعتراض کردیا کرتے ہیں کہ اُردو میں پنجابی ملا دیتے ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ ایک شخص نے میری طرف سے کسی ایسے ہی معترض کو جواب دیا کہ تم انصاف کرو کہ اگر وہ اُردو میں پنجابی کے الفاظ ملا دیتے ہیں تو غضب کیا ہوا؟ ان کی ملکی اور مادری زبان ہے اس کا کیا حق نہیں؟ جب وہ انگریزی یا عربی اور دوسرے کی زبان کا لفظ اردو میں ملاتے ہیں تو تم اعتراض نہیں کرتے مگر جب کوئی پنجابی کا لفظ مِل جاوے تو اعتراض کرتے ہو۔ شرم تو کرو۔ اگر تعصب نہیں تو کیا ہے۔

(دربار شام)

اپنا بوجھ خود اُٹھائیں

ایک شخص نے خط لکھا تھا کہ حضور مجھے کرایہ بھیجا جاوے۔ مَیں حاضرِ خدمت ہوں گا۔ فرمایا:۔

مَنْ جَرَّبَ الْمُجَرَّبَ حَلَّتْ بِهِ النَّدَامَةُ۔ ہم نے بار بار ایسے لوگوں کا تجربہ کرلیا ہے کہ ان میں اخلاص اور نیک نیتی نہیں ہوتی تو کیا ضرورت ہے کہ اس طرح میرا روپیہ ضائع کیا جائے۔ وہی روپیہ دینی کام میں خرچ ہوگا۔ کیا ایسا شخص جو معترض ہے وہ ہمارے حافظ معین الدین سے بھی گیا گذرا ہے؟ یہ بھی ہمیں قریباً پندرہ یا بیس روپے دے چکا ہے کبھی دو آنے اور کبھی ایک آنہ ماہوار دیتا ہے تو ایسے بیکس شخص جب لنگر اور دیگر اخراجات کے واسطے کچھ دے سکتے ہیں تو وہ شخص کیوں اپنا بوجھ نہیں سنبھال سکتا؟ اور شریعت نے تو بوجھ بھی نہیں ڈالا۔ حج کی توفیق نہ ہو تو حج بھی ساقط ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس جگہ بھی گھر بیٹھے بٹھائے بیعت ہوسکتی ہے صرف ایک پیسہ کا کارڈ صرف ہوتا ہے۔

رات کی فضیلت

فرمایا:۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ رات اور دن میں فرق ہی کیا ہے۔ صرف نُور اور ظلمت کا فرق ہے سو وہ نُور تو مصنوعی بھی بن سکتا ہے بلکہ رات میں تو یہ ایک برکت ہے۔ خدا نے بھی اپنے فیضان عطا کرنے کا وقت رات ہی رکھا ہے چنانچہ تہجد کا حکم رات کو ہے۔ رات میں دوسری طرفوں سے فراغت اور کش مکش

سے بے فکری ہوتی ہے۔ اچھی طرح دلجمعی سے کام ہو سکتا ہے رات کو مُردہ کی طرح پڑے رہنا اور سونے سے کیا حاصل؟

انسان کی خوش قسمتی

اگر ہو سکے تو دین کی خدمت کرنی چاہیئے۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اَور کیا ہے کہ انسان کا وقت، وجود، قویٰ، مال، جان خدا کے دین کی خدمت میں خرچ ہو۔ ہمیں تو صرف مرض کے دَورہ کا اندیشہ ہوتا ہے ورنہ دل یہی کرتا ہے کہ ساری ساری رات کٹے جاویں ہماری تو قریباً تمام کتابیں امراض وعوارض میں ہی لکھی گئی ہیں۔ ازالہ اوہام کے وقت میں بھی ہم کو خارش تھی۔ قریباً ایک برس تک وہ مرض رہا تھا۔

منشی اشیاء کا استعمال عمر کو گھٹا دیتا ہے

اللہ اللہ! کیا ہی عمدہ قرآنی تعلیم ہے کہ انسان کی عمر کو خبیث اور مُضر اشیاء کے ضرر سے بچالیا۔ یہ منشی چیزیں شراب وغیرہ انسان کی عمر کو بہت گھٹا دیتی ہیں۔ اس کی قوت کو برباد کر دیتی ہیں اور بڑھاپے سے پہلے بڑھا کر دیتی ہیں۔ یہ قرآنی تعلیم کا احسان ہے کہ کروڑوں مخلوق ان گناہ کے امراض سے بچ گئی جو اِن نشہ کی چیزوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

قادیان کے آریہ سماج کے جلسہ پر جو آریہ آئے تو ان کی گندہ دہنیوں اور گالی گلوچ کا کسی نے حضرت اقدس کی خدمت میں ذکر کیا۔ فرمایا کہ:۔

زبان کی تہذیب کا ذریعہ

انسانی زبان کی چھری تو رُک سکتی ہی نہیں جب خدا کا خوف کسی دل میں نہ ہو۔ انسانی زبان کی بے باکی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا دل سچے تقویٰ سے محروم ہے۔ زبان کی تہذیب کا ذریعہ صرف خوفِ الٰہی اور سچا تقویٰ ہے۔ ان کی گالیوں پر ہمیں کیا افسوس ہو۔ انہوں نے تو نہ خدا کو سمجھا اور نہ حق العباد کو۔ ان کو خبر ہی نہیں کہ زبان کس چیز سے رُکتی ہے۔

تمام قوت اور توفیق خدا ہی کو ہے اور اس کی عنایت اور نصرت سے ہی انسان کچھ لکھ پڑھ سکتا ہے۔ شاید اس کتاب کے خاتمہ کے لکھے جانے سے اس قوم کی قوت وہمت اور دلائل کا خاتمہ ہو جاوے۔

صادق کی مخالفت کا راز

مَیں نے کل سوچا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ جب کوئی صادق خدا کی طرف سے آتا ہے تو اس کو لوگ کتوں کی طرح کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اس کی جان۔ اس کا مال۔ اس کی عزّت وآبرو کے درپے ہو جاتے ہیں۔ مقدمات میں اس کو کھینچتے ہیں۔ گورنمنٹ کو اس سے بدظن کرتے ہیں۔ غرض ہر طرح سے جس طرح اُن سے بن پڑتا ہے اور تکلیف پہنچا سکتے ہیں اپنی طرف سے

کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ہر پہلو سے اس کے استیصال کرنے پر آمادہ اور ہر ایک کمان سے اس پر تیر مارنے کو کمربستہ ہوتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ذبح کر دیں اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے قیمہ کر دیں۔ ادھر تو یہ جوش اُٹھتا ہے مگر دوسری طرف اس کے پاس ہزار دو ہزار لوگ آتے ہیں۔ ہزاروں کنجر اور لنگوٹی پوش فقیر بنتے اور خلق اللہ کو گمراہ کرتے ہیں مگر ان لوگوں کو قتل اور کُفر کا فتویٰ کوئی نہیں دیتا۔ اُن کی ہر حرکت بدعت اور شرک سے پُر ہوتی ہے۔ ان کا کوئی کام ایسا نہیں ہوتا جو سراسر اسلام کے خلاف نہ ہو مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ اُن کے لیے کسی دل میں جوش نہیں اُٹھتا غرض اس میں سوچتا تھا کہ کیا حکمت ہے تو میری سمجھ میں آیا کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے کہ صادق کا ایک معجزہ ظاہر کرے کہ باوجود اس قسم کی ممانعت کے اور دشمن کے تیر و تبر کے چلانے کے صادق بچایا جاتا اور اسکی روزافزوں ترقی کی جاتی ہے۔ خدا کا ہاتھ اُسے بچاتا اور اس کو شاداب و سرسبز کرتا ہے۔ خدا کی غیرت نہیں چاہتی کہ کاذب کو بھی اس معجزہ میں شریک کرے۔ اسی واسطے اس کی طرف سے دُنیا کے دلوں کو بے پروا کر دیتا ہے۔ گویا اس جھوٹے کی کسی کو پروا نہیں ہوتی۔ اس کا وجود دلوں کو تحریک نہیں دے سکتا۔ مگر برخلاف اس کے صادق کا وجود تباہ ہونے والے لوں کو بے قرار اور بے چین کرکے ایک رنگ میں ایک طرح سے خبر دیتا ہے اور اُن کے دل بے قرار ہوتے ہیں۔ کیونکہ دل اندر ہی اندر جانتے ہیں کہ یہ شخص ہمارا کاروبار تباہ کرنے آیا ہے۔ اس واسطے نہایت اضطراب کی وجہ سے اس کے ہلاک کرنے کو اپنے تمام ہتھیاروں سے دوڑتے ہیں مگر اس کا خدا خود محافظ ہوتا ہے۔ خدا اس کے واسطے طاعون کی طرح واعظ بھیجتا اور اس کے دشمنوں کے واعظوں پر اسے غلبہ دیتا ہے۔ وہ خدا کے واعظ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اب دیکھیئے کہ اتنے لوگ جو ہر جمعہ کو جن کی نوبت اکثر پچاس ساٹھ تک پہنچ جاتی ہے اُن کو کون بیعت کے لیے لاتا ہے؟ یہی طاعون کا ڈنڈا ہے جو اُن کو ڈرا کر ہماری طرف لے آتا ہے ورنہ کب جاگنے والے تھے اسی فرشتہ نے اُن کو جگایا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۹، ۱۰ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۳ء)

۲۸؍فروری ۱۹۰۳ء

(دربار شام)

دربار شام میں آریہ لوگوں میں سے چند لوگ حضرت اقدس کی زیارت کے واسطے آئے۔ حضرت نے پوچھا آپ بھی اس جلسہ کی تقریب پر آئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ حضور ہم لوگ تو اصل میں یہ بات سُنکر آئے ہیں کہ آپ کا بھی لیکچر ہوگا ورنہ ہماری اس جگہ آنے کی چنداں خواہش نہ تھی۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

مذہبی مباحثات کے آداب

اصل بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر قوم میں کچھ شریف لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد کسی بے جا حقارت یا کسی کو بے جا گالی گلوچ دینا یا کسی قوم کے بزرگوں کو بُرا بھلا کہنا اُن کا مقصد نہیں ہوتا۔ مگر ہم تو جو کام کرتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے حکم اور اسکی اجازت اور اس کے اشارہ سے کرتے ہیں۔ اس نے ہمیں اس قسم کے زبانی مباحثات سے روک دیا ہوا ہے چنانچہ ہم کئی سال ہوئے کہ کتاب انجام آتھم میں اپنا یہ معاہدہ شائع بھی کر چکے ہیں اور ہم نے خدا سے عہد کیا ہے کہ زبانی مباحثات کی مجالس میں نہ جاویں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسے مجمعوں میں مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں کوئی تو محض جاہل اور دھڑے بندی کے خیال پر آتے ہیں۔ کوئی اس واسطے کہ تا کسی کے بزرگوں کو گالی گلوچ دیکر دل کی ہوس پوری کریں اور بعض سخت تیز طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں سو جہاں اس قسم کا مجمع ہو ایسی جگہ جاکر مذہبی مباحثات کرنا بڑا نازک معاملہ ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ جب دو شخص مقابل میں کھڑے ہوتے ہیں جب تک وہ یہ ثابت کرکے نہ دکھادیں کہ دوسرا مذہب بالکل غلطی پر ہے اور اس میں صداقت اور روحانیت کا حصّہ نہیں وہ مُردہ ہے اور خدا سے اُسے تعلق نہیں ہے تب تک اس کو اپنے مذہب کی خوبصورتی دکھانی مشکل ہوتی ہے کیونکہ یہ دوسرے کے معائب کا ذکر کرنا ہی پڑے گا جو غلطیاں ہیں اس میں اگر ان کا ذکر نہ کیا جاوے تو پھر اظہارِ حق ہی نہیں ہوتا۔ تو ایسی باتوں سے بعض لوگ بھڑک اُٹھتے ہیں۔ وہ نہیں برداشت کر سکتے طیش میں آکر جنگ کرنے کو آمادہ ہوتے ہیں لہٰذا ایسے موقعہ پر جانا مصلحت کے خلاف ہے اور مذہبی تحقیقات کے واسطے ضروری ہے کہ لوگ ٹھنڈے دل اور انصاف پسند طبیعت لے کر ایک مجلس میں جمع ہوں۔ ایسا ہو کہ اُن میں کسی قسم کے جنگ وجدال کے خیالات جوش زن نہ ہوں تو بہتر ہو۔ پھر ایسی حالت میں ایک طرف سے ایک شخص اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرے اور جہانتک وہ بول سکتا ہے بولے۔ پھر دوسری طرف سے جانبِ مقابل بھی اسی طرح نرمی اور تہذیب سے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرے۔ اسی طرح بار بار ہوتا رہے مگر افسوس کہ ابھی تک ہمارے ملک میں اس قسم کے متحمل لوگ اور صبر اور نرم دلی سے تحقیق والے نہیں ہیں۔ ابھی ایسا وقت نہیں آیا۔ ہاں اُمید ہے کہ خدا جلدی سے ایسا وقت لے آوے گا ہم نے تو ایسا ارادہ بھی کیا ہے کہ یہاں ایک ایسا مکان تیار کرایا جائے جس میں ہر مذہب کے لوگ آزادی سے اپنی اپنی تقریریں کر سکیں۔ درحقیقت اگر کسی امر کو ٹھنڈے دل اور انصاف کی نظر اور بُردباری سے نہ سُنا جاوے تو اس کی سچی حقیقت اور تہ تک پہنچنے کے واسطے ہزاروں مشکلات ہوتے ہیں۔ دیکھئے ایک معمولی چھوٹا سا مقدمہ ہوتا ہے تو اُس میں جج کس طرح طرفین کے دلائل، اُنکے عذر وغیرہ کس ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور پھر کس طرح سوچ بچار کر پوری تحقیقات کے بعد فیصلہ کرتا ہے بعض اوقات سال ہی گذر جاتے ہیں جب دُنیا کے مقدمات کا یہ حال ہے تو دین کے مقدمات کا کیونکر دو چار یا دس بارہ منٹ میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ سائل کو سوال کرنا تو آسان ہے مگر جواب دینے والے کو جو مشکلات ہوتی ہیں انکا اندازہ کرنا مشکل ہے ایک شخص اعتراض کر دیوے

کہ نظامِ شمسی کے متعلق اور ستاروں اور زمین کے متعلق حالات مجھے بتا دو اور جتنے وقت میں مَیں نے سوال کیا ہے اتنا ہی تمہیں وقت دیا جاتا ہے کہ اتنے وقت کے اندر اندر جواب دو۔ ورنہ تم جھوٹے ہو۔ اب صاف عیاں ہے کہ جواب دینے والا کیا کرے۔ وہ جب تک کئی جُز کی کتاب نہ لکھے تب تک جواب پورا نہ ہونا ہوا۔ غرض اس طرح کی مشکلات ہیں جو ہم کو درپیش ہیں۔ یہ وجوہ ہیں جو ہمیں ان جلسوں میں جانے سے روکتے ہیں۔

تلاشِ حق کے آداب

اگر سائل ایسا کرے کہ لو صاحب مَیں نے سوال کیا ہے تم جبتک اُس کا جواب کامل کرو مَیں خاموش ہوں تو جواب دینے والے کو بھی مزہ آوے۔ اصل میں جو باتیں خدا کے لیے ہوں اور جو دل خدا کی رضا کے واسطے ایسا کرتا ہے اور اُس کا دِل سچے تقویٰ سے پُر ہے وہ تو کبھی ایسا کرتا نہیں۔ مگر آج کل زبان چھُری کی طرح چلتی ہے اور صرف ایک حجت بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ خدا کے لیے ایسا ہوگا تو وہ باتیں اور وہ طرز ہی اَور ہوتی ہے۔ جو دل سے نکلتا ہے وہ دل ہی پر جا کر بیٹھتا ہے۔ حق جُو کے سوال کی بھی ہم کو خوشبو آجاتی ہے۔ حق جو ہو تو اس کی سختی میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ اس کا حق ہوتا ہے کہ جو امر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے متعلق اپنی تسلّی کرائے اور جب تک اس کی تسلّی نہ ہو اور پورے دلائل نہ مل جاویں تب تک بیشک وہ پُوچھے ہمیں بُرا نہیں لگتا۔ بلکہ ایسا شخص تو قابلِ عزت ہوتا ہے۔ جو باتیں خدا کے لیے ہوتی ہیں وہ کہاں اور نفسانی ڈھکوسلے کہاں؟

اعتراض کرنے میں جلدی نہ کرو

مَیں نے اپنی جماعت کو بھی بارہا سمجھایا ہے کہ کسی پر اعتراض کرنے میں جلدی نہ کرو ہر پُرانا مذہب اصل میں خدا ہی کی طرف سے تھا مگر زمانہ دراز گذرنے کی وجہ سے اس میں غلطیاں پڑ گئی ہیں۔ ان کو آہستگی اور نرمی سے دُور کرنے کی کوشش کرو کسی کو تحقیر کی طرح اعتراض کا تختہ نہ دو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج ایک کپڑا بازار سے لے کر سلایا جاتا اور پہنا جاتا ہے چند روز کے بعد وہ پُرانا ہو جاتا اور اس میں تغیر آکر کچھ اَور کا اَور ہی ہو جاتا ہے۔

سچّے مذہب کی علامات

اسی طرح پُرانے مذہب میں بھی صداقت کی جڑ ضرور ہوتی ہے۔ خدا راستی کے ساتھ ہوتا ہے اور سچا مذہب اپنے اندر زندہ نشان رکھتا ہے کیونکہ درخت اپنے پھلوں سے شناخت ہوتا ہے۔ گورنمنٹ جو اس وراء الوراء ہستی کا ایک نہایت کمزور سا ظلّ ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی نظر میں صادق کیسے عزیز اور معتبر ہوتے ہیں۔ وہ افسر یا ملازم جنکو گورنمنٹ نے خود کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمایا ہوتا ہے وہ کس دلیری سے کام کرتا ہے اور ذرا بھی پوشیدگی پسند نہیں کرتا۔ مگر وہ ایک مصنوعی ڈپٹی کمشنر یا تھانہ دار وغیرہ جو جعلی طور پر کسی جگہ خود بخود حاکم بن کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ کیا وہ گورنمنٹ کے سامنے ہو سکتے ہیں؟ جب گورنمنٹ کو یہ پتہ لگے گا اس کو ذلیل کرے گی اور وہ ہتھکڑی لگ کر

جیل خانہ میں یا اور سزا ملے گی یہی حال ہے مذہبی راستی کا۔ جو خدا کی نظر میں صادق ہوتا ہے اس میں خدا کے نشان او معجزات اور صداقت کے آثار ہوتے ہیں وہ ہر وقت زندہ ہوتا ہے اور اس کی عزت ہوتی ہے۔

متقی کا مقام

اصل میں خدا سے ڈرنیوالے کو تو بڑی بڑی مشکلات ہوتی ہیں۔ انسان پاک صاف تو جب جا کر ہوتا ہے کہ اپنے ارادوں کو اور اپنی باتوں کو بالکل ترک کر کے خدا کے ارادوں کو اسی کی رضا کے حصول کے واسطے فنا فی اللہ ہو جاوے۔ خودی اور تکبر اور نخوت سب اس کے اندر سے نکل جاوے۔ اس کی آنکھ اُدھر دیکھے جدھر خدا کا حکم ہو۔ اس کے کان اُدھر لگیں جدھر اس کے آقا کا فرمان ہو۔ اس کی زبان حق و حکمت کے بیان کرنے کو کھلے۔ اس کے بغیر نہ چلے جب تک اس کے لیے خدا کا اذن نہ ہو۔ اس کا کھانا۔ پہننا۔ سونا۔ پینا۔ مباشرت وغیرہ کرنا سب اس واسطے ہو کہ خدا نے حکم دیا ہے اس واسطے نہ کھانے کہ بھوک لگی ہے بلکہ اس لیے کہ خدا کہتا ہے۔ غرض جب تک مرنے سے پہلے مر کر نہ دکھا دے تب تک اس درجہ تک نہیں پہنچتا کہ متقی ہو۔ پھر جب یہ خدا کے واسطے اپنے اوپر موت وارد کرتا ہے خدا کبھی اسے دوسری موت نہیں دیتا۔

مَیں نیک دِل انسان کو دُور سے پہچان لیتا ہوں

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ جب لَب کھولا جاتا ہے تو اُن کی باتوں میں سے سوائے ہنسی ٹھٹھے اور دل دکھانے والے کلمات کے کچھ نکلتا ہی نہیں جو کچھ کسی برتن میں ہوتا ہے۔ وہی باہر نکلتا ہے۔ اُنکی زبانیں ان کے اندرون پر گواہی دیتی ہیں مَیں تو نیک دل انسان کو دُور سے پہچان لیتا ہوں جو شخص پاک کردار اور سلیم دل لے کر آتا ہے۔ مَیں تو اسی کے دیکھنے کا شوق رکھتا ہوں۔ اس کی تو گالی بھی بُری معلوم نہیں ہوتی۔ مگر افسوس کہ ایسے پاک دل بہت کم ہیں۔

صبر اور حلم کا نمونہ

ایک آریہ صاحب بولے کہ اصل میں حضور جاہل تو دو ہی قومیں ہیں۔ آپ بُرا نہ مانیں تو مَیں عرض کر دوں۔ اوّل تو سکھ دوسرے ہمارے یہ مسلمان بھائی۔

اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ

دیکھئے ایک سمجھنے والے کے لیے جاہل سے زیادہ اَور کیا گالی ہو سکتی ہے۔ کسی شخص کو اس کے منہ پر جاہل کہنا بہت سخت گالی ہے مگر سوچو تو کیا ان حاضرین میں سے کوئی ایک بھی بولا ہے؟ کیا اب بھی تمہیں اس مجلس کی نرمی اور تہذیب پر کچھ شک ہے؟ بہت ہیں جو ہمارے منہ پر گالیاں دے جاتے ہیں مگر ان میں سے ایک کی بھی مجال نہیں ہوتی کہ دم مار کر اس کو کچھ بھی کہہ جاوے۔

ہم ان کو دن رات صبر کی تعلیم دیتے ہیں۔ نرمی اور حلم سکھاتے ہیں۔ یہ وہ قوم نہیں کہ آپ کے اس اصول کی مصداق بن سکے۔ ہاں ہم البتہ عوام الناس لوگوں کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم تب مانیں اگر کسی آریہ لوگوں کے مجمع میں

اس طرح کہدیں کہ تم جاہل ہو اور وہ صبر کر رہیں اور ایک کی بجائے ہزار نہ سنائیں تو!

مسلمان کے اخلاق

آپ نے مسلمانوں کو نہیں دیکھا اور نہ ہی آپ نے اُن کے اخلاق دیکھے ہیں۔ اُن کا اور ان آریوں کا اگر مقابلہ کیا جاوے تو بکری اور بھیڑیئے کا معاملہ نظر آوے۔ عوام جو ہمارے زیر اثر نہیں ہیں اُن کا ہم ذمہ نہیں لیتے۔ گالی اور جوش دلانے والے الفاظ سنکر صبر کرنا مَردوں کا کام ہوتا ہے اگر کوئی ایسا کر کے دکھاوے تو ہم جانیں۔ نرمی بڑی مشکل ہے سختی تو ہر ایک شخص کر سکتا ہے۔

خدا تعالیٰ عمر کو کم و بیش کر سکتا ہے

کسی صاحب نے بیان کیا کہ آریوں نے لیکچر میں کہا کہ خدا عمر کو کم و بیش نہیں کر سکتا۔ فرمایا:-

ہمارا تو اعتقاد ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے وہ عمر کو کم بھی کر سکتا ہے اور زیادہ بھی کر سکتا ہے یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ (سورۃ الرعد : ۴۰) اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ کیوں مرتے ہوئے انسان سے صدقات کراتے ہیں۔ اور کیوں علاج معالجہ کراتے ہیں؟ بلکہ عیسائیوں کا بھی یہی اعتقاد ہے ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک شخص کی پندرہ دن کی عمر رہ گئی تھی دُعا سے پندرہ سال ہو گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ قوم نبوت کی راہ سے بالکل محروم ہونے کی وجہ سے اس راہ اور علم سے جاہلِ مطلق ہے اسی وجہ سے ایسے اعتراض کرتے ہیں۔ رُوحانیت سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ ایسے اعتراض ہرگز نہ کرتے۔ مادرزاد اندھے کو آنکھیں کیونکر دیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۰-۱۱ بابت ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

یکم مارچ ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

حضرت نواب محمد علی خانصاحب کے متعلق ایک الہام

نواب صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج رات ایک کشف میں آپ کی تصویر ہمارے سامنے آئی اور اتنا لفظ الہام ہوا حجۃ اللہ یہ امر کوئی ذاتی معاملات سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے متعلق یوں تفہیم ہوئی کہ چونکہ آپ اپنی برادری اور قوم میں سے اور سوسائٹی میں سے الگ ہو کر آئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام حجۃ اللہ رکھا یعنی آپ ان پر حجت ہوں گے۔ قیامت کے دن اُن کو کہا جاوے گا کہ فلاں شخص نے تم سے نکل کر اس صداقت کو پرکھا اور مانا۔ تم نے کیوں ایسا نہ کیا؟ یہ بھی تم میں سے ہی تھا اور تمہاری طرح کا ہی انسان تھا۔ چونکہ خدا تعالیٰ نے آپ کا نام حجۃ اللہ رکھا آپ کو بھی چاہیئے کہ آپ اِن لوگوں پر تحریر سے تقریر سے ہر طرح

سے حجت پوری کردیؒ۔ اصل میں اس ساری قوم کی حالت قابلِ رحم ہے عیش وعشرت میں گم ہیں۔ دُنیا کے کیڑے بنے ہوئے ہیں اور فنا فی یورپ ہیں۔ خدا سے اور آسمان سے کوئی تعلق نہیں جب کسی کو ایسی قوم میں سے نکالتا اور اس کی اصلاح کرتا ہے تو اس کا نام اس قوم پر حجت رکھتا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (نساء: ۴۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا تھا۔ اُس نے کچھ کہا تھا تو آپ نے فرمایا بس کر۔ اب تو مَیں اپنی ہی اُمّت پر گواہی دینے کے قابل ہو گیا ہوں۔ مجھے فکر ہے کہ میری اُمّت کو میری گواہی کی وجہ سے سزا ملیگی۔

کلمۃ اللہ کی حقیقت

حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے کلمۃ اللہ خصوصیت کے ساتھ کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کی ولادت پر لوگ بڑے گندے اعتراض کرتے تھے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان الزاموں سے بری کرنے کے لیے فرمایا کہ وہ تو کلمۃ اللہ ہیںؑ۔ اُن کی ماں بھی صدیقہ ہے یعنی بڑی پاکباز اور عفیفہ ہے ورنہ یوں تو کلمۃ اللہ ہر شخص ہے۔ اُن کی خصوصیت کیا تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا

ؑ البدر میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کی سیر کے دوران کا ایک اَور ذکر درج ہے جو الحکم میں نہیں۔ لکھا ہے:۔

عورتوں سے حُسنِ معاشرت

مستورات کا ذکر چل پڑا۔ ان کے متعلق احمدی احباب میں سے ایک سربرآوردہ ممبر کا ذکر سنایا کہ اُنکے مزاج میں اوّل سختی تھی۔ عورتوں کو ایسا رکھا کرتے تھے جیسے زندان میں رکھا کرتے ہیں اور ذرا وہ نیچے اُترتیں تو اُن کو مارا کرتے لیکن شریعت میں حکم ہے عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء: ۲۰) نمازوں میں عورتوں کی اصلاح اور تقویٰ کیلئے دُعا کرنی چاہیئے۔ تصاب کی طرح برتاؤ نہ کرے کیونکہ جبتک خدا نہ چاہے کچھ نہیں ہو سکتا مجھ پر بھی بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ عورتوں کو پھراتے ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسی بیماری ہے کہ جس کا علاج پھرانا ہے جب اُن کی طبیعت زیادہ پریشان ہوتی ہے تو بدیں خیال کہ گناہ نہ ہو کہا کرتا ہوں کہ چلو پھرا لاؤں اَور بھی عورتیں ہمراہ ہوتی ہیں۔

پھر خدا تعالیٰ کے مکالمہ مخاطبہ کی نسبت ذکر پر فرمایا کہ مجازی عدالتوں کی طرف سے جو ایک لقب انسان کو ملتا ہے تو اُسے کتنا فخر ہوتا ہے ستارۂ ہند لقب وغیرہ بھی ملتے ہیں تو کیا اب حقیقت میں ان لوگوں میں وہ خواص ہوتے ہیں؟ جو لقب ان کو ملتا ہے صرف استعارہ ہوتے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۷ مورخہ ۱۳ رمارچ ۱۹۰۳ء)

ؒ (البدر سے) "ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت مسیح کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ فرمایا:۔
ان کو کلمہ اس لیے کہا گیا تھا کہ یہود ان کو ناجائز ولادت قرار دیتے تھے ورنہ کیا دوسرے انبیاء کلمۃ اللہ نہ تھے؟ اسی طرح مریم علیہا السلام کو صدیقہ کہا گیا۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اَور عورتیں صدیقہ نہ تھیں۔ یہ بھی اسی لیے کہا کہ یہودی ان پر تہمت لگاتے تھے تو قرآن نے اس تہمت کو دُور کیا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۷ مورخہ ۱۳ رمارچ ۱۹۰۳ء)

ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمے اتنے ہیں کہ وہ ختم نہیں ہو سکتے۔ انہی اعتراضوں سے ہی بری کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا کہ وہ شیطان کے مَس سے پاک تھے ورنہ کیا دوسرے انبیاء شیطان کے ہاتھ سے مَس شدہ ہیں؟ جو نعوذ باللہ دوسرے الفاظ میں یُوں ہے کہ ان پر شیطان کا تسلط ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ شیطان کو کسی معمولی انسان پر بھی تسلط نہیں ہوتا تو انبیاء پر کس طرح ہو سکتا ہے؟ اصل وجہ صرف یہی تھی کہ اُن پر بڑے اعتراض کئے گئے تھے۔ اسی واسطے اُن کی بریّت کا اظہار فرمایا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ (البقرۃ: ۱۰۳) کوئی کہے کہ کیا انبیاء بھی کافر ہوا کرتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں۔ لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ بُت پرست ہو گئے تھے ایک عورت کے لیے۔ اس اعتراض کا جواب دیا۔ یہی حال ہے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق۔

اس دن کی سیر کے دوران ایک اَور ذکر بھی ہوا جو البدر میں یوں درج ہے:۔

چونکہ آج کے دن بھی آریہ سماج کا جلسہ تھا اور کثرت سے لوگ اس جلسہ میں شامل ہوئے تھے کہ حضرت مرزا صاحب کی زیارت ہوگی۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ مباحثہ کی خبر غلط شائع کی گئی ہے تو اب وہ لوگ حضرت کی زیارت کے لیے بعض تو مسجد میں آتے رہے اور بعض سیر میں آکر ملے ان میں سے بعض نے پھر درخواست کی کہ آپ جلسہ میں آکر کچھ گفتگو کریں۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

گالی اور برمحل بات میں فرق

مذہبی باتوں کو علمی رنگ میں بیان کرنا چاہیئے اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ جب انسان کو گیان حاصل ہو۔ ورنہ بلا سوچے سمجھے کہہ دینے سے کچھ نتیجہ نہیں نکلا کرتا۔ ہر ایک مذہب میں کُھلی کُھلی بات اور گیان کی بات بھی ہوتی ہے جبتک انسان نفس کو صاف کر کے بات نہ کرے تو ٹھیک پتہ نہیں لگتا۔ آج کل ہار جیت کو مدِ نظر رکھ کر لوگ بات کرتے ہیں۔ اس سے فساد کا اندیشہ ہوتا ہے۔

بار بار جہاد۔ طلاق۔ کثرت ازدواج کو پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُن کے بزرگ سب یہ باتیں کرتے آئے ہیں۔ یہاں کے آریہ ہمیشہ میرے پاس آتے ہیں اور سوال و جواب بھی ہوتا ہے لیکن آپس میں ناراضگی کبھی نہیں ہوتی بعض (دفعہ) بات اپنے محل پر چسپاں کہی جاتی ہے۔ لوگ اسے غلط فہمی سے گالی خیال کر لیتے ہیں ان کو یہ علم نہیں ہوتا کہ گالی اور برمحل بات میں فرق کر سکیں۔ بات یہ ہے کہ جب انسان پُرانے عقیدہ پر جما ہوا ہوتا ہے تو اس کے عقیدے کو جب دوسرا بیان کرتا ہے تو اسے گالی خیال کرتا ہے۔

اس موقعہ پر ایک ہندو نے کہا کہ آپ نے بعض جگہ گالیاں دی ہوئی ہیں۔ فرمایا کہ

کوئی ایسی بات پیش کرو جو اپنے محل پر چسپاں نہیں ہے۔ اس لیے مَیں کہتا ہوں کہ زبانی تقریریں اچھی نہیں ہیں اور تحریر پیش کرتا ہوں کہ ہر ایک پڑھ کر اپنی اپنی جگہ پر رائے قائم کر لے اور جو اس کا جی چاہے کہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر

حضرت اقدس نے اس ہندو کو تحفہ آریہ یعنی "نسیم دعوت" نئی تصنیف دی کہ تم اسے دیکھو اور بتلاؤ کونسی بات ہے جو اپنے محل پر چسپاں نہیں ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۷ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

(قبل از ظہر)

حضرت اقدس کی زیارت کے لیے کاشی رام وید لاہور سے اور بعض اَور لوگ تشریف لائے۔ حضرت اقدس نے مخاطب کر کے ان کو فرمایا:۔

اختلاف مذہب کی حکمت

اختلاف مذاہب کا جو خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت عملی سے رکھا ہے یہ بھی ایک عمدہ چیز ہے اس سے انسانوں کی عقل بڑھتی ہے۔ دُنیا میں اگر کسی معاملہ میں اتفاق بھی کرتے ہیں تو اس کی باریک در باریک جزئیوں تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے اور جزئی در جزئی نکلتی چلی آتی ہے۔

تبادلہ خیالات کے لیے مجلسوں میں تقریریں کرنی بھی اچھی چیز ہیں لیکن ابھی تک ہمارے ملک میں ایسے مہذب لوگ بہت ہی کم ہیں بلکہ نہیں ہیں جو آرام اور امن کے ساتھ اپنے مخالف رائے سن سکیں۔

مَیں نے خود یہ چاہا تھا اور میرا ارادہ ہے کہ قادیان میں ایک جگہ ایسی بناویں جہاں مختلف لوگ مذاہب کے جمع ہو کر اپنے اپنے مذہب کی صداقت اور خوبیوں کو آزادی سے بیان کر سکیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اگر اظہارِ حق کے لیے جلسے اور تقریریں ہوں تو بہت اچھی بات ہے مگر تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ ان میں فتنہ و فساد کا مظنہ ہوتا ہے اس لیے مَیں نے ان مباحثوں کو چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے دو چار آدمی ایسے بھی ہوں جو صبر اور نرمی کے ساتھ اپنے مخالف کی بات سُن لیں لیکن کثرت ایسے لوگوں کی ہوگی جو عوام الناس میں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنے مخالف کے منہ سے ایک لفظ بھی اپنے مذہب کے خلاف نہیں سُن سکتے خواہ وہ کتنا ہی نرم کیوں نہ ہو۔ چونکہ جب مخالف بیان کرے گا تو کوئی نہ کوئی لفظ اُس کے مُنہ سے ایسا نکل سکتا ہے جو اس کے فریق مخالف کی غلطی کے اظہار میں ہوگا اور اس سے عوام میں جوش پھیل جاتا ہے۔ ایسی جگہ تو تب امن رہ سکتا ہے جب سمجھانے والا اور سمجھنے والا اس طرح بیٹھیں کہ جیسے باپ بیٹے میں کوئی بُرائی دیکھتا ہے اور اس کو سمجھاتا ہے تو وہ نرمی اور صبر سے اس کو سُن لیتا ہے ایسی محبت کی کشش سے البتہ فائدہ ہوتا ہے۔ غیظ و غضب کی حالت میں یہ اُمید رکھنا کہ کوئی فائدہ ہو خام خیال ہے

ہندو اور مسلمانوں کے باہم تعلقات میں ابتری

اب مشکل آ کر یہ پڑی ہے کہ ایک تو دین کا اختلاف ہی ہے پھر اس پر احقاقِ حق لوگوں کی غرض نہیں رہی بلکہ بغض و عناد میں اس قدر ترقی کی گئی ہے کہ اپنے فریق مخالف کا نام بھی ادب یا عزت سے لینا گناہ سمجھا جاتا ہے مَیں دیکھتا ہوں کہ بڑی بے ادبی اور گستاخی سے بات کرتے ہیں۔ پہلے ہندو مسلمانوں میں ایسے

تعلقات تھے کہ برادری کی طرح رہتے تھے اب ایسا تفرقہ پیدا ہوا ہے کہ وہ اندرونی کشش جو ایک دوسرے میں تھی باقی نہیں رہی ہے بلکہ تعصب اور دشمنی بڑھ گئی ہے۔ پس جبکہ کوئی حصہ اُنس اور کشش کا ہی باقی نہ ہو اور ہار جیت مقصود ہو تو پھر اظہارِ حق کس طرح ہو سکتا ہے۔

اظہارِ حق کیلئے ضروری اُمور

اظہارِ حق کے واسطے یہ ضروری امر ہے کہ تعصب سے اندر خالی ہو اور بغض اور عناد نہ ہو۔ سَٹ آسَٹ کے نرنے کے لیے بحث کا تو نام بھی درمیان میں نہیں آنا چاہیئے بلکہ اس کو چاہیئے کہ بحث کو چھوڑ دے۔

مَیں یہ بھی مانتا ہوں اور یہی میرا مذہب ہے کہ ایک اَور غلطی میں لوگ پڑے ہوئے ہیں کسی مذہب پر حملہ کرتے وقت وہ اتنا غور نہیں کرتے کہ جو حملہ ہم کرتے ہیں اس مذہب کی کتاب میں بھی ہے یا نہیں؟ مسلمہ کتب کو چھوڑ دیتے ہیں اور کسی شخص کی ذاتی رائے کو لیکر اس کو مذہب کی خبر بنا دیتے ہیں۔

ہم بہت سی باتوں میں آریہ مذہب کے خلاف ہیں اور ہم ان کو صحیح تسلیم نہیں کرتے لیکن ہم ان کو وید پر نہیں لگاتے ہم کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ اس میں کیا ہے۔ ہاں پنڈت دیانند پر ضرور لگاتے ہیں کیونکہ انہوں نے تسلیم کر لیا ہے ہم تو اس عقیدہ کے خلاف کہتے ہیں جو شائع کر دیا گیا ہے کہ یہ آریہ سماج کا عقیدہ ہے۔ اسی طرح پر آریوں کو اگر کوئی اعتراض کرنا ہو تو چاہیئے کہ وہ قرآن شریف پر کریں یا اس عقیدہ پر جو ہم نے مان لیا ہو اور اس کو شائع کر دیا ہو۔ یہ مناسب نہیں کہ جس بات کو ہم مانتے ہی نہیں خواہ نخواہ ہمارے عقیدہ کی طرف اس کو منسوب کر دیا جائے۔

چونکہ بہت سے فرقے ہو گئے ہیں اس لیے جس نے ایک اُصول مان لیا ہے اُس پر اعتراض کرنا چاہیئے۔ اس لیے مباحثہ کے وقت کتاب کا نام لے۔ تفسیروں اور بھاشوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر اختلاف ہے۔

مباحثہ اُصول پر ہونا چاہیئے

اگر اس اصل کو مدِنظر رکھا جاوے تو سامعین فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جب تک کتاب کو کسی نے سمجھا اور پڑھا ہی نہیں اس پر وہ اعتراض کرنے کا حق کس طرح رکھ سکتا ہے۔ مذہب کے معاملہ میں یہ ضروری بات ہے کہ مانی ہوئی اصل پر بحث کریں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ کل کتابیں پڑھی جاویں اس کے لیے تو عمر بھی وفا نہیں کر سکتی۔

مباحثہ اصول پر ہونا چاہیئے[1] جو بطور بحث کے ہیں اور چونکہ عام مجمعوں میں حق کو مشتبہ رکھا جاتا ہے۔ انسان

---

[1] (البدر سے) "مناظرین نے لکھا ہے کہ فروعات میں بحث کرنا ہی فضول ہے۔ فروعات کی مثال تو لشکر کی ہے جنکے افسر اُصول ہیں۔ جب اصول میں فیصلہ ہو جاوے تو فروع میں خود ہو جاتا ہے جیسے جب افسر مارا جاوے تو سپاہی خود تابع ہو جاتے ہیں۔ مَیں کوئی بات نہیں کرتا جب تک خدا تعالیٰ اجازت نہ دے اگر مَیں نے مباحثہ میں جانا ہوتا تو یہ کتاب (مراد "نسیم دعوت" مرتب) شائع نہ کرتا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۸ کالم اول کا آخر مورخہ ۱۳ر مارچ ۱۹۰۳ء)

ضد اور تعصب سے کام لیتا ہے مَیں نے خدا سے عہد کر لیا ہے کہ اس طریق کو چھوڑ دیا جاوے۔

یہ کتاب (نسیم دعوت۔ مرتب) مَیں نے اصول مباحثہ کے لحاظ سے لکھی ہے اور اسی طریق سے جو مَیں نے پیش کیا ہے بحث کی ہے جو ہم کو گالیاں دیتے ہیں ہم ان کی گالیوں کا کوئی جواب نہیں دیتے کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہم سے تو گالیوں کی قوت ہی کھو دی ہے۔ کس کس کی گالی کا جواب دیں[1]

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۱-۱۲ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۱۲ مارچ ۱۹۰۳ء

(صبح کی سَیر)

مسیح موعودؑ کے ذریعہ خانہ کعبہ کی حفاظت

صاحبزادہ سراج الحق صاحب نے عرض کیا کہ حضور میرے ایک دوست نے لکھا ہے کہ تم تو حج کرنے کو گئے ہوئے ہو مگر ہمیں بھلا دیا ہے[2]

فرمایا:۔ اصل میں جو لوگ خدا کی طرف سے آتے ہیں ان کی خدمت میں دین سیکھنے کے واسطے جانا بھی ایک طرح کا حج ہی ہے حج بھی خدا تعالیٰ کے حکم کی پابندی ہے اور ہم بھی تو اس کے دین اور اس کے گھر یعنی خانہ کعبہ کی حفاظت کے واسطے آئے ہیں۔

---

[1] (البدر سے) "جب یہ آریہ صاحبان تشریف لے گئے تو کچھ اور صاحب آئے۔ ان کے سوالات کا جواب حضرت اقدس نے ذیل کے مختصر فقرات میں دیا۔

"باوجود اختلاف رائے کے حق کی رُو رعایت رکھنا اس بات کو آپ کتاب نسیم دعوت میں دیکھیں گے۔ خدا نے اب ہم سے گالیوں کی قوت ہی دور کر دی ہے اور نہ ہم ہر ایک کو الگ الگ جواب دے سکتے ہیں۔ اب کروڑ ہا آدمی گالی دے رہے ہیں کس کس کو جواب دیں۔ میرا تعلق آریہ سماج سے ہے نہ وید سے کیونکہ وید سے میں واقف نہیں ہوں۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] "ایک شخص کی طرف سے "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ" جو حضرت کا الہام ہے اس پر اعتراض پیش ہوا تو فرمایا کہ انت منی کے معنے ہیں کہ تیری نشوونما مجھ سے ہے اور وانا منک یعنی جب خدا کی عظمت و جلال ایک وقت کم ہو جاتا ہے تو پھر خدا تعالیٰ ایک بندہ کے ذریعہ اسے دنیا پر ظاہر کرتا ہے چونکہ اس وقت خدائی کا جلوہ اس مامور کے ہاتھ سے ہوتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں تجھ سے ہوں یعنی میرا جلال تیرے ذریعہ ظاہر ہوا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کشف میں دیکھا تھا کہ دجال اور مسیح موعود اکٹھے طواف کر رہے ہیں. اصل میں طواف کے معنے ہیں پھرنا تو طواف دو ہی طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو رات کو چور پھرتے ہیں یعنی گھروں کے گرد طواف کرتے ہیں اور ایک چوکیدار طواف کرتا ہے مگر ان میں فرق یہ ہے کہ چور تو گھروں کو لوٹنے اور گھروں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اور چوکیدار ان گھروں کی حفاظت اور بچاؤ اور چوروں کے پکڑنے کے واسطے طواف کرتے ہیں. یہی حال مسیح اور دجال کے طواف کا ہے۔ دجال تو دنیا میں اس واسطے پھرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ تا دنیا کو خدا کی طرف سے پھیر دے اور ان کے ایمان کو لُوٹ لیا جاوے مگر مسیح موعود اس کوشش میں ہے کہ تا اُسے پکڑے اور مارے اور اس کے ہاتھ سے لوگوں کے دین و ایمان کے متاع کو بچاوے۔ غرض یہ ایک جنگ ہے جو ہمارا دجال سے ہو رہا ہے۔

کامل ایمان والے کو کسی نشان کی ضرورت نہیں ہوتی

ایک صاحب نے عرض کی حضور کیا وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو مبشرات کثرت سے ہوتے ہیں اور بعض کو بہت کم بلکہ بالکل ہی نہیں۔ فرمایا کہ :۔

اصل میں اللہ تعالیٰ نے طبائع مختلف پیدا کی ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ایمانی قوت ہی ایسی مضبوط ہوتی ہے کہ اسے کسی نشان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا ایمان کامل ہوتا ہے۔ دیکھو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کونسا نشان دیکھا تھا؟ یا کونسا خواب آیا؟ یا کوئی بشارت ہوئی تھی جس سے انہوں نے آپ کو پہچان لیا تھا اگر اُن کا کوئی خواب یا بشارت وغیرہ ہوتی تو اس کا ذکر حدیث شریف میں ضرور ہوتا۔ وہ ایک سفر پر گئے ہوئے تھے راستہ میں واپسی پر انہوں نے ایک شخص سے پوچھا۔ اپنے شہر کی کوئی نئی بات سناؤ۔ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے آپ کو آگاہ کیا۔ فوراً بے چون وچرا مان لیا۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے حالات دیکھے ہوئے تھے۔ وہ بخوبی آگاہ تھے کہ یہ شخص کاذب یا مفتری نہیں۔ اُن کو پہلی واقفیت اور عقلِ سلیم نے آپ کو فوراً قبول کر لینے پر مجبور کیا۔ زمانہ کی حالت کو انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ وقت تھا ضرورت تھی ایک صادق نے خدا کی طرف سے الہام پاکر دعویٰ کیا فوراً مان لیا۔

اصل میں نشانات کی ضرورت بھی کمزور ایمان کو ہوتی ہے۔ کامل ایمان کو نشان کی ضرورت ہی نہیں۔

خُدا کے مقرب عذابِ الٰہی سے محفوظ رکھے جاتے ہیں

فرمایا کہ خدا کے عذاب سے اپنے آپکو محفوظ رکھنے کے واسطے خدا کا قرب حاصل کرنا ضروری ہے۔ جتنا جتنا خدا سے انسان قریب ہوتا ہے اتنا ہی وہ مصائب

شدائد اور بلاؤں سے دُور ہوتا ہے۔ جو خدا کا مقرب ہوتا ہے اسے کبھی خدا کے قہر کی آگ نہیں کھاتی۔ دیکھو انبیاء کے وقت میں وبائیں اور طاعون سخت ہوتے رہے مگر کوئی بھی نبی ان عذابوں میں ہلاک نہیں ہوا۔ صحابہؓ کے وقت میں بھی طاعون پڑا۔ اور بہت سے صحابہؓ اس سے شہید بھی ہوئے مگر اس وقت وہ صحابہؓ کے واسطے شہادت تھی کیونکہ صحابہؓ اپنا کام پورا کر چکے تھے اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی اُن کو ہو چکی تھی اور نیز وہ کوئی تحدی کا وقت بھی نہ تھا اور مرنا تو ہر انسان کے ساتھ لازمی لگا ہوا ہے۔ اسی ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو اُن کی موت منظور تھی۔ ان کے واسطے شہادت تھی۔ مگر جب کسی عذاب کے واسطے پہلے سے خبر دی جاوے کہ خدا آسمان سے اپنی ناراضگی کی وجہ سے قہر نازل کرے گا تو ایسے وقت میں وہ وبا رحمت نہیں۔ اور شہادت نہیں ہوا کرتی بلکہ لعنت ہوا کرتی ہے۔ پس خدا کی طرف دوڑو کہ اسی کے پاس معالجے ہیں اور بچاؤ کے سامان ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۱، ۱۲ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

ماننے کے قابل حدیث اور خواب

ظہر کے وقت ایک شخص نے ایک پراگندہ سی خواب لکھ کر حضور سے تعبیر پوچھی تھی اس پر آپ نے فرمایا کہ:-

جس طرح سے حدیث ماننے کے قابل نہیں ہوتی جب تک قرآن کے موافق نہ ہو۔ اسی طرح کوئی خواب بھی ماننے کے لائق نہیں جب تک ہمارے موافق نہ ہو۔

عصر کے وقت چند ایک سکھ حضرت اقدس کی ملاقات کے واسطے آئے اور اثناء ذکر میں آپ نے فرمایا کہ

زبان سے تو ایک انسان بھی اپنا بندہ نہیں بن سکتا خدا کیسے بن سکتا ہے محبت ہوگی تو سانجھ ہوگی کھوٹ سے کوئی خدا سے کیا لے سکتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

(دربار شام)

خدا تعالیٰ کے فرستادہ کی تلاش ضروری تھی

ایک صاحب نووارد[1] تھے آپ نے اُن سے فرمایا:-

دیکھو دُنیا چند روزہ ہے کسی کو بقا نہیں اور یہ دنیا اور اس کا جاہ و جلال ہمیشہ نہیں رہنے والے۔ چاہیئے کہ اس وقت جو اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اس کو سمجھا جاوے اگر وہ درحقیقت خدا ہی کی طرف سے ہے تو اس سے دور

---

[1] البدر میں لکھا ہے:-
"صاحبزادہ سراج الحق صاحب نعمانی کے بھائی کے مریدوں میں سے ایک صاحب حضرت اقدس کی زیارت کے لیے تشریف لائے" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

رہنا کیسا بدقسمتی کا موجب ہوگا۔ وقت نازک ہے۔ دنیا نے جس امر کو سمجھنا چاہیئے تھا اسے نہیں سمجھا اور جس کی طرف توجہ کرنی چاہیئے تھی اس کو پسِ پُشت ڈال دیا ہے۔ خدا کے فرستادہ کی تلاش ضروری تھی۔ دیکھو دنیوی ضرورتوں کے واسطے کس طرح دنیا کوشش کرتی اور جانکاہ محنتوں سے ان کے حصول کے ذریعہ کو سوچتی ہے۔ مگر دین کیا ایسا ہی گیا گذرا امر ہے کہ اس کے واسطے اتنی بھی تکلیف نہ برداشت کی جاوے کہ چندروز کے واسطے ایک جگہ رہ کر اسلام کی تحقیق کی جاوے۔ ایک بیمار انسان جب کسی طبیب کے پاس جاتا ہے تو مریض کی اگر طبیب تشخیص کر بھی لیوے تو معالجہ ۱
میں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا دوا دی جاوے۔

ضرورتِ الہام

ایک شہر میں پہنچ کر انسان پھر بھی کسی خاص جگہ پر پہنچنے کے واسطے کسی راہبر کا محتاج ہوتا ہے تو کیا دین کی راہ معلوم کرنے اور خدا کی مرضی پانے کے واسطے انسانی ڈھکوسلے کام آسکتے ہیں؟ اور کیا سفلی عقل کافی ہوسکتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں جب تک اللہ تعالیٰ خود اپنی راہ کو نہ بتاوے اور اپنی مرضی کے وسائل کے حصول کے ذریعہ سے مطلع نہ کرے تب تک انسان کچھ کر نہیں سکتا۔ دیکھو جب تک آسمان سے پانی نازل نہ ہو زمین بھی اپنا سبزہ نہیں نکالتی گو بیج اس میں موجود ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ زمین کا پانی بھی دُور چلا جاتا ہے تو کیا رُوحانی بارش کے بغیر ہی رُوحانی زمین سرسبز ہو جاتی اور بارآور ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ خدا کے الہام کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ دیکھو یہ جو اتنے بڑے عاقل کہلاتے ہیں اور بڑے موجد ہیں آئے دن تار نکلتی ہے ریل بنتی ہے اور انسانی عقل کو حیران کر دینے والے کام کئے جاتے ہیں کیا ان کی عقل کے برابر بھی کوئی اور عقل ہے؟ جب ایسے عاقل لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایک عاجز انسان کو جو ایک عورت کے پیٹ سے عام لڑکوں کی طرح سے پیدا ہوا تھا اور اسی طرح عوارض وغیرہ کا نشانہ بنا رہا اور کھاتا پیتا سب کچھ کرتا ہوا یہودیوں کے ہاتھ سے سولی پر چڑھایا گیا تھا اس کو خداوند بنایا ہوا ہے اور اس کے کفارہ سے اپنی نجات جانتے ہیں اور ایسی بودی چال اختیار کی ہے کہ ایک بچہ بھی اس پر ہنسی کرے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ صرف یہی کہ انہوں نے سفلی عقل پر ہی بھروسہ کیا اور ایک کوے کی طرح نجاست پر گر پڑے۔

دیکھو جب انسان خدا سے مدد چاہتا ہے اور اپنے آپ کو عاجز جانتا ہے اور گردن فرازی نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ خود اس کی مدد کرتا ہے۔ ایک مکھی ہے کہ گندگی پر گرتی ہے اور دوسری کو خدا نے عزت دی کہ سارا جہان اس کا شہد کھاتا ہے یہ صرف اس کی طرف جھکنے کی وجہ سے ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ ہر وقت اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (الفاتحۃ: ۵) پکارتا رہے اور اسی سے توفیق طلب کرے۔ ایسا کرنے سے انسان خدا کی تجلیات کا مظہر بھی بن سکتا ہے۔ چاند جب آفتاب کے مقابل میں ہوتا ہے تو اُسے نُور ملتا ہے مگر جُوں جُوں اس سے کنارہ کشی کرتا ہے توں توں اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال ہے انسان کا۔ جب تک اس کے دروازہ پر گرا رہے اور اپنے

آپ کو اس کا محتاج خیال کرتا رہے تب اللہ تعالیٰ اُسے اُٹھاتا اور نوازتا ہے ورنہ جب وہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ ذلیل کیا جاتا ہے[1]

صادق کی معیت

کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ : ۱۱۹) بھی اسی واسطے فرمایا گیا ہے۔ سادھ سنگت بھی ایک ضرب المثل ہے پس یہ ضروری بات ہے کہ انسان باوجود علم کے اور باوجود قوت اور شوکت کے امام کے پاس ایک سادہ لوح کی طرح پڑا رہے تا اُس پر عمدہ رنگ آوے۔ سفید کپڑا اچھا رنگا جاتا ہے اور جس میں اپنی خودی اور علم کا پہلے سے کوئی میل کچیل ہوتا ہے اس پر عمدہ رنگ نہیں چڑھتا۔ صادق کی معیت[2] میں انسان کی عقدہ کشائی ہوتی ہے اور اسے نشانات دیئے جاتے ہیں جن سے اس کا جسم منوّر اور رُوح تازہ ہوتی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۳ مورخہ ۱۰ رمارچ ۱۹۰۳ء)

---

۱۳ رمارچ ۱۹۰۳ء

(بوقت سیر)

حضرت صاحب تشریف لائے تو کل کے نووارد مہمان بھی ہمراہ سیر کو چلے آپ نے انکو مخاطب کرکے فرمایا:

زندگی کا اعتبار نہیں ہے۔ ایک دن آنے کا ہے اور ایک دن جانے کا ہے معلوم نہیں کب مرنا ہے علم ایک

---

[1] حاشیہ البدر سے۔ "عیسائیوں کی عقل کیسی تیز ہے کیسی کیسی صنعتیں ایجاد کی ہیں گویا بالکل دنیا کو نیا کر دیا ہے۔ ہر ایک پُرانی شئے کی جگہ ایک نئی شئے موجود ہے مگر چونکہ دینی معاملات میں خدا سے مدد نہ مانگی گھمنڈ اور فخر کیا اس لیے عقل آخر کار ماری گئی کہ کتے کی طرح نجاست پر دانت مارا۔ سب پڑھ پڑھا کر ڈبو دیا۔ اس لیے اپنی رائے اور فیصلہ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ ہر ایک نبی میں یہ کمال تھا کہ ہر وقت خدا پر بھروسہ رکھتے۔ اپنی عقل اور طاقت پر ان کو ایک ذرہ بھر اعتبار نہ تھا چونکہ وہ ہر وقت خدا سے مدد مانگتے ہیں۔ اسی لیے ہر وقت اُن کو خدا سے مدد ملتی ہے۔ خدا کے بغیر کوئی طاقت اور مدد نہیں ملتی اور عقل پر گھمنڈ کرے گا تو شہد کی مکھی کی جگہ نجاست کی مکھی کی طرح ہوگا۔ لیکن اگر خدا سے مدد چاہے گا تو ایک نُور اسے ملیگا جس سے مدد پاکر وہ بڑی بڑی تجلیات الٰہی کا اگر مظہر بن جاوے تو سچ ہے۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۹ مورخہ ۱۳ رمارچ ۱۹۰۳ء)

[2] (البدر سے) "صادقوں کی صُحبت میں رہنا بہت ضروری ہے خواہ انسان کیسا علم رکھتا ہو۔ طاقت رکھتا ہو لیکن صحبت میں رہنے سے جو اُس کے شبہات دُور ہوتے ہیں اور اُسے علم حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے طور سے حاصل نہیں ہوتا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۹ مورخہ ۱۳ رمارچ ۱۹۰۳ء)

طاقت انسان کے اندر ہے۔ اس کے اُوپر وساوس اور شبہات پڑتے ہیں۔ عادتوں کے کیڑے برتن کی مَیل کی طرح انسان کے اندر چمٹے ہوئے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ۔ پس اگر آپ چند روز یہاں ٹھہر جاویں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے؟ اس طرح ہر ایک بات کا موقعہ آپ کو مِل جائیگا۔ دُنیا کے کام تو یونہی چلے چلتے ہیں ؎

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد ٭ ہر چہ گیرید مختصر گیرید

بہت لوگ ہمارے پاس آئے اور جلد رُخصت ہونے لگے۔ ہم نے اُن کو منع کیا مگر وہ چلے گئے۔ آخر کار پیچھے سے انہوں نے خط روانہ کئے کہ ہم نے گھر پہنچکر بنایا تو کچھ نہیں اگر ٹھہر جاتے تو اچھا ہوتا اور انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ہمارا جلدی آنا ایک شیطانی وسوسہ تھا۔

مسیح موعودؑ کی صحبت میں رہنے کی تاکید

یہ مرحلہ اس لیے قابلِ طے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے کہ جب دنیا ختم ہونے پر ہوگی تو اس اُمت میں سے مسیح موعود پیدا ہوگا۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اس کے پاس پہنچیں خواہ ان کو برف پر چل کر جانا پڑے۔ اس لیے صحبت میں رہنا ضروری ہے کیونکہ یہ سلسلہ آسمانی ہے۔ پاس رہنے سے باتیں جو ہوں گی ان کو سُنیگا جو کوئی نشان ظاہر ہو اُسے سوچے گا۔ آگے ہی زندگی کا کونسا اعتبار تھا مگر اب تو جب سے یہ سلسلہ طاعون کا شروع ہوا ہے کوئی اعتبار مطلق نہیں رہا۔ آپ نفس پر جبر کر کے ٹھہریئے اور جو شُبہ و خیال پیدا ہو وہ سُناتے رہیئے۔ اَن پڑھ اور اُمّی لوگ جو آتے ہیں ان کی باتیں اور شبہات کا سُننا بھی ہمارا فرض ہے۔ اس لیے آپ بھی اپنے شبہات ضرور سُنایئے یہ ہم نہیں کہتے کہ ہدایت ہو یا نہ ہو۔ ہدایت تو امرِ ربّی ہے کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

مسلمان کون ہے؟

یہ بات سمجھنے والی ہے کہ ہر ایک مسلمان کیوں مسلمان کہلاتا ہے؟ مسلمان وہی ہے جو کہتا ہے کہ اسلام برحق ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں قرآن کتابِ آسمانی ہے۔ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ مَیں ان سے باہر نہ جاؤں گا۔ نہ عقیدہ میں نہ عبادت میں۔ نہ عملدرآمد میں۔ میری ہر ایک بات اور عمل اس کے اندر ہی ہوگا۔

گدی نشین اور بدعات

اب اس کے مقابل پر آپ انصاف سے دیکھیں کہ آج کل گدی والے اس ہدایت کے موافق کیا کچھ کرتے ہیں۔ اگر وہ خدا کی کتاب پر عمل نہیں کرتے تو قیامت کو اس کا جواب کیا ہوگا کہ تم نے میری کتاب پر عمل نہ کیا۔ اس وقت طوافِ قبر، کنجریوں کے جلسے اور مختلف طریقے ذکر جن میں سے ایک ارّہ کا ذکر بھی ہے، ہوتے ہیں، لیکن ہمارا سوال ہے کہ کیا خدا بھول گیا تھا کہ اس نے یہ تمام باتیں کتاب میں نہ لکھ دیں نہ رسُول کو بتائیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت جانتا ہے اسے ماننا پڑیگا

کہ اللہ اور اس کے رسول کے فرمودہ کے باہر نہ جانا چاہیئے۔

کتاب اللہ کے برخلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب بدعت ہے اور سب بدعت فی النار ہے۔ اسلام اس بات کا نام ہے کہ بجز اس قانون کے جو مقرر ہے اِدھر اُدھر بالکل نہ جاوے کسی کا کیا حق ہے کہ بار بار ایک شریعت بناوے۔

بعض پیرزادے چوڑیاں پہنتے ہیں۔ مہندی لگاتے ہیں۔ لال کپڑے ہمیشہ رکھتے ہیں۔ سدا سہاگن ان کا نام ہوتا ہے۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو مرد تھے۔ اس کو مرد سے عورت بننے کی کیا ضرورت پڑی؟

ہمارا اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کتاب قرآن کے سوا اور طریق سُنّت کے سوا نہیں کس شے نے ان کو جرأت دی ہے کہ اپنی طرف سے وہ ایسی باتیں گھڑ لیں۔ بجائے قرآن کے کافیاں پڑھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل قرآن سے کھٹا ہوا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے جو میری کتاب پر چلنے والا ہو وہ ظلمت سے نور کی طرف آوے گا اور کتاب پر اگر نہیں چلتا تو شیطان اس کے ساتھ ہوگا۔

بندگانِ خدا کی علامت

مگر جو خدا کے بندے ہوتے ہیں ان میں خوشبو اور برکت ہوتی ہے۔ فریب اور مکر سے اُن کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جیسے آفتاب اُسے چمکتا ہوا نظر آتا ہے ایسے ہی دُور سے اس کی چمک دکھائی دیتی ہے اور دنیا میں اصل چمک انہیں کی ہے۔ یہ آفتاب اور قمر وغیرہ تو صرف نمونہ ہیں۔ ان کی چمک دائمی نہیں ہے کیونکہ یہ غروب ہو جاتے ہیں لیکن وہ غروب نہیں ہوتے جس کو خدا اور رسول کی محبت کا شوق ہے اور ان کے خلاف کو پسند نہیں کرتا اور عفونت اور بدبو کو محسوس کرنے کا اس میں مادہ ہو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ طریق اسلام سے بہت بعید ہے۔ مثل یہود کے خدا نے انکو چھوڑ دیا ہے۔ بلعم کی طرح اب مکر و فریب کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں رہا۔ صفائی والا انسان جلد دیکھ لیتا ہے کہ یہ جسم اس حقیقی رُوح سے خالی ہے۔

سجادہ نشینوں کے پیرو سوچیں

انسان توجہ کرے تو اسے پتہ لگتا ہے کہ جو لوگ صُمٌّ بُکمٌ ہو کر سجادہ نشینوں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہیں اور عرسوں وغیرہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اُن کو یہ خیال نہیں آتا۔ کہ وہ کونسی روشنی ہے جو خانہ کعبہ سے شروع ہوئی تھی اور تمام دنیا میں پھیلی تھی اور انہوں نے اس میں سے کس قدر حصّہ لیا ہے۔ ان کو ہرگز وہ نور نہیں ملتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے لائے اور اس سے کُل دُنیا کو فتح کیا۔ آج اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں تو ان لوگوں کو جو اُمّت کا دعویٰ کرتے ہیں کبھی شناخت بھی نہ کر سکیں۔ کونسا طریقہ آپ کا ان لوگوں نے رکھا ہے۔

شریعت تو اسی بات کا نام ہے کہ جو کچھ آنحضرتؐ نے دیا ہے اُسے لے لے! اور جس بات سے منع کیا ہے اس سے ہٹے۔ اب اس وقت قبروں کا طواف کرتے ہیں اُن کو مسجد بنایا ہوا ہے۔ عرس وغیرہ ایسے جلسے نہ منہاجِ نبوت ہے،

نہ طریق سُنّت ہے۔ اگر منع کرو تو غیظ و غضب میں آتے ہیں اور دشمن بن جاتے ہیں۔ چونکہ یہ آخری زمانہ ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا لیکن اسی زمانہ کے فسادوں کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس زمانہ میں اکیلا رہنا اور اکیلا مرجانا یا درختوں سے پنجہ مار کر مرجانا ایسی صحبتوں سے اچھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سب چیزیں پوری ہورہی ہیں انسان دوسرے کے سمجھائے کچھ نہیں سمجھتا۔ دل میں کسی بات کا بٹھا دینا یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ خدا جب کسی سے نیکی کرتا ہے تو اسے کچھ عطا کرتا ہے۔ اس کے دل میں فراست پیدا ہوجاتی ہے اور دل ہی معیار ہوتا ہے مگر محجوب دل کام نہیں آتا۔ یہ کام ہمیشہ پاک دل سے نکلتا ہے۔ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی (بنی اسرائیل : ۷۳) ان باتوں کے لیے دُعا کرنی چاہیئے۔

نیک اعمال کیلئے صحبتِ صادقین کی ضرورت ہے

خدا کے فضل کے سوا تبدیلی نہیں ہوتی اعمالِ نیک کے واسطے صحبتِ صادقین کا نصیب ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ خدا کی سُنّت ہے ورنہ اگر چاہتا تو آسمان سے قرآن یونہی بھیج دیتا اور کوئی رسول نہ آتا۔ مگر انسان کو عمل درآمد کے لیے نمونہ کی ضرورت ہے۔ پس اگر وہ نمونہ نہ بھیجتا رہتا تو حق مشتبہ ہوجاتا۔

مخالفت کی وجہ

اب اس وقت علماء مخالف ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ میں بار بار کہتا ہوں کہ یہ تمہارے عقیدے وغیرہ سب خلافِ اسلام ہیں۔ اس میں میرا کیا گناہ ہے؟ مجھے تو خدا نے مامور کیا ہے اور بتلایا ہے کہ ان غلطیوں کو نکال دیا جاوے اور منہاجِ نبوت کو قائم کیا جاوے۔ اب لوگ میرے مقابل پر قصہ کہانیاں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ مجھے خود ہر ایک امر بذریعہ وحی و الہام بتلایا جاتا ہے۔ ان کے کہنے سے میں اسے کیسے چھوڑ دوں؟ ان کا عقیدہ ہے کہ جب مسیح آویگا تو جس قدر غلطیاں ہوں گی ان کو نکال دیگا اگر اس نے سب کچھ انہیں کا قبول کرنا ہے اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا تو بتلاؤ کہ پھر اس کا کام کیا ہوگا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی یہی طریق ایسے لوگوں کا تھا کہ دُور سے بیٹھے شور مچاتے اور پاس آکر نہ دیکھتے۔ ابوجہل نے مخالفت تو سالہا سال کی مگر پیغمبر خدا کی صحبت میں ایک دن بھی نہ بیٹھا حتّٰی کہ مرگیا۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ اب ان سے پوچھا جاوے کہ بلا تحقیق کے کیوں فتوے لگاتے ہو؟

علاماتِ ظہورِ مہدی و مسیح کا پُورا ہونا

یہ خود کہتے تھے کہ صدی کے سر پر آنے والا ہے۔ پھر انہیں کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا کہ کسوف و خسوف ہوگا۔ طاعون پڑے گی۔ حج بند ہوگا۔ ایک ستارہ جو مسیح کے وقت نکلا تھا نکل چکا ہے۔ اونٹوں کی سواری بیکار ہوگئی ہے۔ اسی طرح سب علامتیں پوری ہوگئی ہیں۔ مگر ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ابھی مسیح نہیں آیا یہ معنے رکھتا ہے کہ یہ لوگ

چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی پیشگوئی پوری نہ ہو۔ یہ سب اندرونی نشان ہیں۔ اب بیرونی دیکھئے کہ صلیب کا غلبہ کس قدر ہے۔ نصاریٰ نے تردید اسلام میں کیا کیا کوششیں کی ہیں اور خود اندرونی طور پر تقویٰ۔ زہد۔ ریاضت میں فرق آگیا ہے۔ برائے نام مسلمان ہیں۔ جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں۔ خیانتیں کرتے ہیں۔ قرضہ لے کر دبا لیتے ہیں۔

اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ اسلام ہلاک ہو جاوے اور اندرونی اور بیرونی بلائیں اُسے کھا جائیں تو وہ کسی کو پیدا نہ کرتا۔ اس کا وعدہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) کا کہاں گیا؟ اول تو تار تار مجدد آئے مگر جب مسلمانوں کی حالت تنزل میں ہوئی۔ بد اطواری ترقی کرتی جاتی ہے۔ سعادت کا مادہ ان میں نہ رہا اور اسلام غرق ہونے لگا تو خدا نے ہاتھ اُٹھا لیا؟ جب کہو تو یہی جواب ہے کہ حدیثوں میں لکھا ہے کہ تیس دجال آئیں گے۔ یہ بھی ایک دجال ہے۔ او کمبختو! تمہاری قسمت میں دجال ہی لکھے ہیں؟ غرض کہ یہ باتیں غور کے قابل ہیں مگر دل کے کھولنے کی کُنجی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک وہ نہ کھولے دل میں اثر نہیں ہوتا۔ ابو جہل بھی تو چودہ برس تک باتیں سُنتا ہی رہا۔ یہی ہماری جماعت ہے اس کی کونسی عقل زیادہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کو سمجھ لیا اور بعضوں نے نہ سمجھا ایسے ہی دماغ اعضاء وغیرہ باقی سب مخالفوں کے ہیں مگر وہ اس حقیقت کو نہیں پہنچے۔ انکے دلوں کو قفل لگے ہیں۔

دوکانداری کا جواب

مختلف اعتراضات کے جواب پر فرمایا کہ:۔

اسے دکانداری کہتے ہیں۔ ہے تو دکان مگر خدا کی۔ اگر انسان کی ہوتی تو دیوالہ نکل جاتا لوٹ جاتی۔ مگر خدا کی ہے جو محفوظ ہے۔

ہمارے گروہ کی خدا نے خود مدد کی ہے کہ اتنی جلدی ترقی کر دی کہ یہ مسجدوں کے مُلاں وغیرہ جب دیکھیں گے کہ اب اُن کی تعداد بہت ہے خود ہی ہاں میں ہاں ملا دیں گے۔

(قبل از عشاء)

ایک خانساماں کی استقامت

بٹالہ میں ایک خانساماں جو مشنری لیڈی کے ہاں ملازم تھا حضرت صاحب کا خادم تھا۔

مشنری لیڈی نے اُسے اس تعصب کے باعث برخواست کر دیا۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

اگر مکھن کھاتے دانت جاتے ہیں تو جاویں۔

(مشنری لیڈی نے اُسے کہا تھا کہ تم اتنی دیر ہمارے پاس رہے اور اثر نہ ہوا۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ)

اثر تو ہوا کہ اس نے مقابلہ کر کے دیکھ لیا کہ حق اِدھر ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۵۹، ۶۰ مورخہ ۱۳ رمارچ ۱۹۰۳ء)

۴؍مارچ ۱۹۰۳ء (صبح کی سیر)

جو خدا کے واسطے کھوتا ہے اُسے ہزار چند دیا جاتا ہے

فرمایا کہ جو شخص خدا کی طرف قدم اُٹھاتا ہے (اس پر) خدا سے نُور اُترتا ہے۔ (وہ) اپنے فرشتوں کو اس کی خدمت کے واسطے مامور فرماتا ہے جو اسکے واسطے کچھ کھوتا ہے اس کو اُس سے ہزار چند دیا جاتا ہے۔ دیکھو صحابہؓ میں سے سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا تھا اور کمبل پوش بن پھرا تھا۔ مگر جب خدا تعالیٰ نے اُسے دیا تو کیا دیا۔ دیکھ لو کیسی مناسبت ہے کہ اس نے چونکہ سب صحابہؓ سے اوّل خرچ کیا تھا اسے سب سے پہلے خلافت کا تخت عطا کیا گیا۔ غرض خدا کوئی بخیل نہیں اور نہ اس کے فیض خاص خاص ہیں بلکہ ہر ایک جو صدق دل سے طالب بنتا ہے۔ اُسے عزت دی جاتی ہے۔ یہ ہمارے دشمن تو اللہ تعالیٰ سے جنگ کرتے ہیں۔ بھلا ان سے آسمانی باتیں اور تائیدات روکی جا سکتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پرنالہ کے پانی کو تو کوئی روک بھی سکتا ہے مگر جو آسمان سے موسلا دھار بارش ہونے لگ جاوے۔ اس کو کون روک سکے گا اور اس کے آگے کونسا بند لگاویں گے؟ ہمارا تو سارا کاروبار ہی آسمانی ہے۔ پھر بھلا کسی کی کیا مجال کہ اس میں کسی قسم کا حرج یا خلل واقع کر سکے۔

البدر میں بعض مزید باتوں کا ذکر ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ حضور نے فرمایا۔ "تجربہ ہے کہ جب ہندوؤں میں سے مسلمان ہوتے ہیں تو وہ متقی ہوتے ہیں جیسے مولوی عبیداللہ صاحب۔ سناتن دھرم والے زوائد کو چھوڑ کر وہ تمام باتیں مانتے ہیں جن کے ہم قائل ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں۔ فرشتوں پر بھی اُن کا ایمان ہے نیوگ کے سخت مخالف ہیں۔ جو لوگ اخلاص سے اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ کوئی شرط نہیں باندھتے جو شرطیں پیش کر کے اسلام لانا چاہتا ہے وہ ضرور کھوٹ رکھتا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۰ مورخہ ۱۳؍مارچ ۱۹۰۳ء)

لمبی مُونچھوں کی تعبیر

ایک خواب کی تعبیر میں فرمایا کہ اصل میں زیادہ لمبی لمبی (مونچھیں) رکھنا بھی تکبر اور نخوت کو بڑھاتا ہے اسی واسطے شریعت اسلام نے فرمایا ہے کہ مونچھیں کٹواؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ۔ یہ یہود اور عیسائی اور ہندوؤں کا کام ہے کہ وہ اکثر تکبر سے مونچھوں کو بڑھاتے ہیں اور تاؤ دے کر ایک متکبرانہ وضع بناتے ہیں خصوصاً سکھ لوگ مگر ہماری شریعت کیا پاک ہے کہ جس جگہ سے کسی قسم کی بدی کا احتمال بھی تھا اس سے بھی منع کر دیا۔ بھلا یہ باتیں کسی اَور میں کہاں پائی جاتی ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷؍مارچ ۱۹۰۳ء)

البدر میں ہے :۔ "ایک صاحب نے عرض کی کہ خواب میں مَیں نے اپنی مُونچھوں کو کترتے ہوئے دیکھا ہے فرمایا

کہ لبوں کے کترنے سے مراد انکساری اور تواضع ہے۔ زیادہ لب رکھنا تکبر کی علامت ہے جیسے انگریز اور سکھ وغیرہ رکھتے ہیں۔ پیغمبرِ خدا نے اسی لیے اس سے منع کیا ہے کہ تکبر نہ رہے اسلام تو تواضع سکھاتا ہے جو خواب میں دیکھے تو اس میں فروتنی بڑھ جاوے گی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۰ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۵ مارچ ۱۹۰۳ء

(دربارِ شام)

حضرت اقدس نے فارسی میں فرمایا لہٰذا اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے:۔

دوستوں کی جُدائی پر غمگین ہونا

فرمایا:۔ خدائے تعالیٰ نے یہ بات میرے دل میں ڈالی ہے اور میری فطرت میں رکھ دی ہے کہ جب کوئی دوست مجھ سے جُدا ہونے لگتا ہے مجھے سخت قلق اور درد محسوس ہوتا ہے۔ مَیں خیال کرتا ہوں کہ خدا جانے زندگی کا بھروسہ نہیں۔ پھر ملاقات نصیب ہوگی یا نہیں پھر میرے دل میں خیال آجاتا ہے کہ دوسروں کے بھی تو حقوق ہیں۔ بیوی ہے، بچے ہیں اور اَور رشتہ دار ہیں۔ مگر تاہم جو چند روز بھی ہمارے پاس رہتا ہے اس کے جُدا ہونے سے ہماری طبیعت کو صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ ہم بچے تھے اب بڑھاپے تک پہنچ گئے ہیں ہم نے تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ انسان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں بجز اس کے کہ انسان خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرلے۔

دُعا اَور توکّل

ساری عقدہ کشائیاں دُعا کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں بھی اگر کسی کی خیر خواہی ہے تو کیا ہے۔ صرف ایک دُعا کا آلہ ہی ہے جو خدا نے ہمیں دیا ہے کیا دوست کے لیے اور کیا دشمن کے لیے۔ ہم سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ نہیں کرسکتے۔ ہمارے بس میں ایک ذرہ بھر بھی نہیں ہے مگر جو خدا ہمیں اپنے فضل سے عطا کردے۔

لہ (البدر سے) ایک خادم نے حضرت اقدس سے رخصت طلب کی۔ ان کا وطن یہاں سے دور دراز تھا اور ایک عرصہ سے آکر حضرت اقدس کے قدموں میں موجود تھے اُن کے رخصت طلب کرنے پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ انسان کی فطرت میں یہ بات ہوتی ہے اور میری فطرت میں بھی ہے کہ جب کوئی دوست جُدا ہونے لگتا ہے تو میرا دل غمگین ہوتا ہے کیونکہ خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اس عالم کی یہی وضع پڑی ہے خواہ کوئی ایک سو سال زندہ رہے آخر پھر جُدائی ہے مگر مجھے یہ امر پسند ہے کہ عید الاضحیٰ نزدیک ہے وہ کر کے آپ جاویں جب تک سفر کی تیاری کرتے رہیں۔ باقی مشکلات کا خدا حافظ ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۰ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

انسان کو مشکلات کے وقت اگرچہ اضطراب ہوتا ہے مگر چاہیئے کہ توکل کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدر کے موقع پر سخت اضطراب ہوا تھا۔ چنانچہ عرض کرتے تھے یَارَبِّ اِنْ اَھْلَکْتَ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ فَلَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا۔ مگر آپ کا اضطراب فقط بشری تقاضا سے تھا کیونکہ دوسری طرف توکل کو آپ نے ہرگز ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ آسمان کی طرف نظر تھی اور یقین تھا کہ خدا تعالیٰ مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ یاس کو قریب نہیں آنے دیا تھا۔ ایسے اضطرابوں کا آنا تو انسانی اخلاق اور مدارج کی تکمیل کے واسطے ضروری ہے مگر انسان کو چاہیئے کہ یاس کو پاس نہ آنے دے کیونکہ یاس تو کفار کی صفت ہے۔ انسان کو طرح طرح کے خیالات اضطراب کا وسوسہ ڈالتے ہیں مگر ایمان ان وساوس کو دُور کر دیتا ہے۔ بشریت اضطراب خریدتی ہے اور ایمان اس کو دفع کرتا ہے۔

ایمان و عرفان کی حقیقت

دیکھو ایمان جیسی کوئی چیز نہیں۔ ایمان سے عرفان کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ ایمان تو مجاہدہ اور کوشش کو چاہتا ہے اور عرفان خدا تعالیٰ کی موہبت اور انعام ہوتا ہے عرفان سے مراد کشوف اور الہامات جو ہر قسم کی شیطانی آمیزش اور ظلمت کی طونی سے مبرا ہوں اور نور اور خدا کی طرف سے ایک شوکت کے ساتھ ہوں وہ مراد ہیں اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کی طرف سے موہبت اور انعام ہوتا ہے۔ یہ چیز کچھ کسی چیز نہیں مگر ایمان کسبی چیز ہوتا ہے۔ اسی واسطے اوامر ہیں کہ یہ کرو۔ غرض ہزاروں احکام ہیں اور ہزاروں نواہی ہیں۔ ان پر پوری طرح سے کاربند ہونا ایمان ہے۔

غرض ایمان ایک خدمت ہے جو ہم بجالاتے ہیں اور عرفان اس پر ایک انعام اور موہبت ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ خدمت کئے جاوے۔ آگے انعام دینا خدا کا کام ہے یہ مومن کی شان سے بعید ہونا چاہیئے کہ وہ اس انعام کے واسطے خدمت کرے۔[1]

---

[1] (البدر ۔۔)

خدا کے بندے مایوس اور ضائع نہیں ہوتے

"اگرچہ انسان کو بشریت کے تقاضا سے اضطراب ہوتا ہے مگر وہ خاصۂ بشریت ہے اور سب انبیاء بھی اس میں شریک ہیں جیسے کہ جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اضطراب ہوا تھا۔ مگر عام لوگوں میں اور انبیاء میں یہ فرق ہے کہ عام لوگوں کی طرح انبیاء کے اضطراب میں یاس کبھی نہیں ہوتی۔ ان کو اس امر میں پورا یقین ہوتا ہے کہ خدا ضائع کبھی نہ کریگا۔ میرا یہ حال ہے کہ اگر مجھے جلتی آگ میں بھی ڈالا جاوے تو بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ ضائع نہ ہوں گا۔ اضطراب تو ہوگا کہ آگ ہے اس سے انسان جل جاتا ہے مگر امید ہوتی ہے کہ ابھی آواز آئے گی یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ لیکن دوسرے لوگوں کے اضطراب میں یاس ہوتا ہے۔ خدا پر ان کو توقع نہیں ہوتی اور یہ کفر ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۱ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

خدا کی محبت میں محو ہو جاؤ

مکاشفات اور الہامات کے ابواب کے کھلنے کے واسطے جلدی نہ کرنی چاہیئے۔ اگر تمام عمر بھی کشوف اور الہامات نہ ہوں تو گھبرانا نہ چاہیئے۔ اگر یہ معلوم کرلو کہ تم میں ایک عاشقِ صادق کی سی محبت ہے جس طرح وہ اس کے ہجر میں اس کے فراق میں بھوکا مرتا ہے پیاس سہتا ہے نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پانی کی پروا۔ نہ اپنے تن بدن کی کچھ خبر اسی طرح تم بھی خدا کی محبت میں ایسے محو ہو جاؤ کہ تمہارا وجود ہی درمیان سے گم ہو جاوے پھر اگر ایسے تعلق میں انسان مر بھی جاوے تو بڑا ہی خوش قسمت ہے۔ ہمیں تو ذاتی محبت سے کام ہے۔ نہ کشوف سے غرض نہ الہام کی پروا۔ دیکھو ایک شرابی شراب کے جام کے جام پیتا ہے اور لذت اُٹھاتا ہے۔ اسی طرح تم اس کی ذاتی محبت کے جام بھر بھر کر پیو۔ جس طرح وہ دریا نوش ہوتا ہے اسی طرح تم بھی کبھی سیر نہ ہونے والے بنو۔ جب تک انسان اس امر کو محسوس نہ کرلے کہ مَیں محبت کے ایسے درجہ کو پہنچ گیا ہوں کہ اب عاشق کہلا سکوں تب تک پیچھے ہرگز نہ ہٹے۔ قدم آگے ہی آگے رکھتا جاوے اور اُس جام کو منہ سے نہ ہٹائے۔ اپنے آپ کو اس کے لیے بیقرار و شیدا و مضطرب بنالو۔ اگر اس درجہ تک نہیں پہنچے تو کوڑی کے کام کے نہیں۔ ایسی محبت ہو کہ خدا کی محبت کے مقابل پر کسی چیز کی پروا نہ ہو۔ نہ کسی قسم کی طمع کے مطیع بنو اور نہ کسی قسم کے خوف کا تمہیں خوف[1] ہو۔ چنانچہ کسی کا شعر ہے کہ ؎

آنکہ ترا شناخت جاں راچہ کُند ؎ فرزند و عیال خانماں راچہ کُند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی ؎ دیوانۂ ہر دو جہاں راچہ کُند

مَیں تو اگر اپنے فرزندوں کا ذکر کرتا ہوں تو نہ اپنی طرف سے بلکہ مجھے تو مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ کیا کروں اگر اس کے انعامات کا ذکر نہ کروں تو گنہگار ٹھہروں۔ چنانچہ ہر لڑکے کی پیلے اُسی نے خود اپنی طرف سے بشارت دی۔ اب مَیں کیا کروں۔ غرض انسان کا اصل مدعا تو صرف یہی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کی رضا مل جاوے۔ ؎

---

[1] (البدر سے) "پس یہ تعلقِ محبت ایک چیز ہے جو کہ مَیں چاہتا ہوں کہ ہماری جماعت میں زیادہ ہو۔۔۔ .... جب تک انسان محسوس نہ کرے کہ وہ محبت جس کا نام عشق ہے اس نے اسے بیقرار کر دیا ہے تب تک اس نے کچھ نہیں پایا۔ ہزارہا کشوف وغیرہ ہوں کچھ شئے نہیں ہیں۔ ہم تو ایک دمڑی کو نہیں خریدتے۔ کیا عمدہ کہا ہے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کُند ؎ فرزند و عیال وخانماں راچہ کُند

مَیں جو کبھی فرزندوں کا ذکر کیا کرتا ہوں یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اتفاقی طور پر اُن کا ذکر پیشگوئیوں میں آگیا ہوا ہے ورنہ مجھے اس بات کی کچھ آرزو اور ہوس نہیں ہوتی۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۱ مورخہ ۱۳؍مارچ ۱۹۰۳ء)

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم[1]

مدارِ نجات

مدارِ نجات صرف یہی امر ہے کہ سچا تقویٰ اور خدا کی خوشنودی اور خالق کی عبادت کا حق ادا کیا جاوے۔ الہامات و مکاشفات کی خواہش کرنا کمزوری ہے۔ مرنے کے وقت جو چیز انسان کو لذّت دِہ ہوگی وہ صرف خدا تعالیٰ کی محبت اور اس سے صفائی معاملہ اور آگے بھیجے ہوئے اعمال ہونگے جو ایمان صادق اور ذاتی محبت سے صادر ہوئے ہوں گے۔ مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ۔ اصل میں جو عاشق ہوتا ہے۔ آخر کار ترقی کرتے کرتے وہ معشوق بن جاتا ہے کیونکہ جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی توجہ بھی اس کی طرف پھرتی ہے اور آخر کار ہوتے ہوتے کشش سے وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے اور عاشق معشوق کا معشوق بن جاتا ہے۔ جب جسمانی اور مجازی عشق و محبت کا یہ حال ہے کہ ایک معشوق اپنے عاشق کا عاشق بن جاتا ہے تو کیا روحانی رنگ میں جو اس سے زیادہ کامل ہے ایسا ممکن نہیں کہ جو خدا سے محبت کرنے والا ہو آخر کار خدا اس سے محبت کرنے لگے اور وہ خدا کا محبوب بن جاوے؟ مجازی معشوقوں میں تو ممکن ہے کہ معشوق کو اپنے عاشق کی محبت کا پتہ نہ لگے مگر وہ خدا تعالیٰ علیم بذات الصدور ہے۔ اس سے انسان مظہرِ کراماتِ الٰہی اور موردِ عنایاتِ ایزدی ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی چادر میں مخفی ہو جاتا ہے۔ ان مکاشفات اور رؤیاء اور الہامات کی طرف سے توجہ پھیر لو اور ان امور کی طرف تم خود بخود جرأت کر کے درخواست نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ جلد بازی کرنے والے ٹھہرو۔ اکثر لوگ میرے پاس آتے ہیں کہ ہمیں کوئی ایسا ورد وظیفہ بتا دو کہ جس سے ہمیں الہامات اور مکاشفات ہونے شروع ہو جاویں، مگر میں انکو کہتا ہوں کہ ایسا کرنے سے انسان مشرک بن جاتا ہے۔ شرک یہی نہیں کہ بتوں کی پُوجا کی جاوے بلکہ سخت شرک اور بڑا مشکل مرحلہ تو نفس کے بُت کو توڑنا ہوتا ہے۔ تم ذاتی محبت خریدو اور اپنے اندر وہ قلق وہ سوزش وہ گداز وہ رِقّت پیدا کرو جو ایک عاشق صادق کے اندر ہوتی ہے۔ دیکھو کمزور ایمان جو طمع یا خوف کے سہارے پر کھڑا ہو وہ کام نہیں آتا۔ بہشت کی طمع یا دوزخ کا خوف وغیرہ امور پر اپنے ایمان کا تکیہ نہ لگاؤ۔ بھلا کبھی کسی نے کوئی عاشق دیکھا ہے کہ وہ معشوق سے کہتا ہو کہ میں تو تجھ پر اس واسطے عاشق ہوں کہ تُو مجھے اتنا روپیہ یا فلاں شئے دیدے۔ ہرگز نہیں۔ دیکھو ایسی طبعی محبت پیدا کرو جیسے ایک ماں کو اپنے بچّے سے ہوتی ہے۔ ماں کو نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیوں بچہ سے محبت کرتی ہے۔ اس میں ایک طبعی کشش اور ذاتی محبت ہوتی ہے۔

دیکھو اگر کسی ماں کا بچّہ گم ہو جاوے اور رات کا وقت ہو تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے جُوں جُوں رات زیادہ

---

[1] البدر میں اس کا پہلا مصرعہ بھی لکھا ہے۔

من ذرہ نہ آفتابم ہمہ از آفتاب گویم ٭ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۱ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

ہو گی اور اندھیرا بڑھتا جاوے گا اس کی حالت دگرگوں ہوتی جاوے گی گویا زندہ ہی مر گئی ہے۔ مگر جب اچانک اس سے اس کا فرزند مل جاوے تو اس کی وہ حالت کیسی ہوتی ہے۔ ذرا مقابلہ کر کے تو دیکھو۔ پس صرف ایسی محبت ذاتی اور کامل ایمان سے ہی انسان دارالامان میں پہنچ سکتا ہے۔ سارے رسُول خدا تعالیٰ کو اس لیے پیارے نہ تھے کہ ان کو الہامات ہوتے تھے ان کے واسطے مکاشفات کے دروازے کھولے گئے ہیں یا نہیں بلکہ اُن کی ذاتی محبت کی وجہ سے وہ ترقی کرتے کرتے خدا کے معشوق اور محبوب بن گئے تھے۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ نبی کی نبوت سے اس کی ولایت افضل ہے۔

اسی لیے ہم نے اپنی جماعت کو بارہا تاکید کی ہے کہ تم کسی چیز کی بھی ہوس نہ رکھو۔ پاک دل اور بے طمع ہو کر خدا کی محبتِ ذاتی میں ترقی کرو۔ جب تک ذاتی محبت نہیں تب تک کچھ بھی نہیں۔ مگر جو کہتے ہیں کہ ہم کو خدا سے ذاتی محبت ہے اور اس کے نشان ان میں نہیں پائے جاتے یہ اُن کا دعویٰ غلط ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک مجازی عاشق میں تو عشق کے آثار اور نشانات کھُلے کھُلے پائے جائیں بلکہ کہتے ہیں کہ عشق چھُپائے سے چھُپ نہیں سکتا تو کیا وجہ کہ رُوحانی عشق پوشیدہ رہ جائے۔ اس کے کچھ نشان ظاہر نہ ہوں۔ دھوکا کھاتے ہیں ایسے لوگ ان میں محبت ہی نہیں ہوتی۔

صُحبتِ صادقین اختیار کرو

اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ یعنی صادق لوگوں کی معیت اختیار کرو۔ ان کی صحبت میں مدتہائے دراز تک رہو کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چند روز اُن کے پاس رہ جاوے اور ان ایام میں حکمتِ الٰہی سے کوئی ایسا امر واقع نہ ہو کیونکہ ان لوگوں کے اختیار میں تو نہیں کہ جب چاہیں کوئی نشان دکھا دیں۔ اسی واسطے ضروری ہے کہ اُن کی صحبت میں لمبا عرصہ اور دراز مدت گذر جاوے بلکہ نشان دکھانا تو درکنار یہ لوگ تو اپنے خدا کے ساتھ تعلقات کا اظہار بھی گناہ جانتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اگر کوئی ولی خلوت میں اپنے خدا کے ساتھ خاص حالت اور تعلق کے جوش میں ہو اور اس پر وہ حالت طاری ہو تو ایسے وقت میں اگر کوئی شخص اس کے اس حال سے آگاہ ہو جائے تو وہ ولی شخص ایسا شرمندہ اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی زانی عین زنا کی حالت میں پکڑا جاوے کیونکہ یہ لوگ اپنے راز کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔

چونکہ طبعاً ایسا معاملہ تھا خدا تعالیٰ نے اسی واسطے کہا کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (الفرقان: ۸) تو انہوں نے بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی یہ کلمہ منہ سے نکالا تھا کہ کیا ہے جی۔ یہ تو ہمارے جیسا آدمی ہی ہے۔ کھاتا پیتا بازاروں میں پھرتا ہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض نہ تھا کہ اُن کو کوئی

رسالت کا امر نظر آتا۔ وہ معذور تھے۔ انہوں نے جو دیکھا تھا اسی کے مطابق رائے زنی کر دی پس اس واسطے ضروری ہے کہ مامور من اللہ کی صحبت میں دیر تک رہا جاوے۔ ممکن ہے کہ کوئی جس نے نشان کوئی نہ دیکھا ہو کہدے کہ اجی ہماری طرح نماز روزہ کرتا ہے اور کیا ہے۔ دیکھو حج کے واسطے جانا خلوص اور محبت سے آسان ہے مگر واپسی ایسی حالت میں مشکل ہے۔ بہت ہیں جو وہاں سے نامراد اور سخت دل ہو کر آتے ہیں۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہاں کی حقیقت اُنکو نہیں ملتی۔ قشر کو دیکھ کر رائے زنی کرنے لگ جاتے ہیں وہاں کے فیوض سے محروم ہوتے ہیں اپنی بدکاریوں کی وجہ سے اور پھر الزام دوسروں پر دھرتے ہیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ مامور کی خدمت میں صدق اور استقلال سے کچھ عرصہ رہا جاوے تاکہ اس کے اندرونی حالات سے بھی آگاہی ہو اور صدق پورے طور پر نورانی ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ صفحہ ۳ و ۴ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء)

سناتن دھرم

ہندوؤں کا ذکر چل پڑا۔ فرمایا :۔

یہ جو مَیں نے ایک اَور رسالہ لکھا ہے اس کا نام سناتن دھرم ہی رکھا ہے یہ لوگ اسلام کے بہت ہی قریب ہیں۔ اگر زوائد کو چھوڑ دیں۔ بلکہ مَیں نے اُن سے سُنا ہے اور پڑھا بھی ہے کہ جب یہ جوگی ہو کر خدا کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ تو اس وقت بُت پرستی کو حرام جانتے ہیں۔ ابتدا میں صرف تمثیلی طور پر بُت پرستی انہوں نے غلطی سے دکھلی لیکن اعلیٰ مراتب پر پہنچ کر اُسے اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ قریب ہو کر پھر بعید نہ ہو اور اس حالت میں جو مرتا ہے اسے جلاتے بھی نہیں بلکہ دفن کرتے ہیں۔

کَلِمَۃُ اللّٰہ

کلمۃ اللہ پر فرمایا کہ :۔

وجودیوں کی طرف تو ہم نہیں جاتے مگر جبتک کلمۃ اللہ نہ کہا جاوے تو بات بھی نہیں بنتی۔ یہ علم بہت گہرا ہے۔ جو شئے خدا سے نکلی ہے اس پر رنگ تو خدا کا ہے مگر یہ لوگ اُسے خدا سے الگ خیال نہیں کرتے۔ فیض کے یہ معنے ہیں کہ ہدایت ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۱ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

۶ مارچ ۱۹۰۳ء

بَلاؤں سے بچنے کا طریق

جمعہ کی نماز مسجد اقصیٰ میں ادا کرنے کے بعد چند ایک گردونواح کے آدمیوں نے بیعت کی بیعت کے بعد حضرت اقدس کھڑے ہو گئے اور آپ نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ :۔

جب آدمی توبہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے پہلے گناہ بخش دیتا ہے[1] قرآن میں اس کا وعدہ ہے۔ ہر طرح

[1] (الحکم سے) "اللہ تعالیٰ ان کو طرح طرح کی ذلتوں اور خواریوں سے بچا لیتا ہے۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۴ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

کے دُکھ انسان کو دنیا میں ملتے ہیں مگر جب خدا کا فضل ہوتا ہے تو ان سب بلاؤں سے انسان بچتا ہے۔ اس لیے تم لوگ اگر اپنے وعدہ کے موافق قائم رہو گے تو وہ تم کو ہر ایک بلا سے بچائے گا۔ نمازیں پکے رہو۔ جو مسلمان ہو کر نماز نہیں ادا کرتا ہے وہ بے ایمان ہے۔ اگر وہ نماز ادا نہیں کرتا تو بتلاؤ ایک ہندو میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ زمینداروں کا دستور ہے کہ ذرا ذرا سے عذر پر نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ کپڑے[1] کا بہانہ کرتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اَور کپڑے نہ ہوں تو اسی میں نماز پڑھ لے اور جب دوسرا کپڑا مل جاوے تو اس کو بدل دے۔ اسی طرح اگر غسل کرنے کی ضرورت ہو اور بیمار ہو تو تیمم کر لے۔ خدا نے ہر ایک قسم کی آسانی کر دی ہے تاکہ قیامت میں کسی کو عذر نہ ہو۔

اب ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ شطرنج گنجفہ وغیرہ بیہودہ باتوں میں وقت گذارتے ہیں۔ ان کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ ہم ایک گھنٹہ نماز میں گذار دیں گے تو کیا حرج ہو گا؟ سچے آدمی کو خدا مصیبت سے بچاتا ہے اگر پتھر بھی برسیں تو بھی اُسے ضرور بچا وے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو سچے اور جھوٹے میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لیکن یاد رکھو کہ صرف ٹکریں مارنے سے خدا راضی نہیں ہوتا۔ کیا دُنیا اور کیا دین میں جب تک پوری بات نہ ہو فائدہ نہیں ہوا کرتا۔ جیسے مَیں نے کئی بار بیان کیا ہے کہ روٹی اور پانی سیر ہو کر نہ کھائے پیئے تو وہ کیسے بچ سکتا ہے؟ یہ موت طاعون کی جو آئی ہے یہ اس وقت ٹلے گی کہ انسان قدم پورا رکھے[2] اُدھورے قدم کو خدا پسند نہیں کرتا۔

---

[1] اس جگہ البدر میں جو لفظ ہے وہ ٹھیک پڑھا نہیں جاتا۔ الحکم میں یہ فقرہ واضح ہے جو یہ ہے۔ "کپڑوں کے مَیلا ہونے کا عذر کر دیتے ہیں۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۴ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] (الحکم سے) "دیکھو آج کل طاعون بڑی خوفناک پڑی ہوئی ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اُس کو بچالے گا۔ عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے فقط زبانی اقرار ہی کافی نہیں اور نہ اُدھوری نمازیں ہو سکتی ہیں۔ بھلا ایک شخص جس کو پیاس شدت کی لگی ہوئی ہو کیا ایک قطرہ پانی سے وہ اپنی پیاس بجھا سکتا ہے؟ یا سخت بھوک لگی ہوئی ہو تو ایک ذرہ اناج سے پیٹ بھر سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ اسی طرح پر کوئی شخص اُدھوری اور ناقص نمازوں سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے غضب سے نہیں بچا سکتا۔ پس اپنی نمازوں کو درست کرو۔ ہر ایک قسم کی شکایت۔ گلہ۔ غیبت۔ جھوٹ۔ افتراء۔ بدنظری وغیرہ سے اپنے تئیں بچائے رکھو۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۴ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۳ء)

بدی کو خُدا کے خوف سے چھوڑ دو

جو بات طاقت سے باہر ہے وہ تو خدا معاف کر دیگا مگر جو طاقت کے اندر ہے اس سے مواخذہ ہوگا۔ جب انسان نیک بنتا ہے تو اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے خدا کی رحمت کے فرشتے ہوتے ہیں۔ سچا مومن ولی کہلاتا ہے اور اس کی برکت اُس کے گھر اور اس کے شہر میں ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کو ناراض کرتا ہے وہ نجاست کھاتا ہے۔ اگر انسان بدی کو خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو خدا اس کی جگہ نیک بدلہ اُسے دیتا ہے۔ مثلاً ایک چور اگر چوری کرتا ہے اور وہ چوری کو چھوڑ دے تو پھر خدا اُس کی وجہ معاش حلال طور سے کر دیگا۔ اسی طرح زمینداروں میں پانی وغیرہ چُرانے کا دستور ہوتا ہے اگر وہ چھوڑ دیں تو خدا اُن کی کھیتی میں دوسری طرف سے برکت دے دیگا۔ ایک نیک متقی زمیندار کے واسطے خدا تعالیٰ بادل کا ٹکڑا بھیج دیا کرتا ہے اور اس کے طفیل دوسرے کھیت بھی سیراب ہو جاتے ہیں۔ خدا کو چھوڑ کر بدی اور گند میں رہنا صرف خدا کی نافرمانی ہی نہیں بلکہ اس میں خدا تعالیٰ پر ایمان میں بھی شک ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ چور جب چوری کرتا ہے تو ایمان اس میں نہیں ہوتا اور زانی جب زنا کرتا ہے تو ایمان اسمیں نہیں ہوتا۔

یاد رکھو کہ وسوسے جو بلا ارادہ دل میں پیدا ہوتے ہیں ان پر مؤاخذہ نہیں ہوتا جب پکی نیت انسان کسی کام کی کرے تو اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرتا ہے اچھا آدمی وہی ہے جو دل کو ان باتوں سے ہٹا دے۔ ہر ایک عضو کے گناہوں سے بچے۔ ہاتھ سے کوئی بدی کا کام نہ کرے۔ کان سے کوئی بُری بات چغلی، غیبت، گلہ وغیرہ نہ سُنے۔ آنکھ سے محرمات پر نظر نہ ڈالے۔ پاؤں سے کسی گناہ کی جگہ چل کر نہ جاوے۔

شریروں کیلئے مہلت

بار بار مَیں کہتا ہوں کہ تم لوگ طاعون سے بے خوف نہ ہو اور یہ نہ سمجھو کہ اب اس کا دورہ ختم ہو گیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کیوں نہیں آتی اور وہ بدی پر مصر ہیں ان کو وہ ضرور پکڑے گی۔ اس کا دستور ہے کہ اول دُور دُور رہتی ہے۔ اب دیکھو مکہ میں قحط بھی پڑا۔ وبا بھی آئی لیکن ابوجہل کا بال بھی بیکا نہ ہوا حالانکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا۔ چودہ۱۴ برس تک خدا تعالیٰ نے اُسے ایسا رکھا کہ سر درد تک نہ ہوا۔ آخر وہاں ہی قتل ہوا جہاں پیغمبرِ خدا نے اس کا نشان بتایا تھا۔ اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ سب کام پردے سے کرتا ہے اگر وہ قہری تجلّی ایک دن دکھا دے تو سب ہندو وغیرہ مسلمان ہو جاویں۔ تم میں سے کوئی تکبّر اور غرور سے یہ نہ کہے کہ مجھے طاعون نہیں آتی۔ خدا تعالیٰ شریروں کو اس لیے مہلت دیتا ہے کہ شاید باز آجاویں اور ہدایت ہو۔[۱]

---

[۱] (الحکم سے)

" جو لوگ یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو ہم کو ہمارے گناہوں کے بدلے کیوں عذاب نہیں دیتا اور نہیں پکڑتا۔ وہ دلیری کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ کے کام آہستہ اور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ قہری تجلّی کرے تو ایک لحظہ میں تباہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بیعت کرنیوالوں کو نصیحت

آج تم لوگوں نے توبہ کی ہے۔ اگر سچے دل سے کی ہے تو پہلے سارے گناہ معاف ہوگئے اب اس وقت سے پھر نیا حساب کتاب شروع ہوگا۔ فرشتوں کو حکم ہوا ہے کہ تمہارے گذشتہ اعمال نامے سب چاک کردیویں اور تم نے اب ایک نیا جنم لیا ہے۔ یاد رکھو کہ جیسے ایک آقا نے اپنے غلام کے بہت سے گناہ معاف کردیئے ہوں اور اُسے تاکید ہو کہ اب کروگے تو سخت سزا ہوگی۔ پھر اگر وہ کوئی قصور کرے تو اُسے سخت غصّہ آتا ہے۔ ایسا ہی حال خُدا کا ہے۔ خدا قہار ہے۔ اگر اسکے بعد کوئی باز نہ آیا تو اس کا غضب بھڑکے گا۔ جیسے وہ ستّار ہے ویسا ہی منتقم اور غیور بھی ہے۔ قرآن کو بہت پڑھو۔ نمازوں کو ادا کرو۔ عورتوں کو سمجھاؤ۔ بچوں کو نصیحت کرو۔ کوئی عمل اور بدعت ایسی نہ کرو جس سے خدا تعالیٰ ناراض ہو۔ اگر ایسا کروگے تو خدا تعالیٰ تم میں اور دوسرے لوگوں میں فرق کرکے دکھلا دے گا۔

(مجلس قبل از عشاء)

جس صاحب نے کل حضرت اقدس سے رخصت طلب کی تھی ان سے مخاطب ہوکر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

یہی مناسب ہے کہ عید کی نماز کے بعد روانہ ہوں کیونکہ پھر سخت گرمی کا موسم آنے والا ہے۔ سفر میں بہت تکلیف ہوگی۔ مَیں نے جیسا آپ سے وعدہ کیا ہے دُعا کرتا رہونگا مجھے کسی امیر یا بادشاہ کا خطرہ نہیں ہے۔ میرا کام دعا کرنا ہے۔

توبہ کی انتہا فنا ہے

رخصت ہونے والے احمدی دوست نے کہا کہ حضرت جب سے مَیں آپ پر ایمان لایا ہوں۔ مَیں آج تک فرق نہیں کرسکا کہ میری محبت آپ سے زیادہ ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایسے ہی نہیں معلوم کہ مَیں خدا سے زیادہ پیار کرتا ہوں یا آپ سے۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

یہ فطرت انسانی ہے یَعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ یہی ہے۔ جب زر کو آگ میں ڈالتے ہیں تو آخر کار وہ ایسا ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کردے۔ دنیا میں بھی سارے کام تدریجی ہوتے ہیں اگر ایک شخص گڑ یا ریوڑیاں تقسیم کرے تو یکدم سب کو نہیں دے دیتا بلکہ ایک ایک کرکے ایسا ہی خدا تعالیٰ کا حال ہے۔ پہلے وہ دُور دُور بلائیں بھیجتا ہے تاکہ بعض سعید الفطرت لوگوں کو جو شامتِ اعمال میں گرفتار ہوگئے ہیں توبہ و استغفار کا موقعہ ملے وہ بچ جاتے ہیں اور شریر پکڑے جاتے ہیں۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۱۴ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

ہو جاتا ہے کہ آگ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں رہتا اور اگر وہ آگ سے الگ ہو جاوے تو بھی ایک مفید شئے ضرور دیتا ہے۔ صرف اتنی بات ہوتی ہے کہ چرک اس میں نہیں رہتا۔ آگ اپنے رنگ میں لاکر چرک اس سے دُور کر دیتی ہے۔

تو سلوک کی انتہاء فنا ہے جس کے معنے رجوع کے ہیں یعنی خدا تعالیٰ کے نزدیک ہونا یہی آگ ہے جس سے انسان صاف ہوتا ہے جو شخص اس کے نزدیک قدم رکھنے سے ڈرتا ہے کہ کہیں آگ سے جل نہ جاوے وہ ناقص ہے لیکن جو قدم آگے رکھتا ہے اور جیسے پروانہ آگ میں گر کر اپنے وجود کو جلاتا ہے ویسے ہی وہ بھی گرتا ہے۔ وہ کامیاب ہوتا ہے۔ مجاہدات کی انتہاء فنا ہی ہے۔

مقام لقاء

اس کے آگے جو لقاء ہے وہ امر کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ اس کاروبار کا انتہاء مرنا ہے اور یہ تخم ریزی ہے۔ اس کے بعد روئیدن یعنی پیدا کرنا وہ فعل خدا کا ہے۔ ایک دانہ زمین میں جا کر جب بالکل نیست ہوتا ہے تو پھر خدا تعالیٰ اُسے سبزہ بنا دیتا ہے مگر یہ مرحلہ بہت خوفناک ہے بالکل ٹھیک کہا ہے ؎

عشق اوّل سرکش و خُونی بود ٭ تا گریزد ہر کہ بیرُونی بود

جب آدمی سلوک میں قدم رکھتا ہے تو ہزارہا بلا اس پر نازل ہوتی ہیں جیسے جنّات اور دیو نے حملہ کر دیا ہے مگر جب وہ شخص فیصلہ کر لیتا ہے کہ مَیں اب واپس نہ ہوں گا اور اسی راہ میں جان دے دُونگا تو پھر وہ حملہ نہیں ہوتا اور آخر کار وہ بلا ایک باغ میں متبدل ہو جاتی ہے اور جو اس سے ڈرتا ہے اس کے لیے وہ دوزخ بن جاتی ہے۔ اس کا انتہائی مقام بالکل دوزخ کا تمثّل ہوتا ہے تاکہ خدا تعالےٰ اُسے آزماوے جس نے اس دوزخ کی پروانہ کی وہ کامیاب ہوا۔ یہ کام بہت نازک ہے۔ بجُز موت کے چارہ نہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۶۲ مورخہ ۱۳؍ مارچ ۱۹۰۳ء)

۹؍ مارچ ۱۹۰۳ء

دورانِ سیر

وبا زدہ علاقہ میں ماموریا نہی کے جانے کی تعبیر

ایک شخص کی خواب پر فرمایا کہ:- معبّرین نے لکھا ہے کہ اگر وبائی جگہ پر کوئی ماموریا نبی گیا ہوا دیکھا جاوے تو جاننا چاہیئے کہ وہاں آرام ہوگا کیونکہ وہ لوگ خدا کی رحمت ساتھ لاتے ہیں۔

ایک رؤیا

فرمایا کہ:۔

رات کو مَیں نے ایک خواب دیکھی کہ ایک شخص نے مجھے ایک پروانہ دیا ہے وہ لمبا سا کاغذ ہے۔ مَیں نے پڑھا تو لکھا ہوا تھا کہ عدالت سے چار جگہ کے لیے طاعون کا حکم جاری کیا گیا ہے۔ اس پروانہ سے پایا جاتا تھا کہ اس کا اجراء مَیں نے کیا ہے جیسے کاغذات محافظ دفتر کے پاس ہوتے ہیں ویسے ہی وہ میرے پاس ہے مَیں نے کہا کہ یہ حکم ایک عرصہ سے ہے اور اس کی تعمیل آج تک نہ ہوئی؟ اب مَیں اس کا کیا جواب دونگا۔ اس سے مجھے ایک خوف طاری ہوا اور تمام رات مَیں اسی خدشہ میں رہا اور اس پر روشن خط میں لفظ طاعون کا لکھا تھا گویا حکم میرے نام آتا ہے اور مَیں جاری کرتا ہوں۔ پھر مَیں نے دیکھا کہ اپنی جماعت کے چند آدمی کُشتی کر رہے ہیں مَیں نے کہا آؤ مَیں تم کو ایک خواب سناؤں مگر وہ نہ آئے۔ مَیں نے کہا کیوں نہیں سُنتے جو شخص خدا کی باتیں نہیں سُنتا وہ دوزخی ہوتا ہے۔

التحیات میں انگشت سبابہ اُٹھانے کی حکمت

ایک شخص نے سوال کیا کہ التحیات کے وقت نماز میں انگشت سبابہ کیوں اُٹھاتے ہیں؟ فرمایا کہ:۔

لوگ زمانہ جاہلیت میں گالیوں کے واسطے یہ اُنگلی اُٹھایا کرتے تھے اس لیے اس کو سبابہ کہتے ہیں یعنی گالی دینے والی۔ خدا تعالیٰ نے عرب کی اصلاح فرمائی اور وہ عادت ہٹا کر فرمایا کہ خدا کو واحد لاشریک کہتے وقت یہ اُنگلی اُٹھایا کرو تا اس سے وہ الزام اُٹھ جاوے۔ ایسے ہی عرب کے لوگ پانچ وقت شراب پیتے تھے۔ اس کے عوض میں پانچ وقت نماز رکھی۔

اس کے بعد اس امر پر ذکر رہا کہ

ہر ایک فرقہ میں نذیر آیا ہے جیسے قرآن سے ثابت ہے۔ اسی لیے رام چندر اور کرشن وغیرہ اپنے زمانہ کے نبی وغیرہ ہوں گے۔

تبلیغ کیلئے مفت اشاعت

عرب صاحب نے سوال کیا کہ لوگ آپ کو سادہ مزاج کہتے ہیں۔ اس لیے کہ کتب مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔

فرمایا کہ:۔

گفتہ اند کہ نکوئی کن و در آب انداز۔ کتابیں ہم مفت دیتے ہیں مگر اس میں ہماری سادگی نہیں ہے نہ ہم غلطی پر ہیں۔ ہمارا منشاء تبلیغ کا ہوتا ہے۔ اگر ہزار کتاب شائع ہو اور ایک شخص بھی راہ راست پر آجاوے تو ہمارا مطلب پورا ہو گیا۔[1]

ایک جامع درس

نو مارچ کے دربار شام میں حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جامع تقریر فرمائی۔ ہم کو افسوس ہے کہ اس روز ہم ایک معروفیت کی وجہ سے موجود نہ تھے اس لیے اس تقریر کو خود قلمبند نہیں کر سکے تاہم ہمارے ایک عزیز نے اس کے کچھ نوٹ لیے تھے جن کو مرتب کر کے ناظرین کے فائدے کے لیے مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ پر عمل کرنے کے لیے اُسے ہی پیش کر دیتے ہیں۔ (ایڈیٹر الحکم)

نومبائعین کو نصیحت

چند احباب بتقریب نماز عید الاضحیٰ دارالامان میں تشریف لائے اور انہوں نے بیعت کی۔ حضرت اقدس امام پاک علیہ السلام نے کھڑے ہو کر یہ تقریر فرمائی۔

فرمایا:۔

دیکھو جس قدر آپ لوگوں نے اس وقت بیعت کی ہے اور جو پہلے کر چکے ہیں اُن کو چند کلمات بطور نصیحت کے کہتا ہوں۔ چاہیئے کہ اُسے پوری توجہ سے سُنیں۔

آپ لوگوں کی یہ بیعت۔ بیعتِ توبہ[2] ہے۔ توبہ دو طرح ہوتی ہے ایک تو گذشتہ گناہوں سے یعنی انکی اصلاح کرنے کے واسطے جو کچھ پہلے غلطیاں کر چکا ہے ان کی تلافی کرے اور حتی الوسع ان بگاڑوں کی اصلاح کی کوشش کرنا اور آئندہ کے گناہوں سے باز رہنا اور اپنے آپ کو اس آگ سے بچائے رکھنا۔

توبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ توبہ سے تمام گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں معاف ہو جاتے ہیں بشرطیکہ وہ توبہ صدق دل اور خلوص نیت سے ہو اور کوئی پوشیدہ دغابازی دل کے کسی کونہ میں پوشیدہ نہ ہو۔

---

[1] البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۵-۶۶ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء

[2] البدر میں یُوں لکھا ہے:۔ "بیعت دراصل توبہ ہوتی ہے اور بیعت کے دو جزء ہیں۔

اوّل پچھلے گناہوں سے معافی مانگتے ہیں۔

دوم بیعت میں آئندہ گناہوں سے بچنے کے لیے وعدہ کیا جاتا ہے"

(البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۶ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

وہ دلوں کے پوشیدہ اور مخفی رازوں کو جانتا ہے۔ وہ کسی کے دھوکہ میں نہیں آتا پس چاہیئے کہ اس کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کی جاوے اور صدق سے نہ نفاق سے اس کے حضور توبہ کی جاوے۔

توبہ انسان کے واسطے کوئی زائد یا بے فائدہ چیز نہیں ہے اور اس کا اثر صرف قیامت پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس سے انسان کی دنیا اور دین دونو سنور جاتے ہیں۔ اور اُسے اِس جہان میں اور آنے والے جہان دونو میں آرام اور خوشحالی نصیب ہوتی ہے[1]۔

دیکھو قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرۃ: ۲۰۲) اے ہمارے رب ہمیں اس دُنیا میں بھی آرام اور آسائش کے سامان عطا فرما اور آنے والے جہان میں آرام اور راحت عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

دیکھو دراصل رَبَّنَا کے لفظ میں توبہ ہی کی طرف ایک باریک اشارہ ہے کیونکہ رَبَّنَا کا لفظ چاہتا ہے[2] کہ وہ بعض اور ربّوں کو جو اُس نے پہلے بنائے ہوئے تھے اُن سے بیزار ہو کر اس رب کی طرف آیا ہے اور یہ لفظ حقیقی درد اور گداز کے سوا انسان کے دل سے نکل ہی نہیں سکتا۔ رب کہتے ہیں بتدریج کمال کو پہنچانے والے اور پرورش کرنیوالے کو۔ اصل میں انسان نے بہت سے ارباب بنائے ہوئے ہوتے ہیں اپنے حیلوں اور دغابازیوں پر اُسے پُورا بھروسہ ہوتا ہے تو وہی اس کے رب ہوتے ہیں۔ اگر اُسے اپنے علم کا یا قوتِ بازو کا گھمنڈ ہے تو وہی اس کے رب ہیں۔ اگر اُسے اپنے حُسن یا مال و دولت پر فخر ہے تو وہی اس کا رب ہے۔ غرض اس طرح کے ہزاروں اسباب اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ جب تک ان سب کو ترک کر کے ان سے بیزار ہو کر اس واحد لاشریک سچے اور حقیقی رب کے آگے سرِ نیاز نہ جھکائے اور رَبَّنَا کی پُر درد اور دل کو پگھلانے والی آوازوں سے اس کے آستانہ پر نہ گرے۔ تب تک وہ حقیقی رب کو نہیں سمجھا۔ پس جب ایسی دلسوزی اور جانگدازی سے اُس کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کر کے توبہ کرتا اور اُسے مخاطب کرتا ہے کہ رَبَّنَا یعنی اصلی اور حقیقی رب تو تو ہی تھا مگر ہم اپنی غلطی سے دوسری جگہ بھٹکتے پھرتے رہے۔ اب میں نے ان جھُوٹے بُتوں اور باطل معبودوں کو ترک کر دیا ہے اور صدق دل سے تیری رُبوبیت کا اقرار کرتا ہوں۔ تیرے آستانہ پر آتا ہوں۔

غرض بجز اس کے خدا کو اپنا رب بنانا مشکل ہے جب تک انسان کے دل سے دوسرے رب اور ان کی قدر و منزلت وعظمت و وقار نکل نہ جاوے تب تک حقیقی رب اور اس کی رُبوبیّت کا ٹھیکہ نہیں اُٹھاتا۔

---

[1] البدر میں ہے۔ "توبہ ایک ایسی چیز ہے جو اس جہان میں بھی اپنا پھل لاتی ہے اور آخرت میں بھی۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۶ مورخہ ۲۰؍ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے۔ "قرآن میں جہاں لفظ رب آتا ہے اس کے معنے کا تعلق توبہ سے ہوتا ہے۔" (ایضاً)

بعض لوگوں نے جھوٹ ہی کو اپنا رب بنایا ہوا ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ ہمارا جھوٹ کے بدوں گذارہ مشکل ہے بعض چوری ورہزنی اور فریب دہی ہی کو اپنا رب بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس راہ کے سوا ان کے واسطے کوئی رزق کا راہ ہی نہیں سو اُن کے ارباب وہ چیزیں ہیں۔ دیکھو ایک چور جس کے پاس سارے نقب زنی کے ہتھیار موجود ہیں اور رات کا موقعہ بھی اس کے مفید مطلب ہے اور کوئی چوکیدار وغیرہ بھی نہیں جاگتا ہے تو ایسی حالت میں وہ چوری کے سوا کسی اور راہ کو بھی جانتا ہے جس سے اس کا رزق آسکتا ہے؟ وہ اپنے ہتھیاروں کو ہی اپنا معبود جانتا ہے۔ غرض ایسے لوگ جن کو اپنی ہی حیلہ بازیوں پر اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے ان کو خدا سے استعانت اور دُعا کرنے کی کیا حاجت؟ دُعا کی حاجت تو اسی کو ہوتی ہے جس کے سارے راہ بند ہوں اور کوئی راہ سوائے اس در کے نہ ہو۔ اُسی کے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ غرض رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً الخ ایسی دُعا کرنا صرف انہیں لوگوں کا کام ہے جو خدا ہی کو اپنا رب جان چکے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ اُن کے رب کے سامنے اور سارے ارباب باطلہ ہیچ ہیں۔

آگ سے مراد صرف وہی آگ نہیں جو قیامت کو ہوگی بلکہ دنیا میں بھی جو شخص ایک لمبی عمر پاتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے کہ دنیا میں بھی ہزاروں طرح کی آگ ہے۔ تجربہ کار جانتے ہیں کہ قسم قسم کی آگ دنیا میں موجود ہے۔ طرح طرح کے عذاب خوف، حزن، فقر و فاقے، امراض، ناکامیاں، ذلّت و ادبار کے اندیشے۔ ہزاروں قسم کے دُکھ، اولاد، بیوی وغیرہ کے متعلق تکالیف اور رشتہ داروں کے ساتھ معاملات میں اُلجھن۔ غرض یہ سب آگ ہیں۔ تو مومن دعا کرتا ہے کہ ساری قسم کی آگوں سے ہمیں بچا۔ جب ہم نے تیرا دامن پکڑا ہے تو ان سب عوارض سے جو انسانی زندگی کو تلخ کرنے والے ہیں اور انسان کے لیے بمنزلہ آگ ہیں بچائے رکھ۔

سچی توبہ ایک مشکل امر ہے۔ بجز خدا کی توفیق اور مدد کے توبہ کرنا اور اس پر قائم ہوجانا محال ہے توبہ صرف لفظوں اور باتوں کا نام نہیں۔ دیکھو خدا قلیل سی چیز سے خوش نہیں ہوجاتا۔ کوئی ذرا سا کام کر کے خیال کر لینا کہ بس اب ہم نے جو کرنا تھا کر لیا اور رضا کے مقام تک پہنچ گئے۔ یہ صرف ایک خیال اور وہم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک بادشاہ کو ایک دانہ دے کر یا مٹی کی مٹھی دے کر خوش نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کے غضب کے مورد بنتے ہیں تو کیا وہ احکم الحاکمین اور بادشاہوں کا بادشاہ ہماری ذرا سی ناکارہ حرکت سے یا دو لفظوں سے خوش ہو سکتا ہے۔[1] خدا تعالیٰ پوست کو پسند نہیں کرتا وہ مغز چاہتا ہے۔

---

[1] البدر میں ہے :۔ "میری جماعت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے نفس کو دھوکا نہ دے۔ خدا تعالیٰ ایک ناکارہ چیز کو پسند نہیں کرتا۔ دیکھو اگر ایک شخص دُنیوی بادشاہ کے پاس نکمّی سی چیز ہدیہ کے طور پر لے جاتا ہے تو اگرچہ وہ اس کو لے جا سکتا ہے مگر وہ ایسے فعل سے بادشاہ کی ہتک کرتا ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۶ مورخہ ۲۰ ؍مارچ ۱۹۰۳ء)

شرک کی حقیقت

دیکھو خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاوے۔ بعض لوگ اپنے شرکاء نفسانی کے واسطے بہت حصہ رکھ لیتے ہیں اور پھر خدا کا بھی حصّہ مقرر کرتے ہیں۔ سو ایسے حصّہ کو خدا قبول نہیں کرتا۔ وہ خالص حصّہ چاہتا ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک بنانے سے زیادہ اس کو غضبناک کرنے کا اَور کوئی آلہ نہیں ہے۔ ایسا نہ کرو کہ کچھ تو تم میں تمہارے نفسانی شرکاء کا حصّہ ہو اور کچھ خدا کے واسطے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں سب گناہ معاف کروں گا مگر شرک نہیں معاف کیا جاوے گا۔

یاد رکھو شرک یہی نہیں کہ بُتوں اور پتھروں کی تراشی ہوئی مورتوں کی پُوجا کی جاوے۔ یہ تو ایک موٹی بات ہے۔ یہ بڑے بیوقوفوں کا کام ہے۔ دانا آدمی کو تو اس سے شرم آتی ہے۔ شرک بڑا باریک ہے وہ شرک جو اکثر ہلاک کرتا ہے وہ شرک فی الاسباب ہے یعنی اسباب پر اتنا بھروسہ کرنا کہ گویا وہی اس کے مطلوب و مقصود ہیں۔ جو شخص دنیا کو دین پر مقدم رکھتا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس کو دنیا کی چیزوں پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ امید ہوتی ہے جو دین و ایمان سے نہیں۔ نقد فائدہ کو پسند کرتے ہیں اور آخرت سے محروم۔ جب وہ اسباب پر ہی اپنی ساری کامیابیوں کا مدار خیال کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے وجود کو تو اس وقت وہ لغو محض اور بے فائدہ جانتا ہے اور تم ایسا نہ کرو۔ تم توکّل اختیار کرو۔

توکّل

توکّل یہی ہے[1] کہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے کسی امر کے حاصل کرنے کے واسطے مقرر کئے ہوئے ہیں ان کو حتی المقدور جمع کرو اور پھر خود دعاؤں میں لگ جاؤ کہ اے خدا تو ہی اس کا انجام بخیر کر۔ صدہا آفات ہیں اور ہزاروں مصائب ہیں جو ان اسباب کو بھی برباد اور تہ و بالا کر سکتے ہیں۔ ان کی دست بُرد سے بچا کر ہمیں سچی کامیابی اور منزلِ مقصود پر پہنچا۔

حقیقتِ توبہ

توبہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ گناہ کو ترک کرنا اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔ بدی چھوڑ کر نیکی کی طرف آگے قدم بڑھانا۔ توبہ ایک موت کو چاہتی ہے جس کے بعد انسان زندہ کیا جاتا ہے اور پھر نہیں مرتا۔ توبہ کے بعد انسان ایسا بن جاوے کہ گویا نئی زندگی پا کر دُنیا میں آیا ہے نہ اس کی وہ چال ہو نہ اس کی وہ زبان نہ ہاتھ نہ پاؤں۔ سارے کا سارا نیا وجود ہو جو کسی دوسرے کے ماتحت کام کرتا ہوا نظر آجاوے۔ دیکھنے والے جان لیں کہ یہ وہ نہیں یہ تو کوئی اَور ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یقین جانو کہ توبہ میں بڑے بڑے ثمرات ہیں۔ یہ برکات کا سرچشمہ ہے۔ درحقیقت اولیاء اور صلحاء یہی لوگ ہوتے ہیں جو توبہ کرتے اور پھر اس پر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ وہ گناہ سے دُور اور خدا کے قریب ہوتے

[1] البدر میں ہے:۔ "توکّل ایک طرف سے توڑ اور ایک طرف جوڑ کا نام ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۶ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

جاتے ہیں۔ کامل توبہ کرنے والا شخص ہی ولی، قطب اور غوث کہلا سکتا ہے۔ اسی حالت میں وہ خدا کا محبوب بنتا ہے۔ اس کے بعد بلائیں جو انسان کے واسطے مقدر ہوتی ہیں ٹل جاتی ہیں۔

انبیاء اور مومنوں پر مصائب آنے کی حکمت

اس سے یہ خیال نہ آوے کہ پھر انبیاء اور نیک مومنوں کو کیوں تکلیفیں آتی ہیں؟ ان لوگوں پر بھی بعض بلائیں آتی ہیں اور ان کے واسطے آثارِ رحمت ہوتی ہیں[1]۔ دیکھو ہمارے نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسی کیسی مصائب آتی تھیں۔ اُن کو گِننا بھی کسی بڑے دِل کا کام ہے۔ اُن کے نام سے ہی انسان کے بدن پر لرزہ آتا ہے۔ پھر جو کچھ سلوک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہیوں سے ہوئے۔ ان کی بھی تاریخ گواہ ہے کیا کوئی ایسی بھی تکلیف تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو پہنچائی نہ گئی ہو؟ جس طرح ان کی ایذاء دہی میں کفار نے کوئی دقیقہ باقی نہ اُٹھا رکھا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے کمالات میں کوئی کمی باقی نہ رکھی۔ اصل میں ان لوگوں کے واسطے یہ مصائب اور سختیاں تریاق ہو جایا کرتی ہیں۔ ان لوگوں کے واسطے خدا کی رحمت کے خزانے انہیں سختیوں ہی کی وجہ سے کھولے جاتے ہیں ؎

ہر بَلا کیں قوم را حق دادہ است ☆ زیر آں گنج کرم بنہادہ است

مگر ایسے وقت میں انسان کو چاہیئے کہ صبرِ جمیل کرے اور خدا تعالیٰ سے بدظن نہ ہو۔ وہ لوگ تو خدا کے اسلام کو انعام کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور ابتلاء میں لذت پاتے ہیں۔ قرب کے مراتب جس طرح جلد ابتلاء کے وقت میں طے ہوتے ہیں وہ یوں زہد و تعبد یا ریاضت سے تو سالہا سال میں بھی تمام نہیں کئے جاتے۔ ان لوگوں میں سے جو خدا کے قرب کا نمونہ بنے اور خلق کی ہدایت کا تمغہ ان کو دیا گیا یا وہ خدا تعالیٰ کے محبوب ہوئے۔ ایک بھی نہیں جس پر کبھی نہ کبھی مصائب اور شدائد کے پہاڑ نہ گرے ہوں۔ ان لوگوں کی مثال مشک کے نافہ کی سی ہوتی ہے۔ وہ جب تک بند ہے اس میں اور ایک پتھر یا مٹی کے ڈھیلے میں کچھ تفاوت نہیں پایا جاتا مگر جب اس پر سختی سے جراحی کا عمل کیا جاوے اور اس کو چھُری یا چاقو سے چیرا جاوے تو معاً اُس میں سے ایک خوشکن خوشبو نکلتی ہے جس سے مکان کا مکان معطر ہو جاتا ہے اور قریب آنے والا بھی معطر کیا جاتا ہے۔ سو یہی حال انبیاء اور صادق مومنوں کا ہے کہ جب تک ان کو مصائب نہ پہنچیں تب تک اُن کے اندرونی قویٰ چھپے رہتے ہیں اور اُن کی ترقیات کا

---

[1] البدر میں یوں ہے:- "تکالیف مومنوں پر بھی آتی ہیں بلکہ سب سے زیادہ تو نبیوں پر آتی ہیں۔ اس جگہ بعض جلد باز یہ اعتراض کر دیں گے کہ اگر نبیوں ولیوں کو بھی تکالیف پہنچتی ہیں تو پھر توبہ کا کیا فائدہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب نیک لوگوں کو تکالیف پہنچتی ہیں تو وہ ان کو اس انعام کی خوشخبری دیتی ہیں جو کہ ان تکالیف کے بعد خدا تعالیٰ نے اُن کو دینا ہوتا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۶ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

دروازہ بند ہوتا ہے ان لوگوں کے قویٰ دو قسم کے موقعوں پر اظہار پذیر ہوتے ہیں۔ بعض تو مصائب و شدائد اور دکھوں کے زمانہ میں۔ کیونکہ یکطرفہ کارروائی قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ ایک شخص جس نے بچپن سے خوشحالی اور آرام اور آسائش کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اُس کے قویٰ کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے اور دوسرا جو بچپن سے غربت کی مار اور بدحالی میں مبتلا رہا ہے اس کے قویٰ کا بھی پورا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کسی شخص کے اخلاق فاضلہ اور اس کے خُلق کے متعلق اس کے حالات کا اندازہ تب ہی ہو سکتا ہے جب اس پر انعام و ابتلاء ہر دو طرح کے زمانے آچکے ہوں۔ سو اس امر کے دیکھنے کے لیے بھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سی اَور کوئی مثال نہیں کیونکہ باقی انبیاء میں سے اکثر ایسے تھے کہ انہوں نے نہایت کار ایک زمانہ دیکھا دوسرے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور پاک نبی تھے۔ خدا کے نزدیک ان کے بڑے مدارج ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل میں رکھ کر اگر اُن کو کسی کسوٹی پر پرکھا جاوے تو اُن کے اخلاق بہت گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اقتدار اور ثروت کا زمانہ نہ پایا اور نہ اُس کے متعلق اُن کے اخلاق کا اظہار ہوا۔ ہمیں تو قرآن شریف مجبور کرتا ہے ورنہ ہم اگر اُن کے حالات کے لحاظ سے اور اُن کی عام سوانح کی وجہ سے دیکھیں تو وہ تو ایک کامل انسان کے مرتبہ سے بھی گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کجا یہ کہ عیسائی ان کو خدائے قدوس کا مرتبہ دے بیٹھے ہیں۔ بھلا اُن کا صبر، اُن کی داد و دہش، ان کی جود و سخا کا کونسا نمونہ دنیا میں باقی رہا ہے۔ اُن کی شجاعت کے اظہار کا کونسا موقعہ تھا۔ کس جنگ میں انہوں نے اس امر کا ثبوت دیا۔[1] ان کی بعثت کا زمانہ صرف تین سال تھا اور وہ بھی مصائب کا زمانہ۔ مقابلہ پر صرف ایک ہی قوم تھی جو معدودے چند سے زیادہ ہرگز نہ تھی۔ ان کا پیش کردہ امر بھی ان کے لیے کوئی نرالا نہ تھا جس کی مثال پہلے نہ پائی جاتی ہو۔ قوم پہلے ہی توحید پسند تھی ان کے اخلاق اور ان کے عقائد کا بہت سا حصہ نسبتاً اچھا تھا۔ ان میں خدا ترس اور گوشہ نشین وغیرہ بھی تھے۔ غرض ان کا کام نہایت سہل اور آسان تھا۔ ادھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھو کہ آپ کی نبوت کے زمانہ میں سے ۱۳ سال مصائب اور شدائد کے تھے اور دس سال قوت و ثروت اور حکومت کے۔ مقابل میں کئی قومیں۔ اوّل تو اپنی ہی قوم تھی۔ یہودی تھے عیسائی تھے۔ بُت پرست قوموں کا گروہ تھا۔ مجوس تھے وغیرہ۔ جن کا کام کیا ہے؟ بُت پرستی۔ جو ان کا حقیقی خدا کے اعتقاد سے پختہ اعتقاد اور مسلک تھا۔ وہ کوئی کام کرتے ہی نہ تھے جو ان بتوں کی عظمت کے خلاف ہو۔ شراب خوری

---

[1] البدر میں لکھا ہے: "مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھ لو۔ نصرت کا زمانہ نہیں دیکھا کوئی لڑائی نہیں ہوئی تاکہ ہم اُن کی شجاعت کا اندازہ لگائیں۔ کسی فتح کا وقت نہیں آیا جس سے ہم دیکھ سکتے کہ وہ کس طرح اپنے دشمنوں کو معاف کر سکتے تھے اور اُن میں عفو کی قوت کس قدر تھی۔ اُن کو غنیمتیں نہیں ملیں جس سے ہم دیکھ سکتے کہ ان میں قوت سخاوت کس قدر تھی۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

کی یہ نوبت کہ دن میں پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ شراب۔ بلکہ پانی کی بجائے شراب ہی سے کام لیا جاتا تھا حرام کو تو شیرِ مادر جانتے تھے اور قتل وغیرہ تو اُن کے نزدیک ایک گاجر مولی کی طرح تھا غرض کُل دنیا کی اقوام کا نچوڑ اور گندے عقائد کا عطر اُن کے حصّہ میں آیا ہوا تھا۔ اس قوم کی اصلاح کرنی اور پھر اُن کو درست کرنا اور پھر اس پر زمانہ وہ کہ یکہ تنہا بے یار و مددگار پھرتے ہیں۔ کبھی کھانے کو ملا اور کبھی بھوکے ہی سو رہے جو چند ایک ہمراہی ہیں اُن کی بھی ہر روز بُری گت بنتی ہے۔ بے کس اور بے بس۔ اِدھر کے اُدھر اور اُدھر کے اِدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ وطن سے بے وطن کر دیئے گئے ہیں۔

پھر دوسرا زمانہ تھا کہ تمام جزیرہ عرب ایک سرے سے دوسرے سرے تک غلام بنا ہوا ہے۔ کوئی مخالفت کے رنگ میں چوں بھی نہیں کر سکتا اور ایسا اقتدار اور رُعب خدا نے دیا ہوا ہے کہ اگر چاہتے تو کل عرب کو قتل کر ڈالتے اگر ایک نفسانی انسان ہوتے تو اُن سے اُن کی کرتوتوں کا بدلہ لینے کا عمدہ موقع تھا جب اُلٹ کر مکہ فتح کیا تو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ فرمایا۔

غرض اس طرح سے جو دونو زمانے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آئے اور دونو کے واسطے ایک کافی موقعہ تھا کہ اچھی طرح سے جانچے پرکھے جاتے اور ایک جوش یا فوری ولولہ کی حالت نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر طرح کے اخلاق فاضلہ کا پورا پورا امتحان ہو چکا تھا اور آپ کے صبر۔ استقلال۔ عفت۔ حلم۔ بردباری۔ شجاعت۔ سخاوت۔ جُود وغیرہ وغیرہ کل اخلاق کا اظہار ہو چکا تھا اور کوئی ایسا حصّہ نہ تھا کہ باقی رہ گیا ہو۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت

غرض ایسے ایسے مصائب ہیں جو ان کیلئے رحمت ہیں اور ان سے ان لوگوں کے اندرونی گُن ظاہر ہوتے ہیں۔ دیکھو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جنہوں نے ہمیشہ ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی اور سیّد سیّد کر کے پکارے جاتے تھے۔ انہوں نے بھی تو سختی کا زمانہ نہ دیکھا۔ ان کو ایسے ایسے زمانے دیکھنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا کہ وہ اُن صحابہؓ کے مراتب کو پہنچ سکتے۔ ان کی ساری زندگی ناز و نعمت میں گذری تھی نہ انہوں نے کسی جہاد میں حصّہ لیا تھا نہ کسی کُفر ہی کو توڑا تھا تو خدا نے جو اُن کو شہید کیا۔ کیا اُن پر ظلم کیا؟ ہرگز نہیں۔ انہوں نے پچاس پچپن برس کی عمر تک وہ زمانہ نہ دیکھا تھا کہ شدائد کیا ہوا کرتے ہیں اور انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ جب صحابہؓ بکریوں کی طرح ذبح ہوتے تھے تو پھر اُن کا کیا حق تھا کہ وہ شہداء میں درجہ پاتے یا کسی طرح آخرت میں خدا کے قرب میں عزت پاتے۔ کیا اُن کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بیٹا کہلانے کا فخر بس تھا؟ اور اُن کے واسطے یہی کافی تھا؟ نہیں اس سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی منع فرمایا تھا۔ اس سے کوئی حق قربِ الٰہی نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض انکی اپنی تو ایسی بظاہر کارنمائی نہ تھی جس سے وہ ان درجات اعلیٰ کے وارث یا حقدار ہوتے۔ مگر چونکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم سے ایک قسم کا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نہ چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا تعلق رکھنے والے کو ضائع کرتے۔ سو اُن کے واسطے ایسے ایسے سامان میسر کر دیئے کہ وہ خدا کی راہ میں شہادت پانے کے قابل ہو گئے اور اس طرح وہ سابقین کے ساتھ مل گئے جن کے حالات سے وہ محض ناواقف تھے۔ ایک ذرا سی تکلیف اور اجرِ عظیم مل گیا [1] — شیعہ ہیں کہ اس حکمتِ الٰہی کی طرف تو غور نہیں کرتے اور اُلٹا روتے ہیں کہ ان کو شہید کر دیا۔

ابتلاء پر صبر کا اجر

پس تم مومن ہونے کی حالت میں ابتلاء کو بُرا نہ جانو اور بُرا وہی جانے گا جو مومن کامل نہیں ہے۔ قرآن شریف فرماتا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۵۷)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کبھی تم کو مال سے یا جان سے یا اولاد یا کھیتوں وغیرہ کے نقصان سے آزمایا کریں گے مگر جو ایسے وقتوں میں صبر کرتے اور شاکر رہتے ہیں تو ان لوگوں کو بشارت دو کہ ان کے واسطے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کشادہ اور اُن پر خدا کی برکتیں ہوں گی جو ایسے وقتوں میں کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ یعنی ہم اور ہمارے متعلق کل اشیاء یہ سب خدا ہی کی طرف سے ہیں اور پھر آخر کار ان کا لوٹنا خدا ہی کی طرف ہے کسی قسم کے نقصان کا غم اُن کے دل کو نہیں کھاتا۔ اور وہ لوگ مقامِ رضا میں بود و باش رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ صابر ہوتے ہیں اور صابروں کے واسطے خدا تعالیٰ نے بے حساب اجر رکھے ہوئے ہیں۔[2]

مُہتدی سے مراد

مُہْتَدُوْن سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کے منشاء کو پالیا اور اس کے مطابق عملدرآمد کرنے لگ گئے۔ ایسے ہی لوگ تو ولی ہوتے ہیں۔ انہیں کو تو لوگ قطب کہتے ہیں یہی تو غوث کہلاتے ہیں۔ پس تم کوشش کرو کہ تم بھی ان

---

[1] البدر میں مزید یوں لکھا ہے:۔
"اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اس طرح گمنام فوت نہ ہوں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اُن کو شہادت کی موت سے وفات دی تاکہ وہ دُنیا میں قیامت تک نیک نام مشہور ہو جاویں۔ اگر ان پر یہ مصائب نہ آتے تو وہ کس طرح مشہور ہوتے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں مزید لکھا ہے:۔
"یہی تکالیف جب رسولوں پر آتی ہیں تو ان کو انعام کی خوشخبری دیتی ہیں اور جب یہی تکالیف بدوں پڑتی ہیں تو اُن کو تباہ کر دیتی ہیں۔ غرض مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (البقرۃ: ۱۵۷) پڑھنا چاہیئے کہ تکالیف کے وقت خدا تعالیٰ کی رضا طلب کرے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

مدارجِ عالیہ کو حاصل کرنے کے قابل ہوسکو۔

خدا تعالیٰ نے تو انسان سے نہایت تنزل کے رنگ میں دوستانہ برتاؤ کیا ہے۔ دوستانہ تعلق کیا ہوتا ہے یہی کہ کبھی ایک دوست دوسرے دوست کی بات مان لیتا ہے اور کبھی دوسرے سے اپنی بات منوانا چاہتا ہے چنانچہ خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرتا ہے چنانچہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) اور اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ الآیۃ (البقرۃ: ۱۸۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کی بات مان لیتا ہے اور اس کی دُعا کو قبول فرماتا ہے اور دوسری فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ۔ الآیۃ اور وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔

بعض لوگ اللہ تعالیٰ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہماری دُعا کو قبول نہیں کرتا۔ یا اولیاء لوگوں پر طعن کرتے ہیں کہ اُن کی فلاں دُعا قبول نہیں ہوئی۔ اصل میں وہ نادان اس قانون الٰہی سے ناآشنا محض ہوتے ہیں۔ جس انسان کو خدا سے ایسا معاملہ پڑا ہو گا وہ خوب اس قاعدہ سے آگاہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے مان لینے کے اور منوانے کے دونمونے پیش کئے ہیں۔ انہی کو ماننا ایمان ہے۔ تم ایسے نہ بنو کہ ایک ہی پہلو پر زور دو۔ ایسا نہ ہو کہ تم خُدا کی مخالفت کر کے اس کے مقررہ قانون کو توڑنے کی کوشش کرنیوالے بنو۔[1]

مصائب کی لذّت

مومن کے لیے مصائب ہمیشہ نہیں رہتے اور نہ لمبے ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے واسطے رحمت، محبت اور لذّت کا چشمہ جاری کیا جاتا ہے۔ عاشق لوگ عشق کے غلبہ کے وقتوں اور اس کے دردوں میں ہی لذّت پاتے ہیں۔ یہ باتیں گو ایک خشکِ محض انسان کے لیے سمجھانی مشکل ہیں مگر جنہوں نے اس راہ میں قدم مارا ہے وہ ان کو خوب جانتے ہیں بلکہ ان کو تو معمولی آرام اور آسائش میں وہ چین اور لذّت نہیں ہوتی جو دکھ کے اوقات میں ہوتی ہے۔

مثنوی رومی میں ایک حکایت ہے کہ ایک مرض ایسا ہے کہ اس میں جب تک اُس کو مُکے مارتے کوٹتے اور لتاڑتے رہتے ہیں تب تک وہ آرام میں رہتا ہے ورنہ تکلیف میں رہتا ہے سو یہی حال اہلِ اللہ کا ہے کہ جب تک ان کو مصائب و شدائد کے مشکلات آتے ہیں اور اُن کو مار پڑتی رہے تب تک وہ خوش ہوتے ہیں اور لذّت اُٹھاتے ہیں ورنہ بے چین اور بے آرام رہتے ہیں۔

مومن کے جوہر مصائب سے کُھلتے ہیں

اللہ تعالیٰ قادر تھا کہ اپنے بندوں کو کسی قسم کی ایذاء نہ پہنچنے دیتا اور ہر طرح سے عیش و آرام میں اُنکی زندگی

---

[1] البدر میں لکھا ہے:۔ "مومن کو مصیبت کے وقت میں غمگین نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ نبی سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰۔ مارچ ۱۹۰۳ء)

بسر کرواتا۔ اُن کی زندگی شاہانہ زندگی ہوتی۔ ہر وقت اُن کے لیے عیش و طرب کے سامان مہیا کئے جاتے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس میں بڑے اسرار اور راز نہاں ہوتے ہیں۔ دیکھو والدین کو اپنی لڑکی کیسی پیاری ہوتی ہے بلکہ اکثر لڑکوں کی نسبت زیادہ پیاری ہوتی ہے مگر ایک وقت آتا ہے کہ والدین اس کو اپنے سے الگ کر دیتے ہیں وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت کو دیکھنا بڑے جگر والوں کا کام ہوتا ہے[1]۔ دونو طرف کی حالت ہی بڑی قابل رحم ہوتی ہے قریباً چودہ پندرہ سال ایک جگہ رہے ہوئے ہوتے ہیں۔ آخر ان کی جدائی کا وقت نہایت ہی رقت کا وقت ہوتا ہے۔ اس جدائی کو بھی نادان بے رحمی کہہ دے تو بجا ہے مگر اس کی لڑکی میں بعض ایسے قویٰ ہوتے ہیں جس کا اظہار اس علیحدگی اور سسرال میں جا کر شوہر سے معاشرت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے جو طرفین کے لیے موجبِ برکت اور رحمت ہوتا ہے۔

یہی حال اہل اللہ کا ہے۔ ان لوگوں میں بعض خلق ایسے پوشیدہ ہوتے ہیں کہ جب تک ان پر تکالیف اور شدائد نہ آویں ان کا اظہار ناممکن ہوتا ہے۔

دیکھو اب ہم لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیان کرتے ہیں بڑے فخر اور جرأت سے کام لیتے ہیں یہ بھی تو صرف اسی وجہ سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ دونو زمانے آچکے ہوئے ہیں ورنہ ہم یہ فضیلت کس طرح بیان کرتے۔ دُکھ کے زمانہ کو بُری نظر سے نہ دیکھو یہ خدا سے لذت کو اور اُس کے قرب کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی لذت کو حاصل کرنے کے واسطے جو خدا کے مقبولوں کو ملا کرتی ہے دنیوی اور سفلی کل لذات کو طلاق دینی پڑا کرتی ہے۔ خدا کا مقرب بننے کے واسطے ضروری ہے کہ دُکھ سہے جاویں اور شکر کیا جاوے اور نئے دن ایک نئی موت اپنے اوپر لینی پڑتی ہے جب انسان دنیوی ہوا و ہوس اور نفس کی طرف سے بکلّی موت اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے تب اسے وہ حیات ملتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد مرنا کبھی نہیں ہوتا۔

قرآن کا نزول بحالتِ غم ہوا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف غم کی حالت میں نازل ہوا ہے۔ تم بھی اُسے غم ہی کی حالت میں پڑھا کرو۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ غم و الم میں گذرا ہے۔

توبہ کا درخت اور اُس کا پھل

توبہ کے درخت تو لو تا تم اس کے پھل کھاؤ۔ توبہ کا درخت بھی بالکل ایک باغ کے درخت کی مانند ہے جو جو حفاظتیں

---

[1] البدر میں ہے:۔ والدہ ایک طرف روتی ہے اور والد ایک طرف روتا ہے تاہم وہ سب تکالیف برداشت کرکے اس کو ہمیشہ کیلئے الگ کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ جانتے ہیں کہ اس لڑکی میں ایک جوہر ہے جو کہ سسرال میں جا کر ظاہر ہوگا اس لیے مومن کے جوہر بھی مصائب سے کھلتے ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

(حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر)

اور خدمات اُس باغ کے لیے جسمانی طور سے ہیں وہی اس توبہ کے درخت کے واسطے رُوحانی طور پر ہیں پس اگر توبہ کے درخت کا پھل کھانا چاہو تو اس کے متعلق قوانین اور شرائط کو پورا کرو ورنہ بے فائدہ ہوگا۔

یہ خیال نہ کرو کہ توبہ کرنا مرنا ہوتا ہے۔ خدا قلیل شئے سے خوش نہیں ہوتا اور نہ وہ دھوکہ کھاتا ہے۔ دیکھو اگر تم بھوک کو دُور کرنے کے لیے ایک لقمہ کھانے کا کھاؤ یا پیاس کے دُور کرنے کے لیے ایک قطرہ پانی کا پیو تو ہرگز تمہاری مقصد براری نہ ہوگی۔ ایک مرض کے دفع کرنے کے واسطے ایک طبیب جو نسخہ تجویز کرتا ہے جب تک اس کے مطابق پُورا پُورا عمل نہ کیا جاوے تب تک اس کے فائدہ کی امید امرِ موہوم ہے[1] اور پھر طبیب پر الزام۔ غلطی اپنی ہی ہے اسی طرح توبہ کے واسطے مقدار ہے اور اس کے بھی پرہیز ہیں۔ بد پرہیز بیمار تندرست نہیں ہوسکتا۔

خدا سے صُلح پیدا کرو

اب طاعون کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ اِلَّا الَّذِیْنَ عَلَوْا بِاسْتِکْبَارٍ۔

دیکھو خدا تو سب کا خدا ہے مگر اس کے تعلقات خاص خاص کے ساتھ خاص خاص ہیں۔ جتنی[2] جتنی کوئی اس سے صلح کرتا ہے اتنا ہی وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ تم میں سے ہر ایک کو بھی وہ آواز آسکتی ہے۔ جو مجھے آئی۔ اگر تم سچی تبدیلی اور اس سے صلح پیدا کرو۔ خدا بخیل نہیں مگر ہاں اس نے ایک اندازہ رکھا ہوا ہے جب تک اس تک انسان نہ پہنچے تو وہ کامل نہیں ہوتا اور نہ اس پر وہ فیض جاری کیا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شرابی کو اگر پوری مقدار شراب کی نہ دی جاوے تب تک وہ بیہوش نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جب اس انتہائی درجہ محبت تک ترقی نہ کی جاوے تب تک لاحاصل ہوتا ہے۔ قانونِ قدرت جس طرح جسمانی چیزوں کے واسطے ہے۔ ایسے ہی رُوحانی امور کے واسطے بھی ہے۔

(حاشیہ ع۲ صفحہ سابقہ)

ع۲ البدر میں ہے:۔ اگر توبہ کے ثمرات چاہتے ہو تو عمل کے ساتھ توبہ کی تکمیل کرو۔ دیکھو جب مالی بوٹا لگاتا ہے پھر اس کو پانی دیتا ہے اور اس سے اس کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی طرح ایمان ایک بوٹا ہے اور اس کی آب پاشی عمل سے ہوتی ہے اس لیے ایمان کی تکمیل کے لیے عمل کی ازحد ضرورت ہے۔ اگر ایمان کیساتھ عمل نہیں ہونگے تو بوٹے خشک ہوجائینگے۔ اور وہ خائب وخاسر رہ جائیں گے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

[1] البدر میں ہے:۔ "یہی سنت اللہ ہے کہ جب تک کوئی چیز اپنے مقررہ وزن تک استعمال نہ کی جاوے تب تک بے فائدہ ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "اگر انسان خدا کی طرف آہستہ قدم چلتا ہے تو وہ تیز چل کر آتا ہے اور اگر انسان اس کی طرف تیز چلتا ہے تو وہ دوڑ کر آتا ہے۔" (ایضاً)

دیکھو ابوالحسن خرقانی ۔ بایزید بسطامی یا شیخ عبدالقادر جیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ یہ سب خدا تعالیٰ کے مقرب تھے اور انہوں نے بھی شریعت ہی کی پابندی سے یہ درجہ پایا تھا نہ کہ کوئی نئی شریعت بنا کر۔ جیسا کہ آج کل کے گدی نشین کرتے ہیں۔ یہی نماز تھی اور یہی روزے تھے مگر انہوں نے اس کی حقیقت اور اصل غرض کو سمجھا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ انہوں نے نیکی کی گرسنوار کر۔ انہوں نے اعمال کو بیگار کے طور پر پورا نہ کیا تھا بلکہ صدق اور وفا کے رنگ میں ادا کرتے تھے سو خدا نے ان کے صدق وسداد کو ضائع نہ کیا۔ خدا کسی کا احسان اپنے اوپر نہیں رکھتا وہ ایک پیسہ کے بدلے میں جب تک ہزار نہ دے تب تک نہیں چھوڑتا۔ پس جب کسی انسان میں وہ برکات اور نشانات نہیں ہیں[1] اور وہ خدا کی محبت اور تقویٰ کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ خدا پر الزام نہیں لگاتا بلکہ اپنا گند ظاہر کرتا ہے۔ خدا کی جناب میں بخل ہرگز نہیں۔ پس کوشش کرو کہ اس کی رضا کے موافق عمل درآمد کر سکو۔ اگر مصائب کے وقت میں تم مومن ہو اور خدا تعالیٰ سے صلح کرنے والے اور اس کی محبت میں آگے قدم بڑھانے والے ہو تو وہ رحمت ہے تمہارے واسطے۔ کیونکہ خدا قادر ہے کہ آگ کو گلزار کر دے اور اگر تم فاسق ہو تو ڈرو کہ وہ آگ ہے جو بھسم کرنے والی ہے اور قہر اور غضب ہے جو نیست و نابود کرنے والا ہے۔ فقط

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۹ - ۱۳ مورخہ ۲۴ / مارچ ۱۹۰۳ء)

۱۱/ مارچ ۱۹۰۳ء

(قبل از عشاء)

عشاء سے قبل ایک شخص نے خواب بیان کی کہ کان میں اس نے کچھ بات سُنی ہے۔ اس کی تعبیر میں فرمایا کہ :۔

داہنا کان دین ہوتا ہے اور بایاں دنیا۔ کان میں بات کا ہونا بشارت پر محمول کیا جاتا ہے۔

پھر ایک ذکر پر فرمایا کہ :۔

جو خدا کی طرف رجوع کرتا ہے ایک دن کامیاب ہو ہی جاتا ہے ہاں تھکے نہ۔ کیونکہ خدا کے واسطے لہریں ہوتی ہیں جیسے باد نسیم چلتی ہے ویسے رحمت کی نسیم بھی اپنے وقت پر چلا کرتی ہے۔ انسان کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۸ مورخہ ۲۰ / مارچ ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں ہے :۔ "جب انسان نیکی کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور اس کو اس کے پھل عطا نہیں ہوتے تو وہ جھوٹا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۷ ، ۲۰/ مارچ ۱۹۰۳ء)

۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء

نظر آئے گی دُنیا کو تیرے اسلام کی رفعت
مسیحا کا بنے گا جب یہاں منار۔ یا اللہ!

منارۃ المسیح کی بنیادی اینٹ

بعد نماز جمعہ حضرت حجۃ اللہ المسیح الموعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور ہمارے مکرم دوست حکیم فضل الٰہی صاحب لاہوری۔ مرزا خدا بخش صاحب۔ شیخ مولا بخش صاحب۔ قاضی ضیاء الدین صاحب وغیرہ احباب نے عرض کی کہ حضور منارۃ المسیح کی بنیادی اینٹ حضور کے دستِ مبارک سے رکھی جاوے تو بہت ہی مناسب ہے۔ فرمایا کہ:۔

ہمیں تو ابھی تک معلوم بھی نہیں کہ آج اس کی بنیاد رکھی جاوے گی۔ اب آپ اینٹ لے آئیں میں اس پر دُعا کروں گا اور پھر جہاں میں کہوں وہاں آپ جا کر رکھ دیں۔ چنانچہ حکیم فضل الٰہی صاحب اینٹ لے آئے۔ اعلیٰحضرت نے اس کو ران مبارک پر رکھ لیا۔ اور بڑی دیر تک آپ نے لمبی دعا کی معلوم نہیں کہ آپ نے کیسی کیسی اور کس کس جوش سے دُعائیں اسلام کی عظمت و جلال کے اظہار اور اس کی روشنی کے کل اقطاع و اقطار عالم میں پھیل جانے کی کی ہوں گی۔ وہ وقت قبولیتِ دُعا کا معلوم ہوتا تھا۔ جمعہ کا مبارک دن اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام منارۃ المسیح کی بنیادی اینٹ رکھنے سے پہلے اس کے لیے دل جوش کے ساتھ دُعائیں مانگ رہے ہیں۔ دعا کے بعد آپ نے اس اینٹ پر دَم کیا اور حکیم فضل الٰہی صاحب کو دی کہ آپ اس کو منارۃ المسیح کے مغربی حصہ میں رکھ دیں ــــــ غرض اس عظیم الشان مینار کی بنیاد خدا کے برگزیدہ مامور اور مسیح و مہدی علیہ السلام کے ہاتھ سے ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء کو رکھی گئی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ صفحہ ۴ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء)

حُجرۂ دُعا

بعد نماز جمعہ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء کو حضرت اقدس نے تجویز فرمایا کہ:۔

چونکہ بیت الفکر میں اکثر مستورات وغیرہ اور بچے بھی آجاتے ہیں اور دُعا کا موقعہ کم ملتا ہے اس لیے ایک ایسا حجرہ اس کے ساتھ تعمیر کیا جاوے جس میں صرف ایک آدمی کے نشست کی گنجائش ہو اور چارپائی بھی نہ بچھ سکے تاکہ اس میں کوئی اَور نہ آسکے۔ اس طرح سے مجھے دعا کے لیے عمدہ وقت اور موقعہ مل سکے گا[1]

---

[1] نوٹ از ایڈیٹر البدر:۔
چنانچہ اسی وقت مغربی جانب جو دریچہ ہے اس کے ساتھ ایک حجرے کے لیے عمارت شروع ہوگئی ہے۔

۱۴ مارچ ۱۹۰۳ء

حکام کو نیکی کی تلقین کرنی چاہیئے

نماز عشاء سے قبل مفتی محمد صادق صاحب نے اخبار سول ملٹری میں سے طاعون کا مضمون پڑھ کر سنایا۔ اس مضمون کو سُنکر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا لفظ ہرگز منہ پر نہیں لاتے حالانکہ اگر حاکم کے منہ سے ایک بات نکلتی ہے تو ہزاروں آدمیوں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ بٹالہ کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جو کہ ایک دیسی آدمی تھا اس کے منہ سے یہ بات نکلی کہ نماز پڑھنی چاہیئے۔ اس پر بہت سے مسلمانوں نے نماز شروع کر دی۔ اسی طرح کبھی گورنمنٹ کی طرف سے یہ تاکید ہو کہ لوگ خدا کی طرف رجوع کریں تو دیکھیئے پھر لوگوں کی کیا تبدیلی ہوتی ہے مگر اس وقت امراء لوگ ایسے فسق و فجور میں مبتلا ہیں کہ گویا یہ ان کے نطفہ کا ایک جزو بن گیا ہے۔

عورتوں کے حقوق

اس کے بعد مفتی صاحب نے ایک مضمون سول ملٹری گزٹ سے سُنایا جو کہ اسلامی عورتوں کے حقوق پر تھا۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

ابھی کچھ دن ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک گندہ مضمون سنایا گیا تھا اب خدا تعالیٰ نے اس کے مقابلہ پر ایک فرحت بخش مضمون بھیج دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ ہر ہفتہ ایک نہ ایک بات ایسی نکل آتی ہے جس سے طبیعت کو ایک تروتازگی مل جاتی ہے۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں عورتوں کو وہی حقوق دیئے گئے ہیں جو کہ مردوں کو دیئے گئے ہیں حتّٰی کہ اسلامی عورتوں میں پاکیزہ اور مقدس عورتیں بھی ہوتی ہیں اور ولیہ بھی ہوتی ہیں اور ان سے خارق عادت امور سرزد ہوتے ہیں اور جو لوگ اسلام پر اس بارہ میں اعتراض کرتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ اس پر حضرت اقدس نے عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ:۔

عورتوں کی اصلاح کا طریق

مرد اگر پارسا طبع نہ ہو تو عورت کب صالحہ ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر مرد خود صالح بنے تو عورت بھی صالحہ بن سکتی ہے۔ قول سے عورت کو نصیحت نہ دینی چاہیئے بلکہ فعل سے اگر نصیحت دی جاوے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ عورت تو درکنار اور بھی کون ہے جو صرف قول سے کسی کی مانتا ہے۔

اگر مرد کوئی کجی یا خامی اپنے اندر رکھے گا تو عورت ہر وقت کی اس پر گواہ ہے۔ اگر وہ رشوت لے کر گھر آیا ہے تو اس کی عورت کہے گی کہ جب خاوند لایا ہے تو میں کیوں حرام کہوں۔ غرضیکہ مرد کا اثر عورت پر ضرور پڑتا ہے اور وہ خود ہی اُسے خبیث اور طیب بناتا ہے۔ اسی لیے لکھا ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ ۔ (نور: ۲۷)

اس میں یہی نصیحت ہے کہ تم طیب بنو ورنہ ہزار ٹکریں مارو کچھ نہ بنے گا۔ جو شخص خدا سے خود نہیں ڈرتا تو عورت اس سے کیسے ڈرے؟ نہ ایسے مولویوں کا وعظ اثر کرتا ہے نہ خاوند کا۔ ہر حال میں عملی نمونہ اثر کیا کرتا ہے بھلا جب خاوند رات کو اُٹھ اُٹھ کر دُعا کرتا ہے۔ روتا ہے تو عورت ایک دو دن تک دیکھے گی آخر ایک دن اُسے بھی خیال آوے گا اور ضرور متاثر ہوگی۔ عورت میں متاثر ہونے کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاوند عیسائی وغیرہ ہوتے ہیں تو عورتیں اُن کے ساتھ عیسائی وغیرہ جاتی ہیں۔ ان کی درستی کے واسطے کوئی مدرسہ بھی کفایت نہیں کر سکتا خاوند کا عملی نمونہ کفایت کرتا ہے۔ خاوند کے مقابلہ میں عورت کے بھائی بہن وغیرہ کا بھی کچھ اثر اس پر نہیں ہوتا۔

خدا نے مرد عورت دونو کا ایک ہی وجود فرمایا ہے۔

یہ مَردوں کا ظلم ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو ایسا موقع دیتے ہیں کہ وہ ان کا نقص پکڑیں۔ اُن کو چاہیئے کہ عورتوں کو ہرگز ایسا موقعہ نہ دیں کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ تو فلاں بدی کرتا ہے بلکہ عورت ٹکریں مار مار کر تھک جاوے اور کسی بدی کا پتہ اُسے مل ہی نہ سکے تو اس وقت اس کو دینداری کا خیال ہوتا ہے اور وہ دین کو سمجھتی ہے۔[۱]

مرد[۲] اپنے گھر کا امام ہوتا ہے پس اگر وہی بداثر قائم کرتا ہے تو کس قدر بداثر پڑنے کی امید ہے۔ مرد کو چاہیئے کہ اپنے قویٰ کو برمحل اور حلال موقعہ پر استعمال کرے مثلاً ایک قوت غضبی ہے جب وہ اعتدال سے زیادہ ہو تو جنون کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جنون میں اور اس میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ جو آدمی شدید الغضب ہوتا ہے اس سے حکمت کا چشمہ چھین لیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی مخالف ہو تو اس سے بھی مغلوب الغضب ہو کر گفتگو نہ کرے۔

مرد کی ان تمام باتوں اور اوصاف کو عورت دیکھتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ میرے خاوند میں فلاں فلاں اوصاف تقویٰ کے ہیں۔ جیسے سخاوت، حلم، صبر اور جیسے اُسے پرکھنے کا موقعہ ملتا ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا۔ اسی لیے عورت کو سارق بھی کہا ہے کیونکہ یہ اندر ہی اندر اخلاق کی چوری کرتی رہتی ہے حتّٰی کہ آخر کار ایک وقت پورا

---

[۱] البدر جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۶۸ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء

[۲] یہاں سے جو مضمون شروع ہوتا ہے یہ البدر کے اگلے نمبر یعنی ۱۰ میں درج ہے۔ لیکن وہاں سہو کتابت سے اُسے ۲۰ مارچ کی ڈائری کا بقیہ لکھا ہے جو درست نہیں۔ دراصل یہ ۱۴ مارچ کی بقیہ ڈائری ہے۔ جیسا کہ مضمون کی ترتیب سے واضح ہے۔ ۲۰ مارچ کی مکمل ڈائری تو البدر جلد ۲ کے نمبر ۱۱ صفحہ ۸۱ - ۸۲ پر درج ہے۔ (مرتب)

اخلاق حاصل کر لیتی ہے۔

ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ ایک دفعہ عیسائی ہوا تو عورت بھی اس کے ساتھ عیسائی ہو گئی۔ شراب وغیرہ اوّل شروع کی پھر پردہ بھی چھوڑ دیا۔ غیر لوگوں سے بھی ملنے لگی۔ خاوند نے پھر اسلام کی طرف رجوع کیا تو اُس نے بیوی کو کہا کہ تو بھی میرے ساتھ مسلمان ہو۔ اس نے کہا کہ اب میرا مسلمان ہونا مشکل ہے۔ یہ عادتیں جو شراب وغیرہ اور آزادی کی پڑ گئی ہیں یہ نہیں چھوٹ سکتیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ صفحہ ۷۴ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۱۵ مارچ ۱۹۰۳ء

آریوں کے متعلق لٹریچر کی اشاعت

سیر کے دوران کتابوں کی اشاعت کے متعلق خلیفہ صاحب سے فرمایا کہ ان کی اشاعت کرو ایسا نہ ہو کہ صندوقوں میں بند پڑی رہیں۔

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آریہ لوگ ان کتابوں کے جواب میں ایک گالیوں کا طومار لکھیں گے کیونکہ جواب دینے کی تو ان میں طاقت نہیں ہوتی۔ صرف گندی ہی گندی بولیں گے۔ ہم نے تو نہایت نرم الفاظ میں لکھی ہیں مگر یہ بہتان لگائے بغیر نہ رہیں گے شاید ایک اور کتاب پھر اس کے جواب میں لکھنی پڑے۔ دیانند کو اسلام کی خبر نہیں تھی مگر چونکہ اس نے کتابیں ناگری زبان میں لکھیں اس لیے لوگوں کو اس کی گندہ زبانی کی خبر نہیں ہے۔ لیکھرام نے اردو میں لکھیں اس کی خبر سب کو ہوئی۔

میرا اصول ہے کہ جو شخص حکمت اور معرفت کی باتیں لکھنا چاہے وہ جوش سے کام نہ لیوے ورنہ اثر نہ ہوگا ہاں بعض امور حقہ برمحل عبارت میں لکھنے پڑتے ہیں مگر اَلْحَقُّ مُرٌّ معاملہ ہو کر ہم اس میں مجبور ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں سناتن دھرم اور نسیم دعوت وغیرہ لاہور، بمبئی، کشمیر وغیرہ شہروں میں آریوں کے پاس ضرور روانہ کرنی چاہئیں اگر شائع نہ ہوں تو پھر وہی مثال ہے۔

زہر نہادن چہ سنگ وچہ زر

امامت مسجد اور ختم وغیرہ

ایک سوال پر فرمایا کہ

خدا تعالیٰ کے پاک کلام قرآن کو ناپاک باتوں سے ملا کر پڑھنا بے ادبی ہے وہ تو صرف روٹیوں کی غرض سے مُلاں لوگ پڑھتے ہیں۔ اس ملک کے لوگ ختم وغیرہ دیتے ہیں تو مُلاں لوگ لمبی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں کہ شوربا اور روٹی زیادہ ملے۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرۃ: ۴۲) یہ کفر ہے۔

جو طریق آج کل پنجاب میں نماز کا ہے میرے نزدیک ہمیشہ سے اس پر بھی اعتراض ہے۔ مُلاں لوگ صرف مقررہ آدمیوں پر نظر کر کے جماعت کراتے ہیں۔ ایسا امام شرعاً ناجائز ہے۔ صحابہؓ میں کہیں نظیر نہیں ہے کہ اس طرح اُجرت پر امامت کرائی ہو پھر اگر کسی کو مسجد سے نکالا جاوے تو چیف کورٹ تک مقدمہ چلتا ہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک مُلاں نے نمازِ جنازہ کی ۶ یا ۷ تکبیریں کہیں۔ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ کام روزمرہ کے محاورہ سے یاد رہتا ہے کبھی سال میں ایک آدمی مَرتا ہے تو کیسے یاد رہے جب مجھے یہ بات بھول جاتی ہے کہ کوئی مَرا بھی کرتا ہے تو اس وقت کوئی میّت ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک مُلاّ یہاں آ کر رہا۔ ہمارے میرزا صاحب نے اسے محلے تقسیم کر دیئے ایک دن وہ روتا ہوا آیا کہ مجھے جو محلہ دیا ہے۔ اس کے آدمیوں کے قد چھوٹے ہیں اس لیے اُن کے مرنے پر جو کپڑا ملیگا اس سے چادر بھی نہ بنے گی۔

اس وقت ان لوگوں کی حالت بہت ردّی ہے۔ صُوفی لکھتے ہیں کہ مُردہ کا مال کھانے سے دل سخت ہو جاتا ہے۔

مولُود خوانی

ایک[1] شخص نے مولود خوانی پر سوال کیا۔ فرمایا:۔

آنحضرتؐ کا تذکرہ بہت عمدہ ہے بلکہ حدیث سے ثابت ہے کہ انبیاء اور اولیاء کی یاد سے رحمت نازل ہوتی ہے اور خود خدا نے بھی انبیاء کے تذکرہ کی ترغیب دی ہے[2] لیکن اگر اس کے ساتھ ایسی بدعات[3] مل جاویں جن سے توحید میں خلل واقع ہو تو وہ جائز نہیں۔ خدا کی شان خدا کے ساتھ اور نبی کی شان نبی کے ساتھ رکھو۔ آج کل کے مولویوں میں بدعت کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں اور وہ بدعات خدا کے منشاء کے خلاف ہیں۔ اگر بدعات نہ ہوں تو پھر تو وہ ایک وعظ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت۔ پیدائش اور وفات کا ذکر ہو تو موجبِ ثواب

---

[1] (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ کے صفحہ ۵ پر" استفسار اور اُن کے جواب" کے زیرعنوان حضور علیہ السلام کے جو ملفوظات بلا تاریخ درج ہیں۔ دراصل یہ ۱۵ مارچ ۱۹۰۳ء کی ڈائری ہے۔ کیونکہ یہ سب استفسار اور ان کے جواب "البدر" نے ۱۵ مارچ کی ڈائری میں دیئے ہیں لہٰذا "الحکم" کے ان ملفوظات میں جو بات "البدر" سے زیادہ مفصل ہے وہ حاشیہ میں درج کر دی ہے) (مرتب)

[2] (الحکم سے) "اُس سے محبت بڑھتی ہے اور آپؐ کی اِتباع کے لیے تحریک ہوتی اور جوش پیدا ہوتا ہے"۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ ، ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

[3] (الحکم سے) "قرآن شریف میں بھی اسی لیے بعض تذکرے موجود ہیں جیسے فرمایا وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ" (مریم ۴۲) (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ ، ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

ہے[۱]۔ ہم مجاز نہیں کہ اپنی شریعت یا کتاب بنا لیویں۔

بعض ملاں اس میں غلو کر کے کہتے ہیں کہ مولود خوانی حرام[۲] ہے۔ اگر حرام ہے تو پھر کس کی پیروی کروگے؟ کیونکہ جس کا ذکر زیادہ ہو اس سے محبت بڑھتی ہے اور پیدا ہوتی ہے۔

مولود کے وقت کھڑا ہونا جائز نہیں۔ ان اندھوں کو اس بات کا علم ہی کب ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح آگئی[۳] ہے بلکہ ان مجلسوں میں تو طرح طرح کے بدطینت اور بدمعاش لوگ ہوتے ہیں وہاں آپکی رُوح کیسے آسکتی ہے اور کہاں لکھا ہے کہ رُوح آتی ہے؟ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل: ۳۷)

دونوں طرف کی رعایت رکھنی چاہیئے۔ جب تک وہابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نہیں سمجھتا وہ بھی خدا سے دُور ہے۔ انہوں نے بھی دین کو خراب کر دیا ہے۔ جب کسی نبی یا ولی کا ذکر آجاوے تو چلا اُٹھتے ہیں کہ اُن کو ہم پر کیا فضیلت ہے۔ انہوں نے انبیاء کے خوارق سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہا۔

دوسرے فرقے نے شرک اختیار کیا حتیٰ کہ قبروں کو سجدہ کیا اور اس طرح اپنا ایمان ضائع کیا۔ ہم نہیں کہتے کہ

---

۱ (الحکم سے) لیکن ان تذکروں کے بیان میں بعض بدعات ملا دی جائیں تو وہ حرام ہو جاتے ہیں۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ یاد رکھو کہ اصل مقصد اسلام کا توحید ہے۔ مولود کی محفلیں کرنے والوں میں آج کل دیکھا جاتا ہے کہ بہت سی بدعات ملا لی گئی ہیں جس نے ایک جائز اور موجبِ رحمت فعل کو خراب کر دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ موجبِ رحمت ہے مگر غیر مشروع امور و بدعات منشاءِ الٰہی کے خلاف ہیں۔ ہم خود اس امر کے مجاز نہیں ہیں کہ آپ کسی نئی شریعت کی بنیاد رکھیں اور آجکل یہی ہو رہا ہے کہ ہر شخص اپنے خیالات کے موافق شریعت کو بنانا چاہتا ہے گویا خود شریعت بناتا ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

۲ (الحکم سے) "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ کو حرام کہنا بڑی بیباکی ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع خدا تعالیٰ کا محبوب بنانے کا ذریعہ اور اصل باعث ہے اور اتباع کا جوش تذکرہ سے پیدا ہوتا اور اس کی تحریک ہوتی ہے۔ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

۳ (الحکم سے) "ہاں جو لوگ مولود کے وقت کھڑے ہوتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی خود تشریف لے آئے ہیں یہ اُن کی جرأت ہے ایسی مجلسیں جو کی جاتی ہیں۔ اُن میں بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے ایسے لوگ شریک ہوتے ہیں جو تارک الصلوٰۃ۔ سُود خور اور شرابی ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی مجلسوں سے کیا تعلق؟ اور یہ لوگ محض ایک تماشہ کے طور پر جمع ہو جاتے ہیں۔ پس اس قسم کے خیال بیہودہ ہیں۔"

(ایضاً ایضاً)

انبیاء کی پرستش کرو بلکہ سوچو اور سمجھو۔ خدا تعالیٰ بارش بھیجتا ہے ہم تو اس پر قادر نہیں ہوتے مگر بارش کے بعد کیسی سرسبزی اور شادابی نظر آتی ہے۔ اسی طرح انبیاء کا وجود بھی بارش ہے[1]۔

پھر دیکھو کہ کوڑی اور موتی دونو دریا ہی سے نکلتے ہیں۔ پتھر اور ہیرا بھی ایک ہی پہاڑ سے نکلتا ہے مگر سب کی قیمت الگ الگ ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا نے مختلف وجود بنائے ہیں۔ انبیاء کا وجود اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے اور خدا کی محبت سے بھرا ہوا۔ اُس کو اپنے جیسا سمجھ لینا اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہوگا۔ بلکہ خدا نے تو وعدہ کیا ہے کہ جو ان سے محبت کرتا ہے وہ انہیں میں سے شمار ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ بہشت میں ایک ایسا مقام عطا ہوگا جس میں صرف مَیں ہی ہوں گا۔ ایک صحابی رو پڑا۔ کہ حضور مجھے جو آپ سے محبت ہے مَیں کہاں ہوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تو بھی میرے ساتھ ہوگا۔ پس سچی محبت سے کام نکلتا ہے۔ ایک مشرک ہرگز سچی محبت نہیں رکھتا[2]۔ مَیں نے جہاں تک دیکھا ہے۔ وہابیوں میں تیزی اور چالاکی ہوتی ہے۔ خاکساری اور انکساری تو اُن کے نصیب نہیں ہوتی یہ ایک طرح سے مسلمانوں کے آریہ ہیں۔ وہ بھی الہام کے منکر یہ بھی منکر۔ جب تک انسان براہِ راست یقین حاصل نہ کرے قصص کے رنگ میں ہرگز خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص خدا تعالیٰ پر پورا ایمان رکھتا ہے ضرور ہے کہ اس پر کچھ تو خدا کا رنگ آجاوے۔

دوسرے گروہ میں سوائے قبر پرستی اور پیر پرستی کے کچھ رُوح باقی نہیں ہے۔ قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ خدا نے اُمَّۃً وَّسَطًا کہا تھا۔ وسط سے مراد ہے میانہ رو۔ اور وہ دونو گروہ نے چھوڑ دیا۔ پھر خدا فرماتا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران : ۳۲) کیا[3] آنحضرتؐ نے کبھی روٹیوں پر قرآن پڑھا تھا؟

---

[1] (الحکم میں ہے) "انبیاء علیہم السلام کا وجود بھی ایک بارش ہوتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کا روشن وجود ہوتا ہے۔ خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دنیا کے لیے اس میں برکات ہوتے ہیں۔ اپنے جیسا سمجھ لینا ظلم ہے۔ اولیاء اور انبیاء سے محبت رکھنے سے ایمانی قوت بڑھتی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ ، ۲۴؍ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] (الحکم میں ہے) "مشرک بھی سچی محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں رکھ سکتا اور ایسا ہی وہابی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ مسلمانوں کے آریہ ہیں ان میں رُوحانیت نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ اور اس کے سچے رسول سے سچی محبت نہیں ہے۔ دوسرا گروہ جنہوں نے مشرکانہ طریق اختیار کئے ہیں۔ رُوحانیت ان میں بھی نہیں۔ قبر پرستی کے سوا اَور کچھ نہیں۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ ، ۲۴؍ مارچ ۱۹۰۳ء)

[3] الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے سوال کیا تھا کہ "روٹیوں پر فاتحہ پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟" اس کے جواب میں حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ جواب دیا تھا۔ (مرتب)

اگر آپ نے ایک روٹی پر پڑھا ہوتا تو ہم ہزار پر پڑھتے ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش الحانی سے قرآن سنا تھا اور آپ اس پر روئے بھی تھے جب یہ آیت آئی وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النسآء: ۴۲) آپ روئے اور فرمایا بس کریں آگے نہیں سن سکتا۔ آپ کو اپنے گواہ گذرنے پر خیال گذرا ہوگا۔ ہمیں خود خواہش رہتی ہے کہ کوئی خوش الحان حافظ ہو تو قرآن سنیں۔[1]

آنحضرت نے ہر ایک کام کا نمونہ دکھلا دیا ہے وہ ہمیں کرنا چاہیئے۔ سچے مومن کے واسطے کافی ہے کہ دیکھ لیوے کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں کیا تو کرنے کا حکم دیا ہے یا نہیں؟ حضرت ابراہیم آپ کے جدِ امجد تھے اور قابلِ تعظیم تھے کیا وجہ کہ آپ نے ان کا مولود نہ کروایا؟

اشعار اور نظم پڑھنا

اشعار اور نظم پر سوال ہوا اور فرمایا کہ:-

نظم تو ہماری اس مجلس میں بھی سنائی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک دفعہ ایک شخص خوش الحان کی تعریف سنکر اس سے چند ایک اشعار سنے پھر فرمایا کہ رَحِمَكَ اللّٰهُ یہ لفظ آپ جسے کہتے تھے وہ جلد شہید ہو جاتا۔ چنانچہ وہ بھی میدان میں جاتے ہی شہید ہو گیا۔ ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسجد میں شعر پڑھے۔ حضرت عمرؓ نے روکا کہ مسجد میں مت پڑھو۔ وہ غصہ میں آگیا اور کہا کہ تو کون ہے کہ مجھے روکتا ہے۔ میں نے اسی جگہ اور اسی مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اشعار پڑھے تھے اور آپ نے مجھے منع نہ کیا۔ حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے۔

شعر کہنا

ایک شخص کا اعتراض پیش ہوا کہ مرزا صاحب شعر کہتے ہیں۔ فرمایا:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خود شعر پڑھے ہیں۔ پڑھنا اور کہنا ایک ہی بات ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی شاعر تھے۔ حضرت عائشہؓ۔ امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے قصائد مشہور ہیں۔ حسان بن ثابتؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر قصیدہ لکھا۔

سید عبدالقادر صاحبؒ نے بھی قصائد لکھے ہیں۔ کسی صحابی کا ثبوت نہ دے سکو گے کہ اس نے تھوڑا یا بہت شعر نہ کہا ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو منع نہ فرمایا۔ قرآن کی بہت سی آیات شعروں سے ملتی ہیں۔

---

[1] الحکم میں ہے:-

سوال۔ خوش الحانی سے قرآن شریف پڑھنا کیسا ہے؟

حضرت اقدس۔ خوش الحانی سے قرآن شریف پڑھنا بھی عبادت ہے اور بدعات جو اس کے ساتھ ملا لیتے ہیں وہ اس عبادت کو ضائع کر دیتی ہیں۔ بدعات نکال نکال کر ان لوگوں نے کام خراب کیا ہے۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

ایک شخص نے عرض کی کہ سورہ شعراء میں اخیر پر شاعروں کی مذمت کی ہے۔ فرمایا کہ:۔
وہ مقام پڑھو۔ وہاں خدا نے فسق و فجور کرنیوالے شاعروں کی مذمت کی ہے اور مومن شاعر کا وہاں خود استثناء کر دیا ہے۔ پھر ساری زبُور نظم ہے۔ یرمیاہ سلیمان اور موسیٰ کی نظمیں تورات میں ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نظم گناہ نہیں ہے ہاں فسق و فجور کی نظم نہ ہو۔ ہمیں خود الہام ہوتے ہیں بعض ان میں سے مقفیٰ اور بعض شعروں میں ہوتے ہیں۔

(مجلس قبل از عشاء)

کُتّے اور بندر سے مُراد

کُتے سے مراد ایک طمّاع آدمی جو کہ تھوڑی سی بات پر راضی اور تھوڑی سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں اور بندر سے مراد ایک مسخ شدہ آدمی ہے۔
مفسرین سے یہ بات ثابت نہیں کہ مسخ شدہ یہود پر پشم پیدا ہوگئی تھی اور اُن کی دُم بھی نکل آئی تھی بلکہ ان کے عادات مثل بندروں کے ہوگئے تھے۔ اس وقت بھی اُمت مثلِ یہود کے ہوگئی ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ان کی خصلت ان میں آگئی ہے کہ مامور کا انکار کرتے ہیں۔

کسرِ صلیب

کسرِ صلیب پر فرمایا کہ:۔
اب ایک ہوا چل پڑی ہے جیسے ہمارے دلوں میں ڈالا ہے کہ مسیح مرگیا ویسے ہی اب ان (اہلِ یورپ و امریکہ) کے دلوں میں ڈالا ہے۔ اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور مسیح کی امید لگ رہی ہے سب پُکار رہے ہیں کہ یہی زمانہ ہے۔

تعبیر رؤیا

دانت کی داڑھ نکل کر اگر کانچ کی نظر آوے تو خطرناک ہوا کرتی ہے۔ دانت اگر ٹوٹ کر ہاتھ میں رہے تو عمدہ ہے۔

خواتین کی اصلاح کا طریق

اس کے بعد مفتی محمد صادق صاحب پھر سوِل اخبار کا بقیہ مضمون سناتے رہے جس میں اسلامی عورتوں کا ذکر تھا اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔
کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی عورتیں صالحات میں نہ ہوں گو تھوڑی ہوں مگر ہوں گی ضرور۔ جس نے عورت کو صالحہ بنانا ہو وہ خود صالح بنے۔ ہماری جماعت کے لیے ضروری ہے کہ اپنی پرہیزگاری کیلئے عورتوں کو پرہیزگاری سکھاویں ورنہ وہ گنہگار ہوں گے اور جبکہ اس کی عورت سامنے ہو کر بتلا سکتی ہے کہ تجھ

میں فلاں فلاں عیب ہیں تو پھر عورت خدا سے کیا ڈرے گی جب تقویٰ نہ ہو تو ایسی حالت میں اولاد بھی پلید پیدا ہوتی ہے۔ اولاد کا طیب ہونا تو طیبات کا سلسلہ چاہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر اولاد خراب ہوتی ہے۔ اس لیے چاہیئے کہ سب توبہ کریں اور عورتوں کو اپنا اچھا نمونہ دکھلاویں۔ عورت خاوند کی جاسوس ہوتی ہے وہ اپنی بدیاں اس سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ نیز عورتیں چھپی ہوئی دانا ہوتی ہیں۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ احمق ہیں وہ اندر ہی اندر تمہارے سب اثروں کو حاصل کرتی ہیں۔ جب خاوند سیدھے رستہ پر ہوگا تو وہ اس سے بھی ڈرے گی اور خدا سے بھی۔ ایسا نمونہ دکھانا چاہیئے کہ عورت کا یہ مذہب ہو جاوے کہ میرے خاوند جیسا اور کوئی نیک بھی دُنیا میں نہیں ہے اور وہ یہ اعتقاد کرے کہ یہ باریک سے باریک نیکی کی رعایت کرنے والا ہے۔ جب عورت کا یہ اعتقاد ہو جاویگا تو ممکن نہیں کہ وہ خود نیکی سے باہر رہے۔ سب انبیاء اولیاء کی عورتیں نیک تھیں اس لیے کہ ان پر نیک اثر پڑتے تھے۔ جب مرد بدکار اور فاسق ہوتے ہیں تو ان کی عورتیں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک چور کی بیوی کو یہ خیال کب ہو سکتا ہے کہ میں تہجد پڑھوں۔ خاوند تو چوری کرنے جاتا ہے تو کیا وہ پیچھے تہجد پڑھتی ہے؟ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ[1] اسی لیے کہا ہے کہ عورتیں خاوندوں سے متأثر ہوتی ہیں جس حد تک خاوند صلاحیت اور تقویٰ بڑھاوے گا کچھ حصّہ اس سے عورتیں ضرور لیں گی۔ ویسے ہی اگر وہ بدمعاش ہوگا تو بدمعاشی سے وہ حصّہ لیں گی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ صفحہ ۷۳-۷۴-۷۵ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۱۶ مارچ ۱۹۰۳ء

خواب اور اسکی تعبیر

سیر میں بعض احباب نے اپنے رؤیا سنائے آپ نے فرمایا کہ خواب بھی ایک اجمال ہوتا ہے اور اسکی تعبیر صرف قیاسی ہوتی ہے۔

ایک رؤیا اور ایک الہام

رات کو میں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اپنی جماعت میں سے گھوڑے پر سے گر پڑا۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ سوچتا رہا کہ کیا تعبیر کریں۔ قیاسی طور پر جو بات اقرب ہووے لگائی جاسکتی ہے کہ اس اثناء میں غنودگی غالب ہوئی اور الہام ہوا

"استقامت میں فرق آگیا"

ایک صاحب نے کہا کہ وہ کون شخص ہے حضرت نے فرمایا کہ

معلوم تو ہے مگر جب تک خدا کا اذن نہ ہو مَیں بتلایا نہیں کرتا میرا کام دُعا کرنا ہے۔

---

[1] نساء : ۳۵

سُود کی حُرمت

ایک نے سوال کیا کہ ضرورت پر سودی روپیہ لے کر تجارت وغیرہ کرنے کا کیا حکم ہے۔ فرمایا:۔

حرام ہے۔ ہاں اگر کسی دوست اور تعارف کی جگہ سے روپیہ لیا جاوے اور کوئی وعدہ اس کو زیادہ دینے کا نہ ہو نہ اس کے دل میں زیادہ لینے کا خیال ہو۔ پھر اگر مقروض اصل سے کچھ زیادہ دیدے تو وہ سُود نہیں ہوتا بلکہ یہ تو هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمٰن: ۶۱) ہے۔

اس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر ضرورت سخت ہو اور سوائے سُود کے کام نہ چل سکے تو پھر؟ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

خدا تعالیٰ نے اس کی حرمت مومنوں کے واسطے مقرر کی ہے اور مومن وہ ہوتا ہے جو ایمان پر قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ اسلام میں کروڑہا ایسے آدمی گذرے ہیں جنہوں نے نہ سُود لیا نہ دیا۔ آخر ان کے حوائج بھی پورے ہوتے رہے کہ نہیں؟[1] خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ لو نہ دو جو ایسا کرتا ہے وہ گویا خُدا کے ساتھ لڑائی کی تیاری کرتا ہے ایمان ہو تو اس کا صلہ خدا بخشتا ہے۔ ایمان بڑی بابرکت شئے ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (البقرہ: ۱۰۷) اگر اُسے خیال ہو کہ پھر کیا کرے؟ تو کیا خدا کا حکم بھی بیکار ہے؟ اس کی قدرت بہت بڑی ہے۔ سود تو کوئی شئے ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا کہ زمین کا پانی نہ پیا کرو تو وہ[2] ہمیشہ بارش کا پانی آسمان سے دیا کرتا۔ اسی طرح ضرورت پر وہ خود ایسی راہ نکال ہی دیتا ہے۔ کہ جس سے اس کی نافرمانی بھی نہ ہو جب تک ایمان میں میل کچیل ہوتا ہے تب تک یہ ضعف اور کمزوری ہے۔ کوئی گناہ چھوٹ نہیں سکتا جب تک خدا نہ چھڑاوے ورنہ انسان تو ہر ایک گناہ پر یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ ہم چھوڑ نہیں سکتے اگر چھوڑیں تو گذارہ نہیں چلتا۔ دکانداروں عطاروں کو دیکھا جاوے کہ پُرانا مال سالہا سال تک بیچتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ ملازم پیشہ لوگ رشوت خوری کرتے ہیں اور سب یہ عذر کرتے ہیں[3] کہ گذارہ نہیں چلتا۔ ان سب کو اگر اکٹھا کر کے نتیجہ نکالا جاوے تو پھر یہ نکلتا ہے کہ خدا کی کتاب پر عمل ہی نہ کرو کیونکہ گذارہ نہیں چلتا۔ حالانکہ مومن

---

[1] (الحکم سے) "وہ کبھی ایسی مشکلات میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۴) اللہ تعالیٰ ہر ضیق سے اُن کو نجات دیتا ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۵ مورخہ ۲۴ رمارچ ۱۹۰۳ء)

[2] الحکم میں ہے:۔ "اگر اللہ تعالیٰ مومن کو کہتا کہ تو زمین کا پانی نہ پیا کر۔ تو مَیں ایمان رکھتا ہوں کہ اُس کو آسمان سے پانی ملتا۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ رمارچ ۱۹۰۳ء)

[3] (الحکم سے) "عذر رکھ کر مصیبت میں مبتلا ہونا یہ سفلی عذر ہے جو شیطان سے آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرے۔ تو سب کچھ ہوتا ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ رمارچ ۱۹۰۳ء)

کے لیے خدا خود سہولت کر دیتا ہے۔ یہ تمام راستبازوں کا مجرب علاج ہے کہ مصیبت اور صعوبت میں خدا خود راہ نکال دیتا ہے۔

لوگ خدا کی قدر نہیں کرتے۔ جیسے بھروسا ان کو حرام کے دروازے پر ہے ویسا خدا پر نہیں ہے۔ خدا پر ایمان یہ ایک ایسا نسخہ ہے کہ اگر قدر ہو تو جی چاہے کہ جیسے اَور عجیب نسخہ مخفی رکھنا چاہتے ہیں ویسے ہی اسے بھی مخفی رکھا جاوے۔ مَیں نے کئی دفعہ بیماریوں میں آزمایا ہے کہ پیشاب بار بار آرہا ہے۔ دست بھی لگے ہیں۔ آخر خدا سے دُعا کی۔ صبح کو الہام ہوا۔ " دُعَاءُكَ مُسْتَجَابٌ " اس کے بعد ہی وہ کثرت جاتی رہی اور کمزوری کی جگہ طاقت آگئی۔ یہ خدا کی طاقت ہے خدا ایسا عجیب ہے کہ ان نسخوں سے بھی زیادہ قابلِ قدر ہے جو کیمیا وغیرہ کے ہوتے ہیں مجھے بھی ایک دفعہ خیال آیا کہ یہ تو چھپانے کے قابل ہے پھر سوچا کہ یہ تو بخل ہے۔ ایسی مفید شئے کا دنیا پر اظہار کرنا چاہیئے کہ مخلوق الٰہی کو فائدہ حاصل ہو۔ یہی فرق اسلام اور دوسرے مذاہب کے خدا میں ہے۔ انکا خدا بولتا نہیں۔ خدا معلوم یہ بھی کیسا ایمان ہے۔ اسلام کا خدا جیسا پہلے تھا ویسے ہی اب ہے۔ نہ طاقت کم ہوئی نہ بوڑھا ہوا۔ نہ کچھ اَور نقص اس میں واقع ہؤا۔ ایسے خدا پر جس کا ایمان ہو وہ اگر آگ میں بھی پڑا ہو تو اُسے حوصلہ ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو آخر آگ میں ڈالا ہی تھا۔ ایسے ہی ہم بھی آگ میں ڈالے گئے[1]۔ خون کا مقدمہ بنایا گیا۔ اگر اس میں ۵ یا دس سال کی قید ہو جاتی تو سب سلسلہ تباہ ہو جاتا۔ سب قوموں نے متفق ہو کر یہ آگ سلگائی تھی۔ کیا کم آگ تھی؟ اس وقت سوائے خدا کے اَور کون تھا؟ اور وہی الہام ہوئے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہوئے تھے آخر میں الہام ہوا اِبْرَاءٌ اور تسلّی دی کہ سب کچھ میرے ہاتھ ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ریلوے میں جو لوگ ملازم ہوتے ہیں۔ ان کی تنخواہ میں سے ایک آنہ فی روپیہ کاٹ کر رکھا جاتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ روپیہ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ زائد بھی وہ دیتے ہیں۔ اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ

شرع میں سُود کی یہ تعریف ہے کہ ایک شخص اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو روپیہ قرض دیتا ہے اور فائدہ مقرر کرتا ہے یہ تعریف جہاں صادق آوے گی وہ سُود کہلاویگا۔[2] لیکن جس نے روپیہ لیا ہے اگر وہ وعدہ وعید

---

[1] (الحکم سے) "ڈگلس کے سامنے جو کلارک کا مقدمہ تھا وہ اُس آگ سے کم نہ تھا" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مؤرخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

[2] (الحکم سے) لیکن جبکہ محکمہ ریلوے کے ملازم خود وہ روپیہ سُود کے لالچ سے نہیں دیتے بلکہ جبراً وضع کیا جاتا ہے تو یہ سُود کی تعریف میں داخل نہیں ہے اور خود جو کچھ روپیہ وہ زائد دیدیتے ہیں وہ سُود میں داخل نہیں ہے۔ غرض یہ خود

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو کچھ نہیں کرتا اور اپنی طرف سے زیادہ دیتا ہے اور دینے والا اس نیت سے نہیں دیتا کہ سُود ہے تو وہ بھی سُود میں داخل نہیں ہے وہ بادشاہ کی طرف سے احسان ہے۔ پیغمبر خدا نے کسی سے ایسا قرضہ نہیں لیا کہ ادائیگی کے وقت اُسے کچھ نہ کچھ ضرور زیادہ (نہ) دیدیا ہو۔ یہ خیال رہنا چاہیئے کہ اپنی خواہش نہ ہو خواہش کے برخلاف جو زیادہ ملتا ہے وہ سُود میں داخل نہیں ہے۔

سُود اور سُود در سُود

ایک صاحب نے عرض کیا کہ سید احمد خاں صاحب نے لکھا ہے اَضْعَافاً مُّضٰعَفَةً (آل عمران: ۱۳۱) کی ممانعت ہے فرمایا کہ:۔

یہ بات غلط ہے کہ سُود در سُود کی ممانعت کی گئی ہے اور سُود جائز رکھا ہے شریعت کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے۔ یہ فقرہ اسی قسم کا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ گناہ در گناہ مت کرتے جاؤ۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گناہ ضرور کرو۔

اس قسم کا روپیہ جو کہ گورنمنٹ سے ملتا ہے وہ اسی حالت میں سود ہوگا جبکہ لینے والا اس خواہش سے روپیہ دیتا ہے کہ مجھ کو سُود ملے ورنہ گورنمنٹ جو اپنی طرف سے احساناً دیوے وہ سود میں داخل نہیں ہے۔

رشوت کے روپیہ سے بنائی گئی جائیداد

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر ایک شخص تائب ہو تو اس کے پاس جو اول جائیداد رشوت وغیرہ سے بنائی ہو اس کا کیا حکم ہے۔ فرمایا:۔

شریعت کا حکم ہے کہ توبہ کرے تو جس جس کا وہ حق ہے وہ اُسے پہنچایا جاوے[۱]۔ رشوت اور ہدیہ میں تمیز چاہیئے۔ رشوت وہ مال ہے کہ جب کسی کی حق تلفی کے واسطے دیا یا لیا جاوے ورنہ اگر کسی نے ہمارا ایک کام محنت سے کر دیا ہے اور حق تلفی بھی کسی کی نہیں ہوئی تو اس کو جو دیا جاوے گا۔ وہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔

انشورنس یا بیمہ

انشورنس[۲] اور بیمہ پر سوال کیا گیا۔ فرمایا کہ سُود اور قمار بازی کو الگ کرکے دوسرے اقراروں اور ذمہ داریوں کو شریعت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

دیکھ سکتے ہو کہ آیا یہ روپیہ سُود لینے کے لیے تم خود دیتے ہو یا وہ خود وضع کرتے ہیں اور بلا طلب اپنے طور پر دیتے ہیں" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۶، ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

[۱] (الحکم سے) "اور اگر پتہ نہ لگے تو پھر اسے صدقہ وخیرات کر دے" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۶، ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

[۲] الحکم میں اس سوال سے پہلے ایک اَور سوال اور اس کا جواب یوں درج ہے:۔

سوال۔ رہن کے متعلق کیا حکم ہے؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے صحیح قرار دیا ہے۔ قمار بازی میں ذمہ داری نہیں ہوتی۔ دنیا کے کاروبار میں ذمہ داری کی ضرورت ہے۔

دوسرے ان تمام سوالوں میں اس امر کا خیال بھی رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف میں حکم ہے کہ بہت کھوج نکال کر مسائل نہ پوچھنے چاہئیں۔ مثلاً اب کوئی دعوت کھانے جاوے اور اسی خیال میں لگ جاوے کہ کسی وقت حرام کا پیسہ ان کے گھر میں آیا ہوگا۔ پھر اس طرح تو آخر کار دعوتوں کا کھانا ہی بند ہو جاوے گا۔ خدا کا نام ستار بھی ہے ورنہ دنیا میں عام طور پر راستباز کم ہوتے ہیں مستور الحال بہت ہوتے ہیں۔ یہ بھی قرآن میں لکھا ہے وَلَا تَجَسَّسُوْا (سورۃ الحجرات:۱۳) یعنی تجسس مت کیا کرو ورنہ اس طرح تم مشقت میں پڑو گے۔

مجلس قبل از عشاء

پنڈت نند کشور سناتن دھرمی سے گفتگو

پنڈت نند کشور صاحب جو کہ سناتن دھرم مذہب کے ایک عالم فاضل متبحر لیکچرار ہیں حضرت اقدس کی ملاقات کے واسطے تشریف لائے۔ آتے ہی حضرت صاحب سے سلام علیکم اور مصافحہ کیا۔ حضرت صاحب نے نسیم دعوت اور سناتن دھرم وغیرہ کی نسبت ان کی رائے دریافت کی۔ پنڈت صاحب نے کہا کہ ان کتب میں آپ نے ویسے ہی لکھا ہے جیسے انبیاء کا دستور ہے خدا کے برگزیدہ بندوں سے گندے لفظ نکل ہی نہیں سکتے۔ آریہ لوگوں کی مثال انہوں نے یہ دی کہ جیسے کھاری چشمہ سے میٹھا پانی نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح وہ لوگ لکھ ہی کیا سکتے ہیں۔

حضرت اقدس نے آریہ سماج کی نسبت فرمایا کہ:

آریہ سماج

یہ لوگ بالکل حقیقت ایمان سے بے نصیب ہیں۔ ایمان تو عقلمندوں کی آزمائش کے لیے ہے کہ کچھ عقل سے کام لیوے اور کچھ ایمان سے۔ معجزات میں یہ عادۃ اللہ ہرگز نہیں ہے کہ ایسے کام دکھلائے جاویں جو کہ خدا کی عادت کے برخلاف دنیا میں ہوں۔ مثلاً سوال کرتے ہیں کہ سو یا پچاس سال کے مُردے اگر شہادت دیویں گو کہ یہ ہو تو سکتا ہے مگر سوال ہے کہ جو اس کے بعد قبول کریگا اُسے کیا فائدہ ہوگا؟ جب سب حقیقت کُھل گئی اور سو دو سو آدمی کی شہادت بھی مل گئی تو اب کس کی عقل ماری ہے کہ انکار کرے نہ ہندو نہ چمار کسی کو گنجائش ہی انکار کی نہیں رہتی۔ ہمارے ہاں لکھا ہے کہ اس قسم کا ایمان فائدہ نہیں دیتا۔ اگر دن چڑھا ہوا ہو اور کوئی کہے کہ یہ دن پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

حضرت اقدس۔ ہمارے نزدیک رہن جبکہ نفع و نقصان کا ذمہ دار ہو جاتا ہے اس سے فائدہ اُٹھانا منع نہیں ہے۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

ایمان لایا یا چاند پورا چودھویں کا ہے اور کوئی اس پر ایمان لاوے تو اُسے کیا فائدہ ہوگا؟ اور کس تعریف کا مستحق ہے؟ ہاں اگر اوّل شب کے چاند پر جس کا نام ہلال ہے کوئی اُسے دیکھ کر بتلاوے تو اس کی نظر کی تعریف کی جاوے گی اور جس کی نظر کم و بیش ہے وہ کھل جاویگی تو نشانوں میں یہی اصول خدا نے رکھا ہے کہ ایک پہلو میں ایمان سے فائدہ اٹھاویں اور ایک پہلو میں عقل سے ورنہ ایمان ایمان نہیں رہتا۔ ایک مخفی امر کو عقل سے سوچکر قرائن ملاکر مان لینے کا نام ایمان ہے۔ ان لوگوں کی عقل موٹی ہے۔ ایسے نشان طلب کرتے ہیں جو کہ عادت اللہ کے خلاف ہیں۔ ہم یہ پیش کرتے ہیں کہ جو سچا مذہب ہوتا ہے اس میں امتیاز ہوتا ہے جس قدر تائیدات اور خوارق خدا تعالیٰ نے اسلام کی تائید میں رکھے ہیں۔ وہ کسی دوسرے مذہب کے لیے ہرگز نہیں ہیں۔ مگر یہ ان امور میں مقابلہ چاہتے ہیں جو کہ عادت اللہ کے خلاف ہیں۔ دوسرے خدا غلام نہیں ہے کہ کسی کے تابع ہو بلکہ وہ خدا کے تابع ہیں۔

فیصلہ کا آسان طریق

ہم نے اُن سے یہ چاہا ہے کہ اس طرح سے فیصلہ کرلو کہ ہزاروں اعتراض جو تم لوگ کرتے ہو ان میں سے دو اعتراض چُن لو اگر وہ سچے نکل آویں تو باقی تمہارے سب سچے اور اگر وہ جھوٹے نکل آویں تو باقی سب جھوٹے۔ مگر ان لوگوں کو موت کا خوف نہیں۔ اگر عقل ہو تو لازم ہے کہ وہ اسلام کے سوائے کوئی سچا پاک مذہب دکھلاویں۔ اور طلاق کی نسبت اعتراض ہے ہم کہتے ہیں کہ اچھا آج تک جس قدر طلاق اسلام میں ہوئی ہیں ان کی فہرست ہم سے لو اور جس قدر نیوگ تم میں ہو اس کی فہرست ہمیں دو۔

مدارات اور مداہنہ میں فرق

فرمایا کہ مدارات اسے کہتے ہیں کہ نرمی سے گفتگو کی جاوے تاکہ دوسرے کے ذہن نشین ہو اور حق کا اس طرح اظہار کرنا کہ ایک کلمہ بھی باقی نہ رہے اور سب ادا ہو جاوے اور مداہنہ اسے کہتے ہیں کہ ڈر کر حق کو چھپا لینا۔ کھا لینا۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ نرمی سے گفتگو کرکے پھر گرمی پر آجاتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ حق کو پورا پُورا ادا کرنے کے واسطے ایک ہنر چاہیئے۔ وہ شخص بہت بہادر ہے جو کہ ایسی خوبی سے حق کو بیان کرے کہ بڑے غصہ والے آدمی بھی سُن لیویں۔ خدا ایسوں پر راضی ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حق گو سے لوگ راضی نہ ہوں اگرچہ وہ نرمی بھی کرے مگر تاہم درمیان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اچھا کہنے لگتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ صفحہ ۷۵، ۷۶ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء)

۱۷؍مارچ ۱۹۰۳ء

قبل ازعشاء

معجزہ شق القمر کی شہادت ہندوستان میں

پنڈت نند کشور صاحب سے معجزات پر گفتگو ہوئی۔ پنڈت صاحب نے معجزہ شق القمر کی نسبت کہا کہ بھوج سوانح ایک کتاب سنسکرت میں ہے مجھ سے پنڈتوں نے بیان کیا ہے کہ اس میں شق القمر کی شہادت راجہ بھوج سے ہے کہ وہ اپنے محل پر تھا یکایک اس نے چاند کو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پنڈتوں کو بُلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ چاند اس طرح پھٹا۔ راجہ نے خیال کیا کہ کوئی عظیم الشان حادثہ ہوگا۔ پنڈتوں نے جواب دیا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پچھم کے دیس میں ایک مہاتما پیدا ہوا ہے وہ بہت یوگی ہے اس نے اپنے یوگ بھاش سے چاند کو ایسا کر دیا ہے تب راجہ نے اُسے تحفہ تحائف ارسال کئے۔

تفسیرِ قرآن کا طریق

قرآن کی تفسیر کے متعلق فرمایا کہ

خدا کے کلام کے صحیح معنی تب سمجھ میں آتے ہیں کہ اس کے تمام رشتہ کی سمجھ ہو جیسے قرآن شریف کی نسبت ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ اس کے سوا جو اَور کلام ہوگا وہ تو اپنا کلام ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض وقت ایک آیت کے معنے کرنے کے وقت دو سَو آیتیں شامل ہوتی ہیں۔ ایجادی معنے کرنے والوں کا منہ اس سے بند ہو جاتا ہے۔ (البدر جلد دوم نمبر ۱۰ صفحہ ۷۷ مورخہ ۲۷؍مارچ ۱۹۰۳ء)

۱۸؍مارچ ۱۹۰۳ء

(مجلس قبل ازعشاء)

بعد مغرب گرمی محسوس کر کے حضرت اقدس نے اپنے احباب سے مشورہ کیا کہ اب موسم بدلا ہوا ہے۔ اس لیے اگر مناسب ہو تو اُوپر چل بیٹھیں چنانچہ احباب نے اس سے اتفاق کیا اور اسی وقت تمام احباب اور حضرت اقدس بالائی منزل میں تشریف لے گئے۔

شہ نشین پر بیٹھ کر ابوسعید صاحب سے فرمایا کہ

اگر آپ چلے گئے ہوتے تو اُوپر کا جلسہ کیسے دیکھتے اور یہ کہاں نصیب ہونا تھا۔

اسی اثناء میں نواب صاحب تشریف لائے۔ حضرت نے فرمایا:-

مدت کے بعد آج پھر نواب صاحب کا چہرہ نظر آیا ہے۔ آگے تو ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جا بیٹھا کرتے اور اندھیرے میں چہرہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

فراغت

بیٹھے بیٹھے آپ نے فرمایا کہ :-

جیسے ایک مرض ہوتی ہے کہ اس میں جب تک ٹکیاں مارتے رہیں تو آرام رہتا ہے، اسی طرح فراغت میرے واسطے مرض ہے ایک دن بھی فارغ رہوں تو بے چین ہو جاتا ہوں اس لیے ایک کتاب شروع کر دی ہے جس کا نام "حقیقتِ دُعا" رکھا ہے ایک رسالہ کی طرز پر لکھا ہے۔

دُعا

دعا ایسی شے ہے کہ جب آدمؑ کا شیطان سے جنگ ہوا تو اس وقت سوائے دُعا کے اور کوئی حربہ کام نہ آیا۔ آخر شیطان پر آدمؑ نے فتح بذریعہ دُعا پائی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (سورۃ الاعراف : ۲۴)

اور آخر میں بھی دجال کے مارنے کے واسطے دُعا ہی رکھی ہے۔ گویا اوّل بھی دعا اور آخر بھی دعا ہی دعا ہے حالت موجودہ بھی یہی چاہتی ہے۔ تمام اسلامی طاقتیں کمزور ہیں۔ اور ان موجودہ اسلحہ سے وہ کیا کام کر سکتی ہیں؟ اب اس کفر وغیرہ پر غالب آنے کے واسطے اسلحہ کی ضرورت بھی نہیں۔ آسمانی حربہ کی ضرورت ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ صفحہ ۷۷ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۱۹ مارچ ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

حضور نے شہ نشین پر جلوہ گر ہو کر فرمایا کہ :-

آج طبیعت نہایت علیل تھی کہ اٹھنے کی طاقت نہیں ہوئی۔ اسی لیے ظہر و عصر کے اوقات میں نہ آسکا۔

چند ایک دریدہ دہن آریوں کے بیباکانہ اعتراض پر فرمایا کہ :-

یہ گندہ زبانی سے باز نہیں آتے ہم بھی ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ؎

گر نباشد بدست راہ بردن ٭ شرط عشق است در طلب مُردن

جب انسان کے دل میں مَیل ہوتا ہے تو ایک فرشتے کو بھی میلا سمجھ لیتا ہے۔

ایک رؤیا

فرمایا کہ

آج مَیں نے ایک خواب دیکھا جیسے آنکھ کے آگے ایک نظارہ گذر جاتا ہے۔ دیکھتا ہوں

کرو وسنڈھوں کے سرجسم سے الگ کٹے ہوئے ہاتھوں میں ہیں۔ ایک ایک ہاتھ میں اور دوسرا دوسرے ہاتھ میں۔

اسلام کی حالت کا علاج دُعا ہے

جس حالت میں اب اسلام ہے۔ اس کا علاج اب سوائے دُعا کے اَور کیا ہو سکتا ہے۔ لوگ جہاد جہاد کہتے ہیں مگر اس وقت تو جہاد حرام ہے اس لیے خدا نے مجھے دُعاؤں میں وہ جوش دیا ہے۔ جیسے سمندر میں ایک جوش ہوتا ہے۔ چونکہ توحید کے لیے دُعا کا جوش دل میں ڈالا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ الٰہی بھی یہی ہے جیسا کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) اس کا وعدہ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء

بیعت کا مدعا سچّی توبہ ہے

بعد نماز جمعہ چند آدمیوں نے بیعت کی اور بعد بیعت حضرت اقدس نے ان کو خطاب کر کے فرمایا:

اصل مدعا بیعت کا یہی ہے کہ توبہ کرو۔ استغفار کرو۔ نمازوں کو درست کر کے پڑھو۔ ناجائز کاموں سے بچو۔ مَیں جماعت کے لیے دُعا کرتا رہتا ہوں مگر جماعت کو بھی چاہیئے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو پاک کرے۔

یاد رکھو غفلت کا گناہ پشیمانی کے گناہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ گناہ زہریلا اور قاتل ہوتا ہے۔ توبہ کرنے والا تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ جس کو معلوم ہی نہیں کہ مَیں کیا کر رہا ہوں وہ بہت خطرناک حالت میں ہے۔ پس ضرورت ہے کہ غفلت کو چھوڑ دو اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ جو شخص توبہ کر کے اپنی حالت کو درست کرلیگا وہ دوسروں کے مقابلہ میں بچایا جائے گا۔ پس دُعا اسی کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جو خود بھی اپنی اصلاح کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے سچے تعلق کو قائم کرتا ہے۔ پیغمبر کسی کے لیے اگر شفاعت کرے لیکن وہ شخص جس کی شفاعت کی گئی ہے اپنی اصلاح نہ کرے اور غفلت کی زندگی سے نہ نکلے تو وہ شفاعت اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔[۱]

---

[۱] البدر میں اس کی مزید تشریح یوں درج ہے:

"دیکھو کہ نوح کا بیٹا ہلاک ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہلاک ہوئے۔ اُنکو ایمان نصیب نہ ہوا۔ اسی طرح موسیٰؑ کا چچازاد بھائی تھا۔ اس کو کچھ فائدہ موسیٰؑ کے رشتہ سے نہ ہوا۔

دعا تو ہم کرتے ہیں مگر جب تک انسان خود سیدھا نہ ہو دعا شفاعتی فائدہ نہیں کرتی اگر انسان رحمت کے مقام سے خود ہی بھاگے تو رحمت اُسے کہاں کہاں تلاش کریگی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

جب تک خود خدا تعالیٰ کی رحمت کے مقام پر کھڑا ہو تو دُعا بھی اس کو فائدہ پہنچاتی ہے نرا اسباب پر بھروسہ نہ کرلو کہ بیعت کرلی ہے اللہ تعالیٰ لفظی بیعتوں کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جیسے بیعت کے وقت توبہ کرتے ہو اس توبہ پر قائم رہو اور ہر روز نئی توجہ پیدا کرو جو اس کے استحکام کا موجب ہو۔ اللہ تعالیٰ پناہ ڈھونڈھنے والوں کو پناہ دیتا ہے۔ جو لوگ خدا کی طرف آتے ہیں وہ ان کو ضائع نہیں کرتا۔

اس بات کو خوب سمجھ لو کہ جب پورا خوف دامنگیر ہو اور جان کندن کی سی حالت ہو گئی۔ اس وقت کی توبہ، توبہ نہیں۔ جب بَلا نازل ہو گئی پھر اس کا ردّ کرنا اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ تم بَلا کے نزول سے پہلے فکر کرو۔ جو بَلا کے نزول سے پہلے ڈرتا ہے وہ عاقبت بین اور باریک بین ہوتا ہے اور بَلا کے آجانے کے وقت تو کافر بھی ڈرتے ہیں۔

مَیں نے سُنا ہے بعض گاؤں میں جہاں طاعون کی شدت ہوئی ہندوؤں نے مسلمانوں کو بُلا کر اپنے گھروں میں اذانیں دلوائی ہیں وہی اذان جس سے پہلے اُن کو پرہیز تھا۔[1] جو مومن غرض کے لیے خدا سے نہیں ڈرتا خدا اُس سے خوف کو دُور کر دیتا ہے مگر جس کے دروازہ پر بَلا نازل ہو جاوے تو وہ خواہ نخواہ اس سے ڈریگا۔

بہت دُعائیں کرتے رہو تاکہ ان بلاؤں سے نجات ہو اور خاتمہ بالخیر ہو۔ عملی نمونہ کے سوا بیہودہ قیل قال فائدہ[2] نہیں دیتی اور جیسے یہ ضروری ہے کہ ڈر کے سامانوں سے پہلے ڈرنا چاہیئے۔ یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ ڈر کے سامان قریب ہوں تو ڈر جاؤ اور جب وہ دُور چلے جاویں تو بیباک ہو جاؤ بلکہ تمہاری زندگی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھری ہوئی ہو خواہ مصیبت کے سامان ہوں یا نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ مقتدر ہے وہ جب چاہتا ہے مصیبت کا دروازہ کھول دیتا ہے اور جب چاہتا ہے کشائش کرتا ہے جو بھی اس پر بھروسہ کرتا ہے وہ بچایا جاتا ہے۔ ڈرنے والا اور نہ ڈرنے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے اللہ تعالیٰ ان دونوں میں ایک فرق رکھ دیتا ہے۔

پس ہماری جماعت کو چاہیئے کہ وہ سچّی توبہ کریں اور گناہ سے بچیں۔ جو بیعت کر کے پھر گناہ سے نہیں بچتا وہ

---

[1] البدر میں اس کی مزید تشریح ہے۔ لکھا ہے:۔
"جیسے آجکل سُنا گیا ہے کہ ہندو اور سکھ لوگ طاعون کے ڈر سے مسلمانوں کو بُلا بُلا کر اپنے گھروں میں بانگ دلواتے ہیں مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ غرض کے وقت یہ لوگ نرم ہو جاتے ہیں جب غرض نکل گئی پھر ویسے ہی سخت قلب ہو گئے۔ مومن کی یہ حالت نہ چاہیئے بلکہ اُسے خدا سے صدق اور وفا سے دُعا کرنی چاہیئے۔ اگر طاعون نہ بھی ہو تب بھی وہ خدا سے ایسا ہی ڈرے جیسے ہزار طاعون ہو۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۱)

[2] البدر سے:۔
"ہر وقت اس سے ڈرنا چاہیئے۔ کیا اسے قہر بھیجتے کچھ دیر لگتی ہے؟" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۲)

گویا جھوٹا اقرار کرتا ہے[1]۔ اور یہ میرا ہاتھ نہیں خدا کا ہاتھ ہے جس پر وہ ایسا جھوٹ بولتا ہے اور پھر خدا کے ہاتھ پر جھوٹ بول کر کہاں جاوے گا؟

کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۔ (الصف: ۴) مقت خدا کے غضب کو کہتے ہیں یعنی بڑا غضب اُن پر ہوتا ہے جو اقرار کرتے ہیں اور پھر کرتے نہیں۔ ایسے آدمی پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے اس لیے دُعائیں کرتے رہو۔ کوئی ثابت قدم نہیں رہ سکتا جب تک خدا نہ رکھے۔

(الحکم جلد ۷، نمبر ۱۱ صفحہ ۷ - ۸ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۱۲ مارچ ۱۹۰۳ء

بوقت سیر

کسی خاص شخص کی ہدایت کیلئے دُعا

کسی خاص شخص کی ہدایت پر زور دینے کے بارے میں فرمایا کہ:-

ایک فردِ واحد پر ہدایت کے لیے زور دینا ٹھیک نہیں ہوتا اور نہ اس طرح کبھی انبیاء کو کامیابی ہوئی ہے عام دُعا چاہیئے پھر جو لائق ہوتا ہے وہ اس سے خود بخود متاثر ہوتا ہے۔

حقیقتِ توبہ

توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ سے کلی طور پر بیزار ہو کر خدا کی طرف رجوع کرے اور سچے طور سے یہ عہد ہو کہ موت تک پھر گناہ نہ کروں گا۔ ایسی توبہ پر خدا کا وعدہ ہے کہ میں بخش دوں گا۔ اگرچہ یہ توبہ دوسرے دن ہی ٹوٹ جاوے مگر بات یہ ہے کہ کرنے والے کا اس وقت عزم مصمم ہو اور اس کے دل میں ٹوٹی ہوئی نہ ہو۔

ایک توبہ انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور ایک خدا کی طرف سے۔ خدا کی توبہ کے معنے رجوع کے ہیں کیونکہ اسکا نام تواب ہے۔ انسان توبہ کرتا ہے تو گناہ سے نیکی کی طرف آتا ہے اور جب خدا توبہ کرتا ہے تو وہ رحمت سے اُسکی طرف آتا ہے اور اس انسان کو لغزش سے سنبھال لیتا ہے جب اس قسم کی خدا کی توبہ ہو تو پھر لغزش نہیں ہوتی۔ حدیث میں ہے کہ انسان توبہ کرتا ہے پھر اس سے ٹوٹ جاتی ہے اور قضاء وقدر غالب آتی ہے پھر وہ روتا ہے گڑگڑاتا ہے پھر توبہ کرتا ہے مگر پھر ٹوٹ جاتی ہے اور وہ بار بار تضرع کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے پھر آخر کار جب انتہاء تک اس کی تضرع اور

---

[1] (البدر سے) "بیعت کی بنیاد یہی ہے کہ سچی توبہ ہو اور گناہ چھوٹ جاویں اگر یہ نہ ہو تو بیعت خود گناہ ہوگی"
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۲)

انتہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر خدا توبہ کرتا ہے یعنی اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے اِعۡمَلۡ مَاشِئۡتَ اِنِّیۡ غَفَرۡتُ لَکَ۔ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اب اس کی فطرت ایسی بدل دی گئی ہے کہ گناہ نہ ہو سکے گا جیسے کسی بدکار کا آلہ تناسل کاٹ دیا جاوے تو پھر وہ کیا بدکاری کر سکیگا یا آنکھیں نکال دی جائیں تو وہ کیا بدنظری کرے گا۔ اسی طرح خدا سرشت بدل دیتا ہے اور بالکل پاکیزہ فطرت بنا دیتا ہے۔ بدریں جب صحابہ کرامؓ نے جان لڑائی تو ان کی اس ہمت اور اخلاص کو دیکھ کر خدا نے اُن کو بخش دیا۔ اُن کے دلوں کو صاف کر دیا کہ پھر گناہ ہو ہی نہ سکے۔ یہ بھی ایک درجہ ہے جب فطرت بدل جاتی ہے تو وہ خدا کی رضا کے برخلاف کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اگر انسان سے گناہ نہ ہوں اور وہ توبہ نہ کرے تو خدا اُن کو ہلاک کرکے ایک ایسی قوم پیدا کرے جو گناہ کرے اور پھر خدا اُن کو بخشے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر خدا کی صفت غفوریت کیسے کام کرے گی۔

گناہ توبہ کیساتھ ملکر تریاق بنتا ہے

گناہ ایک مہلک زہر مثل سم الفار وسٹرکنیا وغیرہ کے ہیں مگر توبہ کے ساتھ مل کر یہ تریاق کا حکم رکھتے ہیں۔

انسان کے اندر رعونت پیدا ہو جاتی ہے پھر گناہ سے کسرِ نفس پیدا ہو جاتی ہے جیسے زہر کو زہر مارتی ہے ایسا ہی رعونت وغیرہ کی زہر کو گناہ مارتا ہے۔ حضرت آدم کے ساتھ جو ذلت آئی اس کے بھی یہی معنے ہیں ورنہ اس کے اندر تکبر پیدا ہوتا کہ میں وہ ہوں جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور ملائکہ نے سجدہ کیا مگر اس خطا سے وہ شرمسار ہوئے اور اس تکبر کی نوبت ہی نہ آئی۔ پھر اس شرمساری سے سارے گناہ معاف ہوئے اسی طرح بعض سادات آج کل فخر کرتے ہیں مگر نسبی دعویٰ کیا شئے ہے؛ اس سے رعونت پیدا ہوتی ہے۔ ہر ایک تکبر زہرِ قاتل ہوتا ہے اسے کسی نہ کسی طرح مارنا چاہیئے۔

آدم کی جنّت

سوال ہوا کہ آدم کی جنّت کہاں تھی فرمایا:۔

ہمارا مذہب یہی ہے کہ زمین میں ہی تھی فرماتا ہے مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَ فِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ۔ آدم کی بود و باش آسمان پر یہ بات بالکل غلط ہے۔

شجرِ ممنوعہ

شجر کی نسبت سوال ہوا کہ وہ کونسا درخت تھا جسکی ممانعت کی گئی تھی۔ فرمایا کہ:۔

مفسروں نے کئی باتیں لکھی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ انگور ہوگا۔ شراب اس سے پیدا ہوتی ہے اور شراب کی نسبت لکھا ہے رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت کا انگور ایسا ہی ہو کہ بغیر سڑانے گلانے کے اس کے تازہ شیرہ میں نشہ ہوتا ہو جیسے تاڑی کہ ذرا سی دیر کے بعد اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تمباکو

تمباکو کی نسبت فرمایا کہ:۔

یہ شراب کی طرح تو نہیں ہے کہ اس سے انسان کو فسق و فجور کی طرف رغبت ہو مگر تاہم

تقویٰ یہی ہے کہ اس سے نفرت اور پرہیز کرے۔ مُنہ میں اس سے بدبُو آتی ہے اور منحوس صورت ہے کہ انسان دھوئاں اندر داخل کرے اور پھر باہر نکالے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت یہ ہوتا تو آپ اجازت نہ دیتے کہ اسے استعمال کیا جاوے۔ ایک لغو اور بیہودہ حرکت ہے ہاں مسکرات میں اسے شامل نہیں کر سکتے۔ اگر علاج کے طور پر ضرورت ہو تو منع نہیں ہے ورنہ یونہی مال کو بیجا صرف کرنا ہے۔ عمدہ تندرست وہ آدمی ہے جو کسی شئے کے سہارے زندگی بسر نہیں کرتا ہے۔ انگریز بھی چاہتے ہیں کہ اسے دُور کر دیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۲ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

دربارِ شام

نومبایعین کو نصیحت

چند نو وارد شخصوں نے بیعت کی۔ بعد از بیعت فرمایا:۔

دیکھو بیعت تو تمہاری ہو چکی۔ تمہیں چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ خدا کا قہر سخت ہوتا ہے۔ اگرچہ دُنیا کا عذاب بھی سخت اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ مگر تاہم جس طرح ہوتا ہے اچھے بُرے دن گذر جاتے ہیں مگر آخرت کا عذاب تو ناپیدا کنار ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس کے واسطے کافی سامان کیا جاوے۔

ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ جو شخص آتا ہے اور بیعت کرتا ہے ہم پر فرض ہوتا ہے کہ اُسے کرنے اور نہ کرنے کے کاموں سے آگاہ کریں۔ جیسا بے خبر آیا تھا ویسا ہی بے خبر واپس نہ جاوے ایسا ہونے سے معصیت کا خوف ہے کہ اُسے کیوں نہ بتایا گیا، سو تم سوچ لو کہ مقدّم امر دین ہی کا ہے۔ دنیا کے دن تو کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتے ہیں۔

شبِ تنور گذشت وشبِ سمور گذشت

غرباء اور مساکین بھی جن کو کھانے کو ایک وقت ملتا ہے اور دوسرے وقت نہیں ملتا اور آرام کے مکان بھی نہیں ہوتے ان کی بھی گذر ہی جاتی ہے اور اُمراء اور پلاؤ زردے کھانے والے اور عمدہ مکانوں اور بالاخانوں میں رہنے والے بھی اپنے دن پُورے کر ہی رہے ہیں کسی کا دکھ درد سے اور کسی کا عیش میں گذارہ ہوتا ہے مگر عاقبت کا دُکھ جھیلنا بہت مشکل ہے اور وہ عذاب اور اس کے دُکھ درد ناقابلِ برداشت ہوں گے لہٰذا دانا وہی ہے کہ جو اس ہمیشہ رہنے والے جہان کی فکر میں لگ جاوے۔

حقیقتِ نماز

سو تم نمازوں کو سنوارو اور خدا تعالیٰ کے احکام کو اس کے فرمودہ کے بموجب کرو۔ اس کی نواہی سے بچے رہو اس کے ذکر اور یاد میں لگے رہو دعا کا سلسلہ ہر وقت جاری رکھو اپنی نماز میں جہاں جہاں رکوع وسجود میں دعا کا موقعہ ہے دعا کرو اور غفلت کی نماز کو ترک کر دو رسمی نماز کچھ ثمرات مترتب نہیں لاتی اور نہ وہ قبولیت کے لائق ہے۔ نماز وہی ہے کہ کھڑے ہونے سے سلام پھیرنے

کے وقت تک پورے خشوع خضوع اور حضور قلب سے ادا کی جاوے اور عاجزی اور فروتنی اور انکساری اور گریہ زاری سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس طرح سے ادا کی جاوے کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو ہو کہ وہی تم کو دیکھ رہا ہے۔ اس طرح کمال ادب اور محبّت اور خوف سے بھری ہوئی نماز ادا کرو۔

بے وقت موتوں کا زمانہ

دیکھو یہ زمانہ بے وقت موتوں کا زمانہ آگیا ہے۔ بھلا پہلے کبھی تم نے اپنے باپ دادا سے بھی سُنا ہے کہ اس طرح اچانک موت کا سلسلہ کبھی جاری ہوا ہو۔ رات کو اچھا بھلا کام کاج کرتا اور چلتا پھرتا آدمی سوتا ہے اور صبح کو ایسی نیند میں سویا ہوا ہوتا ہے کہ جس سے جاگنا ہی نہیں۔ اب جس گھر میں یہ موت آئی گھر کا گھر اور گاؤں کے گاؤں اُس نے خالی کر دیئے ابھی انجام کی خبر نہیں۔ کیا کیا دن آنے ہیں۔ ایک نادان اپنی نادانی کی وجہ سے جب طاعون چند دن کے لیے رُک جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اکسی مصلحت سے اُسے بند کرتا ہے وہ کہتا ہے بس اب گئی اب نہیں آئے گی۔ ادمیاں! ایسا ہمیشہ ہی ہوا کرتا ہے کہ بیماریاں آتی ہیں چار دن رہ کر چلی جاتی ہیں مگر خدا کی باریک تدابیر سے وہ ناواقف ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ مہلت دیتا ہے کہ بھلا ابھی ان میں کچھ صلاحیت اور تقویٰ اور خوف بھی پیدا ہوا ہے یا نہیں۔

اس طاعون کا پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ ایک ایک دَورہ ستر ستر سال کا ہوا کرتا ہے۔ اس سے تو جنگل کے جانوروں نے بھی پناہ مانگی ہے جب انسانوں کو ختم کر چکتی ہے تو جنگل کے حیوانوں اور درندوں کو بھی ختم کر دیتی ہے، ایسے وقتوں میں خدا تعالیٰ بچا لیتا ہے ان لوگوں کو جو ان مصائب اور عذابوں کے نازل ہونے سے پہلے اپنے آپ کی اصلاح کرتے اور دوسروں سے عبرت پکڑتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی حفاظت خود کرتا ہے۔ عذابوں اور شدائد کے وقتوں میں جو آرام اور عیش کے وقت میں اس سے ڈرتے اور پناہ مانگتے ہیں۔ مگر جب عذاب کسی پر نازل ہو جاوے تب توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

اپنے آپکو درست کرلو

پس اب موقعہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو درست کر لو اور اس کے فرائض کی بجا آوری میں کمی نہ کرو۔ خلق اللہ سے کبھی بھی خیانت، ظلم۔ بد خلقی۔ ترش روئی ایذاء دہی سے پیش نہ آؤ۔ کسی کی حق تلفی نہ کرو کیونکہ ان چیزوں کے بدلے بھی خدا تعالیٰ مواخذہ کریگا۔ جس طرح خدا تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی۔ اس کی عظمت۔ توحید اور جلال کے خلاف کرنے اور اس سے شرک کرنا گناہ ہیں اسی طرح اس کی خلق سے ظلم کرنا۔ اُن کی حق تلفیاں نہ کرو۔ زبان یا ہاتھ سے دُکھ یا کسی قسم کی گالی گلوچ دینا بھی گناہ ہیں پس تم دونو طرح کے گناہوں سے پاک بنو اور نیکی کو بدی سے خلط ملط نہ کرو۔

تمہارا دین اسلام ہے

تمہارا دین اسلام ہے۔ اسلام کے معنے ہیں خدا کے آگے گردن رکھ دینا۔ جس طرح ایک بکرا ذبح کرنے کی خاطر منہ کے بل لٹایا جاتا ہے

اسی طرح تم بھی خدا کے احکام کی بجا آوری میں بے چون وچرا گردن رکھ دو جب تک کامل طور سے تم اپنے ارادوں سے خالی اور نفسانی ہوا و ہوس سے پاک نہ ہو جاؤ گے تب تک تمہارا اسلام اسلام نہیں ہے بہت ہیں کہ ہماری ان باتوں کو قصہ کہانی جانتے ہوں گے اور ٹھٹھے اور ہنسی سے ان کا ذکر کرتے ہوں گے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ اب آخری دن ہیں خدا تعالیٰ فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ لوگ بے حیائی۔ حیلہ بازی اور نفس پرستی میں حد سے زیادہ گذرے جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عظمت وجلال اور توحید کا ان کے دلوں میں ذرا بھی خیال نہیں گویا نا شک مٹ ہو گئے ہیں۔ کوئی کام بھی ان کا خدا کے لیے نہیں ہے۔

ایک مامور کی بعثت

پس ایسے وقت میں اس نے اپنے ایک خاص بندہ کو بھیجا ہے۔ تا اس کے ذریعہ سے دنیا میں ہدایت کا نور پھیلاوے اور گمشدہ ایمان اور توحید کو از سر نو دنیا میں قائم کرے۔ مگر جب دنیا نے اس کی پرواہ نہ کی اور الٹا دکھ دیا اور اس کی تکذیب کیلئے کمربستہ ہو گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کو قہر کی آگ سے ہلاک کرنا شروع کیا۔ کئی طرح کے عذابوں سے اس نے دنیا کو جگایا ہے کہیں قحط ہوئے اور کہیں زلزلے آئے۔ آتش فشانیاں ہوئیں۔ ہزار در ہزار لوگ تباہ ہوئے۔ انہیں میں سے ایک طاعون بھی ہے۔ یہ دور نہ ہو گی اور نہ جاوے گی جب تک یہ دنیا کو سیدھا نہ کرلے۔ لوگ تسلّی پا جاتے ہیں کہ بس اب گئی اب نہیں آوے گی مگر وہ دھوکا کھاتے ہیں۔ ان نادانوں کا تو کام ہی خدا سے جنگ کرنا ہو گیا ہے مگر وہ کہاں تک ؟ وہ دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ میں ضرور موجود ہوں اور ان کی بیباکیوں اور شرارتوں کو دور کرنا چاہتا ہوں مگر آہستہ آہستہ۔ اس کے تمام کام بتدریج ہوا کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ دنیا طرح طرح کے ظلم اور فسادوں سے بھر گئی اور خدا کا نام دنیا سے اٹھ گیا۔ اس کی توحید اور اس کی کتاب اور اس کے رسول کی ہتک کی گئی تو وہ ایسے وقت میں اپنے خاص رحم سے اپنی رحمت کا دروازہ کھولتا ہے اور اپنی خلقت کو ایک ایسے شخص کے سپرد کرتا ہے) جو اس کو خدا کے عذاب سے بچانے کے واسطے کوشش کرتا اور ان کا بڑا خیر خواہ ہوتا ہے مگر جب دنیا اسکی پروا نہیں کرتی اور بجائے اس کے کہ اس سے محبت کریں اس کو ستایا جاتا اور دکھ دیا جاتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اپنے غضب سے دنیا میں اپنا عذاب نازل کرتا ہے جو نافرمانوں کو آگ کی طرح بھسم کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی سلطنت کا رعب قائم کرتا اور صادق کی نصرت اور اس کے ہمراہیوں کو بطور نمونہ اس سے بچاتا ہے۔

توبہ کرو

پس اب یہ وقت ہے توبہ کرو۔ اگر عذاب آگیا تو پھر توبہ کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ توبہ میں بہت کچھ ہے۔ دیکھو جب کوئی بادشاہ کسی امر کے متعلق سمجھا دے کہ تم اس سے رک جاؤ تمہارا بھلا ہو گا تو اگر وہ شخص رک جاوے تو بہتر ورنہ پھر اس کا عذاب کیسا سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح پہلے چھوٹے چھوٹے عذابوں سے خدا تعالیٰ لوگوں کو سمجھوتیاں دیتا ہے کہ باز آجاؤ موقع ہے ورنہ پچھتاؤ گے مگر جب وہ نہیں

سمجھتے اور اس کی نافرمانی سے نہیں رُکتے تو پھر اس کا عذاب ایسا ہوتا ہے۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس: ۱۶)

صرف بیعت کافی نہیں

تم لوگوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے اسی پر بھروسہ نہ کر لینا۔ صرف اتنی ہی بات کافی نہیں۔ زبانی اقرار سے کچھ نہیں بنتا۔ جب تک عملی طور سے اس اقرار کی تصدیق نہ کرکے دکھلائی جاوے۔ یوں زبانی تو بہت سے خوشامدی لوگ بھی اقرار کرلیا کرتے ہیں مگر صادق وہی ہے جو عملی رنگ سے اس اقرار کا ثبوت دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نظر انسان کے دل پر پڑتی ہے۔ پس اب سے اقرار سچا کرلو اور دل کو اس اقرار میں زبان کے ساتھ شریک کرلو کہ جب تک قبر میں جاویں ہر قسم کے گناہ سے شرک وغیرہ سے بچیں گے۔

غرض حق اللہ اور حق العباد میں کوئی کمی یا سستی نہیں کریں گے۔ اس طرح سے خدا تعالیٰ تم کو ہر طرح کے عذابوں سے بچاویگا اور تمہاری نصرت ہر میدان میں کریگا۔ ظلم کو ترک کرو۔ خیانت حق تلفی اپنا شیوہ نہ بناؤ اور سب سے بڑا گناہ جو غفلت ہے اس سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ صفحہ ۹، ۱۰ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۲۲ مارچ ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

اسلام

مذہب کے مقابلے پر گفتگو فرماتے ہوئے آپؑ نے فرمایا کہ:۔

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنے اقبال کے ساتھ تمام مذاہب کو اپنے پیروں میں لے لیا ہوا ہے۔ اسلام ایسے ملک سے شروع ہوا جہاں لوگ درندوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور طرح طرح کی بداعمالیوں میں مبتلا تھے۔ ان کو حیوانیت سے انسانیت میں اسلام ہی لایا۔ ہر طرف اس کی مخالفت ہوئی لوگوں نے دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ پھر بھی وہ تمام کام پورے ہوکر رہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے اور کوئی فرد بشر بھی اس کا بال نہ بگاڑ سکا۔ حتی کہ ندا آگئی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ: ۴) (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۲ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

ہندوؤں سے گفتگو کا طریق

جیسے کہ بعض لوگوں کا دستور ہے کہ جب ہندو و مسلمانوں میں کوئی گفتگو ہو تو گاؤ خوری وغیرہ باتوں پر بحث ہوا کرتی ہے اس پر حضرت اقدس نے فرمایا۔ کہ بات یہ ہے کہ اصل اشیاء میں حِلّت ہے۔ اب دنیا میں کروڑہا اشیاء ہیں۔ کوئی کچھ کھاتا ہے اور کوئی کچھ۔ اس لیے ایسی باتوں میں پڑنا مناسب نہیں ہوا کرتا۔ چاہیئے کہ ایسے مباحثات میں ہمیشہ اسلام

کی خوبیاں اور صداقت بیان کی جاوے اور ظاہر کیا جاوے کہ کن کن نیک اعمال کی تعلیم اسلام نے دی ہے کن کن مہلکات سے بچایا ہے۔گاؤ خوری کے مسائل وغیرہ بیان کرنے سے کیا فائدہ ؟ جو اسلام کو پسند کریگا۔ وہ گاؤ خوری کو بھی پسند کریگا جس بات کا فساد اس کے نفع سے بڑھ کر ہو اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۲ و ۸۳ مورخہ ۳ر اپریل ۱۹۰۳ء)

۲۳ر مارچ ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ختم اور فاتحہ خوانی

ایک بزرگ نے عرض کی کہ حضور میں نے اپنی ملازمت سے پہلے یہ منّت مانی تھی کہ جب میں ملازم ہو جاؤں گا تو آدھ آنہ فی روپیہ کے حساب سے نکال کر اس کا کھانا پکوا کر حضرت پیران پیر کا ختم دلاؤں گا۔ اس کے متعلق حضور کیا فرماتے ہیں ؟ فرمایا کہ :-

خیرات تو ہر طرح اور ہر رنگ میں جائز ہے اور جسے چاہے انسان دے مگر اس فاتحہ خوانی سے ہمیں نہیں معلوم کیا فائدہ ؟ اور یہ کیوں کیا جاتا ہے ؟ میرے خیال میں یہ جو ہمارے ملک میں رسم جاری ہے کہ اس پر کچھ قرآن شریف وغیرہ پڑھا کرتے ہیں یہ طریق تو شرک ہے اور اس کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے نہیں غرباء و مساکین کو بے شک کھانا کھلاؤ۔

نصیحت بعد از بیعت

چند احباب نے بیعت کی تھی اس پر ان کو چند کلمات بطور نصیحت فرمائے :-

پانچوں نمازیں عمدہ طرح سے پڑھا کرو۔ روزہ صدق سے رکھو اور اگر صاحب توفیق ہو۔ تو زکوٰۃ۔ حج وغیرہ اعمال میں بھی کمر بستہ رہو اور ہر قسم کے گُناہ سے اور شرک اور بدعت سے بیزار رہو۔ اصل میں گناہ کی شناخت کے اصول صرف دو ہی ہیں۔

اوّل - حق اللہ کی بجا آوری میں کمی یا کوتاہی - دوم - حق العباد کا خیال نہ کرنا۔

اصل اصول عبادت بھی یہی ہیں کہ ان دونو حقوں کی محافظت کما حقہٗ کی جاوے اور گناہ بھی انہیں میں کوتاہی کرنے کا نام ہے۔ اپنے عہد پر قائم رہو اور جو الفاظ اس وقت تم نے میرے ہاتھ پر بطور اقرار زبان سے نکالے ہیں۔ ان پر مرتے دم تک قائم رہو۔ انسان بعض اوقات دھوکہ کھاتا ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے اپنے لیے توبہ کا

درخت بو لیا ہے اب اُس کے پھل کی اُمید رکھتا ہے یا ایمان میں نے حاصل کر لیا ہے۔ اس کے اب نتائج مترتب ہونے کا منتظر ہوتا ہے مگر اصل میں وہ خدا کے نزدیک نہ تائب اور نہ سچا مومن۔ کچھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ جو چیز اللہ تعالےٰ کی پسندیدگی اور منظوری کی حد تک نہ پہنچی ہوئی ہو وہ چیز اس کی نظر میں ردی اور حقیر ہوتی ہے۔ اس کی کوئی قدر و قیمت خدا تعالیٰ کے نزدیک نہیں ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان جب کسی چیز کے خریدنے کا ارادہ کرتا ہے جب تک کوئی چیز اس کی پسندیدگی میں نہ آوے تب تک اس کی نظر میں ایک ردی محض اور بے قیمت ہوتی ہے تو جب انسان کا یہ حال ہے تو خدا تو قدوس اور پاک اور بے لوث ہستی ہے۔ وہ ایسی ردی چیز کو اپنی جناب میں کب منظور کرنے لگا؟

دیکھو یہ دن ابتلاء کے دن ہیں۔ وبائیں ہیں۔ قحط ہے۔ غرض اس وقت خدا تعالیٰ کا غضب زمین پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسے وقت میں اپنے آپ کو دھوکا مت دو اور صاف دل سے اپنی کوئی پناہ بنالو۔

یہ بیعت اور توبہ اس وقت فائدہ دیتی ہے جب انسان صدقِ دل اور اخلاصِ نیت سے اس پر قائم اور کاربند بھی ہو جاوے۔ خدا تعالیٰ خشک لفاظی سے جو حلق کے نیچے نہیں جاتی ہرگز ہرگز خوش نہیں ہوتا۔ ایسے بنو کہ تمہارا صدق اور وفا اور سوز و گداز آسمان پر پہنچ جاوے۔ خدا تعالیٰ ایسے شخص کی حفاظت کرتا اور اس کو برکت دیتا ہے۔ جس کو دیکھتا ہے کہ اس کا سینہ صدق اور محبت سے بھرا ہوا ہے وہ دلوں پر نظر ڈالتا اور جھانکتا ہے نہ کہ ظاہری قیل و قال پر۔ جس کا دل ہر قسم کے گند اور ناپاکی سے معرا اور مبرا پاتا ہے اس میں آ اُترتا ہے اور اپنا گھر بناتا ہے مگر جس دل میں کوئی کسی قسم کا بھی رخنہ یا ناپاکی ہے اس کو لعنتی بناتا ہے۔

دیکھو جس طرح تمہارے عام جسمانی حوائج کے پورا کرنے کے واسطے ایک مناسب اور کافی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح تمہاری روحانی حوائج کا حال ہے۔ کیا تم ایک قطرہ پانی زبان پر رکھ کر پیاس بجھا سکتے ہو؟ کیا تم ایک ریزہ کھانے کا مُنہ میں ڈال کر بھوک سے نجات حاصل کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ پس اسی طرح تمہاری رُوحانی حالت معمولی سی توبہ یا کبھی کبھی ٹوٹی پھوٹی نماز یا روزہ سے سنور نہیں سکتی۔ رُوحانی حالت کے سنوارنے اور اس باغ کے پھل کھانے کیلئے بھی تم کو چاہیئے کہ اس باغ کو وقت پر خدا کی جناب میں نمازیں ادا کر کے اپنی آنکھوں کا پانی پہنچاؤ اور اعمالِ صالحہ کے پانی کی نہر سے اس باغ کو سیراب کرو تا وہ ہرا بھرا ہو اور پھلے پھولے اور اس قابل ہو سکے کہ تم اس سے پھل کھاؤ۔

ایمان اور اعمالِ صالحہ

یاد رکھو ایمان بغیر اعمالِ صالحہ کے اُدھورا ایمان ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اگر ایمان کامل ہو تو اعمالِ صالحہ سرزد نہ ہوں؟ اپنے ایمان اور اعتقاد کو کامل کرو ورنہ کسی کام کا نہ ہوگا۔ لوگ اپنے ایمان کو پورا ایمان تو بناتے نہیں پھر شکایت کرتے ہیں کہ ہمیں انعامات نہیں ملتے جن کا وعدہ تھا۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ

مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ (الطلاق : ۳، ۴) یعنی جو خدا کا متقی اور اس کی نظر میں متقی بنتا ہے اسکو خدا تعالیٰ ہر ایک قسم کی تنگی سے نکالتا اور ایسی طرز سے رزق دیتا ہے کہ اُسے گمان بھی نہیں ہوتا کہ کہاں سے اور کیونکر آتا ہے خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ برحق ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے وعدوں کا پورا کرنے والا اور بڑا رحیم کریم ہے جو اللہ تعالیٰ کا بنتا ہے وہ اُسے ہر ذلت سے نجات دیتا اور خود اس کا حافظ و ناصر بن جاتا ہے مگر وہ جو ایک طرف دعویٰ اتقا کرتے ہیں اور دوسری طرف شاکی ہوتے ہیں کہ ہمیں وہ برکات نہیں ملے۔ ان دونوں سے ہم کس کو سچا کہیں اور کس کو جھوٹا؟ خدا تعالیٰ پر ہم کبھی الزام نہیں لگا سکتے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (اٰل عمران: ۱۰) خُدا تعالیٰ اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا۔ ہم اس مدعی کو جھوٹا کہیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اُن کا تقویٰ یا اُن کی اصلاح اس حد تک نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ کی نظر میں قابلِ وقعت ہو یا وہ خدا کے متقی نہیں ہوتے لوگوں کے متقی اور ریاکار انسان ہوتے ہیں۔ سو اُن پر بجائے رحمت اور برکت کے لعنت کی مار ہوتی ہے جس سے سرگرداں اور مشکلاتِ دنیا میں مبتلا رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ متقی کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ وہ اپنے وعدوں کا پکا اور سچا اور پورا ہے۔

متقین کیلئے رزق

رزق بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی تو ایک رزق ہے کہ بعض لوگ صبح سے شام تک ٹوکری ڈھوتے ہیں اور بُرے حال سے شام کو دو تین آنے اُن کے ہاتھ میں آتے ہیں۔ یہ بھی تو رزق ہے مگر لعنتی رزق ہے[1] نہ رزق مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ۔

حضرت داؤد زبور میں فرماتے ہیں کہ مَیں بچہ تھا جوان ہوا۔ جوانی سے اب بڑھاپا آیا۔ مگر مَیں نے کبھی کسی متقی اور خدا ترس کو بھیک مانگتے نہ دیکھا اور نہ اس کی اولاد کو دربدر دھکے کھاتے اور ٹکڑے مانگتے دیکھا۔

یہ بالکل سچ اور راست ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرتا اور اُن کو دوسرے کے آگے ہاتھ پسارنے سے محفوظ رکھتا ہے بھلا اتنے جو انبیاء ہوئے ہیں اولیاء گذرے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ بھیک مانگا کرتے تھے؟ یا اُن کی اولاد پر یہ مصیبت پڑی ہو کہ وہ دربدر خاک بسر ٹکڑے کے واسطے پھرتے ہوں؟ ہرگز نہیں۔ میرا تو اعتقاد ہے کہ ایک آدمی باخدا اور سچا متقی ہو تو اُس کی سات پشت تک بھی خدا رحمت اور برکت کا ہاتھ رکھتا اور اُن کی خود حفاظت فرماتا ہے۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ایک ذکر کیا ہے کہ ایک دیوار دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ وہ گرنے والی تھی اس کے نیچے خزانہ تھا۔ لڑکے ابھی نابالغ تھے۔ اس دیوار کے گرنے سے اندیشہ تھا کہ خزانہ ننگا ہو کر لوگوں کے ہاتھ

---

[1] (البدر سے) "کیا یہ بھی رزق ہے جو کہ کس قدر ذلت سے حاصل ہوتا ہے"۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۳ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

آجائے گا۔ وہ لڑکے بیچارے خالی ہاتھ رہ جاویں گے تو اللہ تعالیٰ نے دو نبیوں کو اس خدمت کے واسطے مقرر فرمایا وہ گئے اور اس دیوار کو درست کر دیا کہ جب وہ بڑے ہوں تو پھر کسی طرح اُن کے ہاتھ وہ خزانہ آجاوے۔ پس اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا (الکھف ۸۳) یعنی ان لڑکوں کا باپ نیک مرد تھا۔ جسکے واسطے ہم نے ان کے خزانہ کی حفاظت کی۔ اللہ تعالیٰ کے ایسا فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکے کچھ اچھے نہ تھے اور نہ اچھے ہونے والے تھے۔ ورنہ یہ فرماتا کہ یہ اچھے لڑکے ہیں صالح ہیں اور صالح ہونے والے ہیں نہیں بلکہ اُنکے باپ کا ہی حوالہ دیا کہ اُن کے باپ کی نیکی کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے۔ دیکھو یہی تو شفاعت ہے۔

حقیقی متقی بنو

وہ لوگ جو بڑے بڑے ادعا کرتے ہیں کہ ہم یوں نیکی کرتے ہیں اور متقی ہیں مگر انکے یہ دعوے قرآن شریف کے مطابق نہیں ہوتے اور نہ اس کسوٹی پر صادق ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ فرماتا ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف: ۱۹۷) اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (الانفال: ۳۵)

تو اس وقت افسوس سے ہمیں ان لوگوں کی ہی حالت پر رحم آتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اصل سبب اس کا یہ ہے کہ ان کا صدق و وفا اور اخلاص خدا کے نزدیک اس درجہ کا نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کے شرک سے قابل نفرت ہوگیا ہوا ہوتا ہے۔ ایمان کم ہوتا ہے اور لافیں زیادہ ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ بار بار فرماتا ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب: ۶۳) بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو وعدہ خلاف یا جھوٹا کہیں اور اس کی نسبت الزام کا خیال بھی کریں۔ اصل میں ایسے لوگوں کا ایمان ناکارہ ہوتا ہے جو لعنت کے مورد ہوتے ہیں نہ رحمت کے۔ وہ اصل میں خدا تعالیٰ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔ بھلا خلق نے تو دھوکا کھا بھی لیا مگر وہ جس کی نظر اندرون در اندرون پہنچتی ہے وہ کسی کے دھوکا میں آسکتا ہے۔

انبیاء کے نقش قدم پر چلو

انسان کو چاہیئے کہ ساری کمندوں کو جلا دے اور صرف محبت الٰہی ہی کی کمند کو باقی رہنے دے۔ خدا نے بہت سے نمونے پیش کئے ہیں۔ آدمؑ سے لیکر نوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام تک کل انبیاء اسی نمونہ کی خاطر ہی تو اُس نے بھیجے ہیں تا لوگ اُن کے نقش قدم پر چلیں جس طرح وہ خُدا تک پہنچے اسی طرح اور

ؔ۱ (البدر میں ہے) "خدا نے اپنے ان دو بندوں کو وہاں بھیجا کہ اس دیوار کی مرمت کریں تاکہ جب وہ جوان ہوں تو اس خزانہ کو نکال کر استعمال کریں کیا وجہ تھی کہ خدا نے ایسے دو عظیم الشان آدمیوں کو وہاں بھیجا۔ اس کی وجہ یہی تھی وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔ یعنی ان کا باپ نیکوکار تھا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۳ مورخہ ۳ راپریل ۱۹۰۳ء)

ؔ۲ (البدر سے) "جب تک انسان اپنا ایمان اُس حد تک نہیں پہنچاتا کہ سُنّت سے فائدہ اُٹھاوے تو خدا تعالیٰ کیسے اس کے لیے سُنّت بدل دیوے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۳ مورخہ ۳ راپریل ۱۹۰۳ء)

بھی کوشش کریں۔ سچ ہے کہ جو خدا کا ہو جاتا ہے خدا اُس کا ہو جاتا ہے۔
یاد رکھو کہ ایسا نہ ہو کہ تم اپنے اعمال سے ساری جماعت کو بدنام کرو۔ شیخ سعدی صاحب فرماتے ہیں :۔

بدنام کنندۂ نکو نامے چند

بلکہ ایسے بنو کہ تا تم پر خدا تعالیٰ کی برکات اور اس کی رحمت کے آثار نازل ہوں۔ وہ عمروں کو بڑھا بھی سکتا ہے مگر ایک وہ شخص جس کا عمر پانے سے مقصد صرف ورلی دُنیا ہی کے لذائذ اور حظوظ ہیں اس کی عمر کیا فائدہ بخش ہو سکتی ہے؟ اس میں تو خدا کا حصہ کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنی عمر کا مقصد صرف عمدہ کھانے کھانے اور نیند بھر کے سونے اور بیوی بچوں اور عمدہ مکان کے یا گھوڑے وغیرہ رکھنے یا عمدہ باغات یا فصل پر ہی ختم کرتا ہے۔ وہ تو صرف اپنے پیٹ کا بندہ اور شکم کا عابد ہے۔ اس نے تو اپنا مقصد و مطلوب اور معبود صرف خواہشات نفسانی اور لذائذ حیوانی ہی کو بنایا ہوا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے انسان کے سلسلہ پیدائش کی علت غائی صرف اپنی عبادت رکھی ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات : ۵۷) پس حصر کر دیا ہے کہ صرف صرف عبادت الٰہی مقصد ہونا چاہیئے اور صرف اسی کے لیے یہ سارا کارخانہ بنایا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اَور ہی اَور ارادے اور اَور ہی اَور خواہشات ہیں۔
بھلا سوچو تو سہی کہ ایک شخص ایک شخص کو بھیجتا ہے کہ میرے باغ کی حفاظت کر۔ اس کی آب پاشی اور شاخ تراشی سے اُسے عمدہ طور کا بنا اور عمدہ عمدہ پھول بیل بُوٹے لگا۔ کہ وہ ہرا بھرا ہو جاوے۔ شاداب اور سرسبز ہو جاوے مگر بجائے اس کے وہ شخص آتے ہی جتنے عمدہ عمدہ پھل پھول اس میں لگے ہوئے تھے اُن کو کاٹ کر ضائع کر دے یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے فروخت کر لے اور ناجائز دست اندازی سے باغ کو ویران کر دے تو بتاؤ کہ وہ مالک جب آوے گا تو اس سے کیسا سلوک کریگا؟

انسان کی پیدائش کا مقصد

خدا نے تو اسے بھیجا تھا کہ عبادت کرے اور حق اللہ اور حق العباد کو بجا لاوے مگر یہ آتے ہی بیویوں میں مشغول، بچوں میں محو اور اپنے لذائذ کا بندہ بن گیا اور اس اصل مقصد کو بالکل بھول ہی گیا بتاؤ اس کا خدا کے سامنے کیا جواب ہوگا؟ دُنیا کے یہ سامان اور یہ بیوی بچے اور کھانے پینے تو اللہ تعالیٰ نے صرف بطور بھاڑہ کے بنائے تھے جس طرح ایک یکہ بان چند کوس تک ٹٹو سے کام لیکر جب سمجھتا ہے کہ وہ تھک گیا ہے اُسے کچھ نہاری اور پانی وغیرہ دیتا ہے اور کچھ مالش کرتا ہے تا اس کی تھکان کا کچھ علاج ہو جاوے اور آگے چلنے کے قابل ہو اور درماندہ ہو کر کہیں آدھ میں ہی نہ رہ جائے اس سہارے کے لیے اُسے نہاری دیتا ہے۔ سو یہ دنیوی آرام اور عیش اور بیوی بچے اور کھانے کی خوراکیں بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھاڑے مقرر کئے ہیں کہ تا وہ تھک کر اور درماندہ ہو کر بھوک سے پیاس سے مر نہ جاوے اور اس کے قویٰ کے تحلیل ہونے کی تلافی مافات ہوتی جاوے۔ پس یہ چیزیں اس حد تک جائز ہیں کہ انسان

کو اس کی عبادت اور حق اللہ اور حق العباد کے پورا کرنے میں مدد دیں۔ ورنہ اس حد سے آگے نکل کر وہ حیوانوں کی طرح صرف پیٹ کا بندہ اور شکم کا عابد بنا کر مشرک بناتی ہیں اور وہ اسلام کے خلاف ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است ٭ تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

مگر اب کروڑوں مسلمان ہیں کہ انہوں نے عمدہ عمدہ کھانے کھانا۔ عمدہ عمدہ مکانات بنانا۔ اعلیٰ درجہ کے عہدوں پر ہونا ہی اسلام سمجھ رکھا ہے۔ مومن شخص کا کام ہے کہ پہلے اپنی زندگی کا مقصد اصلی معلوم کرے اور پھر اس کے مطابق کام کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (الفرقان: ۷۸) خدا کو تمہاری پروا ہی کیا ہے۔ اگر تم اس کی عبادت نہ کرو اور اس سے دعائیں نہ مانگو۔ یہ آیت بھی اصل میں پہلی آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۷) ہی کی شرح ہے جب خدا تعالیٰ کا ارادہ انسانی خلقت سے صرف عبادت ہے تو مومن کی شان نہیں کہ کسی دوسری چیز کو عین مقصود بنا لے حقوقِ نفس تو جائز ہیں مگر نفس کی بے اعتدالیاں جائز نہیں۔ حقوقِ نفس بھی اس لیے جائز ہیں کہ تا وہ درماندہ ہو کر رہ ہی نہ جائے۔ تم بھی ان چیزوں کو اسی واسطے کام میں لاؤ۔ ان سے کام اس واسطے لو کہ یہ تمہیں عبادت کے لائق بنائے رکھیں نہ اس لیے کہ وہی تمہارا مقصود اصلی ہوں۔

قرآن شریف تو موت وارد کرنا چاہتا ہے کھانا پینا صرف جسم کے سہارے کے واسطے ہوں۔ انسانی بدن ہر وقت چونکہ معرضِ تحلیل میں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے جائز رکھا کہ اس کے قویٰ کی بحالی اور قیام کے لیے یہ چیزیں استعمال کی جاویں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کے شارح ہیں۔ آپ ایک موقعہ پر بڑے گھبرائے ہوئے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کہا کہ اے عائشہ ہمیں آرام پہنچاؤ۔ اور اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے آدم کے ساتھ حوا کو بھی بنا دیا تا وہ اس کے واسطے ضرورت کے وقت سہارے کا موجب ہو۔[1]

غرض یہ باتیں ہیں جو اُن پر عمل کرنا اور اُن کو خوب یاد رکھنا ضروری ہے اور سب پر پوری طرح سے قائم ہونا چاہیے۔ دیکھو ایک طبیب جب نسخہ لکھ کر دیتا ہے تو اس کی پوری تعمیل کرنی چاہیئے ورنہ فائدہ سے ہاتھ دھونے چاہئیں۔ ایک شخص اگر بجائے اس نسخہ کے تحریر کردہ امور کے اس کاغذ ہی کو دھو دھو کر پئے تو اسے فائدہ کی اُمید ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ پس اسی طرح تم بھی ہماری ہر ایک بات پر قائم رہو۔ جھوٹی اور خشک محبت کام نہیں آتی بلکہ تعلیم پر پوری طرح سے عمل کرنا ہی کارآمد ہو گا۔ خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا ہے وہ بڑا رحیم و کریم اور

---

[1] البدر سے:۔ عورتوں کو پیدا کرنے میں سِر یہی ہے کہ خدا کی راہ میں نفس کی قربانی کے واسطے جو ایک کوفت پیدا ہوتی ہے یہ اس کا سہارا ہو جاویں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۴)

ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے مگر وہ دغاباز کو بھی خوب جانتا ہے۔

قبولیت آسمان سے ہی نازل ہوتی ہے

تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ ایک شخص چاہتا تھا کہ وہ لوگوں کی نظر میں بڑا قابلِ اعتماد بنے اور لوگ اُسے نمازی اور روزہ دار اور بڑا پاکباز کہیں اور اسی نیت سے وہ نماز لوگوں کے سامنے پڑھتا اور نیکی کے کام کرتا تھا۔ مگر وہ جس گلی میں جاتا اور جدھر اس کا گذر ہوتا تھا۔ لوگ اسے کہتے تھے کہ یہ دیکھو یہ شخص بڑا ریاکار ہے اور اپنے آپ کو لوگوں میں نیک مشہور کرنا چاہتا ہے۔ پھر آخرکار اس کے دل میں ایک دن خیال آیا کہ مَیں کیوں اپنی عاقبت کو برباد کرتا ہوں خدا جانے کس دن مر جاؤں گا کیوں اس لعنت کو اپنے لیے تیار کر رہا[1] ہوں اُس نے صاف دل ہو کر پورے صدق وصفا اور سچے دل سے توبہ کی اور اُس وقت سے نیت کر لی کہ مَیں سارے نیک اعمال لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کیا کروں گا اور کبھی کسی کے سامنے نہ کروں گا۔ چنانچہ اس نے ایسا کرنا شروع کر دیا اور یہ پاک تبدیلی اسکے دل میں بھر گئی۔ نہ صرف زبان تک ہی محدود رہی۔ پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو بظاہر ایسا بنا لیا کہ تارکِ صوم وصلوٰۃ ہے اور گندہ اور خراب آدمی ہے مگر اندرونی طور پر پوشیدہ اور نیک اعمال بجا لاتا تھا۔ پھر وہ جدھر جاتا اور جدھر اس کا گذر ہوتا تھا لوگ اور لڑکے اُسے کہتے تھے کہ دیکھو یہ شخص بڑا نیک اور پارسا ہے۔ یہ خدا کا پیارا اور اس کا برگزیدہ ہے۔

غرض اس سے یہ ہے کہ قبولیت اصل میں آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اولیاء اور نیک لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو پوشیدہ رکھا کرتے ہیں وہ اپنے صدق وصفا کو دوسروں پر ظاہر کرنا عیب جانتے ہیں۔ ہاں بعض ضروری امور کو جن کی اجازت شریعت نے دی ہے یا دوسروں کو تعلیم کے لیے اظہار بھی کیا کرتے ہیں۔

ریاء

نیکی جو صرف دکھانے کی غرض سے کی جاتی ہے وہ ایک لعنت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کے وجود کے ساتھ دوسروں کا وجود بالکل ہیچ جاننا چاہیئے دوسروں کے وجود کو ایک مُردہ کیڑا کی طرح خیال کرنا چاہیئے کیونکہ وہ کچھ کسی کا بگاڑ نہیں سکتے اور نہ سنوار سکتے ہیں۔ نیکی کو نیک لوگ اگر ہزار پردوں کے اندر بھی کریں تو خدا تعالیٰ نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ اسے ظاہر کر دیگا اور اسی طرح بدی کا حال ہے۔ بلکہ لکھا ہے کہ اگر کوئی عابد زاہد خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو اور اس صدق اور جوش کا جو اس کے دل میں ہے انتہا کے نقطہ تک اظہار کر رہا ہو اور اتفاقاً کنڈی لگانا بھول گیا ہو تو کوئی اجنبی باہر سے آکر اس کا دروازہ کھول دے تو اس کی حالت بالکل وہی ہوتی ہے جو ایک زانی کی عین زنا کے وقت پکڑا جانے سے۔ کیونکہ اصل غرض تو دونوں کی ایک ہی ہے یعنی اخفائے راز۔ اگرچہ رنگ الگ الگ ہیں۔ ایک نیکی کو اور دوسرا بدی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ غرض خدا کے

---

[1] البدر سے:۔ "میں نے خدا کی نماز ایک دفعہ بھی نہ پڑھی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۴)

بندوں کی حالت تو اُس نقطہ تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔نیک بھی چاہتے ہیں کہ ہماری نیکی پوشیدہ رہے اور بد بھی اپنی بدی کو پوشیدہ رکھنے کی دُعا کرتا ہے مگر اس امر میں دونو نیک و بد کی دعا قبول نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو قانون بنا رکھا ہے کہ وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ۔ (البقرۃ: ۷۳)

خدا تعالیٰ کی رضا میں فانی لوگ نہیں چاہتے کہ ان کو کوئی درجہ اور امامت دی جاوے۔وہ ان درجات کی نسبت گوشہ نشینی اور تنہا عبادت کے مزے لینے کو زیادہ پسند کرتے ہیں مگر اُن کو خدا تعالیٰ کشاں کشاں خلق کی بہتری کے لیے ظاہر کرتا اور مبعوث فرماتا ہے۔ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو غار میں ہی رہا کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کسی کو پتہ بھی ہو۔آخر خدا تعالیٰ نے اُن کو باہر نکالا اور دنیا کی ہدایت کا بار اُن کے سپرد کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہزاروں شاعر آتے اور آپ کی تعریف میں شعر کہتے تھے مگر لعنتی ہے وہ دل جو خیال کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی تعریفوں سے پھولتے تھے۔وہ اُن کو مُردہ کیڑے کی طرح خیال کرتے تھے۔مدح وہی ہوتی ہے جو خدا آسمان سے کرے۔یہ لوگ محبتِ ذاتی میں غرق ہوتے ہیں ان کو دنیا کی مدح و ثنا کی پروا نہیں ہوتی۔

تو یہ مقام ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ آسمان اور عرش سے ان کی تعریف اور مدح کرتا ہے۔

توفیق سب اللہ تعالیٰ کو ہی ہے

سُنو ہماری یہ باتیں اس واسطے نہیں کہ ہم کسی کے ایمان کو کچھ بڑھا سکتے ہیں یا کسی کے دل میں کچھ ڈال سکتے ہیں۔نہیں ہم کسی کے ایمان کو ایک جَو بھر بھی زیادہ نہیں کر سکتے[۱]ہم صرف اس واسطے کہتے ہیں کہ اتنے جمع ہو شاید ہے کہ کسی کے دل کو کوئی بات پکڑ لے اور اس کی اصلاح ہو جاوے۔توفیق تو سب اللہ تعالیٰ ہی کو ہے خدا تعالیٰ قادر ہے کہ کسی کے دل میں ایمان کی حقیقی جڑ لگا دے اور پھر اُسے اُس کے ثمرات کھلاوے یا کسی کو اس کی بدی کی وجہ سے قہر کی آگ سے ہلاک کرے پس دُعا ہی کرنی چاہیئے تا اس کی توفیق شاملِ انسان ہو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ صفحہ ۴ تا ۷ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء)

---

۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء

سیر میں آریہ مذہب کی نسبت فرمایا کہ

---

[۱] (البدر سے):۔ "سب توفیق خدا تعالیٰ سے ہے جب تک وہ نہ توفیق دے ہم ایک جَو تک نہیں بڑھا سکتے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۴ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

مذہب کی جڑ خدا شناسی ہے اور اس سے کمتر درجہ یہ کہ باہمی تعلق پاکیزگی کے ہوں سو یہ دونو باتیں گری ہوئی ہیں۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۸۹ مورخہ ۳ / اپریل ۱۹۰۳ء)

دربارِ شام

اسباب پر بھروسہ نہ کریں

طاعون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-
اصل میں لوگ اس کے حقیقی علاج کی طرف سے تو بالکل غافل ہیں اور اَور طرف ہاتھ پاؤں مارتے پھرتے ہیں مگر جب تک وہ اس کے اصل علاج کی طرف رجوع نہ کریں گے تب تک نجات کہاں؟ کوئی طبیبوں یا ڈاکٹروں کی طرف بھاگتا ہے اور کوئی ٹیکہ کے واسطے بازو پھیلاتا ہے کوئی نئے تجربہ اور نئی ایجاد کے درپے ہے۔ ہماری شریعت نے اگرچہ اسباب سے منع نہیں کیا بلکہ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ سے معلوم ہوتا ہے کہ دواؤں میں خدا تعالیٰ نے خواص شفاء مرض بھی رکھے ہوئے ہیں اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ دواؤں میں تاثیرات ہوتی ہیں اور امراض کے معالجات ہوا کرتے ہیں مگر ان اسباب پر بھروسہ کرلینا اور یہ گمان کرنا کہ انہیں کے ذریعہ سے نجات اور کامیابی ہو جاوے گی یہ سخت شرک اور کفر ہے۔ بھروسہ اسباب پر ہرگز نہ چاہیئے بلکہ یوں چاہیئے کہ اسباب کو مہیا کرکے پھر بھروسہ خدا تعالیٰ پر کرنا چاہیئے اور اگر وہ چاہے تو ان اسباب کو مفید بنا دے اور اُسی سے پھر بھی دُعا کرنی چاہیئے کیونکہ اسباب پر نتائج مرتب کرنا تو اُسی کا کام ہے اور یہی توکّل ہے۔

نماز کی اہمیت اور حقیقت

ایک شخص نے عرض کیا کہ حضور نماز کے متعلق ہمیں کیا حکم ہے۔ فرمایا :-

نماز ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم اسلام لائی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ہمیں نماز معاف فرمادی جاوے کیونکہ ہم کاروباری آدمی ہیں۔ مویشی وغیرہ کے سبب سے کپڑوں کا کوئی اعتماد نہیں ہوتا اور نہ ہمیں فرصت ہوتی ہے۔ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ دیکھو جب نماز نہیں تو ہے ہی کیا؟ وہ دین ہی نہیں جس میں نماز نہیں۔ نماز کیا ہے؟ یہی کہ اپنے عجز و نیاز اور کمزوریوں کو خدا کے سامنے پیش کرنا اور اسی سے اپنی حاجت روائی چاہنا۔ کبھی اس کی عظمت اور اسکے احکام کی بجا آوری کے واسطے دست بستہ کھڑا ہونا اور کبھی کمال مذلّت اور فروتنی سے اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ اس سے اپنی حاجات کا مانگنا، یہی نماز ہے۔ ایک سائل کی طرح کبھی اس مسئول کی تعریف کرنا کہ تُو ایسا ہے۔ اس کی عظمت اور جلال کا اظہار کرکے اس کی رحمت کو جنبش دلانا پھر اس سے مانگنا، پس جس دین میں یہ نہیں وہ دین ہی کیا ہے۔ انسان ہر وقت محتاج ہے اس سے اس کی رضا کی راہیں مانگتا رہے اور اس کے فضل کا اسی سے خواستگار ہو کیونکہ اسی کی دی ہوئی توفیق سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اے خدا ہم کو

توفیق دے کہ ہم تیرے ہو جائیں اور تیری رضا پر کاربند ہو کر تجھے راضی کریں۔ خدا تعالیٰ کی محبت اسی کا خوف، اسی کی یاد میں دل لگا رہنے کا نام نماز ہے اور یہی دین ہے۔

پھر جو شخص نماز ہی سے فراغت حاصل کرنی چاہتا ہے اس نے حیوانوں سے بڑھ کر کیا کیا؟ وہی کھانا پینا اور حیوانوں کی طرح سو رہنا۔ یہ تو دین ہرگز نہیں یہ سیرتِ کفار ہے بلکہ جو دم غافل وہ دم کافر والی بات بالکل راست اور صحیح ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے اُذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۳) یعنی اے میرے بندو تم مجھے یاد کیا کرو اور میری یاد میں مصروف رہا کرو میں بھی تم کو نہ بھولوں گا تمہارا خیال رکھوں گا اور میرا شکر کیا کرو اور میرے انعامات کی قدر کیا کرو اور کفر نہ کیا کرو۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کے ترک اور اس سے غفلت کا نام کفر ہے۔ پس جو دم غافل وہ دم کافر والی بات صاف ہے۔ یہ پانچ وقت تو خدا تعالیٰ نے بطور نمونہ کے مقرر فرمائے ہیں۔ ورنہ خدا کی یاد میں تو ہر وقت دل کو لگا رہنا چاہیئے۔ اور کبھی کسی وقت بھی غافل نہ ہونا چاہیئے۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت اسی کی یاد میں غرق ہونا بھی ایک ایسی صفت ہے کہ انسان اس سے انسان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ پر کسی طرح کی امید اور بھروسہ کرنے کا حق رکھ سکتا ہے۔

نماز خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے

اصل میں قاعدہ ہے کہ اگر انسان نے کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے تو اس کے واسطے چلنے کی ضرورت ہوتی ہے جتنی لمبی وہ منزل ہو گی اتنا ہی زیادہ تیزی کوشش اور محنت اور دیر تک اسے چلنا ہو گا۔ سو خدا تعالیٰ تک پہنچنا بھی تو ایک منزل ہے اور اس کا بُعد اور دُوری بھی لمبی۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے اور اس کے دربار میں پہنچنے کی خواہش رکھتا ہے اس کے واسطے نماز ایک گاڑی ہے جس پر سوار ہو کر وہ جلد تر پہنچ سکتا ہے۔ جس نے نماز ترک کر دی وہ کیا پہنچے گا۔

اصل میں مسلمانوں نے جب سے نماز کو ترک کیا یا اُسے دل کی تسکین آرام اور محبت سے اس کی حقیقت سے غافل ہو کر پڑھنا ترک کیا ہے تب ہی سے اسلام کی حالت بھی معرض زوال میں آئی ہے وہ زمانہ جس میں نمازیں سنوار کر پڑھی جاتی تھیں غور سے دیکھ لو کہ اسلام کے واسطے کیسا تھا۔ ایک دفعہ تو اسلام نے تمام دنیا کو زیر پا کر دیا تھا جب سے اُسے ترک کیا وہ خود متروک ہو گئے ہیں۔ درد دل سے پڑھی ہوئی نماز ہی ہے کہ تمام مشکلات سے انسان کو نکال لیتی ہے۔ ہمارا بارہا کا تجربہ ہے کہ اکثر کسی مشکل کے وقت دعا کی جاتی ہے ابھی نماز میں ہی ہوتے ہیں کہ خدا نے اس امر کو حل اور آسان کر دیا ہوا ہوتا ہے۔

نماز میں کیا ہوتا ہے یہی کہ عرض کرتا ہے۔ التجا کے ہاتھ بڑھاتا ہے اور دوسرا اس کی غرض کو اچھی طرح سُنتا

ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ جو سُنتا تھا وہ بولتا ہے اور گذارش کرنے والے کو جواب دیتا ہے۔ نمازی کا یہی حال ہے خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کو اپنے مصائب اور حوائج سناتا ہے۔ پھر آخر سچی اور حقیقی نماز کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک وقت جلد آجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے جواب کے واسطے بولتا اور اس کو جواب دیکر تسلی دیتا ہے۔ بھلا یہ بجز حقیقی نماز کے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور پھر جن کا خدا ہی ایسا نہیں وہ بھی گئے گذرے ہیں۔ اُن کا کیا دین اور کیا ایمان ہے۔ وہ کس اُمید پر اپنے اوقات ضائع کرتے ہیں۔

اسلام کے عروج وزوال کے حقیقی اسباب

ہمارے زمانہ میں جو سوال پیش ہوا کہ کیا وجوہات ہیں جن سے اسلام کو زوال آیا اور پھر وہ کیا ذریعے ہیں جن سے اس کی ترقی کی راہ نکل سکتی ہے۔ اس کے مختلف قسم کے لوگوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق جواب دیئے ہیں مگر سچا جواب یہی ہے کہ قرآن کو ترک کرنے سے تنزل آیا اور اسی کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے سے ہی انکی حالت سنور جاوے گی۔ موجودہ زمانہ میں جو اُن کو اپنے خونی مہدی اور مسیح کی آمد کی اُمید اور شوق ہے کہ وہ آتے ہی اُن کو سلطنت لے دیگا اور کفار تباہ ہوں گے یہ اُن کے خام خیال اور وسوسے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ خدا نے جس طرح ابتداء میں دعا کے ذریعہ سے شیطان کو آدم کے زیر کیا تھا اسی طرح اب آخری زمانہ میں بھی دعا ہی کے ذریعہ سے غلبہ اور تسلط عطا کرے گا نہ تلوار سے۔ ہر ایک امر کے لیے کچھ آثار ہوتے ہیں اور اس سے پہلے تمہیدیں ہوتی ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ بھلا اگر ان کے خیال کے موافق یہ زمانہ اُن کے دن پلٹنے کا ہی تھا اور مسیح نے آکر ان کو سلطنت دلانی تھی تو چاہیئے تھا کہ ظاہری طاقت ان میں جمع ہونے لگتی۔ ہتھیار ان کے پاس زیادہ رہتے۔ فتوحات کا سلسلہ اُن کے واسطے کھولا جاتا۔ مگر یہاں تو بالکل ہی برعکس نظر آتا ہے۔ ہتھیار ان کے ایجاد نہیں۔ ملک و دولت ہے تو اوروں کے ہاتھ ہے۔ ہمت و مردانگی ہے تو اوروں میں — یہ ہتھیاروں کے واسطے بھی دوسروں کے محتاج۔ دن بدن ذلت اور ادبار ان کے گرد ہے۔ جہاں دیکھو۔ جس میدان میں سُنو انہیں کو شکست ہے۔ بھلا کیا یہی آثار ہوا کرتے ہیں اقبال کے؟ ہرگز نہیں۔ یہ بھولے ہوئے ہیں۔ زمینی تلوار اور ہتھیاروں سے ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ابھی تو ان کی خود اپنی حالت ایسی ہے اور بیدینی اور لامذہبی کا رنگ ایسا آیا ہے کہ قابلِ عذاب اور موردِ قہر ہیں۔ پھر ایسوں کو کبھی تلوار ملی ہے؟ ہرگز نہیں۔ انکی ترقی کی وہی سچی راہ ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کی تعلیم کے مطابق بناویں اور دُعا میں لگ جاویں ان کو اب اگر مدد آوے گی تو آسمانی تلوار سے اور آسمانی حربہ سے نہ اپنی کوششوں سے اور دُعا ہی سے ان کی فتح ہے نہ قوت بازو سے۔ یہ اس لیے ہے کہ جس طرح ابتدا تھی انتہا بھی اسی طرح ہو۔ آدم اول کو فتح دُعا ہی سے ہوئی تھی۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا.... الخ (الاعراف: ۲۴) اور آدم ثانی کو بھی جو آخری زمانہ میں شیطان سے آخری جنگ کرنا

ہے اسی طرح دُعا ہی کے ذریعہ فتح ہو گی۔[1] (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ صفحہ ۷ - ۸ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء)

۲۵ مارچ ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ہمارا سب سے بڑا کام کسرِ صلیب ہے

حضرت اقدس نے جو حجرہ دعائیہ بنایا ہے۔ اس کی نسبت فرمایا کہ:۔

ہمارا سب سے بڑا کام تو کسرِ صلیب ہے اگر یہ کام ہو جاوے تو ہزاروں شبہات اور اعتراضات کا جواب خود بخود ہی ہو جاتا ہے اور اسی کے اُدھورا رہنے سے سینکڑوں اعتراضاف ہم پر وارد ہو سکتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ چالیس یا پچاس کتابیں لکھی ہیں مگر اُن سے ابھی وہ کام نہیں نکلا جس کے لیے ہم آئے ہیں۔ اصل میں ان لوگوں نے جس طرح قدم جمائے اور اپنا دام فریب پھیلایا ہے وہ ایسا نہیں کہ کسی انسانی طاقت سے درہم برہم ہو سکے۔ دانا آدمی جانتا ہے کہ اس قوم کا تختہ کس طرح پلٹا جا سکتا ہے۔ یہ کام بجُز خدائی ہاتھ کے انجام پذیر ہوتا نظر نہیں آتا اسی واسطے ہم نے ان ہتھیاروں یعنی قلم کو چھوڑ کر دعا کے واسطے یہ مکان (حجرہ) بنوایا ہے کیونکہ دُعا کا میدان خدا نے بڑا وسیع رکھا ہے اور اس کی قبولیت کا بھی اس نے وعدہ فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ مِنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ۔ (الانبیاء: ۹۷) اس امر کے اظہار کے واسطے کافی ہے کہ یہ کل دُنیا کی زمینی طاقتوں کو زیر پا کریں گے ورنہ اس کے سوا اور کیا معنے ہیں؟ کیا یہ قومیں دیواروں اور ٹیلوں کو کودتی پھاندتی پھریں گی؟ نہیں بلکہ اس کے یہی معنے ہیں کہ وہ دُنیا کی کُل ریاستوں اور سلطنتوں کو زیر پا کریں گی اور کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

فتح دُعا کے ذریعہ ہو گی

واقعات جس امر کی تفسیر کریں وہی تفسیر ٹھیک ہوا کرتی ہے۔ اس آیت کے معنے خدا تعالیٰ نے واقعات سے بتا دیئے ہیں انکے مقابلہ میں اگر کسی قسم کی سیفی قوت کی ضرورت ہوتی تو اب جیسے کہ بظاہر اسلامی دنیا کی امیدوں کے آخری دن ہیں چاہیئے تھا کہ اہلِ اسلام کی سیفی طاقت بڑھی ہوئی ہوتی اور اسلامی سلطنتیں تمام دنیا پر غلبہ پاتیں اور کوئی ان کے مقابل

---

[1] البدر میں ہے:۔ گائے وغیرہ کی حلت پر اور حرمت پر ذکر ہوا۔ فرمایا کہ:۔
”حرام کی تو تفصیل خدا نے دی ہے اور حلال کی کوئی تفصیل نہیں دی جس سے پتہ لگے کہ فلاں شئے ضرور کھاؤ سو اس لیے گائے کے ذبح وغیرہ کا ذکر کر کے ناحق موجب فساد ہونا مناسب نہیں ہوتا۔“
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۴ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء)

پڑھ نہ سکتا۔ مگر اب تو معاملہ اس کے برخلاف نظر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور تمہید یا عنوان کے یہ زمانہ ہے کہ ان کی فتح اور ان کا غلبہ دنیوی ہتھیاروں سے نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ اُن کے واسطے آسمانی طاقت کام کریگی جس کا ذریعہ دُعا ہے۔ غرضکہ ہم نے اس لیے سوچا کہ عمر کا اعتبار نہیں ہے۔ ساٹھ یا باسٹھ سال عمر سے گذر چکے ہیں۔ موت کا وقت مقرر نہیں۔ خدا جانے کس وقت آجاوے اور کام ہمارا ابھی بہت باقی پڑا ہے۔ ادھر قلم کی طاقت کمزور ثابت ہوئی ہے۔ رہی سَیف اس کے واسطے خدا تعالیٰ کا اذن اور منشاء نہیں ہے۔ لہٰذا ہم نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور اسی سے قوت پانے کے واسطے ایک الگ حجرہ بنایا اور خدا سے دُعا کی کہ اس مسجد البیت اور بیت الدعا کو امن اور سلامتی اور اعداء پر بذریعہ دلائل نیرہ اور براہین ساطعہ کے فتح کا گھر بنا۔

ہم نے دیکھا کہ اب ان مسلمانوں کی حالت تو خود موردِ عذاب اور شامتِ اعمال سے قہرِ الٰہی کے نزول کی محرک بنی ہوئی ہے اور خدا کی نصرت اور اُس کے فضل وکرم کی جاذب مطلق نہیں رہی۔ جب تک یہ خود نہ سنوریں تب تک خوشحالی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کا ان کو فکر نہیں ہے۔ خدا کے دین کے واسطے ذرا بھی سرگرمی نہیں۔ اس لیے خدا کے آگے دستِ دُعا پھیلانے کا قصد کر لیا ہے کہ وہ اس قوم کی اصلاح کرے اور شیطان کو ہلاک کرے تا کہ خدا کا سچا نُور دنیا پر دوبارہ چمک جاوے اور راستی کی عظمت پھیلے۔

بنی اسرائیل کی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ قوم فسق و فجور میں تباہ ہو جاتی اور اس کی توحید و جلال کو بالکل بھول جاتی تھی تو اُن کے انبیاء اسی طرح جنگلوں اور الگ مکانوں میں دست بدعا ہوتے تھے اور خدا کی رحمت کے تخت کو جنبش دیا کرتے تھے۔

دنیا کو علم نہیں ہے کہ آجکل عیسائی کیا کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی کس قدر ذریت کو انہوں نے برباد کیا ہے کسقدر خاندان اُنکے ہاتھوں نالاں ہیں گویا دُنیا کا تختہ بالکل پلٹ گیا ہے۔ اب خدا کی غیرت نے نہ چاہا کہ اس کی توحید اور جلال کی ہتک ہو اور اس کے رسول کی زیادہ بے عزتی کی جاوے۔ اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اپنے نُور کو اب روشن کرے اور سچائی اور حق کا غلبہ ہو سو اس نے مجھے بھیجا اور اب میرے دل میں تحریک پیدا کی کہ میں ایک حجرہ بیت الدعا صرف دُعا کے واسطے مقرر کروں اور بذریعہ دعا کے اس فساد پر غالب آؤں تا کہ اوّل آخر سے مطابق ہو جاوے اور جس طرح سے پہلے آدم کو دُعا ہی کے ذریعہ سے شیطان پر فتح نصیب ہوئی تھی اب آخری آدم کے مقابل پر آخری شیطان پر بھی بذریعہ دُعا کے فتح ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ صفحہ ۸۴ - ۸۵ مورخہ ۳ / اپریل ۱۹۰۳ء)

※ ※ ※

۲۶ مارچ ۱۹۰۳ء

بوقتِ سیر

رفع یدین

رفع یدین کے متعلق فرمایا کہ:-

اس میں چنداں حرج نہیں معلوم ہوتا، خواہ کوئی کرے یا نہ کرے احادیث میں بھی اس کا ذکر دونو طرح پر ہے اور وہابیوں اور سنّیوں کے طریق عمل سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ ایک تو رفع یدین کرتے ہیں اور ایک نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت رفع یدین کیا اور بعد ازاں ترک کر دیا۔

وتر

فرمایا کہ:-

اکیلا ایک وتر کہیں سے ثابت نہیں ہوتا۔ وتر ہمیشہ تین ہی پڑھنے چاہئیں۔ خواہ تینوں اکٹھے ہی پڑھ لیں خواہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر لیں پھر ایک رکعت الگ پڑھی جاوے۔

قبض و بسط

بابو نبی بخش صاحب احمدی کلرک لاہور نے عرض کی کہ بعض وقت تو دل میں خود بخود ایک ایسی تحریک پیدا ہوتی ہے کہ طبیعت عبادت کی طرف راغب ہوتی ہے اور قلب میں ایک عجیب فرحت اور سرور محسوس ہوتا ہے اور بعض وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ نفس پر جبر اور بوجھ ڈالنے سے بھی حلاوت پیدا نہیں ہوتی اور عبادت ایک بارگراں معلوم ہوتی ہے۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ:-

اسے قبض اور بسط کہتے ہیں۔ قبض اس حالت کا نام ہے جب کہ ایک غفلت کا پردہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے اور خدا کی طرف محبت کم ہوتی ہے اور طرح طرح کے فکر اور رنج اور غم اور اسباب دنیوی میں مشغول ہو جاتا ہے اور بسط اس کا نام ہے کہ انسان دنیا سے دل برداشتہ ہو کر خدا کی طرف رجوع کرے اور موت کو ہر وقت یاد رکھے۔ جب تک اس کو اپنی موت بخوبی یاد نہیں ہوتی وہ اس حالت تک نہیں پہنچ سکتا۔ موت تو ہر وقت قریب آتی جاتی ہے کوئی آدمی ایسا نہیں جس کے قریبی رشتہ دار فوت نہیں ہو چکے اور آجکل تو وبا سے گھر کے گھر صاف ہوتے جاتے ہیں اور موت کے لیے طبیعت پر زور دیکر سوچنے کی حاجت ہی نہیں رہی۔

یہ حالتیں قبض اور بسط کی اس شخص کو پیدا ہوتی ہیں جس کو موت یاد نہیں ہوتی۔ کیونکہ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ انسان قبض کی حالت میں ہوتا ہے اور ایک ناگہانی حادثہ پیش آجانے سے وہ حالتِ قبض معاً دُور ہو جاتی ہے جیسے کوئی زلزلہ آجاوے یا موت کا حادثہ ہو جاوے تو ساتھ ہی اس کا انشراح ہو جاتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبض اصل میں ایک عارضی شئے ہے جو کہ موت کو بہت یاد کرنے اور اللہ تعالیٰ کے

ساتھ سچا پیوست ہو جانے سے دُور ہو جاتی ہے اور پھر بسط کی حالت دائمی ہو جاتی ہے۔ عارفوں کو قبض کی حالت بہت کم ہوتی ہے نادان انسان سمجھتا ہے کہ دنیا بہت دیر رہنے کی جگہ ہے مَیں پھر نیکی کر لوں گا۔ اس واسطے غلطی کرتا ہے اور عارف سمجھتا ہے کہ آج کا دن جو ہے یہ غنیمت ہے۔ خدا معلوم کل زندگی ہے کہ نہیں۔

ایک رؤیا

مَیں اس مکان کی طرف سے مسجد کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ مَیں نے ایک شخص کو آتے ہوئے دیکھا جو کہ ایک سکھ کی طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح سے اکالئے اور کوکہ سکھ ہوتے ہیں اس کے ہاتھ میں ایک تیز خوفناک بڑا اور چوڑا چھُرا تھا اور اس چھُرے کا دستہ چھوٹا سا تھا وہ چھُرا بڑا ہی تیز معلوم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ لوگوں کو قتل کرتا پھرتا تھا۔ جہاں اس نے چھُرا رکھا اور گردن اُڑ گئی۔ کچھ اس طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح مَیں نے لیکھرام کے وقت میں ایک آدمی خواب میں دیکھا تھا اس کی صورت بڑی ڈراؤنی تھی اور بڑا ہی دہشتناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بھی اس سے خوف معلوم ہوا۔ اور مَیں نے اُس کی طرف جانا نہ چاہا۔ لیکن میرے پاؤں بہت بوجھل ہو گئے اور مَیں بڑا ہی زور لگا کر ادھر سے نکلا۔ لیکن اس نے میری مزاحمت نہ کی اور اگرچہ مجھ کو اس سے خوف معلوم ہوا لیکن اس نے مجھ کو کوئی تکلیف نہ دی اور پھر وہ خبر نہیں کہ کس طرف کو نکل گیا۔

ایک اَور رؤیا

ایک حنائی رنگ کا لکھا ہوا دو ورقہ کاغذ کچھ تھوڑے فاصلہ پر گِر پڑا ہے۔ مَیں نے ایک ہندو کو کہا کہ اس کو پکڑو۔ جب وہ پکڑنے لگا تو وہ کاغذ کچھ دُور آگے جا پڑا۔ پھر وہ ہندو اُٹھانے لگا تو وہ وہاں سے اُڑ کر اَور آگے جا پڑا لیکن وہ دو ورقہ اس طرح کچھ ترتیب سے کھُل کر اُڑتا رہا ہے کہ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کوئی جاندار چیز ہے۔ جب وہ کچھ فاصلہ تک چلا گیا تو وہ ہندو وہاں جا کر پھر اس کو پکڑنے لگا تب وہ دو ورقہ اُڑ کر میرے پاس آ گیا تو اس وقت میری زبان سے یہ کلمہ نکلا جس کا "تھا اس کے پاس آگیا"۔ پھر مَیں نے اس کو مخاطب ہو کر کہا کہ ہم وہ قوم ہیں جو رُوح القدس کے بُلائے بولتے ہیں ہم وہ قوم ہیں جن کے حق میں خدا نے فرمایا ہے۔ لَنَفۡخَنَّا فِیۡھِمۡ مِنۡ صِدۡقِنَا۔ اسلامی خدمات کسی دوسرے سے اللہ تعالیٰ لینا ہی نہیں چاہتا۔ شاید دوسرا اس میں کچھ غلطی بھی کرے۔ واللہ اعلم۔

جو شخص اسلام کے عقائد کا منافی ہے وہ اسلام کی تائید کیا کرے گا۔

سناتن دھرم میں اس طرح کے بھی آدمی ہوتے ہیں کہ وہ کسی فرقہ کے مکذّب نہیں ہوتے اور معمولی چیزوں کے آگے بھی ہاتھ جوڑتے پھرتے ہیں۔

خدا نہیں چاہتا کہ جو سلسلہ اُس نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے اس کا کوئی شریک ہو یہاں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا کاغذ ہمارے پاس آگیا۔ (البدر جلد دوم نمبر ۱۱ صفحہ ۸۵ مورخہ ۳ رِ اپریل ۱۹۰۳ء)

آیاتِ مُبین

میرے نزدیک آیاتِ مُبین وہ ہوتی ہیں مخالف جن کے مقابلہ سے عاجز ہوجائے خواہ وہ کچھ ہی ہو جس کا مخالف مقابلہ نہ کرسکے وہ اعجاز ٹھہر جائے گا جب کہ اس کی تحدی کی گئی ہو۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اقتراح کے نشانوں کو اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ نبی کبھی جرأت کرکے یہ نہیں کہیگا کہ تم جو نشان مجھ سے مانگو مَیں وہی دکھانے کو تیار ہوں۔ اس کے منہ سے جو نکلے گا یہی نکلے گا اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ۔ (الانعام: ۱۱۰) اور یہی اس کی صداقت کا نشان ہوتا ہے۔ کم نصیب مخالف اس قسم کی آیتوں سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ معجزات سے انکار کیا گیا ہے مگر وہ آنکھوں کے اندھے ہیں اُن کو معجزات کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوتی اس لیے وہ ایسے اعتراض کرتے ہیں اور نہ ذات باری کی عزت اور جبروت کا ادب اُن کے دل پر ہوتا ہے ہمارا خدا تعالیٰ پر کیا حق ہے کہ ہم جو کہیں وہی کردے۔ یہ سُوءِ ادب ہے۔ ایسا خدا خدا ہی نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ اس کا فضل ہے کہ اس نے ہم کو اُمید اور حوصلہ دلایا کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ٦١) یہ نہیں کہا کہ تم جو مانگو گے وہی دیا جائیگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بعض اقتراحی نشانات مانگے گئے تو آپ نے یہی خدا کی تعلیم سے جواب دیا۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۴)

خدا کے رسُول کبھی اپنی بشریت کی حد سے نہیں بڑھتے اور وہ آداب الٰہی کو مدّنظر رکھتے ہیں۔ یہ باتیں منحصر ہیں معرفت پر جس قدر معرفت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اسی قدر خدا تعالیٰ کا خوف اور خشیت دل پر مستولی ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر معرفتِ انبیاء علیہم السلام ہی کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی ہر بات اور ہر ادا میں بشریت کا رنگ جدا نظر آتا ہے اور تائیدات الٰہیہ الگ نظر آتی ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ نشان دکھاتا ہے، جب چاہتا ہے۔ وہ دنیا کو قیامت بنانا نہیں چاہتا۔ اگر وہ ایسا کھُلا ہوا ہو کہ جیسے سورج تو پھر ایمان کیا رہا؟ اور اس کا ثواب کیا؟ ایسی صورت میں کون بدبخت ہوگا جو انکار کریگا؟ نشان بیّن ہوتے ہیں مگر اُن کو باریک بین دیکھ سکتے ہیں اور کوئی نہیں اور یہ وقتِ نظر اور معرفت سعادت کی وجہ سے عطا ہوتی ہے اور تقویٰ سے ملتی ہے۔ شقی اور فاسق اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ ایمان اس وقت تک ایمان ہے جب تک اس میں کوئی پہلو اخفاء کا بھی ہو لیکن جب بالکل پردہ برانداز ہو تو وہ ایمان نہیں رہتا۔ اگر مُٹھی بند ہو اور کوئی بتادے کہ اس میں یہ ہے تو اس کی فراست قابلِ تعریف ہوسکتی ہے لیکن جب مٹھی کھول کر دکھا دی اور پھر کسی نے کہا کہ مَیں بتا دیتا ہوں تو کیا ہوا؟ یا پہلی رات کا چاند اگر کوئی دیکھ کر بتائے تو البتہ اُسے تیز نظر کہیں گے۔ لیکن جب چودھویں کا چاند ہوگیا اس وقت کوئی کہے کہ مَیں نے چاند دیکھ لیا وہ چڑھا ہوا ہے تو لوگ اس کو پاگل کہیں گے۔

معجزہ غرض معجزات وہی ہوتے ہیں جس کی نظیر لانے پر دوسرے عاجز ہوں۔ انسان کا یہ کام نہیں کہ وہ اُن کی حد بندی کرے کہ ایسا ہونا چاہیئے یا ویسا ہونا چاہیئے۔ اس میں ضرور ہے کہ بعض پہلو اخفا کے ہوں۔ کیونکہ نشانات کے ظاہر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایمان بڑھے اور اس میں ایک عرفانی رنگ پیدا ہو جس میں ذوق ملا ہوا ہو۔ لیکن جب ایسی کھلی بات ہو گی تو اس میں ایمانی رنگ ہی نہیں آسکتا پھر جائیکہ عرفانی اور ذوقی رنگ ہو۔ پس اقتراحی نشانات سے اس لیے منع کیا جاتا ہے اور روکا جاتا ہے کہ اس میں پہلی رگ سُوء ادبی کی پیدا ہو جاتی ہے جو ایمان کی جڑ کاٹ ڈالتی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ صفحہ ۳ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء)

نشانات کس سے صادر ہوتے ہیں

اس سوال کا جواب حضرت حجۃ اللہ علیہ السلام نے ایک بار اپنی ایک مختصر سی تقریر میں دیا ہے۔ فرمایا:۔

نشانات کس سے صادر ہوتے ہیں؟ جس کے اعمال بجائے خود خوارق کے درجہ تک پہنچ جائیں مثلاً ایک شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کرتا ہے وہ ایسی وفاداری کرے کہ اس کی وفا خارقِ عادت ہو جاوے۔ اس کی محبت اس کی عبادت خارقِ عادت ہو۔ ہر شخص ایثار کر سکتا ہے اور کرتا بھی ہے لیکن اس کا ایثار خارقِ عادت ہو۔ غرض اس کے اخلاق، عبادت اور سب تعلقات جو خدا تعالیٰ کے ساتھ رکھتا ہے۔ اپنے اندر ایک خارقِ عادت نمونہ پیدا کریں تو چونکہ خارقِ عادت کا جواب خارقِ عادت ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر نشانات ظاہر کرنے لگتا ہے۔ پس جو چاہتا ہے کہ اس سے نشانات کا صدور ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کو اس درجہ تک پہنچائے کہ اُن میں خارقِ عادت نتائج کے جذب کی قوت پیدا ہونے لگے۔ انبیاء علیہم السلام میں یہی ایک نرالی بات ہوتی ہے اور ان کا تعلق اندرونی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا شدید ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کا ہرگز نہیں ہوتا۔ ان کی عبودیت ایسا رشتہ دکھاتی ہے کہ کسی اور کی عبودیت نہیں دکھا سکتی۔ پس اس کے مقابلہ میں ربوبیت اپنی تجلی اور اظہار بھی اسی حیثیت اور ڈھنگ کا کرتی ہے۔ عبودیت کی مثال عورت کی سی ہوتی ہے کہ جیسے وہ حیا شرم کے ساتھ رہتی ہے اور مرد بیاہنے جاتا ہے تو وہ اعلانیہ جاتا ہے اسی طرح پر عبودیت پردۂ اخفا میں ہوتی ہے لیکن الوہیت جب اپنی تجلی کرتی ہے تو پھر وہ ایک بیّن امر ہو جاتا ہے اور ان تعلقات کا جو ایک سچے مومن اور عبد اور اس کے رب میں ہوتے ہیں خارقِ عادت نشانات کے ذریعہ ظہور ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا یہی راز ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ کل انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے تھے اس لیے آپ کے معجزات بھی سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ صفحہ ۴ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء)

۲۸ر مارچ ۱۹۰۳ء

انسان اور بہائم میں فرق

بچپن کی عمر کا ذکر ہوا۔ فرمایا کہ:۔
انسان کی فطرت میں یہ بات ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے بچوں میں عادت ہوتی ہے کہ جھوٹ بولتے ہیں۔ آپس میں گالی گلوچ ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ جُوں جُوں عمر میں وہ ترقی کرتے جاتے ہیں عقل اور فہم میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ انسان تزکیۂ نفس کی طرف آتا ہے۔

انسان کی بچپن کی حالت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ گائے بیل وغیرہ جانوروں ہی کی طرح انسان بھی پیدا ہوتا ہے۔ صرف انسان کی فطرت میں ایک نیک بات یہ ہوتی ہے کہ وہ بدی کو چھوڑ کر نیکی کو اختیار کرتا ہے اور یہ صفت انسان میں ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ بہائم میں تعلیم کا مادہ نہیں ہوتا۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک قصہ نظم میں لکھا ہے کہ ایک گدھے کو ایک بیوقوف تعلیم دیتا تھا اور اس پر شب و روز محنت کرتا۔ ایک حکیم نے اسے کہا کہ اے بیوقوف تو یہ کیا کرتا ہے؟ اور کیوں اپنا وقت اور مغز بے فائدہ گنواتا ہے؟ یعنی گدھا تو انسان نہ ہوگا تو بھی کہیں گدھا نہ بن جاوے۔

درحقیقت انسان میں کوئی ایسی الگ شئے نہیں ہے جو کہ اور جانوروں میں نہ ہو۔ عموماً سب صفات درجہ وار تمام مخلوق میں پائے جاتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ انسان اپنے اخلاق میں ترقی کرتا ہے اور حیوان نہیں کرتا۔

اخلاق کی حقیقت

دیکھو ارنڈ کا تیل اور کھانڈ کیسے غلیظ ہوتے ہیں لیکن جب خوب صاف کیا جاوے تو مصفّٰی ہو کر خوشنما ہو جاتے ہیں یہی حال اخلاق اور صفات کا ہے۔ اصل میں صفات کُل نیک ہوتے ہیں جب اُن کو بے موقعہ اور ناجائز طور پر استعمال کیا جاوے تو وہ بُرے ہو جاتے ہیں اور اُن کو گندہ کر دیا جاتا ہے لیکن جب ان ہی صفات کو افراط تفریط سے بچا کر محل اور موقعہ پر استعمال کیا جاوے تو ثواب کا موجب ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (الفلق: ۶) اور دوسری جگہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اب سبقت لے جانا بھی تو ایک قسم کا حسد ہی ہے۔ سبقت لے جانے والا کب چاہتا ہے کہ اس سے اَور کوئی آگے بڑھ جاوے۔ یہ صفت بچپن ہی سے انسان میں پائی جاتی ہے۔ اگر بچوں کو آگے بڑھنے کی خواہش نہ ہو تو وہ محنت نہیں کرتے اور کوشش کرنیوالے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ سابقون گویا حاسد ہی ہوتے ہیں لیکن اس جگہ حسد کا مادہ مصفّٰی ہو کر سابق ہو جاتا ہے اسی طرح حاسد ہی بہشت میں سبقت لے جاویں گے۔

اسی طرح سے غضب اگر موقعہ اور محل پر استعمال کیا جاوے تو وہ ایک صفت محمودہ ہے وہ انسان ہی کیا ہے جسے مستورات کی عصمت کی محافظت کے لیے بھی غضب نہ پیدا ہوتا ہو۔ حضرت عمرؓ میں غضب اور غصہ بہت تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد کسی نے آپ سے پوچھا کہ اب وہ غضب اور غصہ کہاں گیا؟ فرمایا کہ غضب تو اسی طرح میرے پاس ہے لیکن آگے بے محل اور بے موقعہ اور ظلم کے رنگ میں تھا اور اب محل اور موقعہ پر استعمال ہوتا ہے۔ اب انصاف کے رنگ میں ہے۔

صفات بدلتے نہیں ہیں ہاں ان میں اعتدال آجاتا ہے اسی طرح گلہ کرنا ناجائز ہے لیکن اُستاد یا ماں باپ اگر گلہ کریں تو وہ قابل مذمت نہیں کیونکہ مُرشد، اُستاد یا باپ اگر گلہ کرتے ہیں تو وہ اس کی ترقی کے لیے گلہ کرتے ہیں اور اس کے عیوب کو اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ عبرت ہو اور اس کے اعمال میں اصلاح ہو۔ ایسے ہی چوری بھی ایک بُری صفت ہے لیکن اگر اپنے دوستوں کی چیز بلا اجازت استعمال کرلی جاوے تو معیوب نہیں (بشرطیکہ دوست ہوں)۔

کمال دوستی کا ایک واقعہ

دو شخصوں میں باہمی دوستی کمال درجہ کی تھی اور ایک دوسرے کا محسن تھا۔ اتفاقاً ایک شخص سفر پر گیا۔ دوسرا اُس کے بعد اس کے گھر میں آیا اور اس کی کنیز سے دریافت کیا کہ میرا دوست کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ سفر کو گیا ہے پھر اُس نے پُوچھا کہ اس کے روپیہ والے صندوق کی چابی تیرے پاس ہے؟ کنیز نے کہا کہ میرے پاس ہے اُس نے کنیز سے وہ صندوق منگوا کر چابی لی اور خود کھول کر کچھ روپیہ اس میں سے لے گیا جب صاحب خانہ سفر سے واپس آیا تو کنیز نے کہا کہ آپ کا دوست گھر میں آیا تھا۔ یہ سن کر صاحب خانہ کا رنگ زرد ہوگیا اور اس نے پوچھا کہ کیا کہتا تھا؟ کنیز نے کہا کہ اُس نے مجھ سے صندوق اور چابی منگوا کر خود آپ کا روپیہ والا صندوق کھولا اور اس میں سے روپیہ نکال کر لے گیا۔ پھر تو وہ صاحب خانہ اس کنیز پر اس قدر خوش ہوا کہ بہت ہی پھُولا اور صرف اس صلہ میں کہ اس نے اُس کے دوست کا کہا مان لیا اُس کو ناراض نہیں کیا۔ اس کنیز کو اُس نے آزاد کر دیا اور کہا کہ اس نیک کام کے اجر میں جو کہ تجھ سے ہوا ہے میں آج ہی تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔

غرض جس قدر یہ جرائم ہیں جن کی نواہی کی شریعت میں تاکید ہے مثلاً گلہ نہ کرو، چوری نہ کرو وغیرہ وغیرہ یہ سب صفات بداستعمال کی وجہ سے خراب ہوگئے ہیں ورنہ حقیقتاً ان کا موقعہ اور محل پر استعمال درست اور انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔ عفو ایک موقعہ پر تو قابل استعمال ہوتا ہے اور بعض موقعہ پر قابل ترک۔ کیونکہ اگر کسی مجرم کو بار بار عفو ہی کر دیا جاوے تو وہ اور زیادہ بیباک ہوکر جرم کریگا۔ ایسے موقعہ پر اس سے انتقام لینا ہی عفو ہوتا ہے۔

انجیل کی غیر متوازن تعلیم

انجیل کی تعلیم میں جو کہ بعض جگہ زیادہ نرمی کی ہدایت ہے اس کا بھی یہی مقصود ہوگا کیونکہ وہ تو صرف یہود کے لیے ہے جو کہ سخت

سرکش اور ظالم طبع لوگ تھے۔ اس مسئلہ کو آج کل لوگوں نے خوب سمجھ لیا ہے۔ برہمو لوگوں نے بھی اس پر اعتراض کئے ہیں۔ مَیں نے ایک برہمو کی کتاب میں دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام عمر مار ہی کھاتے جانا اور ہمیشہ طمانچے کھانا بلکہ ایک گال زخمی کرا کر دوسری گال بھی پھیر دینا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہر قوم انسان اس پر عمل کب کر سکتا ہے اور نہ کسی سے آج تک اس طرح کے عفو پر عمل ہو سکا۔ انجیل کی اس تعلیم کے متبع عیسائی لوگ کبھی بھی اس مسئلہ پر عمل نہ کر سکے۔ آج کسی عیسائی کو ایک بات کہو جو کہ اس کی مرضی کے برخلاف ہو پھر دیکھو وہ کتنی سُناتا ہے اور عدالت کی طرف دوڑتا ہے کہ نہیں۔ بعض نادان عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی اس تعلیم سے یہ مقصود ہے کہ مار اور طمانچہ کھا کر عرضی ڈال دو اور عدالت سے چارہ جوئی کرو لیکن اتنا نہیں سوچتے۔ کہ اگر کسی نے ایک عیسائی کو طمانچہ مار کر اس کے دانت نکال دیئے پھر اس نے حسب حکم شریعت دوسری گال آگے کی اور اس نے ادھر کے بھی دانت نکال دیئے کیونکہ دشمن کا طمانچہ کوئی پیار کا طمانچہ تو نہ ہوگا۔ وہ تو تمام قوت سے طمانچہ مارے گا اور جب دونو طرف کے دانت نکل گئے تو پھر عدالت میں جانے سے وہ دانت کیا واپس لگ جاویں گے؟ اگر مجرم کو سزا بھی ہو گئی تو اس کو کیا ملے گا؟ جو ساری عمر کے لیے ایک نعمت سے محروم ہو کر عمدہ کھانے پینے بولنے کی لذات سے جاتا رہا۔

ایسے ہی اگر ایک بدکار کسی عیسائی کی عورت پر ناجائز حملہ کرنا چاہے تو وہ عیسائی اس وقت تو اس کا مزاحم نہ ہو مگر بعد میں عدالت کے ذریعہ چارہ جوئی کرے اور گواہ اور ثبوت دیتا پھرے۔ عجیب تعلیم ہے۔

پھر ذکر ہوا کہ بلاد یورپ اور امریکہ اور جرمن وغیرہ میں آج کل ایک عجیب تحریک پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لوگ خود بخود ہی ان خیالات فاسدہ سے دست کش ہوتے جاتے ہیں اور اُن کی تجویز ہے کہ تثلیث اور کفارہ کے لیے بے دلیل خیالات کو مہذب دُنیا سے اڑا کر باولیں اور آزادی پسند خیالات نوجوانوں کے آگے پیش کئے جاویں۔ فرمایا کہ :۔

توحید کے قیام کے آثار

اب خدا چاہتا ہے کہ اس کی توحید دنیا میں قائم ہو اور اسی کا تصرف تمام دنیا پر اور لوگوں کے دلوں پر رہے اور کوئی کام نہیں ہو سکتا جب تک کہ خدا تعالیٰ نہ چاہے۔ اس زمانہ میں ان تمام پُرانی جہالت کے زمانہ کی غلطیوں کا اس طرح خود بخود ظاہر ہو جانا یہ بھی ایک مسیح موعود کے زمانہ کی نشانی ہے تاکہ زمانہ کی حالت بھی ایسی ہو کہ وہ مسیح موعود کی تائید کرے جب خدا تعالیٰ کسی بات کو چاہتا ہے کہ وہ ہو جاوے تو وہ تمام زمانہ کو اس کی طرف پھیر دیتا ہے۔ پھر ہر طرف سے اس کی تائید ہی تائید ظاہر ہوتی ہے کیا زمین کیا آسمان گویا سب ہی اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ اگر زمین کسی اَور طرف رجُوع کرے اَور آسمان کسی اور طرف تو پھر حالت ٹھیک نہیں رہتی۔ اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ ہماری تائید

کرے اور چاہتا ہے کہ ہر قسم کے شرک، کفر اور بطلان کو ذلیل کرے۔ توحید کی سچائی کو دُنیا میں قائم کرے۔ اسی لیے اس نے تمام زمانہ میں ایک عجیب تحریک پیدا کر دی ہے اور ہر ایک طرف سے ہماری ہی تائید نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک ذرا سی آگ تمام جہان کے جلانے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح زمانہ میں یہ آگ لگ گئی ہے اور اب تو یہ ہوا چل رہی ہے کہ ان کے دلوں میں پھونک دیا گیا ہے کہ وہ ان تمام پرانے اور بے معنے بلکہ غیر معقول خیالات سے خود بخود بیزار ہو کر حقیقت اور راستی کے جویاں ہو جاویں جیسے کہ اب جرمن کے بادشاہ کے مذہب میں سخت انقلاب ہوا ہے یہی ایک کافی مثال ہے۔ جب سلاطین کے دل میں اللہ کریم نے ایسے ایسے خیالات ڈال دیئے ہیں تو رعیت کا تو بہت سا حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کہ بادشاہ کے مذہب کے ہوتے ہیں اور اپنے بادشاہ کے اشاروں پر چلتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ایک زمانہ میں تو حضرت مسیحؑ کی حد سے زیادہ اور مبالغہ سے بڑھ کر تعریف کی گئی تھی اور اب اس کا رد در و دیوار سے خود بخود عیاں ہوتا جاتا ہے۔

مجلس قبل از عشاء

حضرت ابو طالب کی نجات

بعض لوگ جو کہ غیر مذاہب میں برائے نام ہوتے ہیں مگر خلوص دل سے وہ اسلام کے مداح ہوتے ہیں انکے ذکر پر فرمایا کہ:-

ابو طالب کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے کہ ایک خبیث اور شریر کو ایک ادب اور لحاظ کرنے والے کے برابر کر دیوے۔ اگر اس نے بظاہر تو مذہب قبول نہیں کیا مگر بزرگ سالی کی رعونت اس میں نہ تھی۔ احادیث میں بھی اس قدر تحقیقات کہیں نہیں ہوئی ہے ممکن ہے کہ اس نے کبھی کلمہ پڑھ دیا ہو۔ بجز اعتقاد کے محبت نہیں ہوا کرتی۔ اوّل عظمت دل میں بیٹھتی ہے پھر محبت ہوتی ہے۔

سادہ خوراک

ایک ذکر پر فرمایا کہ:-

ایک سال سے زیادہ عرصہ گذرا ہے کہ میں نے گوشت کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ اکثر مسّی روٹی (بیسنی) یا اچار اور دال کے ساتھ کھا لیتا ہوں۔ آج بھی اچار کے ساتھ روٹی کھائی ہے۔

نسخ

فرمایا کہ:-

ایک سالک کی عمر میں نسخ ہوتا رہتا ہے۔ انبیاء کی زندگی میں بھی نسخ ہوتا ہے اسی لیے اوّل حالت آخر حالت کے ساتھ مطابق نہیں ہوا کرتی جسمانی حالتوں میں بھی نسخ دیکھا جاتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۸۹-۹۰ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

۲۹ر مارچ ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

عصمتِ انبیاء

فرمایا :-

صلیب چونکہ جرائم پیشہ کے واسطے ہے اس واسطے نبی کی شان سے بعید ہے کہ اسے بھی صلیب دی جاوے۔ اس لیے توریت میں لکھا تھا کہ جو کاٹھ پر لٹکایا جاوے وہ ملعون ہے۔ آتشک وغیرہ جو خبیث امراض خبیث لوگوں کو ہوتے ہیں اس سے بھی انبیاء محفوظ رہتے ہیں۔ نفسِ قتل انبیاء کیلیے معیوب نہیں ہے مگر کسی نبی کا قتل ہونا ثابت نہیں ہے جس آلہ سے خبیث قتل ہو۔ اس آلہ سے نبی قتل نہیں ہوتا۔

خوش خلقی

خوش خلقی پر فرمایا کہ

حُسن تناسبِ اعضاء کا نام ہے جبتک یہ نہ ہو ملاحت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے اپنی صفت فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (الانفطار: ۸) فرمائی ہے عَدَلَكَ کے معنے تناسب کے ہیں کہ نسبتی اعتدال ہر جگہ محفوظ رہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۰ - ۹۱ مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۰۳ء)

۳۰ر مارچ ۱۹۰۳ء

بعد ادائے نماز مغرب ایک صاحب نے کسی شخص غیر حاضر کی طرف سے مسئلہ دریافت کیا کہ اس نے غصہ میں اپنی عورت کو طلاق دی ہے اور لکھ بھی دی ہے مگر ایک ہفتہ کے قریب گذرنے پر وہ رجوع کرنا چاہتا ہے اس میں کیا ارشاد ہے؟

حضرت اقدس نے فرمایا کہ :-

جب تک وہ شخص خود حاضر ہو کر بیان نہ کرے ہم نہیں فتویٰ دے سکتے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱ مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۰۳ء)

صدقات اور دُعا

لوگ اس نعمت سے بے خبر ہیں کہ صدقات۔ دُعا اور خیرات سے ردّ بلا ہوتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسان زندہ ہی مَر جاتا۔ مصائب اور مشکلات کے وقت کوئی امداس کے لیے تسلی بخش نہ ہوتی، مگر نہیں اسی نے لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران: ۱۰) فرمایا ہے۔ لَا يُخْلِفُ الْوَعِيْدَ نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے وعید معلق ہوتے ہیں جو دعا اور صدقات سے بدل جاتے ہیں۔ اس

کی بے انتہا نظیریں موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی فطرت میں مصیبت اور بلا کے وقت دُعا اور صدقات کی طرف رجوع کرنے کا جوش ہی نہ ہوتا۔

جسقدر راستباز اور نبی دنیا میں آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور قوم میں آئے ہوں مگر یہ بات ان سب کی تعلیم میں یکساں ملتی ہے کہ انہوں نے صدقات اور خیرات کی تعلیم دی۔ اگر خدا تعالیٰ تقدیر کے محو اور اثبات پر قادر نہیں تو پھر یہ ساری تعلیم فضول ٹھہر جاتی ہے اور پھر ماننا پڑیگا کہ دُعا کچھ نہیں اور ایسا کہنا ایک عظیم الشان صداقت کا خون کرنا ہے۔ اسلام کی صداقت اور حقیقت دعا ہی کے نکتہ کے نیچے مخفی ہے کیونکہ اگر دعا نہیں تو نماز بے فائدہ، زکوٰۃ بے سُود اور اسی طرح سب اعمال معاذاللہ لغو ٹھہرتے ہیں۔

ہمارا بھروسہ خدا پر ہے

ہمارے مخالف ہر طرف سے کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ ہر قسم کی تدبیریں اور منصوبے کرتے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ پہلے ہی ہم کو تسلی دے چکا ہے مَکَرُوْا وَ مَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔ خدا کے ساتھ لڑ کر کبھی کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان کا بھروسہ اپنی تدابیر اور حِیَل پر ہے اور ہمارا خدا پر۔

استقامت و صبر

کوئی مشکل اور کوئی مصیبت مصیبت رہ سکتی ہی نہیں اگر کوئی شخص استقامت اور صبر اپنا شیوہ کرلے اور خدا تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرے۔

خدا داری چہ غم داری

نشانات کا ظہور

نشانات جو ظاہر ہوتے ہیں یہ اسی طرح ظاہر ہوتے ہیں جیسے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک رات تک تو ماں خیال کرتی ہے کہ مَیں مر جاؤنگی اور وہ دردِزہ کی تکلیف سے قریب المرگ ہوجاتی ہے۔ اسی طرح پر نبیوں کے نشان بھی مصیبت کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ نشان کی جڑ دُعا ہی ہے یہ اسمِ اعظم ہے اور دنیا کا تختہ پلٹ سکتی ہے۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور ضرور ہے اور ضرور ہے کہ پہلے ابتہال اور اضطراب کی حالت پیدا ہو۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ صفحہ ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

۲؍اپریل ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ایک الہام کے معنی

فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ بھی عجیب معاملہ ہے۔ ہمارا یہ الہام کہ اَنْتَ

مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ تَوْحِیْدِیْ وَتَفْرِیْدِیْ ایک نئی طرز کا الہام ہے۔ ہم نے اب سے پہلے کسی الہامی عبارت میں اس قسم کے الفاظ نہیں دیکھے۔ اس کے معنے جو ہمارے خیال میں آتے ہیں۔ یہ ہیں کہ ایسا شخص بمنزلہ توحید ہی ہوتا ہے جو ایسے وقت میں مامور ہو کہ جب دنیا میں توحید الٰہی کی نہایت ہتک کی گئی ہو اور اُسے نہایت ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔[۱] ایسے وقت میں آنے والا توحید مجسّم ہوتا ہے۔[۲] ہر شخص اپنا ایک مقصد اور غایت مقرر کرتا ہے۔ مگر اس شخص کا مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ کی توحید ہی ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید ہی ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو اپنے طبعی جذبات اور مقاصد سے بھی مقدم کر لیتا ہے۔ اپنی ساری ضرورتوں کو پیچھے ڈال دیتا ہے۔

اسی طرح پر ہر ایک شخص کا اپنے مقاصد کا ایک بُت ہوتا ہے اور وہ اس تک پہنچنا چاہتا ہے مگر یہ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہوتا ہے کہ اس تک پہنچا دے یا اس کی عمر کا پہلے ہی خاتمہ کر دے۔ وہ اپنے مال یا عزت و آبرو یا بال بچوں یا دوسری حوائج کے لیے تڑپتا ہے اور بیخود ہوتا ہے اور لبا اوقات لوگ انہیں مشکلات میں پڑ کر خودکشی بھی کر لیتے ہیں مگر وہ شخص جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آتا ہے اس کا یہی جوش خدا تعالیٰ کی توحید کیلئے ہو جاتا ہے اور اپنی نفسانی خواہشوں کی بجائے خدا تعالیٰ کی توحید کے لیے مضطرب اور بیخود ہوتا ہے۔[۳] میں سمجھتا ہوں کہ ایسے وقت میں یہ الفاظ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں کہ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ تَوْحِیْدِیْ وَ تَفْرِیْدِیْ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی توحید بہت ہی پیاری ہے۔

یہ توحید تھی جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے کبھی وبا کبھی قحط اور کبھی اپنے پیارے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ کی تلوار سے اس کے قیام کے واسطے ہزاروں مشرک جانوں کو تباہ کر دیا۔ مکّہ اور مدینہ منورہ کے حالات بھی صرف اسی کی خاطر پیچیدہ ہوئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ بھی اسی توحید کے لیے تھا۔[۴]

---

[۱] البدر میں مزید یہ فقرہ ہے: "اور شرک کی عظمت اور قدر کی جاتی ہو۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

[۲] البدر میں یہ مضمون یوں ہے: "اس مامور شدہ شخص کو توحید کی پیاس ایسی لگائی جاتی ہے کہ وہ اپنے تمام اغراض و مقاصد کو ایک طرف رکھ کر توحید کے قائم کرنے میں خود ایک مجسم توحید ہو جاتا ہے اس کے اُٹھنے بیٹھنے اور حرکت اور سکون اور ہر ایک قول اور فعل میں توحید کی لَو اسے لگی ہوئی ہوتی ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱)

[۳] (البدر سے) "کہ خدا کی خواہشات اس کی توحید اور عظمت اور جلال غالب آویں۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱)

[۴] (البدر سے) "طاعون وغیرہ قحط اور دیگر بلاؤں سے ملک کے ملک ہلاک ہوئے تو آخر توحید پیاری تھی تو یہ ہوا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱)

عقیدہ کی اہمیت

عقیدہ ہی سے اعمال میں قوت آتی ہے۔ جیسا قوی اور کامل عقیدہ ہو ویسے ہی اس کے مطابق اعمال صادر ہوں گے۔ اگر عقیدہ ہی زنگ آلودہ اور کمزور اور مُردہ ہوگا تو پھر اعمال کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

اگرچہ ظاہر اعمال نماز روزہ میں تو مسلمان باہم شترک ہیں اور اکثر بجا لاتے ہیں مگر پھر اُن کے نتائج میں برکات کے اختلاف کا باعث جو ہے تو صرف یہی عقیدہ ہے جن کے عقائد عمدہ اور کامل ہوتے ہیں اُن کے لیے نتائج عمدہ اور برکات کثرت سے نازل ہوتے ہیں۔ مگر کمزور ایمان والے اپنے اعمال کی قوت پر تو نگاہ نہیں کرتے برکات کے نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں۔

عداوت کا فائدہ

فرمایا:۔

محبت اور عقیدت کی توجہ تو ایک جُدا امر ہے مگر عداوت کی توجہ بھی بے فائدہ نہیں ہوتی بلکہ مفید ہوتی ہے۔ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکّہ کے زمانہ میں آپ کے مقابل میں محبت اور عقیدت کی توجہ تو نہایت ہی کم بلکہ کچھ بھی نہ تھی مگر عداوت کی توجہ کامل طور سے تھی اور آخر یہی عداوت کی توجہ آپ کی عام لوگوں اور عرب کے کناروں تک شہرت پہنچانے کا باعث ہوگئی۔ ورنہ آپ کے پاس اس وقت اور کیا ذریعہ تھا جو اپنی دعوت کو اس طرح شائع کرتے۔ آپ کے واسطے اس وقت تبلیغ کا پہنچانا نہایت مشکل تھا مگر خدا تعالےٰ نے یہ کام کیا کہ دشمنوں ہی کے ہاتھوں سے ایسا کرا دیا۔[۱] اب موجودہ زمانے میں ہمارے دشمن بھی ایسا ہی کرتے ہیں اگرچہ اس وقت کی فوری حالت ایسی ہوتی ہے کہ ہماری جماعت کو ان لوگوں کی کارروائیوں سے رنج اور صدمہ ہوتا ہے مگر ان کی کارروائیوں کا انجام ہمارے مفید مطلب اور بخیر ہوتا ہے۔ اصل میں ان لوگوں کی گالیاں تو ایسی ہیں جیسے عورتیں شادی کے موقعہ پر لڑکے والوں کو دیتی ہیں۔ اُن سے اس وقت کون ناراض ہوتا ہے؟ یہی حال ان مخالفوں کی گالیوں کا ہے۔ یہ گالیاں ہمارے مفید مطلب ہیں۔ یہ ہماری تبلیغ کا ذریعہ بنتی ہیں اور سعید اور شریف ان کی گالیوں ہی سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ حق کس کے پاس ہے۔ اسی طرح پر ہماری جماعت ان میں سے ہی نکل کر آئی ہے اور دن بدن نکلتی آتی ہے۔

---

[۱] (البدر سے) "آپ کے بعد مسیلمہ کذاب وغیرہ بھی مدعی ہوئے مگر اُن کو کسی نے پوچھا بھی نہ۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ:۔
آجکل تو لوگ فرعون کی خصلت رکھتے ہیں کہ چاروں طرف سے خوف آیا تو ایمان لے آئے اور مان لیا۔ جب خوف جاتا رہا تو پھر مخالفت شروع کر دی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ صفحہ ۹ مورخہ ۱۰؍اپریل ۱۹۰۳ء)

۳؍اپریل ۱۹۰۳ء

اقرارِ بیعت کے اثرات

نماز جمعہ کے بعد گرد و نواح کے لوگوں اور چند ایک دیگر احباب نے بیعت کی۔ بعد بیعت حضرت احمد مرسل مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذیل کی تقریر کھڑے ہو کر فرمائی:۔

اس وقت تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے بیعت کا اقرار کیا ہے اور تمام گناہوں سے توبہ کی ہے اور خدا تعالیٰ سے اقرار کیا ہے کہ کسی قسم کا گناہ نہ کریں گے۔ اس اقرار کی دو تاثیریں ہوتی ہیں۔ اقرار بیعت یا تو رحمت ہے یا باعثِ عذاب۔ یا تو اس کے ذریعہ انسان خدا تعالیٰ کے بڑے فضل کا وارث ہو جاتا ہے کہ اگر اس پر قائم رہے تو اس سے خدا تعالیٰ راضی ہو جائے گا اور وعدہ کے موافق رحمت نازل کرے گا اور یا اس کے ذریعہ سخت مجرم بنے گا کیونکہ اگر اقرار کو توڑے گا تو گویا اس نے خدا تعالیٰ کی توہین کی جس طرح سے ایک انسان سے اقرار کیا جاتا ہے اور اُسے بجا نہ لایا جاوے تو توڑنے والا مجرم ہوتا ہے ایسے ہی خدا تعالیٰ کے سامنے گناہ نہ کرنے کا اقرار کر کے پھر توڑنا خدا تعالیٰ کے روبرو سخت مجرم بنا دیتا ہے۔ آج کے اقرار اور بیعت سے یا تو رحمت کی ترقی کی بنیاد پڑ گئی اور یا عذاب کی ترقی کی۔

اگر تم نے تمام باتوں میں خدا تعالیٰ کی رضامندی کو مقدم رکھا اور مدت دراز کی تمام عادتوں کو بدل دیا تو یاد رکھو کہ بڑے ثواب کے مستحق ہو۔ عادت کو چھوڑنا آسان بات نہیں۔ دیکھتے ہو کہ ایک افیونی یا جھوٹ بولنے والے کو جو عادت پڑ گئی ہوئی ہوتی ہے اُس کا بدلنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے جو اپنی عادت کو خدا تعالیٰ کے واسطے چھوڑتا ہے تو وہ بڑی بات کرتا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ عادت چھوٹی ہو یا بڑی ایک عرصہ تک انسان جب گناہ کرتا ہے تو اس کے قویٰ کو ایک عادت اس کے کرنے کی ہو جاتی ہے۔ تو کیا تمہارے نزدیک اسے چھوڑ دینا کوئی چھوٹی بات ہے؟ جب تک کہ انسان کے اندر ہمت استقلال نہ ہو تب تک یہ دُور نہیں ہو سکتی۔ ماسوا اسکے ان عادتوں کے بدلنے میں ایک اَور مشکل ہے کہ عادتوں کا پابند آدمی عیالداری کے حقوق کی بجا آوری میں

ل البدر سے:۔ "فرمایا کہ دابۃ الارض کے معنے قرآن شریف سے ہی معلوم کرنے چاہئیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں یہ لفظ آیا ہے وہاں کیڑے ہی کے معنے ہیں۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہاتھی وغیرہ جانور ہرگز نہیں ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱)

سُست ہوا کرتا ہے۔ مثلاً ایک افیونی ہے تو وہ نشہ میں مبتلا ہو کر عیالداری کے لیے کیا کچھ کریگا؟ اور اسی طرح بعض عادتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ کنبہ اور اہل و عیال کے آدمی اس کے حامی ہوتے ہیں اور اس کا چھوڑنا اور بھی دشوار تر ہوتا ہے مثلاً ایک شخص بذریعہ رشوت روپیہ حاصل کرتا ہے۔ عورتوں کو اکثر علم نہیں ہوتا وہ تو اس کو اچھا جانیں گی کہ میرا خاوند خوب روپیہ کماتا ہے۔ وہ کب کوشش کریگی کہ خاوند سے یہ عادت چھوڑا دے تو ان عادتوں کو چھوڑانے والا بجز اللہ تعالیٰ کی ذات کے کوئی نہیں ہوتا۔ باقی سب اس کے حامی ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک شخص جو نماز روزہ کو وقت پر ادا کرتا ہے اسے یہ لوگ سُست کہتے ہیں کہ کام میں حرج کرتا ہے اور جو نماز روزہ سے غافل رہ کر زمینداری کے کاموں میں مصروف رہے اُسے ہوشیار کہتے ہیں اس لیے میں کہتا ہوں کہ توبہ کرنی بہت مشکل کام ہے۔ ان ایام میں تو بہت سے مقابلے آکر پڑے ہیں۔ ایک طرف عادتوں کو چھوڑنا دوسری طرف طاعون ایک بلا کی طرح سر پر ہے۔ اس سے بچنا، اب دیکھو کونسی مشکل کو تم قبول کر سکتے ہو۔ رزق سے ڈر کر انسان کو کسی عادت کا پابند نہ ہونا چاہیئے۔ اگر اُس کا خدا تعالیٰ پر ایمان ہے تو خدا تعالیٰ رزاق ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اس کا ذمہ دار میں ہوں مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۳، ۴) یعنی باریک سے باریک گناہ جو ہے اسے خدا تعالیٰ سے ڈر کر جو چھوڑے گا خدا تعالیٰ ہر ایک مشکل سے اُسے نجات دیگا۔ یہ اسلیئے کہا ہے کہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں ہم تو چھوڑنا چاہتے ہیں مگر ایسی مشکلات آپڑتی ہیں کہ پھر کرنا پڑ جاتا ہے خدا تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ اُسے ہر مشکل سے بچالے گا۔ پھر آگے ہے يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۴) یعنی ایسی راہ سے اسے روزی دیگا کہ اس کے گمان میں بھی وہ نہ ہوگی۔ ایسے ہی دوسرے مقام پر ہے۔ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (اعراف: ۱۹۷) جیسے ماں اپنی اولاد کی والی ہوتی ہے ویسے ہی وہ نیکوں کا والی ہوتا ہے پھر فرماتا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ یعنی جو کچھ تم کو وعدہ دیا گیا ہے اور تمہارا رزق آسمان پر ہے۔

جب انسان خدا پر سے بھروسہ چھوڑتا ہے تو دہریت کی رگ اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ پر بھروسہ اور ایمان اس کا ہوتا ہے جو اُسے ہر بات پر قادر جانتا ہے۔

اب ایسا زمانہ ہے کہ جو توبہ کرنا چاہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان باتوں کیلئے اپنے ہاتھوں سے اُن کی مدد کر رہا ہے اس کی ذات رحمت سے بھری ہوئی ہے۔ طاعون کے حملے بہت خوفناک ہوتے ہیں مگر اصل میں یہ رحمت ہے سختی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ ہوں گے جو کہ عبادت سے غافل ہونگے۔ اگر اتنی چشم نمائی خدا تعالیٰ نہ کرے تو پھر تو لوگ بالکل ہی منکر ہو جاویں یہ تو اس کا فضل ہے کہ سوئے ہوؤں کو ایک تازیانہ سے جگا رہا ہے ورنہ اُسے کیا پڑی ہے کہ کسی کو عذاب دیوے جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (النساء: ۱۴۸) کہ اگر تم میری راہ اختیار کرو تو تم کو کیوں عذاب ہو۔

اس کی رحمت بہت وسیع ہے جیسے بچہ جب پڑھتا نہیں ہے تو اُسے مار پڑتی ہے اس کا تر یہی ہے کہ اس کی آئندہ زندگی خراب نہ ہو اور وہ سُدھر جاوے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ یہ عذاب اس لیے دیتا ہے کہ لوگ سدھر جاویں اور یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے۔

سچی توبہ کرو۔ بھلا دیکھو تو سہی اگر بازار سے کوئی دوا مثل شربت بنفشہ کے تم لاؤ اور اصل دوا تم کو نہ ملے بلکہ سڑا ہوا پرانا شیرا تم کو دیا جاوے تو کیا وہ بنفشہ کے شربت کا کام دیگا؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح سڑے ہوئے الفاظ جو زبان تک ہوں اور دل قبول نہ کرے وہ خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچتے۔ بیعت کرانے والے کو تو ثواب ہو جاتا ہے مگر کرنیوالے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بیعت

بیعت کے معنے ہیں بیچ دینا۔ جیسے ایک چیز بیچ دی جاتی ہے تو اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ خریدار کا اختیار ہوتا ہے جو چاہے سو کرے۔ تم لوگ جب اپنا بیل دوسرے کے پاس بیچ دیتے ہو تو کیا اُسے کہہ سکتے ہو کہ اسے اس طرح استعمال کرنا؟ ہرگز نہیں۔ اس کا اختیار ہے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اسی طرح جس سے تم بیعت کرتے ہو۔ اگر اس کے احکام پر ٹھیک نہ چلو تو پھر کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ہر ایک دوا یا غذا جب تک بقدر شربت نہ پی جاوے فائدہ نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح اگر بیعت پورے معنوں میں نہ ہو تو وہ بیعت نہ ہوگی۔ خدا تعالیٰ کسی کے دھوکہ میں نہیں آسکتا۔ اس کے ہاں نمبر اور درجے مقرر ہیں۔ اس نمبر اور درجہ تک توبہ ہوگی تو وہ قبول کرے گا۔ جہانتک طاقت ہے وہاں تک کوشش کرو۔ پورے صالح بنو۔ عورتوں کو نصیحت کرو۔ نماز روزہ کی تاکید کرو۔ سوائے آٹھ سات دن کے جو عورتوں کے ہوتے ہیں اور جس میں نماز معاف ہے۔ تمام نمازیں پوری پڑھیں اور روزے معاف نہیں ہیں ان کو پھر ادا کریں۔ انہی کمیوں کی وجہ سے کہا کہ عورتوں کا دین ناقص ہے۔ اپنے ہمسایہ اور محلہ والوں کو بھی نیکی کی تاکید کرو۔ غافل نہ ہو۔ اگر علم نہ ہو تو واقف سے پوچھو کہ خدا تعالیٰ کیا چاہتا ہے۔

مسلمانوں کی دینی حالت

اس وقت مسلمانوں نے اپنے دین کو بدل دیا ہے۔ جو خدا تعالیٰ چاہتا تھا اُسے بدل کر اَور کا اَور بنا دیا ہے۔ اس وقت ایک شور برپا ہے۔ اگر کہا جاوے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے ہیں اور عیسٰیؑ زندہ ہے تو سب خوش ہوتے ہیں۔ مگر جب کہا جاوے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ اور خاتم النبیین اور آپ کے بعد کوئی غیر نبی نہیں آنے والا۔ تو سب ناراض ہو جاتے ہیں۔

مسیحؑ کو آنحضرتؐ پر فضیلت نہ دو

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے خدا تعالیٰ نے سب سے آخر پیدا کیا ویسے ہی آخری درجے کے سب کمال

آپ کو دیئے کہ کوئی بھی خوبی کسی دوسرے نبی میں ایسی نہیں جو کہ آپ کو نہ دی گئی ہو ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کیا تم یہ قبول کرتے ہو کہ ایک کے ہاں بہت سے مہمان ہوں تو ان میں سے ایک کو وہ مکلف کھانا پلاؤ وغیرہ دلوے اور دوسرے کو معمولی کھانا شوربہ یا روٹی وغیرہ تو باقی مہمان کہیں گے کہ کاش ہم اس گھر میں مہمان نہ ہوتے۔ اسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو گذرے ہیں انہوں نے کیا گناہ کیا کہ جو فضیلت اور رُتبہ عیسیٰ علیہ السلام کو دیا جاتا ہے ان میں سے ایک کو بھی وہ نہ ملا۔ ان سب کو فوت مانتے ہو اور ایک عیسیٰؑ کو زندہ اور وہ بھی آسمان پر۔

قرآن فرماتا ہے رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ : ۱۱۵) اور حضرتؐ تو اس دعا کو برابر مانگتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۳ برس کی ہوئی۔ دوسرے تمام پیغمبروں کو گھٹانا اور مسیح کو سب سے بڑھ کر فضیلت دینا ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ کونسی فضیلت مسیح کو دوسروں پر ہے؟ انہوں نے نہ ساری دنیا کی اصلاح کا دعویٰ کیا۔ نہ کوئی دُکھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اُن کو پہنچا نہ مقابلہ کی نوبت آئی۔ نہ کوئی شکست اُٹھانی پڑی۔ چند آدمی صرف ایمان لائے وہ بھی بگڑے گئے۔ اس کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ آپ کا دعویٰ کُل جہان کے لیے اور سخت سے سخت دُکھ اور تکالیف آپ کو پہنچے۔ جنگیں بھی آپ نے کیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ آپ کی زندگی میں موجود تھے پھر ان باتوں کے ہوتے ہوئے جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی ایسا کلمہ زبان پر لائے گا جس سے آپ کی ہتک ہو وہ حرامی نہیں تو اَور کیا ہے؟ ان کم بختوں سے کوئی پوچھے کہ پھر تم محمد رسول اللہ کیوں کہتے ہو عیسیٰ رسول اللہ ہی کہو۔

اب تم کو چاہیئے کہ جہانتک ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزت دو۔ اگر تم یہ کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر زندہ ہیں تو ہم آج مانتے ہیں مگر جس سے تم کو فیض اور فائدہ کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اُس کو جھوٹی فضیلت دینے سے تم کو کیا حاصل؟

تمام فیضوں کا سرچشمہ قرآن ہے نہ انجیل نہ تورات۔ جو قرآن کو چھوڑ کر ان کی طرف جُھکتا ہے وہ مُرتد ہے اور کافر۔ مگر جو قرآن کی طرف جُھکتا ہے وہ مسلمان ہے۔ کیا ان کو شرم نہیں آتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حفاظت پیش آئی تو خدا تعالیٰ نے آپؐ کو غار میں جگہ دی اور عیسیٰ کو جب وہ موقعہ پیش آیا تو آسمان پر جا بٹھایا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۳ برس کی کہتے ہیں اور عیسیٰ کو اب تک زندہ مانتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کا دین غالب ہے۔ آج مسلمان کم ہیں اور عیسائی زیادہ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہی دلائل بیان کر کے پادریوں نے مسلمانوں کو عیسائی بنایا ہے۔

خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ عیسیٰؑ مر گیا فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کی آیت موجود ہے۔ اگر تمہارا مذہب قرآن ہے تو اس پر

ایمان کیوں نہیں لاتے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے خدا تعالیٰ نے ہرگز نہ چاہا کہ باہر سے لوگ آویں۔ سورہ نور میں بھی وعدہ ہے کہ تمام خلیفے اور امام تیری اُمت میں سے آویں گے۔ سو خدا تعالیٰ نے وہ پورا کیا اور اسی طرح اب ہمیں مامور کیا۔ جیسے چودہ سو برس کے بعد موسیٰ کی امت میں سے مسیح آیا تھا۔ ویسے ہی چودہ سو برس گذرنے کے بعد ہمیں بھیجا وہ مسیح بھی صاحب شریعت نہ تھے۔ تورات پر ان کا عمل تھا ایسے ہی ہم ہیں تا کہ مماثلت پوری ہو اور کوئی کمی نہ رہ جاوے۔ جیسی محبت خدا تعالیٰ ہم سے کرتا ہے ویسی کسی اَور سے نہیں کرتا۔ اگر یہ خیال ہو کہ عیسیٰ کو خدا تعالیٰ آسمان پر لے گیا۔ اس کو آج تک زندہ رکھا اور اس کو پھر لاوے گا تو پھر ساری محبت خدا کی عیسیٰ کے ساتھ چاہیئے جو ان تمام باتوں کو غور سے دیکھے گا تو سمجھے گا کہ جو آپ کی شان ہے وہ اَور کسی نبی کی نہیں ہے جب تک تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر خوبی میں افضل نہ جانو گے مسلمان نہ ہو گے بلکہ کرانی (یعنی عیسائی۔ مرتب) ہو گے۔ یہ تو عقیدہ چاہیئے اور نمازوں میں دُعا کرو۔ کہ اے خدا طاعون سے ہمیں بچا۔ جو لوگ ہنسی کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ بڑے آدمی کیوں نہیں مرتے وہ نادان ہیں۔ خدا تعالیٰ کا کام ہے آہستہ آہستہ پکڑنا۔ اس لیے غافل نہ ہو۔ تہجدوں میں دُعا کرو۔ پانچوں وقت کی نمازوں میں دُعا کرو۔ جب تمہارا گھر دعا سے بھر جاوے گا تو پھر ہرگز وبا نہ آوے گی اور اگر کوئی روک رکھو گے تو دعا کام نہ دیگی۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھو گے تو خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ تم کو ضرور محفوظ رکھے گا۔ [1]

دربارِ شام

حضرت عیسیٰؑ کی محبت میں غلو اور آنحضرتؐ کی توہین

بارہا ہمیں یہ تعجب آتا ہے کہ کیوں یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ سے بیجا محبت کرتے ہیں

انہوں نے ان کا کیا دیکھا تھا جو ان پر ایسے شیدا ہیں کہ اُن کو خدا ہی بنا دیا ہے۔ ایسے اُن کی محبت میں اندھے ہوئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کا کلمہ پڑھتے ہیں انکی توہین اپنی زبان سے کرتے ہیں۔ توہین کیا ہوتی ہے یہی کہ ایک شخص جس میں اعلیٰ درجہ کے اوصاف ہوں اس کو نظر انداز کر کے ایک ایسے شخص کو اس سے بڑھ چڑھ کر متصف باوصاف کیا جاوے جس میں وہ اوصاف نہیں ہیں۔ تعزیرات میں توہین کی مثال کے نیچے یہ مثال لکھی ہے کہ زید اور بکر نے (جو درحقیقت چور تھے) چوری کی ہے مگر عمرو (جو ایک شریف آدمی ہے اور درحقیقت اس کی کوئی سازش اس چوری میں نہیں) نے چوری نہیں کی۔ اور نہ ہی اس کا اس میں کچھ تعلق ہے تو قانوناً ایسا کہنے والا شخص عمرو کی توہین کرتا ہے اور وہ مجرم قرار دیا جاوے گا اور مستحق سزا کا ہوگا۔

---

[1] البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱ - ۹۳ مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۰۳ء

غرض توہین کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی اتنی تعریف کی جاتی ہے کہ گویا اُن پر جب مصیبت آئی تو خدا تعالیٰ کو زمین پر اُن کے بچاؤ کی کوئی راہ نظر نہ آئی اور اُن کو آسمان پر اور پھر دوسرے آسمان پر جا چھپایا۔ بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سخت مصائب اور شدائد آئے تو اللہ تعالےٰ نے نعوذ باللہ بقول مولویوں کے آپکو بالکل بے مدد اور کس مپرسی چھوڑ دیا اور آپ کو ایک غار میں جو آسمان کے مقابل میں جس طرح وہ بلند یہ اسفل میں واقع تھی، پناہ دی۔ غار کی تعریف بھی کیا کہ بچھوؤں، سانپوں اور ہر قسم کے موذی حشرات الارض کا گھر تھا۔ بھلا اب سوچو یہ توہین نہیں تو کیا ہے؟

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سرورِ کائنات فخر الاولین والآخرین اشرف الخلق تو امیدوار ہیں کہ ہم لمبی عمر پاویں مگر اُن کو تو صرف تریسٹھ برس کی عمر دی جاتی ہے اور اُن کے مقابل میں حضرت عیسیٰؑ گویا اب تک زندہ ہیں اور دو ہزار برس اُن کی عمر ہو چکی ہے اور اُن کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ آپ رہتے تو دنیا کی اصلاح کرتے جیسا کہ پہلا تجربہ بتا چکا ہے کہ ضرور ہزاروں کی اصلاح کرتے اگر اور عمر پاتے۔ مگر بالمقابل حضرت عیسیٰؑ اتنی عمر میں نہ کوئی نیکی کرتے ہیں نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ اور نہ کسی کی اصلاح ہے۔ اُن سے نہ کسی کو نفع ہے اور نہ وہ کسی سے کسی قسم کے ضرر کو دور کر سکتے ہیں۔ نیز پُرانا تجربہ بھی اس امر کا کافی شاہد تھا کہ صرف بارہ آدمی مدت کی کوشش سے تیار کئے۔ آخر وہ بھی یوں الگ ہوئے کہ کسی نے لعنت کی اور کسی نے تیس روپے کے عوض دشمن کے ہاتھ میں دے دیا۔

پھر مرنے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح آسمان پر گئی تو پھر وہ حریف موجود تھے کہ وہ تو آسمان میں مع جسم عنصری تشریف رکھتے ہیں اور جنابؐ کا جسم ہزاروں من مٹی کے نیچے پڑا ہے اور پھر اسی پر ختم نہیں۔ آخر کار آپ کی اُمت میں وہ پھر آویں گے اور چالیس سال تک ان پر حکومت کریں گے اور ان سے بیعت لیں گے۔ بھلا غور تو کرو کہ یہ توہین نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر ایک بات اور ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن شریف میں یہ وعدہ کرتا ہے کہ مَیں تیری اُمت میں سے تیری اُمت کی اصلاح کے واسطے خلیفے بھیجتا رہوں گا۔ مگر آخر اس وعدہ کا ذرا بھی پاس نہ کیا اور ایک قوم میں سے جس کے متعلق اس نے وعدہ کر لیا ہوا تھا کہ اس قوم پر میرا غضب نازل ہو چکا ہے۔ مَیں اُن پر کبھی کوئی رُوحانی اور جسمانی فضل و نعمت ہرگز نازل نہ کروں گا مگر آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وعدہ خلافی فرما کر اُسے بھیجا اور اپنے قانون کو بھی توڑا۔ کیا یہ کوئی گوارا کر سکتا ہے کہ خدا پر وعدہ خلافی عائد ہو۔ ہرگز نہیں

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ (آل عمران : ۱۰)

ہماری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اس عیسیٰؑ کو اُتار کر کرینگے کیا؟ آخر اُن کے قویٰ تو وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔ پہلے کیا کیا تھا جو اب کریں گے۔ ایک ذلیل سی معدودے چند ایک قوم تھی ان کی اصلاح بھی نہ ہوئی۔

لکھا ہے ایک دفعہ اُن میں سے پانسو آدمی مُرتد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ اگر حضرت موسیٰ کے دوبارہ آنے کی اُمید رکھتے تو کچھ موزون بھی تھا کیونکہ وہ صاحب عظمت اور جبروت تو تھے ان میں شجاعت بھی تھی۔ اب یہ عیسیٰ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

پھر مشکل یہ ہے کہ عادت کا جانا محال ہے اُن کو مار کھانے اور بزدلی کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ اگر دجّال سے جنگ کریں گے تو کس طرح؟ ادھر ان مسلمانوں کی بھی یہ عادت ہو گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ ہی آویں گے۔ لکیر کے فقیر ہیں۔ باپ دادا اور مولوی جو اس بات کی تعلیم دیتے ہوئے گذر گئے۔ وہ خواہ قرآن شریف کے مخالف ہی ہو وہ اسی ہندوؤں کی گنگا کی طرح اس اعتقاد کو ترک نہ کریں گے خواہ کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔

ان لوگوں کو تو اپنے گھر کا بھی حال معلوم نہیں کہ ان کے اس اعتقاد نے اسلام کو کیسا ضعف پہنچایا ہے۔ عیسائی جب کسی کو مُرتد کرنے پر آتے ہیں تو یہی حجت پکڑتے ہیں کہ تمہارا نبی مُردہ اور ہمارا زندہ آسمان پر موجود ہے۔ اب بتاؤ کہ ان دونو میں سے کون اچھا اور خدا تعالیٰ کا پیارا ہے اور وہ مسلمانوں کی کتابوں سے ہی نکال کر دکھا دیتے ہیں۔

اب قریباً ہر ایک فرقہ میں سے الگ الگ ملا جلا کر ۲۹ لاکھ کے قریب آدمی مُرتد ہو چکے ہیں۔ کیا سید کیا پٹھان کیا قریش اور کیا مغل۔ ہر قوم اس وبا میں ہلاک ہوئی ہے۔ ایسے ایسے لوگ جو فخر اسلام کہنے کے مستحق بن جانے کے قابل تھے وہ اب بیدین ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے ہیں اور پھر اسی پر ابھی تمام نہیں بلکہ وہ جان سے مال سے عزت و جاہ سے عورتوں سے لڑکیوں سے اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ کسی طرح دُنیا سے اسلام کا نشان مٹا دیں۔ بھلا اگر یہی وہ فتّان لوگ نہیں تو اَور کون ہوگا؟ اس قوم کا فتنہ تو مسلمانوں کے بناوٹی دجّال کے فتنہ سے بھی کہیں بڑھ گیا۔ بھلا یہ بتاویں تو سہی اس قوم کی جس کا فتنہ دجّال سے بھی زیادہ ہے خبر کہاں دی گئی ہے۔ قرآن شریف نے تو اسی واسطے دجّال کا نام نہیں لیا بلکہ وَلَا الضَّآلِّيْن کہا جس سے مراد یہی قوم نصاریٰ ہے وَلَا الدَّجَّال کیوں نہ کہا۔ اصل امر یہی ہے کہ وہ ایک قوم ہے جس سے تمام انبیاء اپنی اپنی اُمت کو ڈراتے آئے ہیں۔ ان لوگوں کے خیالات کی بناء احادیث موضوعہ پر ہے جو قرآن شریف کی مُہر سے خالی ہے۔ مگر ہم قرآن شریف کو ان احادیث کی خاطر چھوڑ نہیں سکتے۔ قرآن شریف بہر حال مقدم ہے بھلا قرآن کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جمع کیا۔ لکھوایا اور پھر نمازوں میں بار بار پڑھ کر سُنایا۔ کیا اگر احادیث بھی ویسی ہی ضروری ہیں تو اُن میں سے بھی کسی کو اسی طرح جمع کیا اور بار بار سُنایا اور دَور کیا؟ ہرگز نہیں جب نہیں کیا تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرض منصبی میں کوتاہی کی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ صحیح امر یہی ہے کہ قرآن شریف ہی آپ لائے تھے اور اسی کے جمع کرنے کا آپ کو حکم تھا سو آپ نے کر دیا۔ اب احادیث میں سے وہ قابلِ عمل اور اعتقاد ہے جس پر قرآن شریف کی مُہر ہو کہ وہ اس کے خلاف نہیں۔

پھر اسی پر بس نہیں۔ قرآن شریف کہتا ہے کہ عیسیٰ مر گئے اور پھر دوبارہ قیامت تک وہ اس دنیا میں نہیں

آئیں گے بلکہ آنے والا اُس کا مثیل اس کی خو بُو لے کر آوے گا۔ جیسا کہ آیت قرآن شریف فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ میں صاف بیان ہے۔

توہینِ عیسیٰؑ کے اعتراض کا جواب پھر کہتے ہیں کہ سیدنا المسیح کی توہین کرتے ہیں۔ بھلا سوچو تو کہ ہم اگر اپنے پیغمبر سے اُن جھوٹے اعتراضات جو نافہمی اور کوتہ چشمی سے کر کے مسیح کو آسمان پر زندہ بٹھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے جاتے ہیں اُن کے دُور کرنے کے واسطے مسیح کی اصل حقیقت کا اظہار نہ کریں تو کیا کریں؟ ہم اگر کہتے ہیں کہ وہ زندہ نہیں بلکہ مر گئے جیسے دوسرے انبیاء بھی مر گئے تو ان لوگوں کے نزدیک تو یہ بھی ایک قسم کی توہین ہوئی۔ ہم خدا تعالیٰ کے بلائے بولتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو فرشتے آسمان پر کہتے ہیں۔ افتراء کرنا تو ہمیں آتا نہیں اور نہ ہی افتراء خدا کو پیارا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسرِ شان اور ہتک کی گئی۔ ضرور ہے کہ اس کا بدلہ لیا جاوے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نُور اور جلال کو دوبارہ از سرِ نو تازہ و شاداب کر کے دکھایا جاوے اور یہ اس مسیح کے بُت کے ٹوٹنے اور اس کی موت کے ثابت ہونے میں ہے پس ہم خدا تعالیٰ کے منشاء اور ارادے کے مطابق کرتے ہیں اب اُن کی لڑائی ہم سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے ہے۔

ان لوگوں نے تو حضرت مسیحؑ کو خاصہ خدا بنایا ہوا ہے اور موحد کہلاتے ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ وہ زندہ ہے قائم علی السماء ہے۔ خالق۔ رازق۔ غیب دان۔ محی۔ ممیت ہے۔ بھلا اب بتلاؤ کہ اگر یہ صفات خدا کی نہیں تو کس کی ہیں؟ بشریت تو ان صفات کی حامل ہو سکتی نہیں۔ پھر خدائی میں فرق ہی کیا رہا؟ یہ تو عیسائیوں کو مدد دے رہے ہیں۔ پُورے نہیں نیم عیسائی تو ضرور ہیں۔ اگر ہم اُن کے عقائد ردیّہ کی تردید نہ کریں تو کیا کریں؟ پھر ہمیں ماننا پڑیگا کہ نعوذ باللہ اسلام۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے پاک نبی اور قرآن شریف خدا کا کلام برحق نہیں۔ حضرت مسیحؑ زندہ نہیں بلکہ مر گئے کشمیر سرینگر محلہ خانیار میں مدفون ہیں۔ یہی سچا عقیدہ ہے۔

طلاق اور حلالہ ایک صاحب نے سوال کیا کہ جو لوگ ایک ہی دفعہ تین طلاق لکھدیتے ہیں ان کی وہ طلاق جائز ہوتی ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں فرمایا کہ:۔

لہ طلاق کا یہ مضمون الحکم نے ۳؍ اپریل کی شام کی ڈائری میں لکھا ہے اور طلاق کا قریباً یہی مضمون البدر نے ۴؍ اپریل کی صبح کی سیر میں بیان کیا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ مضمون دونو وقت بیان ہوا ہے اور یا الحکم اور البدر کے ڈائری نویس صاحبان میں سے کسی ایک کو ۳؍ اپریل کی شام کی ڈائری کو ۴؍ اپریل کی ڈائری میں یا ۴؍ اپریل کی صبح کی ڈائری کو ۳؍ اپریل کی شام کی ڈائری لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (مرتب)

قرآن شریف کے فرمودہ کی رُو سے تین طلاق دی گئی ہوں اور ان میں سے ہر ایک کے درمیان اتنا ہی وقفہ رکھا گیا جو قرآن شریف نے بتایا ہے تو ان تینوں کی عدت گذرنے کے بعد اس خاوند کا کوئی تعلق اس بیوی سے نہیں رہتا۔ ہاں اگر کوئی شخص اس عورت سے عدت گزرنے کے بعد نکاح کرے اور پھر اتفاقاً وہ اس کو طلاق دیدے تو اس خاوند اوّل کو جائز ہے کہ اس بیوی سے نکاح کرلے۔ لیکن اگر دوسرا خاوند خاوندِ اوّل کی خاطر سے یا لحاظ سے اس بیوی کو طلاق دے کہ تا وہ پہلا خاوند اس سے نکاح کرلے تو یہ حلالہ ہوتا ہے اور یہ حرام ہے۔

لیکن اگر تین طلاق ایک ہی وقت میں دی گئی ہوں تو اس خاوند کو یہ فائدہ دیا گیا ہے کہ وہ عدت گذرنے کے بعد بھی اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے کیونکہ یہ طلاق ناجائز طلاق تھی دراصل قرآن شریف میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو یہ امر نہایت ہی ناگوار ہے کہ پرانے تعلقات والے خاوند اور بیوی آپس کے تعلقات کو چھوڑ کر الگ الگ ہو جاویں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے طلاق کے واسطے بڑی بڑی شرائط لگائی ہیں وقفہ کے بعد تین طلاق کا دینا اور ان کا ایک ہی جگہ رہنا وغیرہ یہ امور سب اس واسطے ہیں کہ شاید کسی وقت اُن کے دلی رنج دُور ہو کر آپس میں صُلح ہو جاوے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کوئی قریبی رشتہ دار وغیرہ آپس میں لڑائی کرتے ہیں اور تازہ جوش کے وقت میں حکام کے پاس عرضی پرچے لے کر آتے ہیں تو آخر دانا حکام اس وقت ان کو کہدیتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے بعد آنا۔ اصل غرض ان کی صرف یہی ہوتی ہے کہ یہ آپس میں صلح کریں گے اور ان کے جوش فرو ہونگے تو پھر انکی مخالفت باقی نہ رہیگی۔ اسی واسطے وہ اس وقت انکی وہ درخواست لینا مصلحت کے خلاف جانتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی مرد اور عورت کے الگ ہونے کے واسطے کافی موقعہ رکھ دیا ہے یہ ایک ایسا موقعہ ہے کہ طرفین کو اپنی بھلائی بُرائی کے سوچنے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (البقرۃ ۲۳۰) یعنی دو دفعہ کی طلاق ہونے کے بعد یا اُسے اچھی طرح سے رکھ لیا جاوے یا احسان سے جُدا کر دیا جاوے۔ اگر اتنے لمبے عرصہ میں بھی ان کی آپس میں صلح نہیں تو پھر ممکن نہیں کہ وہ اصلاح پذیر ہوں۔

وتر کیسے پڑھے جائیں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ وتر کس طرح پڑھنے چاہئیں۔ اکیلا بھی جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا:۔

اکیلا وتر تو ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ وتر تین ہیں خواہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر کر تیسری رکعت پڑھ لو۔ خواہ تینوں ایک ہی سلام سے آخر میں التحیات بیٹھ کر پڑھ لو۔ ایک وتر تو ٹھیک نہیں۔

مخالفوں کو سلام کہنا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضور مخالفوں سے جو ہیں اور حضور کو گالی گلوچ نکالتے ہیں اور سخت سُست کہتے ہیں السلام علیکم جائز ہے یا نہیں۔ فرمایا:۔

مومن بڑا غیرت مند ہوتا ہے کیا غیرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ تو گالیاں دیں اور تم اُن سے السلام علیکم کرو؟ ہاں البتہ خرید و فروخت جائز ہے۔ اس میں حرج نہیں۔ کیونکہ قیمت دینی اور مال لینا کسی کا اسمیں احسان نہیں

مِنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ کی تفسیر

ہمیں کئی بار اس آیت کی طرف توجہ ہوئی ہے اور اس میں سوچتے ہیں کہ مِنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ (الانبیاء: ۹۷)

اس کا ایک تو یہ مطلب ہے کہ ساری سلطنتیں، ریاستیں اور حکومتیں ان سب کو اپنے زیر کرینگے اور کسی کو ان کے مقابلہ کی تاب نہ ہوگی۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ حدب کے معنے بلندی۔ نسل کے معنے دوڑنا یعنی ہر بلندی پر سے دوڑ جاویں گے کل عمومیت کے معنے رکھتا ہے یعنی ہر قسم کی بلندی کو کُود جاویں گے۔ بلندی پر چڑھنا قوت اور جرأت کو چاہتا ہے۔ نہایت بڑی بھاری اور آخری بلندی مذہب کی بلندی ہوتی ہے۔ ساری زنجیروں کو انسان توڑ سکتا ہے مگر رسم اور مذہب کی ایک ایسی زنجیر ہوتی ہے کہ اس کو کوئی ہمت والا ہی توڑ سکتا ہے۔

سو ہمیں اس ربط سے ایک یہ بھی بشارت معلوم ہوتی ہے کہ وہ آخرکار اس مذہب اور رسم کی بلندی کو اپنی آزادی اور جرأت سے پھلانگ جاویں گے اور آخرکار اسلام میں داخل ہوتے جاوینگے اور یہی ضالّ کے لفظ سے بھی ٹپکتا ہے اور اس امر کی بنیادی اینٹ قیصر جرمن نے چند دن ہوئے۔ اپنا عقیدہ عیسویت کے متعلق ظاہر کرکے رکھدی ہے۔

دجّال کے کانا ہونے سے مراد

یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ دجّال کانا ہوگا۔ ایک آنکھ بالکل نہ ہوگی اور دوسری میں پھُلّ ہوگا۔ یہ ایک نہایت باریک استعارہ ہے یعنی اس کی ایک آنکھ (قرآن کی آنکھ) تو بالکل نہ ہوگی۔ اس طرف سے تو وہ بالکل اندھا اور کالمیت ہوگا اور دوسری توریت والی سو وہ بھی کانی ہوگی اس میں بھی پھُلّ ہوگا یعنی اسکی تعلیم پر بھی پُورے طور سے کاربند نہ ہونگے۔ چنانچہ واقعہ نے کیسا صاف بتادیا ہے کہ یہ اسی طرح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کیسی صاف طور سے پوری ہوئی ہے۔

عیسویت کے ابطال کے واسطے تو ایک دانا آدمی کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے اس عقیدہ پر نظر کرے کہ خدا مر گیا ہے۔ بھلا کوئی سوچے کہ خدا بھی مرا کرتا ہے۔ اگر یہ کہیں کہ خدا کی رُوح نہیں۔ بلکہ جسم مرا تھا تو اُن کا کفارہ باطل ہوجاتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ صفحہ ۱۳-۱۴ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

۴ اپریل ۱۹۰۳ء

(بوقت سیر)

طلاق

ایک شخص کے سوال پر فرمایا کہ:۔

طلاق ایک وقت میں کامل نہیں ہوسکتی۔ طلاق میں تین طہر ہونے ضروری ہیں۔ فقہاء نے ایک ہی مرتبہ تین طلاق دے دینی جائز رکھی ہے مگر ساتھ ہی اس میں یہ رعایت بھی ہے کہ عدت کے بعد اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو وہ عورت اسی خاوند سے نکاح کرسکتی ہے اور دوسرے شخص سے بھی کرسکتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے جب تین طلاق دیدی جاویں تو پہلا خاوند اس عورت سے نکاح نہیں کرسکتا جبتک کہ وہ کسی اور کے نکاح میں آوے اور پھر وہ دوسرا خاوند بلا عمد اسے طلاق دیدے۔ اگر وہ عمداً اسی لیے طلاق دیگا کہ اپنے پہلے خاوند سے وہ پھر نکاح کرلیوے تو یہ حرام ہوگا کیونکہ اسی کا نام حلالہ ہے جو کہ حرام ہے۔ فقہاء نے جو ایک دم کی تین طلاقوں کو جائز رکھا ہے اور پھر عدت کے گذرنے کے بعد اسی خاوند سے نکاح کا حکم دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اوّل اُسے شرعی طریق سے طلاق نہیں دی۔

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو طلاق بہت ناگوار ہے کیونکہ اس سے میاں بیوی دونوں کی خانہ بربادی ہوجاتی ہے اس واسطے تین طلاق اور تین طہر کی مدت مقرر کی ہے کہ اس عرصہ میں دونو اپنا نیک و بد سمجھ کر اگر صلح چاہیں تو کرلیں۔

نمازِ جنازہ

فرمایا:۔ اگر متوفی بالجہر مکفر اور مکذب نہ ہو تو اس کا جنازہ پڑھ لینے میں حرج نہیں۔ کیونکہ علام الغیوب خدا کی پاک ذات ہے۔

فرمایا۔ جو لوگ ہمارے مکفر ہیں اور ہم کو صریحاً گالیاں دیتے ہیں۔ اُن سے السلام علیکم مت لو اور نہ اُن سے مل کر کھانا کھاؤ۔ ہاں خرید و فروخت جائز ہے اس میں کسی کا احسان نہیں۔

جو شخص ظاہر کرتا ہے کہ مَیں نہ اُدھر کا ہوں اور نہ اِدھر کا ہوں اصل میں وہ بھی ہمارا مکذب ہے اور جو ہمارا مصدق نہیں اور کہتا ہے کہ مَیں ان کو اچھا جانتا ہوں وہ بھی مخالف ہے ایسے لوگ اصل میں منافق طبع ہوتے ہیں۔ اُن کا یہ اصول ہوتا ہے کہ

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

ان لوگوں کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں ہوتا۔ بظاہر کہتے ہیں کہ ہم کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے مگر یاد رکھو کہ جو شخص ایک طرف کا ہوگا اس سے کسی نہ کسی کا دل ضرور دُکھے گا۔

مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْن

فرمایا کہ:۔ مَیں نے اس آیت پر بڑی غور کی ہے۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ ہر ایک بلندی سے دوڑیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر ایک سلطنت پر

غالب آجاویں گے۔ دوم یہ کہ بلندی کی طرف انسان قوت اور جرأت کے بغیر دوڑ اور چڑھ نہیں سکتا اور مذہب پر غالب آجانا بھی ایک بلندی ہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر وہ زمانہ بھی آوے گا کہ مذہب کے اوپر سے بھی گذر جاویں گے یعنی اپنے اس تثلیثی مذہب سے بھی عبور کر جاویں گے اور اس کو پاؤں کے نیچے مَسل دیویں گے اور اسی سے ہمیں اُن کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بُو آتی ہے۔ پہلی بات تو پوری ہو چکی ہے۔ اب انشاء اللہ دوسری بات پوری ہو گی اور یہ باتیں خدا تعالیٰ کے ارادہ کے ساتھ ہوا کرتی ہیں۔ جب خدا تعالیٰ کی مشیت ہو تو ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور دلوں کو حسب استعداد صاف کرتے ہیں۔ تب یہ کام ہوا کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا خلقِ عظیم

فرمایا:۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا نمونہ۔ ایک صوفی لکھتا ہے کہ آپ کے پاس ایک نصرانی ملاقات کو آیا۔ آپ نے اس کو اپنا مہمان کیا۔ رات کو کھانا اور بستر دیا مگر وہ کمبخت بہت کھا گیا۔ رات کو بدہضمی ہوئی تو لحاف میں اس کا دست نکل گیا۔ اس لیے شرمندہ ہو کر صبح کو چوری چوری چل دیا۔ جب وہ دُور نکل گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ مہمان چلا گیا ہے۔ بستر دیکھا تو پاخانہ سے بھرا ہوا۔ آپ نے اُسے اپنے ہاتھ سے دھونا شروع کیا۔ صحابہؓ نے ہر چند اصرار کیا کہ ہم دھوئیں مگر آپ نے فرمایا کہ وہ میرا مہمان تھا مجھے دھونے دو۔ ادھر راستے میں نصرانی کو یاد آیا کہ وہ اپنے سونے کی صلیب بستر پر بھول آیا ہے۔ اُسے لینے کے واسطے وہ واپس آیا۔ دیکھا تو آپ وہی نجاست بھرا لحاف اپنے ہاتھ سے دھو رہے ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھ کر صلیبی ایمان پر اس نے لعنت کی اور مسلمان ہو گیا۔

دربارِ شام

رقت کی لذت

طاعون کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ایک عرب صاحب نووارد تھے۔ انہوں نے قرآن شریف سُنایا اس کی لذت اور رقت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں حضرت اقدس نے فرمایا کہ دنیا میں ہزاروں لذتیں ہیں مگر رقت جیسی کوئی بھی لذت نہیں۔ یہی ہے جس سے نماز اور عبادت کا مزا آتا ہے اور پھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۴ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)[1]

---

[1] ایک عرب صاحب ملک مصر سے تشریف لائے ہوئے تھے اور قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ حضرت اقدس نے ان کا قرآن شریف سُن کر اُن کے لب و لہجہ کو بہت پسند کیا اور قرآن شریف کی عظمت کے خیال سے ان کی تکریم کی۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء)

۵؍اپریل ۱۹۰۳ء

کثرتِ عوارض کی وجہ

ان مختلف امراض اور عوارض کے ذکر پر جو انسان کو لاحق ہوتے ہیں فرمایا کہ:۔
اللہ تعالیٰ قادر تھا کہ چند ایک بیماریاں ہی انسان کو لاحق کر دیتا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے امراض ہیں جن میں وہ مبتلا ہوتا ہے۔ اس قدر کثرت میں خدا تعالیٰ کی یہ حکمت معلوم ہوتی ہے تاکہ ہر طرف سے انسان اپنے آپ کو عوارض اور امراض میں گھرا ہوا پا کر اللہ تعالیٰ سے ترساں اور لرزاں رہے اور اسے اپنی بے ثباتی کا ہر دم یقین رہے اور مغرور نہ ہو اور غافل ہو کر موت کو نہ بھول جاوے اور خدا سے بے پروا نہ ہو جاوے۔

مرا بمرگِ عدو جائے شادمانی نیست

بعض مخالفین کے طاعون سے ہلاک ہونے کی خبر آئی۔ اس پر فرمایا کہ:۔
دشمن کی موت سے خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ ہر ایک شخص کا خدا تعالیٰ سے الگ الگ حساب ہے۔ سو ہر ایک کو اپنے اعمال کی اصلاح اور جانچ پڑتال کرنی چاہیئے۔ دوسروں کی موت تمہارے واسطے عبرت اور ٹھوکر سے بچنے کا باعث ہونی چاہیئے نہ یہ کہ تم ہنسی ٹھٹھے میں بسر کر کے اور بھی خدا تعالیٰ سے غافل ہو جاؤ میں نے ایک جگہ توارت میں دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ اس میں فرماتا ہے کہ ایک وقت ہوتا ہے کہ جب میں ایک قوم کو اپنی قوم بنانی چاہتا ہوں تو اس کے دشمنوں کو ہلاک کر کے اُسے خوش کرتا ہوں۔ مگر اُسی قوم کی بے اعتنائیوں سے ایک وقت پھر ایسا آجاتا ہے کہ اس کو تباہ کر کے اس کے دشمنوں کو خوش کرتا ہوں۔

کامیاب ہونیوالے

فرمایا:۔
اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی نظر میں نیک اور نمازی وغیرہ ہوتے ہیں مگر ان کا اندر بدیوں اور گناہوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے وہ عند اللہ تقویٰ پر قدم مارنے والے ہوتے ہیں۔ مگر ان دونوں میں سے کامیاب ہونے والے وہی ہوتے ہیں جو عند اللہ متقی اور خدا کی نظر میں نیک ہوتے ہیں اور ان پر خدا تعالیٰ راضی ہوتا ہے صرف لاف زنی کام نہیں آسکتی۔

اس وقت دو قوموں کا آپس میں مقابلہ ہے۔ ایک تو ہمارے مخالف ہیں اور دوسری ہماری جماعت۔ اب خدا تعالیٰ دونوں کے دلوں کو دیکھتا اور ان کے اعمال سے آگاہ ہے۔ وہی جانتا ہے کہ ہماری جماعت اس کی نگاہ میں کیسی ہے اور دشمن کیسے؟ اور وہ ان سے کہاں تک ناراض ہے۔ پس ہر ایک کو چاہیئے کہ اپنا حساب خود ٹھیک کر لے۔ چاہیئے کہ دوسروں کا ذکر کرتے وقت تقویٰ سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ اپنے اعمال کا خیال ہو کہ کہاں

تک ہم خدا تعالیٰ کے منشاء کو پُورا کرنیوالے ہیں یا صرف لافیں ہی لافیں ہیں۔ ابھی طاعون موقوف نہیں ہو گئی خدا جانے کب تک اس کا دورہ ہے اور اس نے کیا کچھ دکھانا ہے۔ سات سال سے تو ہم برابر دیکھتے ہیں کہ یوماً فیوماً بڑھتی ہی جاتی ہے اور پیچھے قدم نہیں ہٹاتی۔ ہر سال پہلے کی نسبت سُنا جاتا ہے کہ ترقی پر ہے۔

نازک زمانہ

زمانہ ایسا آیا ہوا ہے کہ لوگ اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ ہزارہا انعامات اور خدا تعالیٰ کے فضل کے نشانات ہیں اور عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے سے تو نفس کو شرم نہ آئی کہ خدا تعالیٰ کا حق بھی ادا کرے۔ مگر شاید اس قہری نشان کو دیکھ کر اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ افسوس لوگ انعامات اور احسانات الٰہیہ سے تو شرمندہ نہ ہوئے اب اس عذاب ہی سے ڈر کر سنور جاویں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں کہ مسلمان کہلا کر مسلمانوں کی اولاد ہو کر اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح گالیاں دیتے ہیں جیسے چوڑھے چمار کسی کو نکالا کرتے ہیں۔ اللہ اور رسول سے اُن کو بجز گالیوں کے اور کوئی تعلق ہی نہیں۔ بڑے گندہ دہن اور پرلے درجہ کے عیاش۔ بدمعاش۔ بھنگی۔ چرسی۔ قمار باز وغیرہ بن گئے ہیں۔

اب ایسے لوگوں کی زجر اور توبیخ کے واسطے خدا تعالیٰ جوش میں نہ آوے تو کیا کرے؟ خدا غیور بھی ہے وہ شدید العقاب بھی ہے۔ ایسے لوگوں کی اصلاح بھلا بجز عذاب اور قہرِ الٰہی کے نازل ہونے کے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ چونکہ بعض طبائع عذاب ہی سے اصلاح پذیر ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ (الاعراف: ۳۵) جب عذاب الٰہی نازل ہوجاتا ہے تو پھر وہ اپنا کام کرکے ہی جاتا ہے اور اس آیت سے یہ بھی استنباط ہوتا ہے کہ قبل از نزول عذاب توبہ و استغفار سے وہ عذاب ٹل بھی جایا کرتا ہے۔

استغفار کی حقیقت

گناہ ایک ایسا کیڑا ہے جو انسان کے خون میں ملا ہوا ہے مگر اس کا علاج استغفار سے ہی ہو سکتا ہے۔ استغفار کیا ہے؟ یہی کہ جو گناہ صادر ہو چکے ہیں ان کے بدثمرات سے خدا تعالیٰ محفوظ رکھے اور جو ابھی صادر نہیں ہوئے اور جو بالقوہ انسان میں موجود ہیں ان کے صدور کا وقت ہی نہ آوے اور اندر ہی اندر وہ جل بھُن کر راکھ ہو جاویں۔

یہ وقت بڑے خوف کا ہے۔ اس لیے توبہ و استغفار میں مصروف رہو اور اپنے نفس کا مطالعہ کرتے رہو۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اور اہلِ کتاب مانتے ہیں کہ صدقات و خیرات سے عذاب ٹل جاتا ہے مگر قبل از نزول عذاب۔ مگر جب نازل ہو جاتا ہے تو ہرگز نہیں ٹلتا۔ پس تم ابھی سے استغفار کرو اور توبہ میں لگ جاؤ تا تمہاری باری ہی نہ آوے اور اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰۶ مورخہ ۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء)

۶؍اپریل ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

حقیقتِ دُعا فرمایا کہ:۔

ہمارے دوستوں کو بعض وقت دُعا کے متعلق ابتلاء پیش آجاتے ہیں اسلیئے مناسب معلوم ہوا کہ اُن کو دُعا کی حقیقت سے اطلاع دی جاوے اور اسی لیے مَیں نے حقیقت الدعا کے نام سے ایک رسالہ لکھنا شروع کیا ہے مگر چونکہ طبیعت علیل رہی ہے اس لیے ختم نہیں کر سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام مدار دُعا پر ہی تھا اور ہر ایک مشکل میں آپ دُعا ہی کرتے تھے۔ ایک روایت سے ثابت ہے کہ آپ کے گیارہ لڑکے فوت ہو گئے ہیں تو کیا آپ نے اُن کے حق میں دُعا نہ کی ہوگی ؟ آج کل ایک غلط فہمی لوگوں کے دلوں میں پڑ گئی ہے اور یہ اس جہالت کے زمانہ کی نشانی ہے کہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ فلاں ولی کی ایک پھونک مارنے سے صاحبِ کمال ہو گیا اور فلاں کے ہاتھ سے مُردے زندہ ہوئے۔

بیعت اور توبہ چند احباب نے بیعت کی۔ ان کو حضرت اقدس نے نصیحت فرمائی۔

بیعت میں انسان زبان کے ساتھ گناہ سے توبہ کا اقرار کرتا ہے مگر اس طرح سے اس کا اقرار جائز نہیں ہوتا جب تک دل سے وہ اقرار نہ کرے۔ یہ خدا تعالیٰ کا بڑا فضل اور احسان ہے کہ جب سچے دل سے توبہ کی جاتی ہے تو وہ اُسے قبول کر لیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ یعنی مَیں توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ اس اقرار کو جائز قرار دیتا ہے جو کہ سچے دل سے توبہ کرنیوالا کرتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کا اقرار نہ ہوتا تو پھر توبہ کا منظور ہونا ایک مشکل امر تھا۔ سچے دل سے جو اقرار کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر خدا تعالیٰ بھی اپنے تمام وعدے پُورے کرتا ہے جو اُس نے توبہ کرنیوالوں کے ساتھ کئے ہیں اور اسی وقت سے ایک نُور کی تجلّی اس کے دل میں شروع ہو جاتی ہے۔ جب انسان یہ اقرار کرتا ہے کہ مَیں تمام گناہوں سے بچوں گا اور دین کو دُنیا پر مقدم رکھوں گا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ اگرچہ مجھے اپنے بھائیوں، قریبی رشتہ داروں اور سب دوستوں سے قطع تعلق ہی کرنا پڑے مگر مَیں خدا تعالیٰ کو سب سے مقدم رکھونگا اور اسی کیلئے اپنے تعلقات چھوڑتا ہوں۔ ایسے لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے کیونکہ انہیں کی توبہ دلی توبہ ہوتی ہے۔

پھر جو لوگ دل سے دُعا کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان پر رحم کرتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ آسمان زمین اور سب اشیاء

کا خالق ہے ویسے ہی وہ توبہ کا بھی خالق ہے اور اگر اس نے توبہ کو قبول کرنا نہ ہوتا تو وہ اُسے پیدا ہی نہ کرتا. گناہ سے توبہ کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں سچی توبہ کرنیوالا خدا تعالیٰ سے بڑے بڑے انعامات پاتا ہے۔ یہ اولیاء، قطب، غوث کے مراتب اسی واسطے لوگوں کو ملے ہیں کہ وہ توبہ کرنے والے تھے اور خدا تعالیٰ سے ان کا پاک تعلق تھا اس واسطے ہرگز نہیں ہے کہ وہ منطق، فلسفہ اور دیگر علوم طبعیہ وغیرہ میں ماہر تھے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ ان بندوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے۔

اس شرط سے دین کو کبھی قبول نہ کرنا چاہیئے کہ مَیں مالدار ہو جاؤں گا۔ مجھے فلاں عہدہ مِل جاوے گا۔ یاد رکھو کہ شرطی ایمان لانے والے سے خدا تعالیٰ بیزار ہے۔ بعض وقت مصلحت الٰہی یہی ہوتی ہے کہ دنیا میں انسان کی کوئی مراد حاصل نہیں ہوتی۔ طرح طرح کے آفات۔ بلائیں۔ بیماریاں اور نامرادیاں لاحق حال ہوتی ہیں مگر ان سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ موت ہر ایک کے واسطے کھڑی ہے اگر بادشاہ ہو جاوے گا تو کیا موت سے بچ جاویگا؟ غریبی میں بھی مرنا ہے۔ بادشاہی میں بھی مرنا ہے اس لیے سچی توبہ کرنے والے کو اپنے ارادوں میں دنیا کی خواہش نہ ملانی چاہیئے۔

خدا تعالیٰ کی یہ عادت ہرگز نہیں ہے کہ جو اس کے حضور عاجزی سے گر پڑے۔ وہ اُسے خائب و خاسر کرے اور ذلت کی موت دیوے جو اس کی طرف آتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے ایسی نظیر ایک بھی نہ ملے گی کہ فلاں شخص کا خدا تعالیٰ سے سچا تعلق تھا اور پھر وہ نامراد رہا۔ خدا تعالیٰ بندے سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہش اس کے حضور پیش نہ کرے اور خالص ہو کر اس کی طرف جھک جاوے جو اس طرح جھکتا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور ہر ایک مشکل سے خود بخود اس کے واسطے راہ نکل آتی ہے جیسے کہ وہ خود وعدہ فرماتا ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۳،۴)

اس جگہ رزق سے مُراد روٹی وغیرہ نہیں بلکہ عزت، علم وغیرہ سب باتیں جن کی انسان کو ضرورت ہے اس میں داخل ہیں۔ خدا تعالیٰ سے جو ذرہ بھر بھی تعلق رکھتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال: ۸) ہمارے ملک ہندوستان میں نظام الدین صاحب اور قطب الدین صاحب اولیاء اللہ کی جو عزت کی جاتی ہے۔ وہ اسی لیے ہے کہ خدا تعالیٰ سے اُن کا سچا تعلق تھا اور اگر یہ نہ ہوتا تو تمام انسانوں کی طرح وہ بھی زمینوں میں ہل چلاتے معمولی کام کرتے۔ مگر خدا تعالیٰ کے سچے تعلق کی وجہ سے لوگ اُن کی مٹی کی بھی عزت کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کا حامی ہو جاتا ہے۔ دشمن چاہتے ہیں کہ ان کو نیست و نابود کریں مگر وہ روز بروز ترقی پاتے ہیں اور اپنے دشمنوں پر غالب آتے جاتے ہیں جیسا کہ اس کا وعدہ ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ

رُسُلِیْ (المجادلہ : ۲۲) یعنی خدا تعالیٰ نے لکھدیا ہے کہ مَیں اور میرے رسُول ضرور غالب رہیں گے۔ اوّل اوّل جب انسان خدا تعالیٰ سے تعلق شروع کرتا ہے تو وہ سب کی نظروں میں حقیر اور ذلیل ہوتا ہے مگر جوں جوں وہ تعلقات الٰہی میں ترقی کرتا ہے توں توں اس کی شہرت زیادہ ہوتی ہے حتٰی کہ وہ ایک بڑا بزرگ بن جاتا ہے جیسے خدا تعالیٰ بڑا ہے اسی طرح جو کوئی اس کی طرف زیادہ قدم بڑھاتا ہے وہ بھی بڑا ہو جاتا ہے حتٰی کہ آخر کار خدا تعالیٰ کا خلیفہ ہو جاتا ہے۔

اس توبہ کو کھیل نہ خیال کرو اور یہ نہ کرو کہ اُسے یہیں چھوڑ جاؤ بلکہ اُسے ایک امانت اللہ تعالیٰ کی خیال کرو۔ توبہ کرنے والا خدا تعالیٰ کی اس کشتی میں سوار ہوتا ہے جو کہ اس طوفان کے وقت اس کے حکم سے بنائی گئی ہے۔ اُس نے مجھے فرمایا ہے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ اور پھر یہ بھی فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۔ جس طرح بادشاہ اپنی رعایا میں اپنے نائب کو بھیجتا ہے اور پھر جو اس کا مطیع ہوتا ہے اُسے بادشاہ کا مطیع سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ بھی اپنے نائب دنیا میں بھیجتا ہے۔ آجکل تو یہ ایک بیج ہے جس کے ثمرات تمہارے تک ہی نہ ٹھہریں گے بلکہ اولاد تک بھی پہنچیں گے۔ سچے دل سے توبہ کرنے والوں کے گھر رحمت سے بھر جاتے ہیں۔

دنیوی لوگ اسباب پر بھروسہ کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اس بات کے لیے مجبور نہیں ہے کہ اسباب کا محتاج ہو کبھی چاہتا ہے تو اپنے پیاروں کے لیے بلا اسباب بھی کام کر دیتا ہے اور کبھی اسباب پیدا کر کے کرتا ہے اور کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنے بنائے اسباب کو بگاڑ دیتا ہے۔

غرض اپنے اعمال کو صاف کرو اور خدا تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرو اور غفلت نہ کرو۔ جس طرح بھاگنے والا شکار جب ذرا سُست ہو جاوے تو شکاری کے قابو میں آجاتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے ذکر سے غفلت کرنے والا شیطان کا شکار ہو جاتا ہے۔ توبہ کو ہمیشہ زندہ رکھو اور کبھی مُردہ نہ ہونے دو۔ کیونکہ جس عضو سے کام لیا جاتا ہے وہی کام دے سکتا ہے اور جس کو بیکار چھوڑ دیا جاوے پھر وہ ہمیشہ کے واسطے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح توبہ کو بھی متحرک رکھو تاکہ وہ بیکار نہ ہو جاوے۔ اگر تم نے سچی توبہ نہیں کی تو وہ اس بیج کی طرح ہے جو پتھر پر بویا جاتا ہے اور اگر وہ سچی توبہ ہے تو وہ اس بیج کی طرح ہے جو عمدہ زمین میں بویا گیا ہے اور اپنے وقت پر پھل لاتا ہے۔ آج کل اس توبہ میں بڑی بڑی مشکلات ہیں۔ اب یہاں سے جا کر تم کو بہت کچھ سُننا پڑیگا اور لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے کہ تم نے ایک مجذوم۔ کافر۔ دجّال وغیرہ کی بیعت کی۔ ایسا کہنے والوں کے سامنے جوش ہرگز مت دکھانا۔ ہم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر کے واسطے مامور کئے گئے ہیں۔ اس لیے چاہیئے کہ تم ان کے لیے دُعا کرو کہ خدا تعالیٰ ان کو بھی ہدایت دے اور جیسے کہ تم کو اُمید ہے کہ وہ تمہاری باتوں کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ تم بھی اُن سے منہ پھیر لو۔

ہمارے غالب آنے کے ہتھیار استغفار۔ توبہ۔ دینی علوم کی واقفیت۔ خدا تعالیٰ کی عظمت کو مدّنظر رکھنا

اور پانچوں وقت کی نمازوں کو ادا کرنا ہیں۔ نماز دُعا کی قبولیت کی کُنجی ہے جب نماز پڑھو تو اس میں دُعا کرو اور غفلت نہ کرو۔ اور ہر ایک بدی سے خواہ وہ حقوق الٰہی کے متعلق ہو خواہ حقوق العباد کے متعلق ہو۔ بچو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰۶-۱۰۷ مورخہ ۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء)

۷ر اپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

صحابہؓ کی فضیلت

فرمایا:-

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (نور: ۳۸) یہ ایک ہی آیت صحابہؓ کے حق میں کافی ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی تبدیلیاں کی تھیں اور انگریز بھی اس کے معترف ہیں کہ اُن کی کہیں نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادیہ نشین لوگ اور اتنی بہادری اور جرأت۔ تعجب آتا ہے۔

طاعون کا علاج

طاعون کے علاج کے متعلق ذکر آنے پر فرمایا:-

مجھے سمجھ نہیں آتا کہ طاعون کا کوئی قطعی علاج ہو۔ اس کے زور کے وقت اور اس بیماری میں مبتلا شدید کو اگر کوئی دوائی فائدہ کرے۔ تب تو مان لیں۔ جب زہریلے مواد نہایت تیزی سے پیدا ہو رہے ہوں۔ اس وقت کسی دوائی کا عمل دکھلاؤ تو سہی۔ اس کا نسخہ تو محض اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

نسیم توحید

اب خدا تعالیٰ کی طرف سے امید ہے کہ وہ دن قریب ہیں کہ ہمارا غلبہ ہو جاوے کیونکہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ توحید کی طرف رجوع کرتے جاتے ہیں عیسائیوں نے مسیح کی خدائی پر اب اتنا زور دینا چھوڑ دیا ہے۔ ہنود میں آریہ توحید طرف مائل ہو رہے ہیں۔ پس یہ ایک ہوا چل پڑی ہے۔ جب ان سب لوگوں نے اپنے اصول چھوڑ دیئے ہیں تو اُن کی تو خودکشی ہو رہی ہے۔

جیسے چھ مہینے کے بعد کھیتی کی حالت کچھ اَور ہی ہو جاتی ہے اسی طرح ان لوگوں کے عقائد میں بین فرق نظر آتا جاتا ہے۔

ایک اکیلے آدمی کا کام ہرگز نہیں کہ کسرِ صلیب کر سکے مگر ہاں جب خدا تعالیٰ کا ارادہ ساتھ ہو تو پھر ملائک اس کی امداد میں کام کرتے ہیں۔

نزولِ مامور

جب مامور مامور ہو کر آتا ہے تو بے شمار فرشتے اس کے ساتھ نازل ہوتے ہیں اور دلوں میں اسی طرح نیک اور پاک خیالات کو پیدا کرتے ہیں جیسے اس سے پہلے

شیاطین بُرے خیالات پیدا کیا کرتے ہیں اور یہ سب مامور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ اسی کے آنے سے یہ تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح فرمایا۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ۔ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ۔ (القدر: ۲،۳) خدا تعالیٰ نے مقدر کیا ہوا ہوتا ہے کہ مامور کے زمانہ میں ملائک نازل ہوں۔ کیا یہ کام بغیر امداد الٰہی کہیں ہوسکتا ہے؟ کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک شخص خود بخود اُٹھے اور کسرِ صلیب کر ڈالے نہیں۔ ہاں اگر خدا اُسے اُٹھا دے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

یہ کسرِ صلیب اعزازاً اور اکراماً مسیح موعود کی طرف منسوب کی جاتی ہے ورنہ کرتا تو سب کچھ خدا ہے۔ یہ باتیں عین وقت پر واقع ہوئی ہیں۔ قرآن سے بتصریح معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے جس کا نام خدا تعالیٰ نے رکھا ہے سِتَّةِ اَیَّامٍ۔ چھٹے دن کے آخری حصہ میں آدم کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ براہین میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اَرَدۡتُ اَنۡ اَسۡتَخۡلِفَ فَخَلَقۡتُ اٰدَمَ۔ پھر فرمایا اِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (الحج: ۴۸)

آج سے پہلے جو ہزار برس گذرا ہے وہ باعتبار بداخلاقیوں اور بداعمالیوں کے تاریکی کا زمانہ تھا کیونکہ وہ فسق و فجور کا زمانہ تھا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خَيۡرُ الۡقُرُوۡنِ قَرۡنِیۡ کہہ کر تین سو برس کو مستثنیٰ کر دیا ہے باقی ایک ہزار ہی رہ جاتا ہے ورنہ اس کے بغیر احادیث کی مطابقت ہو ہی نہیں سکتی اور اس طرح پر پہلی کتابوں سے بھی مطابقت ہو جاتی ہے اور وہ بات بھی پوری ہوتی ہے کہ ہزار سال تک شیطان کھلا رہے گا یہ بات بھی کیسی پوری ہوتی ہے اور انگریز بھی اسی واسطے شور مچاتے ہیں کہ یہی زمانہ ہے جس میں ہمارے مسیح کو دوبارہ آنا چاہیئے۔ یہ مسئلہ ایسا مطابق آیا ہے کہ کوئی مذہب اس سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک علمی نشان ہے جس سے گریز نہیں ہو سکتا۔

رؤیا کا اختتام

ایک بھائی کے خواب بیان کرنے پر فرمایا:۔

یہ خواب ایک عجیب بات پر ختم ہوا ہے۔ شیطان انسان کو طرح طرح کے تمثلات سے دھوکہ دینا چاہتا ہے مگر معلوم ہوا ہے کہ تمہارا نتیجہ بہت اچھا ہے کیونکہ اس رؤیا کا اختتام اچھی جگہ پر واقع ہوا ہے۔ ایسا اکثر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک ولی اللہ کا تذکرہ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو اُن کا آخری کلمہ یہ تھا کہ ابھی نہیں ابھی نہیں۔ ایک اُن کا مرید یہ کلمہ سُن کر سخت متعجب ہوا۔ اور رات دن رو رو کر دعائیں مانگنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ایک دن خواب میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔ دریافت کیا کہ یہ آخری لفظ کیا تھا اور آپ نے کیوں کہا تھا؟ آپ نے جواب دیا کہ شیطان چونکہ موت کے وقت ہر ایک انسان پر حملہ کرتا ہے کہ اس کا نورِ ایمان اخیر وقت پر چھین لے۔ اس لیے حسب معمول وہ میرے پاس بھی آیا اور مجھے مرتد کرنا چاہا اور مَیں نے جب اس کا کوئی وار چلنے نہیں دیا تو مجھے کہنے لگا کہ تو میرے ہاتھ سے بچ نکلا۔ اس لیے مَیں نے کہا کہ ابھی نہیں ابھی نہیں

یعنی جب تک مَیں مَر نہ جاؤں مجھے تجھ سے اطمینان حاصل نہیں۔

ایک رؤیاء پھر فرمایا:۔

آج رات مجھے بھی خواب آیا ہے نہ معلوم اس کا اصل مفہوم کیا ہے مَیں نے اس کے لفظوں سے اجتہادی معنے نکالے ہیں۔ جیسا کہ مَیں کسی راستہ پر چلا جاتا ہوں۔ گھر کے لوگ بھی ساتھ ہیں اور مبارک احمد کو مَیں نے گود میں لیا ہوا ہے۔ بعض جگہ نشیب و فراز بھی آجاتا ہے جیسے کہ دیوار کے برابر چڑھنا پڑتا ہے مگر آسانی سے اُتر چڑھ جاتا ہوں اور مبارک اسی طرح میری گود میں ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک مسجد میں جانا ہے۔ جاتے جاتے ایک گھر میں جا داخل ہوئے ہیں۔ گویا وہ گھر ہی مسجد موعود ہے جس کی طرف ہم جا رہے ہیں۔ اندر جا کر دیکھا ہے کہ ایک عورت بعمر ۱۸ سال سفید رنگ وہاں بیٹھی ہے۔ اس کے کپڑے بھگوے رنگ کے ہیں۔ مگر بہت صاف ہیں۔ جب اندر گئے ہیں تو گھر والوں نے کہا ہے کہ یہ احسن کی ہمشیرہ ہے اور یہیں خواب ختم ہو گئی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ ر اپریل ۱۹۰۳ء)

استفسار اور اُن کے جواب[1]

اہلِ بیت سے مراد

سوال:۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (احزاب:۳۴) کس کی شان میں ہے۔

جواب:۔ اگر قرآن شریف کو دیکھا جاوے تو جہاں یہ آیت ہے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں ہی کا ذکر ہے۔ سارے مفسر اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُمہات المومنین کی صفت اس جگہ بیان فرماتا ہے دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ (نور:۲۷) یہ آیت چاہتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے طیبات ہوں۔ ہاں اس میں صرف بیبیاں ہی شامل نہیں بلکہ آپ کے گھر کی رہنے والی ساری عورتیں شامل ہیں اور اس لیے اس میں بنت بھی داخل ہو سکتی ہے بلکہ ہے اور جب فاطمہ رضی اللہ عنہا داخل ہوئیں تو حسنین رضی اللہ عنہما بھی داخل ہوئے۔ پس اس سے زیادہ یہ آیت وسیع نہیں ہو سکتی جتنی وسیع ہو سکتی تھی۔ ہم نے کر دی۔ کیونکہ قرآن شریف ازواج کو مخاطب کرتا ہے اور بعض احادیث نے حضرت فاطمہ اور حسنین کو مطہرین میں داخل کیا ہے پس ہم نے دونوں کو یکجا جمع کر لیا۔

---

[1] اس عنوان سے الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۷ پر بعض سوال اور ان کے جوابات ایسے ہیں جو ۱۳ر اپریل ۱۹۰۳ء کی ڈائری میں الحکم میں اور ۱۴ر اپریل ۱۹۰۳ء کی ڈائری میں البدر میں چھپ چکے ہیں۔ لہٰذا انکو چھوڑ کر باقی استفسار اور انکے جواب یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ (مرتب)

شیعہ نے ازواج مطہرات کو سب وشتم سے یاد کیا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ایسا کریں گے اس لیے قبل از وقت اُن کی برأت کر دی۔

بعض مخالفین کا طاعون سے بچنا

سوال :۔ بعض مخالف کہتے ہیں کہ ہم پر کیوں طاعون نہیں آتی ؟

جواب :۔ فرمایا کہ :۔

ایک تنگ دروازہ سے جب لاکھ آدمی گذرنے والا ہے تو کیا وہ سب کے سب ایک ہی دفعہ گذر جائینگے؟ یا کسی آدمی نے لاکھ آدمی کی دعوت کی ہے تو کیا سب کو ایک دم کھانا کھلا دیگا ؟ نہیں بلکہ نوبت بہ نوبت ۔

طاعون کا دورہ بہت لمبا ہے ۔ ابھی سے کیوں گھبراتے ہیں ۔ دو چار موٹے موٹے مخالف اگر جلدی مَر جاویں تو پھر خاتمہ ہی ہو جاوے ۔ ان مخالفوں کی ہی وجہ سے تو انوار و برکات اور خوارق کا نزول ہوتا ہے اور ہوگا ۔ ابھی بعض کو ہدایت بھی ہوگی اور خدا تعالیٰ کا قانون اسی طرح پر چلا آتا ہے ۔

کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی کی تفسیر

سوال :۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو پوچھا رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (البقرۃ : ۲۶۱) اس سے کیا غرض ہے ؟

جواب :۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا مطلب جس کو سِرِّ الٰہی سمجھنا چاہیئے یہ ہے کہ ہر ایک چیز میری آواز سُنتی ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مُردوں کے زندہ ہونے پر کوئی شک پیدا نہیں ہوا ۔ کیونکہ ہم تو ہر روز دیکھتے ہیں کہ متعفن پانی اور اغذیہ میں سے جانور پیدا ہو جاتے ہیں ۔ پیٹ میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے کیا وہ پہلے مُردہ نہیں ہوتا ؟ پس واقعات سے انکار کرنے والا تو بڑا احمق ہوتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اصل سِر سے واقف ہونا چاہتے تھے ۔ پس خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر ایک چیز میری آواز سُنتی ہے جیسے پرندے تمہاری آواز سنکر دوڑے چلے آتے ہیں ۔ اسی طرح ہر ایک چیز میری آواز سُنتی اور میرے پاس دوڑی چلی آتی ہے ۔ یہانتک کہ ادویہ اور اغذیہ جو انسان کے پیٹ میں جاتی ہیں اور ہر ذرہ ذرہ میری آواز سُنتا ہے ۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ ایمان اور معرفت کا یقین دلانا چاہتا ہے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کو خالق سے ایک باریک کشش ہوتی ہے ۔ جیسے کسی کا شعر ہے ؎

ہمہ را روئے در خدا دیدم ❊ و آں خدا . برہمہ ترا دیدم

خدا تعالیٰ نے جو ملائک کی تعریف کی ہے وہ ہر ایک ذرہ ذرہ پر صادق آسکتی ہے جیسے فرمایا اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ (بنی اسرائیل : ۴۵) ویسے ملائکہ کی نسبت فرمایا یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (النحل : ۵۱)

اس کی تشریح نسیم دعوت میں خوب کردی ہے۔ ہر ایک ذرہ ملائکہ میں داخل ہے۔ اگر ان اعلیٰ کی سمجھ نہیں آتی تو پہلے ان چھوٹے چھوٹے ملائک پر نظر ڈال کر دیکھو۔ ملائکہ کا انکار انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے۔

غرض اس قصہ میں اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کی تابع ہے۔ اگر اس سے انکار کیا جاوے تو پھر تو خدا تعالیٰ کا وجود بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اخیر میں اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز اور حکیم بیان کی ہے یعنی اس کا غلبہ قہری ایسا ہے کہ ہر ایک چیز اس کی طرف رجوع کر رہی ہے بلکہ جب خدا تعالیٰ کا قرب انسان حاصل کرتا ہے تو اس انسان کی طرف بھی ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے جس کا ثبوت سورۃ العادیات میں ہے۔ عزیز، حکیم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غلبہ حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ ناحق کا دُکھ نہیں ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۹ مورخہ ۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء)

---

۹ راپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

حق و باطل

فرمایا:۔ حق اپنے زور اور قوت سے چلتا اور اس کے ساتھ باطل بھی ضرور چلتا ہے، لیکن باطل اپنی قوت اور طاقت سے نہیں چلتا بلکہ حق کے پرتو سے چلتا ہے کیونکہ حق چاہتا ہے کہ ساتھ ساتھ کچھ باطل بھی چلے تاکہ تمیز ہو۔ کاذبوں اور منکروں کے وجود سے بہت سی تحریکیں ہو جاتی ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دن ہی سارا مکہ آمنّا و صدّقنا کہہ کر ساتھ ہو لیتا تو پھر قرآن شریف کا نزول اسی دن بند ہو جاتا اور وہ اتنی بڑی کتاب نہ ہوتی۔ جس جس قدر زور سے باطل حق کی مخالفت کرتا ہے اسی قدر حق کی قوت اور طاقت تیز ہوتی ہے۔ زمینداروں میں بھی یہ بات مشہور ہے کہ جتنا جیٹھ ہاڑ تپتا ہے اسی قدر ساون میں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک قدرتی نظارہ ہے حق کی جس قدر زور سے مخالفت ہو اسی قدر وہ چمکتا اور اپنی شوکت دکھاتا ہے۔

ہم نے خود آزما کر دیکھا ہے جہاں جہاں ہماری نسبت زیادہ شور وغل ہوا ہے وہاں ایک جماعت تیار ہو گئی اور جہاں لوگ اس بات کو سنکر خاموش ہو جاتے ہیں وہاں زیادہ ترقی نہیں ہوتی۔ فتح کیلئے اول لڑائی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر لڑائی نہ ہو تو فتح کا وجود کہاں سے آئے؟ پس اسی طرح اگر حق کی مخالفت نہ ہو تو اس کی صداقت کس طرح کھلے؟

مرکز میں نمازوں کا قصر

نماز کے قصر کرنے کے متعلق سوال کیا گیا کہ جو شخص یہاں آتے ہیں وہ قصر کریں یا نہ؟ فرمایا :-

جو شخص تین دن کے واسطے یہاں آوے اس کے واسطے قصر جائز ہے۔ میری دانست میں جس سفر میں عزم سفر ہو پھر خواہ وہ دو تین چار کوس کا ہی سفر کیوں نہ ہو اس میں قصر جائز ہے۔ یہ ہماری سَیر سفر نہیں ہے۔ ہاں اگر امام مقیم ہو تو اس کے پیچھے پوری ہی نماز پڑھنی چاہیئے۔ حکام کا دورہ سفر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے باغ کی سَیر کرتا ہے۔ خواہ نخواہ قصر کرنے کا تو کوئی وجود نہیں۔ اگر دَوروں کی وجہ سے انسان قصر کرنے لگے تو پھر یہ دائمی قصر ہو گا جس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔ حکام کہاں مسافر کہلا سکتے ہیں۔ سعدیؒ نے بھی کہا ہے ؎

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و خوابگاہ ساخت

نکاح پر باجا اور آتش بازی

نکاح پر باجا بجانے اور آتش بازی چلانے کے متعلق سوال ہوا۔ فرمایا کہ :-

ہمارے دین میں دین کی بناء یُسر پر ہے عُسر پر نہیں اور پھر اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ ضروری چیز ہے باجوں کا وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھا۔ اعلان نکاح جس میں فسق و فجور نہ ہو۔ جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں ضروری شئے ہے کیونکہ اکثر دفعہ نکاحوں کے متعلق مقدمات تک نوبت پہنچتی ہے پھر وراثت پر اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اعلان کرنا ضروری ہے مگر اس میں کوئی ایسا امر نہ ہو جو فسق و فجور کا موجب ہو۔ رنڈی کا تماشا یا آتش بازی فسق و فجور اور اسراف ہے۔ یہ جائز نہیں۔

باجے کے ساتھ اعلان پر پوچھا گیا کہ جب برات لڑکے والوں کے گھر سے چلتی ہے کیا اسی وقت سے باجا بجتا جاوے یا نکاح کے بعد؟ فرمایا:-

ایسے سوالات اور جزو دَر جزو نکالنا بے فائدہ ہے۔ اپنی نیت کو دیکھو کہ کیا ہے اگر اپنی شان و شوکت دکھانا مقصود ہے تو فضول ہے اور اگر یہ غرض ہے کہ نکاح کا صرف اعلان ہو تو اگر گھر سے بھی باجا بجتا جاوے تو کچھ حرج نہیں۔ اسلامی جنگوں میں بھی تو باجا بجتا ہے وہ بھی ایک اعلان ہی ہوتا ہے۔

نیک نیتی میں برکت ہے

ایک زرگر کی طرف سے سوال ہوا کہ پہلے ہم زیوروں کے بنانے کی مزدوری کم لیتے تھے اور ملاوٹ ملا دیتے تھے۔ اب ملاوٹ چھوڑ دی ہے اور مزدوری زیادہ مانگتے ہیں تو بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم مزدوری وہی دینگے جو پہلے دیتے تھے تم ملاوٹ ملا لو۔ ایسا کام ہم ان کے کہنے سے کریں یا نہ کریں؟ فرمایا:-

کھوٹ والا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیئے اور لوگوں کو کہہ دیا کرو کہ اب ہم نے توبہ کر لی ہے جو ایسے کہتے ہیں کہ کھوٹ ملا دو وہ گناہ کی رغبت دلاتے ہیں۔ پس ایسا کام اُن کے کہنے پر بھی ہرگز نہ کرو۔ برکت دینے والا خدا ہے اور جب آدمی نیک نیّتی کے ساتھ ایک گناہ سے بچتا ہے تو خدا ضرور برکت دیتا ہے۔

مُردے اور اسقاط

پھر سوال ہوا کہ مُلاں لوگ مُردوں کے پاس کھڑے ہو کر اسقاط کراتے ہیں کیا اس کا کوئی طریق جائز ہے؟ فرمایا:۔

اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔ مُلاؤں نے ماتم اور شادی میں بہت سی رسمیں پیدا کر لی ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

مقدمات میں مصنوعی گواہ بنانا

ایک مختار کار عدالت نے سوال کیا کہ بعض مقدمات میں اگرچہ وہ سچّا اور صداقت پر ہی مبنی ہو مصنوعی گواہ بنانا کیسا ہے؟ فرمایا:۔

اوّل تو اس مقدمہ کے پیروکار بنو جو بالکل سچا ہو۔ یہ تفتیش کر لیا کرو کہ مقدمہ سچا ہے یا جھوٹا۔ پھر سچ آپ ہی فروغ حاصل کریگا۔ دوّم گواہوں سے آپ کا کچھ واسطہ ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ موکل کا کام ہے کہ وہ گواہ پیش کرے۔ یہ بہت ہی بُری بات ہے کہ خود تعلیم دی جاوے کہ چند گواہ تلاش کر لاؤ اور ان کو یہ بات سکھا دو۔ تم خود کچھ بھی نہ کہو۔ موکل خود شہادت پیش کرے خواہ وہ کیسی ہی ہو۔

ہر صحیح بات کا اظہار ضروری نہیں

پھر سوال ہوا کہ بعض باتیں واقعہ میں صحیح ہوتی ہیں مگر مصلحتِ وقت اور قانون ان کے اظہار کا مانع ہوتا ہے تو کیا ہم لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ کے موافق ظاہر کر دیا کریں؟ فرمایا:۔

یہ بات اس وقت ہوتی ہے جب آدمی آزاد بالطبع ہو۔ دوسری جگہ یہ بھی تو فرمایا۔ لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ: ۱۹۶) قانون کی پابندی ضروری شے ہے۔ جب قانون روکتا ہے تو رُکنا چاہیئے جب کہ بعض جگہ اخفاءِ ایمان بھی کرنا پڑتا ہے تو جہاں قانون بھی مانع ہو وہاں کیوں اظہار کیا جاوے؟ جس راز کے اظہار سے خانہ بربادی اور تباہی آتی ہے وہ اظہار کرنا منع ہے۔

نتائج نیت پر مترتب ہوتے ہیں

پھر آتش بازی کے متعلق فرمایا کہ اس میں ایک جزو گندھک کا بھی ہوتا ہے اور گندھک وبائی ہوا صاف کرتی ہے۔ چنانچہ آج کل طاعون کے ایام میں مثلاً انار بہت جلد ہوا کو صاف کرتا ہے اور اگر کوئی شخص صحیح نیت اصلاحِ ہوا کے واسطے ایسی آتش بازی جس سے کوئی خطرہ نقصان کا نہ ہو چلا دے تو ہم اس

کو جائز سمجھتے ہیں مگر بہ شرطِ اصلاح نیت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ تمام نتائج نیت پر مترتب ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک صحابیؓ نے گھر بنوایا اور آپؐ کو مجبور کیا کہ آپؐ اس میں قدم ڈالیں۔ آپؐ نے اس مکان کو دیکھا۔ اس کے ایک طرف کھڑکی تھی۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ کس لیے بنائی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ٹھنڈی ہوا کے آنے کے واسطے۔ آپؐ نے فرمایا اگر تو اذان سننے کے واسطے اس کی نیّت رکھتا تو ہوا تو آ ہی جاتی اور تیری نیت کا ثواب بھی تجھے مِل جاتا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۰ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء)

مجلس قبل از عشاء

اوّل طاعون کے ٹیکہ کے متعلق بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد توحید کا ذکر چل پڑا۔ فرمایا:

توحید اور اسباب پرستی

توحید اس کا نام نہیں کہ صرف زبان سے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہہ لیا۔ بلکہ توحید کے یہ معنے ہیں کہ عظمتِ الٰہی بخوبی دل میں بیٹھ جاوے اور اس کے آگے کسی دوسری شئے کی عظمت دل میں جگہ نہ پکڑے۔ ہر ایک فعل اور حرکت اور سکون کا مرجع اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو سمجھا جاوے اور ہر ایک امر میں اسی پر بھروسہ کیا جاوے کسی غیر اللہ پر کسی قسم کی نظر اور توکل ہرگز نہ رہے اور خدا تعالیٰ کی ذات میں اور صفات میں کسی قسم کا شرک جائز نہ رکھا جاوے۔

اس وقت مخلوق پرستی کے شرک کی حقیقت تو کھل گئی ہے اور لوگ اس سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں اس لیے یورپ وغیرہ تمام بلاد میں عیسائی لوگ ہر روز اپنے مذہب سے متنفّر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ کے اخباروں رسالوں اور اشتہاروں سے جو بیان پڑھے جاتے ہیں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

الغرض مخلوق پرستی کو اب کوئی نہیں مانتا۔ ہاں اسباب پرستی کا شرک اس قسم کا شرک ہے کہ اس کو بہت لوگ نہیں سمجھتے۔ مثلاً کسان کہتا ہے کہ میں جب تک کھیتی نہ کرونگا اور وہ پھل نہ لاوے گی تب تک گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہر ایک پیشہ والے کو اپنے پیشہ پر بھروسہ ہے اور انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر ہم یہ نہ کریں تو پھر زندگی محال ہے۔ اس کا نام اسباب پرستی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان نہیں ہے، پیشہ وغیرہ تو درکنار پانی۔ ہوا۔ غذا وغیرہ جن اشیاء پر مدارِ زندگی ہے یہ بھی انسان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جب تک خدا تعالیٰ کا اذن نہ ہو۔ اسی لیے جب انسان پانی پئے تو اسے خیال کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی پیدا کیا ہے اور پانی نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک خدا تعالیٰ کا ارادہ نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے ارادے سے پانی نفع دیتا ہے اور جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے تو وہی پانی ضرر دیتا ہے۔

ایک شخص نے ایک دفعہ روزہ رکھا جب افطار کیا تو پانی پیتے ہی لیٹ گیا۔ اُس کے لیے پانی ہی نے زہر کا کام کیا۔

جو کام ہے خواہ معاشرہ کا خواہ کوئی اَور جب تک اس میں آسمان سے برکت نہ پڑے۔ تب تک مبارک نہیں ہوتا۔ غرضکہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات پر کامل یقین چاہیئے جس کا یہ ایمان نہیں ہے اس میں دہریت کی ایک رگ ہے۔ پہلے ایک امر آسمان پر ہو رہتا ہے۔ تب زمین پر ہوتا ہے۔

لاف وگزاف کا نام توحید نہیں۔ مولویوں کی طرف دیکھو کہ دوسروں کو وعظ کرتے اور آپ کچھ عمل نہیں کرتے اسی لیے اب اُن کا کسی قسم کا اعتبار نہیں رہا ہے۔ ایک مولوی کا ذکر ہے کہ وہ وعظ کر رہا تھا۔ سامعین میں اس کی بیوی بھی موجود تھی۔ صدقہ وخیرات اور مغفرت کا وعظ اس نے کیا۔ اس سے متاثر ہو کر ایک عورت نے پاؤں سے ایک پازیب اُتار کر واعظ صاحب کو دیدی جس پر واعظ صاحب نے کہا تو چاہتی ہے کہ تیرا دوسرا پاؤں دوزخ میں جلے؟ یہ سُنکر اس نے دوسری بھی دیدی۔ جب گھر میں آئے تو بیوی نے بھی اس وعظ پر عملد رآمد چاہا کہ محتاجوں کو کچھ دے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ یہ باتیں سُنانے کی ہوتی ہیں کرنے کی نہیں ہوتیں اور کہا کہ اگر ایسا کام ہم نہ کریں تو گذارہ نہیں ہوتا۔ انہیں کے متعلق یہ ضرب المثل ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب ومنبر مے کنند ٭ چوں بخلوت مے روند آں کارِ دیگر مے کنند

تعبیر رؤیا مُردہ کو کلمہ پڑھتے سننا یعنی دین کا دوبارہ سرسبز ہونا۔

بڑ۔ یعنی بوہڑ کے درخت سے مراد نصاریٰ کا دین ہے کہ جس کی عظمت اور سرکشی تو بہت ہے مگر پھل ندارد۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰۷-۱۰۸ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء)

۱۰؍اپریل ۱۹۰۳ء

بعد نماز جمعہ چند اشخاص نے بیعت کی جس پر حضرت اقدس نے ذیل کی تقریر فرمائی:۔

بیعتِ توبہ اس وقت جو تم بیعت کرتے ہو یہ بیعتِ توبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ جو کوئی توبہ کریگا اس کے گناہ بخش دُونگا۔ گناہ کے یہ معنے ہیں کہ انسان دیدہ دانستہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اور ان احکام کے برخلاف کرے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور ان باتوں کو کرے جن کے کرنے سے منع فرمایا ہے۔ گناہ ایسی چیز ہے کہ جس کا نتیجہ اس دُنیا میں بھی بد ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔

جب انسان توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو فراموش کر دیتا ہے اور تائب کو بیگناہ سمجھتا ہے مگر

شرط یہ ہے کہ تائب اپنی توبہ پر قائم رہے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ توبہ کرکے بھول جاتے ہیں۔ مثلاً حج کرنیوالے حج کرکے آتے ہیں اور واپس آکر چند دنوں کے بعد پھر سابقہ بدیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ان کے اس حج سے کیا فائدہ؟ خدا تعالیٰ گناہوں سے ہمیشہ بیزار ہے اس لیے انسان کو گناہ سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ جو شخص اس بات پر قادر ہے کہ گناہ چھوڑ دے اور پھر نہ چھوڑے تو خدا تعالیٰ ایسے شخص کو ضرور پکڑے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اس توبہ کے درخت سے پھل کھاؤ اور تمہارے گھر وباؤں سے بچے رہیں تو چاہیئے کہ سچی توبہ کرو۔

خدا تعالیٰ اپنی سنّت کو نہیں بدلا کرتا۔ جیسے قرآن شریف میں ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فاطر: ۴۴) اور جو انسان ذرا سی بھی نیکی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اُسے ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح جو ذرہ بھر بدی کرتا ہے اس پر بھی خدا تعالیٰ مواخذہ کرتا ہے۔ پس جب یہ حالت ہے تو گناہ سے بہت بچنا چاہیئے۔

گناہ کی پرواہ نہ کرنی

بعض لوگ گناہ کرتے ہیں اور پھر اس کی پرواہ نہیں کرتے گویا گناہ کو ایک شیریں شربت کی مثال خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا مگر یاد رکھیں کہ جیسے خدا تعالیٰ بڑا غفور اور رحیم ہے ویسے ہی وہ بڑا بے نیاز بھی ہے جب وہ غضب میں آتا ہے تو کسی کی پروا نہیں کرتا۔ وہ فرماتا ہے وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس: ۱۶) یعنی کسی کی اولاد کی بھی اسے پروا نہیں ہوتی کہ اگر فلاں شخص ہلاک ہوگا تو اس کے یتیم بچے کیا کریں گے۔ آجکل دیکھو یہی حالت ہو رہی ہے۔ آخر کار ایسے بچے پادریوں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے گناہ کرکے کبھی بے پروا مت رہو اور ہمیشہ توبہ کرو۔

نماز اور دُعا کا حق

یہ مت خیال کرو کہ جو نماز کا حق تھا ہم نے ادا کر لیا یا دُعا کا جو حق تھا وہ ہم نے پورا کیا۔ ہرگز نہیں۔ دُعا اور نماز کے حق کا ادا کرنا چھوٹی بات نہیں یہ تو ایک موت اپنے اوپر وارد کرنی ہے۔ نماز اس بات کا نام ہے کہ جب انسان اسے ادا کرتا ہو۔ تو یہ محسوس کرے کہ اس جہان سے دوسرے جہان میں پہنچ گیا ہوں۔ بہت سے لوگ ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ پر الزام لگاتے ہیں اور اپنے آپ کو بَری خیال کرکے کہتے ہیں کہ ہم نے تو نماز بھی پڑھی اور دعا بھی کی ہے مگر قبول نہیں ہوتی۔ یہ ان لوگوں کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ نماز اور دعا میں جب تک انسان غفلت اور کسل سے خالی نہ ہو تو وہ قبولیت کے قابل نہیں ہوا کرتی۔ اگر انسان ایک ایسا کھانا کھائے جو کہ بظاہر تو میٹھا ہے مگر اس کے اندر زہر ملی ہوئی ہے تو مٹھاس سے وہ زہر معلوم تو نہ ہوگا مگر پیشتر اس کے کہ مٹھاس اپنا اثر کرے زہر پہلے ہی اثر کرکے کام تمام کر دیگا۔ یہی وجہ ہے کہ غفلت سے بھری ہوئی دُعائیں قبول نہیں ہوتیں کیونکہ غفلت اپنا اثر پہلے کر جاتی ہے۔ یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بالکل مطیع ہو اور پھر اس کی دُعا قبول نہ ہو۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے

مقررہ شرائط کو کامل طور پر ادا کرے۔ جیسے ایک انسان اگر دُور بین سے دُور کی شئے نزدیک دیکھنا چاہے تو جب تک وہ دُور بین کے آلہ کو ٹھیک ترتیب پر نہ رکھے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہی حال نماز اور دعا کا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کام کی شرط ہے جب وہ کامل طور پر ادا ہو تو اس سے فائدہ ہوا کرتا ہے۔ اگر کسی کو پیاس لگی ہو اور پانی اس کے پاس بہت سا موجود ہے مگر وہ پیئے نہ تو فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یا اگر اس میں سے ایک دو قطرہ پئے تو کیا ہوگا؛ پوری مقدار پینے سے ہی فائدہ ہوگا۔ غرضکہ ہر ایک کام کے واسطے خدا تعالیٰ نے ایک حد مقرر کی ہے جب وہ اس حد پر پہنچتا ہے تو بابرکت ہوتا ہے اور جو کام اس حد تک نہ پہنچیں تو وہ اچھے نہیں کہلاتے اور نہ ان میں برکت ہوتی ہے۔

عاجزی

عاجزی اختیار کرنی چاہیئے۔ عاجزی کا سیکھنا مشکل نہیں ہے اس کا سیکھنا ہی کیا ہے، انسان تو خود ہی عاجز ہے اور وہ عاجزی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (الذّاریات : ۵۷)

تکبر وغیرہ سب بناوٹی چیزیں ہیں اگر وہ اس بناوٹ کو اُتار دے تو پھر اُس کی فطرت میں عاجزی ہی نظر آوے گی اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ خیریت سے رہو اور تمہارے گھروں میں امن رہے تو مناسب ہے کہ دُعائیں بہت کرو اور اپنے گھروں کو دُعاؤں سے پُر کرو۔ جس گھر میں ہمیشہ دُعا ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ اسے برباد نہیں کیا کرتا۔ لیکن جو سُستی میں زندگی بسر کرتا ہے اُسے آخر فرشتے بیدار کرتے ہیں۔ اگر تم ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو گے تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ بہت پکا ہے وہ کبھی تم سے ایسا سلوک نہ کریگا جیسا کہ فاسق فاجر سے کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ تم کو عذاب دیوے بشرطیکہ تم ایمان لاؤ اور شکر کرو۔ انسان کو عذاب ہمیشہ گناہ کے باعث ہوتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (الرعد : ۱۲) اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو صاف نہ کرے تب تک خدا تعالیٰ عذاب کو دور نہیں کرتا ہے۔

یہ دنیا خود بخود نہیں ہے اس کے لیے ایک خالق ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسی کی مرضی سے ہو رہا ہے بغیر اس کی رضا کے ایک ذرہ حرکت نہیں کر سکتا۔ جو اللہ تعالیٰ سے ترساں رہے گا وہ خود محسوس کریگا کہ اس میں ایک فرقان پیدا ہو گیا ہے مگر شرط یہ ہے کہ شیطانی سیرت کا انسان نہ ہو۔ تکالیف تو نبیوں پر بھی آتی ہیں مگر وہ عام لوگوں کی طرح نہیں بلکہ اُن کے لیے وہ باعث برکت ہوتی ہیں۔

دغاباز آدمی کی نماز قبول نہیں ہوتی وہ اس کے منہ پر ماری جاتی ہے کیونکہ وہ دراصل نماز نہیں پڑھتا بلکہ خدا تعالیٰ کو رشوت دینا چاہتا ہے مگر خدا تعالیٰ کو اس سے نفرت ہوتی ہے کیونکہ وہ رشوت کو خود پسند نہیں کرتا۔

نماز کوئی ایسی ویسی شئے نہیں ہے بلکہ یہ وہ شئے ہے جس میں اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (الفاتحہ:۶)
جیسی دُعا کی جاتی ہے اس دُعا میں تبلایا گیا ہے کہ جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں ان پر دُنیا میں خدا تعالیٰ کا غضب
آتا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا چاہیئے جو کام ہوتا ہے اس کے ارادہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ طاعون بھی
اسی کے حکم سے آئی ہے یہ دُنیا سے رُخصت نہ ہوگی جب تک ایک تغیر عظیم پیدا نہ کرلے۔ جو اس سے نہیں ڈرتا
وہ بڑا بدبخت ہے اور اس کے استیصال کے لیے ایک ہی راہ ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو پاک کرو کیونکہ اگر پاک ہو
کر مَر بھی جاوے گا تو وہ بہشت کو پہنچے گا۔ مرنا تو سب نے ہے مومن نے بھی اور کافر نے بھی مگر مومن اور کافر
کی موت میں خدا تعالیٰ فرق کر دیتا ہے۔

دیکھو ان باتوں کو منتر جنتر نہ سمجھو اور یہ خیال نہ کرو کہ یونہی فائدہ ہو جاوے گا جیسے کہ بھوکے کے سامنے
روٹیوں کا انبار فائدہ نہیں دیتا جب تک کہ وہ نہ کھاوے۔ اسی طرح آج کے اقرار کے مطابق جب تک کوئی
اپنے آپ کو گناہ سے نہ بچاوے گا اسے برکت نہ ہوگی۔ یاد رکھو کہ مَیں اس بات پر شاہد ہوں کہ میں نے تم کو سمجھا
دیا ہے۔

اب تم کو چاہیئے کہ بُرائیوں سے بچنے کے واسطے خدا تعالیٰ سے دُعا کرو تاکہ بچے رہو۔ جو شخص بہت دُعا کرتا
ہے اس کے واسطے آسمان سے توفیق نازل کی جاتی ہے کہ گناہ سے بچے اور دعا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ سے
بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ اُسے مل جاتی ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا یعنی جو امور اُسے
کشاں کشاں گناہ کی طرف لے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان امور سے بچنے کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے قرآن
کو بہت پڑھنا چاہیئے اور پڑھنے کی توفیق خدا تعالیٰ سے طلب کرنی چاہیئے کیونکہ محنت کے سوا انسان کو
کچھ نہیں ملتا۔ کسان کو دیکھو کہ جب وہ زمین میں ہل چلاتا ہے اور قسم قسم کی محنت اُٹھاتا ہے تب پھل حاصل
کرتا ہے۔ مگر محنت کے لیے زمین کا اچھا ہونا شرط ہے۔ اسی طرح انسان کا دل بھی اچھا ہو سامان بھی عمدہ ہو سب
کچھ کر بھی سکے۔ تب جاکر فائدہ پاوے گا۔ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم:۴۰) دل کا تعلق اللہ تعالیٰ
سے مضبوط باندھنا چاہیئے۔ جب یہ ہوگا تو دل خود خدا سے ڈرتا رہے گا اور جب دل ڈرتا رہتا ہے تو خدا تعالیٰ کو
اپنے بندے پر خود رحم آجاتا ہے اور پھر تمام بلاؤں سے اُسے بچاتا ہے۔

گناہ سے بچو۔ نماز ادا کرو۔ دین کو دنیا پر مقدم رکھو۔ خدا تعالیٰ کا سچا غلام وہی ہوتا ہے جو دین کو دُنیا
پر مقدم رکھتا ہے۔

لقاءِ الٰہی کا واسطہ قرآن اور آنحضرتؐ ہیں

ہر ایک شخص کو خود بخود خدا تعالیٰ سے ملاقات
کرنے کی طاقت نہیں ہے اس کے واسطے واسطہ

ضرور ہے اور وہ واسطہ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اس واسطے جو آپ کو چھوڑتا ہے وہ کبھی بامراد نہ ہوگا۔انسان تو دراصل بندہ یعنی غلام ہے غلام کا کام یہ ہوتا ہے کہ مالک جو حکم کرے اُسے قبول کرے۔اسی طرح اگر تم چاہتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض حاصل کرو تو ضرور ہے کہ اس کے غلام ہو جاؤ۔قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ (الزمر: ۵۴) اس جگہ بندوں سے مراد غلام ہی ہیں نہ کہ مخلوق۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بندہ ہونے کے واسطے ضروری ہے کہ آپ پر درود پڑھو۔اور آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرو۔سب حکموں پر کاربند رہو جیسے کہ حکم ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۲) یعنی اگر تم خدا تعالیٰ سے پیار کرنا چاہتے ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے فرماں بردار بن جاؤ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں فنا ہو جاؤ تب خدا تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

جب لوگ بدعتوں پر عمل کرتے ہیں تو وہ کہدیتے ہیں کہ کیا کریں دُنیا سے چھٹکارا نہیں ملتا یا کہتے ہیں کہ ناک کٹ جاتی ہے۔ایسے وقت میں گویا انسان خدا تعالیٰ کے اس فرمان کو چھوڑتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہے اور خیال کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنا بے فائدہ ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰۸-۱۰۹ مورخہ ۲۴ ؍اپریل ۱۹۰۳ء)

۱۱؍اپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

دلیل صداقت

فرمایا:۔

جب ہمیں یہ الہام ہوا تھا وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا اس وقت تو ایک شخص بھی ہمارا مُرید نہ تھا۔اگر یہ سلسلہ من عند غیر اللہ ہوتا تو آج تک الٰہی بخش کی طرح بیکار ہی پڑا رہتا۔کیا یہ ثبوت کافی نہیں؟

الٰہی بخش تو میرے الہامات کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ایسا کیوں کرتا ہے کہ الہام ہمارے سالہا سال سے شائع ہو چکے ہیں اُن کی اب نقل کرتا ہے۔اصل میں جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح حق اپنے انوار سے شناخت کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یَا مَسِیْحَ الْخَلْقِ عَدْوَانَا اس وقت سے چھپا ہوا اور شائع شدہ ہے جبکہ طاعون کا کہیں نام و نشان

بھی نہ تھا اور اب آج طاعون کی وجہ سے لوگ آتے اور زبانِ حال سے کہتے ہیں یَا مَسِیْحَ الْخَلْقِ عَدْوَانَا اور اکثر اپنے خطوں میں لکھتے ہیں۔ اب یا تو یہ ثابت کرو کہ یہ الہام ہمارا من گھڑت ہے اور ہم نے اپنی کوشش سے چند لوگوں کو اس کے تکمیل کرنے کے واسطے ملا لیا ہے یا یہ قبول کرو کہ یہ جو دو دو اور چار چار سو آدمی یکدم بیعت کرتے ہیں یہ خدا تعالیٰ کی تائید ہے۔

جس زور کے ساتھ طاعون کی وجہ سے لوگ اس سلسلہ میں داخل ہو رہے ہیں اس طرح کسی کو یقین چھوڑ وہم بھی نہ تھا کیونکہ یہ الہام اس وقت کا ہے جب ان لوگوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس لیے ان تمام ناموں کو محفوظ رکھا جاوے اور اگر ان لوگوں کا الگ رجسٹر نہ ہو تو رجسٹر بیعت ہی میں سُرخی کیساتھ ان کو درج کیا جاوے۔

کنچنی کی مسجد میں نماز

ایک شخص کے سوال پر فرمایا کہ:۔
کنچنی کی بنوائی ہوئی مسجد میں نماز درست نہیں۔

طریقِ ادب سے بعید سوالات

پھر ایک شخص نے پوچھا کہ قیامت کے دن بھی ہماری جماعت اسی طرح آپ کے آگے پیچھے ہوگی؟ فرمایا:۔
یہ تفصیلیں نہیں ہوسکتی ہیں۔ ایسے سوال طریقِ ادب سے بعید ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ پر چھوڑو۔

حق کی چارہ جوئی

سوال ہوا کہ مخالف ہم کو مسجد میں نماز پڑھنے نہیں دیتے حالانکہ مسجد میں ہمارا حق ہے۔ ہم ان سے بذریعہ عدالت فیصلہ کریں؟

فرمایا:۔
ہاں اگر کوئی حق ہے تو بذریعہ عدالت چارہ جوئی کرو۔ فساد کرنا منع ہے۔ کوئی دنگہ فساد نہ کرو۔

مخالف کے گھر کی چیز کھانا

سوال ہوا کہ کیا مخالفوں کے گھر کی چیز کھالیوں؟ فرمایا:۔
نصاریٰ کی پاک چیزیں بھی کھالی جاتی ہیں۔ ہندوؤں کی مٹھائی وغیرہ بھی ہم کھالیتے ہیں۔ پھر ان کی چیز کھالینا کیا منع ہے؟

مخالف سے حُسنِ معاشرت

ہاں مَیں نماز سے منع کرتا ہوں کہ ان کے پیچھے نہ پڑھو۔ اس کے سوائے دنیاوی معاملات میں بیشک شریک ہو۔ احسان کرو مروّت کرو اور ان کو قرض دو اور اُن سے قرض لو اگر ضرورت پڑے تو صبر سے کام لو شائد کہ اس سے سمجھ بھی جاویں۔

نماز کی اہمیت

ایک شخص نے عرض کی کہ میرے لیے دُعا کریں کہ نماز کی توفیق اور استقامت ملے۔ فرمایا:۔
حقیقت میں جو شخص نماز کو چھوڑتا ہے وہ ایمان کو چھوڑتا ہے اس سے خدا کے ساتھ تعلقات میں فرق آجاتا

جاتا ہے۔اس طرف سے فرق آیا تو معاً اُس طرف سے بھی فرق آجاتا ہے۔

سر پر ہاتھ رکھنا

پھر اسی شخص نے عرض کی کہ میرے سر پر ہاتھ رکھیں آپ نے اسکے سر پر ہاتھ رکھدیا اور اس طرح پر اخلاق فاضلہ کا ثبوت دیا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۰۔۱۱ مورخہ ۲۴ را پریل ۱۹۰۳ئ)

۱۱ر اپریل ۱۹۰۳ئ

(دربار شام)

تکمیل ایمان کا ذریعہ

اصل میں ایمان کے کمال تام کا ذریعہ الہامات صحیحہ اور پیشگوئی ہوتے ہیں ایمان کبھی قصوں کہانیوں سے ترقی نہیں پکڑتے۔عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ انسان جس مذہب میں پیدا ہوتا ہے۔جس راہ و رسم کا پابند اپنے آباء و اجداد کو پاتا ہے اکثر اسی کا پابند ہوا کرتا ہے۔اگر ایک بُت پرست کے گھر میں پیدا ہوا ہو تو بُت پرستی ہی اس کا شیوہ ہوگا۔اور اگر ایک عیسائی کے ہاں اس نے تربیت پائی ہے تو وہی خُو بُو اس میں پائی جاوے گی۔مگر اس کے مسائل اور اس کے بنیادی عقائد کا بہت ساحصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی عقل فہم میں کچھ بھی نہیں آیا ہوتا۔صرف لکیر کا فقیر ہوتا ہے بچپن اور اوائل عمر میں تو کیا کوئی ان مذاہب کی حقیقت سے آگاہ ہوگا۔عیسویت کے حامی تو اگر ان سے کوئی پوری تعلیم کا پورا جوان عاقل بالغ بھی ان کی تثلیث کے راز کو پوچھے تو کہدیتے ہیں کہ یہ راز ہے جو ایشیائی دماغ کی بناوٹ کے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے اور یہی حال بُت پرست کا ہے۔

اسلام کی حقانیت

ہاں البتہ اسلام ایک دُنیا میں ایسا مذہب ہے کہ جس کے عقائد ایسے ہیں کہ انسان ان کو سمجھ سکتا ہے اور وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔اسلام کے مسائل ایسے ہیں کہ کسی خاص دماغ یا عقل کے واسطے خاص نہیں بلکہ وہ تمام دنیا کے واسطے یکساں ہیں اور ہر ایک کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔مگر وہ زندہ ایمان کہ جس سے انسان خدا تعالیٰ کو گویا دیکھ لیتا ہے اور وہ نور جس سے انسان کی آنکھ کھل کر اس کو ایقان تام حاصل ہو جاوے وہ صرف الہام ہی پر منحصر ہے۔الہام سے انسان کو ایک نور ملتا ہے جس سے وہ ہر تاریکی سے مبرا ہو جاتا ہے اور ایک قسم کا اطمینان اور تسلّی اسے ملتی ہے۔اس کا نفس اس دن سے خدا تعالیٰ میں آرام پانے لگتا ہے اور ہر گناہ فسق و فجور سے اس کا دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے اس کا دل امید اور بیم سے بھر جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی معرفت کی وجہ سے وہ ہر وقت ترساں

ولرزاں رہتا ہے اور زندگی کو ناپائیدار جانتا اور سفلی لذات کی ہوس اور خواہش کو ترک کر کے خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول میں لگ جاتا ہے اور در حقیقت وہ اسی وقت گناہ کی آلودگی سے علیحدہ ہوتا ہے۔

جب تک تازہ نور انسان کو آسمان پر سے نہ ملے اور خدا تعالیٰ کا مشاہدہ نہ ہو جاوے تب تک پورا ایمان نہیں ہوتا جب تک ایمان کمال درجہ تک نہ پہنچا ہو تب تک گناہ کی قید سے رہائی ناممکن ہے۔ بجز الہام کے ایمان کی تصویر لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اس کی ماہیت سے لوگ بے بہرہ اور خالی محض ہوتے ہیں تعجب ہے کہ یورپ تو آجکل بہت سی ٹھوکریں کھا کر ان امور کو تسلیم کرتا جاتا ہے مگر ہمارے مولوی انکار و کفر میں غرق ہیں اگر الہام ہونے کا نام بھی لیا جاوے تو کفر کا فتویٰ تیار ہے۔ وحی کے نزول کا دعویٰ کرنے والا تو اکفر اور ضال اور دجال ہے۔ افسوس آتا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کے کلام سے کیسے دُور جا پڑے ہیں اور ان سے فہم قرآن چھین لیا گیا ہے۔ بھلا اگر خدا تعالیٰ نے اس اُمت کو اس شرف سے محروم ہی رکھنا تھا تو یہ دُعا ہی کیوں سکھائی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ (الفاتحہ: ۶، ۷) اس دُعا سے تو صاف نکلتا ہے کہ یا الٰہی ہمیں پہلے منعم علیہم لوگوں کی راہ پر چلا اور جو ان کو انعامات ملے ہمیں بھی وہ انعامات عطا فرما۔ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کون تھے؟ خدا تعالیٰ نے خود ہی فرما دیا ہے کہ نبی۔ صدیق۔ شہید۔ صالح لوگ تھے اور ان کا بڑا انعام یہی الہام اور وحی کا نزول تھا بھلا اگر خدا تعالیٰ نے اس دُعا کا سچا نتیجہ جو ہے اس سے محروم ہی رکھنا تھا تو پھر کیوں ایسی دُعا سکھائی؟ ہمیں تعجب آتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا۔ یہی تو ایک چیز تھی۔ جو نہایت نازک اور رُوح کی غذا تھی۔ جو انسان اس کے حصول کا پیاسا نہیں ممکن نہیں کہ اس کے اندر پاک تبدیلی آسکے اور جب تک انسان اس طرح خدا تعالیٰ کا چہرہ نہ دیکھے اور اس کی سُریلی آواز سے بہرہ ور نہ ہو۔ تب تک ممکن نہیں کہ گناہ کے زہر سے بچ سکے۔ خیر خود تو محروم اور بے نصیب تھے ہی مگر دوسروں کو جو اس قسم کے خیال رکھیں کہ خدا تعالیٰ کسی سے ہمکلام ہو سکتا ہے کافر جانتے ہیں۔ وہ تو دوسروں کو کافر کہتے ہیں۔ مگر ہمیں خود اُن کے ایمان کا خطرہ ہے کہ ان کا ایمان ہی کیا ہے جو اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں اور خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کے واسطے ہاتھ ہی کس طرح اُٹھا سکتے ہیں۔

خدا تعالیٰ تک پہنچانے کے ذرائع

دو ہی چیزیں ہیں کہ جو خدا تک انسان کو پہنچا سکتی ہیں۔ دیدار۔ جس کی موسیٰؑ نے بھی درخواست کی تھی اور وہ بھی الہام ہی کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ جب انسان اس کی طرف ترقی پاتا ہے تو اور اور مدارج کی بھی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا چاہتا ہے۔

دوسری چیز خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی گفتار ہے اور یہ فضل خدا تعالیٰ کا تو ایسا ہوا ہے کہ عورتوں تک بھی

گفتار سے مشرف ہوتی رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ کی ماں کو بھی ہمکلامی کا شرف حاصل تھا۔ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو بھی یہ نعمت ملی ہوئی تھی۔ خضر کو بھی الہام ہوتا تھا تو کیا اسلام ہی ایسا گیا گذرا تھا؟ اور خدا تعالیٰ کی نظر میں گرا ہوا تھا بلکہ اُسے بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی پیچھے پھینک دیا۔ ان وہابیوں کا تو یہ اعتقاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ میں سے کسی کو اور نہ بعد میں ائمہ میں سے کسی کو اور نہ ہی بڑے بڑے خدا تعالیٰ کے ولیوں مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ ان میں سے کسی کو بھی الہام نہیں ہوا۔ یہ سارے کے سارے ہی خشک مُلّاں تھے ان میں سے کسی کو بھی خدا تعالیٰ کے مکالمے مخاطبے کا شرف نہ ملا ہوا تھا۔ انکے ہاتھ میں بھی صرف قصّے کہانیاں ہی تھیں۔ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب: ۴۱) کے معنے ہی ان کے نزدیک یہی ہیں کہ الہام کا دروازہ آپ کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور آپ کے بعد آپ کی اُمت سے یہ برکت کہ کسی کو مکالمات اور مخاطبات ہوں بالکل اُٹھ گئی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صدی اس امر کی منتظر ہوتی ہے کہ اس اُمت میں سے چند افراد یا کوئی ایک فرد ضرور خدا تعالیٰ کی ہمکلامی سے مشرف ہوں گے جو اسلام پر سے گرد و غبار کو دُور کر کے پھر اسلام کے روشن چہرے کو چمکا کر دکھایا کریں ان لوگوں سے اگر پوچھا جاوے کہ تمہارے پاس سچائی کی دلیل ہی کونسی ہے؟ کوئی معجزات یا خارق عادت تمہارے پاس نہیں تو دوسروں کا حوالہ دیدینگے۔ خود خالی اور محروم ہیں۔ صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ کر اور آپ کی صحبت کی برکت سے آنحضرت کے ہی رنگ میں رنگین ہو گئے تھے اور ان کے ایمانوں کے واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں اور معجزات کثرت سے دیکھنے اور ہر وقت مشاہدہ کرنے سے اُن کے ایمانوں کا تزکیہ اور تربیت ہوتی گئی اور آخر کار ترقی کرتے کرتے وہ کمالِ تمام تک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگین ہو گئے مگر ان لوگوں کے ایمانوں کو مضبوط کرنے کے واسطے اگر اُن سے پوچھا جاوے تو کیا ہے؟ تیرہ سَو برس کا حوالہ دیں گے کہ اس وقت یہ معجزات اور خارقِ عادت ظاہر ہوا کرتے تھے پیشگوئیاں بھی تھیں مگر اب کچھ بھی نہیں۔

خیرِ اُمم

مَیں نہیں سمجھتا کہ اگر خدا تعالیٰ نے اُسے خیر الامم بنانا تھا تو اُس کا نام قرآن شریف میں خیر اُمّت کر کے کیوں پکارا؟ کیونکہ اس کی موجودہ حالت بقول مولویوں کے بدترین معلوم ہوتی ہے۔ اندرونی و بیرونی حملوں سے پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ دجال نے آکر ہر طرف سے گھیر لیا ہے تو پھر ایسے مصیبت کے وقت میں اگر خبر گیری بھی کی تو ایک اَور دجال بھیجدیا جو دین کا حامی ہونے کی بجائے بیخ کُن ہے اور ان کے لوگ ہزاروں مجاہدے اور ریاضت زہد و تعبد کریں مگر خُدا سے مکالمہ کا شرف کبھی نہیں نصیب ہوتا ہے اور ایسے گئے گذرے ہیں کہ دوسری امتوں کی عورتوں سے بھی درماندہ اور پس پا افتادہ ہیں ان میں تو ایک موسوی شریعت کے خادم ہزاروں نبی آتے اور ایک ایک زمانہ میں چار چار سو نبی بھی ہوتے رہے۔ مگر اس

اُمت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا خادم ایک بھی صاحب الہام نہ آیا۔ گویا کہ سارے کا سارا باغ ہی بے ثمر رہ گیا۔ پہلے لوگوں کے باغ تو مثمر ہوئے مگر ان کے اعتقاد کے بموجب نعوذ باللہ آپؐ کا باغ بے برگ و بار ہوا۔ اگر ان لوگوں کا یہی دین اور ایمان ہے تو خُدا دنیا پر رحم کرے اور لوگوں کو ایسے ایمان سے نجات دیوے۔

ایمان

ایمان کی نشانی ہی کیا ہے اور اس کے معنے کیا ہیں یہی کہ مان لینا اور پھر اس پر یقین آجانا۔ جب انسان ایک بات کو سچے دل سے مان لیتا ہے تو اس کا اس پر یقین ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس سے اعمال بھی سرزد ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ سنکھیا ایک زہر ہوتا ہے اور اس کے کھانے سے انسان مر جاتا ہے یا ایک سانپ جان کا دشمن ہوتا ہے جس کو کاٹتا ہے اس کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ تو اس ایمان کے بعد نہ تو وہ سنکھیا کھاتا اور نہ ہی سانپ کے سوراخ میں اُنگلی ڈالتا۔

آجکل طاعون کے متعلق لوگوں کو ایمان ہے کہ اس کی لاگ سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے جس مکان میں طاعون ہو اس سے کوسوں بھاگتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں۔ غرض جس چیز پر ایمان کامل ہوتا ہے اس کے مطابق اس سے عمل بھی صادر ہوا کرتے ہیں مگر کیا وجہ ہے کہ خدا کے موجود ہونے کا ایمان ہو اور جزا سزا کے ان کا ایمان ہو اور حساب کتاب یاد ہو تو پھر گناہ باقی رہ جاویں یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا خدا کا ایمان سانپ کے خوف سے بھی گیا گذرا ہے؟ مومن ہونے کا دعویٰ ہے اور پھر بایں چوری۔ جھوٹ۔ زنا۔ بدنظری۔ شراب خوری۔ فسق و فجور میں فرق نہیں۔ نفاق اور ریاکاری کی تصدیق نہیں۔ زبانی ایمان کا دعویٰ ہے ورنہ عملی طور پر ایمان اور دین کچھ بھی چیز نہیں۔

ہم صاف مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان کو جس چیز کے مفید ہونے کا ایمان ہے اُسے ہرگز ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ کوئی امیر اور کوئی غریب ہم نے نہیں دیکھا جو اپنے گھر سے اپنی جائداد یا دولت کو جو اس کے پاس ہے باہر نکال پھینکتا ہو بلکہ ہم نے تو کسی کو ایک پیسہ بھی پھینکتے نہیں دیکھا۔ پیسہ تو کجا ایک سوئی بھی اگر کمائی ہوئی ٹوٹ جاوے تو اُسے رنج ہوتا ہے کہ میرے کارآمد چیز تھی۔ مگر ایمان باللہ کی قدر ان لوگوں کی نظر میں اُس سوئی کے برابر بھی نہیں اور نہ اس کا فائدہ ایک سوئی کے برابر لوگ جانتے ہیں۔ پس جب ایمان ایسا ہوتا ہے کہ ایک سوئی کے برابر بھی اس کی قدر ان میں نہیں ہوتی۔ تو اسی کے مطابق اُن کو انسان سے نفع بھی نہیں پہنچتا اور نہ ان کو وہ کمال حاصل ہوتا ہے کہ خُدا ان پر الہامات کے دروازے کھول دے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۵-۶ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭

۱۲؍اپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

بیماری کی افادیت

بیماریوں کے ذکر پر فرمایا کہ:۔
بیماری کی شدت سے موت اور موت سے خدا یاد آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (نساء ۲۹) انسان چند روز کے لیے زندہ ہے۔ ذرہ ذرہ کا وہی مالک ہے جو حی و قیوم ہے۔ جب وقتِ موعود آ جاتا ہے تو ہر ایک چیز السلام علیکم کہتی اور سارے قویٰ رخصت کر کے الگ ہو جاتے ہیں اور جہاں سے یہ آیا ہے وہیں چلا جاتا ہے۔

طاعون کا علاج

طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ:۔
آسمانی علاج ابھی تک لوگوں نے غیر مفید سمجھا ہوا ہے۔ سچی توبہ اور تقویٰ کی طرف پورا رجوع نہیں کیا گیا مگر یاد رکھیں کہ خدا رجوع کرائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

رکوع و سجود میں قرآنی دُعا کرنا

مولوی عبد القادر صاحب لدھیانوی نے سوال کیا کہ رکوع و سجود میں قرآنی آیت یا دُعا کا پڑھنا کیسا ہے؟

فرمایا:۔
سجدہ اور رکوع فروتنی کا وقت ہے اور خدا تعالیٰ کا کلام عظمت چاہتا ہے۔ ماسوا اس کے حدیثوں سے کہیں ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رکوع یا سجود میں کوئی قرآنی دُعا پڑھی ہو۔

رہن

رہن کے متعلق سوال ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ:۔
موجودہ تجاویز رہن جائز ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں یہ قانون تھا کہ اگر فصل ہو گئی تو حکام زمینداروں سے معاملہ وصول کر لیا کرتے تھے اگر نہ ہوتی تو معاف ہو جاتا اور اب خواہ فصل ہو یا نہ ہو حکام اپنا مطالبہ وصول کر ہی لیتے ہیں۔ پس چونکہ حکام وقت اپنا مطالبہ کسی صورت میں نہیں چھوڑتے تو اس طرح یہ رہن بھی جائز رہا کیونکہ کبھی فصل ہوتی اور کبھی نہیں ہوتی۔ تو دونوں صورتوں میں مرتہن نفع و نقصان کا ذمہ دار ہے۔ پس رہن عدل کی صورت میں جائز ہے۔ آجکل گورنمنٹ کے معاملے زمینداروں سے ٹھیکہ کی صورت میں ہو گئے ہیں اور اس صورت میں زمینداروں کو کبھی فائدہ اور کبھی نقصان ہوتا ہے۔ ایسی صورت عدل میں رہن بیشک جائز ہے۔

جب دودھ والا جانور اور سواری کا گھوڑا رہن باقبضہ ہو سکتا ہے اور اس کے دودھ اور سواری سے مرتہن فائدہ اٹھا سکتا ہے تو پھر زمین کا رہن تو آپ ہی حاصل ہو گیا۔

پھر زیور کے رہن کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا:۔
زیور ہو کچھ ہو جب انتفاع جائز ہے تو خواہ نخواہ تکلفات کیوں بناتے جاویں۔ اگر کوئی شخص زیور کو استعمال کرنے سے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی اس کے ذمہ ہے۔ زیور کی زکوٰۃ بھی فرض ہے چنانچہ کل ہی ہمارے گھر میں زیور کی زکوٰۃ ڈیڑھ سو روپیہ دیا ہے۔ پس اگر زیور استعمال کرتا ہے تو اس کی زکوٰۃ دے اگر بکری رہن رکھی ہے اور اس کا دودھ پیتا ہے تو اس کو گھاس بھی دے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۹۰۳ء)

۱۲؍ اپریل ۱۹۰۳ء

(دربار شام)

خواب قضاءِ معلق ہوتے ہیں

ایک خواب کی تعبیر میں فرمایا کہ:۔
خواب ہر ایک انسان کو عمر بھر میں کبھی مبشر اور کبھی وحشتناک ضرور آتے ہیں مگر وہی قضا مبرم اور فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی۔ خدا تعالیٰ کی معرفت کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ قضا کبھی ٹل بھی جایا کرتی ہے۔ خواب کے حالات خواہ مبشر ہوں یا منذر۔ دونو صورتوں میں قضاءِ معلق کے رنگ میں ہوا کرتے ہیں۔ اُن کے نتائج کے بر لانے یا روکنے کے واسطے ضروری ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کرے کہ اگر یہ امر میرے واسطے مفید اور تیری رضا کے بموجب ہے تو تُو اُسے جیسا مجھے خواب میں مبشر دکھایا ہے ایسا ہی بشارت آمیز صورت میں پورا کر۔ ورنہ منذر ہے تو اس کی خوفناک صورت سے اپنے آپ کو حفاظت میں رکھنے کے لیے بھی استغفار اور توبہ کرتا رہے۔

قضاءِ معلق دُعا سے ٹل سکتی ہے

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ قضا ٹل جایا کرتی ہے اس لیے انسان پوری تضرع۔ خشوع و خضوع اور حضورِ قلب سے اور سچی عاجزی۔ فروتنی اور درد دل سے اُس سے دُعا کرے۔ خواب میں دیکھے ہوئے حالات کے متعلق خواہ وہ کسی رنگ میں ہوں۔ دونوں صورتوں میں دعا کی ضرورت ہے۔

ہمیں بارہا خیال آتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی کوئی ایک وحشت ناک ہی معاملہ معلوم ہوا ہوگا کہ انہوں نے ساری رات دُعا میں صرف کی اور نہایت درجہ کے درد انگیز اور بلبلانے والے الفاظ سے خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی تقدیر معلق کو مبرم ہی خیال کر بیٹھے ہوں اور اسی وجہ سے ان کا یہ

سارا اضطراب اور گھبراہٹ بڑھ گئی ہو اور اس درجہ کا گداز اور رقت اُن میں اپنا آخری دم جان کر ہی پیدا ہوئی ہو۔ کیونکہ اکثر ایک تقدیر جو معلق ہوا کرتی ہے ایسی باریک رنگ میں ہوتی ہے کہ اس کو سرسری نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مبرم ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب فتوح الغیب میں لکھتے ہیں کہ میری دُعا سے اکثر وہ قضا جو قضائے مبرم کے رنگ میں ہوتی ہے ٹل جاتی ہے اور ایسے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں مگر ان کے اس امر کا جواب ایک اَور بزرگ نے دیا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقدیرِ معلق ایسے طور سے واقع ہوتی ہے کہ اس کا پہچاننا کہ آیا معلق ہے یا مبرم محال ہو جاتا ہے اُسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مبرم ہے مگر درحقیقت ہوتی وہ تقدیر معلق ہے اور وہ ایسی ہی تقدیریں ہوں گی جو شیخ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے ٹل گئی ہوں کیونکہ تقدیرِ معلق ٹل جایا کرتی ہے۔ غرض اہل اللہ نے اس امر کو خوب واضح طور سے لکھا ہے کہ قضا معلق ٹل جایا کرتی ہے۔

حضرت عیسٰیؑ پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑی بھاری صعوبت اور مشکل کا وقت تھا کیونکہ ان کی اپنی ہی کتاب کے الفاظ بھی ایسے ہی ہیں کہ آخر میں فرمایا۔ سُمِعَ لِتَقْوٰىهُ یعنی تقدیر تو بڑی سخت تھی اور بڑی مصیبت کا وقت تھا مگر اس کے تقویٰ کی وجہ سے آخر کار اس کی دعا ضائع نہ گئی بلکہ سُنی گئی۔ یہ عیسائی بدنصیب اس امر کی طرف تو خیال نہیں کرتے کہ اوّل تو خدا اور اسکا مرنا یہ دونوں فقرے آپس میں کیسے متضاد پڑے معلوم ہوتے ہیں جب ایک کان میں یہ آواز ہی پڑتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے کہ ایں یہ کیا لفظ ہیں؟ اور پھر ماسوا اس کے ایک ایسے شخص کو خدا بنائے بیٹھے ہیں کہ جس نے بخیال ان کے ساری رات یعنی چار پہر کا وقت لغو اور بیہودہ کام میں جو اس کے آقا اور مولیٰ کی منشاء اور رضا کے خلاف تھا خواہ نخواہ ضائع کیا اور پھر ساری رات رویا اور ایسے درد اور گداز کے الفاظ میں دُعا کی کہ لوہا بھی موم ہو مگر ایک بھی نہ سُنی گئی۔ واہ اچھا خدا تھا!

پھر کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی رُوح انسانی تھی نہ رُوح الوہیت۔ ہم پوچھتے ہیں کہ بھلا ان کی رُوح اگر انسانی تھی تو اس وقت اُن کی الوہیت کی روح کہاں تھی؟ کیا وہ آرام کرتی تھی اور خوابِ غفلت میں غرقِ نوم تھی۔ خود بیچارے نے بڑے درد اور رقت کے ساتھ چلا چلا کر دُعا کی۔ حواریوں سے دعا کرائی مگر سب بے فائدہ تھی۔ وہاں ایک بھی نہ سُنی گئی۔ آخر کار خدا صاحب یہودیوں کے ہاتھ سے ملکِ عدم کو پہنچے۔ کیسے قابل شرم اور افسوس ہیں ایسے خیالات۔ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایسا ہی ایک وقت مصیبت اور صعوبت کا آیا تھا اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء پر ایک ایسا مشکل اور نہایت درجہ کی مصیبت کا ایک وقت ضرور آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُحد کا معاملہ کوئی تھوڑا معاملہ تھا؟ آخر کار وہاں شیطان بھی بول اُٹھا تھا کہ نعوذ باللہ آنحضرتؐ مارے گئے اور ہو سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے بھی اس افراتفری میں ایسا خیال کیا ہو

اور بعض صحابہؓ تو تتر بتر بھی ہو گئے تھے۔ آپ ایک گڑھے میں گر پڑے تھے۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم: ۷۲) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضرور انبیاء اور صلحاء کو بھی دنیا میں ایک ایسا وقت آتا ہے کہ نہایت درجہ کی مصیبت کا وقت اور سخت جانکاہ مشکل ہوتی ہے اور اہل حق بھی ایک دفعہ اس صعوبت میں وارد ہوتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جلد تر ان کی خبر گیری کرتا اور ان کو اس سے نکال لیتا ہے اور چونکہ وہ ایک تقدیر معلق ہوتی ہے۔ اس واسطے ان کی دعاؤں اور ابتہال سے ٹل جایا کرتی ہیں

شیخ رحمت اللہ صاحب کی دُعا

شیخ رحمت اللہ صاحب کی دکان کو آگ لگنے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے ننگے سر اور ننگے پاؤں سجدے میں گر کر دُعا کی تو معاً دُعا کرتے کرتے خدا تعالیٰ نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور امن امن کی آواز آگئی اور ہر طرح اطمینان ہوگیا۔

ملائکہ کی حقیقت

اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

ہوا، پانی، آگ وغیرہ بھی ایک طرح کے ملائکہ ہی ہیں۔ ہاں بڑے بڑے ملائکہ وہ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا مگر اس کے سوا باقی اشیاء مفید بھی ملائکہ ہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جہاں فرماتا ہے کہ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل: ۴۵) یعنی کل اشیاء خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں تسبیح کے معنے یہی ہیں کہ جو خدا تعالیٰ ان کو حکم کرتا ہے اور جس طرح اُس کا منشا ہوتا ہے اسی طرح کرتے ہیں اور ہر ایک امر اس کے ارادے اور منشا سے واقع ہوتا ہے۔ اتفاقی طور سے دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا ذرہ ذرہ پر تصرف تام اور اقتدار نہ ہو تو وہ خدا ہی کیا ہوا۔ اور دعا کی قبولیت کی اس سے کیا امید ہو سکتی ہے؟ اور حقیقت یہی ہے کہ وہ ہوا کو جدھر چاہے اور جب چاہے چلا سکتا ہے اور جب ارادہ کرے بند کر سکتا ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں پانی اور پانیوں کے سمندر ہیں جب چاہے جوش زن کردے اور جب چاہے ساکن کردے وہ ذرہ ذرہ پر قادر اور مقتدر خدا ہے۔ اس کے تصرف سے کوئی چیز باہر نہیں۔ وہ جنہوں نے دُعا سے انکار ہی کردیا ہے۔ ان کو بھی یہی مشکلات پیش آئے ہیں کہ انہوں نے خدا کو ہر ذرہ پر قادر مطلق نہ جانا اور اکثر واقعات کو اتفاقی مانا۔ اتفاق کچھ بھی نہیں۔ بلکہ جو ہوتا ہے اور اگر پتہ بھی درخت سے گرتا ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کے ارادے اور حکمت سے گرتا ہے اور یہ سب ملائکہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے حکم کے اشارے سے کام کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں لگائے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے سچے فرمانبردار اور اسی کی رضا کے خواہاں ہوتے ہیں جو خدا کا بن جاتا ہے اُسے خدا تعالیٰ سب کچھ عطا کرتا ہے ؎

جے توں میرا ہو رہیں سب جگ تیرا ہو

مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ پھر ایسے مرتبے کے بعد انسان کو وہ رعیت ملتی ہے کہ باغی نہیں

ہوتی۔ سو دنیوی بادشاہوں کی رعیت تو باغی بھی ہو جاتی ہے مگر ملائکہ کی رعیت ایک ایسی رعیت ہے کہ وہ باغی نہیں ہوتی۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۶-۷ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

۱۳ اپریل ۱۹۰۳ء

(دربارِ شام)

ایک رؤیاء

حضرت اقدس نے مندرجہ ذیل خواب سنایا جو گذشتہ شب کو آیا تھا۔ فرمایا کہ
مَیں دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا بحرِ ذخّار کی طرح ایک دریا ہے جو سانپ کی طرح پیچ کھاتا مغرب سے مشرق کو جا رہا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے سمت بدل کر مشرق سے مغرب کو اُلٹا بہنے لگا۔

طاعون کا زور

فرمایا کہ:۔
اب تو وہ زمانہ طاعون نے دکھانا شروع کر دیا ہے جس طرح مدینہ منورہ میں یہودی قتل ہوئے تھے تو ایک بڑا شخص زندہ رکھا گیا تھا۔ اُس نے پُوچھا فلاں شخص کا کیا حال ہوا۔ فلاں کا کیا حال ہوا۔ غرض جس کے متعلق اس نے دریافت کیا اسی کے متعلق جواب ملا کہ وہ سب قتل کئے گئے تو پھر اس نے کہا کہ لوگوں کے مارے جانے کے بعد مَیں نے زندہ رہ کر کیا بنانا ہے۔ مجھے بھی زندگی کی ضرورت نہیں سو آج کل طاعون وہ حال دکھا رہی ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انسان لمبی عمر کے بھی خواہشمند ہوتے ہیں مگر جب دوست اور تعلق دار ہی نہ رہے تو اس عمر کا ہونا بھی ایک وبال ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت دیکھ کر انسان ایسی لمبی عمر کی بھی آرزو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان دوستوں اور رشتہ داروں کے بغیر رہ سکتا ہی نہیں۔

انسان اور پرندہ

ایک جانور آج کل کے موسم میں شام کے بعد مسجد مبارک کے شہ نشین احباب پر حملہ کیا کرتا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ:۔
کوئی ایسی تدبیر کی جاوے کہ ایک دفعہ یہ اس جگہ پکڑا جاوے پھر ہم اُسے چھوڑ ہی دینگے مگر ایک دفعہ پکڑا جانے سے اتنا تو ضرور ہو گا کہ پھر وہ کبھی آئندہ اس جگہ اس طرح حملہ کرنے کا ارادہ نہ کریگا۔
ہر جانور کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کے اندر ایک خاصیت ہے کہ جس جگہ سے اُسے ایک دفعہ ٹھوکر لگتی ہے اور مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اس جگہ کا پھر وہ کبھی قصد نہیں کرتا مگر صرف انسان ہی ایک ہے جو باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے ان پرندوں وغیرہ سے بھی گرا ہوا ہے کہ جہاں سے اُسے مصائب پہنچتے ہیں اور

ضرر اور نقصان اُٹھاتا ہے اس کی طرف بھاگنے کا حریص ہوتا ہے ہوشیار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس نافرمانی کو ترک کرتا ہے بلکہ جذبات نفس کا مطیع ہو کر پھر اسی کام کو کرنے لگتا ہے جس سے ایکبار ٹھوکر کھا چکا ہو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۷ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

۱۴ اپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

صادق کیساتھ ایک کشش نازل ہوتی ہے

فرمایا:۔ صادق کی بعثت کیساتھ ہی آسمان سے[1] اس کے واسطے ایک کشش نازل ہوا کرتی ہے جو دلوں کو ان کی استعدادوں کے مطابق کشش کرتی اور ایک قوم بنا دیتی ہے۔ اس سے تمام سعید روحیں صادق کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ دیکھو ایک شخص کو دوست بنا کر اس کو اپنے منشاء کے موافق بنانا ہزار مشکل رکھتا ہے اور اگر ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی کسی کو صادق وفادار دوست بنانے کی کوشش کی جاوے تو بھی معرض خطر میں ہی پڑتا ہے اور پھر آخر کار اس خیال کے برعکس نتیجہ نکلتا ہے مگر ادھر اب لاکھوں ہیں کہ غلاموں کی طرح سچے فرمانبردار۔ وفادار۔ صدق و وفا کے پُتلے خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں۔ اور پھر عجب بات یہ ہے کہ اس امر کی اطلاع آج سے بائیس برس پیشتر جب اس کی ایک بھی مثال قائم نہ ہوئی تھی دی گئی۔ چنانچہ الہام ہے کہ وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ۔

آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دُنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک کشش کا نزول ہے سعید تو دوستی کے رنگ میں چلے آتے ہیں مگر شقی بھی اس حصہ سے محروم نہیں۔ ان میں مخالفت کا جوش شعلے مار رہا ہے جب کہیں ہمارا نام بھی اُن کے سامنے آجاتا ہے تو سانپ کی طرح بل پیچ کھاتے اور بیخود ہو کر مجنونوں کی طرح گالی گلوچ تک آجاتے ہیں۔ ورنہ بھلا دنیا میں ہزاروں فقیر۔ لنگوٹی پوش بھنگی۔ چرسی۔ کنجر۔ بدمعاش۔ بدعتی وغیرہ پھرتے ہیں مگر ان کے لیے کسی کو جوش نہیں آتا اور کسی کے کان پر جُوں نہیں چلتی وہ چاہے بد مذہبیاں اور بے دینیاں کریں پھر بھی ان سے مست ہی ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ وہ چونکہ روحانیت سے

---

[1] (البدر سے) "جس طرح انسان کا جسم ایک ہیکل کی طرح بنا کر اس میں خدا تعالیٰ نے روح پھونکی ہے کشش بھی دلوں میں دی ہے جو کہ ان کو کھینچکر یہاں لا رہی ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

خالی ہیں اس واسطے ان کے واسطے کسی کوشش نہیں[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت میں ہزاروں ہزار لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر بھی آپ کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہوئے۔ اپنے مالوں کا جانوں کا نقصان منظور کیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیلئے دن رات تدبیروں منصوبوں میں کوشاں ہوئے مگر دوسری طرف مسیلمہ تھا ادھر کسی کو توجہ نہ تھی۔ اس کی مخالفت کے واسطے کسی کے کان بھی کھڑے نہ ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے جس طرح گھر گھر میں پھوٹ اور جدائی ہوتی تھی۔ مسیلمہ کے واسطے ہرگز نہ ہوئی۔ غرض صادق کے واسطے ہی ایک کشش ہوتی ہے جو دلوں کے ولولوں کو ابھارتی اور جوش میں لاتی ہے۔ سعیدوں کے ولولے سعادت اور اشقیاء کے شقاوت کے رنگ میں پھل لاتے ہیں۔ شقی چونکہ اسی فطرت کے ہوتے ہیں۔ اس واسطے ان کے واسطے کشش بھی اُلٹے رنگ میں ثمرات لاتی ہے۔

(دربارِ شام)

تشبہ بالکفار

ایک شخص نے پوچھا کہ کیا ہندوؤں والی دھوتی باندھنی جائز ہے یا نہیں؟
اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

تشبیہ بالکفار تو کسی رنگ میں بھی جائز نہیں۔ اب ہندو ماتھے پر ایک ٹیکہ سا لگاتے ہیں کوئی وہ بھی لگالے۔ یا سر پر بال تو ہر ایک کے ہوتے ہیں مگر چند بال بودی کی شکل میں ہندو رکھتے ہیں اگر کوئی ویسے ہی رکھ لیوے تو یہ ہرگز جائز نہیں[2]۔ مسلمانوں کو اپنی ہر ایک چال میں وضع قطع میں غیرت مندانہ چال رکھنی چاہیئے ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہ بند بھی باندھا کرتے تھے اور سراویل بھی خریدنا آپ کا ثابت ہے جسے ہم پاجامہ یا تنبی کہتے ہیں ان میں سے جو چاہے پہنے۔ علاوہ ازیں ٹوپی۔ کُرتہ۔ چادر اور پگڑی بھی آپ کی عادت مبارک تھی۔ جو چاہے پہنے کوئی حرج نہیں۔ ہاں البتہ اگر کسی کو کوئی نئی ضرورت درپیش آئے تو اسے چاہیئے کہ ان میں

---

[1] (البدر میں مزید لکھا ہے) "مگر ہمارے لیے ہر ایک طرف سے کوشش ہے کہ یہ کاروبار رُکے مگر وہ بڑھتا جاتا ہے کیونکہ ان لوگوں کی فطرت اُلٹی ہے اس لیے اُن کو کشش بھی اُلٹی ہے۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

[2] (البدر میں ہے):۔ "مثلاً کوئی مسلمان ہندوؤں کی طرح بودی وغیرہ رکھ لیوے تو اگرچہ قرآن اور حدیث میں اس کا کہیں ذکر صریح نہیں ہے مگر چونکہ کفار سے اس میں مشابہت پائی جاتی ہے اس لیے اس سے پرہیز چاہیئے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

سے ایسی چیز کو اختیار کرے جو کفار سے تشبیہ نہ رکھتی ہو اور اسلامی لباس سے نزدیک تر ہو۔ جب ایک شخص اقرار کرتا ہے کہ میں ایمان لایا تو پھر اس کے بعد وہ ڈرتا کس چیز سے اور وہ کون سی چیز ہے جس کی خواہش اب اس کے دل میں باقی رہ گئی ہے کیا کفار کی رسوم اور عادات کی؟ اب اُسے ڈر چاہیئے تو خدا کا۔ اتباع چاہیئے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ کسی ادنیٰ سے گناہ کو خفیف نہ جاننا چاہیئے بلکہ صغیرہ ہی سے کبیرہ بن جاتے ہیں۔ اور صغیرہ ہی کا اصرار کبیرہ ہے[۱]۔

ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسی فطرت ہی نہیں دی کہ ان کے لباس یا پوشش سے فائدہ اُٹھائیں۔ سیالکوٹ سے ایک دوبار انگریزی جُوتا آیا۔ ہمیں اس کا پہننا ہی مشکل ہوتا تھا کبھی اِدھر کا اُدھر اور کبھی بائیں کا دائیں۔ آخر تنگ آکر سیاہی کا نشان لگایا گیا کہ شناخت رہے مگر اس طرح بھی کام نہ چلا۔ آخر میں نے کہا کہ یہ میری فطرت ہی کے خلاف ہے کہ ایسا جُوتا پہنوں۔

دو راستوں میں سے کس کو اختیار کرے

اسی صاحب نے سوال کیا کہ اگر ایک شخص جاتا ہو اور ایک جگہ پر دو راہ جمع ہو جائیں۔ ایک دائیں اور دوسرا بائیں کو۔ تو کس راہ کی طرف جاوے؟ فرمایا کہ:-

اس سے اگر تمہاری مراد بھی جسمانی راہ ہے تو پھر اس راہ جاوے جس میں اس کی صحت نیت اور کوئی فساد نہیں اور اگر جانتا ہے کہ ادھر بدبُو اور عفونت ہے یا کنجروں اور فاسقوں۔ خدا اور رسول کے دشمنوں کے گھر ہیں تو اس راہ کو چھوڑ دے۔ غرض صحتِ نیت کا خیال کرلے اور فساد کی راہ سے کلّی پرہیز کرے[۳]۔

---

[۱] (البدر میں ہے۔ "مسلمانوں کا پیرایہ اختیار کرنا عمدہ بات ہے۔ اس سے انسان مسلمان ثابت ہوتا ہے۔ حتی الوسع دوسرے کو اعتراض کا موقعہ نہ دینا چاہیئے جو لباس اسلام کا ہے اسی میں تقویٰ ہے"۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ ، ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

[۲] (البدر سے) "حتی الوسع اپنے آپ کو ایسے لباس سے بچانا چاہیئے کہ جس سے مشابہت کفار ہو جاتی ہے جب لباس کفار کا ہے تو دوسرے انسان کو وہ کافر ہی نظر آویگا۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ چھوٹی چھوٹی بات پر اصرار کرتا ہے تو آخر کار بڑی بڑی باتوں پر آجاتا ہے مگر جب مسلمان کہلاتا ہے تو اُسے کفار کے لباس کی کیا ضرورت ہے (ایضاً)

[۳] (البدر سے) :- "فرمایا اگر سوال کا تعلق ظاہر راستوں سے ہے تو جو راستہ عافیت کا ہو اُدھر سے جاوے۔ مثلاً ایک راستہ میں مفسد لوگ کنجر وغیرہ آباد ہیں یا شراب خوری ہوتی ہے تو اس کو چھوڑ دیوے۔ اور اگر باطنی راستوں سے سوال کا تعلق ہے تو بھی وہی راستہ اختیار کرے جس میں صلاح اور تقویٰ ہو"۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

بے ایمانی کیسے پیدا ہوتی ہے

ایک اَور سوال کیا کہ بے ایمانی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ فرمایا کہ:۔

بے ایمانی خدا کی معرفت نہ ہونے اور ایمان کے کامل درجہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ادھورا ایمان اس کی وجہ ہوتی ہے۔

ختمِ نبوت سے مُراد

ایک اَور صاحب نے سوال کیا کہ حضور جب سلسلہ موسوی اور سلسلہ محمدی میں مماثلت ہے تو کیا وجہ ہے کہ اُس سلسلہ کے خادم تو نبی کہلائے مگر ادھر اس طرح کوئی بھی نبی نہ کہلایا؟ فرمایا کہ:۔

مشابہت میں ضروری نہیں کہ مشبّہ اور مشبّہ بہٖ بالکل آپس میں ایک دوسرے کے عین ہوں اور ان کا ذرہ بھی آپس میں خلاف نہ ہو۔ اب ہم جو کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو شیر ہے۔ تو اب اس میں کیا بھلا ضروری ہے کہ اس شخص کے جسم پر لمبے لمبے بال بھی ہوں، چار پاؤں بھی ہوں اور دُم بھی ہو اور وہ جنگلوں میں شکار بھی کرتا پھرے؟ بلکہ جس طرح من وجہٖ تشابہ ہوتا ہے ویسا ہی من وجہٖ مخالف بھی ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ تو ہمیں ہی فرمایا ہے۔ جو اعلیٰ درجہ کے خیر اور برکات تھے وہ اسی اُمت میں جمع ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ایسے وقت تک پہنچ گیا ہوا تھا کہ دماغی اور عقلی قوےٰ پہلے کی نسبت بہت کچھ ترقی کر گئے تھے۔ اس زمانہ میں تو ایک گونہ جہالت تھی۔ اب کوئی کہے کہ اس طرح بھی تشابہ نہ ہوا تو یہ اس کا کہنا درست نہ ہوگا۔ نبوت جو اللہ تعالیٰ نے اب قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حرام کی ہے اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب اس اُمت کو کوئی خیر و برکت ملے گی ہی نہیں اور نہ اس کو شرفِ مکالمات اور مخاطبات ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر کے سوائے اب کوئی نبوت نہیں چل سکے گی۔ اس اُمت کے لوگوں پر جو نبی کا لفظ نہیں بولا گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے بعد تو نبوت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عالی جناب، اولوالعزم صاحبِ شریعتِ کامل آنے والے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے واسطے یہ لفظ جاری رکھا گیا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ ہر ایک قسم کی نبوت بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بند ہو چکی تھی اس واسطے ضروری تھا کہ اس کی عظمت کی وجہ سے وہ لفظ نہ بولا جاتا۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:۴۱) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جسمانی طور سے آپکی اولاد کی نفی بھی کی ہے اور ساتھ ہی روحانی طور سے اثبات بھی کیا ہے کہ رُوحانی طور سے آپ باپ بھی ہیں اور رُوحانی نبوت اور فیض کا سلسلہ آپ کے بعد جاری رہے گا اور وہ آپ میں سے ہو کر جاری ہوگا۔ نہ الگ طور سے۔ وہ نبوت چل

سکے گی جس پر آپ کی مُہر ہوگی۔ ورنہ اگر نبوت کا دروازہ بالکل بند سمجھا جاوے تو نعوذ باللہ اس سے تو انقطاعِ فیض لازم آتا ہے اور اس میں تو نحوست ہے اور نبی کی ہتک شان ہوتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو جو کہا کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ یہ جھوٹ تھا نعوذ باللہ۔ اگر یہ معنے کئے جاویں کہ آئندہ کے واسطے نبوت کا دروازہ ہر طرح سے بند ہے تو پھر خیر الامۃ کی بجائے شر الامم ہوئی یہ اُمت۔ جب اس کو اللہ تعالیٰ سے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی نصیب نہ ہوا۔ تو یہ تو کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ہوئی اور بہائم سیرت اسے کہنا چاہیئے نہ یہ کہ خیر الامم۔ اور پھر سورۃ فاتحہ کی دُعا بھی لغو جاتی ہے۔ اس میں جو لکھا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ تو سمجھنا چاہیئے کہ ان پہلوں کے پلاؤ زردے مانگنے کی دعا سکھائی ہے اور انکی جسمانی لذات اور انعامات کے وارث ہونے کی خواہش کی گئی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر یہی معنے ہیں تو باقی رہ بھی کیا گیا۔ جس سے اسلام کا علو ثابت ہووے۔ اس طرح تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی کچھ بھی نہ تھی اور آپ حضرت موسیٰ سے مرتبے میں گرے ہوئے تھے کہ ان کے بعد تو ان کی اُمت میں سے سینکڑوں نبی آئے مگر آپ کی اُمت سے خدا تعالیٰ کو نفرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مکالمہ بھی نہ کیا کیونکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے آخر اس سے کلام تو کیا ہی جاتا ہے۔

نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سلسلہ جاری ہے مگر آپ میں سے ہو کر اور آپ کی مُہر سے اور فیضان کا سلسلہ جاری ہے۔ ہزاروں اس اُمت میں سے مکالمات اور مخاطبات کے شرف سے مشرف ہوئے اور انبیاء کے خصائص اُن میں موجود ہوتے رہے ہیں سینکڑوں بڑے بڑے بزرگ گذرے ہیں جنہوں نے ایسے دعوے کئے۔ چنانچہ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ایک کتاب فتوح الغیب کو ہی دیکھ لو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ جو فرماتا ہے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی (بنی اسرائیل:۷۳) اگر خدا تعالیٰ نے خود ہی اس امت کو اعمٰی بنایا تھا تو عجیب ہے خود ہی اسے اعمٰی بنایا اور خود ہی اعمٰی کے واسطے زجر اور توبیخ ہے کہ آخرت میں بھی اعمٰی ہوگی۔ اس اُمت بیچاری کے کیا اختیار۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک شخص کسی کو کہے کہ اگر تو اس مکان سے گر جاوے گا تو تجھے قید کر دیا جاویگا مگر پھر خود ہی اسے دھکا دیدے۔

گویا نبوت کا سلسلہ بند کر کے فرمایا کہ تجھے مکالمات اور مخاطبات سے بے بہرہ کیا گیا اور تو بہائم کی طرح زندگی بسر کرنے کے واسطے بنائی گئی اور دوسری طرف کہتا ہے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی۔ اب بتاؤ کہ اس تناقض کا کیا جواب ہے؟ ایک طرف تو کہا خیر اُمت اور دوسری جگہ کہدیا کہ تو اعمٰی ہے آخرت میں بھی اعمٰی ہوگی۔ نعوذ باللہ۔ کیسے غلط عقیدے بنائے گئے ہیں۔

اور اگر کوئی باہر سے اس کی اصلاح کے واسطے آگیا تو بھی مشکل۔ اس اُمت کے نبی کی ہتک شان اور

قوم کی بھی ناک کٹی ہوئی کہ اس میں گویا کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اصلاح کرنے کے قابل ہو سکے اور کسی کو یہ شرف مکالمہ عطا نہیں کیا جا سکتا اور اسی پر بس نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض آتا ہے کہ ایسے بڑے نبی ہو کر ان کی اُمت ایسی کمزور اور گئی گذری ہے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ بات یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ کی اُمت میں نبوت ہے اور نبی ہیں مگر لفظ نبی کا بوجہ عظمت نبوت استعمال نہیں کیا جاتا لیکن برکات اور فیوض موجود ہیں۔

خدا کو پانے کی راہ

ایک شخص نے سوال کیا کہ وہ کیا راہ ہے جس سے انسان خدا کو پا سکے؟
فرمایا:-

جو لوگ برکت پاتے ہیں ان کی زبان بند اور عمل ان کے وسیع اور صالح ہوتے ہیں پنجابی میں کہاوت ہے کہ کہنا ایک جانور ہوتا ہے اس کی بدبو سخت ہوتی ہے اور کرنا خوشبودار درخت ہوتا ہے سو ایسا ہی چاہیئے کہ انسان کہنے کی نسبت کر کے بہت کچھ دکھائے۔ صرف زبان کام نہیں آتی۔ بہت سے ہوتے ہیں جو باتیں بہت بناتے ہیں اور کرنے میں نہایت سُست اور کمزور ہوتے ہیں۔ صرف باتیں جن کے ساتھ روح نہ ہو وہ نجاست ہوتی ہیں۔ بات وہی برکت والی ہوتی ہے جس کے ساتھ آسمانی نور ہو اور عمل کے پانی سے سرسبز کی گئی ہو۔ اس کے واسطے انسان خود بخود ہی نہیں کر سکتا۔ چاہیئے کہ ہر وقت دُعا سے کام کرتا رہے اور درد و گداز سے اور سوز سے اس کے آستانہ پر گرا رہے اور اس سے توفیق مانگے ورنہ یاد رکھے کہ اندھا مریگا۔

دیکھو جب ایک شخص کو کوڑھ کا ایک داغ پیدا ہو جاوے تو وہ اس کے واسطے فکرمند ہوتا ہے اور دوسری باتیں اُسے بھول جاتی ہیں۔ اسی طرح جس کو رُوحانی کوڑھ کا پتہ لگ جاوے۔ اُسے بھی ساری باتیں بھول جاتی ہیں اور وہ پیچھے علاج کی طرف دوڑتا ہے مگر افسوس کہ اس سے آگاہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ انسان کے واسطے یہ مشکل ہے کہ وہ سچی توبہ کرے ایک طرف سے توڑ کر دوسری طرف جوڑنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ ہاں مگر جسے خدا تعالیٰ توفیق دے۔ ہاں ادب سے حیا سے۔ شرم سے اُس سے دُعا اور التجا کرنی چاہیئے کہ وہ توفیق عطا کرے اور جو ایسا کرتے ہیں وہ پا بھی لیتے ہیں اور اُن کی سُنی بھی جاتی ہے صرف باتونی آدمی مفید نہیں ہوتا۔ کپڑا جتنا سفید ہوتا ہے اور پہلے اس پر کوئی رنگ نہیں دیا جاتا۔ اتنا ہی عمدہ رنگ اس پر آتا ہے۔ پس تم اس طرح اپنے آپ کو پاک کرو تا تم پر خدائی رنگ عمدہ چڑھے۔ اہلِ بیت جو ایک پاک گروہ اور بڑا عظیم الشان گھرانا تھا۔ اس کے پاک کرنے کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ (الاحزاب:۳۴) یعنی میں ہی ناپاکی اور نجاست کو دُور کروں گا اور خود ہی ان کو پاک کیا تو بھلا اور کون ہے جو خود بخود پاک صاف ہونے کی

توفیق رکھتا ہو۔ پس لازمی ہے کہ اس سے دُعا کرتے رہو اور اسی کے آستانہ پر گرے رہو ساری توفیقیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۷ تا ۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

۱۵ اپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

محمدی سلسلہ میں موسوی سلسلہ کی طرح نبی کیوں نہ آئے؟

فرمایا:۔ رات کے سوال کا یہ حصّہ کہ جب مماثلت ہے موسوی اور محمدی سلسلوں میں۔ تو محمدی سلسلے میں موسوی سلسلے کی طرح نبی کیوں نہ آئے ؟ یہ حصّہ ایسا ہے جس سے ایک انسان کو دھوکا لگ سکتا ہے۔ لہٰذا ہم اس کے متعلق زیادہ تشریح کر دیتے ہیں۔ اوّل تو یہی بات کہ مماثلت کے لیے ضروری نہیں کہ دوسرے کا وہ عین ہو۔ مُشَبَّہ و مُشَبَّہ بِہٖ میں ضرور فرق ہوتا ہے۔ ایک خوبصورت انسان کو چاند سے مشابہت دے دیتے ہیں۔ مگر چاہیئے کہ ایسے انسان کا ناک نہ ہو۔ کان نہ ہوں۔ صرف ایک گول سفید چمکیلا سا ٹکڑا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ مشابہت کے واسطے بعض حصہ میں مشابہت ضرور ہوتی ہے[۱]

دیکھیئے حضرت موسیٰؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشابہت ہے اور اس میں صرف اعلیٰ جزو یہی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم کو جو فرعون کے ماتحت غلامی میں مبتلا تھی اور اُن کے حالات گندے ہو گئے تھے وہ خدا کو بھول گئے تھے اور ان کے خیالات اور ہمتیں پست ہو گئی تھیں۔ موسیٰؑ نے اس قوم کو فرعون سے نجات دلائی اور ان کو خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے قابل بنا دیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک قوم کو بتوں کی غلامی اور راہ و رسم کی قید سے نجات دلائی اور اپنے دشمن کو فرعون کی طرح ہلاک و برباد کیا۔ یہ مشابہت تھی[۲]

---

[۱] البدر میں ہے :۔ "مماثلت میں عین ہونا ضروری نہیں کیونکہ اگر بالکل وہی ہو گیا تو پھر وہی چیز ہوئی نہ مثال۔ اس لیے کچھ نہ کچھ فرق ہونا ضروری ہے۔ جیسے کسی کو اگر شیر کہا جاوے تو یہ ضرور نہیں کہ وہ کچا گوشت بھی کھاتا ہو اور اُس کے دُم بھی ہو اور وہ جنگلوں میں رہتا ہو۔ وغیرہ۔ صرف بعض صفات شجاعت وغیرہ میں اس کی مماثلت ہوگی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

[۲] البدر میں ہے :۔ مشابہت میں مِن وجہٍ مخالفت چاہیئے اور مِنْ وجہٍ مطابقت اور اس اُمّت میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

-- اگر غور سے دیکھا جاوے تو ہمارے نبی کریمؐ کو آپ کے بعد کسی دوسرے کے نبی نہ کہلانے سے شوکت ہے اور حضرت موسیٰؑ کے بعد اور لوگوں کے بھی نبی کہلانے سے اُن کی کسرِ شان۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ بھی ایک نبی تھے اور ان کے بعد ہزاروں اَور بھی نبی آئے تو اُن کی نبوت کی خصوصیت اور عظمت کوئی نہیں ثابت ہوتی۔ برعکس اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظمت اور آپ کی نبوت کے لفظ کا پاس اور ادب کیا گیا ہے۔ کہ آپ کے بعد کسی دوسرے کو اس نام سے کسی طرح بھی شریک نہ کیا گیا۔

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت میں بھی ہزاروں بزرگ نبوت کے نور سے منور تھے اور ہزاروں کو نبوت کا حصّہ عطا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خاتم الانبیاء رکھا گیا تھا۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے نہ چاہا کہ دوسرے کو بھی یہ نام دے کر آپ کی کسرِ شان کی جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سے ہزارہا انسانوں کو نبوت کا درجہ ملا اور نبوت کے آثار اور برکات ان کے اندر موجزن تھے مگر نبی کا نام۔ صرف شانِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سدِّ باب نبوت کی خاطر اُن کو اس نام سے ظاہراً ملقب نہ کیا گیا۔[لے] مگر دوسری طرف چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض اور رُوحانی برکات کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

جو مراتب خدا تعالیٰ نے رکھے ہیں وہ موسوی سلسلہ سے بہت زیادہ ہیں اگر اس کے برابر ہوتے تو پھر فضیلت کیا ہوئی۔ پھر جس قدر علوم کی کثرت اور وسعت اس وقت اس اُمّت میں ہے کیا وہ موسوی اُمّت میں تھی؟ چونکہ خدا تعالیٰ کا ارادہ تھا کہ اَور کوئی شریعت اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ ہوگی اس لیے آپ کو وہ علوم اور انفاظ دیئے کہ کسی کو پھر نئی شریعت کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ خاتم النبیین کی آیت بتلا رہی ہے کہ جسمانی نسل کا انقطاع ہے نہ کہ رُوحانی نسل کا۔ اس لیے جس ذریعہ سے وہ نبوت کی نفی کرتے ہیں۔ اسی سے نبوت کا اثبات ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چونکہ کمال عظمت خدا تعالیٰ کو منظور تھی اس لیے لکھ دیا کہ آئندہ نبوت آپ کی اتباع کی مُہر سے ہوگی اور اگر یہ معنے ہوں کہ نبوت ختم ہے تو اس سے خدا تعالیٰ کے فیضان کے بخل کی بُو آتی ہے۔ ہاں یہ معنے ہیں ہر ایک قسم کا کمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا اور پھر آئندہ آپ کی مہر سے وہ کمال آپ کی اُمّت کو ملا کریں گے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ ، ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

لے البدر سے :- "لیکن اگر اس اُمّت میں کوئی بھی نبی نہ پکارا جاتا تو مماثلت موسوی کا پہلو بہت ناقص ٹھہرتا اور مِن وجہٍ اُمّت موسوی کو ایک فضیلت ہو جاتی اس لیے یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زبان مبارک سے ایک شخص کو دیدیا جس نے مسیح ابن مریم ہو کر دنیا میں آنا تھا۔ کیونکہ اس جگہ دو پہلو مدِّ نظر تھے۔ ایک ختمِ نبوت کا، اُسے اس طرح نبھایا کہ جو نبی کے لفظ کی کثرت موسوی سلسلہ میں تھی اُسے اُڑا دیا۔ دوسری مشابہت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دروازہ بند بھی نہ کیا گیا تھا اور نبوت کے انوار جاری بھی تھے۔ جیسا کہ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ سے نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر اور اذن سے اور آپ کے نُور سے نُورِ نبوت جاری بھی ہے اور یہ سلسلہ بند بھی نہیں ہوا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اسے ظاہراً بھی شائع کیا جاوے تاکہ موسوی سلسلہ کے نبیوں کے ساتھ آپ کی اُمت کے لوگ بھی مماثلت کے پورا کرنے میں صاف طور سے نبی اللہ کا لفظ فرما دیا اور اس طرح سے دونوں امور کا لحاظ نہایت حکمت اور کمال لطافت سے رکھ لیا گیا۔ ادھر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسرِ شان بھی نہ ہو اور اُدھر موسوی سلسلہ سے مماثلت بھی پوری ہو جاوے۔ تیرہ سو برس تک نبوت کے لفظ کا اطلاق تو آپ کی نبوت کی عظمت کے پاس سے نہ کیا اور اس کے بعد اب مدت دراز کے گذرنے سے لوگوں کے چونکہ اعتقاد اس امر پر پختہ ہو گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی خاتم الانبیاء ہیں اور اب اگر کسی دوسرے کا نام نبی رکھا جاوے تو اس سے آنحضرت کی شان میں کوئی فرق بھی نہیں آتا اس واسطے اب نبوت کا لفظ مسیح کے لیے ظاہراً بھی بول دیا۔ یہ ٹھیک اسی طرح سے ہے جیسے آپ نے پہلے فرمایا تھا کہ قبروں کی زیارت نہ کیا کرو اور پھر فرما دیا کہ اچھا اب کر لیا کرو۔ پہلے منع کرنا بھی حکمت رکھتا تھا کہ لوگوں کے خیالات ابھی تازہ بتازہ بت پرستی سے ہٹے تھے تا وہ پھر اسی عادت کی طرف عود نہ کریں۔ پھر جب دیکھا کہ اب اُن کے ایمان کمال کو پہنچ گئے ہیں اور کسی قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اُسے اس طرح سے پورا کیا کہ ایک کو نبی کا خطاب دیدیا۔ تکمیل مشابہت کے لیے اس لفظ کا ہونا ضروری تھا سو پورا ہو گیا اور جو مصلحت یہاں مدنظر تھی وہ موسوی سلسلہ میں نہیں تھی کیونکہ موسیٰؑ خاتم نبوت نہیں تھے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۱۰۲ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

لے البدر میں ہے :۔ "نبوت کے معنے مکالمہ کے ہیں جو غیب کی خبر دیوے وہ نبی ہے۔ اگر آئندہ نبوت کو باطل قرار دو گے تو پھر یہ اُمت خیرِ اُمت نہ رہے گی۔ بلکہ کالانعام ہو گی اور سورہ فاتحہ کی تعلیم جس میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ : ۶-۷) ہے بیسود ٹھہرے گی۔ کیونکہ انعام و اکرام تو خدا کا اب کسی پر ہونا نہیں تو پھر دُعا کا فائدہ کیا ہوا؟ اور نعوذ باللہ یہ ماننا پڑا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں قدسی قوت ہی نہ تھی۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے نفس میں معرفت کی پیاس رکھ دی ہے اور خود ہی فرمایا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل : ۷۳) ادھر یہ کہا اور اُدھر مکالمہ کا دروازہ بند ہوا تو پھر تو خدا نے دیدہ دانستہ اعمیٰ رکھنا چاہا اور پھر وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) کے کیا معنے ہوئے؟

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۹۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

شرک وبدعت کو ان کے ایمان میں راہ نہیں تو اجازت دیدی۔ بالکل اسی طرح یہ امر ہے۔ پہلے تیرہ سو[۱۳۰۰] برس اس عظمت کے واسطے نبوت کا لفظ نہ بولا اگرچہ صفتی رنگ میں صفتِ نبوت اور انوارِ نبوت موجود تھے اور حق تھا کہ ان لوگوں کو نبی کہا جاوے مگر خاتم الانبیاء کی نبوت کی عظمت کے پاس کی وجہ سے وہ نام نہ دیا گیا۔ مگر اب وہ خوف نہ رہا تو آخری زمانہ میں مسیح موعود کے واسطے نبی اللہ کا لفظ فرمایا۔ آپ کے جانشینوں اور آپ کی اُمت کے خادموں پر صاف صاف نبی اللہ بولنے کے واسطے دو امور مدّنظر رکھنے ضروری تھے۔ اوّل عظمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوم عظمت اسلام۔ سو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے پاس کی وجہ سے ان لوگوں پر ۱۳۰۰ برس تک نبی کا لفظ نہ بولا گیا تاکہ آپ کی ختمِ نبوت کی ہتک نہ ہو کیونکہ اگر آپ کے بعد ہی آپ کی امت کے خلیفوں اور صلحاء لوگوں پر نبی کا لفظ بولا جانے لگتا جیسے حضرت موسٰیؑ کے بعد لوگوں پر بولا جاتا رہا تو اُس میں آپ کی ختمِ نبوت کی ہتک تھی اور کوئی عظمت نہ تھی۔ سو خدا تعالیٰ نے ایسا کیا کہ اپنی حکمت اور لُطف سے آپ کے بعد ۱۳۰۰ برس تک اس لفظ کو آپ کی اُمت پر سے اُٹھا دیا تا آپ کی نبوت کی عظمت کا حق ادا ہو جاوے اور پھر چونکہ اسلام کی عظمت چاہتی تھی کہ اس میں بھی بعض ایسے افراد ہوں جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لفظ نبی اللہ بولا جاوے اور تا پہلے سلسلہ سے اس کی مماثلت پوری ہو۔ آخری زمانہ میں مسیح موعود کے واسطے آپ کی زبان سے نبی اللہ کا لفظ نکلوا دیا۔ اور اس طرح پر نہایت حکمت اور بلاغت سے دو متضاد باتوں کو پورا کیا اور موسوی سلسلہ کی مماثلت بھی قائم رکھی اور عظمت اور نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قائم رکھی[۱]۔

عورت نبیہ نہیں ہو سکتی

سوال:۔ کیا کوئی عورت نبیہ ہو سکتی ہے؟ فرمایا:۔

نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۵) اور وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرة: ۲۲۹) عورتیں اصل میں مردوں کی ہی ذیل میں ہوا کرتی ہیں۔ جب صاحبِ درجہ اور صاحب مرتبہ کے واسطے ایک دروازہ بند کر دیا گیا تو یہ بیچاری ناقصات العقل کس حساب میں ہیں؟

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۹-۱۰ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭

---

[۱] البدر میں ہے:۔ "محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ نبوت تشریعی جائز نہیں دوسری جائز ہے۔ مگر میرا اپنا مذہب یہ ہے کہ ہر قسم کی نبوت کا دروازہ بند ہے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انعکاس سے جو نبوت ہو وہ جائز ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ صفحہ ۱۰۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

۱۶ / اپریل ۱۹۰۳ء

ایک نیا نکتہ بعد نماز مغرب حضرت اقدس نے اس تقریر کا اعادہ فرمایا جو کہ مورخہ ۱۵/ اپریل کی سیر میں درج ہو چکی ہے۔ اسکی تکمیل میں ایک نئی بات یہ فرمائی کہ:۔

اس وقت میں اُمتِ موسوی کی طرح جو مامور اور مجددین آئے ان کا نام نبی نہ رکھا گیا تو اس میں یہ حکمت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ ختمِ نبوت میں فرق نہ آوے (جس کا مفصل ذکر قبل ازیں گذر چکا ہے) اور اگر کوئی نبی نہ آتا تو پھر مماثلت میں فرق آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آدم۔ ابراہیم۔ نوح اور موسیٰ وغیرہ میرے نام رکھے حتیٰ کہ آخر کار جَرِیُّ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَاءِ کہا۔ گویا اس سے سب اعتراض رفع ہو گئے اور آپ کی امت میں ایک آخری خلیفہ ایسا آیا جو موسیٰ کے تمام خلفاء کا جامع تھا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۳ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

---

۱۷ / اپریل ۱۹۰۳ء[1]

(دربار شام)

انجیل کی تعلیم ناقابلِ عمل ہے کالجوں اور مدرسوں میں انجیل پڑھانے کے متعلق ذکر ہوتے ہوئے فرمایا کہ:۔

ہمیں تو تعجب آتا ہے کہ یہ لوگ انجیل کو پیش کس خیال سے کرتے ہیں۔ اس کی تعلیم تو انسانی فطرت ہی کے خلاف پڑی ہوئی ہے اور تو اور ایک درخت[2] کی طرح مثال خیال کرو اور اس کی مختلف شاخوں کو انسان کے

---

[1] البدر میں لکھا ہے:۔ "دو گریجوایٹ لاہور سے حضرت اقدس کی ملاقات کو تشریف لائے تھے۔ اُن کی آمد پر عیسویت کے متعلق ذکر چل پڑا۔ اس پر حضرت اقدس نے عیسویت کی تعلیم کے متعلق فرمایا" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۳ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "انسان کے قویٰ اور اخلاق کی مثال ایسی ہے جیسے ایک درخت ہو اور اسکی بہت سی شاخیں ہوں اور سب اسی لیے ہوتی ہیں کہ پھل دیویں۔ ایسے ہی انسان کو جو اخلاق دیئے گئے ہیں اُنکے استعمال کے مختلف موقعے ہوتے ہیں کبھی حلم کی قوت ہوتی ہے مگر وقت ان کے استعمال کا نہیں ہوتا مصلحت اس سے کام لینے کا تقاضا نہیں کرتی۔ ایسے ہی غضب کا حال ہے جس قدر قویٰ انسان لیکر آیا ہے حکمتِ الٰہی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اپنے اپنے محل پر استعمال ہوں۔ ورنہ پھر خدا تعالیٰ کا فعل عبث ٹھہرتا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۳ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

مختلف قویٰ۔ انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ مختلف اوقات پر مختلف قویٰ سے کام لیوے کیونکہ اس کی فطرت میں اس کی پیدائش کے وقت سے ایسا ہی رکھا گیا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک انسان کو ایک وقت ایک اور برمحل غضب ہو تو اس کی جگہ حلم کرے اور ہمیشہ ایک قوت سے کام لے دوسرے قویٰ کے ظہور کا موقعہ ہی نہ آوے۔ اگر ایسا ہی خدا تعالیٰ نے کرنا تھا تو اتنے مختلف قویٰ کیوں انسان کو دیئے؟ صرف ایک عفو اور حلم ہی دیتا۔ باقی قویٰ سے جب کام لینا ہی گناہ تھا تو وہ عطا کیوں کئے؟ نہیں ایسا نہیں۔ بلکہ انسان کی انسانیت اور اخلاقِ فاضلہ ہی اسی میں ہیں کہ محل اور موقعہ کے مطابق اپنے قویٰ کا اظہار کرے۔ ورنہ اس میں اور حیوانوں میں مابہ الامتیاز کیا ہوا؟

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن سے ایک دو مرتبہ عفو اور درگذر کیا جاوے اور نیک سلوک کیا جاوے تو اطاعت میں ترقی کرتے اور اپنے فرائض کو پوری طرح سے ادا کرنے لگ جاتے ہیں اور بعض شرارت میں اَور بھی زیادہ ترقی کرتے اور احکام کی پروا نہ کرکے ان کو توڑ دینے کی طرف دوڑتے ہیں۔ اب اگر ایک خدمت گار کو جو نہایت شریف الطبع آدمی ہے اور اتفاقاً اس سے ایک غلطی ہوگئی ہے اُسے اُٹھ کر مارنے اور پیٹنے لگ جائیں تو کیا وہ کام دے سکیگا؟ نہیں بلکہ اس سے تو عفو اور درگذر کرنا ہی اس کے واسطے مفید اور اس کی اصلاح کا موجب ہے مگر ایک شریر کو جس کا بارہا تجربہ ہوگیا ہے کہ وہ عفو سے نہیں سمجھتا بلکہ اَور بھی شرارت میں قدم آگے رکھتا ہے تو اس کو ضرور سزا دینی پڑیگی اور اسکے واسطے مناسب یہی ہے کہ اُسے سزا دی جاوے۔

اس قانون کے سوا انجیلی تعلیم پر چل کر تو انسانی تمدن کا نظام چل سکتا ہی نہیں بھلا اگر ایسا ہی اُنکا مذہب تھا تو پھر عدالتوں کے قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ عدالتوں کے قوانین میں کیوں سزائیں مقرر ہیں؟ کسی مجرم کے واسطے کہیں قانون میں عفو کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ہر جُرم کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

انجیلی تعلیم نے صرف ایک ہی پہلو پر زور دیا ہے۔ اگر ہمیں خدا تعالیٰ کی کتاب سے یہ امر نہ معلوم ہوتا کہ یہ مختص الزمان اور مختص المکان تعلیم ہے تو اس کے آسمانی اور الہامی ہونے میں تو ہمیں انکار ہی کرنا پڑتا کیونکہ بھاری بھاری ضرورتوں کے پُورا کرنے کی اُس کے اندر وسعت نہیں۔ کیا اگر کسی شریر کو اس کی اصلاح کے لیے سزا دی جاوے تو وہ گناہ ہے اور کیا ایک شخص کو جو بدمعاش ہے اور چوری کرکے لوگوں کا مال مار چکا ہے اس کو عین محل پر سزا دی جاوے تو یہ بُرا ہے؟[1]

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہی سزا اور چشم نمائی پر منحصر ہوتی ہے۔ لڑکے جو اُستادوں کے پاس تعلیم پاتے ہیں ان کو بھی کچھ نہ کچھ چشم نمائی کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ ہمیشہ اور

[1] الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۶ مورخہ ۱۷؍ اپریل ۱۹۰۳ء

ہر خطا پر عفو ہی کرتے رہیں تو لڑکا خراب ہو جاتا ہے۔ ایسی تعلیم اب یہ لوگ کرتے ہی کیوں ہیں؟ انہیں تو چاہیئے تھا اسے چھپاتے یہ تو زمانہ ہی ایسا تھا کہ اس کی تعلیم کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے۔ اگر کوئی انجیل پوچھتا بھی تو کہہ دیتے کہ انجیل فلاں الماری میں بھول گئی ہے اور آج وہاں رہ گئی ہے کل دیں گے۔ اور اس طرح پر ہر روز ٹلاتے رہتے۔ کیونکہ انجیلی تعلیم موجودہ زمانہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھا جاوے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کبھی کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے اس تعلیم پر عمل کرکے دکھایا ہو۔ کسی پادری اور عیسائی کو جب یہ بات حاصل نہیں تو اور کوئی کیا کرے گا۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مسیح نے بھی انجیل کی تعلیم کے موافق کرکے نہیں دکھایا اور ان کا عمل ثابت نہیں ہے اور بیچارے کس شمار میں ہیں۔ اگر یہ تعلیم صحیح ہے تو چاہیئے تھا کہ عیسائی لوگ اب بھی کُرتہ مانگنے والے کو چادر دے دیتے اور ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری بھی پھیر دیتے مگر ہم کو افسوس سے ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ تکلف اور تصنع سے بھی برائے نام کسی نے اس پر عمل کرکے نہ دکھایا۔ کوئی تو انجیل کی عزت رکھنے والا ہوتا۔ برخلاف اسکے دیکھا گیا ہے کہ اگر ذرا سی بات بھی مشنریوں کے خلاف مزاج ہوئی تو عدالت تک پہنچاتے ہیں اور ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ سزا دلائی جاوے۔

مگر قرآن شریف اس کے مقابلے میں کیا تعلیم دیتا ہے۔ فرماتا ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشورٰی: ۴۱) یعنی بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے لیکن اگر کوئی معاف کر دے اور اس عفو میں اصلاح مدنظر ہو بگاڑ نہ ہو تو ایسے شخص کو خدا سے اجر ملے گا۔ دیکھو قرآن شریف نے انجیل کی طرح ایک پہلو پر زور نہیں دیا بلکہ محل اور موقعہ کے موافق عفو یا سزا کی کارروائی کرنے کا حکم دیا ہے۔ عفو غیر محل نہ ہو۔ ایسا عفو نہ ہو کہ اس کی وجہ سے کسی مجرم کو زیادہ جرأت ہو اور دلیری بڑھ جاوے اور وہ اور بھی گناہ اور شرارت میں ترقی کرتے۔ غرض دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہے۔ اگر عفو سے اس کی عادت بدجاتی رہے تو عفو کی تعلیم ہے اور اگر اصلاح سزا میں ہو تو سزا دینی چاہیئے[1] اور پھر اگر قرآن شریف کی اور باقی تعلیموں کو بھی زمانہ کے ساتھ مطابق کرنا چاہیں تو اور کوئی تعلیم اس کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

مسیح موعودؑ کے دعاوی کا انحصار نشانات پر ہوگا

فرمایا:۔ قرآن شریف نے جو فرمایا اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ (النمل: ۸۳) اس سے معلوم

---

[1] البدر سے:۔ "ایک ہی پہلو اختیار کرنا اور حلم اور عفو پر زور دینا اور وقت اور مصلحت کو نہ دیکھنا کسقدر خلاف عقل ہے۔ عقل ہمیں دکھلاتی ہے کہ ہزار انسان ہیں جو کہ سزا کے ذریعہ ہدایت یاب ہوتے ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۳ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

ہوتا ہے کہ مسیح موعود جس کے وقت کے متعلق یہ پیشگوئی ہے اس کے دعاوی کا بہت بڑا انحصار اور دارومدار نشانات پر ہوگا اور خدا تعالیٰ نے اسے بھی بہت سے نشانات عطا فرمار کھے ہوں گے کیونکہ یہ جو فرمایا کہ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ - یعنی اس عذاب کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے نشانات کی کچھ بھی پروا نہ کی اور ان کو نہ مانا اس واسطے ان کو یہ سزا ملی۔ ان نشانات سے مراد صرف مسیح موعود کے نشانات ہیں ورنہ یہ امر تو ٹھیک نہیں کہ گناہ تو زید کرے اور اس کی سزا عمرو کو ملے جو اس سے تیرہ سو سال بعد آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر لوگوں نے نشانات دیکھے اور ان سے انکار کیا تو اس انکار کی سزا تو ان کو اسی وقت مل گئی اور وہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ اگر آیت سے وہی نشانات مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے تھے تو اب ہزاروں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں کہ اگر اُن سے پوچھا بھی جاوے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کون کون سے نشانات ظاہر ہوئے تو ہزاروں میں سے شاید کوئی ہی ایسا نکلے جس کو اس طرح پر آپ کے نشانات کا علم ہو ورنہ عام طور سے اب مسلمانوں کو خبر تک بھی نہیں کہ وہ نشانات کیا تھے اور کس طرح خدا تعالیٰ نے آپ کی تائید میں ان کو ظاہر فرمایا مگر کیا اس لاعلمی سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگ سارے کے سارے ان نشانات سے منکر ہیں اور ان کو وہ نہیں مانتے۔ حالانکہ وہ مومن بھی ہیں۔ اگر ان کو علم ہو تو وہ ماننے بیٹھے ہیں اُن کو کوئی انکار نہیں۔ ان لوگوں کے متعلق تو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات نہ ماننے کا لفظ لا سکتے ہی نہیں کیونکہ انہوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی نبوت کی تفاصیل سمیت مان لیا ہوا ہے وہ انکار کیسے کر سکتے ہیں اور دیگر مذاہب کے لوگوں پر وہ نشانات اب حجت نہیں کیونکہ انہوں نے وہ دیکھے نہیں ہیں۔ جنہوں نے دیکھ کر انکار کیا تھا وہ ہلاک ہو چکے۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں نے آپ کے نشانات دیکھے ہی نہیں تو وہ انکار کی وجہ سے ہلاک کیسے ہو سکتے ہیں؟

پس معلوم ہوا کہ ان نشانات سے مراد مسیح موعود ہی کے نشانات ہیں جن کا انکار کرنے کی وجہ سے عذاب کی تنبیہ ہے اور خدا تعالیٰ کا غضب ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے مسیح موعود کے نشانات سے انکار کیا ہے اور یہ خدائی فیصلہ ہے جس کو رد نہیں کیا جا سکتا یہ نصِ صریح ہے اس بات پر کہ طاعون مسیح موعود کے انکار کی وجہ سے آئی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۳ء)

۱۸ر اپریل ۱۹۰۳ء

(بوقتِ سیر)

حضور کا دعویٰ

نو وارد مہمانوں میں سے ایک نے سوال کیا کہ آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ فرمایا:۔
ہمارا دعویٰ مسیح موعود کا ہے جس کے کل عیسائی اور مسلمان منتظر ہیں اور وہ میں ہوں۔

پھر پوچھا کہ اس کے دلائل کیا ہیں؟ فرمایا:۔
اب وقت تھوڑا ہے۔ سوال تو انسان چند منٹوں میں کرلیتا ہے مگر بعض اوقات جواب کے لیے چند گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ جب تک ہر ایک پہلو سے نہ سمجھایا جاوے تو بات سمجھ نہیں آیا کرتی اس لیے آپ کتابیں دیکھیں یا پھر کافی وقت ہو تو بیان کر دیئے جاویں گے۔

خاتم النبیین کی تشریح

دوسرے صاحب نے سوال کیا کہ خاتم النبیین کی شرح کیا ہے؟

اس کے جواب میں حضرت اقدس نے اپنا وہی مذہب بیان کیا جو ۱۵/اپریل کی ڈائری میں آچکا ہے۔ نیز فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۲) جو جس سے پیار کرتا ہے تو اس سے کلام بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ جس سے پیار کرتا ہے تو اس سے بلا مکالمہ نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع سے جب انسان کو خدا پیار کرنے لگتا ہے تو اس سے کلام بھی کرتا ہے غیب کی خبریں اس پر ظاہر کرتا ہے۔ اسی کا نام نبوت ہے۔

مجلس قبل از عشاء

معرفت کی راہ

فرمایا:۔
خدا تعالیٰ کی معرفت کی راہ بہت باریک اور تنگ ہے۔ اس لیے اس کا مشاہدہ انسان پر مشکل ہے۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسباب کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اور اسی لیے انسان ہی پرائی ہو جاتا ہے مگر تاہم ایک حصہ امراض کا انسان کو ایسا لگا ہوا ہے کہ طبیب ہاتھ ملتے ہی رہ جاتے ہیں اور کچھ پیش نہیں جاتی۔

کیا دینداری اختیار کرنے سے مصیبت آتی ہے؟

بعض دنیا دار اعتراض کرتے ہیں کہ دینداری اختیار کی تو مصیبت آئی۔ مگر وہ بہت جھوٹے ہوتے ہیں۔ دیندار پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کے ثواب اور معرفت کا موجب ہوتی ہے اور دنیا دار پر جو مصیبت آتی ہے وہ اس کی لعنت کا موجب بن جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مصیبت پڑی مگر کیا ہی پیاری مصیبت تھی کہ جیسے جیسے وہ بڑھتی جاتی ویسے ہی زور سے قرآن نازل ہوتا جاتا۔ وہ دَور گو جلدی ختم ہو گیا یعنی صرف حضرت معاویہ تک ہی رہا۔ مگر نہ وہ رہے نہ یہ۔ ہاں سعید گروہ کے آثار قیامت تک رہے

اور شقی کا نام بھی ندارد۔ کاش کہ ابوجہل کبھی زندہ ہو کر آتا تو دیکھتا کہ جس کو وہ حقیر اور ذلیل خیال کرتا تھا خدا تعالیٰ نے اس کی کیا شان بنائی ہے۔ مشرق اور مغرب تک کہاں کہاں بلادِ اسلامیہ پھیلے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو صحابہؓ فوت ہوئے انہوں نے تو وہ ترقیات نہ دیکھیں مگر جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا انہوں نے دیکھ لیں۔ ساگر ابوجہل وغیرہ کو معلوم ہوتا کہ عروج ہوگا تو مثل غلاموں کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو جاتے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

---

۲۰ اپریل ۱۹۰۳ء

(صبح کی سیر)

حُباب ہستی فرمایا:۔ مجھے ہمیشہ تعجب آتا ہے کہ باوجود اس قدر بے بنیاد ہستی کے انسان دنیا میں بنیادیں قائم کرتا ہے۔ صرف ایک دم کی آمد و شد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ سلسلہ خدا تعالیٰ نے کیسا رکھا ہے کہ جو شخص یہاں سے رخصت ہو جاوے اس کو اجازت نہیں کہ واپس آ کر وہاں کی خبر ہی بتلا جاوے۔ اس سے حکماء اور فلاسفر اور دانایانِ زمان سب عاجز ہیں ہاں اسی قدر پتہ ملتا ہے جو خدا کی کلام نے بتایا ہے۔

آدمی جو مرتا ہے اکثر اپنے بڑے بڑے تعلقات اور عزیز اور پیارے رشتہ دار چھوڑ جاتا ہے مگر معاً انتقال کے بعد ان سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ آجکل یورپ کو ہر ایک بات کی تلاش ہے چنانچہ امریکہ میں ایک شخص سے معاہدہ ہوا (جو واجب القتل تھا) کہ جب اس کا سر کاٹا جاوے تو اس کو بہت بلند آواز سے پکارا جاوے تو یہ آنکھ سے اشارہ کریگا۔ چنانچہ جب سر کاٹا گیا تو بڑے زور سے آوازیں دی گئیں مگر کچھ حرکت نہ ہوئی۔ سچ ہے ؎

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

جو کچھ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وہی سچ ہے ہاں موت اور نیند کو آپس میں مشابہت ہے۔

احیاءِ موتیٰ احیاءِ موتیٰ کے بارے میں سوال ہونے پر فرمایا کہ:۔

اس میں ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ اعجازی طور پر بھی احیاءِ موتیٰ نہیں ہوتا بلکہ یہ عقیدہ ہے کہ وہ شخص دوبارہ دنیا کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ مبارک احمد کی حیات اعجازی ہے۔ اس میں کوئی بحث نہیں کہ جس شخص کی باقاعدہ طور پر فرشتہ جان قبض کر لے اور زمین میں بھی دفن کیا جاوے وہ پھر کبھی زندہ نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی نے خوب کہا ہے ؎

واہ کہ گر مردہ باز گردیدے ٭ درمیان قبیلہ و پیوند
ردّ میراث سخت تر بودے ٭ وارثاں را ز مرگ خویشاوند

خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ (الزمر:۴۳)۔

حقیقتِ کشف

کشف کیا ہے اسی بیداری کے ساتھ کسی اور عالم کا تداخل ہوجاتا ہے۔ اس میں حواس کے معطل ہونے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا کی بیداری بھی ہوتی ہے اور ایک عالمِ غیبوبیت بھی ہوتا ہے یعنی حالت بیداری ہوتی ہے اور اَمرارِ غیبی بھی نظر آتے ہیں۔

قتلِ انبیاء

قتلِ انبیاء پر سوال ہونے پر فرمایا:۔

توریت میں لکھا ہے کہ جھوٹا نبی قتل کیا جاوے گا۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر قرآن کی نصِ صریح سے پایا جاوے یا حدیث کے تواتر سے ثابت ہو کہ نبی قتل ہوتے رہے ہیں تو پھر ہم کو اس سے انکار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہرحال یہ کچھ ایسی بات نہیں کہ نبی کی شان میں خلل انداز ہو کیونکہ قتل بھی شہادت ہوتی ہے مگر ہاں ناکام قتل ہوجانا انبیاء کی علامات میں سے نہیں۔

یہ مصالح پر موقوف ہے کہ ایک شخص کے قتل سے فتنہ برپا ہوتا ہے تو مصلحتِ الٰہی نہیں چاہتی کہ اس کو قتل کرا کر فتنہ برپا کیا جاوے۔ جس کے قتل سے ایسا اندیشہ نہ ہو اس میں حرج نہیں۔

حدیث قرآن سے باہر نہیں

پھر فرمایا کہ :۔

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے وہی کچھ حدیث میں ہے۔ ہاں بعض[1] باتوں کا استنباط ایسا اعلیٰ حدیثوں نے کیا ہے کہ دوسرے گو اس کو سمجھ نہیں سکتے ورنہ حدیث قرآن سے باہر نہیں۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کا نام رکھا ہے مُفَصَّلاً۔ اس پر ایمان ہونا چاہیئے بعض تفاسیر سوائے انبیاء کے اَور کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ پھر اس طرح حدیث میں قرآن سے زائد کچھ نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۲ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں یہ عبارت یوں ہے :۔ "ہاں یہ بات ہے کہ بعض لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات قرآن کے کس مقام سے استنباط کی ہے تو انکو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن میں نہیں ہے ورنہ اصل بات یہ ہے کہ سب کچھ قرآن سے ہی لیا گیا ہے مگر اس باریک در باریک استنباط کا لوگوں کو علم نہیں ہوتا خدا تعالیٰ نے قرآن کو کتاب مفصل کہا ہے تو اس پر ایمان ہونا چاہیئے۔ بعض استنباط سوائے انبیاء کے دوسرے کو سمجھ ہی نہیں آتے۔ اس پر مولوی محمد احسن صاحب نے کہا کہ جیسے اب اس وقت مسیح موعودؑ اور اس زمانہ کے فتن کی خبر حضور نے سورۃ فاتحہ سے استنباط کر کے بتلائی ہے آج تک کس کو خبر تھی کہ یہ سب کچھ قرآن میں ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۴ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

متقی ہر وقت تیار رہتا ہے

ہر رات حاملہ عورت کی طرح ہوتی ہے جیسے وہاں معلوم نہیں کہ کیا پیدا ہو۔ نہیں معلوم صبح کو کیا نتیجہ پیدا ہو۔ اس لیے متقی اپنے اوقات کو ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ ہر وقت تیار رہتا ہے یہ جان کر کہ معلوم نہیں کس وقت آواز پڑ جاوے۔

نبوّت مسیح موعود

نبوّت کا لفظ ہمارے الہامات میں دو شرطیں رکھتا ہے اوّل یہ کہ اس کے ساتھ شریعت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ بواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔

ملائکہ کا وجود

جو لوگ ملائکہ سے انکار کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ان کو اتنا معلوم نہیں کہ دراصل جس قدر اشیاء دنیا میں موجود ہیں ذرہ ذرہ پر ملائکہ کا اطلاق ہوتا ہے اور میں یہی سمجھتا ہوں کہ بغیر اس کے اذن کے کوئی چیز اپنا اثر نہیں کر سکتی یہاں تک کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اندر نہیں جا سکتا اور نہ وہ مؤثر ہو سکتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (بنی اسرائیل: ۴۵) کے یہی معنے ہیں اور رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ خَادِمُكَ کے بھی یہی معنے ہیں۔ یہی اسلام اور ایمان ہے اس کے سوا بدبودار چیز ہے۔

موت

موت کا مضمون بہت ہی مؤثر مضمون ہے اگر یہ انسان کے اندر چلا جاوے تو انسان بدیوں سے بچنے کی بہت کوشش کرے۔ ابراہیم اُدہم اور شاہ شجاع جیسے بادشاہوں پر اسی مضمون نے اثر کیا تھا جو سلطنتیں چھوڑ کر فقیر ہو گئے۔

خلق اور امر

جو چیز علل اور اسباب سے پیدا ہوتی ہے وہ خلق ہے اور جو محض کُن سے ہو وہ امر ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ (یٰسٓ: ۸۳) عالم امر میں کبھی توقف نہیں ہوتا۔ خلق سلسلہ علل و معلول کا محتاج ہے جیسے انسان کا بچہ پیدا ہونے کے لیے نطفہ کا محتاج ہو پھر دوسرے مراتب طبعی اور طبابت کے قواعد کے نیچے ہوتا ہے مگر امر میں یہ نہیں ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

۲۱ اپریل ۱۹۰۳ء

(بوقتِ سیر)

وحی و الہام اور کشف

فرمایا کہ:۔
جب سماع[1] کے ذریعہ سے کوئی خبر دی جاتی ہے تو اسے وحی کہتے ہیں

---

[1] الحکم میں اس سے پہلے ایک اور ذکر درج ہے لکھا ہے:۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور جب رویت کے ذریعہ سے کچھ بتلایا جاوے تو اسے کشف کہتے ہیں۔ اسی طرح مَیں نے دیکھا ہے کہ بعض وقت ایک ایسا امر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صرف قوتِ شامہ سے ہوتا ہے مگر اس کا نام نہیں رکھ سکتے جیسے یوسفؑ کی نسبت حضرت یعقوبؑ کو خوشبو آئی تھی۔ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف: ۹۵) اور کبھی ایک امر ایسا ہوتا ہے کہ جسم اُسے محسوس کرتا ہے گویا کہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنی باتیں اظہار کرتا ہے۔[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

"فرمایا۔ آج صبح جب میں نماز کے بعد ذرا لیٹ گیا تو الہام ہوا مگر افسوس ہے کہ ایک حصہ اس کا یاد نہیں رہا۔ ایک پہلے عربی کا فقرہ تھا اور اس کے بعد اس کا ترجمہ اُردو میں تھا وہ اُردو فقرہ یاد ہے۔ یہ بات آسمان پر قرار پا چکی ہے تبدیل ہونے والی نہیں۔ اور عربی فقرہ کچھ اس سے مشابہ تھا۔ تَعَھَّدَ وَتَمَکَّنَ فِی السَّمَآءِ۔ مگر وہ اصل فقرہ بھول گیا۔ اور اس نسیان میں بھی کچھ منشاء الٰہی ہوتا ہے گویا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ اب تقدیر مبرم ہے اس میں اب تبدیلی نہیں ہوگی۔ غرض تعبیرات قضاء و قدر کا ارادہ آسمان پر پختہ کیا گیا ہے۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۲ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۳ء)

---

[۱] الحکم میں زیادہ تفصیل سے یوں لکھا ہے:۔

"غرض تمام حواسِ خمسہ سے وحی ہوتی ہے اور ملہم کو قبل از وقت بذریعہ وحی ان باتوں کی اطلاع دی جاتی ہے۔ مثنوی رُومی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک دفعہ چند قیدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پابجولاں آئے۔ ان قیدیوں نے خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں یہ خیال تمہارا غلط ہے جس وقت تم لوگ گھوڑوں پر سوار اور ناز و نعمت میں بآرام چلتے تھے مَیں تو اس وقت تمہیں پابہ زنجیر دیکھ رہا تھا۔ اب مجھے تمہارے دیکھنے کی کیا خوشی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ الہام کے ساتھ عموماً کشوف بھی ہوا کرتے ہیں۔

اشتہار تبلیغ میں مَیں نے اپنا ایک خواب درج کیا ہے کیا دیکھتا ہوں کہ مَیں اپنے باغ میں سے سیر کر کے نکلا ہوں دیکھا کہ کچھ سوار گھوڑوں پر باغ میں داخل ہوئے۔ مَیں نے سمجھا کہ یہ اس کو پامال کر دیں گے۔ مَیں بھی انکے عقب میں جا داخل ہوا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سب کہیں نظر نہیں آتے۔ جب وسط باغ میں گیا ہوں تو دیکھا کہ سب کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہیں اور کھال اُتاری ہوئی ہے۔ مَیں نے رقت میں آکر اور رو کر خدا تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ یہ تیرا ہی کام تھا مَیں اکیلا ان کا مقابلہ کیا کر سکتا تھا۔ تو فوراً تعبیر بتلائی گئی کہ سر کا کٹنا غرور اور تکبر کا ٹوٹنا ہے۔ ہاتھوں کا کٹنا یعنی انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے بچاؤ اور دشمن کے قتل کی مدد دیتا ہے گویا ان کے اسباب امداد کٹ گئے۔ پاؤں سے انسان بھاگ سکتا ہے یعنی اب کوئی صورت مفر نہیں۔ کھال زینت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دہریت

ہندوستان اور یورپ کی دہریت میں فرق ہے۔ یورپ کے دہریہ اس خدا کے منکر ہیں جو مصنوعی ہے اور عیسائی لوگ وہاں اُن کو دہریہ کہتے ہیں جو کہ مسیح کو خدا نہ مانے اور اب فسق وفجور نے بھی اثر ڈالا ہے۔ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ سب اثر کفارہ پرستی کا ہے۔ تو اب وہ کیسے مانیں۔

قضاءعمری

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ قضاء عمری کیا شئے ہے جو کہ لوگ (عید الاضحیٰ) کے پیشتر جمعہ کو ادا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ:۔

میرے نزدیک یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ان کی نسبت وہی جواب ٹھیک ہے جو کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو دیا تھا جبکہ ایک شخص ایک ایسے وقت نماز ادا کر رہا تھا جس وقت میں نماز جائز نہیں۔ اس کی شکایت حضرت علیؓ کے پاس ہوئی تو آپ نے اسے جواب دیا کہ میں اس آیت کا مصداق نہیں بننا چاہتا۔ اَرَأَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (العلق: ۱۰-۱۱) یعنی تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک نماز پڑھتے بندے کو منع کرتا ہے۔

نماز جو رہ جائے اس کا تدارک نہیں ہو سکتا ہاں روزہ کا ہو سکتا ہے۔

اور جو شخص عمداً سال بھر اس لیے نماز کو ترک کرتا ہے کہ قضاء عمری والے دن ادا کر لونگا تو وہ گنہگار ہے اور جو شخص نادم ہو کر توبہ کرتا ہے اور اس نیت سے پڑھتا ہے کہ آئندہ نماز ترک نہ کرونگا تو اس کے لیے حرج نہیں۔[1]

ہم تو اس معاملہ میں حضرت علیؓ ہی کا جواب دیتے ہیں۔

نماز کے بعد دُعا

سوال ہوا کہ نماز کے بعد دُعا کرنا یہ سُنت اسلام میں ہے یا نہیں؟ فرمایا ہم انکار نہیں کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا مانگی ہوگی مگر ساری نماز دعا ہی ہے اور آج کل دیکھا جاتا ہے کہ لوگ نماز کو جلدی جلدی ادا کر کے گلے سے اُتارتے ہیں۔ پھر دُعاؤں میں اس کے بعد اس قدر خشوع خضوع کرتے ہیں کہ جس کی حد نہیں اور اتنی دیر تک دُعا مانگتے رہتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اور پردہ ہوتا ہے۔ یعنی ان تیرے مخالفوں کی زینت جاتی رہی اور پردہ دری ہوگئی۔ یہ اب پورا ہو رہا ہے۔ پس ہر جگہ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ سے ہی کام چلتا ہے انسان کی کیا طاقت ہے۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۲ بابت ۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء)

[1] (الحکم سے) "اگر ندامت کے طور پر تدارک مافات کرتا ہے تو پڑھنے دو۔ کیوں منع کرتے ہو۔ آخر دعا ہی کرتا ہے ہاں اس میں پست ہمتی ضرور ہے۔ پھر دیکھو منع کرنے سے کہیں تم بھی اس آیت کے نیچے نہ آجاؤ۔"

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۲ مورخہ ۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء)

مسافر دو میل تک نکل جاوے بعض لوگ اس سے تنگ بھی آجاتے ہیں تو یہ بات معیوب ہے۔ خشوع خضوع اصل جزو تو نماز کی ہے وہ اس میں نہیں کیا جاتا اور نہ اس میں دعا مانگتے ہیں۔ اس طرح سے وہ لوگ نماز کو منسوخ کرتے ہیں۔ انسان نماز کے اندر ہی ماثورہ دعاؤں کے بعد اپنی زبان میں دعا مانگ سکتا ہے۔

سُنّتِ صحیحہ معلوم کرنے کا طریق

جب اسلام کے فرقوں میں اختلاف ہے تو سنتِ صحیحہ کیسے معلوم ہو؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ:۔

قرآن شریف، احادیث اور ایک قوم کے تقویٰ طہارت اور سنت کو جب ملایا جاوے تو پھر پتہ لگ جاتا ہے کہ اصل سنت کیا ہے۔

نماز اور قرآن شریف کا ترجمہ جاننا ضروری ہے

مولانا محمد احسن صاحب نے فرمایا کہ وَلَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (النساء: ۴۴) سے ثابت ہے کہ انسان کو اپنے قول کا علم ضروری ہے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

جن لوگوں کو ساری عمر میں تَعْلَمُوْا نصیب نہ ہو ان کی نماز ہی کیا ہے۔

مزکّی کی ضرورت

ایک عورت کا ذکر کرتے ہیں کہ نماز پڑھا کرتی تھی۔ ایک دن اُس نے پوچھا کہ درود میں جو صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ آتا ہے اس کے کیا معنے ہیں۔ خاوند نے کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول تھے اس پر اس نے تعجب کیا اور کہا کہ ہائے ہائے میں ساری عمر بیگانہ مرد کا نام لیتی رہی (یہ حالت آج کل اسلام اور مسلمانوں کی ہے اور پھر اس پر کہا جاتا ہے کہ ایک مزکّی انسان کی ضرورت نہیں ہے)

قرآن کا صرف ترجمہ کافی ہے کہ نہیں

فرمایا۔ ہم ہرگز فتویٰ نہیں دیتے کہ قرآن کا صرف ترجمہ پڑھا جاوے۔ اس سے قرآن کا اعجاز باطل ہوتا ہے جو شخص یہ کہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ قرآن دُنیا میں نہ رہے بلکہ ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جو دُعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہیں وہ بھی عربی میں پڑھی جاویں دوسرے جو اپنی حاجات وغیرہ ہیں ماثورہ دعا کے علاوہ وہ صرف اپنی زبان میں مانگی جاویں۔

ایک شخص نے کہا کہ حضور حنفی مذہب میں صرف ترجمہ پڑھ لینا کافی سمجھا گیا ہے فرمایا کہ:۔

اگر یہ امام اعظم کا مذہب ہے تو پھر اُن کی خطا ہے۔

☆ ☆ ☆

صدقہ اور ہدیہ میں فرق

صدقہ میں ردِ بلا ملحوظ ہوتی ہے اور یہ صدق سے نکلا ہے کیونکہ اس کے عملدرآمد میں انسان اللہ تعالیٰ کو صدق و صفا دکھلاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہدیہ ہدایت سے نکلا ہے کہ آپس میں محبت بڑھے۔

بعد وفات میّت کو کیا شئے پہنچتی ہے

فرمایا کہ:۔
دُعا کا اثر ثابت ہے ایک روایت میں ہے کہ اگر میّت کی طرف سے حج کیا جاوے تو قبول ہوتا ہے اور روزہ کا ذکر بھی ہے۔
ایک شخص نے عرض کی کہ حضور یہ جو ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم: ۴۰) فرمایا کہ:۔
اگر اس کے یہ معنے ہیں کہ بھائی کے حق میں دعا نہ قبول ہو تو پھر سورہ فاتحہ میں اِھْدِنَا کی بجائے اِھْدِنِیْ ہوتا۔

مجلس قبل از عشاء
ایک شخص کی موت کا ذکر ہوا۔ اس کا باعث بیان ہوا کہ فلاں مرض اور اسباب تھے۔ فرمایا کہ:۔
جب انسان یہیں آکر ٹھہر جاوے کہ فلاں باعث موت کا ہے اور آگے نہ چلے تو ایسی باتیں معرفت کی روک ہیں اور اس سے نظر اسباب تک ہی رہتی ہے۔

لَوْلَا الْاِکْرَامُ لَھَلَکَ الْمُقَامُ

فرمایا:۔
جب طاعون کی آگ بھڑک رہی ہے تو اب کوئی سوچے کہ ایک مفتری کہہ سکتا ہے لَوْلَا الْاِکْرَامُ لَھَلَکَ الْمُقَامُ کیا ممکن نہ تھا کہ وہ خود ہی مر جاوے اور طاعون کا شکار ہو۔ اس وقت قادیان مثل مکہ ہے کہ اس کے اردگرد لوگ ہلاک ہو رہے ہیں اور یہاں خدا تعالیٰ کے فضل سے بالکل امن ہے۔ مکہ کی نسبت بھی ہے یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِھِمْ (العنکبوت: ۶۸) کہ لوگ اس کے گرد و نواح سے اُچک لیے جاویں گے لَوْلَا الْاِکْرَامُ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سرزمین سے راضی نہیں ہے اور مجھے یہ بھی الہام ہوا ہے مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ۔

قنوت

آج کل چونکہ وبا کا زور ہے اس لیے نمازوں میں قنوت پڑھنا چاہیئے۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۴-۱۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭

۲۲؍اپریل ۱۹۰۳ء

(بوقتِ سیر)

گوشت خوری

آریوں کے مسئلہ گوشت خوری پر ذکر چلا فرمایا کہ

انسانی زندگی کے واسطے دوسری اشیاء کی ہلاکت لازمی پڑی ہوئی ہے مثلاً دیکھو ریشم جب ہی حاصل ہوتا ہے جب ریشم کے کیڑے مریں۔ پھر شہد کی مکھی کب چاہتی ہے کہ اس کا شہد لیا جاوے اکثر جونکیں خون پی کر مرجاتی ہیں۔ پھر ہوا میں کیڑے ہیں جو سانس سے مرتے ہیں۔ جب یکجائی نظر سے خدائی کے کل دائرے کو دیکھا جاوے تو پھر سمجھ میں آتا ہے کہ دنیا میں سلسلہ آکل اور ماکول کا برابر جاری ہے اور اس کے بغیر دنیا رہ ہی نہیں سکتی کہ بعض کی جان لی جاوے ورنہ اس طرح تو پھر کدو دانہ وغیرہ کیڑے جو پیٹ میں پیدا ہوتے ہیں ان کو بھی نہ مارنا چاہیئے۔

ایک شخص نے کہا کہ حضور آریہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جو انسان کی طاقت سے باہر امر ہے اس میں اس پر الزام نہیں۔ فرمایا کہ :۔

طاقت سے باہر تو وہ کہا جاوے گا جس کا تعلق انسانی زندگی سے نہ ہو اور جو اس کے اندر رہے وہ سب طاقت میں ہوگا۔ خدا تعالیٰ کا ہی یہ منشاء ہے کہ انسانی حفاظت کے واسطے بہت جانوں کو لیا جاوے۔ پھر فطرت انسانی میں بعض قویٰ ایسے ہیں کہ اگر گوشت نہ کھایا جاوے تو ان کا نشوونما ہو ہی نہیں سکتا۔ شجاعت پیدا ہی نہیں ہوتی اس لیے سکھ وغیرہ اقوام جو گوشت خور ہیں وہ نسبتاً شجاعت بہت زیادہ رکھتے ہیں۔

اس پر اعتراض کیا گیا کہ بنگالی گوشت خور ہیں مگر وہ ایسے بہادر نہیں ہوتے فرمایا :۔

ایسی حالتوں میں قوموں کی مجموعی حالت کو دیکھا کرتے ہیں کہ کس قدر اقوام گوشت خور ہیں اور کس قدر نہیں پھر مقابلۃً دیکھا جاوے کہ کونسی اقوام شجاعت میں بڑھ کر ہیں۔

مجلس قبل از عشاء

احمدیوں کی اقسام

فرمایا۔ ہمارے مریدوں کے بھی کئی قسم کے طبقے ہیں۔ ایک تو طاعونی ہیں جو طاعون سے ڈر کر اس سے بچنے کی نیت سے اب آرہے ہیں[1]۔ دوسرے

---

[1] الحکم میں ہے :۔ ”ایک طاعونی جماعت ہے یعنی وہ جماعت جو طاعون کے نشان کو دیکھ کر اس سلسلہ میں داخل ہوئی ہے اور یہ جماعت کثرت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔“ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ صفحہ ۸ مورخہ ۳۰؍اپریل ۱۹۰۳ء)

قمری اور شمسی ہیں جو کہ قمر اور شمس کا گرہن دیکھ کر داخل بیعت ہوئے۔
کچھ خوابی ہیں کہ بذریعہ خواب کے ان کی راہنمائی کی گئی [1]
بعض عقلی ہیں۔ انہوں نے عقل سے کام لے کر بیعت کی۔ بعض نقلی ہیں کہ حدیث آثار وغیرہ دیگر امور کو پورے ہوتے دیکھ کر ایمان لائے اور ابھی شاید اور بھی چند قسمیں ہوں۔

ہمارا نقارہ

فرمایا کہ :-
اعداء کا وجود ہمارا نقارہ ہے یہ انہیں کی مہربانی ہے کہ تبلیغ کرتے رہتے ہیں مثنوی میں ایک ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک چور ایک مکان کو نقب لگا رہا تھا۔ ایک شخص نے اوپر سے دیکھ کر کہا کہ کیا کرتا ہے چور نے کہا کہ نقارہ بجا رہا ہوں۔ اس شخص نے کہا آواز تو نہیں آتی۔ چور نے جواب دیا کہ اس نقارہ کی آواز صبح کو سنائی دیوے گی۔ اور ہر ایک سُنے گا۔ ایسے ہی یہ لوگ شور مچاتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں تو لوگوں کو خبر ہوتی رہتی ہے۔

فلسفہ جدیدہ کا فائدہ

فلسفہ جدیدہ نے اگرچہ نقصانات بھی پہنچائے ہیں مگر ایک صورت میں یہ مفید بھی ہوا ہے کہ بہت سی غیر معقول باتوں سے دلوں میں نفرت دلا دی ہے مثلاً یہ فرقہ شیعہ کہ جن کی اصلاح کی کبھی امید نہ تھی مگر اس فلسفہ سے متاثر ہو کر وہ بھی راہ راست پر آتے جاتے ہیں۔

صلحاء و اتقیاء سے محبت میں غلو نہ کیا جائے

ایک شخص کے اس سوال پر کہ اولیاء اللہ سے محبت رکھی جاوے کہ نہ فرمایا :-
ہم اس کے مخالف نہیں ہیں کہ صلحاء، اتقیاء اور ابرار سے محبت رکھی جاوے اگر حد سے گذر جانا حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کو مقدم رکھنا یہ مناسب نہیں ہے جیسے کہ گذشتہ ایام میں بعض شیعہ کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی اس میں لکھا تھا کہ صرف امام حسینؓ کی شفاعت سے تمام انبیاء نے نجات پائی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر شان ہے۔ اس سے تو ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ نے غلطی کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا اور حسینؓ پر نہ کیا۔[2] (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

---

[1] الحکم میں ہے :- "یہ گروہ بھی بڑا بھاری گروہ ہے" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ صفحہ ۸ ، ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

[2] الحکم میں ہے :- "فرمایا کہ
ہمارا ایمان ہے کہ بزرگوں اور اہل اللہ کی تعظیم کرنی چاہیئے لیکن حفظ مراتب بڑی ضروری شئے ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ حد سے گذر کر خود ہی گنہگار ہو جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے نبیوں کی ہتک ہو جائے وہ شخص جو کہتا ہے کہ کُل انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی امام حسینؓ کی شفاعت سے نجات پائینگے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ازدیادِ ایمان

ایمان کی نعمت یہی ہے کہ خدائی نصرتوں کو انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جب وہ خدا تعالیٰ کی نصرتوں کو دیکھتا ہے تب اس کا ایمان بڑھتا ہے اور معرفت اور بصیرت کی آنکھ کھلنے لگتی ہے۔ جب تک خدا تعالیٰ کی نصرتوں کی چمک نظر نہیں آتی۔ اس وقت تک یہ حالتِ تذبذب میں رہتا ہے لیکن جب اُن کی چمکار نظر آجاتی ہے اس وقت سینہ کی غلاظتیں دُور ہو جاتی ہیں اور اندر ایک صفائی اور نُور نظر آتا ہے۔ وہ حالت ہوتی ہے جب اس کے لیے کہا جاتا ہے اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ۔

عابدِ کامل سے عبادت کا ساقط ہو جانا

اہل اللہ کہتے ہیں کہ جب انسان عابد کامل ہو جاتا ہے اس وقت اس کی ساری عبادتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ پھر خود ہی اس جُملہ کی شرح کرتے ہیں کہ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز روزہ معاف ہو جاتا ہے نہیں بلکہ اس سے یہ مطلب ہے کہ تکالیف ساقط ہو جاتی ہیں یعنی عبادات کو وہ ایسے طور پر ادا کرتا ہے جیسے دونو وقت روٹی کھاتا ہے وہ تکالیف مدرک الحلاوت اور محسوس اللذات ہو جاتی ہیں۔ پس ایسی حالت پیدا کرو کہ تمہاری تکالیف ساقط ہو جائیں اور پھر خدا تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل اور نہی سے بچنا فطرتی ہو جاوے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو گویا ملائکہ میں داخل ہو جاتا ہے جو یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کے مصداق ہیں۔

ثوابِ عبادت ضائع ہونے کا مطلب

سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آدمی عارف اور عابد ہو جاتا ہے تو اسکی عبادت کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر خود ہی اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہر نیکی کا اجر نقد پا لیتے ہیں یعنی جب نفسِ امّارہ بدل کر مطمئنہ ہو جاتا ہے تو وہ تو جنت میں پہنچ گیا۔ جو کچھ پانا تھا پالیا۔ اس لحاظ سے ثواب نہیں رہتا۔ مگر بات اصل یہ ہے کہ ترقیات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

عربی میں الہامات کی کثرت کی وجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع کے سوا اگر ہم کسی اور راستہ پر چلتے تو ہماری کثرتِ الہام کسی دوسری زبان میں ہوتی۔ گر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اس نے کیسا غلو کیا ہے جس سے سب نبیوں کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک ہوتی ہے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ان لوگوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تعریف میں اس قدر غلو کیا ہے مگر امام حسن رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے وقت ان لوگوں سے ایسا دِلی جوش صادر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ معلوم نہیں کیا ہے شاید یہی باعث ہو کہ انہوں نے حضرت معاویہ کی بیعت کر لی تھی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ صفحہ ۸ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

جب کہ اسی خدا، اسی کی کتاب اور اسی نبی کے اتباع پر ہم چلانا چاہتے ہیں تو پھر ہم کیوں عربی زبان میں مثل لانے کی تحدی نہ کریں؟

حقیقی جنت مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب میں کسی کتاب کا مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں اور قلم اُٹھاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی اندر سے بول رہا ہے اور میں لکھتا جاتا ہوں۔
اصل یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سلسلہ ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کو سمجھا بھی نہیں سکتے۔ خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر آجاتا ہے اور میرا ایمان تو یہ ہے کہ جنت ہو یا نہ ہو۔ خدا تعالیٰ پر پورا یقین ہونا ہی جنت ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ صفحہ ۵ مورخہ ۳۰؍اپریل ۱۹۰۳ء)

۲۳؍اپریل ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

مسیح کا مقام رُوحٌ مِّنْہُ اپی فینی میں کسی ہندو نے ایک مضمون شائع کردیا ہے کہ قرآن شریف میں حضرت مسیح کی نسبت روح اللہ کا لفظ آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب سے افضل ہیں۔ اس پر حضرت حجۃ اللہ نے فرمایا کہ :۔

اللہ تعالیٰ کا مسیح کو روحٌ منہ فرمانے سے اصل مطلب یہ ہے کہ تا اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا جاوے جو اُن کی ولادت کے متعلق کئے جاتے ہیں۔ یاد رکھو ولادت دو قسم کی ہوتی ہے ایک ولادت تو وہ ہوتی ہے کہ اس میں روح الٰہی کا جلوہ ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتی ہے کہ اس میں شیطانی حصّہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے کہ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (بنی اسرائیل: ۶۵) یہ شیطان کو خطاب ہے غرض خدا تعالیٰ نے رُوحٌ مِّنْہُ فرما کر یہودیوں کے اس اعتراض کو ردّ کیا ہے جو وہ نعوذ باللہ حضرت مسیح کی ولادت کو ناجائز ٹھہراتے تھے۔ روح منہ کہہ کر صاف کردیا کہ ان کی ولادت پاک ہے۔

یہودی تو ایسے بیباک اور دلیر تھے کہ ان کے منہ پر بھی ان کی ولادت پر حملہ کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ مسِ شیطان سے پاک ہیں۔ اس میں بھی اس کی تصدیق ہے ورنہ تمام انبیاء اور صلحاء مسِ شیطان سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ان کی صراحت اس واسطے کی ہے کہ ان پر ایسے ایسے اعتراض ہوئے اور کسی نبی پر چونکہ اعتراض نہیں ہوئے اسلئے ان کے لیے صراحت کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ دوسرے نبیوں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے الفاظ ہوتے تو یہ بھی ایک قسم کی توہین ہے کیونکہ اگر ایک مسلم و

مقبول نیک آدمی کی نسبت کہا جاوے کہ وہ تو زانی نہیں یہ اس کی ایک رنگ میں ہتک ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو خود اہلِ مکہ تسلیم کر چکے ہوئے تھے کہ وہ مسِ شیطان سے پاک ہیں۔ تب ہی تو آپ کا نام انہوں نے امین رکھا ہوا تھا اور آپ نے ان پر تحدی کی کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا (یونس: ۱۷) پھر کیا ضرورت تھی کہ آپ کی نسبت بھی کہا جاتا۔ یہ الفاظ حضرت مسیح کی عزت کو بڑھانے والے نہیں ہیں۔ انکی برأت کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کلنک کا بھی پتہ دے دیتے ہیں کہ ان پر الزام تھا۔

یاد رکھو کہ کلمہ اور رُوح کا لفظ عام ہے حضرت مسیح کی کوئی خصوصیت اس میں نہیں ہے۔ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَكَلِمٰتِهٖ (الاعراف: ۱۵۹) اب اللہ تعالیٰ کے کلمات تو لاانتہا ہیں اور ایسا ہی صحابہؓ کی تعریف میں آیا ہے اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلۃ: ۲۳) پھر مسیح کی کیا خصوصیت رہی؟

حضرت مسیح کی ماں کی نسبت جو صدیقہ کا لفظ آیا ہے یہ بھی دراصل رفع الزام ہی کے لیے آیا ہے یہودی جو معاذ اللہ ان کو فاسقہ فاجرہ ٹھہراتے تھے۔ قرآن شریف نے صدیقہ کہہ کر اُن کے الزاموں کو دور کیا ہے کہ وہ صدیقہ تھیں۔ اس سے کوئی خصوصیت اور فخر ثابت نہیں ہوتا اور نہ عیسائی کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں بلکہ ان کو تو یہ اُمور پیش بھی نہیں کرنے چاہئیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ صفحہ ۸ مورخہ ۳۰ راپریل ۱۹۰۳ء)

---

۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ایک اعتراض کا جواب

کسی نے اعتراض کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں کوئی احمدی طاعون سے فوت ہوتا ہے؟ فرمایا کہ:۔

یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے کہ انجام کو نہیں دیکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جب ایک طرف کافر مرتے ہوں گے اور ایک طرف صحابہؓ بھی۔ تو لوگ اعتراض تو کرتے ہوں گے کہ مرتے تو وہ بھی ہیں پھر فرق کیا؟ اس لیے ہمیشہ انجام کو دیکھنا چاہیئے۔ ایک وہ وقت تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے تھے اور کوئی ساتھ نہ تھا ہر ایک مقابلہ کے لیے تیار ہوتا۔ اب ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر طاعون سے ہمارے مرید مرتے جاتے ہیں تو پھر ہماری ترقی کیوں ہوتی جاتی ہے؟ اور ان کی جمعیت کیوں گھٹتی جاتی ہے؟

یہ اعتراض تو پھر سب پیغمبروں پر ہوگا اور ہم نے تو اس لیے کشتیٔ نوح میں لکھ دیا تھا کہ اگر عافیت کا پہلو نسبتاً ہماری طرف ہو تو ہم سچے اور موت تو سب کو آنی ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے۔

طاعون کو جو ایک طرف شہادت اور ایک طرف عذاب کہا جاتا ہے۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ اس کے ذریعے سے جس فریق کے لیے برکات ظاہر ہو رہے ہیں اُن کے لیے تو شہادت اور رحمت ہے اور جن کے لیے برکات ظاہر نہ ہوں اور کمی ہوتی جاوے ان کے لیے عذاب ہے۔ ہم کو اس سے دو فائدے ہیں اور ان کو دو نقصان ہیں اور پھر ہم بیس سال سے براہین میں یہ پیشگوئی عذاب کی شائع کر چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ان کافروں کو جس طرح چاہے عذاب دیوے۔ پھر جب ان لوگوں پر وہ عذاب ایک جنگ کے رنگ میں نازل ہوا تو کفار کے ساتھ صحابہؓ کیوں اس میں حصہ لیتے رہے؟ یہ امر اس لیے ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک پہلو اخفاء اور ایمان بالغیب کا بھی رہے۔

ہندوؤں کا بانگ دلوانا

آج کل طاعون کی کثرت کے وقت اکثر سکھوں اور ہندوؤں کے گاؤں میں یہ علاج کیا جاتا ہے کہ اذان نماز بڑے زور اور کثرت سے ہر ایک گھر میں دلائی جاتی ہے اس کی نسبت ایک شخص نے حضرت اقدس سے دریافت کیا کہ یہ فعل کیسا ہے؟ فرمایا کہ:۔

اذان سراسر اللہ تعالیٰ کا پاک نام ہے۔ ہمیں تو حضرت علیؓ کا جواب یاد آتا ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ میں اس أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ (العلق: ۱۰، ۱۱) کا مصداق ہونا نہیں چاہتا۔ ہمارے نزدیک بانگ میں بڑی شوکت ہے اور اس کے دلوانے میں حرج نہیں (حدیث میں آیا ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے)

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

۲۵ر اپریل ۱۹۰۳ء

دربار شام

الہام يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي[۱]

مولوی محمد حسین صاحب کے ذکر پر فرمایا[۲] کہ:۔

---

[۱] یہ الہام اور اس کی تشریح البدر میں ۲۷ر اپریل کی ڈائری کے بعد درج ہے۔ دیکھئے صفحہ ۲۷۸ پر "طاعون کے متعلق ایک تازہ الہام" (مرتب) (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

[۲] البدر میں لکھا ہے:۔ مقدمات کی نسبت ذکر ہوا۔ فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ہر میدان میں ہم کو فتح دی ہے براہین میں یہ الہام موجود ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

اصل میں اگر کوئی صاف دل اور بے تعصب ہو کر ہمارے دلائل سُنے تو اس کو معلوم ہو جاوے کہ درحقیقت ہم حق پر ہیں۔ ہمارا اُن کا اختلاف ہی کیا ہے۔

وفات مسیح علیہ السلام

مسیحؑ کی حیات ممات کا بڑا مسئلہ ہے اور یہ ایسا صاف ہے کہ اس میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ شروع سے یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے اور وفاتِ مسیح اکثر اکابران ملت کا مذہب ہے۔ صحابہؓ کا یہی مذہب تھا۔

احیاء موتیٰ

رہا حضرت عیسٰیؑ کا احیاء موتیٰ۔ اس میں رُوحانی احیاء موتیٰ کے تو ہم بھی قائل ہیں۔ اور ہم مانتے ہیں کہ رُوحانی طور پر مُردے زندہ ہوا کرتے ہیں اور اگر یہ کہو کہ ایک شخص مر گیا اور پھر زندہ ہو گیا۔ تو یہ قرآن شریف یا احادیث سے ثابت نہیں ہے اور ایسا ماننے سے پھر قرآن شریف اور احادیثِ نبوی گویا ساری شریعتِ اسلام ہی کو ناقص ماننا پڑے گا کیونکہ ردالموتیٰ کے متعلق مسائل نہ قرآن شریف میں ہیں نہ حدیث نے کہیں ان کی صراحت کی ہے۔ اور نہ فقہ میں کوئی بات اس کے متعلق ہے۔ غرض کسی نے بھی اس کی تشریح نہیں کی۔ اس طرح پر یہ مسئلہ بھی صاف ہے[1]

خلق طیر

پھر ان کا جانور بنانا ہے سو اس میں بھی ہم اس بات کے تو قائل ہیں[2] کہ روحانی طور سے معجزہ کے طور پر درخت بھی ناچنے لگ جاوے تو ممکن ہے مگر یہ کہ انہوں نے چڑیاں بنا دیں اور انڈے بچے دے دیئے اس کے ہم قائل نہیں ہیں اور نہ قرآن شریف سے ایسا ثابت ہے۔ ہم کیا کریں ہم اس طور پر ان باتوں کو مان ہی نہیں سکتے جس طرح پر ہمارے مخالف کہتے ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف صریح اس کے خلاف ہے اور وہ ہماری تائید میں کھڑا ہے اور دوسری طرف بار بار کثرت کے ساتھ ہمیں الہام الٰہی کہتا ہے۔ قُلْ عِنْدِی شَهَادَةٌ مِنَ اللّٰهِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُؤْمِنُوْنَ ۔ قُلْ عِنْدِی شَهَادَةٌ مِنَ اللّٰهِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۔

اب ان الہامات کے بعد ہم اَور کس کی بات سُنیں ؟ اور وہ کون ہے جس کی آواز خدا تعالیٰ کی ان آوازوں

---

[1] البدر میں ہے :۔ ”فرمایا۔ ہم اعجازی احیاء کے قائل ہیں مگر یہ بات بالکل ٹھیک نہیں ہے کہ ایک مُردہ اس طرح زندہ ہوا کہ وہ پھر اپنے گھر میں آیا اور رہا اور ایک عمر اس نے بسر کی اگر ایسا ہوتا تو قرآن ناقص ٹھہرتا ہے کہ اس نے ایسے شخص کی وراثت کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کیا ہوا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے :۔ ”فرمایا۔ اسی طرح ہم چڑیوں کو مانتے ہیں کہ وہ بھی ٹاپنے لگ گئی ہوں اور چڑیاں کیا شئے ہیں ہم تو یہ بھی مانتے ہیں کہ ایک درخت بھی ٹاپنے لگے۔ مگر پھر بھی وہ خدا کی چڑیوں کی طرح ہرگز نہیں ہو سکتیں کہ جس سے تشابہ بالخلق لازم آجاوے بڑی بات قابل فیصلہ وفات مسیح ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

کے بعد ہمارے دل کو لے سکے؟ مولوی محمد حسین صاحب بنے تو خود لکھدیا ہے کہ اہل کشف اور دلی الہام کی رو سے احادیث کی صحت کر لیتے ہیں۔ بعض احادیث ائمہ اہلِ حدیث کے نزدیک موضوع ہوتی ہیں اور اہلِ کشف بذریعہ کشف اُن کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اور وہ حق پر ہوتے ہیں۔ اب وہ خود ہی بتادیں کہ ہم کیا کریں۔ کیا ہم خدا تعالیٰ کے الہام کو مانیں یا کسی دوسرے کے قیل وقال کو؟

براہین احمدیہ موجود ہے اور وہ دشمنوں دوستوں سب کے ہاتھ میں ہے اس میں اس وقت سے ۲۵ سال پہلے کی وہ وہ پیشگوئیاں اور وعدے بھرے ہوئے ہیں جن کا اس وقت نام ونشان بھی نہ تھا۔ اور وہ اب بڑے زور شور سے اپنے سچے معنوں میں پوری ہو رہی ہیں کیا کوئی آدمی ایسی نظیر بتا سکتا ہے کہ کسی کاذب کو ایسے سامان ملے ہوں کہ پہلے اتنا عرصہ دراز اُس نے پیشگوئیاں کی ہوں اور وہ پھر اسی طرح پوری ہوئی ہوں اور وہ کامیاب ہو گیا ہو۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ صفحہ ۸ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء)

---

۲۶ اپریل ۱۹۰۳ء

بوقتِ سیر

خدا تعالیٰ اور انبیاء کا علم مساوی نہیں ہوتا

فرمایا کہ:۔ خدا کے علم کے ساتھ بشر کا علم مساوی نہیں

ل البدر میں ۲۵ اپریل کی ڈائری مندرجہ ذیل دو باتیں لکھی ہیں جو الحکم میں نہیں حالانکہ الحکم کی باقی ڈائری مفصل ہے مگر معلوم ہوتا ہے یہ دو باتیں وہاں رہ گئی ہیں۔ البدر میں ہے:۔

نرمی فرمایا۔ نرمی اس بات کا نام نہیں ہے کہ دوسرا اگر بالمقابل پر نرمی کرتا رہا تو تم بھی کرتے رہو اور جب اس نے ذرا تیور بدلے تو تم نے بھی بدل لیے بلکہ جب فریق مقابل سختی کرے اور اس وقت تم نرمی کرو تو اس کا نام نرمی ہو گا۔

عمر کا اثر انسان پر فرمایا کہ عمر کا بھی اثر انسان کے اخلاق اور عادات پر پڑتا ہے چالیس سال تک انسان بہت سی بیہودگیاں کرتا ہے۔ اس کے بعد جب انحطاط شروع ہوتا ہے تو ساتھ ہی خیالات کا بھی انحطاط شروع ہوتا ہے اور ایک تغیر عظیم انسان کے اندر ہوتا ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

ہو سکتا۔ اس لیے انبیاء سے اجتہاد میں غلطیاں واقع ہوتی رہی ہیں اور پھر جب خدا تعالیٰ نے اس پر اطلاع دی تو ان کو علم ہوا۔ یہودیوں کو مسیح کے وقت یہی مغالطہ ہوا۔ انہوں نے کہا کہاں داؤد کی بادشاہت قائم ہوئی۔ اور یہی دعویٰ آخر کار رخنہ کا موجب ہوا۔ اگر پیغمبر پر ہر ایک تفصیل کھول دی جاتی تو پھر ہر ایک پیغمبر کو یہ علم ہوتا کہ میرے بعد فلاں پیغمبر آوے گا اور موسیٰ علیہ السلام کو علم ہوتا کہ میرے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہونگے حالانکہ ان کا یہی خیال ہوگا کہ آپ بنی اسرائیل سے ہوں گے۔ اسی طرح آئندہ کے امور بعض وقت ایک نبی پر منکشف کئے جاتے ہیں مگر تفصیلی علم نہیں دیا جاتا۔ پھر جب ان کا وہ وقت آتا ہے تو خود بخود حقیقت کھل جاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم ہو کر آئے تھے تو کیا آپ نے یہود کی کل باتیں تسلیم کر لی تھیں؟

مجلس قبل از عشاء

دینی غیرت

ایک مقام کے چند ایک احباب آریوں کے ایک ایسے جلسے میں گئے تھے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی پاک تعلیم پر ناجائز اور فحش سے بھرے ہوئے نامعقول حملے ہو رہے تھے۔ اس پر حضرت اقدس نے ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا:۔

یہ لوگ ایسی محفلوں میں کیوں جاتے ہیں؟ اور جب ایسے ذکر اذکار شروع ہوں تو کیوں نہیں اُٹھ کر چلے آتے؟

ہماری رائے میں ہمارے احباب کو یہ طریق اختیار کرنا چاہیئے کہ اپنی ہفتہ وار کمیٹی میں ایسی باتوں کی تردید کیا کریں اور بذریعہ اشتہاران تمام لوگوں کو مدعو کیا کریں جو کہ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ طریق نہایت امن اور عمدہ تبلیغ حق کا ہے اور غیرت دینی کے بہت اقرب ہے۔

نبوت کا اقرار اور انکار

اعتراض۔ ایک شخص کی طرف سے یہ سوال پیش ہوا کہ مرزا صاحب اپنی تصنیفات میں کہیں نبوت کی نفی کرتے ہیں اور کہیں جواز۔

جواب۔ فرمایا:۔ یہ اس کی غلطی ہے۔ ہم اگر نبی کا لفظ اپنے متعلق استعمال کرتے ہیں تو ہم ہمیشہ وہ مفہوم لیتے ہیں جو کہ ختمِ نبوت کا مُخل نہیں ہے اور جب اس کی نفی کرتے ہیں تو وہ معنے مراد ہوتے ہیں جو ختمِ نبوت کے مخل ہیں۔

نیوگ اور طلاق میں سے کونسا امر کانشنس کے خلاف ہے

طلاق پر آریوں کے اعتراض سُنکر فرمایا کہ:۔

اگر طلاق ایسا امر ہوتا جو کہ کانشنس کے خلاف ہے تو پھر دیگر اقوام بھی اسے بجا نہ لاتیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی قوم نہیں ہے جو ضرورت کے وقت عورت کو طلاق نہ دیتی ہو لیکن اگر نیوگ بھی ایسا ہی ہے تو آریوں کو چاہیئے کہ اپنی قوم کے معزز اور برگزیدہ کئی سو ممبر انتخاب کریں کہ جن کی اولاد نہ ہو اور پھر وہ اپنی عورتوں سے نیوگ کراویں اور شائع کریں کہ فلاں فلاں صاحب اپنی عورت سے نیوگ کرواتے ہیں۔ جب تک وہ یہ نمونہ دکھلاویں۔ تب تک بحث فضول ہے اور جب وہ ایسا کریں تو پھر ہم کو ان پر کچھ افسوس نہ ہوگا۔ ہمارا اعتراض اس وقت تک ہے جب تک وہ اسے عملی طور پر قوم میں نہیں دکھلاتے۔ اسی طرح اگر وہ بالمقابل چاہیں تو ہم اہلِ اسلام کے رؤساء اور معزز لوگوں کی ایسی فہرست تیار کردیویں گے جنہوں نے معقول وجوہات پر اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے۔

وجوہ طلاق

احمدی جماعت میں سے ایک صاحب نے اپنی عورت کو طلاق دی۔ عورت کے رشتہ داروں نے حضرت کی خدمت میں شکایت کی کہ بے وجہ اور بے سبب طلاق دی گئی ہے۔ مرد کے بیان سے یہ بات پائی گئی کہ اگر اسے کوئی سزا ہی کیوں نہ دی جاوے مگر وہ اس عورت کو بسانے پر ہرگز آمادہ نہیں ہے۔ عورت کے رشتہ داروں نے جو شکایت کی تھی اُن کا منشاء تھا کہ پھر آبادی ہو۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ :-

عورت مرد کا معاملہ آپس میں جو ہوتا ہے اس پر دوسرے کو کامل اطلاع نہیں ہوتی۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی فحش عیب عورتوں میں نہیں ہوتا مگر تاہم مزاجوں کی ناموافقت ہوتی ہے جو کہ باہمی معاشرہ میں مخل ہوتی ہے ایسی صورت میں مرد طلاق دے سکتا ہے۔

بعض وقت عورت گو ولی ہو اور بڑی عابد اور پرہیزگار اور پاکدامن ہو اور اس کو طلاق دینے میں خاوند کو بھی رحم آتا ہو بلکہ وہ روتا بھی ہو مگر پھر بھی چونکہ اس کی طرف سے کراہت ہوتی ہے اس لیے وہ طلاق دے سکتا ہے۔ مزاجوں کا آپس میں موافق نہ ہونا یہ بھی ایک شرعی امر ہے۔ اسلئے ہم اسمیں دخل نہیں دے سکتے۔ جو ہوا سو ہوا۔ مہر کا جو جھگڑا ہو وہ آپس میں فیصلہ کر لیا جاوے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

۲۷ر اپریل ۱۹۰۳ء

بوقتِ سیر

ضرورۃ حکم

جب مدت دراز گذر جاتی ہے اور غلطیاں پڑ جاتی ہیں تو خدا ایک حَکَم مقرر کرتا ہے جو ان غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح کے سات سَو برس بعد

آئے۔ اس وقت ساتویں صدی میں ضرورت پڑی تو کیا اب چودھویں صدی میں بھی ضرورت نہ پڑتی۔ اور پھر جس حال میں کہ ایک ملہم ایک صحیح حدیث کو وضعی اور وضعی کو صحیح بذریعہ الہام قرار دے سکتا ہے اور یہ اصول ان لوگوں کا مسلّم ہے تو پھر حَکَم کو کیوں اختیار نہیں ہے؛ ایک حدیث کیا اگر وہ ایک لاکھ حدیث بھی پیش کریں تو اُن کی پیش کب چل سکتی ہے؛

اَلعِزَّۃُ لِلّٰہِ

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے ذکر پر فرمایا کہ:۔

انہوں نے لکھا تھا کہ ہم ہی نے اونچا کیا تھا اور ہم ہی اسے نیچا گرا دیں گے۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ انہوں نے چڑھانے کے لیے کیا کوشش کی تھی۔ ہم پر تو سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کا ذرہ بھر بھی احسان نہیں۔ ہاں اب گرانے کے لیے انہوں نے بہت کوشش کی اور جتنی اس نے کی اَور کسی نے مطلق نہیں کی مگر خدا تعالیٰ کے آگے کس کی پیش چلتی ہے۔

اس کے بعد مولوی صاحب کی شہادت قتل کے مقدمہ میں اور وہاں کرسی وغیرہ مانگنے کا ذکر ہوتا رہا۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ:۔

قلوب میں عظمت ڈالنا خدا کا کام ہے

علماء دین کے واسطے ظاہری بلندی چاہنی عیب میں داخل ہے۔ قلوب میں عظمت ڈالنی انسانی ہاتھ کا کام نہیں ہے۔ یہ ایک کشش ہوتی ہے جو کہ خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتی ہے ہم کیا کر رہے ہیں جو ہزار ہا آدمی کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ سب خدا تعالیٰ کی کشش ہے۔ ان لوگوں کی علمیت اور حکمت۔ دانائی اُن کے کچھ کام نہ آئی۔ مثنوی میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص دولت مند تھا مگر بیچارے کی عقل کم تھی۔ وہ کہیں جانے لگا تو اس نے گدھے پر بورے میں ایک طرف جواہر ڈالے اور وزن کو برابر کرنے کے واسطے ایک طرف اتنی ہی ریت ڈال دی۔ آگے چلتے چلتے اسے ایک شخص دانشمند ملا مگر کپڑے پھٹے ہوئے، بھوک کا مارا ہوا۔ سر پر پگڑی نہیں۔ اس نے اس کو مشورہ دیا کہ تُو نے ان جواہرات کو نصف نصف کیوں نہ دونو طرف ڈالا۔ اب ناحق جانور کو تکلیف دے رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مَیں تیری عقل نہیں برتتا۔ تیری عقل کے ساتھ نحوست ہے بلکہ میں تجھ بدبخت کا مشورہ بھی قبول نہیں کرتا۔

فروتنی

انسان کو چاہیئے جب کہیں جاوے تو سب سے نیچی جگہ اپنے لیے تجویز کرے۔ اگر وہ کسی اَور جگہ کے لائق ہوگا تو میزبان خود اسے بُلا کر جگہ دیگا اور اس کی عزت کریگا۔

عوام النّاس کی کم فہمی

فرمایا:۔

جن لوگوں کے دل میں کجی ہو وہ متشابہات کی طرف جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول نہ کیا انہوں نے آیاتِ مبینہ سے فائدہ نہیں

اُٹھایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک حبشی عورت سے نکاح کیا تو لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اگر یہ منجانب اللہ ہوتا تو حبشن سے نکاح نہ کرتا۔ اس ذرہ سی بات پر ان کے تمام معجزات کو نظر انداز کر دیا۔

مجلس قبل از عشاء

معبّر کی رائے کا اثر تعبیر پر نہیں پڑتا

ایک شخص نے سوال کیا کہ جب خواب بیان کیا جاتا ہے تو یہ بات مشہور ہے کہ سب سے اول جو تعبیر معبّر کرے وہی ہوا کرتی ہے اور اسی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر کس و ناکس کے سامنے خواب بیان نہ کرنا چاہیئے۔ فرمایا:۔

جو خواب مبشر ہے اس کا نتیجہ انذار نہیں ہو سکتا اور جو منذر ہے وہ مبشر نہیں ہو سکتا اس لیے یہ بات غلط ہے کہ اگر مبشر کی تعبیر کوئی معبّر منذر کی کرے تو وہ منذر ہو جاوے گا اور منذر مبشر ہو جاوے گا۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ اگر کوئی منذر خواب آوے تو صدقہ و خیرات اور دُعا سے وہ ٹل جاتی ہے۔

تفاؤل

کسی کے نام سے بطور تفاؤل کے فال لینے پر سوال ہوا۔ فرمایا:۔

یہ اکثر جگہ صحیح نکلتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تفاؤل سے کام لیا ہے ایک دفعہ مَیں گورداسپور مقدمہ پر جا رہا تھا اور ایک شخص کو سزا ملنی تھی۔ میرے دل میں خیال تھا کہ اسے سزا ہوگی یا نہیں؟ اتنے میں ایک لڑکا ایک بکری کے گلے میں رسّی ڈال رہا تھا۔ اُس نے رسّی کا حلقہ بنا کر بکری کے گلے میں ڈالا اور زور سے پکارا کہ وہ پھنس گئی وہ پھنس گئی مَیں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اُسے سزا ضرور ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح ایک دفعہ سیر کو جا رہے تھے اور دل میں پگٹ کا خیال تھا کہ بڑا عظیم الشان مقابلہ ہے۔ دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک شخص غیر از جماعت نے راستہ میں کہا السلام علیکم مَیں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہماری فتح ہو گی۔

طاعون کے متعلق ایک تازہ الہام

قُلْنَا یَا اَرْضُ ابْلَعِیْ مَاءَ كِ وَ یَا سَمَاءُ اَقْلِعِیْ۔

اس الہام کے متعلق جہاں تک میری رائے ہے وہ یہ ہے کہ یہ عام شہروں اور دیہات کے متعلق نہیں اور نہ اس سے دوام منع ثابت ہوتا ہے۔ غالباً یہی ہے کہ بعض دیہات اور شہروں میں جن کی نسبت خدا تعالیٰ کا ارادہ ہے چند مہینوں تک طاعون بند رہے گی اور پھر جہاں خداوند قدیر چاہے پھر پھوٹ پڑے اور یہ بکلّی

بند نہیں ہوگی جب تک وہ ارادہ بکمال و تمام پورا نہ ہو جاوے جو آسمان پر قرار پایا ہے اور ضرور ہے کہ زمین اپنے مواد نکالتی رہے جب تک کہ خدا تعالیٰ کا ارادہ اپنے کمال کو نہ پہنچے۔

مرزا غلام احمد

ایک الہام

جو مورخہ ۲۷؍اپریل ۱۹۰۳ء کو شام کو بیان فرمایا:۔

رَبِّ اِنِّیْ مَظْلُوْمٌ فَانْتَصِرْ۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱۷ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء)

۲۸؍اپریل ۱۹۰۳ء

بوقتِ ظہر

مہندی اور وسمہ

مہندی اور وسمہ کی نسبت ذکر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ:۔

اکثر اکابر اس طرف گئے ہیں کہ وسمہ نہ لگانا چاہیئے یا مہندی لگائی جاوے یا وسمہ اور مہندی ملا کر۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۱ مورخہ ۸؍مئی ۱۹۰۳ء)

۲۹؍اپریل ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ناپائیدار زندگی

ایک شخص کی نئی ایجاد کا ذکر ہوا کہ اس کی ایجاد بہت مقبول ہوئی ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ لکھوکھا روپیہ اب کماویگا۔ فرمایا کہ:۔

دنیا چند روزہ ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ دولت آوے گی اور ان کی نظر یہاں تک ہی محدود رہتی ہے۔ لیکن اگر زندگی نہ ہوئی تو کیا فائدہ؟ لوگوں کا دستور ہے کہ ہر ایک پہلو پر نظر نہیں ڈالتے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۱ مورخہ ۸؍مئی ۱۹۰۳ء)

☆ ☆ ☆

۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء

بوقتِ سیر

ایک الہام

فرمایا کہ:-

مجھے الہام ہوا مگر اس کا آخری حصہ یاد ہے دوسرے الفاظ یاد نہیں رہے جو الفاظ یاد ہیں وہ یہ ہیں فِیْہِ خَیْرٌ وَّ بَرَکَۃٌ۔ اس کا ترجمہ بھی بتلایا گیا "اس میں تمام دُنیا کی بھلائی ہے۔"

حج نہ کرنے پر اعتراض کا جواب

مخالفوں کے اس اعتراض پر کہ مرزا صاحب حج کیوں نہیں کرتے۔ فرمایا:-

کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو خدمت خدا تعالیٰ نے اوّل رکھی ہے اس کو پس انداز کر کے دوسرا کام شروع کر دیوے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عام لوگوں کی خدمات کی طرح ملہمین کی عادت کام کرنے کی نہیں ہوتی۔ وہ خدا تعالیٰ کی ہدایت اور رہنمائی سے ہر ایک امر کو بجا لاتے ہیں۔ اگرچہ شرعی تمام احکام پر عمل کرتے ہیں مگر ہر ایک حکم کی تقدیم و تاخیر الٰہی ارادہ سے کرتے ہیں۔ اب اگر ہم حج کو چلے جاویں تو گویا اس خدا کے حکم کی مخالفت کرنیوالے ٹھہرینگے اور مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (آل عمران: ۹۸) کے بارے میں کتاب حجج الکرامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو حج ساقط ہے۔ حالانکہ اب جو لوگ جاتے ہیں اُن کی کئی نمازیں فوت ہوتی ہیں۔ ماموریں کا اوّل فرض تبلیغ ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ سال مکہ میں رہے آپؐ نے کتنی دفعہ حج کئے تھے؟ ایک دفعہ بھی نہیں کیا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کی بے باپ پیدائش

سوال:- کیا قرآن میں کوئی صریح آیت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح بلا باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ فرمایا کہ:-

جواب:- یحییٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے قصّہ کو ایک جا جمع کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جیسے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش خارق عادت ہے ویسے ہی مسیح علیہ السلام کی بھی ہے پھر یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا حال بیان کر کے مسیح کی پیدائش کا حال بیان کیا ہے یہ ترتیب قرآنی بھی بتلاتی ہے کہ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی کی ہے یعنی جسقدر معجز نمائی کی قوت یحییٰؑ[1] کی پیدائش میں ہے اس سے بڑھ کر مسیح کی پیدائش میں ہے۔ اگر اس میں کوئی معجزانہ بات نہ تھی تو

[1] "یعنی حضرت زکریا علیہ السلام بہت ہی بوڑھے تھے اور انکی بیوی بانجھ تھی۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء)

یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کرکے کیوں ساتھ ہی مریم کا ذکر چھیڑ دیا؟ اس سے کیا فائدہ تھا؟ اسی لیے کیا کہ تاویل کی گنجائش نہ رہے۔ ان دونو بیانوں کو ایک جا ذکر کرنا اعجازی امر کو ثابت کرتا ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو گویا قرآن تنزل پر آتا ہے جو کہ اس کی شان کے برخلاف ہے۔

پھر اس کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ۔ (اٰل عمران: ۶۰) اگر مسیح بن باپ کے نہ تھا تو آدم سے مماثلت کیا ہوئی؟ اور وہ کیا اعتراض مسیح پر تھا جس کا یہ جواب دیا گیا؟

تواریخی بات یہ بھی ہے کہ یہود آپ کی پیدائش کو اسی لیے ناجائز قرار دیتے تھے کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اس پر خدا نے یہود کو جواب دیا کہ آدم بھی تو بلا باپ پیدا ہوا تھا بلکہ بلا ماں بھی۔ بہ اعتبار واقعات کے جو اعتراض ہوا کرتے ہیں ان سے جواب کو دیکھنا چاہیئے اور اگر کوئی اُسے خلاف قانون قدرت قرار دیتا ہے تو اوّل قانون قدرت کی حدبست دکھلا دے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۲ مورخہ ۸؍ مئی ۱۹۰۳ء)

یکم مئی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ایک رؤیا فرمایا کہ:۔

ایک رؤیا تھی تو وحشت ناک مگر اللہ تعالیٰ نے ٹال ہی دیا۔ دیکھا کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ بیل کو میدان میں ذبح کریں گے۔ مگر عملی کارروائی نہ ہوئی۔ ذبح نہ ہوا کہ جاگ آ گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں مسیح موعودؑ کے دفن ہونے کا سِرّ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ مسیح موعود کی قبر میری قبر میں ہوگی۔ اس پر ہم نے سوچا کہ یہ کیا سِر ہے تو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہر ایک قسم کی دُوری اور دُوئی کو دُور کرتا ہے اور اس سے اپنے اور مسیح موعود کے وجود میں ایک اتحاد کا ہونا ثابت کیا ہے اور ظاہر کر دیا ہے کہ کوئی شخص باہر سے آنے والا نہیں ہے بلکہ مسیح موعود کا آنا گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا آنا ہے جو بروزی رنگ رکھتا ہے۔ اگر کوئی اَور شخص آتا تو اس سے دُوئی لازم آتی اَور غیرتِ نبوی کے تقاضے کے خلاف ہوتا۔

بروز میں دُوئی نہیں ہوتی

اگر کوئی غیر شخص آ جاوے تو غیرت ہوتی ہے لیکن جب وہ خود ہی آوے تو پھر غیرت کیسی؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر ایک شخص آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھے اور پاس اس کی بیوی بھی موجود ہو تو کیا اس کی بیوی آئینہ والی تصویر کو دیکھ کر پردہ کرے گی اور اس

کو یہ خیال ہو گا کہ کوئی نامحرم شخص آگیا ہے اس لیے پردہ کرنا چاہیئے اور یا خاوند کو غیرت محسوس ہو گی کہ کوئی اجنبی شخص گھر میں آگیا ہے اور میری بیوی سامنے ہے. نہیں بلکہ آئینہ میں انہیں خاوند بیوی کی شکلوں کا بروز ہوتا ہے اور کوئی اس بروز کو غیر نہیں جانتا اور نہ ان میں کسی قسم کی دُوئی ہوتی ہے۔

یہی حالت مسیح موعود کی آمد کی ہے۔ وہ کوئی غیر نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جُدا ہے اور کسی نئی تعلیم یا شریعت کو لے کر آنے والا نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا بروز اور آپؐ کی ہی آمد ہے جس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے آنے سے کوئی غیرت دامنگیر نہیں ہوئی بلکہ اس کو اپنے ساتھ ملایا ہے اور یہی سِر ہے آپ کے اس ارشاد میں کہ وہ میری قبر میں دفن کیا جاوے گا۔ یہ امر غایت اتحاد کی طرف رہبری کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قدر تعریف کر کے بھی جو قرآن شریف میں کی گئی ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء ٹھہرا کر بھی پھر کبھی اور آپ کے بعد نبوت کے تخت پر بٹھا دیتا تو آپ کی کس قدر کسر شان ہوتی اور اس سے نعوذ باللہ یہ ثابت ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی بہت ہی کمزور ہے کہ آپ سے ایک شخص بھی ایسا تیار نہ ہو سکا جو آپ کی اُمت کی اصلاح کر سکتا۔ اس سے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر شان ہوتی بلکہ یہ امر جیسا کہ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے۔ منافی غیرت بھی ہوتا۔ ہر شخص میں دنیا کے ادنیٰ ادنیٰ معاملات کے لیے غیرت ہوتی ہے تو کیا انبیاء علیہم السلام میں خدائی تعلقات میں بھی غیرت نہیں؟ معاذ اللہ اس قسم کے کلمات کفر کے کلمات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی اطاعت کرتے۔ اس سے کیا مراد تھی؟ یہی کہ آپ کی نبوت کے زمانہ میں اَور کوئی دوسرا نبی نہیں آسکتا تھا۔ ایسا ہی جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آپ نے تورات کا ایک ورق دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہی غیرت تھی جس سے چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ اے عمرؓ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو نہیں دیکھتا۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ نے وہ کاغذ اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور اس طرح پر غیرتِ نبوی کا ادب کیا۔ بھلا جب ایک چھوٹی سی بات کے لیے آپ کا چہرہ غیرت سے سُرخ ہو گیا تھا تو کیا اگر وہی مسیح جو بنی اسرائیل کا آخری رسول تھا اگر آپ کی اُمت کی اصلاح اور آپ کی ختم نبوت کی مُہر کو توڑنے کے واسطے آجاویگا تو آپ کو غیرت نہ آئے گی؟[1] اور کیا خدا تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قدر ہتک

---

[1] البدر سے:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت کب تقاضا کرتی ہے کہ آپ کی کُرسی پر دوسرا بیٹھے اللہ تعالیٰ آپکی تعریف کرے اور آپ کا درجہ بلند کر کے آپ کو ہر طرح کے سکھ اور آرام کا مالک بنا دے اور آخر میں آکر یہ دُکھ دیوے کہ آپ کی کُرسی پر غیر کو بٹھا دیوے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۲ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء)

کرنی چاہتا ہے؟ افسوس ہے یہ لوگ مسلمان کہلا کر اور آپ کا کلمہ پڑھ کر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور آپ کو خاتم النبیین مان کر پھر آپ کی مُہر کو توڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر بھی الزام لگاتے ہیں کہ وہ پسند کرتا ہے کہ اس قدر تعریفوں کے بعد جو قرآن شریف میں آپ کی کی گئی ہیں آپؐ سے یہ سلوک کرے۔ معاذ اللہ۔

ایک غلو کا جواب

شیعہ لوگوں کے ذکر پر فرمایا:۔

ہمیں ان لوگوں کی حالت پر رحم آتا ہے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایسی ہی شان اور عظمت تھی جو یہ بیان کرتے ہیں اور کُل نبیوں کی نجات ان ہی کی شفاعت سے ہوتی ہے تو پھر تعجب ہے کہ قرآن شریف میں آپ کا نام ایک مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ نے نہ لیا۔ زیدؓ جو ایک معمولی صحابی تھے ان کا نام تو قرآن نے لے لیا مگر امام حسین رضی اللہ عنہ کا جو ایسے جلیل القدر منجی اور کل انبیاء علیہم السلام کے شفیع تھے ان کا نام بھی قرآن شریف نے نہ لیا۔ کیا قرآن شریف کو بھی اُن سے کچھ عداوت تھی؟

اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن شریف میں تحریف ہوگئی ہے[1] اور آپ کا نام بھی محرّف مبدّل ہوگیا ہوگا تو یہ الزام بھی انہی کی گردن پر ہے کیونکہ جن کی طرف یہ تحریف منسوب کی جاتی ہے اُن کی وفات کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ تو زندہ تھے اور وہ اپنے وقت کے مقتدر خلیفہ تھے۔ شیرِ خدا تھے جب اُن کو یہ معلوم تھا کہ اس قرآن میں تحریف کی گئی ہے تو کیوں انہوں نے اس کو درست نہ کیا؟ ان کو چاہیئے تھا کہ اصل قرآن شریف کی اشاعت کرتے اور اس کو درست کر دیتے لیکن جبکہ انہوں نے بھی یہی قرآن رکھا اور اپنا صحیح اور درست قرآن شائع نہ کیا۔ تو یہ الزام بھی اُن کے اپنے ہی سر رہا۔ اُن کا حق تھا اور اُن پر فرض تھا کہ جب اصل قرآن شریف گم کر دیا گیا تھا تو اس وقت تو بھلا وہ خوف کے مارے کچھ نہ کر سکتے تھے مگر اُن کی وفات کے بعد تو اُن کو موقعہ تھا کہ لوگوں میں اس امر کا اعلان کر دیتے کہ اصل قرآن شریف یہ ہے اور جو تمہارے پاس ہے وہ محرّف مبدّل ہوگیا ہے۔ مگر جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو پھر یہ الزام ان پر رہا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۴ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۳ء)

ھوشعنا

براہین میں یہ ایک الہام حضرت اقدس کا درج ہے یہ ایک عبرانی لفظ ہے جس کے معنے ہیں "نجات دے" فرمایا کہ:۔

یَا مَسِیْحَ الْخَلْقِ عَدْوَانَا کا مضمون اس سے ملتا جلتا ہے۔

مامور کی اطاعت کا معیار

فرمایا:۔

ایک مامور کی اطاعت اس طرح ہونی چاہیئے کہ اگر ایک حکم کسی کو دیا جاوے تو خواہ اس کو مقابلہ پر دشمن کیسا ہی لالچ اور طمع کیوں نہ دیوے یا کیسی ہی عجز۔ انکساری اور خوشامد

---

[1] جیسا کہ شیعہ کہدیتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

درآمد کیوں نہ کرے مگر اس حکم پر ان باتوں میں سے کسی کو بھی ترجیح نہ دینی چاہیئے اور کبھی اس کی طرف التفات نہ کرنی چاہیئے۔ سیرت اور خصلت اس قسم کی چاہیئے کہ جس سے دوسرے آدمی پر اثر پڑے اور وہ سمجھے کہ ان لوگوں میں واقعی طور پر اطاعت کی روح ہے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہ ملے گا کہ اگر کسی کو ایک دفعہ اشارہ بھی کیا گیا ہے تو پھر خواہ بادشاہ وقت نے ہی کتنا ہی زور کیوں نہ لگایا مگر اس نے سوائے اس اشارہ کے اُور کسی کی کچھ مانی ہو۔

اطاعت پوری ہو تو ہدایت پوری ہوتی ہے۔ ہماری جماعت کے لوگوں کو خوب سُن لینا چاہیئے اور خدا تعالےٰ سے توفیق طلب کرنی چاہیئے کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۲ مئی ۱۹۰۳ء

بوقتِ سیر

مہر کے متعلق ایک شخص نے پوچھا کہ اس کی تعداد کس قدر ہونی چاہیئے؟ فرمایا کہ:۔

مہر

تراضی طرفین سے جو ہو اس پر کوئی حرف نہیں آتا اور شرعی مہر سے یہ مراد نہیں کہ نصوص یا احادیث میں کوئی اس کی حد مقرر کی گئی ہے بلکہ اس سے مراد اس وقت کے لوگوں کے مروجہ مہر سے ہوا کرتی ہے ہمارے ملک میں یہ خرابی ہے کہ نیّت اَور ہوتی ہے اور محض نمود کے لیے لاکھ لاکھ روپے کا مہر ہوتا ہے۔ صرف ڈراوے کے لیے یہ لکھا جایا کرتا ہے کہ مرد قابو میں رہے اور اس سے پھر دوسرے نتائج خراب نکل سکتے ہیں۔ نہ عورت والوں کی نیّت لینے کی ہوتی ہے اور نہ خاوند کی دینے کی۔

میرا مذہب یہ ہے کہ جب ایسی صورت میں تنازعہ آ پڑے تو جب تک اس کی نیّت ثابت نہ ہو کہ ہاں رضا و رغبت سے وہ اسی قدر مہر پر آمادہ تھا جس قدر کہ مقرر شدہ ہے۔ تب تک مقررہ مہر نہ دلایا جاوے اور اسکی حیثیت اور رواج وغیرہ کو مدنظر رکھ کر پھر فیصلہ کیا جاوے کیونکہ بدنیتی کی اتباع نہ شریعت کرتی ہے اور نہ قانون۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے ریویو کا ذکر چلا جو کہ براہین پر لکھا ہے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

ہمیں اس کی حالت پر تعجب ہے کہ جس وقت ایک درخت کا ابھی تخم ہی زمین میں ڈالا گیا ہے اور کسی طرح کا نشوونما اس نے نہیں پایا نہ پتہ نکلا ہے نہ پھل لگا ہے نہ کوئی پھول تو اس معدومی کی حالت میں تو اس کی

تعریف کی جاتی ہے کہ اس کی نظیر ۱۳ سو سال میں کہیں نہیں ملتی اور اب جب وہ درخت پھلا اور پھولا اور نشوونما پائی تو اس کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں ہمارے دعویٰ کی مثال رات کی تھی۔ اس وقت تو شپر کی طرح اسے قبول اور پسند کیا اور اب جب دن چڑھا اور سورج کی طرح وہ چمکا تو آنکھ بند کر لی۔

جن ایام میں شناخت کے آثار نہ تھے اور اس وقت یہ امر مخفی اور مستور تھا تو ریویو لکھے اور رائے ظاہر کی۔ اب یہ وقت آیا تھا کہ وہ اپنے ریویو پر فخر کرتا کہ دیکھو جو باتیں مَیں نے اوّل کہی تھیں وہ آج پوری ہو رہی ہیں اور میری اس فراست کے شواہد پیدا ہو گئے ہیں مگر افسوس کہ اب وہ اپنی فراست کے خود ہی دشمن ہو گئے۔ ہم نے کونسی بات نئی کی ہے۔ جس حَکَم کے وہ لوگ منتظر ہیں بھلا ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس نے آکر ہر ایک رطب و یابس کو قبول کر لینا ہے اور وہ وحی کی پیروی کرے گا یا کہ ان مختلف مولویوں کی؟ اگر اس نے آکر انہی کی ساری باتیں قبول کر لینی ہیں تو پھر اس کا وجود بیہودہ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۳ مورخہ ۸ رمئی ۱۹۰۳ء)

دربارِ شام

دُعا کے جواب میں ایک الہام

فرمایا:-

آج ہم نے عام طور پر بہت سے بیماروں کے لیے دُعا کی تھی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا "آثارِ صحت"۔ یہ نہیں معلوم کہ کس شخص کے متعلق ہے۔ دُعا عام تھی۔

ہدایت مجاہدہ اور تقویٰ پر منحصر ہے

فرمایا کہ

جو شخص محض اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کی راہ کی تلاش میں کوشش کرتا ہے اور اس سے اس امر کی گرہ کشائی کے لیے دُعائیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہم میں سے ہو کر کوشش کرتے ہیں ہم اپنی راہیں ان کو دکھا دیتے ہیں) کے موافق خود ہاتھ پکڑ کر راہ دکھا دیتا ہے اور اسے اطمینانِ قلب عطا کرتا ہے اور اگر خود دل ظلمت کدہ اور زبان دُعا سے بوجھل ہو اور اعتقاد شرک و بدعت سے ملوث ہو تو وہ دُعا ہی کیا ہے اور وہ طلب ہی کیا ہے جس پر نتائجِ حسنہ مترتب نہ ہوں۔ جب تک انسان پاک دل اور صدق و خلوص سے تمام ناجائز رستوں اور اُمیدوں کے دروازوں کو اپنے اوپر بند کر کے خدا تعالیٰ ہی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اس وقت تک وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید اُسے ملے لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دروازہ پر گرتا اور اسی سے دُعا کرتا ہے تو اس کی یہ حالت جاذبِ نصرت اور رحمت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ آسمان سے انسان کے دل کے کونوں میں جھانکتا ہے اور اگر کسی کونے میں بھی کسی قسم کی ظلمت یا شرک و بدعت کا کوئی حصہ ہوتا ہے تو اُس کی دُعاؤں اور عبادتوں

کو اُس کے مُنہ پر اُلٹا مارتا ہے اور اگر دیکھتا ہے کہ اس کا دل ہر قسم کی نفسانی اغراض اور ظُلمت سے پاک صاف ہے تو اس کے واسطے رحمت کے دروازے کھولتا ہے اور اسے اپنے سایہ میں لیکر اُس کی پرورش کا خود ذمہ لیتا ہے۔

اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ سے قائم کیا ہے اور اس پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ آتے ہیں اور وہ صاحب اغراض ہوتے ہیں۔ اگر اغراض پورے ہو گئے تو خیر ورنہ کدھر کا دین اور کدھر کا ایمان[۱]۔ لیکن اگر اس کے مقابلہ میں صحابہؓ کی زندگی میں نظر کی جاوے تو ان میں ایک بھی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ہماری بیعت تو بیعت تو بہ ہی ہے لیکن ان لوگوں کی بیعت تو سر کٹانے کی بیعت تھی۔ ایک طرف بیعت کرتے تھے اور دوسری طرف اپنے سارے مال و متاع، عزت و آبرو اور جان و مال سے دست کش ہو جاتے تھے گویا کسی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں اور اس طرح پر اُن کی کُل اُمیدیں دنیا سے منقطع ہو جاتی تھیں ہر قسم کی عزت و عظمت اور جاہ و حشمت کے حصول کے ارادے ختم ہو جاتے تھے۔ کس کو یہ خیال تھا کہ ہم بادشاہ بنیں گے یا کسی ملک کے فاتح ہوں گے۔ یہ باتیں اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں بلکہ وہ تو ہر قسم کی امیدوں سے الگ ہو جاتے تھے اور ہر وقت خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر دُکھ اور مصیبت کو لذت کے ساتھ برداشت کرنے کو تیار ہو جاتے تھے یہانتک کہ جان تک دینے کو آمادہ رہتے تھے۔ ان کی اپنی تو یہی حالت تھی کہ وہ اس دنیا سے بالکل الگ اور منقطع تھے لیکن یہ الگ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی عنایت کی اور ان کو نوازا۔ اور اُن کو جنہوں نے اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا ہزار چند کر دیا۔

صحابہؓ کی مثالی زندگی

دیکھئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال و متاع خدا تعالیٰ کی راہ میں دیدیا اور آپ کمبل پہن لیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر انہیں کیا دیا۔ تمام عرب کا انہیں بادشاہ بنا دیا اور اسی کے ہاتھ سے اسلام کو نئے سرے زندہ کیا اور مرتد عرب کو پھر فتح کر کے دکھا دیا اور وہ کچھ دیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ غرض ان لوگوں کا صدق و وفا اور اخلاص و مروت ہر مسلمان کے لیئے قابل اُسوہ ہے۔ صحابہؓ کی زندگی ایک ایسی زندگی تھی کہ تمام نبیوں میں سے کسی نبی کی زندگی میں یہ مثال نہیں پائی جاتی۔ اور آپؐ کے صحابہؓ کے مقابلہ میں حضرت مسیحؑ کے حواری تو بہت ہی گری ہوئی حالت میں نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ جوش، صدق و وفا جو ایک مُرید کو اپنے مُرشد کے لیئے ہونا چاہیئے پایا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ مصیبت

[۱] البدر میں ہے:۔ اغراضِ نفسانی شرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب پر حجاب لاتے ہیں۔ اگر انسان نے بیعت بھی کی ہوئی ہو تو پھر بھی اس کے لیے یہ ٹھوکر کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمارا سلسلہ تو یہ ہے کہ انسان نفسانیت کو ترک کر کے توحید خالص پر قدم مارے۔ سچی طلب حق کی ہو ورنہ جب وہ اصل مطلوب میں فرق آتا دیکھے گا تو اُسی وقت الگ ہو جاویگا کیا صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی واسطے قبول کیا تھا کہ مال و دولت میں ترقی ہو؟" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۳ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء)

کے وقت سب کے سب بھاگ گئے اور جو پاس رہ گیا۔ اس نے لعنت بھیجنی شروع کردی۔

اصل بات یہ ہے کہ جب تک انسان اپنی خواہشوں اور اغراض سے الگ ہوکر خدا تعالیٰ کے حضور نہیں آتا ہے وہ کچھ حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنا نقصان کرتا ہے لیکن جب وہ تمام نفسانی خواہشات اور اغراض سے الگ ہو جاوے اور خالی ہاتھ اور صافی قلب لے کر خدا تعالیٰ کے حضور جاوے تو خدا اس کو دیتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کی دستگیری کرتا ہے مگر شرط یہی ہے کہ انسان مرنے کو تیار ہو جاوے اور اس کی راہ میں ذلت اور موت کو خیر باد کہنے والا بن جاوے۔

اہلِ صدق و وفا کے لیے قبولیت و عظمت

دیکھو دُنیا ایک فانی چیز ہے مگر اس کی لذت بھی اسی کو ملتی ہے جو اس کو خدا کے واسطے چھوڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کا مقرب ہوتا ہے خدا تعالیٰ دنیا میں اس کیلئے قبولیت پھیلا دیتا ہے۔ یہ وہی قبولیت ہے جس کے لیے دنیا دار ہزاروں کوششیں کرتے ہیں کہ کسی طرح کوئی خطاب مل جاوے یا کسی عزت کی جگہ یا دربار میں کُرسی ملے اور کرسی نشینوں میں نام لکھا جاوے۔ غرض تمام دنیوی عزتیں اُنہی کو دی جاتی ہیں اور ہر دل میں ان کی عظمت اور قبولیت ڈال دی جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کے لیے سب کچھ چھوڑنے اور کھونے پر آمادہ ہو جاتے ہیں نہ صرف آمادہ بلکہ چھوڑ دیتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے واسطے کھونے والوں کو سب کچھ دیا جاتا ہے[1] اور وہ نہیں مرتے ہیں جب تک وہ اس سے کئی چند نہ پالیں جو انہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کسی کا قرض اپنے ذمہ نہیں رکھتا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ان باتوں کو ماننے والے اور ان کی حقیقت پر اطلاع پانے والے بہت ہی کم لوگ ہیں۔ ہزاروں اہلِ صدق و وفا گذرے ہیں مگر کسی نے نہ دیکھا ہوگا اور نہ کسی نے سُنا ہوگا کہ وہ ذلیل و خوار ہوئے ہوں۔ دنیوی امور میں اگر وہ نہایت درجہ کی ترقی کرتے تو زیادہ سے زیادہ تین چار آنے کی مزدوری کر لیتے اور کس مپرس اور گمنام لوگوں میں سے ہوتے مگر جب انہوں نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی راہ میں لگایا تو خدا تعالیٰ نے اُن کو ایسا کیا کہ تمام دنیا میں نام آور بن گئے اور ان کی عزت و عظمت دلوں میں بٹھائی گئی اور اب ان کے نام ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ دنیوی عظمت اور عزت بھی بذریعہ دین ہی حاصل ہوتی ہے۔ پس مبارک وہی ہے جو دین کو مقدم کرے[2] دیکھو ایک جونک کی نسبت بیل کو اور

---

[1] البدر میں ہے:۔ ”زمینی گورنمنٹوں کے لیے جو ذرہ سا کچھ گنواتا ہے ان کو اجر ملتا ہے تو جو خدا کے لیے گنوائے تو کیا اُسے اجر نہ ملیگا۔“ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۳)

[2] البدر میں ہے:۔ ”لوگ اسباب پر گرتے ہیں۔ ایمان نہیں ہوتا۔ اسی لیے دُکھ اُٹھاتے ہیں۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔“ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۳ مورخہ ۸ رمئی ۱۹۰۳ء)

ایک بیل کی نسبت انسان کو اور انسانوں میں سے خواص کو اللہ تعالیٰ نے لذات اور حظوظ دیئے ہوئے ہیں اور خواص کو خاص قوی لذتوں کے ملتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ خدا تعالیٰ کے مقرب ہوکر خواص بنتے ہیں تو اُنکو دنیوی لذائذ وغیرہ بھی اعلیٰ درجہ کے عطا ہوتے ہیں[1]۔ ایک پنجابی شعر ہے جو بالکل کلام الٰہی کے موافق اسی کا گویا ترجمہ ہے کہ ؎

جے توں میرا ہو رہیں سب جگ تیرا ہو

پس خدا تعالیٰ کے خاص بندے بننے کی کوشش کرنی چاہیئے[2] (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۳-۱۴ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۳ مئی ۱۹۰۳ء

بوقت سیر

خواب کی اقسام

ایک نووارد صاحب نے سوال[3] کیا کہ خواب کیا شئے ہے؟ میرے خیال میں تو یہ صرف خیالات انسانی ہیں حقیقت میں کچھ نہیں۔ فرمایا کہ:۔

خواب کی تین قسمیں ہیں:۔ نفسانی۔ شیطانی۔ رحمانی

نفسانی جس میں انسان کے اپنے نفس کے خیالات ہی متمثل ہوکر آتے ہیں جیسے بلی کو چھیچھڑوں کے خواب۔

شیطانی وہ جس میں شیطانی اور شہوانی جذبات ہی نظر آویں۔

رحمانی وہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دی جاتی ہیں اور بشارتیں دی جاتی ہیں۔

سوال[4]:۔ کیا کسی بدکار آدمی کو بھی نیک خواب آتا ہے؟

---

[1] البدر میں ہے:۔ ”پس جو انسان خواص انسان ہیں۔ وہ اسی طرح ان لذات میں زیادہ لذت پاتے ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیوی تمام لذات میں خواص کا ہی حصہ زیادہ ہے۔“ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۳ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں مزید یوں لکھا ہے:۔ ”مجھے خواب میں دو دفعہ پنجابی مصرعے بتلائے گئے ہیں ایک تو یہی جو بیان ہوا ہے (”جے توں میرا ہو رہیں سب جگ تیرا ہو“ مراد ہے۔ مرتب)۔

اور ایک دفعہ مَیں نے دیکھا کہ ایک وسیع میدان ہے اس میں ایک مجذوب (جس میں محبت الٰہی کا جذبہ ہو) میری طرف آ رہا ہے تو اُس نے یہ شعر پڑھا عشق الٰہی وستے مُنہ پر ولیاں ایہہ نشانی (ولیوں کی یہ نشانی ہے کہ عشق الٰہی منہ پر برس رہا ہوتا ہے)۔ (البدر ایضاً)

[3] و [4] الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ میں صفحہ ۲ پر یہ سوال اور اُن کے جواب بغیر تاریخ کے ”استفسار اور ان کے جواب“ کے زیر عنوان درج ہیں۔ (مرتب)

جواب :۔ فرمایا کہ ایک بدکار آدمی کو بھی نیک خواب آجاتی ہے کیونکہ فطرتاً کوئی بد نہیں ہوتا خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات : ۵۷) تو جب عبادت کے واسطے سب کو پیدا کیا ہے سب کی فطرت میں نیکی بھی رکھی ہے ۔ اور خواب نبوت کا حصّہ بھی ہے اگر یہ نمونہ ہر ایک کو نہ دیا جاتا تو پھر نبوت کے مفہوم کو سمجھنا تکلیف مالایطاق ہو جاتا ۔ اگر کسی کو علم غیب تبلایا جاتا وہ ہرگز نہ سمجھ سکتا ۔ بادشاہِ مصر جو کہ کافر تھا اُسے سچی خواب آئی مگر آج کل سچی خواب کا انکار دراصل خدا تعالیٰ کا انکار ہے اور اصل میں خدا ہے اور ضرور ہے اسی کی طرف سے بشارتیں ہوتی ہیں اور نیک خوابیں آتی ہیں اور وہ پُوری بھی ہوتی ہیں ۔ جس قدر انسان صدق اور راستی میں ترقی کرتا ہے ویسے ہی نیک اور مبشر رؤیا بھی آتے ہیں ۔

حُسنِ عقیدت کیسے حاصل ہو

سوال :۔ مَیں ایک مسلمان ہوں اور مسلمانوں کی اولاد ہوں عام طور پر دنیا کو دیکھ کر حُسنِ عقیدت کسی پر پیدا نہیں ہوتی ۔ یہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی دیکھ کر چاہتا ہوں کہ حسنِ عقیدت ہو مگر پھر نہیں ہوتی ۔ اس کی کیا وجہ اور کیا علاج ہے؟

جواب :۔ فرمایا کہ :۔

انسان ہمیشہ تجارب سے نتیجہ نکالتا ہے اور عقلِ انسانی بھی بذریعہ تجارب کے ترقی کرتی رہتی ہے مثلاً انسان جانتا ہے کہ انب کے درخت کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور بعض درخت کے پھل کڑوے ہوتے ہیں تو اس تجربہ کثیر سے اُسے ایک فہم حاصل ہو جاویگا کہ انب کے پھل ضرور شیریں ہوتے ہیں ۔ اسی طرح چونکہ تجربہ آج کل یہی ہوتا ہے کہ دنیا میں فسق و فجور اور مکر و فریب کا سلسلہ بڑھا ہوا ہے اس لیے اس کا خیال بندھ جاتا ہے کہ ہر ایک فریبی اور مکار ہی ہے ۔ سابقہ تجارب اُسے تعلیم دیتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔ اسی وجہ سے حُسنِ عقیدت کی جگہ بدعقیدگی پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے لوگ انبیاء پر بھی سُوءِ ظن رکھتے آئے ہیں ۔ موسیٰؑ کی وفات کو دو ہزار برس گذر چکے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اس زمانے میں بہت سے جھوٹے معجزات دکھانے والے اور دعوے کرنے والے پیدا ہوئے تھے ۔ لوگوں کو اُن کا تجربہ تھا اور اسی حالت میں یک لخت ایک صادق بھی آگیا ۔ آخر اُن کو اس صادق کو بھی وہی کہنا پڑا جو ان جھوٹے مدعیوں کے حق میں کہتے تھے یعنی اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (صٓ : ۷) کہ یہ تو دکانداری ہے ۔ غرضکہ انسان تجارب کے ذریعہ سے بھول رہے ہیں خدا تعالیٰ کے بندوں کی معرفت کا ہونا یہ خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہے ۔ وہی معرفت دے تو پتہ لگتا ہے ۔ دُعا بہت کرے دعا کے سوا چارہ نہیں ہاں یہ امر ضروری ہے کہ استغناء نہ کرے کہ نیک اور بد کو ایک جیسا جان لیوے اور کہے کہ جیسے بُرے درخت ہوتے ہیں ویسے ہی اچھے بھی ہوتے ہیں ۔ یہ ایک قاعدہ اپنی طرف سے ہرگز نہ بنانا چاہیئے بلکہ نفس کو یہ سمجھانا چاہیئے کہ اچھے بھی ضرور ہیں ۔ جب شیطان کا گروہ اس قدر دنیا میں موجود ہے کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ

کا گروہ بالکل ہی دُنیا میں موجود نہ ہو۔ خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا رہے کہ آنکھیں ہیں۔

آج کل واقعہ میں علماء کی یہی حالت ہے۔ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند ؎ چوں بخلوت مے روند آں کارِ دیگر میکنند

حافظ نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا ہے۔ ؎

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

اور غور سے دیکھا جاوے تو سچے کے بغیر جھوٹ کی کچھ روشنی ہی نہیں ہوتی۔ اگر آج سچا سونا چاندی نہ ہو تو جھوٹے سونے چاندی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

انبیاء و مامورین کی عظمت و صداقت

جس قدر انبیاء ہوئے ہیں سب اکراہ سے آگے ہوئے ہیں۔ گروہوں اور مجلسوں سے ان کی طبیعت متنفر ہوتی ہے۔ انبیاء میں انقطاع اور اخلاص کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ ان کی بڑی آرزو ہوتی ہے کہ لوگ اُنکی طرف رجوع نہ کریں مگر چونکہ خدا تعالیٰ نے فطرت ایسی دی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے کام کریں۔ اس لیے اُن کی عظمت جس قدر دنیا میں پھیلتی ہے وہ مکائد سے ہرگز نہیں پھیلتی بلکہ خود خُدا پھیلاتا ہے۔ اُنکے مقابل کے کُل مکائد پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ان کے کام میں اعجاز اور پیشگوئیاں بے نظیر ہوتی ہیں اگر معجزات نہ ہوتے تو طبائع پر بہت مشکلات پڑتے کیسی ہی طبیعت کثیف ہو مگر ان کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

ایک مخالف کا میرے پاس خط آیا کہ مَیں آپ کا مخالف ہوں مگر آج کل مجھے یہ حیرانی ضرور ہے کہ اگر آپ جھوٹے ہیں تو اس قدر کامیابی اور ترقی کیوں ہے۔ دنیا میں وہ انسان اندھا ہے جو مختصر تجارب سے نتیجہ نکالتا ہے۔ سچا نتیجہ اس وقت نکلتا ہے جب تمام شواہد کو یکجائی نظر سے دیکھا جاوے۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے آنیوالے ماموروں کو ایسی بات نہ ملے تو پھر ان کی سچائی کا ثبوت کیا ہے۔ شاہی سند اس کے پاس ضرور ہونی چاہیئے۔ آفتاب نکلا ہوا ہو اور کوئی اُسے رات کہے تو کب تک کہہ سکتا ہے؟

خدا تعالیٰ کی طرف سے جو آتا ہے وہ دلائل۔ شواہد۔ آثار۔ اخبار۔ زمینی نشان۔ آسمانی نشان۔ سماوی تائیدات۔ قبولیت وغیرہ لیکر آتا ہے۔ اس کی اخلاقی حالت اور تعلق خدا سب اس کی سچائی پر دلالت کرتے ہیں اور اس کے لیے ایک میدان دلائل سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک نیک دل اگر یقین کے لیے کافی ثبوت چاہے تو اُسے فکر کرنے سے مل جاوینگے۔

اگر اعتراض ہو کہ کل دُنیا کے لوگ کیوں نہیں ایمان لاتے تو جواب یہ ہے کہ بعض لوگوں کی فطرت میں روشنی کم اور بدظنی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض ہوئے۔ نشان دیکھ دیکھ پھر ان کو جھٹلاتے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فریبی کہا ایسے لوگوں کی فطرت بد ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے کہا ہے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ٭ پس بہر دستے نہ باید داد دست

یہ بھی نہ ہو کہ سب کو فریبی جان لے۔ نہ بدظنی کو اتنا وسیع کرے کہ راستبازوں کے فیوض سے محروم رہے نہ اس قدر حسنِ ظن کہ ایک مکار اور فریبی کو بھی خدا رسیدہ جان لے سچے دل سے دعا کرتا رہے۔ انبیاء وغیرہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے ہوتے ہیں جب تک خدا نہ دکھاوے کوئی ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ ابوجہل مکہ میں ہی رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نشوونما دیکھتا رہا۔ آپ کی ساری زندگی دیکھی مگر پھر بھی ایمان نہ لایا۔

کہتے ہیں کہ سلطان محمود ایک راجہ کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ راجہ کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہ کر آخرکار اپنے مذہب اور اسلام کا مقابلہ کرکے مسلمان ہوگیا۔ الگ خیمہ میں وہ رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوا رو رہا تھا کہ خیمہ کے پاس سے محمود گذرا۔ اُس نے رونے کی آواز سُنی۔ اندر آیا۔ پوچھا کہ اگر وطن یاد آیا ہے تو وہیں کا راجہ بنا کر بھیج دیتا ہوں۔ اس نے کہا اب مجھے دنیا کی ہوس کوئی نہیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال آیا ہے کہ قیامت کے دن اگر یہ سوال ہوا کہ تو کیسا مسلمان ہے کہ جب تک محمود نے چڑھائی نہ کی اور وہ گرفتار کرکے تجھ کو نہ لایا تو مسلمان نہ ہوا۔ کیا اچھا ہوتا کہ مجھے اس وقت ابتدا میں سمجھ آجاتی کہ اسلام سچا مذہب ہے۔

مخالف کا جنازہ

ایک صاحب نے پوچھا[1] کہ ہمارے گاؤں میں طاعون ہے اور اکثر مخالف مکذّب مرتے ہیں ان کا جنازہ پڑھا جاوے کہ نہ؟ فرمایا کہ:

یہ فرض کفایہ ہے اگر کنبہ میں سے ایک آدمی بھی چلا جاوے تو ہو جاتا ہے مگر اب یہاں ایک تو طاعون زدہ ہے کہ جس کے پاس جانے سے خدا روکتا ہے۔ دوسرے وہ مخالف ہے خواہ نخواہ تداخل جائز نہیں ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو بالکل چھوڑ دو اور اگر وہ چاہے گا تو اُن کو خود دوست بنا دے گا یعنی مسلمان ہو جاویں گے۔ خدا تعالیٰ نے منہاج نبوت پر اس سلسلہ کو چلایا ہے۔ مداہنہ سے ہرگز فائدہ نہ ہوگا بلکہ اپنا حصہ ایمان کا بھی گنواؤ گے۔

مجلس قبل از عشاء

توبہ کا دروازہ بند ہونا

طاعون پر ذکر ہوا کہ بعض مقامات بالکل تباہ ہوگئے ہیں مگر پھر بھی وہاں کے لوگوں کی فسق و فجور کی وہی حالت ہے کوئی پاک

---

[1] الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ میں صفحہ ۲ و ۳ پر یہ سوال اور اس کا جواب "استفسار اور ان کے جواب" کے زیر عنوان بغیر تاریخ کے درج ہے۔ (مرتب)

تبدیلی نظر نہیں آتی فرمایا کہ :-
سمجھ اُلٹی ہے توبہ کا دروازہ بند ہونے کے ایک یہ معنے بھی ہیں۔

لَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ

یہ ایک حضرت اقدس علیہ السلام کا پرانا الہام ہے جو مسجد کے اوپر کے حصّہ میں لکھا ہوا تھا اور عمارت کے تغیر و تبدّل کے وقت وہ نوشتہ قائم نہ رہ سکا۔ فرمایا کہ :-
اسے پھر لکھوایا جاوے اور نہیں معلوم کہ اس کے معنے کس قدر وسیع ہیں [1]

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۲۹-۱۳۰ مورخہ ۱۵ رمئی ۱۹۰۳ء)

---

۴ رمئی ۱۹۰۳ء

بوقت سیر

اکرام ضیف

مہمانوں کے انتظام مہمان نوازی کی نسبت ذکر ہوا۔ فرمایا :-
میرا ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کسی مہمان کو تکلیف نہ ہو بلکہ اس کے لیے ہمیشہ تاکید کرتا رہتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے مہمانوں کو آرام دیا جاوے۔ مہمان کا دل مثل آئینہ کے نازک ہوتا ہے اور ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ خود بھی مہمانوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ مگر جب سے بیماری نے ترقی کی اور پرہیزی کھانا کھانا پڑا تو پھر وہ التزام نہ رہا۔ ساتھ ہی مہمانوں کی کثرت اس قدر ہوگئی کہ جگہ کافی نہ ہوتی تھی اس لیے بمجبوری علیحدگی ہوئی۔ ہماری طرف سے ہر ایک کو اجازت ہے کہ اپنی تکلیف کو پیش کر دیا کرے۔ بعض لوگ بیمار ہوتے ہیں۔ ان کے واسطے الگ کھانے کا انتظام ہو سکتا ہے [2]

دربارِ شام

رسوم و عادات

فرمایا [3] کہ :-
عادات اور رسوم کا قلع قمع کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے اور یہی ایک حجاب ہزاروں

---

[1] (نوٹ از ایڈیٹر) حضرت اقدس علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ فرشتے اسے سبز روشنائی سے لکھ رہے ہیں۔
(البدر حوالہ مذکور)

[2] البدر جلد ۲ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۳۰ مورخہ ۱۵ رمئی ۱۹۰۳ء

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انوار سے محروم بھی رکھتا ہے ورنہ ہمارا معاملہ تو نہایت ہی صاف اور کُھلا کھلا ہے۔ کیسے ہی دلائل اور براہین سے ایک امر کو مدلّل کرکے کیوں نہ بیان کیا جاوے عادت و رسم کا پابند ضرور اس کے ماننے میں پس و پیش کریگا اور جب تک وہ اس حجاب کو پھاڑ کر باہر نہ نکلے اسے حق لینا نصیب ہی نہیں ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کیسی اجلیٰ اور اصفٰی تھی مگر اُن کے دعویٰ کے وقت بھی عیسائی راہبوں اور یہودی مولویوں نے جو عادت اور رسم کے پابند تھے ہزاروں عذر تراشے اور آپ کو صادق کہنے کی بجائے کاذب کا خطاب دیا۔ گویا رسم اور عادت کی ظلمت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا ہوا تھا کہ وہ نور کو ظلمت کہتے تھے ورنہ آپ کے معجزات، بیّنات اور فیوض اس قدر کامل اور اعلیٰ تھے کہ کسی کو اُن سے انکار ممکن نہ تھا[1]

تسلّی پانے کے تین طریق

اس زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قسم کے دلائل بیّنات ہمارے واسطے جمع کر دیئے ہیں۔ انسان کے تسلّی پانے کے تین ہی طریق ہوا کرتے ہیں۔

(۱) اوّل نقلی دلائل۔ سو وہ قرآن شریف کے نصوص سے ثابت ہیں کیونکہ جو شخص قرآن شریف کو کلام الٰہی مانتا ہے اسے تو اس بن چارہ نہیں بلکہ اس کا ایمان ہی کلام الٰہی کے بغیر ناقص ہے[2]

نقلی دلائل کا دوسرا حصہ احادیث ہیں۔ سو ان میں سے وہ احادیث قابل پذیرائی ہیں۔ جو قرآن شریف کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

[2] البدر میں لکھا ہے کہ ایک نوجوان مولوی صاحب کانپور سے تعلیم پا کر اپنے وطن ڈیرہ غازی خاں کی طرف جا رہے تھے کہ انکو یہ خیال ہو کہ تحقیق کے لیے قادیان بھی آویں چنانچہ وہ تشریف لائے اور اُن کی ملاقات حکیم نورالدین صاحب سے ہوئی۔ حکیم صاحب نے ان کو کہا کہ آپ بہت استغفار کرکے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ امرِ حق ظاہر کر دیوے۔ بعد نماز مغرب حکیم صاحب نے انکی ملاقات حضرت اقدسؑ سے کرائی اور عرض کی کہ یہ بعض امور کے جواب طلب کرنا چاہتے ہیں اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔ ”انسان نے بعض باتیں بطور رسم و عادت کے اختیار کی ہوئی ہوتی ہیں۔ انکا چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ رسمی خیالات کا وہ پابند ہوتا ہے جب تک انکا قلع قمع نہ کیا جاوے تو حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔“ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۱۳۰)

[1] البدر میں ہے:۔ ”کیا باعث ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کامل اور لاثانی آوے اور پھر نہ مانا جاوے؟ ماں باپ سے جو ایک عادت بخل کی چلی آتی ہے وہ امرِ حق کو سمجھنے نہیں دیا کرتی۔ اب اس وقت بھی طریق تسلّی اختیار کرنے میں یہی مشکلات ہیں۔“ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۱۳۰)

[2] البدر میں ہے:۔ ”جس کو خدا تعالیٰ پر یقین ہے اور وہ قرآن کو خدا تعالیٰ کا کلام جانتا ہے وہ ایک آیت سنکر کب دلیری کریگا کہ اس کی تکذیب کرے۔ صریح نص سے انکار مشکل ہے۔“ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ صفحہ ۱۳۰)

معارض نہ ہوں۔ کیونکہ جو حدیث قرآن شریف کے مخالف و معارض ہو وہ ردّی ہے اور قبول کرنے کے لائق نہیں مثلاً قرآن شریف بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوئے ہیں، لیکن اگر حدیث میں یہ ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہوئے ہیں تو وہ بالکل ردّی ہے اور ماننے کے لائق نہیں یا ایسی ہی اگر اور کوئی مخالفت صریح قرآن شریف کی کوئی حدیث کرے تو وہ بھی اس ذیل میں داخل ہے۔

احادیث میں احتمال صدق اور کذب دونو طرح کا ہے کیونکہ احادیث تو قرآن شریف کی طرح اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع نہیں کیں اور نہ ہی اُن کا قرآن شریف کی طرح کوئی نام رکھا ہے بلکہ آپ سے قریباً اڑھائی سو برس بعد جمع ہوئی ہیں۔ غرض ان کے صدق کذب کا معیار قرآن شریف ہے پس جو احادیث قرآن شریف کے معارض نہیں وہ ماننے کے لائق ہیں۔ یہ جو ۷۳ فرقے بن گئے ہیں یہ بھی تو ان احادیث کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ جب لوگوں کی توجہ قرآن شریف سے ہٹ گئی اور احادیث کو قرآن شریف پر قاضی جانا تو یہاں تک نوبت پہنچی۔

(۲) دوسرا ذریعہ عقل ہے جس سے انسان حق کو پہچان سکتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں مجرمین کے الفاظ درج ہیں کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک : ۱۱) سو اگر ان لوگوں سے سوال کیا جاوے کہ کیا عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ کوئی شخص زندہ بجسم عنصری آسمان پر چلا جاوے اور دو ہزار برس تک وہیں بیٹھا رہے اور کسی قسم کی ضروریات اور عوارض اُسے نہ لگیں۔ کیا کوئی عقل ہے جو اس خصوصیت کو مان سکے؟ بھلا ان لوگوں سے پوچھا جاوے کہ اس خصوصیت کی جو تم نے حضرت عیسیٰؑ میں مانی ہے کیا وجہ ہے یہ تو ایک قسم کا باریک شرک ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (الانبیاء : ۸)

اللہ تعالیٰ انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ ہر ایک امر میں نظائر ضروری ہیں۔ جس چیز میں نظیر نہیں وہ چیز خطرناک ہے۔ آجکل جس طرح کا ہمارا جھگڑا ہے اسی قسم کا ایک جھگڑا پہلے بھی اہلِ کتاب میں گذر چکا ہے اور وہ الیاس کا معاملہ تھا۔ ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ مسیح آسمان سے نہیں نازل ہوگا جب تک ایلیا آسمان سے دوبارہ نہ آلے۔ اسی بناء پر جب حضرت مسیح آئے اور انہوں نے یہود کو ایمان کی دعوت دی تو انہوں نے صاف انکار کیا کہ ہمارے ہاں مسیح کی علامت یہ ہے کہ اس سے پہلے ایلیا آسمان سے دوبارہ نازل ہوگا مگر حضرت مسیح نے اس کی یہی تعبیر کی تھی کہ یہی شخص یعنی یوحنا (یحییٰ) ہی الیاس ہے اور یہ اس کی (الیاس کی) خو بُو لے کر آیا ہے۔ اسی کو ایلیا مان لو وہ آسمان سے دوبارہ نہیں آویگا۔ جس نے آنا تھا وہ آچکا چاہو تو مانو چاہو تو نہ مانو۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک مصیبت پڑ چکی تھی اور ان کا فیصلہ ہمارے اس مقدمہ کے لیے ایک دلیل ہو سکتا ہے۔ اگر حضرت

عیسیٰؑ یہود کے مقابل میں حق پر تھے تو ہمارا معاملہ بھی صاف ہے ورنہ پہلے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کریں۔ بعد میں ہمارا معاملہ آئے گا۔

اگر واقعی طور پر ان یہودیوں کی طرح یہ یہودی بھی حق پر ہیں تو پھر اوّل تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ثبوت نہیں تو اُن کا آسمان سے آنا کجا؟ پس یا تو یہ مسلمان اس بات کو مان لیں کہ آسمان پر کوئی شخص زندہ نہیں جایا کرتا اور نہ ہی وہ دوبارہ واپس آیا کرتا ہے اور وہ اسی قاعدہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو دوسرے انبیاء کی طرح وفات پائے ہوئے مان لیں اور یا حضرت عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار کریں اور اس طرح پر اُن کی آمد کے متعلق تمام امیدوں سے ہاتھ دھولیں۔ غرض اُن کی منفرد اور خاص قسم کی زندگی ایک خطرناک قسم کا شرک ہے۔ غرض دوسری قسم کے دلائل عقلی تھے۔ سو اُن کی رُو سے بھی یہ قوم ملزم ہے[۱]

(۳) تیسرا ذریعہ ایک صادق کی شناخت کا اس کے ذاتی نشانات اور خارق عادت پیشگوئیاں ہوتی ہیں اور منہاج نبوت پر پرکھی جاتی ہیں۔ سو اس قسم کے دلائل بھی اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بہت جمع کر دیئے ہیں۔ کیا زمینی، کیا آسمانی، کیا مکانی، کیا زمانی، ہر قسم کے نشانات اُس نے خود ہمارے لیے ظاہر فرمائے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر پیشگوئیوں کا ظہور بھی ہو چکا ہے۔ آسمان نے ہمارے لیے گواہی دی۔ زمین ہمارے واسطے شہادت لائی اور ہزاروں خارق عادت ظہور میں آچکے ہیں۔ زمانہ ہے سو وہ زبانِ حال سے چلّا رہا ہے کہ ضرور کوئی آنا چاہیئے۔ قوم کے ۷۳ فرقے ہو چکے ہیں۔ یہ خود ایک حَکَم کو چاہتے ہیں۔ ان تمام فرقوں میں ایسے ایسے اختلاف پڑے ہیں کہ ایک دوسرے کو تکفیر کے فتوے لگائے جاتے ہیں اور ارتداد کا جُرم اُن میں سے ہر ایک کی گردن پر سوار ہے۔ حنفی وہابیوں کو اور وہابی حنفیوں کو جہنمی بتاتے ہیں۔ شیعہ ان سب کو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے کہتے ہیں۔ خارجی ہیں سو وہ شیعہ کی جان کے دشمن ہیں۔ غرض ہر ایک فرقہ دوسروں کے خون کا پیاسا ہے۔ اب اُن میں سے اختلاف کو دُور کرنے کے واسطے جو حَکَم آوے گا کیا وہ اُن کی مساوی باتوں کو مان لے گا؟ اگر ایسا کریگا تو دوسرا ناراض ہو جاوے گا۔ یہاں ہر ایک فرقہ یہی چاہتا ہے کہ میری اگر ساری باتیں وہ نہ مانے گا تو وہ خدا کی طرف سے نہ ہوگا۔ غرض ہر ایک نے اُس کے صدق کا معیار اپنے تمام عقائد کو مان لینا مقرر کیا ہوا ہے مگر کیا وہ ایسا ہی کریگا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ ہر ایک راستی کا حامی اور ناراستی کا دشمن ہوگا۔ اگر ایسا نہیں تو وہ حَکَم ہی کس کام کا ہوا؟ اور ایسے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کے وجود سے عدم بہتر ہے۔

اصل مشکل یہ ہے کہ ان بیچارے لوگوں کی عادت ہی ہو گئی ہے اور بچپن سے کان میں ہی یہی پڑتا آیا ہے کہ وہ اس طرح آسمان سے ایک مینار پر اُترے گا۔ پھر سیڑھی مانگیگا اور دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ

---

[۱] الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء

رکھ کر وہ نیچے اترے گا۔ پس آتے ہی نہ بحلی نہ بُری کفار کو تہ تیغ کر کے انکے اموال واملاک سب مسلمانوں کے حوالے کریگا وغیرہ وغیرہ۔

ان باتوں کو جو مدتوں سے سادہ لوح پر کندہ ہوگئی ہیں دُور کریں تو کس طرح؟ وہ بیچارے معذور ہیں۔ یہ مشکلات ہیں اور ان کا دُور ہونا بجز خدا تعالیٰ کی مشیت کے ہرگز ممکن نہیں۔

(قرآن نے) تَوَفَّيْتَنِي فرمایا اور بخاری نے اپنا مذہب اور اس آیت کے معنے بیان کر دیئے کہ مُتَوَفِّيكَ - مُمِيتُكَ۔ تو پھر اس کے بعد خواہ نخواہ ان کو زندہ آسمان پر بٹھانا ان لوگوں کی کیسی غلطی ہے وہ بیچارہ تو خود بھی دہائی دیتا ہے کہ یہ لوگ میرے مرنے کے بعد بگڑے ہیں بھلا اب ہمیں کوئی بتاوے کہ یہ لوگ ابھی بگڑے ہوئے ہیں یا نہیں اگر یہ بگڑے ہیں تو مسیح وفات پا چکے ہیں ورنہ اُن کے تثلیث کفارے اور دوسرے اعتقادات پر ایمان لاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرو۔ یہ جو اللہ تعالیٰ نے سُورۃ فاتحہ میں فرمایا ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ اس میں ہم نے غور کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے شخص میں دوقسم کی صفات کی ضرورت ہے۔ اوّل تو عیسوی صفات اور دوم محمدی صفات کی کیونکہ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں جب یہود نے شرارت کی تھی تو حضرت عیسٰیؑ اُن کے واسطے آئے تھے جب نصاریٰ کی شرارت زیادہ بڑھ گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف آور ہوئے تھے اور یہاں خدا تعالیٰ نے دونو کا فتنہ جمع کیا۔ اندرونی یہود اور بیرونی نصاریٰ جن کے لیے آنے والا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل بروز اور حضرت عیسٰیؑ کا پورا نقشہ ہونا چاہیئے تھا۔

حَکَم کا مقام

حَکَم کے سامنے کسی کی پیش ہی کیا جاتی ہے اور اس سے ان کی بحث ہی کیا۔ یہ زمینی وہ آسمانی۔ یہ ناقابلِ محض، وہ ہر وقت خدا سے تعلیم پاتا۔ یہ لوگ ہیں رطب و یابس احادیث اور اقوال کا انبار پیش کر کے ہرانا چاہتے ہیں مگر یہ کیا کریں ہمیں تو تیس سال ہوئے کہ خود خدا ہر وقت تازہ الہامات سے خبر دیتا ہے کہ یہ امرِ حق ہے جو تو لایا ہے۔ تیرے مخالف ناحق پر ہیں ہم اب کیا کریں۔ ان لوگوں کی مانیں یا آسمان سے خدا کی مانیں۔

سوچنے والے کے لیے کافی ہے کہ صدی کا سر بھی گذر گیا ہے اور تیرھویں صدی تو اسلام کے واسطے سخت منحوس صدی تھی۔ ہزاروں مرتد ہوگئے۔ یہود خصلت بنے اور جو ظاہر میں مرتد نہیں اگر باریک نظر سے دیکھا جاوے تو وہ بھی مُرتد ہیں اُن کے رگ و ریشے میں دجال نے اپنا تسلط کیا ہوا ہے۔ پوشاک تک ان کی بدل گئی ہے تو دل ہی نہ بدلے ہوں گے۔ صرف بعض خوف سے یا بعض اور وجوہات سے اظہار نہیں کرتے ورنہ ہیں وہ بھی مُرتد اپنے دین کی خبر نہ ہوئی دوسروں کے زیر اثر ہوئے تو اب ارتداد میں کسر ہی کونسی باقی رہ گئی۔ اگر اب بھی اُن کا

مہدی اور مسیح نہیں آیا تو کب آئے گا؟ جب اسلام کا نام ہی دُنیا سے اُٹھ جاویگا اور یہ بیڑا ہی غرق ہو جاویگا۔ افسوس کہ قوم آنکھیں بند کئے پڑی ہے اور اُسے اپنی حالت کی بھی خبر نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷ رمئی ۱۹۰۳ء)

---

۵ رمئی ۱۹۰۳ء

(بوقتِ سیر)

قبولِ حق کیلئے دُعا کرتے رہنا چاہیئے

نو وارد صاحب نے بیان کیا کہ رات کو مَیں نے خواب دیکھا کہ مَیں آپ سے سوال کر رہا ہوں کہ اگر آپ کو عیسٰی علیہ السلام تسلیم کیا جاوے اور ہم اس امر میں غلطی میں ہوں تو پھر آپ ذمہ دار ہیں۔ فرمایا:۔

اگر ہم نے یہ بار اپنے ذمہ نہ لیا ہوتا تو کئی لاکھ انسانوں کی دعوت کیسے کرتے؟ بلکہ خود خدا تعالیٰ نے یہ ذمہ داری لی ہے۔ جو ہم سے انکار کرتا ہے تو پھر اسے تمام سلسلہ نبوت سے انکار کرنا پڑیگا۔ مسیح علیہ السلام آئے تو اُس کو نہ مانا اور یہ حجت پیش کی کہ اس سے پیشتر الیاس نے آنا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہی جواب دیا کہ الیاس کی طبیعت اور خُو پر یحیٰی آگیا ہے اور یہی الیاس کا آنا ہے۔ غرضکہ اگر مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوں تو پھر وہ نشان کیسے ظاہر ہوتے ہیں جو کہ مسیح کے لیے مقرر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو یہود کا یہی اعتراض تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں ہو گا۔ خدا اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ اس کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے ہر ایک وقت پر عقلمند تو مانتے رہے اور بیوقوف ہمیشہ ضد کرتے رہے کہ سب باتیں پوری ہو لیں تو مانیں گے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے مراد مولوی ہیں کیونکہ ایسی باتوں میں اوّل نشانہ مولوی ہی ہوا کرتے ہیں۔ دنیا داروں کو تو دین سے تعلق ہی کم ہوتا ہے جب سے یہ سلسلہ نبوت کا جاری ہے یہ اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ مولویوں کے پاس جس قدر ذخیرہ رطب و یابس کا ہو وہ حرف بحرف پُورا ہوا ہو۔ دیکھ لو ان ہی باتوں سے ابتک یہود نے نہ مسیح کو مانا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ حق کو قبول کرنا ایک نعمتِ الٰہی ہے یہ ہر ایک کو نہیں ملا کرتی اس لیے ہمیشہ دُعا کرنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ اُسے قبول کرنے کی توفیق عطا کرے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۳۱ مورخہ ۱۵ رمئی ۱۹۰۳ء)

۶؍ مئی ۱۹۰۳ء

بوقت سیر

نووارد صاحب نے دریافت کیا کہ گھنگھریالے بالوں سے کیا مراد ہے؟

پیشگوئیوں میں ہمیشہ استعارات ہوتے ہیں

فرمایا کہ

احادیث ایک ظنّی شئے ہے۔ یہ ہرگز ثابت نہیں ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلا ہو وہ ضبط ہوا ہو۔ معلوم نہیں کہ اصل لفظ کیا ہو۔ پیشگوئیوں میں ہمیشہ استعارات ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب خبروں میں کوئی ایسی خبر موجود ہو جو ثابت شدہ واقعہ کے برخلاف ہو تو اُسے بہرحال ردّ کرنا پڑیگا۔ اس وقت جو فتنہ موجود ہے تم اس کی نظیر کسی زمانہ سالقہ میں دکھاؤ کہ کبھی ہوا ہے؟ پھر سب سے بڑا فتنہ تو یہ ہے اور ادھر دجّال کا فتنہ سب سے بڑا رکھا گیا ہے اور دجّال کے معنے بھی لُغت سے معلوم ہوگئے تو اب شک کی کونسی جگہ باقی رہ گئی ہے؟

پھر ہم کہتے ہیں کہ اگر استعارات صرف دجّال کے معاملہ میں ہوتے اَور کسی جگہ نہ ہوتے تو پھر بھی کسی کو کلام ہوتا کہ تم کیوں تاویل کرتے ہو مگر دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ خود قرآن شریف اور نیز احادیث بھی استعارات سے بھرے پڑے ہیں اور نہ ہی اس امر کی ضرورت ہے کہ ہر ایک استعارہ کی حقیقت کھولی جاوے کیا آج تک دنیا کے سب امور کسی نے جان لیے ہیں جو اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ ایک ایک لفظ کی حقیقت بتلاؤ۔ دستور ہے کہ موٹے موٹے امور کو انسان سمجھ کر باقی کو اس پر قیاس کر لیتا ہے۔[1]

توفّی

توفّی کا لفظ صرف انسانوں پر ہی آتا ہے دیگر حیوانات پر استعمال نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت دہریہ طبع لوگ بھی تھے جو کہ حشر و نشر کے قائل نہ تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ کوئی شئے انسان کی باقی نہیں رہتی۔ اس لفظ کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ رُوح کو ہم اپنی طرف قبض کر لیتے ہیں اور باقی رہتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا وہاں معنی قبض رُوح کے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی معنے نہیں ہوتے۔[2]

---

[1] البدر جلد ۲ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۳۲ میں ۶؍ اپریل ۱۹۰۳ء کی تاریخ لکھی ہے جو سہو معلوم ہوتا ہے ترتیب مضمون اور ترتیب ڈائری کے لحاظ سے دراصل یہ ۶؍ مئی کی ڈائری ہے۔ ۶؍ اپریل کی ڈائری تو البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۰۶ و ۱۰۷ میں درج ہے۔ (مرتب)

[2] البدر جلد ۲ نمبر ۱۷ صفحہ ۱۳۲ مورخہ ۱۵؍ مئی ۱۹۰۳ء

تحصیل حاصل ؟

سوال ۔ جب ایک شخص نے ایک بات تحصیل کی ہے تو دوبارہ اسی کے تحصیل کرنے سے کیا حاصل ہے ؟

جواب ۔ ہم اِس اصول کو لانُسلّم کہتے ہیں ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے ۔ قرآن میں لکھا ہے ۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ۔ (الاعراف : ۱۷۳) یعنی جب رُوحوں سے خدا تعالیٰ نے سوال کیا کہ کیا مَیں تمہارا ربّ نہیں ہوں تو وہ بولیں کہ ہاں ۔ تو اب سوال ہو سکتا ہے کہ روحوں کو علم تو تھا تو پھر انبیاء کو خدا تعالیٰ نے کیوں بھیجا گویا تحصیل حاصل کرائی ۔ یہ اصل میں غلط ہے ۔ ایک تحصیل پھیکی ہوتی ہے ایک گاڑھی ہوتی ہے ۔ دونوں میں فرق ہوتا ہے وہ علم جو کہ نبیوں سے ملتا ہے ۔ اس کی تین اقسام ہیں ۔

علم الیقین ۔ عین الیقین ۔ حق الیقین ۔

اس کی مثال یہ ہے ۔ جیسے ایک شخص دُور سے دھواں دیکھے تو اسے علم ہوگا کہ وہاں آگ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاں آگ ہوتی ہے وہاں دھوآں بھی ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں ۔ یہ بھی ایک قسم کا علم ہے جس کا نام علم الیقین ہے مگر اَور نزدیک جا کر وہ اس آگ کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو اُسے عین الیقین کہتے ہیں ۔ پھر اگر اپنا ہاتھ اس آگ پر رکھ کر اس کی حرارت وغیرہ کو بھی دیکھ لیوے ۔ تو اُسے کوئی شبہ اس کے بارے میں نہ رہے گا اور اس طرح سے جو علم اُسے حاصل ہوگا اس کا نام حق الیقین ہے ۔ اب کیا ہم اسے تحصیل حاصل کہہ سکتے ہیں ۔ ہرگز نہیں [۱] (البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۳۷ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء)

دربار شام

نزولِ وحی کا طریق

فرمایا کہ

وحی کا قاعدہ ہے کہ اجمالی رنگ میں نازل ہوا کرتی ہے اور اُس کیساتھ ایک تفہیم ہوتی ہے مثلاً جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو ساتھ کشفی رنگ میں نماز کا طریق ، اس کی رکعات کی تعداد ، اوقات نماز وغیرہ بتا دیا گیا تھا ۔ علیٰ ہذا القیاس ۔

جو اصطلاح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کی تفصیل اور تشریح کشفی رنگ میں ساتھ ہوتی ہے ۔ جن لوگوں کو وہ

---

[۱] نوٹ از ایڈیٹر :۔ دراصل سائل کا مطلب یہ تھا کہ جس حالت میں ہمارے پاس قرآن موجود ہے تو اب ہمیں بیعت کی کیا ضرورت ہے ؟ وہی نماز روزہ وہاں ادا کرنا ہے ۔ وہی بلا بیعت ادا کرنا ہے گویا تحصیل حاصل ہے مگر حضرت اقدس نے کھول کر بتلا دیا کہ تحصیل کے مدارج ہیں ۔ چنانچہ اس فلسفہ کو سمجھ کر آخر سائل نے حضرت اقدس کی بیعت کر لی ۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۳۷ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء)

اس وحی کے منشاء سے آگاہ کرتا ہے اور اسکو دوسرے کے دلوں میں داخل کرتا ہے. جب سے دُنیا ہے وحی کا یہی طرز چلا آیا ہے اور کل انبیاء علیہم السلام کی وحی اسی رنگ کی تھی۔ وحی کشفی تصویروں یا تفہیم کے سوا کبھی نہیں ہوتی اور نہ وہ اجمال بجز اس کے کسی کی سمجھ میں آسکتا ہے [1]

مُد میں پیشگوئی کے مطابق تباہی

مُد سے خبر آئی ہے کہ اس جگہ آبادی کچھ اُوپر دوسَو آدمی کی ہے اور ابتک ایک سو تین آدمی مر چکے ہیں اور چار پانچ روز مرتے ہیں۔ اس پر حضرت اقدس نے حکم دیا کہ اخباروں میں مُد کے متعلق پیشگوئی مندرجہ قصیدہ اعجاز احمدی کو شائع کر کے دکھائیں اور مولوی ثناء اللہ وغیرہ کو آگاہ کریں کہ وہی الفاظ جن پر وہ مقدمہ بنوانا چاہتا تھا خدا تعالیٰ اب پورے کر رہا ہے۔ اب وہ لوگ سوچیں کہ وہ حق تھا یا نہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۸ اصفحہ ۲ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۷ مئی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

عورتوں کے حقوق

فرمایا کہ:۔

عورتوں کے حقوق کی جیسی حفاظت اسلام نے کی ہے ویسی کسی دوسرے مذہب نے قطعاً نہیں کی۔ مختصر الفاظ میں فرما دیا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرۃ: ۲۲۹) کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں ویسے ہی عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ بعض لوگوں کا حال سُنا جاتا ہے کہ ان بیچاریوں کو پاؤں کی جُوتی کی طرح جانتے ہیں اور ذلیل ترین خدمات ان سے لیتے ہیں. گالیاں دیتے ہیں۔ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور پردہ کے حکم ایسے ناجائز طریق سے برتتے ہیں کہ ان کو زندہ در گور کر دیتے ہیں۔ چاہیئے کہ بیویوں سے خاوند کا ایسا تعلق ہو جیسے دو سچے اور حقیقی دوستوں کا ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاق فاضلہ اور خدا تعالیٰ سے تعلق کی پہلی گواہ تو یہی عورتیں ہوتی ہیں۔ اگر ان ہی سے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ سے صلح ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ

---

[1] البدر سے:۔ "جب سے دُنیا شروع ہے وحی سوائے کشفی حالت کے ہوتی ہی نہیں ہے۔ ورنہ پھر یہ اعتراض ہوگا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خائن تھے یا اپنی طرف سے بنا کر تبلا دیا کرتے تھے؟ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ ان کے دل میں ڈالتا تھا وہ دوسرے کے دل میں ڈال دیتے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۸ صفحہ ۱۳۷ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء)

تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل کے لیے اچھا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۳۷ مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۰۳ء ✤ الحکم جلد ۷ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۸ مئی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

محمد حسین بٹالوی اور قرآن کریم کی بے ادبی

"بہ ظاہری تُک بندی تو مسیلمہ نے بھی کرلی تھی اس میں قرآن شریف کی خصوصیت کیا ہے"۔ یہ ایک کلمہ ہے جو کہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اول المکفرین کی قلم سے قرآن کریم کی شان میں نکلا ہے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:-

اس سے بڑھ کر کیا بے ادبی ہوگی کہ قرآن شریف کی آیات کو جو کہ ہر ایک پہلو اور ہر ایک رنگ کیا بلحاظ ظاہر اور کیا بلحاظ باطن کے معجزہ ہے "تُک بندی" کہا جاتا ہے۔ جیسے قرآن شریف کا باطن معجزہ ہے ویسے ہی اس کے ظاہر الفاظ اور ترتیب بھی معجزانہ ہے۔ اگر ہم اس کے ظاہر کو معجزہ نہ مانیں تو پھر باطن کے معجزہ ہونے کی دلیل کیا ہوگی؟ ایک انسان کا اگر ظاہر بھی گندہ ناپاک اور خبیث ہوگا تو اس کی رُوحانی حالت کیسے اچھی ہو سکتی ہے؟ عوام الناس اور موٹی نظر والوں کے واسطے تو ظاہری خوبی ہی معجزہ ہو سکتی ہے اور چونکہ قرآن ہر ایک قسم کے طبقہ کے لوگوں کے واسطے ہے اس لیے ہر ایک رنگ میں یہ معجزہ ہے۔ مامور من اللہ کی عداوت کا نتیجہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۳۷-۱۳۸ مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۰۳ء)

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۹ مئی ۱۹۰۳ء

بوقت سیر

وبا کے علاقے سے نکلنا

عام لوگوں کا خیال ہے کہ وبا سے بھاگنا نہ چاہیئے۔ یہ لوگ غلطی کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر وبا کی ابتدا ہو تو بھاگ جانا چاہیئے اور اگر کثرت سے ہو تو پھر نہیں بھاگنا چاہیئے۔ جس جگہ وبا ابھی شروع نہیں ہوئی تب تک اس حصہ والے

اس کے اثر سے محفوظ ہوتے ہیں اور اُن کا اختیار ہوتا ہے کہ اس سے الگ ہو جاویں اور توبہ اور استغفار سے کام لیویں۔

جماعتِ احمدیہ اور طاعون

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ نشان بھی ہوتے ہیں اور ان میں التباس بھی ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگا گیا تو کہا کہ خدا قادر ہے خواہ آسمان سے نشان دکھلاوے یا بعض کو بعض سے جنگ کرا کر نشان دکھاوے[1] چنانچہ جنگوں میں صحابہؓ بھی شہید ہوئے بعض کمزور ایمان والوں نے اعتراض کیا کہ اگر یہ عذاب ہے تو ہم میں سے کیوں مرتے ہیں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ (آل عمران : ۱۴۱) پس اگر ہماری جماعت میں سے کوئی بھی نہ مرے اور کُل قومیں مرتی رہیں تو کُل دُنیا ایک ہی دفعہ راہِ راست پر آجاوے اور بجز اسلام کے اَور کوئی مذہب دنیا پر نہ رہے حتٰی کہ گورنمنٹوں کو بھی مسلمان ہونا پڑے[2] اور یہی بہتر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ بھی فوت ہوئے تھے۔ ہاں سلامتی کا حصہ نسبتاً ہماری طرف زیادہ رہے گا۔ براہین احمدیہ میں بھی لکھا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔ (الانعام : ۸۳)

اب خدا جانے کہ کون ظلم سے خالی ہے کسل اور غفلت بھی ظلم ہے مگر تاہم دعا کرنا ضروری ہے۔ اس جماعت کا قطعاً محفوظ رہنا یہ الفاظ کہیں ہم نے نہیں لکھے اور نہ یہ سنت اللہ ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر تو اکراہ فی الدین ہو جاتا ہے جب سے انبیاء پیدا ہوئے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ احمقوں کو ان بھیدوں کی خبر نہیں۔ خدا تعالیٰ کا وعدہ نسبتاً حفاظت کا ہے نہ کہ کلّیتہً[3] پھر بھی یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری جماعت کا ایک مرتا ہے تو اس کے

---

[1] الحکم میں مزید لکھا ہے:۔ "آخر جو لڑائیاں ہوئیں وہ بھی تو نشان ہی تھے اور وہ منکروں اور کافروں کیلئے عذاب لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا صحابہؓ میں سے کوئی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مارا گیا؟" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ صفحہ ۹ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۳ء)

[2] الحکم میں مزید لکھا ہے:۔ "اور بجز اسلام کے اَور کوئی مذہب ہی نہ رہے حالانکہ ایسا نہیں ہوگا۔ دوسرے مذاہب بھی قیامت تک باقی رہیں گے۔ خدا تعالیٰ نشانوں میں قیامت کا نمونہ دکھانا نہیں چاہتا اور نہ کبھی ایسا ہوا، بلکہ اُن میں کسی حد تک اخفا ضرور ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ میں سے بھی بعض ان جنگوں میں شہید ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تکلیف پہنچی، لیکن انجام نے دکھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نشان کیسا عظیم الشان تھا۔ اسی طرح یہاں پر بھی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ صفحہ ۹ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۳ء)

[3] (الحکم سے) "اس لیے دُعا کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ بالکلیہ حفاظت کا وعدہ کہیں نہیں ہے بلکہ الہامات میں استثنا کے الفاظ قریباً موجود ہیں اس جماعت کے قطعاً محفوظ رہنے کا وعدہ نہیں بلکہ نسبتاً ہے اور سنت اللہ بھی یہی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ طاعون سے کون گھٹتا اور کون بڑھتا ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ صفحہ ۹ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۳ء)

بدلے تین سَو آجاتے ہیں۔ انجام ہمیشہ متقیوں کے واسطے ہی ہوتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ ایسا کُھلا کُھلا فرق کردیوے تو مَیں نہیں جانتا کہ مذہبی اختلاف ایک ذرّہ بھر بھی رہ جاوے حالانکہ اس اختلاف کا قیامت تک ہونا ضروری ہے۔

بعض لوگ ہماری جماعت میں سے بھی غلطی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی نہ مریگا یہ ان کو مغالطہ لگا ہے ایسا ہرگز ہو نہیں سکتا۔ اگرچہ ایک حد تک خدا تعالیٰ نے وعدے کئے ہوئے ہیں مگر ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جماعت سے مطلقاً کوئی بھی نشانہ طاعون نہ ہو۔ یہ بات ہماری جماعت کو خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہرگز نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نہ مریگا۔ ہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (الرعد : ۱۸) پس جو شخص اپنے وجود کو نافع الناس بناویں گے ان کی عمریں خدا تعالیٰ زیادہ کریگا۔ خدا تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت بہت کرو اور حقوق العباد کی بجا آوری پورے طور پر بجا لانی چاہیئے۔

نوحؑ اور مسیح موعود کے حالات کا فرق

اعتراض ہوا کہ نوحؑ کی کشتی پر چڑھنے والے سب کے سب طوفان سے محفوظ رہے تھے تو کیا وجہ ہے کہ جو لوگ یہاں بیعت میں ہیں وہ محفوظ نہ رہیں۔

جواب۔ فرمایا کہ" ہمارا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم ہے۔ نوحؑ کے وقت ایمان کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور اس وقت کوئی التباس ایمان کا نہ تھا مگر اب ہے نوحؑ کے وقت یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اب قوم تو ضرور ہلاک ہونے والی ہے۔ خواہ ایمان لاوے خواہ نہ لاوے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت مہلت دی گئی کہ جو توبہ کریگا وہ بچ جاویگا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عین قتل کے وقت فرمایا کہ اگر کوئی ایمان لاوے تو تلوار روک لی جاوے۔ مگر نوحؑ کی قوم کے واسطے تھا کہ صرف کشتی والے بچائے جاویں گے باقی سب تباہ اور ہلاک ہوں گے۔ وہ صورت خاص اور الگ تھی اور اعتراض تو خود نوحؑ پر بھی تھا کہ اس نے کہا تھا کہ میرے اہل بچے رہیں گے مگر پھر بھی مخالفوں کو یہ کہنے کی گنجائش رہی کہ نوحؑ اپنے بیٹے کو نہ بچا سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوح کو بھی شُبہ پیدا ہوا تھا تب ہی تو اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زجر ہوا۔ پھر دیکھو باوجود نبی ہونے کے اُن کو دھوکا لگا اور یہ معاملہ اسی طرح سے ہوا کہ مخالفین تو درکنار خود نُوح کو ہی شکوک پیدا ہوگئے۔ خدا تعالیٰ اپنے رُعب اور خوف کو دُور نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آج وہ کُھلا وعدہ دے دے کہ جماعت میں سے کوئی نہ مریگا تو پھر اس کا خوف دلوں میں نہ رہے۔ جہاں خاص گھر کا اس نے وعدہ کیا ہے کہ اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ وہاں بھی ایک فقرہ ساتھ رکھ دیا ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ عَلَوْا بِاسْتِکْبَارٍ۔

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا رجوع کب ہوگا؟

فرمایا:۔ دیکھو بچہ جب پیٹ میں ہوتا ہے تو

اگرچہ زندہ ہوتا ہے مگر تاہم خوشی پر ہنس نہیں سکتا اور تکلیف پر رو نہیں سکتا۔ بلاؤ تو بولتا نہیں۔ مگر جب باہر آتا ہے تو اس کو حواس مل جاتے ہیں۔ ہنستا بھی ہے روتا بھی ہے بلانے سے بولتا بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول زندگی جو کہ پیٹ میں تھی وہ اصل اور حقیقی زندگی نہ تھی۔ حواس اس میں نہ تھے۔ جب خدا تعالیٰ ایک بات ڈالتا ہے تو حواس آجاتے ہیں۔ یہی حال مولوی محمد حسین صاحب کا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات دل میں ڈال جاوے گی تو اسی وقت تبدیلی ہو جاوے گی۔

جو بُلائے جاتے ہیں وہ آتے ہیں اور جو بلائے نہیں جاتے وہ کفر میں ترقی کرتے ہیں اگر قرآن شریف نہ آتا تو ابو جہل اعلیٰ درجہ کے لوگوں میں شمار ہوتا۔ اسی طرح صدہا آدمیوں کو ہم صلحا سمجھتے ہیں مگر جب ان کے سامنے حق پیش کیا گیا اور انہوں نے انکار کیا تو معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک اُن میں صلاحیت نہ تھی۔ کسی کے باطن کا کسی کو کیا علم؟ مگر حق پیش کرنے پر حقیقت کھل جاتی ہے کہ خدا کی آواز سننے والے کون ہیں اور اس سے انکار کرنیوالے کون؟

ایک غیر معمولی مجلس

کل سے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صاحب گورداسپور سے دورہ پر اور تحصیلدار صاحب بٹالہ سے مینار کی تعمیر کے ملاحظہ کے واسطے تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت اقدس علیہ السلام جب سیر سے واپس تشریف لائے تو کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد ہر دو عہدیدار صاحبان نے حضرت اقدس سے ملاقات کی۔ طاعون پر ذکر اذکار ہوتے رہے اور مینار کے متعلق بھی تحصیلدار صاحب نے چند امور استفسار کئے۔ اس موقعہ پر جو حضرت اقدس نے ارشاد فرمایا اُسے ہم یکجائی طور پر درج کر دیتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

طاعون

طاعون کے تجربہ کے سوال پر فرمایا کہ

اس کے تجربہ کا موقعہ ابھی بہت ہے حکماء نے لکھا ہے کہ اس کا دورہ ستر ستر برس تک ہوا کرتا ہے۔ بڑے بڑے حکماء نے پچاس ساٹھ برس تک اس کے دورہ کا مشاہدہ لکھا ہے۔ لیکن خدا جانے کہ بعد میں اس کے کیا تجارب ہوں۔ یہ کہنا کہ تجربہ ہوا ہے کہ کھلی ہوا میں اس کے کیڑے زیادہ ہوتے ہیں ٹھیک نظر نہیں آتا کیونکہ علاقہ بمبئی میں اس نے سب سے پہلے زیادہ حصہ شہر بمبئی کا ہی پسند کیا تھا۔ شاید یہ بات بعد میں بدل جائے۔ ہم اس رائے کو اس وقت قبول کرتے ہیں جب طاعون کی رفتار بھی اُسے قبول کرے۔ جیسے حکام کے دورے ہوتے ہیں اسی طرح اس کے بھی دورے ہوتے ہیں کسی جگہ پر عود کرتی ہے اور کسی جگہ نہیں لیکن اس پر بھی زور نہیں دیا جا سکتا۔ شاید ایک ہی جگہ بار بار آجاوے۔ پہلا تجربہ یہ ہے کہ انہوں

نے لکھا ہے کہ یہ اپنی عمر پوری کر کے خود بخود ہی چھوڑ جاتی ہے۔

طاعون کا باعث

سوال ہوا کہ طاعون کا اصل باعث کیا ہے؟ فرمایا کہ:۔

مَیں اس مجلس میں اس کا ذکر اس لیے پسند نہیں کرتا کہ مذہبی رنگ کے مسائل کو لوگ کم سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اس کی نافرمانی کا نتیجہ ہے۔ قاعدہ کی بات ہے جب انسان اپنی عقل پر بہت بھروسہ کرتا ہے تو ہر شیئ کا انکار کر دیتا ہے حتٰی کہ خدا تعالیٰ سے بھی منکر ہو جاتا ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ آج کل کے جنٹلمین دینی بات کرنے والے کو بیوقوف کہہ دیتے ہیں۔ لیکن یقین ہے کہ اب زمانہ خود بخود مئودب ہو جائے گا۔ نرے ارضی اسباب ہی اس طاعون کے موجد نہیں ہیں۔ آخر اس کے کیڑے کسی پیدا کرنیوالے کی وجہ سے ہی پیدا ہوئے ہیں اور وہ زمانہ قریب ہے کہ لوگوں کو اس کی ہستی کا پتہ لگ جاویگا ابھی تک لوگوں کو عبرت کامل نہیں ہوئی ہے۔ طاعون کی گذشتہ چال سے پتہ چلتا ہے کہ اول عوام پر پھر خواص پر پھر ملوک پر حملہ کرتی ہے اور اس کے اصل اسباب کا معمہ تو خدا خود ہی کھولے گا۔ مَیں نے اس کی خبر آج سے بائیس سال پیشتر دی ہے۔ پھر سات سال کے بعد دی۔ پھر اس وقت دی جب ایک دو ضلعوں میں یہ تھی۔ قرآن میں، انجیل میں، دانیال نبی کی کتاب میں اس کا ذکر ہے۔ غرض قبل از وقت ہم اس کی نسبت کُھل کر بات نہیں کرتے کیونکہ اس پر ہنسی کی جاوے گی۔ جب خدا تعالیٰ اس کا پورا دورہ خود ختم کرے گا تو اس وقت آپ ہی لوگوں کو پتہ لگ جاوے گا۔

اطباء نے لکھا ہے کہ جب موسم جاڑے یا گرمی کی طرف حرکت کرتا ہے تو اس وقت یہ زیادہ ہوتی ہے مگر ابھی تو موسم اتنی شدت گرمی کا نہیں ہے لیکن اگر مئی کے گذرنے پر یہی حال رہا تو شاید یہ قاعدہ بھی ٹوٹ جاوے مگر اصل بات کا علم تو خدا تعالیٰ ہی کو ہے۔

اکثر جگہ چوہے کثرت سے مرتے ہیں تو وہاں طاعون کا اندیشہ ہوتا ہے مگر ہمارے گھر میں دو بلیاں ہیں اور وہ کوئی چوہا نہیں چھوڑتیں۔ شاید یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک علاج ہو۔

طاعون کا حقیقی علاج

سوال ہوا پھر اس کا علاج کیا ہے؟ فرمایا:۔

ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ بجز تقویٰ طہارت اور رجوع الی اللہ کے اور کوئی چارہ نہیں گو لوگ اسے دیوانہ پن سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ دُنیا خود بخود نہیں ہے۔ ایک خالق اور مدبر کے ماتحت یہ چل رہی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ زمین پر پاپ اور گناہ بہت بڑھ گیا ہے تو وہ تنبیہہ نازل کرتا ہے اور جب رجوع الی اللہ ہو تو پھر اُسے اُٹھا لیتا ہے، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ بہت بیباک ہیں اور اُن کو ابھی تک کچھ پروا نہیں ہے۔

منارۃ المسیح کی غرض

سوال ہوا کہ منار کیوں بنوایا جاتا ہے؟ فرمایا کہ:۔
اس منار کی تعمیر میں ایک یہ بھی برکت ہے کہ اس پر چڑھ کر خدا تعالیٰ کا نام لیا جاوے گا اور جہاں خدا تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے وہاں برکت ہوتی ہے چنانچہ آجکل اسی لیے سکھوں نے بھی اذانیں دلوائی ہیں اور مسلمانوں کو اپنے گھروں میں بُلا کر قرآن پڑھوایا ہے پھر اس کے اوپر ایک لالٹین بھی نصب کی جاوے گی جس کی روشنی دُور دُور تک نظر آوے گی۔

سُنا گیا ہے کہ روشنی سے بھی طاعونی مواد کا دفعیہ ہوتا ہے اور ایک گھنٹہ بھی اس پر لگایا جاوے گا۔ اس کی بلندی کی نسبت ہم کہہ نہیں سکتے۔ ابھی سرمایہ نہیں ہے۔ سرمایہ پر دیکھا جاویگا کہ کس قدر بلند ہوگا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ لوگ اس پر چڑھ کر چارپائیاں بچھاویں گے کیونکہ ایک تو وہ مخروطی شکل کا ہوگا اور گھنٹہ کی وجہ سے اُسے بند رکھا جاویگا کہ لوگ چڑھ کر اُسے خراب نہ کر دیویں۔

مجھے حیرت ہے کہ یہاں کے ہندوؤں کے ساتھ ہم نے آج تک برادرانہ برتاؤ رکھا ہے اور یہ لوگ ہمارے منار کی تعمیر پر اس قدر جوش و خروش ظاہر کر رہے ہیں۔ اس مسجد کو ہمارے مرزا صاحب (والد صاحب) نے سات سو روپے کو خریدا تھا اور اس منار کی تعمیر میں صرف مسجد ہی کے لیے مفید بات نہیں ہے بلکہ عوام کو بھی فائدہ ہے یہ خیال کہ اس سے بے پردگی ہوگی یہ بھی غلط ہے۔ اب ہمارے سامنے ڈپٹی شنکرداس صاحب کا گھر ہے اور اس قدر اُونچا ہے کہ آدمی اُوپر چڑھے تو ہمارے گھر میں اُسکی نظر برابر پڑتی ہے۔ تو کیا اب ہم کہیں کہ اُسے گرا دیا جاوے؟ بلکہ ہم کو چاہیئے کہ اپنا پردہ خود کر لیویں۔

ان لوگوں کو چاہیئے تھا کہ مذہبی اُمور میں ہم سے دلبستگی ظاہر کرتے اور اس امر میں ہماری امداد کرتے۔ اگر یہ لوگ اپنا معبد بلند کرنا چاہیں تو کیا ہم اُسے روک سکتے ہیں؟

یہ خیال کہ مسجد یہاں ہو اور منار کہیں باہر ہو ایک قسم کی ہنسی ہے اور اس وقت قبولیت کے قابل ہے کہ اوّل مسجد باہر نکال دی جاوے پھر منار بھی باہر ہو جاوے گا۔ یہ قبر ہمارے مرزا صاحب کی ہے۔ انہوں نے نزول[1] سے زمین خرید کر اس مسجد کو تعمیر کرایا تھا اور اپنی موت سے ۲۲ دن پہلے اپنی اس قبر کا نشان بتلایا کہ اس جگہ ہو۔

مجھے ان لوگوں پر بار بار افسوس آتا ہے کہ ہمارے دل میں تو ان کی ہمدردی ہے۔ بیماریوں میں ہم ان کا علاج کرتے ہیں۔ ہر ایک ان کی مصیبت میں شریک ہوتے ہیں۔ انہیں سے پوچھا جاوے کہ کبھی ان کے مذہبی معاملات میں مَیں نے اُن سے نقیض کی ہے؟ دنیاوی معاملات تو الگ ہوتے ہیں لیکن مذہبی

---

[1] نقل مطابق اصل

معاملات میں شرافت کا برتاؤ ہوا کرتا ہے۔ ان کو لازم تھا کہ ایسی باتیں نہ کرتے جو آپس کی شکر رنجی کا موجب ہوتیں اس مینار کی بنیاد پر گیارہ سو روپیہ خرچ آیا ہے۔ تین برس سے اس کا ابتدائی کام شروع ہے۔ چنانچہ "الحکم" میں اس کا اعلان موجود ہے اگر ہمارا چار ہزار روپے کا نقصان ہو۔ پھر ان کو یہ روپیہ مل جاوے تو بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ خیر ہمسائیوں کو فائدہ پہنچا۔ لیکن ابھی تو مینار خیالی پلاؤ ہے جوں جوں روپیہ آویگا بنتا رہے گا۔ جب وہ مکمل ہو جاوے تو پھر کوئی اعتراض کی بات ہو تو اعتراض ہو سکتا ہے۔

میں ایسا فعل کیوں کرنے لگا جس سے اَوروں کو بھی نقصان ہو اور مجھے بھی۔ ہماری پردہ داری سب سے اعلیٰ ہے۔ اگر کوئی مینار پر چڑھے گا تو جیسے اَوروں کے گھر میں نظر پڑ سکتی ہے ویسی ہی ہمارے گھر میں بھی پڑ سکتی ہے تو کیا ہم گوارا کریں گے کہ یہ بات ہو؟ بہرحال جب یہ بن جاویگا تو لوگ سمجھ لیویں گے کہ اُن کو اس سے کس قدر فائدہ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء)

گوشت خوری

چونکہ انسان جلالی جمالی دو نو رنگ رکھتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ گوشت بھی کھائے اور دال وغیرہ بھی کھائے۔ ۲۲/۱۰/۱۹۰۰ [۱]

بلا تاریخ

اچھوتا نکتہ

عبادت اور احکامِ الٰہی کی دو شاخیں ہیں۔ تعظیم لامر اللہ اور ہمدردی مخلوق۔ مَیں سوچتا تھا کہ قرآن شریف میں تو کثرت کے ساتھ اور بڑی وضاحت سے ان مراتب کو بیان کیا گیا ہے مگر سورہ فاتحہ میں ان دونوں شقوں کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ مَیں سوچتا ہی تھا کہ فی الفور میرے دل میں یہ بات آئی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے یعنی ساری صفتیں اور تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جو ربّ العالمین ہے۔ یعنی ہر عالم میں نطفہ میں اور مضغہ وغیرہ میں سارے عالموں کا ربّ ہے۔ پھر رحمٰن ہے۔ پھر رحیم ہے اور مالک یوم الدین ہے۔ اب اس کے بعد اِیَّاكَ نَعْبُدُ جو کہتا ہے تو گویا اس عبادت میں وہی ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالک یوم الدین کی صفات کا پرتو انسان کو اپنے اندر لینا چاہیئے کیونکہ کمال عابد انسان کا یہی ہے تَخَلَّقُوْا

---

[۱] حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ پُرانے ملفوظات الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ کے صفحہ ۳ پر درج ہیں۔ گوشت خوری والے حصہ کے آخر میں ۲۲/۱۰/۱۹۰۰ کی تاریخ درج ہے۔ مگر "اچھوتا نکتہ" اور "معجزات کے تین اقسام" جو مضامین اگلے صفحات پر درج ہیں ان کی کوئی تاریخ درج نہیں۔ (مرتّب)

بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ میں رنگین ہو جاوے۔ پس اس صورت میں یہ دونو امر بڑی وضاحت اور صفائی سے بیان ہوئے۔

بلا تاریخ

معجزات کے تین اقسام

فرمایا:-
معجزات تین اقسام کے ہوتے ہیں:-

(۱) دُعائیہ (۲) ارہاصیہ (۳) قوتِ قدسیہ

ارہاصیہ میں دُعا کو دخل نہیں ہوتا۔ قوتِ قدسیہ کے معجزات ایسے ہوتے ہیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی میں انگلیاں رکھدیں اور لوگ پانی پیتے رہے یا ایک تلخ کوئیں میں اپنا لب گرادیا اور اس کا پانی میٹھا ہو گیا۔ مسیح کے معجزات میں بھی یہ رنگ پایا جاتا ہے۔ خود ہم کو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

مسیح کے معجزات کے متعلق جو ہم نے عمل الترب کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ تعالےٰ نے خلقی طور پر انسان کی فطرت میں ودیعت کی ہیں وہ توجہ سے سرسبز ہوتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ مسیح کے معجزات کو مکروہ کہا ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ بعض اوقات ایک امر جائز ہوتا ہے اور دوسرے وقت نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۳ء)

بلا تاریخ[1]

تکمیل ہدایت اور تکمیل اشاعتِ ہدایت

جب ہم اس ترتیب کو دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو مقصد ہی بیان فرمائے ہیں تکمیل ہدایت اور تکمیل اشاعت ہدایت اور اول الذکر تکمیل چھٹے دن یعنی جمعہ کے دن ہوگی۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ (المائدہ: ۴) اسی دن نازل ہوئی اور دوسری تکمیل کے لیے بالاتفاق مانا گیا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں ہوگی۔ چنانچہ سب مفسروں نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے جبکہ پہلی تکمیل چھٹے دن ہوئی تو دوسری تکمیل بھی چھٹے دن ہی ہوگی اور قرآن شریف میں ایک دن ایک ہزار برس کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسیح موعود چھٹے ہزار میں ہوگا۔

---

[1] یہ ملفوظات بھی "الحکم" میں بلا تاریخ شذرات کی صورت میں دُرج ہیں۔ (مرتّب)

بلا تاریخ

بہترین دُعا

بہترین دعا وہ ہوتی ہے جو جامع ہو تمام خیروں کی اور مانع ہو تمام مضرات کی۔ اس لیے اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی دُعا میں آدمؑ سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک کے کل منعم علیہم لوگوں کے انعامات کے حصول کی دُعا ہے اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں ہر قسم کی مضرتوں سے بچنے کی دُعا ہے۔ چونکہ مغضوب سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاری بالاتفاق ہیں تو اس دعا کی تعلیم کا منشا صاف ہے کہ یہود نے جیسے بیجا عداوت کی تھی۔ مسیح موعود کے زمانہ میں مولوی لوگ بھی ویسا ہی کریں گے اور حدیثیں اس کی تائید کرتی ہیں یہانتک کہ وہ یہودیوں کے قدم بہ قدم چلیں گے۔

بلا تاریخ

رُوح القدس کے فرزند

اَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرۃ : ۲۵۴) میں مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ رُوح القدس کے فرزند تمام وہ سعادتمند اور راستباز ہیں جن کی نسبت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (الحجر : ۴۳) وارد ہے۔ قرآن کریم سے دو قسم کی مخلوق ثابت ہوتی ہے۔ اوّل وہ جو روح القدس کے فرزند ہیں دوسرے وہ جو شیطان کے فرزند ہیں پس اس میں مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں۔

بلا تاریخ

دوزخ دائمی نہیں

ہمارا ایمان یہی ہے کہ دوزخ میں ایک عرصہ تک آدمی رہیگا پھر نکل آئے گا۔ گویا جن کی اصلاح نبوت سے نہیں ہو سکی ان کی اصلاح دوزخ کریگا۔ حدیث میں آیا ہے یَاْتِیْ عَلٰی جَھَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ۔ یعنی دوزخ پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اسمیں کوئی متنفس نہیں ہوگا اور نسیم صبا اس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ صفحہ ۳ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء)

بلا تاریخ

استفسار اور انکے جواب[۱]

سوال :۔ کبھی نماز میں لذت آتی ہے اور کبھی وہ لذت جاتی رہتی ہے اس کا کیا علاج ہے ؟

۱؎ یہ ملفوظات بھی "الحکم" میں بلا تاریخ شذرات کی صورت میں درج ہیں۔ (مرتب)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جواب:۔ ہمت نہیں ہارنی چاہیئے بلکہ اس لذّت کے کھوئے جانے کو محسوس کرنے اور پھر اس کو حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جیسے چور آوے اور وہ مال اُڑا کر لے جاوے تو اس کا افسوس ہوتا ہے اور پھر انسان کوشش کرتا ہے کہ آئندہ اس خطرہ سے محفوظ رہے۔ اس لیے معمول سے زیادہ ہوشیاری اور مستعدی سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح پر جو خبیث نماز کے ذوق اور اُنس کو لے گیا ہے تو اس سے کس قدر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے؟ اور کیوں نہ اس پر افسوس کیا جاوے؟ انسان جب یہ حالت دیکھے کہ اس کا اُنس و ذوق جاتا رہا ہے تو وہ بے فکر اور بےغم نہ ہو نماز میں بے ذوقی کا پیدا ہونا ایک سارق کی چوری اور روحانی بیماری ہے جیسے ایک مریض کے مُنہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے تو وہ فی الفور علاج کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح پر جس کا رُوحانی مذاق بگڑ جاوے اس کو بہت جلد اصلاح کی فکر کرنی لازم ہے۔

یاد رکھو انسان کے اندر ایک بڑا چشمہ لذّت کا ہے جب کوئی گناہ اس سے سرزد ہوتا ہے تو وہ چشمہ لذت مکدر ہو جاتا ہے اور پھر لذت نہیں رہتی۔ مثلاً جب ناحق گالی دے دیتا ہے یا ادنیٰ ادنیٰ سی بات پر بدمزاج ہو کر بدزبانی کرتا ہے تو پھر ذوق نماز جاتا رہتا ہے۔ اخلاق قویٰ کو لذت میں بہت بڑا دخل ہے۔ جب انسانی قویٰ میں فرق آئے گا تو اس کے ساتھ ہی لذت میں بھی فرق آجاوے گا۔ پس جب کبھی ایسی حالت ہو کہ اُنس اور ذوق جو نماز میں آتا تھا وہ جاتا رہا ہے تو چاہیئے کہ تھک نہ جاوے اور بے حوصلہ ہو کر ہمت نہ ہارے بلکہ بڑی مستعدی کے ساتھ اس گمشدہ متاع کو حاصل کرنے کی فکر کرے اور اس کا علاج ہے۔ توبہ، استغفار، تضرع۔ بے ذوقی سے ترک نماز نہ کرے بلکہ نماز کی اَور کثرت کرے۔ جیسے ایک نشہ باز کو جب نشہ نہیں آتا تو وہ نشہ کو چھوڑ نہیں دیتا بلکہ جام پر جام پیتا جاتا ہے یہانتک کہ آخر اس کو لذت اور سرور آجاتا ہے۔ پس جس کو نماز میں بے ذوقی پیدا ہو اس کو کثرت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیئے اور تھکنا مناسب نہیں آخر اسی بے ذوقی میں ایک ذوق پیدا ہو جاویگا۔

دیکھو پانی کیلئے کسقدر زمین کو کھودنا پڑتا ہے جو لوگ تھک جاتے ہیں وہ محروم رہ جاتے ہیں جو تھکتے نہیں وہ آخر نکال ہی لیتے ہیں۔ اس لیے اس ذوق کو حاصل کرنے کے لیے استغفار، کثرت نماز و دُعا، مستعدی، اور صبر کی ضرورت ہے

بہترین وظیفہ

سوال:۔ بہترین وظیفہ کیا ہے؟

جواب:۔ نماز سے بڑھ کر اَور کوئی وظیفہ نہیں ہے کیونکہ اس میں حمدالٰہی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

؎ یہ ملفوظات بھی "الحکم" میں بلا تاریخ درج ہیں "استفسار ہے اور ان کے جواب" کے عنوان سے "الحکم" میں جو ملفوظات بلا تاریخ درج ہوتے ہیں بعض دفعہ تو "البدر" کی ڈائری سے پتہ لگ جاتا ہے کہ کس تاریخ کے ہیں لیکن بعض دفعہ "البدر" کی ڈائری سے بھی ان کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا تو بلا تاریخ درج کر دیئے جاتے ہیں۔ (مرتب)

استغفار ہے اور درود شریف۔ تمام وظائف اور اَوراد کا مجموعہ یہی نماز ہے اور اس سے ہر قسم کے غم و ہم دُور ہوتے ہیں اور مشکلات حل ہوتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ذرا بھی غم پہنچتا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اسی لیے فرمایا ہے اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ۔ اطمینان و سکینتِ قلب کے لیے نماز سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ لوگوں نے قسم قسم کے وِرد اور وظیفے اپنی طرف سے بنا کر لوگوں کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور ایک نئی شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مقابلہ میں بنا دی ہوئی ہے۔ مجھ پر تو الزام لگایا جاتا ہے کہ مَیں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر مَیں دیکھتا ہوں اور حیرت سے دیکھتا ہوں کہ انہوں نے خود شریعت بنائی ہے اور نبی بنے ہوئے ہیں اور دُنیا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ان وظائف اور اَوراد میں دُنیا کو ایسا ڈالا ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی شریعت اور احکام کو بھی چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ اپنے معمول اور اَوراد میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ نمازوں کا بھی لحاظ نہیں رکھتے۔ مَیں نے مولوی صاحب سے سُنا ہے کہ بعض گدی نشین شاکت مت والوں کے منترا اپنے وظیفوں میں پڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک سب وظیفوں سے بہتر وظیفہ نماز ہی ہے۔ نماز ہی کو سنوار سنوار کر پڑھنا چاہیئے اور سمجھ سمجھ کر پڑھو اور مسنون دُعاؤں کے بعد اپنے لیے اپنی زبان میں بھی دُعائیں کرو اس سے تمہیں اطمینان قلب حاصل ہوگا اور سب مشکلات خدا تعالیٰ چاہے گا تو اسی سے حل ہو جائیں گی۔ نماز یادِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے فرمایا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ۔ (طٰہٰ : ۱۵)

قبرستان میں جانا

سوال:۔ قبرستان میں جانا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:۔ نذر و نیاز کے لیے قبروں پر جانا اور وہاں جا کر منتیں مانگنا درست نہیں ہے ہاں وہاں جا کر عبرت سیکھے اور اپنی موت کو یاد کرے تو جائز ہے۔ قبروں کے پختہ بنانے کی ممانعت ہے البتہ اگر میت کو محفوظ رکھنے کی نیت سے ہو تو حرج نہیں ہے یعنی ایسی جگہ جہاں سیلاب وغیرہ کا اندیشہ ہو اور اس میں بھی تکلفات جائز نہیں ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ صفحہ ۹ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۱۰ مئی ۱۹۰۳ء

صبح کی سیر

مامور کا زمانہ ایک قیامت ہوتا ہے

فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ وَ فَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ (شوریٰ : ۸)

خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ جیسے ایک طرف بغض و حسد

کرنیوالے ہمارے دشمن موجود ہیں۔ ویسے ہی ان کے بالمقابل وہ لوگ بھی ہیں جو کہ اسی تحریک سے راہ راست کی طرف آجاتے ہیں۔ مامور کا زمانہ بھی ایک قیامت ہے۔ جیسے لوگ جزا کے دن دو فریقوں میں تقسیم ہو جاویں گے یعنی فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ۔ (الشوریٰ : ۸) ایسے ہی مامور کی بعثت کے وقت بھی دو فریق ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران : ۵۶) جیسے تقریباً سات سو برس پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کہا گیا اور مسیح علیہ السلام کے وقت پورا ہوا ویسا ہی آپ کے تیرہ سو برس بعد چودھویں صدی میں ہمارے زمانہ میں پورا ہو رہا ہے۔

ابلیس ملائکہ میں سے نہ تھا

فرمایا کہ[1]:۔

اہلِ عرب اس قسم کے استثناء کرتے ہیں۔ صرف و نحو میں بھی اگر دیکھا جاوے تو ایسے استثناء بکثرت ہوا کرتے ہیں اور ایسی نظیریں موجود ہیں جیسے کہا جاوے کہ میرے پاس ساری قوم آئی مگر گدھا۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ساری کی ساری قوم جنس حمار میں سے تھی غلط ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ کے بھی یہی معنے ہوئے کہ وہ فقط ابلیس ہی قوم جن میں سے تھا ملائکہ میں سے نہیں تھا۔ ملائک ایک الگ پاک جنس ہے اور شیطان الگ۔ ملائکہ اور ابلیس کا راز ایسا مخفی در مخفی ہے کہ بجز آمنّا و صدّقنا کے انسان کو چارہ نہیں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اقتدار اور توفیق نہیں دی مگر وسوسہ اندازی میں وہ محرک ہے جیسے ملائکہ پاک تحریکات کے محرک ہیں ویسے ہی شیطان ناپاک جذبات کا محرّک ہے۔ ملائکہ کی منشاء ہے کہ انسان پاکیزہ ہو، مطہر ہو، اور اس کے اخلاق عمدہ ہوں اور اس کے بالمقابل شیطان چاہتا ہے کہ انسان گندہ اور ناپاک ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ قانون الٰہی ملائکہ و ابلیس کی تحریکات کا دوش بدوش چلتا ہے لیکن آخر کار ارادہ الٰہی غالب آجاتا ہے گویا پس پردہ ایک جنگ ہے جو خود بخود جاری رہ کر آخر قادر و مقتدر حق کا غلبہ ہو جاتا ہے اور باطل کی شکست۔

مجہول الکنہہ اشیاء

چار چیزیں ہیں جن کی کنہہ و راز کو معلوم کرنا انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔

اوّل اللہ جلشانہٗ دوّم روح۔ سوّم ملائکہ، چہارم ابلیس

جو شخص ان چاروں میں سے خدا تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے اور اس کی صفاتِ الوہیت پر ایمان رکھتا ہے ضرور ہے کہ وہ ہر سہ اشیاء روح و ملائک و ابلیس پر ایمان لائے۔

---

[1] البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۴۰ میں ہے کہ "سوال ہوا کہ ابلیس ملائکہ سے تھا یا کون؟" اس کے جواب میں حضور نے فرمایا۔ (مرتب)

مثلاً رُوح جیسے انسان کے اندر داخل ہوتی معلوم نہیں ہوتی ویسے ہی اس میں سے خارج ہوتی بھی معلوم نہیں ہوتی[1]۔ انسان کو ہر حال میں رضاء الٰہی پر چلنا چاہیئے اور کارخانہ الٰہی میں دخل درمعقولات نہیں دینا چاہیئے۔ تقویٰ اور طہارت، اطاعت و وفا میں ترقی کرنی چاہیئے اور یہ سب باتیں تب ممکن ہیں جب انسان کامل ایمان اور یقین سے ثابت قدم رہے اور صدق و اخلاص اپنے مولا کریم سے دکھلائے اور وہ باتیں جو علم الٰہی میں مخفی ہیں اس کی کُنہ کے معلوم کرنے میں بیسود کوشش نہ کرے[2]۔ مثلاً ہلیلہ قبض کو دُور کرتی ہے اور سم الفار ہلاک کرتا ہے۔ اب کیا ضرورت پڑی ہے کہ بے فائدہ اس دھت میں بھاگا پھرے کہ کونسی شے ہے جو یہ اثر کرتی ہے۔ طبیب کا کام ہے کہ اُن کے خواص کو معلوم کرے۔

اور یہ سوال کہ کیوں یہ خواص پیدا ہو گئے حوالہ بخدا کرے جو شخص ہر ایک چیز کے خواص و ماہیت دریافت کرنے کے پیچھے لگ جاتا ہے وہ نادانی سے کارخانہ ربّی اور اس کے منشاء سے بالکل ناواقف و نابلد ہے۔

ملائکہ اور شیطان

اگر کوئی کہے کہ شیطان و ملائکہ دکھلاؤ تو کہنا چاہیئے کہ تمہارے اندر یہ خواص کہ بیٹھے بٹھائے آناً فاناً بدی کی طرف متوجہ ہو جانا یہانتک کہ خدا تعالےٰ کی ذات سے بھی منکر ہو جانا اور کبھی نیکی میں ترقی کرنا اور انتہا درجہ کی انکساری و فروتنی و عجز و نیاز میں گر جانا یہ اندرونی کششیں جو تمہارے اندر موجود ہیں ان سب کے محرک جو قویٰ ہیں وہ ان دو الفاظ ملک و شیطان کے وجود میں مجسم ہیں۔

سعادت اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لایا جاوے اور اس کو حاضر و ناظر یقین کیا جاوے اور اس کی عین موجودگی کا تصور دل میں رکھ کر ہر ایک بدی و ناراستی سے پرہیز کیا جاوے۔ یہی بڑی دانش و حکمت ہے اور یہی معرفت الٰہی کا سیراب کرنے والا شیریں سوتہ ہے جس سے اور جس کے لیے اہل اللہ ایک ریگستان کے پیاسے کی طرح آگے بڑھ کر خوش مزگی سے پیتے ہیں اور یہی وہ آبِ کوثر ہے جو مولائے کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے اپنے اولیاء اصفیا کو پلاتا ہے۔

مومن چونکہ خدا تعالیٰ کی معرفت کا محتاج ہے اور ہر کوئی اس کی طرف نظر اُٹھائے دیکھ رہا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے بھی یہ دروازہ پورے طور پر کھولا ہوا ہے جوں جوں انسان اس راہ میں کوشش کریگا توں توں

---

[1] البدر سے:۔ "جیسے انڈے کے بیچ میں رُوح آتی ہے اور بعض وقت بچہ بیچ میں ہی مرکر رہ جاتا ہے اور رُوح نکل جاتی ہے لیکن معلوم کسی کو نہیں ہوتا۔ پس یہ راز ہوتے ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۴۰ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء)

[2] البدر سے:۔ "انسان کو ان باتوں کی کنہ دریافت کرنے میں نہ پڑنا چاہیئے۔ تقویٰ اور اطاعت میں ترقی کرنی چاہیئے تو اس طرح خدا تعالیٰ خود اس کی تسلی کر دے گا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۴۰)

درِ رحمت اس پر کُھلتا جاوے گا۔ دُنیا میں بے انت ایسی چیزیں ہیں جن کی ہمیں خبر بھی نہیں پر ایسی چیزوں کی دریافت کیلئے سرگرداں ہونا کونسی عقلمندی ہے؟ کونسی چیز ہے جس کی تحقیق انسان نے پورے طور سے کر لی ہے۔ جو چیز اللہ جلشانہٗ نے انسان کے لیے چنداں مفید نہیں سمجھی۔ وہ پورے طور پر انسان پر منکشف بھی نہیں ہوتی پس جو ہر ایک چیز کو دریافت کرنا چاہتا ہے وہ خدا بننا چاہتا ہے۔ جس راہ پر انسان پہنچ نہیں سکتا چاہیئے کہ اُسے چھوڑ دے۔ انسان کو جو کچھ کہ دیا گیا ہے اس پر قانع رہے۔ اگر یہ توقع رکھے کہ آسمان کے درخت کا پھل آوے تو مَیں کھاؤں حالانکہ اس کا ہاتھ وہاں پہنچ بھی نہیں سکتا تو وہ مجنوں ہے ہاں جب اللہ تعالیٰ اس کی فطرت میں یہ قویٰ پیدا کر دے کہ آسمان تک پہنچ سکے تو کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ آسمان ہی کے پھل کھاوے۔

گناہ سے کیسے بچ سکتے ہیں

گناہ سے انسان کیسے بچ سکتا ہے اس کا علاج یہ تو بالکل نہیں کہ عیسائیوں کی طرح ایک کے سَر میں درد ہو تو دوسرا اپنے سر میں پتھر مار لے اور پہلے کا دردِ سر دُور ہو جاوے دراصل انسان کا حدِ اعتدال سے گذر جانا ہی گناہ کا موجب ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ بات پھر عادت میں داخل ہو جاتی ہے اور یہ سوال کہ یہ عادت کیونکر دُور ہو سکتی ہے؟ اکثر لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہ عادت دُور نہیں ہو سکتی اور عیسائیوں کا تو پختہ یقین و ایمان ہے کہ عادت یا فطرتِ ثانی ہرگز دُور نہیں ہو سکتی اور نہ بدل سکتی ہے۔ مسیح کے کفارہ کو مان کر بھی یہ تو نہیں ہو سکتا ہے کہ انسان گناہ سے بالطبع نفرت کرنے لگ جائے۔ نہیں البتہ اس کفارہ کے طفیل اُخروی عذاب سے نجات پا جائے گا۔ یہی اعتقاد ہے جو رکھنے سے انسان خلیع الرسن ہو کر بدکاریوں اور نامزا وار اُمور میں دل کھول کر ترقی کرتا ہے۔

قابلِ توجہ

ہماری جماعت کو اس پر توجہ کرنی چاہیئے کہ ذرا سا گناہ خواہ کیسا ہی صغیرہ ہو جب گردن پر سوار ہو گیا تو رفتہ رفتہ انسان کو کبیرہ گناہوں کی طرف لے جاتا ہے۔ طرح طرح کے عیوب مخفی رنگ میں انسان کے اندر ہی اندر ایسے رَچ جاتے ہیں کہ اُن سے نجات مشکل ہو جاتی ہے۔

فروتنی اور عاجزی

انسان جو ایک عاجز مخلوق ہے اپنے تئیں شامتِ اعمال سے بڑا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ کبر اور رعونت اس میں آجاتی ہے اللہ کی راہ میں جب تک انسان اپنے آپ کو سب سے چھوٹا نہ سمجھے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ کبیر نے سچ کہا ہے ؎

بھلا ہوا ہم نیچ بھئے ہر کو کیں سلام ؎ جے ہوتے گھر اُونچ کے ملتا کہاں بھگوان

یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم چھوٹے گھر میں پیدا ہوئے۔ اگر عالی خاندان میں پیدا ہوتے تو خدا نہ ملتا۔ جب لوگ اپنی اعلیٰ ذات پر فخر کرتے تو کبیر اپنی ذات بافندہ[1] پر نظر کر کے شکر کرتا۔

---

[1] البدر میں ہے: "جب لوگ اپنی اپنی ذات پر فخر کرتے تو کبیر اپنی قوم چمار پر نظر کر کے شکر کرتا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۱۴)

پس انسان کو چاہیئے کہ ہر دم اپنے آپ کو دیکھے کہ مَیں کیسا ہیچ ہوں. میری کیا ہستی ہے. ہر ایک انسان خواہ کتنا ہی عالی نسب ہو مگر جب وہ اپنے آپ کو دیکھے گا بہر نہج وہ کسی نہ کسی پہلو میں بشرطیکہ آنکھیں رکھتا ہو تمام کائنات سے اپنے آپ کو ضرور بالضرور ناقابل و ہیچ جان لیگا۔ انسان جب تک ایک غریب و بیکس بڑھیا کے ساتھ وہ اخلاق نہ برتے جو ایک اعلیٰ نسب عالی جاہ انسان کے ساتھ برتتا ہے یا برتنے چاہئیں اور ہر ایک طرح کے غرور و رعونت وکبر سے اپنے آپ کو نہ بچاوے وہ ہرگز ہرگز خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔[1]

دُعا

جس قدر نیک اخلاق ہیں تھوڑی سی کمی بیشی سے وہ بداخلاقی میں بدل جاتے ہیں. اللہ جلشانہٗ نے جو دروازہ اپنی مخلوق کی بھلائی کے لیے کھولا ہے وہ ایک ہی ہے یعنی دُعا. جب کوئی شخص بُکا و زاری سے اس دروازہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ مولائے کریم اس کو پاکیزگی و طہارت کی چادر پہنا دیتا ہے اور اپنی عظمت کا غلبہ اس پر اس قدر کر دیتا ہے کہ بیجا کاموں اور ناکارہ حرکتوں سے وہ کوسوں بھاگ جاتا ہے. کیا سبب ہے کہ انسان باوجود خدا کو ماننے کے بھی گناہ سے پرہیز نہیں کرتا؟ درحقیقت اس میں دہریت کی ایک رگ ہے اور اُس کو پورا پورا یقین اور ایمان اللہ تعالیٰ پر نہیں ہوتا ورنہ اگر وہ جانتا کہ کوئی خدا ہے جو حساب کتاب لینے والا ہے اور ایک آن میں اس کو تباہ کر سکتا ہے تو وہ کیسے بدی کر سکتا ہے اس لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ کوئی چور چوری نہیں کرتا درآنحالیکہ وہ مومن ہے اور کوئی زانی زنا نہیں کرتا درآنحالیکہ وہ مومن ہے. بدکرداریوں سے نجات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ یہ بصیرت اور معرفت پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ کا غضب ایک ہلاک کرنے والی بجلی کی طرح گرتا اور بھسم کرنے والی آگ کی طرح تباہ کر دیتا ہے تب عظمت الٰہی دل پر ایسی مستولی ہو جاتی ہے کہ سب افعال بد اندر ہی اندر گداز ہو جاتے ہیں۔

نجات

پس نجات معرفت میں ہی ہے. معرفت ہی سے محبت بڑھتی ہے اس لیے سب سے اوّل معرفت کا ہونا ضروری ہے. محبت کے زیادہ کرنے والی دو چیزیں ہیں. حُسن اور احسان. جس شخص کو اللہ جلشانہٗ کا حُسن اور احسان معلوم نہیں وہ کیا محبت کریگا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (الاعراف: ۴۱) یعنی کفار جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذر جائے. مفسرین اس کا مطلب ظاہری طور پر لیتے ہیں مگر میں یہی کہتا ہوں کہ نجات کے طلبگار کو خدا تعالیٰ کی راہ میں نفس کے شتر بے مہار کو مجاہدات سے ایسا دُبلا کر دینا چاہیئے کہ وہ سوئی کے ناکہ میں سے گذر جائے. جب تک نفس دنیوی لذائذ و شہوانی حظوظ

---

[1] اس کے آگے البدر میں مزید لکھا ہے: "اور قوتیں تو انسان کی کبھی کبھی غلبہ کرتی ہیں مگر رعونت اور نخوت ہر وقت اس پر سوار رہتی ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ صفحہ ۱۴۰)

سے موٹا ہوا ہوا ہے تب تک یہ شریعت کی پاک راہ سے گذر کر بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ دنیوی لذائذ پر موت وارد کرو اور خوف و خشیت الٰہی سے دُبلے ہو جاؤ تب تم گذر سکو گے اور یہی گذرنا تمہیں جنّت میں پہنچا کر نجاتِ اخروی کا موجب ہوگا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۳-۱۴ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۳ء)

مجلس قبل از عشاء

پابندی رُسوم کا اثر ایمان پر

فرمایا:۔
قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ۔ (آل عمران : ۳۲) اللہ تعالیٰ کے خوش کرنے کا ایک یہی طریق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی فرمانبرداری کی جاوے۔ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ طرح طرح کی رسومات میں گرفتار ہیں۔ کوئی مرجاتا ہے تو قسم قسم کی بدعات اور رسومات کی جاتی ہیں۔ حالانکہ چاہیئے کہ مُردہ کے حق میں دُعا کریں۔ رسومات کی بجاآوری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف مخالفت ہی نہیں ہے بلکہ اُن کی ہتک بھی کی جاتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کافی خیال کرتے تو اپنی طرف سے رسومات کے گھڑنے کی کیوں ضرورت پڑتی۔

فرمایا کہ:۔
انسان کی وہ غلطی تو معاف ہوسکتی ہے جو کہ یہ نادانی سے کرتا ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد فیج اعوج کے زمانہ میں طرح طرح کی غلطیاں پھیل گئیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مسیح فوت نہیں ہوئے اور اسی جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر موجود ہیں۔

(اس مقام پر حضرت اقدس نے مسیح کی وفات کے دلائل مختصراً جامع طور پر بیان فرمائے) اور پھر ان کے بعد ایک تقریر اس مضمون پر فرمائی کہ ہماری جماعت سے کیوں بعض لوگ طاعون سے مرجاتے ہیں اور فرمایا کہ:۔

ہمیشہ انجام پر نظر چاہیئے۔ آخر کار مومن ہی کامیاب ہوتا ہے اور پھر ایک التباس بھی ہوتا ہے کہ جس پر ہر ایک کو ایمان لانا چاہیئے۔ اگر التباس نہ ہو تو پھر ایمان ایمان نہیں ہوسکتا۔ بعض کام تو اس لیے کئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت پوری ہو جاوے اور بعض اس لیے ظہور میں آتے ہیں کہ انسان تدبّر کریں۔ اگر التباس نہ ہو تو تدبّر کرنے والوں کو ثواب کیسے حاصل ہوتا اور ایمان کے کیا معنے ہوتے؟

اگر موت صرف دشمنوں کے واسطے ہی ہو تو پھر کون بیوقوف ہے جو کہ ظاہری موت کو دیکھ کر مسلمان نہ ہو جاوے یوں تو لوگ بیشک خدا تعالیٰ کے سوا اَوروں کی عبادت کرتے ہیں مثلاً بعض ہندو قبروں کی بھی پوجا کرتے ہیں تو

جب ایسے لوگ دیکھ لیویں کہ عافیت تو صرف خدا کے ایک ماننے والوں کے پاس ہے تو اُن کو ایمان سے کونسی شئے روک سکتی ہے؟ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ صفحہ ۱۴۷ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۰۳ء)

---

۱۴ مئی ۱۹۰۳ء

بوقتِ ظہر

نجات کے واسطے اعمال کی ضرورت ہے

ایک ذکر پر فرمایا کہ:۔

صدق اور عاجزی کام آتی ہے مگر یہ کسی کا اختیار نہیں ہے کہ کسی کو ہاتھ ڈال کر سیدھا کر دیوے۔ ہر ایک انسان کی نجات کے واسطے اس کے اپنے اعمال کا ہونا ضروری ہے۔ بوستاں میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک اہل اللہ کو کہا کہ میرے لیے دُعا کرو کہ مَیں اچھا ہو جاؤں۔ اس نے جواب دیا کہ میرے ایک کی دُعا کیا کام کرے گی جبکہ ہزاروں بے گناہ قیدی تیرے لیے بد دُعا کرتے ہیں۔ اُس نے یہ سُنکر تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔

مجلس قبل از عشاء

فرمایا کہ:۔

اس وقت صدہا فرقے ہیں اگر ایک الٰہی فرقہ بھی ہو گیا تو کیا حرج ہے؟ خدا معلوم کیوں ان لوگوں نے شور مچا رکھا ہے۔ ہمارا خدا بائیس برس سے زیادہ عرصہ سے ہماری امداد کر رہا ہے اور ان لوگوں کی پیش نہ گئی۔ بد دُعا کرتے کرتے انکے ناک بھی گھِس گئے اور ہمیں تجربہ ہے کہ ہمارا وہی خدا ہے جس کی کلام ہم پر نازل ہوتی ہے۔ اب اس کے مقابل پر اُن کے ظنّیات کس کام کے ہیں؟ جس حَکَم کے وہ منتظر ہیں آخر اُس نے بھی آکر ایک ہی فرقہ بنانا ہے۔ ان کی باتوں کا اکثر حصہ اگر وہ ردّ کریگا تو ہی ایک فرقہ بنا سکے گا۔ پھر کیوں تقویٰ اجازت نہیں دیتا کہ ان کی باتیں ردّ کی جاویں؟ کتاب اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ حدیث بھی پکّی سے پکّی ہمارے ساتھ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح کو مُردوں میں معراج کی رات میں دیکھ کر آئے۔ اُدھر خدا کی قولی شہادت اِدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی شہادت کہ مسیح فوت ہو گئے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ محبت اور ایمان کے لیے اسباب ہوتے ہیں۔ مسیح کی زندگی پر نظر کرو تو معلوم ہوگا کہ ساری عمر دھکے کھاتے رہے۔ صلیب پر چڑھنا بھی مشتبہ رہا۔ اُدھر ایک لمبا سلسلہ عمر اور سوانح آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کا دیکھو کیسی نصرتِ الٰہی شامل رہی۔ ہر ایک میدان میں آپ کو فتح ہوئی۔ کوئی گھڑی یاس کی آپ پر گذری ہی نہیں۔ یہانتک کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کا وقت آگیا۔ ان تمام نصرتوں میں کوئی حصہ بھی حضرت مسیح کا نظر نہیں آتا۔ اس لیے صاف ثابت ہے کہ محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا سے زیادہ ہو نہ کہ مسیح کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بکثرت ہیں اور اس لیے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہوسکتی ہے کہ وہ آسمان پر زندہ ہوں۔ جو شخص نظارہ قدرت زیادہ دیکھتا ہے وہی زیادہ فریفتہ ہوا کرتا ہے۔

اور اب اگر مسیح آویں بھی تو اس میں اسلام کی اور خود مسیح کی بے عزتی ہے۔ اسلام کی بے عزتی اس طرح کہ کہنا پڑیگا کہ خاتم النّبیین کے بعد ایک اَور پیغمبر اسرائیلی آیا۔ اور مسیح کی بے عزتی اس طرح کہ ان کو آکر انجیل چھوڑنی پڑے گی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ صفحہ ۱۴۶ مورخہ ۲۹ رمئی ۱۹۰۳ء)

---

۱۸ رمئی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

قرآن کی ایک پیشگوئی کا پورا ہونا

وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا (بنی اسرائیل : ۵۹) کوئی ایسا گاؤں نہیں مگر روزِ قیامت سے پہلے پہلے ہم اس کو ہلاک کر کے رہیں یا اس کو سخت عذاب دیویں گے۔ قرآن میں یہ ایک پیشگوئی ہے۔ فرمایا کہ:

یہ اب پنجاب پر بالکل صادق آرہی ہے۔ بعض گاؤں تو اس سے بالکل تباہ ہوگئے ہیں اور بعض جگہ بطور عذاب کے طاعون جاکر پھر اُن کو چھوڑ دیتی ہے۔

قوم کی حالت

امریکہ اور یورپ کے بلاد میں حضرت مسیح کی نسبت جو ایک انقلاب عظیم خیالات میں ہو رہا ہے اور جس کا ذکر ہم "البدر" کے ایک آرٹیکل بعنوان "کسر صلیب کا دروازہ کھل گیا ہے" میں کر چکے ہیں۔ اس پر ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک : ۱۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ سماع اور عقل انسان کو ایمان کے واسطے جلد تیار کر دیتی ہے۔ ہماری قوم میں نہ سماع ہے نہ عقل ہے۔ دل میں یہی ٹھانی ہوئی ہے کہ تردید کریں۔ پیشگوئیوں کو جھوٹا ثابت کریں۔ نص اور اخبار کی تکذیب کریں۔ کشوف وغیرہ جو

اولیائے کرام کے ہماری تائید میں ہیں ان سب کو جھوٹا کہدیں۔ غرضیکہ یہ سماع کا حال ہے۔
اب عقل کا سُن لو کہ نظائر پیش نہیں کر سکتے کہ کوئی اس امر کا ثبوت دیں کہ سوائے مسیح کے اور بھی کچھ آدمی زندہ آسمان پر گئے۔ ایک بات کو دیکھ کر دوسری کو پیدا کرنا اس کا نام عقل ہے سو اس کو انہوں نے ہاتھ سے دیدیا ہے۔ دونو طریق (سماع اور عقل) قبولِ حق کے تھے سو وہ دونو کھو بیٹھے۔ مگر یہ لوگ (اہل امریکہ و یورپ) غور کرتے ہیں اگرچہ سب نہیں کرتے مگر ایسے پائے تو جاتے ہیں جو کرتے ہیں۔ جس حال میں کہ وہ مانتے ہیں کہ مسیح کے دوبارہ آنے کا زمانہ یہی ہے اور اس کی موت کے بھی قائل ہیں تو دیکھ لو کہ وہ لوگ کسقدر قریب ہیں۔ اس قوم کا اقبال اب بڑھ رہا ہے اور مسلمانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دن بدن گرتے جاتے ہیں۔ اور وہ منتظر ہیں کہ مسیح اور مہدی آتے ہی تلوار اُٹھاویوے گا اور خون کی ندیاں بہادے گا۔ کمبخت دیکھتے نہیں کہ مسلمانوں کے پاس نہ تو فنونِ حرب ہیں نہ ان کے پاس ایجاد کی طاقت ہے نہ استعمال کی استعداد ہے۔ جنگی طاقت نہ بحری ہے نہ بری۔ تو یہ زمانہ ان کے منشاء کے موافق کیسے ہو سکتا ہے؟ اور نہ خدا کا یہ ارادہ ہے کہ جنگ ہو کیا تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ انہیں کو یہ سمجھ دے دیوے کیونکہ فہم۔ دماغ اور اقبال کے ایام انہیں کے اچھے ہیں۔ اصل علم وہی ہے جو خدا تعالیٰ کے پاس ہے زمانہ وہی ہے جس کا وعدہ تھا مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ نکمے، فاسق، فاجر اور کاہل بھی ہیں تو پھر بجز اُس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا اسی گروہ میں سے ایسے پیدا کر دے کہ وہ خود ہی سمجھ جاویں۔ خدا تعالیٰ کو توپ اور بندوق کی کیا حاجت ہے۔ اس نے بندوں میں ہدایت پھیلانی ہے یا اُنکو قتل کرنا ہے؟ زمانہ کی موجودہ حالت خود دلالت کرتی ہے کہ یہ زمانہ علمی رنگ کا ہے۔ اگر کسی کو مار مار کر سمجھاؤ بھی تو وہ بات دل میں نہیں بیٹھتی لیکن اگر دلائل سے سمجھایا جاوے تو وہ دل پر تصرف کر کے اس میں دھس جاتی ہے اور انسان کو سمجھ آجاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی حالت اَور تھی اس وقت لوہے سے اَور طرح کام لیا گیا تھا۔ اب ہم بھی لوہے سے ہی کام لے رہے ہیں مگر اور طرح سے کہ لوہے کے قلموں سے رات دن لکھ رہے ہیں۔

میری رائے یہی ہے کہ تلوار کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ عیسائی بھی جہالت میں ڈوبے ہیں۔ اور مسلمان بھی۔ حکمت الٰہی چاہتی ہے کہ رِفق اور محبت سے سمجھایا جاوے مثلاً ایک ہندو ہے اگر دس بیس مسلمان ڈنڈے لے کر اس کے پیچھے پڑجاویں تو وہ ڈر کے مارے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو کہہ دیگا لیکن اس کا کہنا بودا ہوگا کہ بالکل مفید نہیں ہو سکتا اور رفق اور محبت سے سمجھایا جاوے تو وہ دل میں جم جاویگا حتیٰ کہ اگر اس کو زندہ آگ میں بھی پھونک دو تو بھی وہ اس کے کہنے سے باز نہ آوے گا۔ اَسْلَمْنَا (الحجرات: ۱۵) ہمیشہ لاٹھی سے ہوتا ہے اور اٰمَنَّا اس وقت ہوتا ہے جب خدا تعالیٰ دل میں ڈال دے۔ ایمان کے لوازم اَور ہوتے ہیں اور

اسلام کے اَور۔اسی لیے خدا تعالیٰ نے اس وقت ایسے لوازم پیدا کئے کہ جن سے ایمان حاصل ہو۔مسلمان تو اپنی موجودہ حالت کے لحاظ سے خود اس قابل ہیں کہ انہی سے جہاد کیا جاوے۔اب تو وہ زمانہ ہے کہ بچوں کی طرح دین کی باتیں لوگوں کو سمجھائی جاویں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ صفحہ ۱۴۶۔۱۴۷ مورخہ ۲۹ رمئی ۱۹۰۳ء)

---

۱۹ رمئی ۱۹۰۳ء

بعد نماز فجر

ایک رؤیا اور الہام

حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔
۱۲ بجے کے قریب میں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ کوئی کہتا ہے کہ یہ فتح ہوگئی۔بار بار اسے تکرار کرتا ہے گویا کہ بہت سی فتوحات کی طرف اشارہ ہے۔اس کے بعد طبیعت وحی کی طرف منتقل ہوئی اور الہام ہوا۔ مجموعہ فتوحات۔

مجلس قبل از عشاء

اپنی صداقت پر گفتگو فرماتے رہے اور اس امر پر ذکر فرمایا کہ:۔
خدا تعالیٰ جھوٹے سے اتنا عرصہ دراز یارانہ نہیں لگایا کرتا۔اگر ہم مفتری ہوتے تو آجتک تباہ اور ہلاک ہو جاتے۔

بیّنات و متشابہات

پیشگوئیوں کے ہمیشہ دو حصے ہوا کرتے ہیں اور آدمؑ سے اس وقت تک یہی تقسیم چلی آرہی ہے کہ ایک حصہ متشابہات کا ہوا کرتا ہے اور ایک حصہ بیّنات کا۔اب حدیبیہ کے واقعات کو دیکھا جاوے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو سب سے بڑھ کر ہے مگر علم کے لحاظ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا سفر کرنا دلالت کرتا تھا کہ آپ کی رائے اسی طرف تھی کہ فتح ہوگی۔نبی کی اجتہادی غلطی جائے عار نہیں ہوا کرتی۔اصل صورت جو معاملہ کی ہوتی ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے اور انسان اور خدا میں یہی تو فرق ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ صفحہ ۱۴۷ مورخہ ۲۹ رمئی ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭

۲۵؍مئی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

تزکیۂ نفس

ایک استفسار کے جواب میں کہ آج کل کے پیر اور گدی نشین وظائف وغیرہ اور مختلف قسم کے اوراد بتاتے ہیں۔ آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا کہ :-

مومن جو بات سچے یقین سے کہے وہ ضرور مؤثر ہوتی ہے[1] کیونکہ مومن کا مطہر قلب اَسرارِ الٰہی کا خزینہ ہے جو کچھ اس پاک لوحِ انسانی پر منقش ہوتا ہے وہ آئینہ خدا نما ہے۔ مگر انسان جب ضعفِ بشریت سے سہو و گناہ کر بیٹھتا ہے اور پھر ذرہ بھی اس کی پروا نہیں کرتا تو دل پر سیاہ زنگ بیٹھ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ قلب انسانی کہ خشیتِ الٰہی سے گداز اور شفاف تھا۔ سخت اور سیاہ ہوتا جاتا ہے[2]۔ مگر جونہی انسان اپنی مرضِ قلب کو معلوم کر کے اس کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور شب و روز نمازوں میں دُعائیں، استغفار وزاری و قلق جاری رکھتا ہے اور اس کی دُعائیں انتہا کو پہنچتی ہیں تو تجلیاتِ الٰہی اپنے فضل کے پانی سے اس ناپاکی کو دھوڈالتی ہیں اور انسان بشرطیکہ ثابت قدم رہے ایک قلب لیکر نئی زندگی کا جامہ پہن لیتا ہے گویا کہ اس کا تولدِ ثانی ہوتا ہے۔

دو زبردست لشکر ہیں جن کے درمیان انسان چلتا ہے ایک لشکر رحمٰن کا دوسرا شیطان کا۔ اگر یہ لشکر رحمٰن کی طرف جھک جاوے اور اس سے مدد طلب کرے تو اسے بحکمِ الٰہی مدد دی جاتی ہے اور اگر شیطان کی طرف رجوع کیا تو گناہوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے[3]۔ پس انسان کو چاہیئے کہ گُناہ کی زہریلی ہوا سے بچنے کیلئے

---

1. البدر میں ہے :"حضرت اقدس نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق:۴) اسکے یہ معنے ہیں کہ مومن جو بات یقین سے کہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لفظوں کی پابندی اس میں ضروری نہیں ہے ہاں انسان کو یہ آیت قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس:۱۰) ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ گناہ سے بچا رہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۳)
2. البدر سے :"جب انسان گناہ کر لیتا ہے اور وہ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تو دل سخت ہو جاتا ہے اور جب دل سخت ہو جاوے تو پاک نہیں ہوتا جب تک کہ پھر نرم نہ ہو اور نرم نہیں ہوتا جب تک کہ نمازوں میں دُعائیں نہ کرے۔ انسان توبہ پر توبہ کر کے توڑ دیتا ہے اور اس پر کاربند نہیں ہو سکتا جب تک خدا تعالیٰ ساتھ نہ ہو۔ اس پر قدرتی طور پر سوال ہوتا ہے کہ پھر گناہ کا علاج کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ سچی خشوع اور خضوع پیدا کرو اور اپنی دعاؤں کو انتہا تک پہنچاؤ۔ انبیاء علیہم السلام بھی دُعائیں ہی کیا کرتے تھے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۳)
3. البدر میں ہے :"اگر یہ خدا تعالیٰ کے لشکر کی طرف جھک جاوے اور اس سے مدد طلب کرے تو اُس گناہ سے بچایا جاتا ہے جو کہ شیطان کے لشکر کی وجہ سے اس سے سرزد ہوتا ہے اور اگر خدا تعالیٰ کے لشکر کی مدد حاصل نہیں کرتا تو شیطان کے لشکر میں پھنس جاتا ہے۔" (البدر حوالہ مندرجہ بالا)

رحمٰن کی حفاظت میں ہو جاوے۔ وہ چیز جو انسان اور رحمٰن میں دُوری اور تفرقہ ڈالتی ہے وہ فقط گناہ ہی ہے جو اس سے بچ گیا اس نے خدا تعالیٰ کی گود میں پناہ لی۔ دراصل گناہ سے بچنے کے لیے دو ہی طریق ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان خود کوشش کرے[1]۔ دوسرے اللہ تعالیٰ سے جو زبردست مالک و قادر ہے استقامت طلب کرے یہانتک کہ اُسے پاک زندگی میسر آوے اور یہی تزکیۂ نفس کہلاتا ہے[2]۔

اَوراد و وظائف

اور بندوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعامات و اکرامات ہوتے ہیں وہ محض اللہ پاک کے فضل و کرم سے ہی ہوتے ہیں۔ پیروں۔ فقیروں۔ صوفیوں گدی نشینوں کے خود تراشیدہ اَوراد و وظائف، طریق رسومات سب فضول بدعات ہیں جو ہرگز ہرگز ماننے کے قابل نہیں۔ اگر یہ لوگ کل معاملات دنیوی و دینی کو ان خود ساختہ بدعات سے بھی درست کر سکتے ہیں تو یہ ذرا ذرا سی بات پر کیوں تکرار کرتے لڑتے جھگڑتے۔ حتیٰ کہ سرکاری عدالتوں میں جائز و ناجائز حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں دراصل وقت کا ضائع کرنا اور خداداد دماغی استعدادوں کا تباہ کرنا ہے۔

انسان اس لیے نہیں بنایا گیا کہ لمبی تسبیح لے کر صبح و شام تمام لوازمات و حقوق کو تلف کر کے بے توجہگی سے سبحان اللہ میں لگا رہے۔ اپنے اوقاتِ گرامی بھی تباہ کرے اور خود اپنے قویٰ کو بھی تباہ کرے اور اَوروں کے تباہ کرنے کے لیے شب و روز کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی معصیت سے بچاوے۔

الغرض یہ سب باتیں سُنتِ نبوی کو چھوڑنے سے پیدا ہوئیں۔ یہ حالت ایسی ہے جیسے پھوڑا کہ اندر سے تو پیپ سے بھرا ہوا ہے اور باہر سے شیشے کی طرح چمکتا ہے۔ زبان سے تو وِرد وظائف کرتے ہیں اور اندرونے بدکاری و گناہ سے سیاہ ہوئے ہوئے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ سب کچھ خدا تعالیٰ سے طلب کرے۔ جب وہ کسی کو کچھ دے دیتا ہے تو اس کی بلند شان کے خلاف ہے کہ واپس لے۔ تزکیہ وہی ہے جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ دنیا میں سکھایا گیا۔ پیدا کیا گیا۔ یہ لوگ اس سے بہت دُور رہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں سارے دن میں چار دفعہ دم لیتا ہوں بعض فقط ایک یا دو دفعہ اس سے لوگ

---

[1] البدر میں ہے:- "اوّل یہ کہ انسان خود کوشش کرے لیکن یہ کوشش ناکافی ہوا کرتی ہے (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۳)

[2] البدر میں ہے:- "اسی کا نام تزکیۂ نفس ہے جب یہ ہو جاتا ہے تو انسان فلاح پاتا ہے اور اپنے سلوک کی انتہا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور جو انعامات و اکرامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کو ملتے ہیں وہ سب اسکے فضل سے مل سکتے ہیں۔ جیسے بنیا ہر روز اپنی کتاب پر حساب لکھتا ہے اور اُسے کبھی نہیں بھولتا۔ اسی طرح مومن کو چاہیئے کہ ہر وقت اپنا حساب یاد رکھے اور جب گناہ سرزد ہو تو اُن سے کُشتی کرے اور ہر وقت اس فکر میں رہے کہ گناہ سے بچایا جاوے اس طریق سے انسان گناہ سے بچ سکتا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۳)

ان کو ولی سمجھ بیٹھتے ہیں اور ایسی واہیات دم کشی کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں حالانکہ فخر کے قابل یہ بات ہے کہ انسان مرضیاتِ الٰہی پر چل کر اپنے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح و آشتی پیدا کرے جس سے کہ وہ انبیاء کا وارث کہلائے اور صلحاء و ابدال میں داخل ہو۔ اسی توحید کو پکڑے اور اس پر ثابت قدم رہے اللہ تعالیٰ اپنا غلبہ و عظمت اس کے دل پر بٹھا دیگا۔

وظیفوں کے ہم قائل نہیں۔ یہ سب منتر جنتر ہیں جو ہمارے ملک کے جوگی ہندو سنیاسی کرتے ہیں جو شیطان کی غلامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ البتہ دُعا کرنی چاہیئے خواہ اپنی ہی زبان میں ہو۔ سچے اضطراب اور سچی تڑپ سے جناب الٰہی میں گداز ہوا ہوا ایسا کہ وہ قادر الحی القیوم دیکھ رہا ہے جب یہ حالت ہوگی تو گناہ پر دلیری نہ کریگا۔ جس طرح انسان آگ یا اور ہلاک کرنے والی اشیاء سے ڈرتا ہے ویسے ہی اس کو گناہ کی سرزنش سے ڈرنا چاہیئے۔ گناہگار زندگی انسان کے لیے دُنیا میں مجسّم دوزخ ہے جس پر غضبِ الٰہی کی سموم چلتی اور اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ جس طرح آگ سے انسان ڈرتا ہے اسی طرح گناہ سے ڈرنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی آگ ہے ہمارا مذہب یہی ہے کہ نماز میں رو رو کر دُعائیں مانگو تا اللہ تعالیٰ تم پر اپنے فضل کی نسیم چلائے دیکھو شیعہ لوگ کیسے راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ حسین حسین کرتے مگر احکام الٰہی کی بے حرمتی کرتے ہیں حالانکہ حسین کو بھی بلکہ تمام رُسولوں کو استغفار کی ایسی سخت ضرورت تھی جیسے ہم کو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین کا فعل اس پر شاہد ہے۔ کون ہے جو آپ سے بڑھ کر نمونہ بن سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ صفحہ ۸ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء)

---

۲۸ مئی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

مولوی[۱] محمد علی صاحب ایم۔اے نے حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ عیسائیوں کی طرف سے بھی ایک میگزین سہ ماہی رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں پادری صاحب نے لکھا ہے کہ مسلمان عیسائیت اس لیے قبول نہیں کرتے کہ اُن کے دل سخت اور گناہ آلودہ ہیں۔ فرمایا کہ:۔

---

[۱] البدر میں اس سے پہلے یہ ذکر ہے کہ "بعد ادائے نماز مغرب حضرت اقدس نے ماہ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ ہجری القدس کا ماہِ مبارک دیکھا اور پھر اس پر فرمایا کہ "ہر مہینہ اپنے اندر خیر اور شر کے لوازم رکھتا ہے اس لیے دعا کرنی چاہیئے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۵ مورخہ ۵ جون ۱۹۰۳ء)

عیسائیت اور اسلام

جب انسان تعصب اور فاسقانہ زندگی سے اندھا ہو جاتا ہے تو اُسے حق اور باطل میں فرق نظر نہیں آتا۔ ہر ایک حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھتا ہے اور نیکی کے ترک کرنے میں ذرا دریغ نہیں کرتا۔ شراب جو اُمّ الخبائث ہے۔ عیسائیوں میں حلال سمجھی جاتی ہے[1]۔ مگر ہماری شریعت میں اس کو قطعاً منع کیا گیا ہے اور اس کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (المائدہ ۹۱:۵) کہا گیا ہے۔ کیا کوئی پادری ہے جو یہ دکھا دے کہ انجیل میں حرمت شراب کی لکھی ہے بلکہ شراب ایسی متبرک خیال کی گئی ہے کہ پہلا معجزہ مسیح کا شراب کا ہی تھا تو پھر دلیری کیوں نہ ہو۔ جو بڑا پرہیز گار اُن میں ہوگا۔ وہ کم ازکم ایک بوتل برانڈی کی ضرور استعمال کرتا ہوگا۔ چنانچہ کثرتِ شراب نے ولایت میں آئے دن نئے نئے جرائم کو ایجاد کر دیا ہے اور پادری کے اس قول پر کہ اہلِ اسلام گناہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سخت تعجب آتا ہے کہ کس حوصلہ اور دلیری سے یہ بات کہدی۔ بھلا اگر زمانہ دراز کی بات ہوتی تو ممکن تھا کہ اُن کے ایسے بہتان سے عیسائیوں کی نیک چلنی کا نسبتاً گمان ہوتا۔ مگر جب دونوں قومیں ہمارے سامنے اپنے اعمال کے دفتر کھولے بیٹھی ہیں تو پھر کسی کی شیخی اور تعلّی سے کیا فائدہ؟ روشن ضمیر پبلک خود روز روشن میں دیکھ سکتی ہے۔ ولایت کے جیل خانوں میں ہندوستان کے جیل خانوں کی نسبت جرائم پیشہ لوگوں کی کس فیصدی سے زیادتی ہے؟ جن اصولوں کو عیسائی قوم مانتی ہے وہ اصول خود جرائم مثل زنا۔ قمار بازی کے محرک ہیں۔ ان کی اصطلاح سے تو اب گناہ گناہ نہ رہنے چاہئیں۔ گویا گناہ سے وہ ایسے ہی بے پرواہ ہوگئے۔ جیسے شاکت مت والے[2]۔

---

[1] البدر میں مزید لکھا ہے :۔ "شراب جو اُمّ الخبائث ہے اُسے حلال سمجھا گیا ہے۔ اس سے انسان خشوع خضوع سے جو کہ اصل جزو اسلام ہے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جو کہ رات دن نشہ میں رہتا ہے ہوش اس کے بجا ہی نہیں ہوتے تو اُسے دوسری بدیوں کے ارتکاب میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے؟ موقعہ موقعہ پر ہر ایک بات مثل زنا۔ چوری۔ قمار بازی وغیرہ کر سکتا ہے۔ ہماری شریعت نے قطعاً اس کو بند کر دیا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ شیطان کے عمل سے ہے تاکہ خدا کا تعلق ٹوٹ جاوے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۵)

[2] نوٹ از ایڈیٹر :۔ اس موقعہ پر حضرت حکیم الامت نے ایک قصّہ سُنایا کہ جب انہوں نے ایک شاکت مت والے سے پوچھا کہ یہ کیا بُرائی ہے کہ تم لوگ بدیوں سے ذرا بھی نہیں رُکتے تو اس نے جواب دیا کہ بدی کیا ہے؟ تمہارے قرآن میں یہ شکتی کہاں ہے کہ ماں اور بہن اور بیٹی وغیرہ صلبی رشتے حلال کر دے۔ ہمارے مذہب میں تو یہ سب باتیں طے کی ہوئی ہیں۔ ٭

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت اقدس نے پھر اپنی تقریر کو شروع کیا اور فرمایا کہ :-

یورپ اور اسلامی ممالک کا موازنہ

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ایک شریف آدمی جب خلافِ واقعہ بات سُنتا ہے اور پھر اس پر اصرار کرتا ہے تو دل میں سخت رنجیدہ ہوتا ہے۔ ہمارا سوال تو یہ ہے کہ پادری صاحب سے پوچھا جاوے کہ گناہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ آیا زنا۔ چوری۔ فریب۔ قتل۔ قمار بازی۔ شراب نوشی تمہارے نزدیک گناہ میں داخل ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو کیا یورپ کی حالت اسلامی ممالک کی حالت سے بہتر ہے یا ابتر یا مساوی۔ صغائر کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ مثلاً ایک شخص بدنظری میں مبتلا ہے۔ ممکن ہے کہ اس عورت کو خبر ہی نہ ہو جس پر بدنظری کرتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو زنا کرتا، شراب پیتا ہے اس کی خبر ایک دُنیا کو ہوگی۔ ان جرائم کا اس قدر زور ہے کہ چھپائے سے چھپ سکتا ہی نہیں۔ قمار بازی میں اتلافِ حقوق ہوتا ہے۔ شراب نوشی کے ساتھ دوسرے گناہ مثلاً زنا، قتل وغیرہ لازم پڑے ہوتے ہیں جہاں تک ہمیں مجرموں کے حالات سے شہادت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شراب سے زنا ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ شراب نوشی میں اس وقت یورپ اوّل درجہ پر ہے اور زنا میں بھی اوّل نمبر پر ہے۔ اب دیکھئے کہ پردہ رسم ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ جیسا کتاب اللہ نے بتایا ہے اور تجارب نے اس کی تصدیق کی ہے سچا تزکیۂ نفس جو مجاہدات سے پیدا ہوتا ہے وہ پردہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

مومنوں کے تین طبقے ہیں :-

ایک وہ جو ٹھوکر کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔

دوسرے وہ جو میانہ رو۔ کسی ٹھوکر سے بچتے اور ڈرتے رہتے ہیں۔

تیسرے وہ جو ہر ایک ٹھوکر سے ایسے بچ کر نکل جاتے ہیں جیسے سانپ اپنی کینچلی سے وہ ہر ایک خیر کے لیے دوڑتے اور ہر ایک شر سے بھاگتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

* البدر میں یہ نوٹ زیادہ مفصل ہے لکھا ہے۔ "شاکت مت ایک ہندوؤں کا فرقہ ہے کہ جب وہ ایک خاص منتر پڑھتے ہیں تو اس وقت ماں اور بہن بیٹی وغیرہ سے مجامعت اُن کے ہاں جائز ہو جاتی ہے اور اس پر بڑا ثواب مترتب ہوتا ہے۔ حکیم نورالدین صاحب نے اس وقت ایک قصّہ سنایا کہ جب مَیں نے ایک شاکت مت والے پر ایک دفعہ اعتراض کیا تو اس نے جواب دیا کہ جب تمہارے قرآن کے منتر میں یہ طاقت ہے کہ اسکے پڑھنے سے تمہارے بھائی کی لڑکی تمہارے لڑکے کیلئے جائز ہو جاتی ہے تو ہمارے منتر میں یہ طاقت ہے کہ وہ ماں کو بھی جائز کر دیتا ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۵ مورخہ ۱۵؍ جون ۱۹۰۳ء)

جن لوگوں نے اپنے تزکیہ کا خیال نہیں کیا وہ بالضرور بے پردگی سے ٹھوکر کھا سکتے ہیں۔ عورتوں کو اُن سے پردہ کرنا چاہیئے۔ مثل مشہور ہے ؎

خربستہ بہ گرچہ دزد آشنا است

قسم اوّل ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ ٭ دوم مُقْتَصِدٌ ٭ سوم سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ

ان مختلف مدارج و مراتب کے اشخاص کیسے یکساں سلوک کے لائق ہیں؟ کیا عیسائی بتا سکتے ہیں کہ ان میں سب پاکباز ہیں۔ شرابی نہیں، زانی نہیں۔ اگر پردہ ہوتا تو ان جرائم کی نوبت کیوں آتی ہزارہا ولدالحرام کیوں پیدا ہوتے۔ تجربہ بتا رہا ہے کہ اوّل قسم کے لوگ بکثرت ہیں[1]۔ اس لیے ان سے حتی الوسع پردہ کرنے کیلئے شریعت نے مجبور کیا کہ پردہ کی رسم ہو۔ شرابی آدمی کو نہ طعن و تشنیع کا فکر ہے نہ ڈنڈے کا خوف۔ اس لیے عیسائیوں کا اسلام پذیر ہونا محالات سے ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۷ مورخہ ۱۷ ؍جون ۱۹۰۳ء)

---

۲۰ ؍مئی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

آج حضرت اقدس نے بہت سے احباب کی بیعت کے بعد تقریر فرمائی۔ فرمایا کہ:۔

نومبایعین کو نصائح

اب تم لوگ جو بیعت میں داخل ہوئے ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ تم نے عہد کیا ہے کہ ہم دین کو دنیا پر مقدم کریں گے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ عہد تمہارا اللہ کے ساتھ ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس عہد پر مضبوط رہنا چاہیئے۔ نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ امور شرعی کا پابند رہنا چاہیئے اور ہر ایک برائی اور شائبہ گناہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہماری جماعت کو ایک پاک نمونہ بنکر دکھانا چاہیئے۔ زبانی لاف و گزاف سے کچھ نہیں بنتا جب تک انسان کچھ کر کے نہ دکھائے۔ تم دیکھتے ہو کہ طاعون سے کس قدر لوگ ہلاک ہو رہے ہیں۔ گھروں کے گھر برباد ہو رہے ہیں اور ابھی تک معلوم نہیں کہ یہ تباہی کب تک جاری رہے۔ طاعون لوگوں کی بداعمالی کے سبب غضبِ الٰہی کی صورت میں بھیجی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی رسول ہے جو اس کام کو کر رہی ہے۔ ہزاروں ہیں جو اپنے سامنے ہلاک شدہ لوگوں کے پشتے پر پشتے دیکھتے ہیں۔ خاندان کے خاندان "تباہ

---

[1] البدر میں ہے:۔ "اور تیسرے درجے والے دُور کے ستاروں کی طرح ہیں اس لیے بلحاظ کثرت کے خدا کے قانون نے چاہا کہ پردہ کی رسم عام ہو۔ تجارب و نظائر بھی تبلا رہے ہیں۔ یورپ و امریکہ اور فرانس کی سیر کرو تو پتہ لگے گا"۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۱ صفحہ ۱۶۱)

ہوگئے۔ ہزاروں لاکھوں بچے بے پدر، لاکھوں خاندان بے ٹھکانہ ہوگئے۔ جہاں یہ پڑی ہے۔ بے نام نشاں اس جگہ کو کردیا بعض گھروں میں کیا، محلّوں اور گاؤں میں کوئی آباد ہونے والا نہیں رہا۔ انسانوں سے گذر کر حیوانوں کو تباہ کیا۔ گویا یہ بات کہ انسان کے گناہ سے تمام زمین لعنتی ہوگئی اب گویا اہلِ زمین کیا چرند اور کیا پرند انسان کی بدکاری کے بدلے پکڑے جارہے ہیں۔ لوگوں میں باوجود اس کے کہ سخت سے سخت عذاب میں مبتلا ہیں مگر ویسے ہی رعونت وکبر سے مخمور پھرتے ہیں۔ موت کا خوف دل سے اُٹھ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عزّت کا پاس دل میں نہیں رہا۔ عوام تو عوام خواص کا یہ حال ہے کہ دُنیا پرستی میں سخت جکڑے ہوئے ہیں۔ خدا کا نام فقط زبان پر ہی ہے اندرونہ بالکل اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت سے خالی ہے۔[1]

وفاتِ مسیحؑ

مسیح کی وفات کا کیا معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (المائدۃ:۱۱۸) بخاری میں مُتَوَفِّيكَ کے معنے صاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی مُمِيتُكَ آیا۔ حدیث کے فرمودہ کے مطابق چودہویں صدی کے سر پر مجدد آیا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ ہزاروں طرح کے حیلے دنیا نے کئے۔ طرح طرح کی شرارتیں منصوبے تجویز کئے مگر اللہ تعالیٰ کا جیسا کہ وعدہ تھا اپنے زور آور حملوں سے سچائی ظاہر کرتا رہا۔

عیسائی لوگ زہرناک کیڑے کی طرح اسلام کے درخت کی جڑ کو کاٹ رہے ہیں[2] مگر علماء کو ذرا بھی خیال

---

[1] البدر سے:۔ "پاک باطن اور پاک رُوح والے جو لوگ ہوتے ہیں وہ ان باتوں سے ہزاروں کوس دور ہوتے ہیں۔ مُلّا لوگ دین کے تھم ہوتے ہیں۔ جب وہی ایسے ہوئے تو دنیا کا کیا حال۔ ایک زہرناک کیڑا اُن کے دلوں کو کھا گیا ہے ہر ایک شخص کو دیکھ لو کہ بہت سا حصّہ دُنیا کا اُس کے اندر بھرا ہے۔ ضرورت پر مقدموں میں جھوٹے گواہ بناتے ہیں خود جھوٹ بولتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہم کامیاب ہوجاویں۔ ہر پہلو میں دیکھ لو دُنیا پرستی نے ہلاک کر دیا ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۶ مورخہ ۵ رجون ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔

"عیسائیوں کی لگاتار یہ کوشش ہے کہ کسی طرح اسلام کا نام زمین سے مٹ جاوے اور اب خدا چاہتا ہے کہ ازسرِنَو اسلام کو زندہ کرے۔ سابقہ کتب میں ان باتوں کا ذکر تھا کہ مسلمانوں کو ایک زحمت اندرونی ہوگی۔ ایمان اُٹھ جاوے گا دنیا کے کیڑے ہوجاویں گے۔ جو محبت خدا سے چاہیئے وہ دُنیا سے کریں گے۔ دوستی محبت میل ملاپ سب دُنیا کے واسطے ہوگا۔ دوسری بلا اور آفت یہ ہوگی کہ ایک انسان کی پرستار عیسائی قوم اُن کو گمراہ کرنے پر کمربستہ ہوگی۔ سو تم دیکھتے ہو کہ انہوں نے مکر کا جال کیسا پھیلایا ہے۔ شہر بہ شہر اُن کے پادری موجود ہیں۔ عورتیں ہر جگہ پھرتی ہیں۔ گاؤں میں چھاؤنیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ اُن کا ارادہ ہے کہ ایک مسلمان بھی دنیا میں نہ رہے من گھڑت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں بلکہ اپنے خیالات سے کہ مسیح زندہ آسمان پر ہے اور دوبارہ قیامت سے پہلے آئے گا. مدد دے رہے ہیں - ان کی لگاتار کوشش یہی ہے کہ اسلام کا نام تک مٹ جائے اور یہ اپنے فاسد عقیدہ سے اُن کو مدد دے رہے ہیں۔ دیکھو لوکہ پادریوں نے شہر بہ شہر گاؤں بہ گاؤں مکروتزویر کا جال پھیلایا ہوا ہے۔ عورتوں اور بچوں تک کمربستہ ہیں کہ کسی طرح ایک عاجزہ کے بیٹے کو خدا بنا کر منوادیں. کئی کروڑ کتابیں ردّ اسلام میں بنا کر مفت تقسیم کردیں۔ اس پر بھی مسلمانوں کو غیرت نہ آئی۔ وہ خدا جو کہتا ہے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) کیا وہ غلط کہتا ہے؟ کیا اسلام کی وہ ابھی حالت نہیں ہوئی جو کسی مصلح ومجدد کی ضرورت پیدا کرے۔ طرح طرح کے زمینی اور آسمانی نشان پورے ہو چکے مگر وہ اب تک منکر ہیں۔ آج تک ۲۹ لاکھ مسلمان مُرتد ہوگئے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اگر ایک مسلمان مرتد ہوجاتا تھا تو قیامت برپا ہوجاتی تھی جس قدر مسلمان باقی ہیں وہ بھی عیسائیت کے قریب قریب ہی ہیں - اگر سو سال تک ایسی ہی حالت رہتی تو اسلام کا نام نشان زمین سے مِٹ جاتا۔ لیکن خدا تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے عین ضرورت کے وقت مجھے مسیح موعود کرکے بھیجا۔

یہ بات کوئی بناوٹی نہیں۔ صدہا نشان خرق عادت کے طور پر آسمان وزمین پر میری تصدیق کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

باتیں بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبیاں کرتے ہیں اور رات دن اس کوشش میں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے دل بیزار ہوں۔ حال کے مسلمان جن کی مت ماری گئی ہے. بدقسمتی سے اندھے ہوگئے ہیں۔ وہی بات کرتے ہیں کہ اسلام کو فائدہ نہ پہنچے اور عیسائیوں کو پہنچے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۳ برس کہتے ہیں اور مسیح کو قیامت تک زندہ مانتے ہیں۔ پھر یہ کہ آخری زمانہ میں وہی آوے گا۔ حَکَم اور قاضی بھی وہی ہوگا۔ دوسری بات یہ مانتے ہیں کہ وہ خالق بھی ہے۔ جانور اس نے بنائے۔ مُردہ اس سے زندہ ہوگئے غرض کہ اس قسم کی باتوں سے عیسائیوں کی اس قدر تائید کرتے ہیں کہ ان میں اور عیسائیوں میں صرف انیس اور بیس کا فرق رہ جاتا ہے جس قدر وہ باتیں مسیح کی نسبت کرتے ہیں ویسی ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت نہیں کرتے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۶ مورخہ ۵ جون ۱۹۰۳ء)

[1] البدر سے :- ایک طرف نہ ان میں تقویٰ الٰہی نہ طہارت۔ ایک طرف عیسائی غالب آگئے۔ کئی لاکھ رسالے ہر ماہ عیسائیوں کی طرف سے نکلتے ہیں جن میں افترا، عیب شماری، اور ہتکِ اسلام کے مضامین ہوتے ہیں۔ جس حالت میں خدا تعالیٰ نے اسلام کی نسبت کہا کہ وہ قیامت تک زندہ مذہب ہوگا وہ اسلام کی اس حالت کو کیسے دیکھے؟ اگر اب بھی وہ مجدد نہ بھیجے؟ حالانکہ سَو سال صدی کے گذر گئے۔ ۲۰ سال اَور بھی اوپر ہوئے تو اب اندازہ کرلو کہ اور ایک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں[1]۔ چنانچہ طاعون بھی ایک نشان ہے جس کی بابت کل انبیاء خبر دیتے رہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے اِنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا نَحْنُ مُھْلِکُوْھَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ اَوْمُعَذِّبُوْھَا (بنی اسرائیل : ۵۹) کوئی بستی اور کوئی گاؤں ایسا نہ ہوگا کہ جسے ہم قیامت سے پہلے پہلے خطرناک عذاب میں مبتلا نہ کردینگے یا ہلاک نہ کردیں گے۔

غرضکہ یہ منذر نشان ہے کسوف وخسوف کا نشان لوگوں نے ہنستے ہوئے دیکھا اور طاعون کا نشان روتے ہوئے۔

احمدیوں کا طاعون سے مرنا

بعض نادان اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے آدمی کیوں مرتے ہیں۔ ان نادانوں کو اتنا معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی جب لوگ عذاب کا معجزہ مانگتے تھے تو اُن کو تلوار کا معجزہ ملا اور یہ بھی ایک قسم کا عذاب تھا۔ چنانچہ[2] کئی صحابہؓ بھی تلوار سے شہید ہوئے مگر کیا ابو بکرؓ و عمرؓ جیسے بھی ہلاک ہوئے؟ اللہ تعالیٰ نے جس جس انسان کے دماغ یا ہاتھ سے کوئی اپنا کام لینا تھا وہ تو بچ ہی رہے اور بالمقابل جتنے رئیس کفار تھے اُن سب کا ٹھکانا جہنم ہوا۔ اور ان کے صغیر و کبیر سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

صدسال تک اسلام کا کیا حال ہوگا؟ سو برس بعد مجدد آنے میں یہ حکمت ہے۔ ایک سو سال کے گذرنے تک پہلے علم والے گذر جاتے ہیں اور اپنی باتیں اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں اگر نئے علوم پھر خدا نہ بتلا دے تو حق کیسے قائم رہے؟ چونکہ علم میں فرق آجاتا ہے اس لیے آسمان پر ایک نئی بنیاد ڈالی جاتی ہے تم دیکھتے ہو کہ صدی گذر گئی اور اس پر ۲۰ برس اَور بھی گذر گئے اب خدا تعالیٰ نے ایک سلسلہ قائم کیا اور مجھے مسیح موعود بنایا۔ یہ بات بناوٹی نہیں ہے اس کے واسطے نشانیاں ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۶)

[1] البدر سے :۔

"لکھا ہوا تھا کہ چاند اور سورج کا گرہن ماہ رمضان میں ہوگا ویسے ہی ہوا۔ پھر طاعون لکھی تھی۔ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر ستر ستر بلکہ پچہتر برس کی ہوتی ہے ابھی تو کُے آمدی اور کُے پیر شُدی والا معاملہ ہے۔ یہ خدا کی لعنت ہے فیصلہ کرکے چھوڑے گی۔ سب انبیاء نے اس کی خبر دی ہے۔ قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے جیسے کہ لکھا ہے اِنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا نَحْنُ مُھْلِکُوْھَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ اَوْمُعَذِّبُوْھَا۔" (بنی اسرائیل : ۵۹) (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۶)

[2] البدر میں ہے :۔ "اگرچہ مقابلہ کے وقت اصحابؓ بھی شہید ہوئے تھے مگر اسلام تو اُن کے ساتھ شہید نہ ہو جاتا تھا۔ ہر روز ترقی اسلام کی ہوتی۔ کفار گھٹتے گھٹتے ایسے معدوم ہوگئے کہ اُن کا نام ونشان نہ رہا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۶)

اگر ایک شخص کا ایک پیسہ چوری ہو گیا ہے اور دوسرے کا تمام گھر بار لُوٹا گیا ہے تو کیا وہ آدمی جس کا تمام گھر بار لُوٹا گیا پیسہ والے کو کہہ سکتا ہے کہ تم اور مَیں برابر ہیں؟ بھلا سوچو تو سہی اگر ستر برس تک ہمارا کوئی آدمی ہلاک نہ ہو تو ایسا کونسا آدمی ہے جو ہمارے سلسلہ میں داخل ہونے سے رُکا رہے؟

مگر اللہ تعالیٰ کو یہ امر منظور نہیں ہے اور نہ کبھی ایسا ہوا۔ ایمان کی حالت ہی کا پوشیدہ ہونا ضروری ہے جب تک ہماری جماعت تقویٰ اختیار نہ کرے نجات نہیں پا سکتی خدا تعالیٰ اپنی حفاظت میں نہ لے گا۔ یہی سبب ہے کہ بعض ان صحابہؓ میں سے جن جن سے بڑے بڑے کام لینے تھے وہ سب سخت سے سخت خطروں میں بھی بچائے گئے۔ دوسروں کو خدا تعالیٰ نے جلد اُٹھا کر بہشت میں داخل کیا۔ جاہل کو حقیقت معلوم نہیں ہوتی جو بات مُنہ میں آئی کہہ دی۔ ہر ایک نبی کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔ جہاں کفار مرتے تھے۔ وہاں اصحاب میں سے بھی کوئی نہ کوئی مر جاتا تھا۔ اگر خدا تعالیٰ کُھلا کُھلا نشان مثلاً سوٹے کا سانپ کر دیتے[1] تو نیک و بد میں فرق کیا رہیگا؟ تمام یورپ و امریکہ اسلام میں داخل ہو جاویں گے مگر خدا تعالیٰ نے ہمیشہ امتیاز رکھا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو خدا تعالیٰ نے توحید پھیلانے کے لیے پیدا کیا اور انہوں نے توحید پھیلائی۔ اب بھی خدا تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ توحید پھیلے جو آوے گا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے محروم نہ رہے گا مگر چاہیئے کہ اپنے وجود کو مفید بنا دے[2] اللہ تعالیٰ خود انکی حفاظت کریگا۔ زبان سے خدا خدا کہنا مگر عمل سے خدا تعالیٰ سے بیگانگی ایک طرح کا دہریہ پن ہے[3]

گھروں کو ذکر اللہ سے معمور کرو۔ صدقہ و خیرات دو۔ گناہوں سے بچو تا اللہ تعالیٰ رحم کرے جو لوگ بیعت

---

[1] البدر میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:۔ " ہر نبی کے ساتھ ایسا ہوا کہ جہاں کفار مرتے رہے اس کی جمعیت میں سے بھی کچھ مرتے رہے۔ حضرت موسیٰؑ کی جنگ میں اگر ایک طرف کنعانی مرتے تو ایک طرف اسرائیلی بھی مرتے۔ اگر خدا ایسی ہی کُھلی کُھلی بات کر دے کہ اندھے بھی فرق کریں تو پھر ایک بھی کافر نہ رہے۔ سوٹے کا سانپ اگر بنا دیا تو اس سے لوگوں کو کیا؟ مگر جان کے بچنے کا علاج اگر ان کو ملتا ہو تو ایمان لانے سے کون باہر رہتا ہے۔ تمام یورپ و امریکہ بھی جلد ہی داخل اسلام ہو جاویں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۵۶ مورخہ ۵ رجون ۱۹۰۳ء)

[2] البدر سے:۔ " اپنے وجود کو جس قدر کارآمد بنا دیگا اسی قدر اس کی حفاظت ہوگی۔" (حوالہ مذکورہ)

[3] البدر میں ہے:۔ " جب انسان ایک بدی کرتا ہے اور جانتا ہے کہ خدا نے اس سے منع کیا ہے تو وہ دہریہ ہوتا ہے خدا کی عظمت اور جلال اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ ایسا شخص خدا کی حفاظت میں نہیں ہے وہ جب چاہے اُسے مار دے یا ایسی بلا میں اُسے ڈال دے کہ نہ زندوں میں ہو اور نہ مُردوں میں، لیکن جو شخص خدا کی عظمت دل میں رکھتا ہے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ کسی مصیبت میں پڑے خدا کی نظر میں ہوتا ہے اور وہ اُسے محفوظ رکھتا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۱ صفحہ ۱۶۱ مورخہ ۱۲ رجون ۱۹۰۳ء)

کرکے چلے جاتے ہیں اور پھر شکل بھی نہیں دکھلاتے اُن کے لیے دُعا کیا ہو جب ہمیں وہ یاد تک بھی نہیں رہتے۔ بار بار ملو اور تعلق محبت بڑھاؤ۔ جو بار بار آتا ہے اس کی ذراسی تکلیف سے دُعا کا خیال آجاتا ہے مگر جو لوگ دُنیا کے معاملات میں مستغرق رہتے ہیں وہ ایسے ہی ہیں گویا انہوں نے بیعت ہی نہیں کی[1]۔ یاد رکھو اور عمل کرو جو جس سے پیار کرتا ہے وہ انہیں میں سے ہے[2]۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۷، ۱۸ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۳ء)

---

۳۰ مئی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ایک صاحب کے مقدمہ کی تاریخ عنقریب تھی۔ وہ دُعا کروانے کے واسطے آئے تو حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

چار پانچ دن یہاں رہو اور ہر روز ملاقات کرو کہ دُعا کی تحریک ہو۔ یہ خیال نہ کرو کہ پیچھے نقصان ہوگا سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اسباب پر نظر نہ رکھو ہم یہ نہیں کہتے کہ رعایت اسباب ہی چھوڑ دو۔ بلکہ یہ کہ یہ نہ خیال کرو کہ فلاں بات ہو تو ہی یہ ہوگا۔ جیسے کہ روٹی کھانی پانی پینا منع نہیں ہے۔ مگر اس پر یہ بھروسہ کرنا کہ اس سے زندگی ہے یہ منع ہے۔ کئی آدمی روٹی کھاتے ہیں۔ ادھر سُول (درد) ہوا اور جان گئی۔ پانی پیا اور ہیضہ سے مر گئے۔ ان پر بھروسہ کرنا یہ شرک ہے۔ اسباب وہی بہم پہنچاتا ہے۔

ریاست کپورتھلہ سے خبر آئی کہ بعض لوگوں نے ایک مشورہ کرکے اس امر کا منصوبہ بنانا چاہا ہے کہ وہاں کی احمدی جماعت کے بعض ممبروں کو ایذا دیویں۔ اس پر فرمایا کہ:۔

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۵۶) یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ فتنہ فساد ہو۔ دُعا کی جاوے گی۔ ایک شخص نے عرض کی کہ سارے گاؤں میں مَیں ایک اکیلا آپ کا مرید ہوں۔ فرمایا خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والا اکیلا نہیں ہوتا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۱ صفحہ ۱۶۱ مورخہ ۱۲ر جون ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر سے:۔ "مگر جو دُنیا میں اس قدر غرق ہے کہ گویا اس نے بیعت ہی نہیں کی۔ اور اُسے ملنے کی فرصت ہی نہیں کیا وہ ان لوگوں کے برابر ہو سکتا ہے جو بار بار آکر ملتے رہتے ہیں؟"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۱ صفحہ ۱۶۱ مورخہ ۱۲ر جون ۱۹۰۳ء)

[2] البدر سے:۔ "بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ مسلمان ہو کر پادریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض ہندوؤں سے رکھتے ہیں۔ خدا فرماتا ہے کہ پھر وہ انہی میں سے ہیں۔ یہ باتیں ہیں انکو یاد رکھو اور خدا سے عمل کی توفیق طلب کرو۔" (البدر حوالہ مذکورہ بالا)

یکم۔ ۲۔ ۳؍ جون ۱۹۰۳ء

مقدمہ ہمیشہ سیدھا کرنا چاہیئے

ان تاریخوں میں کوئی اور بات قابلِ نوٹ نہیں ہے۔ ایک بار مقدمات کے ذکر پر فرمایا کہ:-

مقدمہ ہمیشہ سیدھا کرنا چاہیئے۔ جب معلوم ہو کہ از روئے قانون بھی صاف طور پر ہمارا حق ثابت ہے اور از روئے شریعت بھی تو ابتدا کرنی چاہیئے ورنہ پیچ در پیچ بات ہو تو کبھی مقدمہ کی طرف نہ جانا چاہیئے

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۱ صفحہ ۱۶۲ مورخہ ۱۲؍ جون ۱۹۰۳ء)

۴؍ جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ایک رویاء

فرمایا۔ دو یا تین بجے رات کو میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک جگہ پر مع چند ایک دوستوں کے گیا ہوں۔ وہ دوست وہی ہیں جو رات دن پاس رہتے ہیں۔ ایک ان میں مخالف بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سیاہ رنگ، لمبا قد، اور کپڑے چرکیں ہیں۔ آگے جاتے ہوئے تین قبریں نظر آئی ہیں۔ ایک قبر کو دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ والد صاحب کی قبر ہے اور دوسری قبریں سامنے نظر آئیں۔ میں ان کی طرف چلا۔ اس قبر سے کچھ فاصلہ پر گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب قبر (جسے میں نے والد صاحب کی قبر سمجھا تھا) زندہ ہو کر قبر پر بیٹھا ہوا ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اور شکل ہے والد صاحب کی شکل نہیں۔ مگر خوب گورا رنگ، پتلا بدن، فربہ چہرہ ہے میں نے سمجھا کہ اس قبر میں یہی تھا۔ اتنے میں اُس نے آگے ہاتھ بڑھایا کہ مصافحہ کرے۔ میں نے مصافحہ کیا اور نام پوچھا تو اس نے کہا نظام الدین۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔ آتے ہوئے میں نے اُسے پیغام دیا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور والد صاحب کو السلام علیکم کہہ چھوڑنا۔ راستہ میں میں نے اس مخالف سے پوچھا کہ آج جو ہم نے یہ عظیم الشان معجزہ دیکھا۔ کیا اب بھی نہ مانو گے؟ تو اس نے جواب دیا کہ اب تو حد ہو گئی۔ اب بھی نہ مانوں تو کب مانوں۔ مُردہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد الہام ہوا۔ سَلِیْمٌ حَامِدٌ مُّسْتَبْشِرًا کچھ حصہ الہام کا یاد نہیں رہا۔

والد کا زندہ ہونا یا کسی اور مُردہ کا زندہ ہونا کسی مُردہ امر کا زندہ ہونا ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی سمجھا کہ ہمارا کام والدین کے رفع درجات کا بھی موجب ہے۔

شرطی طلاق

فرمایا کہ :-
اگر شرط ہو کہ فلاں بات ہو تو طلاق ہے اور وہ بات ہو جائے تو پھر واقعی طلاق ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص کہے کہ اگر فلاں پھل کھاؤں تو طلاق ہے اور پھر وہ پھل کھالے تو طلاق ہو جاتی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۱ صفحہ ۱۶۲ مورخہ ۱۲؍جون ۱۹۰۳ء)

۵؍جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ایک رکعت میں قرآن ختم کرنا

ذکر ہوا کہ ایک رکعت میں بعض لوگ قرآن کو ختم کرنا کمالات میں تصور کرتے ہیں اور ایسے حافظوں اور قاریوں کو اس امر کا بڑا فخر ہوتا ہے۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ :-

یہ گناہ ہے اور ان لوگوں کی لاف زنی ہے۔ جیسے دُنیا کے پیشہ والے اپنے پیشہ پر فخر کرتے ہیں ویسے ہی یہ بھی کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کو اختیار نہ کیا۔ حالانکہ اگر آپ چاہتے تو کر سکتے تھے مگر آپ نے چھوٹی چھوٹی سورتوں پر اکتفا کی۔

انعامات کی اُمّ

پھر فرمایا کہ :-
ہر ایک شئے کی ایک اُمّ ہوتی ہے۔ مَیں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہیں اُن کی اُمّ کیا ہے؟ خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ اُن کی اُمّ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن : ۶۱) ہے۔ کوئی انسان بدی سے بچ نہیں سکتا جب تک خدا تعالیٰ کا فضل نہ ہو پس اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ فرما کر یہ جتلا دیا کہ عاصم وہی ہے اسی کی طرف تم رجوع کرو۔

استغفار کی حقیقت

گناہ جو انسان سے صادر ہوتا ہے اگر انسان یقین سے توبہ کرے[۱] تو خدا بخش دیتا ہے۔ پیغمبرِ خدا جو ستر بار استغفار کرتے تھے حالانکہ ایک دفعہ کے استغفار سے گذشتہ گناہ معاف ہو سکتے تھے۔ پس اس سے ثابت ہے کہ استغفار کے یہ معنے ہیں کہ

---

[۱] الحکم سے :- "گناہ سچی توبہ سے دُور ہو جاتا ہے۔ سچی توبہ عصمت و حفاظت کا ایک جامہ پہناتی ہے۔"
(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۴ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۳ء)

خدا تعالیٰ آئندہ ہر ایک غفلت اور گناہ کو دبائے رکھے اس کا صدور بالکل نہ ہو[1]۔ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النجم:۳۳) سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ معصوم اور محفوظ ہونا تمہارا کام نہیں ہے خدا کا ہے۔ ہر ایک نُور اور طاقت آسمان سے ہی آتی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۶۹ مورخہ ۱۹ جون ۱۹۰۳ء)

---

۶ جُون ۱۹۰۳ء

طبابت کا پیشہ

ڈاکٹری کے امتحان کا ذکر تھا اس پر فرمایا کہ:۔

پاس کے خیال میں مستغرق ہو کر اپنی صحت کو خراب کر لینا ایک مکروہ خیال ہے۔ اوّل زمانہ کے لوگ علم اس لیے حاصل کرتے تھے کہ توکّل اور رضائے الٰہی حاصل ہو۔ اور طبابت تو ایسا فن ہے کہ اس میں پاس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب ایک طبیب شہرت پا جاتا ہے تو خواہ فیل ہو مگر لوگ اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تحصیلِ دین کے بعد طبابت کا پیشہ بہت عمدہ ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۶۹ مورخہ ۱۹ جون ۱۹۰۳ء)

---

۷ جُون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

ایمان لانے کے مختلف طریق

ایک شخص نے حضرت اقدس کی بیعت کی نسبت کچھ بشارات خدا تعالیٰ سے پائی تھیں وہ حضرت کی خدمت میں تحریر کر کے روانہ کی تھیں۔ حضرت اقدس نے ان کو سُن کر فرمایا کہ:۔

جو لوگ فطری امور کی استعداد نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ اُن کو بذریعہ رؤیا کے سمجھا دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے بھی یہ بات تھی کہ لوگ رؤیا دیکھتے اور بعض وہ تھے جو کہ آپ کے جُود و سخا کو دیکھکر ایمان لائے اور پھر آپ نے سب کو ایک ہی راہ سے گذرانا۔ یہ ایک مشکل کام ہے کہ ہر ایک کی رعایت بھی

---

[1] الحکم سے :۔"تا ہر ایک غفلت و کسل سے اللہ تعالےٰ محفوظ رکھے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۴)

مدنظر رہے اور پھر ایک ہی راہ سے سب کو گذارا جاوے۔[۱]

آپ پر ایمان لانے کے مختلف طریق تھے۔ بعض اخلاق دیکھ کر ایمان لائے تھے۔[۲] غرضکہ آدم سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک جسقدر طریق جمع ہو سکتے تھے وہ سب آپ میں جمع تھے۔ یہ بھی ایک مجموعہ جمع کرنے کے قابل ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے طریق کیا کیا تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار میں سے ایک توجہ کا بھی حصّہ ہے کہ جو لوگ قسی القلب تھے وہ بھی کھچے چلے آتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بادشاہ ثمامہ کو باندھا گیا آپ اس کے حالات ہر روز دریافت کرتے۔ چنانچہ چند روز کے بعد حکم دیا کہ اُسے چھوڑ دیا جاوے۔ پھر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ پہلے دنیا کے تمام ناموں سے تیرا نام مجھے بہت بُرا معلوم ہوتا تھا اور آج وہی نام سب سے پیارا ہے اور اس شہر سے مجھے بہت نفرت ہوتی تھی لیکن اب اس شہر کو محبّت اور پیار کی جگہ دیکھتا ہوں۔ تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ہی تھی جس سے باطنی چرک و مَیل دُور ہوتی تھی۔ اس کو بنظرِ استخفاف نہ دیکھنا چاہیئے۔ توجہ میں بھی ایک قوتِ قدسیہ اور تاثیر ہوتی ہے۔[۳]

---

[۱] الحکم میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:۔

"انبیاء کے ماننے کے مختلف طریق ہیں بعض ایسے اشخاص ہیں جو رویائے صادقہ کے ذریعہ ایمان لاتے ہیں اور بعض دلائل عقلی و نقلی کے ذریعہ۔ اور بعض پیغمبروں اور ماموروں کے اخلاق فاضلہ دیکھکر۔ الغرض ایمان لانے کے مختلف طریق ہیں مگر سب کو ایک ہی تنگ راہ سے گذارنا بہت ہی مشکل ہے۔ بلکہ ہر ایک فرد بشر کے الگ الگ مذاق کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۴ مورخہ ۲۴ / جون ۱۹۰۳ء)

[۲] الحکم سے:۔ "بعض آپ کا جود و سخا دیکھکر ہی ایمان لائے اور بعض اَور اَور محامد و محاسن مشاہدہ کرکے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجود پاک میں تمام انبیاء علیہم السلام کے محامد کے جامع تھے جس کے سبب سے آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہلائے اس لیے آپ پر ایمان لانیوالے بھی ہر ایک مختلف طور و طریق کو دیکھ کر آپ کے پیچھے ہو لیے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۴ مورخہ ۲۴ / جون ۱۹۰۳ء)

[۳] الحکم میں یہ عبارت یوں لکھی ہے:۔

"اس نے کہا کہ پہلے آپ کا نام مبارک مجھے تمام ناموں سے زیادہ مذموم معلوم ہوتا تھا مگر اب تمام ناموں سے زیادہ محمود و پیارا معلوم ہوتا ہے اور اس شہر کو جس میں آپ رہتے ہیں مَیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا مگر اب یہی محبوب ترین نظر آتا ہے۔ یہ کیا بات تھی جس نے اس شخص کو گرویدہ بنالیا؟ یہ حضور علیہ السلام کی توجہ کا اثر تھا۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۴ مورخہ ۲۴ / جون ۱۹۰۳ء)

صحابہؓ کا اخلاص اور اس کا اجر

صحابہ کرامؓ کے حالات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ گرمی دیکھی نہ سردی اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ نہ عزت کی پروا کی نہ جان کی۔ بکری کی طرح ذبح ہوتے رہے۔ اس طرح کی نظیر پیش کرنی آسان نہیں ہے۔ اس جماعت کے اخلاص کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہے کہ جان دیکر اخلاص ثابت کیا۔ ان کے نفس بالکل دنیا سے خالی ہو گئے تھے۔ جیسے کوئی ڈیوڑھی پر کھڑا سفر کے لیئے تیار ہوتا ہے ویسے ہی وہ لوگ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کے واسطے تیار تھے[1]۔

لوگوں کے کاموں میں بہت حصہ دُنیا کا ہوتا ہے اور اس فکر میں ہوتے ہیں کہ یہ کرو وہ کرو اور وقت مؤجل آ پہنچتا ہے۔ خدا ایسا نہیں کہ کسی کو ضائع کرے[2]۔ یہ اعتراض کہ ہمارے املاک تباہ ہو جاویں گے غلط ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ابوبکرؓ وغیرہ کے املاک ہی کیا تھے؟ ایک ایک دو دو سو یا کچھ زیادہ روپیہ کسی کے پاس ہوگا مگر اُس کا اجر اُن کو یہ ملا کہ خدا تعالیٰ نے بادشاہ کر دیا اور قیصر و کسریٰ کے وارث ہو گئے[3] مگر خدا تعالیٰ کی غیرت یہ نہیں چاہتی کہ کچھ حصہ خدا کا ہو اور کچھ شیطان کا اور توحید کی حقیقت بھی یہی ہے کہ غیر از خدا کا کچھ بھی حصہ نہ ہو۔ توحید کا اختیار کرنا تو ایک مرنا ہے لیکن اصل میں یہ مرنا ہی زندہ ہونا ہے۔

مومن جب توبہ کرتا ہے اور نفس کو پاک صاف کرتا ہے تو خوف ہوتا ہے کہ مَیں تو جہنّم میں جا رہا ہوں کیونکہ تکالیف کا سامنا ہوتا ہے مگر خدا تعالیٰ اُسے ہر طرح سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ موت مختلف طریق سے مومنوں پر

---

1. صحابہؓ کے اخلاص کا ذکر الحکم میں ان الفاظ میں ہے:۔ "صحابہ کرامؓ کے حالات کو دیکھ کر سُنکر تعجب آتا ہے کہ انہوں نے نہ گرمی دیکھی نہ سردی نہ عزت اور نہ آبرو۔ سب دنیوی فخر و ناز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر خاک میں ملا دیا۔ ہر ایک ذلت آپ کی نافرمانبرداری میں اور ہر ایک عزت آپ کی اطاعت میں ہی دیکھی۔ بھیڑ و بکری کی طرح آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ذبح ہو گئے۔ کوئی قوم کوئی مذہب دنیا میں ہے جو سچی قربانی کی مثال صحابہؓ سے بڑھ کر دکھا سکے؟ جان دیکر سچا اخلاص دکھانا اسی کو کہتے ہیں۔ اُن کے نفس بالکل کدورتِ دنیا سے پاک ہو چکے تھے جیسے کوئی گھر سے نکل کر ڈیوڑھی پر کھڑا ہو کر سفر کے لیے تیار ہوتا ہے ویسے ہی وہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کے واسطے تیار تھے"۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۴، ۱۵ مورخہ ۲۴ رجون ۱۹۰۳ء)
2. الحکم سے:۔ "جو لوگ اللہ کے لیے کچھ کھوتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ پا لیتے ہیں"۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)
3. (الحکم سے) "مگر چونکہ انہوں نے پورے اخلاص سے اپنے اتنے کچھ اندوختہ کو راہِ مولا میں قربان کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اجر میں قیصر و کسریٰ کے خزائن کا مالک کر دیا۔ سب کچھ کامل ایمان اور سچے اخلاص سے ملتا ہے"۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)

وارد ہوتی ہے کسی کو لڑائی سے کسی کو کسی طرح سے[1]۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جنگ نہ کی تو آپ کو لڑکے کی قربانی کرنی پڑی۔

یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ خدا پر اُمید رکھے اور ایک اَور بھی حصہ دار ہو۔ قرآن میں بھی لکھا ہے کہ حصہ سے خدا راضی نہیں ہوتا بلکہ فرماتا ہے کہ حصہ داری سے جو حصہ انہوں نے خدا کا کیا ہوتا ہے وہ بھی خدا انہی کا کر دیتا ہے۔ کیونکہ غیرت احدیت حصہ داری کو پسند نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء باوجود غریب۔ یتیم اور بیکس اور بلا اسباب ہونے کے اور پھر بموجب قانون دنیا کے بے ہنر ہونے کے آگے سے آگے قدم بڑھاتے ہیں اور یہ سب سے پہلا ثبوت خدا تعالیٰ کی خدائی کا ہے[2]۔ اسی لیے اُن کے مخالف حیران ہو جاتے ہیں۔ کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ۔ جو شخص بڑا جاہل اور ان کے تقدس سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ بھی کم از کم اُن کی دانائی کا قائل ہوتا ہے جیسے عیسائی لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں پوری ہوتی دیکھ کر کہتے ہیں کہ وہ بہت دانا آدمی تھا۔

توبہ ہی طاعون کا علاج ہے

طاعون کے علاج کی نسبت فرمایا کہ :۔

بجز اس کے کہ توبہ ہو اَور سب تجاویز جو اس کے علاج کے لیے سوچی جاویں خدا کے ساتھ مقابلہ ہے۔ کوئی تجویز ہونا کافی ہے جب تک خدا سے صلح نہ ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۷۰ مورخہ ۱۹؍جون ۱۹۰۳ء)

۱۱؍جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

حقیقت اور معرفت

فرمایا کہ :۔

در حقیقت خدا تعالیٰ نے تنگی کسی بات میں نہیں

---

[1] الحکم میں یہ عبارت یوں ہے :۔ "اللہ تعالیٰ ہر ایک مومن پر طرح طرح کے ابتلاء اور آزمائش لاتا ہے۔ کسی کو جنگ میں آزمانے سے، کسی کو روپیہ پیسہ سے، کسی کو بیٹے کے قربان کرنے سے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)

[2] الحکم سے :۔ انبیاء کی زندگی کے واقعات صاف تبلا رہے ہیں کہ آپ کیسے آگے سے آگے قدم بڑھاتے رہے حالانکہ اُن کے دشمن ہر آن اُن کی ذلّت و رسوائی سے ناکامیابی کے دل سے خواہاں اور امید کرنے والے تھے۔ مگر غیرتِ الٰہی نے اُن کو باوجود ایسی تمام روکاوٹوں کے ہر ہر موقعہ پر ہر ہر میدان میں فتح و نصرت عطا کی۔ الغرض فتح و کشود کاری کی کلید توکل و توحید ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)

رکھی جو ڈھونڈھ یا بندہ ہوتا ہے [1]

فرمایا کہ :۔

دو شخص برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک وہ جو حقیقت پر پہنچتا ہے اور ایک وہ جو معرفت تک[2]۔ جیسے رؤیت اور سماع برابر نہیں ہو سکتے ویسے ہی یہ بھی برابر نہیں ہے۔ جو عارف ہے اور نمونہ قدرت دیکھ چکا ہے اور ایک دوسرا جس کے پاس کوئی نظیر نہیں کہ جسے پیش کر سکے، صرف ظنی امور پاس ہیں وہ کیسے برابر ہوں۔

خدا کی صفات کا علم ہونا ضروری ہے

ایک ہندو کا ذکر ہوا کہ وہ کہتا ہے کہ سب مذہب نجات یافتہ ہیں۔ اور آپ مسیح بھی سچے ہیں۔ وہ اپنے خیال کی تائید میں یہ شعر پیش کرتا ہے۔

ذات پات نہ پوچھے کو ؎ جو ہر کو بھجے سو ہر کا ہو

فرمایا :۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ جو خدا تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کرے وہی اس کا ہو سکتا ہے مگر اس بات کا تو پتہ ہونا چاہیئے کہ آیا خدا کو پوج رہا ہے یا شیطان کو؟ کیا وہ کسی اَور کا پجاری ہو کر خدا کا ہو سکتا ہے؟ اس لیے اوّل خدا کی صفات کا علم ہونا ضروری ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۷۰ مورخہ ۱۹ جون ۱۹۰۳ء)

---

۱۲ جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

موسیٰ کا خضر کے قتل نفس پر اعتراض کرنا کیوں درست نہ تھا؟

سوال :۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ تورات میں حکم تھا کہ کوئی نفس بلا کسی نفس کے بدلہ قتل نہ کیا جائے تو پھر خضر علیہ السلام نے کیوں اس جان کو قتل کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے جو اس پر سوال کیا تو اُسے کیوں خلافِ ادب جانا گیا؟ موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی رُو سے سوال کیا تھا [3]

---

[1] الحکم میں یوں ہے :۔ "اللہ تعالیٰ کسی کی سعی کو ضائع نہیں کرتا۔ جو ڈھونڈھ یا بندہ" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)

[2] الحکم میں یہ عبارت یوں ہے :۔ "صاحب شریعت اور صاحبِ عرفان دونوں برابر نہیں ہو سکتے" (" " " " ")

[3] الحکم میں ہے :۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام بلحاظ شریعت مُنَزّلہ حق پر تھے۔" (" " " " " ")

جواب :۔ فرمایا :۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ (المائدۃ : ۳۳) کے ساتھ آگے اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ (المائدۃ : ۳۳) بھی لکھا ہے۔ فساد کا لفظ وسیع ہے۔ جو شئی کسی زمانہ میں فساد کا موجب ہو سکتی ہے وہ آئندہ زمانہ میں قتل نفس کا موجب بھی ہو سکتی ہے۔ حشرات الارض کو ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں ہزاروں روز مارے جاتے ہیں اس لیے کہ وہ کسی کی ایذا کا موجب نہ ہوں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ قتل الموذی قبل الایذاء۔ تو ہر ایک موذی شئے کا قتل اس کے ایذا دینے سے قبل جائز ہوتا ہے۔ حالانکہ اس مُوذی نے ابھی کوئی قتل وغیرہ کیا نہیں ہوتا۔[1] شریعت اور الہامی اور کشفی امور الگ الگ ہیں۔ اس لیے اُن کو شریعت کے ظاہری الفاظ کے تابع نہ کرنا چاہیئے۔ وحی الٰہی کا معاملہ ہی اَور ہوتا ہے اس کی ایک دو نظیریں نہیں بلکہ ہزارہا نظائر ہیں بعض وقت ایک ملہم کو الہام کی رُو سے ایسے احکام بتلائے جاتے ہیں کہ شریعت کی رُو سے اُن کی بجاآوری درست نہیں ہوتی۔ مگر جسے بتلائے جاتے ہیں اُسے اُن کا بجالانا فرض ہوتا ہے اور عدم بجاآوری میں اُسے موت نظر آتی ہے اور سخت گناہ ہوتا ہے حالانکہ شریعت اُسے گناہ قرار ہی نہیں دیتی۔ یہ تمام باتیں مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا کے تحت میں ہوتی ہیں ایک جاہل تو اُن کو شریعت کے مخالف قرار دیگا اور اعتراض کریگا مگر وہ اس کی بیوقوفی ہوگی۔ وہ بھی اصل میں ایک شریعت ہی ہے[2]۔ جب سے دنیا چلی آئی ہے یہ دونو باتیں ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں یعنی[3] ایک تو ظاہر شریعت جو

---

۱ الحکم میں ہے :۔ "قانون قدرت ہمیں اس قانون کے رواج کا نشان دیتا ہے۔ قرآن کریم اور دیگر کسی شریعت آسمانی نے بھی یہی جائز رکھا اور عقل انسانی بھی اس قتل حفظ ماتقدم کے لیے سبق دیتی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)

۲ الحکم میں ہے :۔ "دراصل اہل باطن کے لیے وہ بھی ایک شریعت ہوتی ہے۔ جس کی بجاآوری ان پر فرض ہوتی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵)

۳ الحکم سے :۔ شریعت ظاہری وہ ہے کہ جس میں اُمورِ دُنیا کا پورا پورا انصرام اہتمام کیا گیا ہے تاکہ اس کے انتظام میں بلحاظ ظاہر کے کوئی بات خلاف طریق ظاہر نہ ہو۔ شریعت باطنی وہ ہے کہ بعض امور ظاہری جو بادی النظر میں کامل طور پر ظہور پذیر نہیں ہو سکتے الہام وکشوف سے ظاہر اور رواج دیئے جاتے ہیں۔ شریعت ظاہری کی طرح اہلِ کشف پر احکام نازل ہوتے ہیں۔ جو بعض امور کے حقائق پر مشتمل ہوتے ہیں اور جب تک ملہم اُن کی بجاآوری میں بدل وجان کوشش نہ کرے ممکن نہیں کہ اندرونی اصلاح کما حقہٗ حقیقتاً ہو سکے اور یہ امور جو اہلِ کشف پر نازل ہوتے ہیں۔ شریعت کے دراصل مخالف نہیں ہوتے بلکہ بعض حقائق کی تکمیل ہوتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ : ۱۹۶) جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر ایک شخص کو حکم ہوتا ہے کہ تو اپنے بچے کو دریا میں ڈال دے جیسے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ دنیا کے امور کے واسطے ہوتی ہے اور ایک وہ امور جو کہ از روئے کشف و الہام کے ایک مامور پر نازل ہوتے ہیں۔ اور اُسے حکم ہوتا ہے کہ یہ کر و بظاہر گو وہ شریعت کے مخالف ہو مگر اصل میں بالکل مخالف نہیں ہوتا۔ مثلاً دیکھو کہ از روئے شریعت تو دیدہ دانستہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا منع ہے۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ : ۱۹۶) مگر ایک شخص کو حکم کہ تو دریا میں جا اور چیر کر نکل جا۔ تو کیا وہ اس کی نافرمانی کرے گا؟ بھلا بتلاؤ تو سہی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل کہ بیٹے کو ذبح کرنے لگ گئے کونسا شریعت کے مطابق تھا؟ کیا یہ کہیں شریعت میں لکھا ہے کہ خواب آوے تو سچ مچ بیٹے کو اُٹھ کر ذبح کرنے لگ جاوے؟ مگر وہ ایسا عمل تھا کہ ان کے قلب نے اسے قبول کر کے تعمیل کی۔ پھر دیکھو۔ موسیٰ کی ماں تو نبی بھی نہ تھی مگر اُس نے خواب کی رُو سے مُوسیٰ کو دریا میں ڈال دیا۔ شریعت کب اجازت دیتی ہے کہ اس طرح ایک بچّہ کو پانی میں پھینک دیا جاوے۔ بعض امور شریعت سے وراء الوریٰ ہوتے ہیں اور وہ اہلِ حق سمجھتے ہیں جو کہ خاص نسبت خدا تعالیٰ سے رکھتے ہیں اور وہی ان کو بجا لاتے ہیں۔ ورنہ اس طرح تو خدا تعالیٰ پر اعتراض ہوتا ہے کہ وہ لغو امور کا حکم کرتا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے۔ اس کا سِرّ وہی جانتے ہیں جو خدا تعالیٰ سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے امور میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے یہ قصّے اس لیے درج کئے ہیں کہ انسان ادب سیکھے۔ ایک مرید کا ادب اپنے مرشد کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس پر اعتراض نہ کیا جاوے اور اسکے افعال و اعمال میں اعتراض کرنے میں مستعجل نہ ہو۔ جو علم خدا نے اسے (مرشد کو) دیا ہوتا ہے۔ اس کی اسے خبر ہی نہیں ہوتی ورنہ اس طرح کی مخالفت کرنے سے کہیں سلب ایمان کی نوبت نہ آجاوے۔

شریعت کا ایک رنگ ظاہر پر ہے اور ایک محبّت الٰہیہ پر ہے کہ جن سے خدا تعالیٰ کے خاص تعلق ہوتے ہیں ان پر کشف ہوتے ہیں۔ ایسے امور اُن سے صادر ہوتے ہیں کہ لوگوں کو اعتراض کا موقع ملتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا کہ حبشن کیوں کی؟ آخر اس حرکت سے خدا کا غضب ان پر شروع ہوا اور جذام کے آثار نمودار ہوئے۔ دوسرے گناہوں میں تو عذاب دیر سے آتا ہے مگر ان میں فوراً شروع ہو جاتا ہے۔

سائل نے عرض کیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے پھر کیوں جرأت کی حالانکہ وہ نبی تھے؟

فرمایا کہ:-

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

حضرت موسیٰ کی ماں کو حکم ہوا۔ یا دریا چیر کر نکل جا جیسے خود موسیٰ علیہ السلام کو یا مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر اور آپ کرنے لگ گئے۔ یہ امور شریعت سے وراء الوریٰ ہوتے ہیں جن کو اہلِ حق ہی سمجھتے ہیں اور وہی اُن کو بجا لاتے ہیں۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵ مورخہ ۲۴ رجون ۱۹۰۳ء)

اسی لیے تو یہ قصہ لکھا ہے کہ وہ نبی تھا اور تم تو اُمتی ہو تم کو اور بھی ڈر کر قدم رکھنا چاہیئے۔ یہ اس طرح کے امور ہوتے ہیں کہ ظاہری شریعت کو منسوخ کر دیتے ہیں[1]۔ مولانا روم نے ایسی ہی ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک طبیب نے ایک کنیز کو ایسے طریق سے ہلاک کر دیا کہ پتہ نہ لگا۔ مسہل وغیرہ ایسی ادویہ دیتا رہا کہ وہ کمزور ہو ہو کر مر گئی۔ تو پھر اس پر لکھا ہے کہ اس پر قتل کا جرم نہ[2] ہوگا کیونکہ وہ تو مامور تھا۔ اس لیے اپنے نفس سے اُسے قتل نہیں کیا بلکہ امر سے کیا۔

اسی طرح ملک الموت جو خدا جانے کسقدر جانیں روز ہلاک کرتا ہے کیا اس پر مقدمہ ہو سکتا ہے؛ وہ تو مامور ہے۔ اسی طرح ابدال بھی ملائکہ کے رنگ میں ہوتے ہیں۔ خدا ان سے کئی خدمات لیتا ہے پیمانہ شریعت سے ہر ایک امر کو ناپنا غلطی ہوتی ہے[3]۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۷۰-۱۷۱ مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۰۳ء)

۱۴ر جون ۱۹۰۳ء

دربار شام

اللہ تعالیٰ سے سچا رشتہ

فرمایا:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بڑے سیدھے سادے تھے۔ جیسے کہ ایک برتن قلعی کرا کر صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے ایسے ہی ان لوگوں کے دل تھے جو کلام الٰہی کے انوار سے روشن اور کدورت نفسانی کے زنگ سے بالکل صاف تھے گویا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس: ۱۰) کے سچے مصداق تھے[4]۔

---

[1] الحکم میں یہ عبارت یوں ہے:۔ "اس سوال کا جواب کہ موسیٰ علیہ السلام نے کیوں جرأت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان ادب اسرارِ الٰہی کے دریافت کرنے میں ایک عظیم الشان نبی کے ذریعہ سکھایا کہ جب وہ نبی صاحبِ شریعت باوجود عالی مرتبہ ہونے کے اسرارِ الٰہی میں ادب کی طرف راہبر کئے گئے تو تم اُمتی ہو کر بہت ڈر کر قدم رکھو۔ یہ ایسے امور ہیں کہ ظاہری شریعت کو تو منسوخ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر دراصل وہ شریعت کے اسرار ہوتے ہیں جن کی کنہ و راز کو معلوم کرنا انسان کا کام نہیں۔ جب تک کہ وہ علام الغیوب اپنے فضل و کرم سے خود مطلع نہ کرے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۵-۱۶)

[2] الحکم سے:۔ "واجب القتل نہ ٹھہرا اور نہ قصاص لازم آیا اس لیے کہ وہ مامور تھا۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۶)

[3] الحکم میں ہے:۔ "پیمانہ شریعت ظاہری سے ہر ایک امر کو ناپنا غلطی ہے۔" (حوالہ مذکورہ بالا)

[4] البدر سے:۔ "جب ایک برتن کو مانجھ کر صاف کر دیا جاتا ہے پھر اس پر قلعی ہوتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مجھے خوب معلوم ہے کہ ابھی تک ہماری جماعت میں سے کثرت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ اگر ہماری دنیا کو کسی طرح سے کوئی جنبش آئی تو ہم کدھر جائیں گے مگر تعجب تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے ہاتھ پر اقرار کرتے ہیں کہ ہم دنیا پر دین کو مقدم سمجھیں گے اور دوسری طرف دنیا ومافیہا میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ دنیا کی خاطر ہر ایک دینی نقصان برداشت کرنا گوارا کرتے ہیں۔ ذرا سا کوئی کُنبہ میں بیمار ہو جاوے یا بیل بکری ہی مرجاوے تو جھٹ بول اُٹھتے ہیں کہ ہیں یہ کیا ہوا؟ ہم تو مرزا صاحب کے مُرید تھے۔ ہمارے ساتھ کیوں یہ حادثہ واقع ہوا[1] حالانکہ یہ خیال ان کا خام ہے وہ اس سچے رشتہ سے جو اللہ تعالیٰ سے باندھنا چاہیئے ناواقف ہیں۔ برکات الٰہی انسان پر اس وقت نازل ہوتے ہیں جب خدا تعالیٰ سے مضبوط رشتہ باندھا جاوے۔ جیسے رشتہ داروں کو آپس میں رشتہ کا پاس ہوتا ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کے رشتہ کا جو اس پاک ذات کے ساتھ ہے سخت پاس ہوتا ہے۔ وہ مولا کریم اس کے لیے غیرت کھاتا ہے اور اگر کوئی دُکھ یا مصیبت اس کو پہنچتی ہے تو وہ بندہ اپنے لیے راحت جانتا ہے[2]

الغرض کوئی دُکھ اس رشتہ کو توڑتا نہیں اور نہ کوئی سُکھ اس کو دوبالا کرتا ہے۔ ایک سچا تعلّق و حقیقی عشق عبد و معبود میں قائم ہو جاتا ہے اگر ہماری جماعت میں چالیس آدمی بھی ایسے مضبوط رشتہ کے جو رنج و راحت، عُسر و یُسر میں خدا تعالیٰ کی رضا کو مقدم کریں، ہوں تو ہم جان لیں کہ ہم جس مطلب کے لیے آئے تھے وہ پورا ہو چکا اور جو کچھ کرنا تھا وہ کر لیا۔

کیسی سوچنے کی بات ہے کہ صحابہ کرامؓ کے تعلقات بھی تو آخر دنیا سے تھے ہی۔ جائدادیں تھیں، مال تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اور پھر نفیس اور مصفا کھانا اس میں ڈالا جاتا ہے۔ یہی حالت ان کی تھی۔ اگر انسان اسی طرح صاف ہو اور اپنے آپ کو قلعی دار برتن کی طرح منور کرے تو خدا تعالیٰ کے انعامات کا کھانا اس میں ڈال دیا جاوے، لیکن اب کس قدر انسان ہیں جو ایسے ہیں اور آیت قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس: ۱۰) کے مصداق ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۷ مورخہ ۲۶؍جون ۱۹۰۳ء)

۱؎ البدر میں ہے: "اگر کوئی طاعون سے مرجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تو مرید تھا وہ کیوں مرا؟ اب دیکھو کہ اس زمانہ میں اور اُس زمانہ میں کس قدر فرق ہے۔" (البدر بحوالہ مذکور)

۲؎ البدر میں ہے: "اس میں شک نہیں کہ دنیا ایسا ہی مقام ہے کہ انسان کو اُس میں دُکھ اور مصیبت پیش آتی ہے مگر اُن کا تعلق خدا تعالیٰ سے ایسا ہوتا ہے کہ اس دُکھ اور مصیبت میں ایک راحت نظر آتی ہے۔"

(البدر بحوالہ مذکور)

زر تھا۔مگر اُن کی زندگی پر کس قدر انقلاب آیا کہ سب کے سب ایک ہی دفعہ دستبردار ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ (الانعام: ۱۶۳) ہمارا سب کچھ اللہ ہی کیلئے ہے۔اگر اس قسم کے لوگ ہم میں ہو جاویں تو کونسی آسمانی برکت اس سے بزرگ تر ہے ؟

بیعت کرنا صرف زبانی اقرار ہی نہیں بلکہ یہ تو اپنے آپ کو فروخت کر دینا ہے خواہ ذلت ہو نقصان ہو۔کچھ ہی کیوں نہ ہو کسی کی پروا نہ کی جاوے۔مگر دیکھو اب کس قدر ایسے لوگ ہیں جو اپنے اقرار کو پورا کرتے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کو آزمانا چاہتے ہیں۔بس یہی سمجھ رکھا ہے کہ اب ہمیں مطلقاً کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے اور ایک پُر امن زندگی بسر ہو حالانکہ انبیاء اور قطبوں پر مصائب آئے اور وہ ثابت قدم رہے مگر یہ ہیں کہ ہر ایک تکلیف سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔بیعت کیا ہوئی گویا خدا تعالیٰ کو رشوت دینی ہوئی۔حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (العنکبوت: ۳) یعنی کیا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ فقط کلمہ پڑھ لینے پر ہی چھوڑ دیئے جاویں گے اور ان کو ابتلاؤں میں نہیں ڈالا جاوے گا۔ پھر یہ لوگ بلاؤں سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ہر ایک شخص کو جو ہمارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے جان لینا چاہیئے کہ جب تک آخرت کے سرمائے کا فکر نہ کیا جاوے کچھ نہ بنے گا اور یہ ٹھیکہ کرنا کہ ملک الموت میرے پاس نہ پھٹکے، میرے کنبے کا نقصان نہ ہو۔میرے مال کا بال بیکا نہ ہو، ٹھیک نہیں ہے۔خود شرط وفا دکھلاوے اور ثابت قدمی و صدق سے مستقل رہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی راہوں سے اس کی رعایت کرے گا اور ہر ایک قدم پر ان کا مددگار بن جاوے گا۔

انسان کو صرف پنجگانہ نماز اور روزوں وغیرہ احکام کی ظاہری بجا آوری پر ہی ناز نہیں کرنا چاہیئے کہ نماز پڑھنی تھی پڑھ لی۔روزے رکھنے تھے رکھ لیے، زکوٰۃ دینی تھی دے دی۔وغیرہ۔نوافل ہمیشہ نیک اعمال کے مُتمّم و مُکمّل ہوتے ہیں اور یہی ترقیات کا موجب ہوتا ہے۔مومن کی تعریف یہ ہے کہ خیرات و صدقہ وغیرہ جو خدا نے اس پر فرض[1] ٹھہرایا ہے بجا لاوے اور ہر ایک کار خیر کے کرنے میں اس کو ذاتی محبت ہو اور کسی تصنع و نمائش و ریا کو اس میں دخل نہ ہو۔یہ حالت مومن کی اس کے سچے اخلاص اور تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور ایک سچا اور مضبوط رشتہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیدا کر دیتی ہے۔اس وقت اللہ تعالیٰ اُس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور اس کے کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ کام کرتا ہے۔

---

[1] البدر میں یوں لکھا ہے: "مومن کی تعریف یہ ہے کہ خیرات او صدقہ وغیرہ جو کہ خدا نے اس پر فرض تو نہیں کئے مگر وہ اپنی ذاتی محبت سے ان کو بجا لاتا ہے اس وقت اس کا ایک خاص تعلق خدا سے ہوتا ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۷)

الغرض ہر ایک فعل اُس کا اور ہر ایک حرکت سکون اس کا اللہ ہی کا ہوتا ہے۔ اس وقت جو اس سے دشمنی کرتا ہے وہ خدا سے دشمنی کرتا ہے اور پھر فرماتا ہے کہ مَیں کسی بات میں اس قدر تردد نہیں کرتا جس قدر کہ اسکی موت میں۔

قرآن شریف میں لکھا ہے کہ مومن اور غیر مومن میں ہمیشہ فرق رکھ دیا[1] جاتا ہے۔ غلام کو چاہیئے کہ ہر وقت رضاء الٰہی کو ماننے اور ہر ایک رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں دریغ نہ کرے۔ کون ہے جو عبودیت سے انکار کر کے خدا کو اپنا محکوم بنانا چاہتا ہے؟

تعلقات الٰہی ہمیشہ پاک بندوں سے ہوا کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے۔ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى (النجم: ۳۸) لوگوں پر جو احسان کرے ہرگز نہ جتلاوے۔ جو ابراہیم کے صفات رکھتا ہے ابراہیم بن سکتا ہے۔ ہر ایک گناہ بخشنے کے قابل ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سوا اَور کو معبود و کارساز جاننا ایک ناقابل عفو گناہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان: ۱۴)۔ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (النسآء: ۴۹) یہاں شرک سے یہی مراد نہیں کہ پتھروں وغیرہ کی پرستش کی جاوے بلکہ یہ ایک شرک ہے کہ اسباب کی پرستش کی جاوے اور معبودات[2] دنیا پر زور دیا جاوے اسی کا نام شرک ہے۔

اَور معاصی کی مثال تو حقہ کی سی ہے کہ اس کے چھوڑ دینے سے کوئی دقت و مشکل کی بات نظر نہیں آتی مگر شرک کی مثال افیم کی ہے کہ وہ عادت ہو جاتی ہے جس کا چھوڑنا محال ہے۔ بعض کا یہ خیال بھی ہوگا کہ انقطاع الی اللہ کر کے تباہ ہو جاویں؟ مگر یہ سراسر شیطانی وسوسہ ہے۔ اللہ کی راہ میں برباد ہونا آباد ہونا ہے۔ اس کی راہ میں مارا جانا زندہ ہونا ہے۔ کیا دنیا میں ایسی کم مثالیں اور نظیریں ہیں کہ جو لوگ اس کی راہ میں قتل کئے گئے۔ ہلاک کئے گئے۔ انکے زندہ جاوید ہونے کا ثبوت ذرہ ذرہ زمین میں ملتا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی دیکھ لو کہ سب سے زیادہ اللہ کی راہ میں برباد کیا اور سب سے زیادہ دیا گیا چنانچہ تاریخ اسلام میں پہلا خلیفہ حضرت ابوبکر ہی ہوا۔[3] (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۱، ۱۰ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۳ء)

۱؎ البدر میں ہے: "قرآن شریف میں بھی لکھا ہے کہ مومن اور غیر مومن میں ہمیشہ فرقان ہوتا ہے مگر ایک کمبخت جلد باز خدا کے فرقان کو پسند نہیں کرتا بلکہ نفس کے فرقان کو پسند کرتا ہے۔ غلام کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت عبودیت کے لیے تیار رہے اور کسی مصیبت کی پروا نہ کرے مگر ایک پاجی سرکش عبودیت سے تو انکار کرتا ہے اور خدا کو اپنا محکوم بنانا چاہتا ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۸)

۲؎ الحکم میں ایسا ہی درج ہے مگر دراصل یہ لفظ محبوبات معلوم ہوتا ہے چنانچہ البدر میں بھی محبوبات ہی لکھا ہے (مصحح)

۳؎ البدر کے الفاظ یہ ہیں:۔ "بہت کا یہ بھی خیال ہوگا کہ کیا ہم انقطاع الی اللہ کر کے اپنے آپ کو تباہ کر لیویں؟ مگر یہ ان کو دھوکا ہے کوئی تباہ نہیں ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ لو۔ اُس نے سب کچھ چھوڑا پھر وہی سب سے اول تخت پر بیٹھا۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۸)

۱۵؍جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

بیویوں سے حسنِ معاشرت

بار ہا دیکھا گیا ہے اور تجربہ کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص خفیف عذرات پر عورت سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہے تو یہ امر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ملال کا موجب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص سفر میں تھا اس نے اپنی بیوی کو لکھا کہ اگر وہ بدیدن خط اس کی طرف روانہ نہ ہوگی تو اُسے طلاق دے دی جاوے گی۔

سُنا گیا ہے کہ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ:۔

”جو شخص اس قدر جلدی قطع تعلق کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو ہم کیسے اُمید کر سکتے ہیں کہ ہمارے ساتھ اس کا پکا تعلق ہے۔“

ایسا ہی ایک واقعہ اب چند دنوں سے پیش تھا کہ ایک صاحب نے اوّل بڑی چاہ سے ایک شریف لڑکی کے ساتھ نکاح ثانی کیا مگر بعد ازاں بہت خفیف عذر پر دس ماہ کے اندر ہی انہوں نے چاہا کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جاوے۔ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام کو بہت سخت ملال ہوا اور فرمایا کہ:۔

مجھے اس قدر غصہ ہے کہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا اور ہماری جماعت میں ہو کر پھر یہ ظالمانہ طریق اختیار کرنا سخت عیب کی بات ہے۔

چنانچہ دوسرے دن پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ:۔

وہ صاحب اپنی نئی یعنی دوسری بیوی کو علیحدہ مکان میں رکھیں جو کچھ زوجہ اوّل کو دیویں وہی اسے دیویں۔ ایک شب اُدھر رہیں تو ایک شب اِدھر رہیں اور دوسری عورت کوئی لونڈی غلام نہیں ہے بلکہ بیوی ہے اُسے زوجہ اوّل کا دستِ نگر کر کے نہ رکھا جاوے۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس سے پیشتر کئی سال ہوئے گذر چکا ہے کہ ایک صاحب نے حصولِ اولاد کی نیت سے نکاح ثانی کیا اور بعد نکاح رقابت کے خیال سے زوجہ اوّل کو جو صدمہ ہوا۔ اور نیز خانگی تنازعات نے ترقی پکڑی تو اُنہوں نے گھبرا کر زوجہ ثانی کو طلاق دے دی۔ اس پر حضرت اقدس نے ناراضگی ظاہر فرمائی۔ چنانچہ اس خاوند نے پھر اس زوجہ کی طرف میلان کر کے اسے اپنے نکاح میں لیا اور وہ بیچاری بفضل خدا اس دن سے اب تک اپنے گھر میں آباد ہے۔

گرمی کا موسم اور اشتیاق زیارت اور کلام کے سُننے میں احباب کے مِل مِل کر بیٹھنے پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

خدا تعالیٰ مکان کو وسیع کر دیوے تو یہ شکایت رفع ہو۔ ہر ایک شخص تقاضائے محبت سے آگے آتا ہے اور جگہ ہوتی نہیں۔

عبودیت کا سِرّ اور استغفار

چند ایک احباب نے بیعت کی۔ اس پر حضرت اقدس نے اُن کو نصیحت فرمائی کہ:۔

خدا تعالیٰ کا منشاء ہے کہ انسان توبہ نصوح کرے اور دعا کرے کہ اس سے گناہ سرزد نہ ہو۔ نہ آخرت میں رسوا ہو نہ دنیا میں۔

جب تک انسان سمجھ کر بات نہ کرے اور تذلل اس میں نہ ہو تو خدا تک وہ بات نہیں پہنچتی صوفیوں نے لکھا ہے کہ اگر چالیس دن گذر جاویں اور خدا کی راہ میں رونا نہ آوے تو دل سخت ہو جاتا ہے۔ تو سختی قلب کا کفارہ یہی ہے کہ انسان رووے۔ اس کے لیے محرکات ہوتے ہیں انسان نظر ڈال کر دیکھے کہ اس نے کیا بنایا ہے اور اس کی عمر کا کیا حال ہے۔ دیگر گذشتگان پر نظر ڈالے پھر انسان کا دل لرزاں و ترساں ہوتا ہے۔

جو شخص دعویٰ سے کہتا ہے کہ میں گناہ سے بچتا ہوں وہ جھوٹا ہے۔ جہاں شیرینی ہوتی ہے وہاں چیونٹیاں ضرور آتی ہیں۔ اسی طرح نفس کے تقاضے تو ساتھ لگے ہی ہیں ان سے نجات کیا ہو سکتی ہے؟ خدا تعالیٰ کے فضل اور رحمت کا ہاتھ نہ ہو تو انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا نہ کوئی نبی نہ ولی اور نہ اُن کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ ہم سے گناہ سرزد نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کا فضل مانگتے تھے اور نبیوں کے استغفار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کا ہاتھ اُن پر رہے ورنہ اگر انسان اپنے نفس پر چھوڑا جاوے تو وہ ہرگز معصوم اور محفوظ نہیں ہو سکتا۔ اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ اور دوسری دُعائیں بھی استغفار کے اسی مطلب کو بتلاتی ہیں۔ عبودیت کا سِرّ یہی ہے کہ انسان خدا کی پناہ کے نیچے اپنے آپ کو لے آوے جو خدا کی پناہ نہیں چاہتا وہ مغرور اور متکبر ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۸ مورخہ ۲۶ جون ۱۹۰۳ء)

---

۱۸ جون ۱۹۰۳ء

بوقتِ ظہر

ہمارے مخدوم مولانا عبد الکریم صاحب جو کہ عرصہ قریباً پانچ سال سے حضرت اقدس کے

مبارک قدموں میں جاگزیں ہیں۔ ان کو ایک شادی کی تقریب میں شمولیت کے واسطے ساتھ لے جانے کے واسطے) ایک دو احباب سیالکوٹ سے تشریف لائے تھے مگر خدا تعالیٰ نے جو عشق اور محبت مولوی ؛. احب کو حضرت اقدس کے ساتھ عطا کیا ہے وہ ایک پل کے واسطے بھی ان مبارک قدموں سے جدائی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس کا اثر یہ ہے کہ جب کوئی احمدی بھائی قادیان آکر پھر رخصت طلب کرتے ہیں تو مولوی صاحب کی اُن کو یہی نصیحت ہوتی ہے کہ اس مقام کو اتنی جلدی نہ چھوڑو۔ دیکھو تمہارے اوقات دنیوی کاروبار میں کس قدر گذرتے ہیں۔ اگر اس کا ایک عشرِ عشیر بھی تم دین کے واسطے یہاں گذارو تو تم کو پتہ لگے اور آنکھ کھلے کہ یہاں کیا ہے جو ہمیں ایک پل کے واسطے علیحدہ نہیں ہونے دیتا۔ غرضیکہ مولوی صاحب موصوف نے سیالکوٹ جانے سے انکار کیا اور وہی بات اس وقت حضرت اقدس کے سامنے پیش ہوئی۔ حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ :۔

قادیان دارالامان

اس مقام کو خدا تعالیٰ نے امن والا بنایا ہے اور متواتر کشوف والہامات سے ظاہر ہوا ہے کہ جو اس کے اندر داخل ہوتا ہے وہ امن میں ہوتا ہے تو اب ان ایام میں جبکہ ہر طرف ہلاکت کی ہوا چل رہی ہے اور گو کہ طاعون کا زور اب کم ہے مگر سیالکوٹ ابھی تک مطلق اس سے خالی نہیں ہے اس لیے اس جگہ کو چھوڑ کر وہاں جانا خلافِ مصلحت ہے۔

آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ جن صاحب کی شادی ہے وہ اور لڑکی کی طرف سے اس کا ولی ایک شخص وکیل ہو کر یہاں قادیان میں آجاویں اور یہاں نکاح ہو۔ حضرت صاحب کی دُعا بھی ہوگی اور خود مولوی عبدالکریم صاحب کیا بلکہ حضرت اقدس علیہ السلام بھی اس تقریبِ نکاح میں شامل ہوجاوینگے۔

جس لڑکے کے رشتہ کی یہ تقریب تھی اس کا رشتہ اوّل ایک ایسی جگہ ہوا ہوا تھا جو کہ حضرت اقدس کی بیعت میں نہیں تھے اور جب یہ رشتہ قائم ہوا تھا تو اس وقت لڑکا بھی شاملِ بیعت نہ تھا۔ جب لڑکے نے بیعت کی تو لڑکی والوں نے اس لیے لڑکی دینے سے انکار کر دیا کہ لڑکا مرزائی ہے اس ذکر پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ :۔

اوّل اوّل یہ لوگ ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے۔ سُنّی وہابیوں کی اور وہابی سُنّی کی تکفیر کرتا تھا مگر اب اس وقت سب نے موافقت کر لی ہے اور سارا کفر اکٹھا کر کے گویا ہم پر ڈال دیا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۹ مورخہ ۲۶ رجون ۱۹۰۳ء)

۱۹ر جون ۱۹۰۳ء

ریل کی پیشگوئی قرآن شریف میں

جمعہ کی نماز سے پیشتر تھوڑی دیر حضرت اقدس علیہ السلام نے مجلس فرمائی۔ ریل وغیرہ کی ایجاد سے جو فوائد بنی نوع انسان کو پہنچے ہیں اُن کا ذکر ہوتا رہا۔ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ:-

انسانی صنعتوں کا انحصار خدا تعالیٰ کے فضل پر ہے۔ ریل کے واسطے قرآن شریف میں دو اشارے ہیں۔

اوّل۔ اِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (التکویر: ۸)

دوم۔ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (التکویر: ۵)

عشار حمل دار اونٹنی کو کہتے ہیں۔ حمل کا ذکر اس لیے کیا تاکہ معلوم ہو جاوے کہ قیامت کا ذکر نہیں ہے۔ صرف قرینہ کے واسطے یہ لفظ لکھا ہے ورنہ ضرورت نہ تھی۔ اگر پیشگوئیوں کا صدق اس دنیا میں نہ کھلے تو پھر اس کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے اور ایمان کو کیا ترقی ہو؟ بیوقوف لوگ ہر ایک پیشگوئی کو صرف قیامت پر لگاتے ہیں اور جب پوچھو تو کہتے ہیں کہ اس دنیا کی نسبت کوئی پیشگوئی قرآن شریف میں نہیں ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۵ مورخہ ۳ر جولائی ۱۹۰۳ء)

۲۵ر جون ۱۹۰۳ء

ربوبیتِ تامہ

رات کو بعد از نماز عشاء چند مستورات نے بیعت کی۔ حضرت اقدس نے ان کو ایک جامع وعظ فرمایا جس کا جسقدر حصہ قلمبند ہوا وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

"اس سے مطلب یہ ہے کہ قدم قدم پر خدا تعالیٰ کی پرورش ضرور ہوتی ہے۔ دیکھو بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کس طرح خدا تعالیٰ اس کے ناک، کان وغیرہ غرض اس کے سب اعضاء بناتا ہے اور اس کے دو ملازم مقرر کرتا ہے کہ وہ اس کی خدمت کریں۔ والدین بھی جو مہربانی کرتے ہیں اور پرورش کرتے ہیں وہ سب پرورشیں بھی خدا تعالیٰ کی پرورشیں ہوتی ہیں۔

بعض لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے سوا اَوروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر فلاں نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ میرے ساتھ فلاں نے احسان کیا۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (الفلق: ۲) میں اس خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں جس کی تمام پرورشیں ہیں۔ ربّ یعنی پرورش کنندہ وہی ہے اس کے سوا کسی کا رحم اور کسی کی پرورش نہیں ہوتی حتیٰ کہ جو ماں باپ بچے پر رحمت کرتے ہیں۔ دراصل وہ بھی اسی خدا کی پرورشیں ہیں اور بادشاہ جو رعایا سے انصاف کرتا ہے اور اُس کی پرورش کرتا ہے۔ وہ سب بھی اصل میں خدا تعالیٰ کی مہربانی ہے۔

ان تمام باتوں سے اللہ تعالیٰ یہ سکھلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی نہیں۔ سب کی پرورشیں اسی کی ہی پرورشیں ہوتی ہیں بعض لوگ بادشاہوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں نہ ہوتا تو میں تباہ ہوجاتا اور میرا فلاں کام بادشاہ نے کردیا وغیرہ وغیرہ۔ یاد رکھو ایسا کہنے والے کافر ہوتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ کافر نہ بنے مومن بنے۔ اور مومن نہیں ہوتا جب تک کہ دل سے ایمان نہ رکھے کہ سب پرورشیں اور رحمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ انسان کو اس کا دوست ذرہ بھی فائدہ نہیں دے سکتا جب تک کہ خدا تعالیٰ کا رحم نہ ہو۔ اسی طرح بچے اور تمام رشتہ داروں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رحم ہونا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دراصل مَیں ہی تمہاری پرورش کرتا ہوں۔ جب خدا تعالیٰ کی پرورش نہ ہو تو کوئی پرورش نہیں کرسکتا۔ دیکھو جب خدا تعالیٰ کسی کو بیمار ڈال دیتا ہے تو بعض دفعہ طبیب کتنا ہی زور لگاتے ہیں مگر وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔ طاعون کے مرض کی طرف غور کرو۔ سب ڈاکٹر زور لگا چکے۔ مگر یہ مرض دفع نہ ہوا۔ اصل یہ ہے کہ سب بھلائیاں اسی کی طرف سے ہیں اور وہی ہے کہ جو تمام بدیوں کو دُور کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الفاتحہ: ۲) سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور تمام پرورشیں تمام جہان پر اسی کی ہیں۔

الرَّحْمٰن وہی ہے جس کی رحمتیں بے بدلہ ہیں مثلاً انسان کا کیا عذر تھا اگر اللہ تعالیٰ اُسے کتا بنا دیتا تو کیا یہ کہہ سکتا تھا کہ اے اللہ تعالیٰ میرا فلاں عمل نیک تھا اس کا بدلہ تو نے نہیں دیا۔

الرَّحِیم۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کے بدلہ نیک نتیجہ دیتا ہے جیسا کہ نماز پڑھنے والا۔ روزہ رکھنے والا صدقہ دینے والا دُنیا میں بھی رحم پاویگا اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (التوبہ: ۱۲۰) اور دوسری جگہ فرماتا ہے مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال: ۸،۹) یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا جو کوئی ذرہ سی بھی بھلائی کرتا ہے وہ اس کا بدلہ پالیتا ہے۔

ایک یہودی نے کسی شخص کو کہا کہ میں تجھے جادو سکھلا دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ تو کوئی بھلائی نہ کرے۔ جب دنوں کی تعداد پوری ہوگئی اور جادو نہ سیکھ سکا تو یہودی نے کہا کہ تُو نے ان دنوں میں ضرور کوئی بھلائی کی ہے

جس کی وجہ سے تونے جادو نہیں سیکھا۔ اُس نے کہا کہ مَیں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا سوائے اس کے راستہ میں سے کانٹا اُٹھایا۔ اُس نے کہا بس یہی تو ہے جس کی وجہ سے تو جادُو نہ سیکھ سکا۔ تب وہ بولا۔ خدا تعالیٰ کی بڑی مہربانیاں ہیں کہ اس نے ذرہ سی نیکی کے بدلہ بڑے بھاری گناہ سے بچا لیا۔

اور ہمیں اس خدا تعالیٰ کی ہی پرستش کرنی چاہیئے جو کہ ذرہ سے کام کا بھی اجر دیتا ہے خدا وہ ہے کہ انسان اگر کسی کو پانی کا گھونٹ بھی دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ دیتا ہے۔ دیکھو ایک عورت جنگل میں جا رہی تھی رستہ میں اس نے ایک پیاسے کُتّے کو دیکھا۔ اس نے اپنے بالوں سے رسہ بنا کر کنوئیں سے پانی کھینچ کر اس کُتّے کو پلایا جس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل کو قبول کر لیا ہے وہ اس کے تمام گناہ بخش دیگا۔ اگرچہ وہ تمام عمر فاسقہ رہی ہے۔

ایک اَور قصّہ بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تین آدمی پہاڑ پر پھنس گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے پہاڑ کی غار میں ٹھکانا لیا تھا جبکہ ایک پتھر سامنے سے آگرا اور راستہ بند کر لیا۔ تب ان تینوں نے کہا کہ اب تو نیک کام ہی بچائیں گے۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ ایک دفعہ مَیں نے مزدور لگائے تھے۔ مزدوری کے وقت اُن میں سے ایک کہیں چلا گیا۔ مَیں نے بہت ڈھونڈا۔ آخر نہ ملا تو مَیں نے اس کی مزدوری سے کوئی بکری خریدی اور اس طرح چند سال تک ایک بڑا گلہ ہو گیا۔ پھر وہ آیا اس نے کہا کہ مَیں نے ایک دفعہ آپ کی مزدوری کی تھی۔ اگر آپ دیں تو عین مہربانی ہو گی۔ مَیں نے اس کا تمام مال اس کے سُپرد کر دیا۔ اے اللہ اگر تجھے میرا یہ نیک عمل پسند ہے تو میری مشکل آسان کر۔ اتنے میں تھوڑا پتھر اُونچا ہو گیا۔

پھر دوسرے نے اپنا قصّہ بیان کیا[1]۔ اور پھر بولا کہ اے اللہ اگر میری یہ نیکی تجھے پسند ہے تو میری مشکل آسان کر۔ پتھر ذرا اور اونچا ہو گیا۔

پھر تیسرے نے کہا کہ میری ماں بوڑھی تھی۔ ایک رات کو اس نے پانی طلب کیا۔ مَیں جب پانی لایا تو وہ سو چکی تھی۔ میں نے اس کو نہ اُٹھایا کہ کہیں اس کو تکلیف نہ ہو اور وہ پانی لیے تمام رات کھڑا رہا۔ صبح اُٹھی تو اُسے دیدیا۔ اے اللہ اگر تجھے میری یہ نیکی پسند ہے تو مشکل کو دُور کر۔ پھر اس قدر پتھر اونچا ہو گیا کہ وہ سب نکل گئے۔ اس طرح پر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو نیکی کا بدلہ دیا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۵۔ ۱۸۶ مورخہ ۳ ؍ جولائی ۱۹۰۳ء)

---

[1] اس جگہ البدر کے ڈائری نویس نے نوٹ دیا ہے کہ ”مَیں اسے نوٹ نہ کر سکا اور نہ یاد رکھ سکا۔ عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحیح الفاظ قلمبند نہیں کئے جا سکے مثلاً ”پتھر اونچا ہو گیا“ کے الفاظ درست نہیں ”پتھر سرک گیا“ ہونا چاہیئے۔ حضور نے حدیث کا یہ مشہور واقعہ بیان فرمایا جسے ڈائری نویس صاحب اچھی طرح قلمبند نہیں کر سکے (مرتب)

۲۶؍ جون ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ایمان کیساتھ عمل ضروری ہے

فرمایا[1]:۔
اسلام کا دعویٰ کرنا اور میرے ہاتھ پر بیعتِ توبہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کیونکہ جب تک ایمان کے ساتھ عمل نہ ہو کچھ نہیں۔ منہ سے دعویٰ کرنا اور عمل سے اس کا ثبوت نہ دینا خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانا ہے اور اس آیت کا مصداق ہو جاتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (الصف: ۳، ۴) یعنی اے ایمان والو۔ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے ہو۔ یہ امر کہ تم وہ باتیں کہو جن پر تم عمل نہیں کرتے خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑے غضب کا موجب ہے۔

پس وہ انسان جس کو اسلام کا دعویٰ ہے یا جو میرے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اس دعویٰ کے موافق نہیں بناتا اور اس کے اندر کھوٹ رہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بڑے غضب کے نیچے آجاتا ہے اس سے بچنا لازم ہے۔

امرِ شرعی اور امرِ کونی

فرمایا[2]:۔
اوامر کی دو قسمیں ہوتی ہیں:۔

ایک امرِ شرعی ہوتا ہے جس کے برخلاف انسان کر سکتا ہے۔ دوسرے اوامر کونی ہوتے ہیں جس کا خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ جیساکہ فرمایا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیاء: ۷۰) اس میں کوئی خلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آگ اس حکم کے خلاف ہرگز نہ کر سکتی تھی[3]۔

انسان کو جو حکم اللہ تعالیٰ نے شریعت کے رنگ میں دیئے ہیں جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (البقرۃ: ۴۴) نماز کو قائم رکھو۔ یا فرمایا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرۃ: ۴۶) ان پر جب ایک عرصہ تک قائم رہتا ہے تو یہ احکام بھی شرعی رنگ سے نکل کر کونی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور پھر وہ ان احکام کی

---

[1] "البدر" میں لکھا ہے کہ "چند ایک احباب نے بیعت کی۔ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے یہ تقریر فرمائی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۶)

[2] البدر میں ہے کہ "ایک سوال پر فرمایا"۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۶)

[3] البدر میں اس کے آگے مزید یوں لکھا ہے:۔ "اس میں اللہ تعالیٰ انسان کو عبرت دیتا ہے کہ دیکھو جب آگ تک اس کی فرمانبردار ہے تو انسان کو کہاں تک فرمانبردار ہونا چاہیئے"۔ (البدر حوالہ مذکورہ)

خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا۔[1] (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۵ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۳ء)

۲۸ر جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

کیا آدم کے وقت دوسرے انسان موجود تھے

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آدم علیہ السلام جو خلیفہ بن کر آئے تو اس وقت کونسی قوم موجود تھی جس کے وہ خلیفہ تھے؟ اور اگر کوئی قوم موجود تھی تو حوا ان کی زوجہ کی نئی پیدائش کی ضرورت نہ تھی۔ اسی موجودہ قوم میں سے وہ نکاح کر سکتے تھے۔ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا:۔

حدیث شریف میں ہے کہ بہت سے پیچ در پیچ جو امور غیر مفید ہوں ان کو انسان ترک کر دے[2]۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرۃ:۳۱) سے استنباط ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے سے اس وقت کوئی قوم موجود ہو اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (الحجر:۲۸) ایک قوم جان بھی آدم سے پہلے موجود تھی۔ بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے اور یہی حق ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کو ہمیشہ سے خالق نہ مانیں تو اس کی ذات پر (نعوذ باللہ) حرف آتا ہے اور ماننا پڑے گا کہ آدمؑ سے پیشتر خدا تعالیٰ معطل تھا۔ لیکن چونکہ قرآن شریف خدا تعالیٰ کی صفات کو قدیمی بیان کرتا ہے اسی لیے اس حدیث کا مضمون راست ہے۔ قرآن کریم میں جو کوئی ترکیب ہے وہ ان صفات کے استمرار پر دلالت کرتی ہیں[3]۔ لیکن اگر آدمؑ سے ابتدا خلق ہوتی اور اس سے پیشتر نہ ہوتی تو پھر یہ نحوی ترکیب قرآن میں نہ ہوتی۔[4]

---

[1] البدر میں ہے: "جب انسان دیر تک ان حکموں پر کاربند رہتا ہے تو اس پر بھی وہ زمانہ آجاتا ہے کہ کہا جاتا ہے یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا (الانبیاء:۷۰) یعنی تو جو مصیبتوں میں جل رہا تھا تو اب ٹھنڈا ہو جا اور اس آگ کی طرح فرمانبردار ہو جا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۶)

[2] الحکم میں ہے:۔ "حدیث شریف میں آیا ہے وَمِنْ حُسْنِ اِلْاِسْلَامِ تَرْکُ مَالَا یَعْنِیْهِ پیچ در پیچ غیر مفید امور کو ترک کر دینا بھی اسلام کی خوبی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۵ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۳ء)

[3] نقل مطابق اصل۔ الحکم میں یہ الفاظ ہیں:۔ "اور قرآن شریف میں جو ترکیب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے استمرار پر دلالت کرتی ہے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۵ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۳ء)

[4] حاشیہ الحکم سے:۔ "پس آدم علیہ السلام سے پہلے مخلوق ضرور تھی۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۵ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۳ء)

باقی رہی لڑکیوں کی بات کہ ان کے موجود ہوتے حوا کی پیدائش کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ ممکن ہے کہ جس مقام پر آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی ہو وہاں کے لوگ کسی عذاب الٰہی سے ایسے تباہ ہو گئے ہوں کہ آدمی نہ بچا ہو[1]۔ دنیا میں یہ سلسلہ جاری ہے کہ کوئی مقام بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ کوئی غیر آباد آباد ہو جاتا ہے کوئی برباد شدہ از سرِ نو آباد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ ابھی تک یورپ والے ٹکریں مار رہے ہیں کہ شاید قطب شمالی میں کوئی آبادی ہو اور تلاش کر کر کے معلوم کر رہے ہیں کہ کون سے قطعاتِ زمین اوّل آباد تھے اور پھر تباہ ہو گئے۔ پس ایسی صورت میں ان مشکلات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایمان لانا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ ربّ۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین ہے اور ہمیشہ سے ہی ہے۔ جاندار ایک تو تکوّن سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک تکوین سے۔ ممکن ہے کہ آدم کی پیدائش کے وقت اَور مخلوقات ہو اور اس کی جنس سے نہ ہو یا اگر ہو بھی تو اس میں کیا حرج ہے کہ قدرت نمائی کے لیے خدا تعالیٰ نے حوا کو بھی اُن کی پسلی سے پیدا کر دیا۔

جب انسان بیعت کرتا ہے تو سب امور نہی اُسے ماننے چاہئیں اور خدا تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان چاہیئے۔ خدا تعالیٰ ہر طرح پر قادر ہے ممکن ہے کہ ایک قوم موجود ہو۔ اور اس کے ہوتے ہوئے وہ اَور قوم پیدا کر دیوے یا ایک قوم کو ہلاک کر کے اَور پیدا کر دے۔ موسیٰؑ کے قصہ میں بھی ایک جگہ ایسا واقعہ بیان ہوا ہے۔ آدمؑ کے وقت بھی خدا سابقہ قوموں کو ہلاک کر چکا تھا۔ پھر جب آدمؑ کو پیدا کیا تو اَور قوم بھی پیدا کر دی۔

خلیفہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک قوم ضرور پہلے سے موجود ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک اَور قوم کو پیدا کر کے پہلی قوم کا خلیفہ اُسے قرار دیا جاوے اور آدم اس کے مورثِ اعلیٰ ہوں کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات ازلی ابدی ہے اس پر تغیر نہیں آتا۔ مگر انسان ازلی ابدی نہیں ہے اس پر تغیر آتا ہے۔ میرے الہام میں بھی مجھے آدم کہا گیا ہے۔

جب روحانیت پر موت آجاتی ہے یعنی اصل انسانیت فوت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بطور آدم کے ایک اَور کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح سے ہمیشہ سے آدم پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر قدیم سے یہ سلسلہ ایسا نہ ہو تو پھر ماننا پڑیگا کہ پانچ یا چھ ہزار برس سے خدا ہے قدیم سے نہیں ہے یا یہ کہ اوّل وہ معطل تھا۔

یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ بعض قرون کو ہلاک کرتا ہے۔ دیکھو نوحؑ کے وقت ایک زمانہ کو ہلاک کر دیا۔ اس لیے ممکن کیا بلکہ یقین ہے کہ نوحؑ کی طرح اس وقت سابقہ قوموں کو ہلاک کر دیا اور پھر ایک نئی پیدائش کی۔ اگر یہ ہلاکت کا سلسلہ نہ ہو تو پھر زمین پر اس قدر آبادی ہو کر رہنا محال ہو جاوے۔ یہ قبریں ہی ہیں جنہوں نے یہ پردہ پوشی کی ہے[2]

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۶-۱۸۷ مورخہ ۳ ؍جولائی ۱۹۰۳ء)

---

[1] حاشیہ الحکم میں ہے:۔ ”کوئی آدمی نہ بچا ہو“ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۵ مورخہ ۱۰ ؍جولائی ۱۹۰۳ء)

[2] الحکم میں ہے:۔ ”پردہ پوشی کی ہوئی ہے“ (” ” ” ” ۱۶ ” ” ” ” ”)

۳۰ جون ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

بیعت کے بنیادی لوازم

چند ایک نووارد احباب نے بیعت کی۔ ان میں سے چند ایک نے عرض کی کہ حضرت جی۔ ہم قرآن پڑھے ہوئے نہیں ہیں فرمایا کہ:۔

موٹے موٹے گناہوں کو تو جانتے ہو اُن سے بچو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ ظلم نہ کرو۔ کسی کا مال یا زمین نہ دباؤ۔ جھوٹ مت بولو۔ شرک مت کرو۔

حدیث شریف سے ثابت ہے کہ اَھْلُ الْجَنَّۃِ بُلْہٌ۔ کہ جنت میں جانے والے سادے ہوتے ہیں۔ جو بہت پڑھے ہوئے ہیں اور عمل نہیں کرتے ان کی سخت مذمت کی گئی ہے اور ان پر خُدا نے لعنت بھی کی تھی۔ غریب لوگ پانصد برس پیشتر بہشت میں داخل ہونگے۔ غریبی خوش قسمتی ہے۔ خُدا کو پہچانو کہ جس کی طرف تم نے جانا ہے اور شرک سے پرہیز کرو۔ اسباب پر بھروسہ کرنے سے بچو کہ یہ بھی ایک شرک ہے۔ جو آدمی چالاکی سے گناہ کرتا ہے اور باز نہیں آتا تو آخر خدا کا قہر ایک دن اُسے ہلاک کرتا ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے معنے یہی ہیں کہ خدا کے سوا اور کسی کی پُوجا نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں۔

اپنی عورتوں کو نصیحتیں کرو۔ رشوتیں نہ لو نہ دو۔ تکبر۔ گھمنڈ۔ غرور ان سب باتوں سے بچو۔ خُدا کے غریب اور عاجز بندے بن جاؤ۔

صبر اور عفو

ایک نے سوال کیا کہ اگر کوئی دشمن نقصان دیوے تو پھر بدلہ لیویں کہ نہ؟ فرمایا کہ:۔

صبر کرو کہ یہ وقت صبر کا ہے۔ جو صبر کرتا ہے خدا تعالیٰ اُسے بڑھاتا ہے۔ انتقام کی مثال شراب کی طرح ہے کہ جب تھوڑی تھوڑی پینے لگتا ہے تو بڑھتی جاتی ہے حتٰی کہ پھر وہ اُسے چھوڑ نہیں سکتا اور حد سے بڑھتا ہے اس طرح انتقام لیتے لیتے انسان ظلم کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

ایسی مجلس سے اُٹھ جانا چاہیئے جہاں بُرا کہا جاتا ہو

سوال ہوا کہ اگر آپ کو کوئی بُرا کہے تو ہم کیسے صبر کر سکتے ہیں؟ فرمایا کہ:۔

جوش کے وقت اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیئے۔ دُکھ تو ہوتا ہے مگر انسان ثواب پاتا ہے۔ اگر کوئی ہمیں بُرا کہتا ہو تو وہاں سے اُٹھ گئے یا الگ ہو گئے۔ نہ سُنا کہ جس سے جوش آوے اور فساد ہووے۔

فساد سے بچنا چاہیئے

سوال ہوا کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دیتے اور اس مسجد میں ہمارا حصّہ ہے۔ فرمایا کہ:۔

سفید زمین پر ایک حد کر لی وہی مسجد ہو جاتی ہے مگر فساد اچھا نہیں۔ اگر تم دشمن سے بدلہ نہ لو اور اُسے خدا کے حوالہ کر دو تو وہ خود نپٹ لیوے گا۔ دیکھو ایک بچہ کے دشمن کا مقابلہ ماں باپ کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ کے دروازہ پر گرتا ہے تو خدا خود اس کی رعایت کرتا ہے اور اسے ضرر دینے والے کو تباہ کر دیتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ صفحہ ۱۸۷ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء)

یکم جولائی ۱۹۰۳ء

دربار شام

ایک فقہی مسئلہ

ایک لڑکی کے دو بھائی تھے اور ایک والدہ۔ ایک بھائی اور والدہ ایک لڑکے کے ساتھ اس لڑکی کے نکاح کے لیے راضی تھے۔ مگر ایک بھائی مخالف تھا۔ وہ اَور جگہ رشتہ پسند کرتا تھا اور لڑکی بھی بالغ تھی۔ اس کی نسبت مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اس کا نکاح کہاں کیا جاوے۔ حضرت اقدس علیہ السلام نے دریافت کیا کہ وہ لڑکی کس بھائی کی رائے سے اتفاق کرتی ہے؟ جواب دیا گیا کہ اپنے اس بھائی کے ساتھ جس کے ساتھ والدہ بھی متفق ہے۔ فرمایا کہ:۔

پھر وہاں ہی اس کا رشتہ ہو جہاں لڑکی اور اس کا بھائی دونوں متفق ہیں۔

آنحضرتؐ کا ابولہب کے لڑکوں سے رشتہ کرنا

پھر نکاحوں پر ذکر چل پڑا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لڑکیوں کے رشتے ابولہب کے[1] کر دیئے تھے حالانکہ وہ مشرک تھا مگر اس وقت تک نکاح کے متعلق وحی کا نزول نہ ہوا تھا۔ چونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر توحید غالب تھی اس لیے دخل نہ دیتے تھے اور قومیت کے لحاظ سے بعض امور کو سرانجام دیتے اس لیے ابولہب کو لڑکی دے دی تھی۔

رسُول کو علمِ غیب نہیں ہوتا

رسول عالم الغیب ہوتا ہے کہ نہیں؟ اس پر فرمایا کہ:۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب ہوتا تو آپ زینب کا

---

[1] ابولہب کے گھر مراد ہے۔ (مرتب)

نکاح زید سے نہ کرتے کیونکہ بعد کو جُدائی نہ ہوتی اور اسی طرح ابولہب سے بھی رشتہ نہ کرتے۔

مسیح موعود علیہ السلام کا مقام ماموریت

میں ایک مرد ہوں کہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور اپنے خاص خزانہ سے مجھے تعلیم دیتا ہے اور اپنے ادب سے میری تادیب فرماتا ہے۔ وہ اپنی مجھ پر وحی بھیجتا ہے۔ مَیں اس کی وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ ایسی صورت میں مجھے کونسی ایسی ضرورت ہے کہ مَیں اس کی راہ کو ترک کر کے دوسری متفرق راہیں اختیار کروں؟ جو کچھ آج تک مَیں نے کہا ہے اسی کے امر سے کہا ہے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں ملایا۔ اور نہ اپنے خدا پر مَیں نے افتراء باندھا ہے۔ مفتری کا انجام ہلاکت ہے۔ پس اس کاروبار پر تعجب کرنے کا کونسا مقام ہے۔ اس قادر مطلق خدا کے کاروبار پر تعجب نہ کرو کیونکہ اس نے تو زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس سے پوچھے کہ یہ کیا کیا؟

میرے پاس خدا تعالیٰ کی بہت سی شہادتیں ہیں۔ اس نے میرے لیے بہت سے نشان دکھلائے ہیں اور اس کی وحی کردہ غیبی خبروں میں جو اس نے مجھے دیں ایسے ایسے راز ہیں کہ انسان کی عقل کو اُن تک رسائی نہیں ہے پس اس لیے چاہیئے کہ طاعون کے بارے میں ہمارے ساتھ جھگڑا نہ کریں اور اس شخص کی طرح نہ ہوویں جس کے دل کو خدا نے غافل کر دیا اور اس نے اپنے اسباب کو اپنا خدا قرار دے لیا۔ کیا ان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ہر ایک سبب کا انتہا آخر کار ہمارے خدا تک ہی ہے اور تھوڑی دور تک چل کر اسباب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور صرف امرِ خالص کا مرتبہ رہ جاتا ہے کہ جسے کسی طرح ہم سبب کی طرف منسوب نہیں کر سکتے اور صرف خدا تعالےٰ کی ذات ہی باقی رہ جاتی ہے اور اسباب کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ اسباب کا سلسلہ تو صرف چند قدموں تک ساتھ دیتا ہے اس کے بعد خدا تعالیٰ کی غیر مدرک اور غیر مرئی خالص قدرت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا پوشیدہ خزانہ ہے کہ جس کی حد اور انتہا ہی نہیں ہے اور ایسا دریا ہے کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اور ایک ایسا دشت ہے کہ جو طے ہونے میں نہیں آتا۔ یہ کہنا کہ قدرت خالص اللہ تعالیٰ کی بے کار ہو جاتی ہے اور صرف اسباب رہ جاتے ہیں بڑی بےانصافی ہے۔ کیا تم کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ خُدا نے آدمؑ اور عیسیٰؑ کو کیسے پیدا کیا تھا؟ اور موسیٰؑ کے لیے کس طرح دریا کو شگاف کیا کہ جس سے موسیٰ علیہ السلام تو دریا سے سلامت گذر گئے اور فرعون غرق ہو گیا؟ اب تم ہی جواب دو کہ وہ کونسی کشتی تھی جس پر بیٹھ کر موسیٰؑ دریا سے گذرے۔

خدا تعالیٰ نے اس قصّہ کو قرآن کریم میں بے فائدہ نہیں ذکر کیا ہے بلکہ اس میں بڑے بڑے معارف اور حقائق ہیں تاکہ تم کو اس بات کا علم ہو کہ اس پاک ذات اللہ تعالےٰ کی قدرت اسباب میں مقیّد نہیں ہے اور تمہارے ایمان ترقی کریں۔ آنکھیں کھلیں اور شکوک و شبہات رفع ہوں اور تم کو یہ شناخت حاصل ہو کہ تمہارا خدا ایسا قادر

خدا ہے کہ اس پر کسی قسم کا کوئی دروازہ مسدود نہیں ہے۔ اس کی قدرتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جو شخص اس کی وسعتِ قدرت سے منکر ہو کر اسباب کے احاطہ میں اسے مقیّد کرتا ہے تو سمجھو کہ صدق کے مقام سے وہ گر پڑا۔ پس اگر کوئی شخص حکمِ خداوندی سے اسباب کو ترک کرتا ہے تو تم اُسے بُرا مت کہو اور خدا تعالیٰ کے قانون کو ایک تنگ و تاریک دائرہ میں محدود مت کرو۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۱ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء)

نیز (البدر جلد ۲ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۹۳-۱۹۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء)

---

۴ جولائی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

تعویذ اور دَم

ایک شخص نے مسئلہ استفسار کیا کہ تعویذ کا بازو وغیرہ مقامات پر باندھنا اور دم وغیرہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جناب مولنا حکیم نورالدین صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ:۔

احادیث میں کہیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ نہیں؟

حکیم صاحب نے عرض کی کہ لکھا ہے کہ خالد بن ولید جب جنگوں میں جاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک جو کہ آپ کی پگڑی میں بندھے ہوتے آگے کی طرف لٹکا لیتے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف[۱] ایک دفعہ صبح کے وقت سارا سر منڈوایا تھا تو آپ نے نصف سر کے بال ایک خاص شخص کو دے دیئے اور نصف سر کے بال باقی اصحاب میں بانٹ دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جُبّہ مبارک کو دھو دھو کر مریضوں کو بھی پلاتے تھے[۲] اور مریض اس سے شفایاب ہوتے تھے۔ ایک عورت نے ایک دفعہ آپ کا پسینہ بھی جمع کیا۔ یہ تمام اذکار سُنکر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

پھر اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ بہر حال اس میں کچھ بات ضرور ہے جو خالی از فائدہ نہیں ہے اور تعویذ وغیرہ کی

۱؎ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ "صرف" نہیں بلکہ "جب" ہے جو طباعت کی غلطی سے "صرف" چھپ گیا ہے۔ چنانچہ الحکم میں "جب" ہی لکھا ہے۔ الحکم میں ہے:۔

"جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر منڈوایا تو آدھے سر کے کٹے ہوئے بال ایک شخص کو دیدیئے اور آدھے دوسرے حصہ کے باقی اصحاب کو بانٹ دیئے۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

۲؎ الحکم میں ہے:۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات جُبّہ شریف دھو کر مریضوں کو بھی پلایا کرتے تھے۔" (حوالہ مذکور)

اصل بھی اس سے نکلتی ہے۔ بال لٹکائے تو کیا اور تعویذ باندھا تو کیا۔ میرے الہام میں جو ہے کہ بادشاہ تیرے کپڑوں میں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ آخر کچھ تو ہے تبھی وہ برکت ڈھونڈیں گے مگر ان تمام باتوں میں تقاضائے محبت کا بھی دخل ہے۔

عظیم الشان انسانوں کے صغائر پر نظر کرنے کا ذکر ہوا۔ فرمایا کہ :-

صدق و وفا میں جو عظیم الشان انسان ہوتے ہیں۔ ان کے صغائر کا ذکر کرنے سے سلبِ ایمان ہو جاتا ہے۔ خدا تو ان صغائر کو عفو کر دیتا ہے اور اُن کے کارناموں کی عظمت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں صغائر کا ذکر کرتے ہی شرم آتی ہے اسی لیے وہ رفتہ رفتہ ایسے معدوم ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا نام و نشان ہی نہیں رہتا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۱ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۳ء)

۵ر جولائی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

تبلیغ کا طریق

فرمایا کہ :-

کتابوں کو شائع کرنا چاہیئے تاکہ تبلیغ ہو۔ دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے پرے بہت کم لوگوں کو ہمارے دعاوی کی خبر ہے۔ اس کا انتظام یوں ہونا چاہیئے کہ ایک لمبا سفر کیا جاوے اور اس میں یہ تمام کتب جو کہ بہت سا ذخیرہ پڑا ہوا ہے تقسیم کی جاویں تاکہ تبلیغ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سے سامان دیئے ہیں ان سے فائدہ نہ اُٹھانا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار ہوتا ہے ہمارے لیے ریل بنائی گئی ہے جس سے مہینوں کا سفر دنوں میں ہوتا ہے۔

چندوں کی اہمیت

اور قوم کو چاہیئے کہ ہر طرح سے اس سلسلہ کی خدمت بجا لاوے۔ مالی طرح پر بھی خدمت کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں چاہیئے۔ دیکھو دنیا میں کوئی سلسلہ بغیر چندہ کے نہیں چلتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سب رسولوں کے وقت چندے جمع کئے گئے۔ پس ہماری جماعت کے لوگوں کو بھی اس امر کا خیال ضروری ہے۔ اگر یہ لوگ التزام سے ایک ایک پیسہ بھی سال بھر میں دیویں تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا تو اُسے جماعت میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔[1]

---

[1] الحکم سے :- (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس وقت اس سلسلہ کو بہت سی امداد کی ضرورت ہے۔ انسان اگر بازار جاتا ہے تو بچے کی کھیلنے والی چیزوں پر ہی کئی کئی پیسے خرچ کر دیتا ہے تو پھر یہاں اگر ایک ایک پیسہ دے دیوے تو کیا حرج ہے؛ خوراک کے لیے خرچ ہوتا ہے، لباس کے لیے خرچ ہوتا ہے۔ اور ضرورتوں پر خرچ ہوتا ہے تو کیا دین کے لیے ہی مال خرچ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

۵؍ جولائی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

احمدی کون ہے؟

(اپنے الفاظ میں)

حضور علیہ السلام معمول کے موافق شہ نشین پر جلوس فرما ہوئے اور ذیل کی تقریر فرمائی:۔

مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جماعت میں چندہ دینے والے بہت تھوڑے ہیں۔ آئے دن صدہا آدمی بیعت کر کے چلے جاتے ہیں لیکن دریافت کرنے پر بہت ہی کم تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو متواتر ماہ بماہ چندہ دیتے ہیں۔ جو شخص اپنی حیثیت و توفیق کے موافق اس سلسلہ کی چند پیسوں سے امداد نہیں کرتا اس سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے اور اس سلسلہ کو اسکے وجود سے کیا فائدہ؟ ایک معمولی انسان بھی خواہ کتنی ہی شکستہ حالت کا کیوں نہ ہو جب بازار جاتا ہے تو اپنی قدر کے موافق اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا ہے تو پھر کیا یہ سلسلہ جو اپنی عظیم الشان اغراض کے لیے اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس لائق بھی نہیں کہ وہ اس کے لیے چند پیسے بھی قربان کر سکے؛ دنیا میں آجکل کونسا سلسلہ ہوا ہے یا ہے جو خواہ دُنیوی حیثیت سے ہے یا دینی بغیر مال چل سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر ایک کام اس لیے کہ عالمِ اسباب ہے اسباب سے ہی چلایا ہے۔ پھر کسقدر بخیل و مُمسِک وہ شخص ہے کہ جو ایسے عالی مقصد کی کامیابی کے لیے ادنیٰ چیز مثل چند پیسے خرچ نہیں کر سکتا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ الٰہی دین پر لوگ اپنی جانوں کو بھیڑ بکری کی طرح نثار کرتے تھے۔ مالوں کا تو کیا ذکر، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سے زیادہ دفعہ اپنا کل گھر بار نثار کیا حتی کہ سوئی تک کو بھی اپنے گھر میں نہ رکھا اور ایسا ہی حضرت عمرؓ نے اپنی بساط و انشراح کے موافق اور عثمانؓ نے اپنی طاقت و حیثیت کے موافق، علیٰ ہذا القیاس علیٰ قدر مراتب تمام صحابہ اپنی جانوں اور مالوں سمیت اس دین الٰہی پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک وہ ہیں کہ بیعت تو کر جاتے ہیں اور اقرار بھی کر جاتے ہیں کہ ہم دنیا پر دین کو مقدم کریں گے مگر مدد و امداد کے موقعہ پر اپنی جیبوں کو دبا کر پکڑ رکھتے ہیں۔ بھلا ایسی محبتِ دنیا سے کوئی دینی مقصد پا سکتا ہے؛ اور کیا ایسے لوگوں کا وجود کچھ بھی نفع رساں ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرنا گراں گذرتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ان چند دنوں میں صدہا آدمیوں نے بیعت کی ہے مگر افسوس ہے کہ کسی نے ان کو کہا بھی نہیں کہ یہاں چندوں کی ضرورت ہے۔ خدمت کرنی بہت مفید ہوتی ہے جس قدر کوئی خدمت کرتا ہے اسی قدر وہ راسخ الایمان ہو جاتا ہے اور جو کبھی خدمت نہیں کرتے ہیں تو اُن کے ایمان کا خطرہ ہی رہتا ہے۔

چاہیئے کہ ہماری جماعت کا ہر ایک متنفس عہد کرے کہ میں اتنا چندہ دیا کروں گا۔ کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے عہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں برکت دیتا ہے۔ اس دفعہ تبلیغ کے لیے جو بڑا بھاری سفر کیا جاوے تو اس میں ایک رجسٹر بھی ہمراہ رکھا جاوے۔ جہاں کوئی بیعت کرنا چاہے اس کا نام اور چندہ کا عہد درج رجسٹر کیا جاوے اور ہر ایک آدمی کو چاہیئے کہ وہ عہد کرے کہ مدرسہ میں اس قدر چندہ دیوے گا اور لنگر خانہ میں اس قدر۔

بہت لوگ ایسے ہیں کہ جن کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ چندہ بھی جمع ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو سمجھانا چاہیئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران: ۹۳) جب تک تم اپنی عزیز ترین اشیاء اللہ جل شانہ کے راہ میں خرچ نہ کرو۔ تب تک تم نیکی کو نہیں پاسکتے۔

اس وقت ہماری جماعت قریباً تین لاکھ ہے اگر ایک ایک پیسہ ہی اس سلسلہ کی امداد مثل لنگر و مدرسہ وغیرہ امداد دیں تو لاکھوں پیسے ہو سکتے ہیں۔ قطرہ قطرہ بہم شود دریا ایک ایک بوند پانی سے دریا بن جاتا ہے تو کیا ایک ایک پیسہ سے ہزار ہا روپیہ نہیں بن سکتا اور کیا سلسلہ کی ضروریات پُوری نہیں ہوسکتیں؟

اگر ایک شخص چار روٹیاں کھاتا ہے۔ آدھی بھی اگر روٹی بچا لے تو بھی اس عہد سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

البتہ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ اکثر لوگوں کو اب تک کہا بھی نہیں جاتا کہ ہمارے سلسلہ کے لیے کسی چندہ کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ رو رو کر بیعت کر کے جاتے ہیں۔ اگر ان کو کہا جاوے تو ضرور وہ چندہ دیویں۔ مگر ترغیب دینا ضروری ہے۔ پس میں تم میں سے ہر ایک کو جو حاضر یا غائب ہے تاکید کرتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کو چندہ سے باخبر کرو۔ ہر ایک کمزور بھائی کو بھی چندہ میں شامل کرو۔ یہ موقعہ ہاتھ آنے کا نہیں۔ کیسا یہ زمانہ برکت کا ہے کہ کسی سے جانیں مانگی نہیں جاتیں اور یہ زمانہ جانوں کے دینے کا نہیں بلکہ فقط مالوں کے بقدر استطاعت خرچ کرنے کا ہے اس لیے ہر ایک شخص تھوڑا تھوڑا جو وہ لنگر اور مدرسہ اور دیگر ضروری مدوں میں دے سکتا ہے دے۔ وہ آدمی جو تھوڑا تھوڑا چندہ دے۔ مگر باقاعدہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ دے مگر گاہے گاہے دے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ صفحہ ۸ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء)

کہ اگر تم سچا تعلق رکھتے ہو تو خدا تعالیٰ سے پکا عہد کرلو کہ اس قدر چندہ ضرور دیا کروں گا اور ناواقف لوگوں کو یہ بھی سمجھایا جاوے کہ وہ پوری تابعداری کریں۔ اگر وہ اتنا عہد بھی نہیں کرسکتے تو پھر جماعت میں شامل ہونے کا کیا فائدہ؟ نہایت درجہ کا بخیل اگر ایک کوڑی بھی روزانہ اپنے مال میں سے چندے کے لیے الگ کرے تو وہ بھی بہت کچھ دے سکتا ہے ایک ایک قطرہ سے دریا بن جاتا ہے۔ اگر کوئی چار روٹی کھاتا ہے تو اسے چاہیئے کہ ایک روٹی کی مقدار اس میں سے اس سلسلہ کے لیے بھی الگ کر رکھے اور نفس کو عادت ڈالے کہ ایسے کاموں کے لیے اسی طرح سے نکالا کرے۔

چندے کی ابتدا اس سلسلہ سے ہی نہیں ہے بلکہ مالی ضرورتوں کے وقت نبیوں کے زمانہ میں بھی چندے جمع کئے گئے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ذرا چندے کا اشارہ ہوا تو تمام گھر کا مال لاکر سامنے رکھ دیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسبِ مقدور کچھ دینا چاہیئے اور آپ کی منشاء تھی کہ دیکھا جاوے کہ کون کس قدر لاتا ہے۔ ابوبکرؓ نے سارا مال لاکر سامنے رکھدیا۔ اور حضرت عمرؓ نے نصف مال۔ آپ نے فرمایا کہ یہی فرق تمہارے مدارج میں ہے اور ایک آج کا زمانہ ہے کہ کوئی جانتا ہی نہیں کہ مددِ دینی بھی ضروری ہے۔ حالانکہ اپنی گذران عمدہ رکھتے ہیں ان کے برخلاف ہندوؤں وغیرہ کو دیکھو کہ کئی کئی لاکھ چندہ جمع کرکے کارخانہ چلاتے ہیں اور بڑی بڑی مذہبی عمارات بناتے اور دیگر موقعوں پر صرف کرتے ہیں حالانکہ یہاں تو بہت ہلکے چندے ہیں۔ پس اگر کوئی معاہدہ نہیں کرتا تو اسے خارج کرنا چاہیئے وہ منافق ہے اور اس کا دل سیاہ ہے۔ ہم ہرگز نہیں کہتے کہ ماہواری روپے ہی ضرور دو ہم تو یہ کہتے ہیں کہ معاہدہ کرکے دو جس میں کبھی فرق نہ آوے۔ صحابہ کرامؓ کو پہلے ہی سکھایا گیا تھا۔ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (آل عمران: ۹۳) اس میں چندہ دینے اور مال صرف کرنے کی تاکید اور اشارہ ہے یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ ہوتا ہے اس کو نباہنا چاہیئے۔ اس کے برخلاف کرنے میں خیانت ہوا کرتی ہے۔ کوئی کسی ادنیٰ درجہ کے نواب کی خیانت کرکے اس کے سامنے نہیں ہوسکتا تو احکم الحاکمین کی خیانت کرکے کس طرح اسے اپنا چہرہ دکھلا سکتا ہے۔ ایک آدمی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جمہوری امداد میں برکت ہوا کرتی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں بھی آخر چندوں پر ہی چلتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی سلطنتیں زور سے ٹیکس وغیرہ لگاکر وصول کرتے ہیں۔ اور یہاں ہم رضا اور ارادہ پر چھوڑتے ہیں۔ چندہ دینے سے ایمان میں ترقی ہوتی ہے اور یہ محبت اور اخلاص کا کام ہے۔

پس ضرور ہے کہ ہزار در ہزار آدمی جو بیعت کرتے ہیں ان کو کہا جاوے کہ اپنے نفس پر کچھ مقرر کریں اور اس میں پھر غفلت نہ ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲ مورخہ ۱۷؍ جولائی ۱۹۰۳ء)

۶؍جولائی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ:۔

طاعون کا عذاب

اس بات کو سوچنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونے والا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قتل کے عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا حالانکہ صحابہؓ بھی قتل ہوتے تھے لیکن وہی قتل کفار کے لیے عذاب کا حکم رکھتا تھا اور مسلمانوں کے لیے شہادت کا۔ عذاب کا معیار یہی ہے کہ انسان دیکھے کہ کونسا فریق زیادہ تباہ ہو رہا ہے آیا موافق یا مخالف۔ پس جو زیادہ تباہ ہوتا ہو ان کیلئے عذاب ہے۔ اسی طریق سے آج کل مقابلہ کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے طاعون کو عذاب کے طور پر بھیجا ہے۔ اس میں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ آیا ہماری جماعت کے لوگ زیادہ مرتے ہیں یا مخالف؟ پھر خود ہی معلوم ہو جاوے گا کہ اس عذاب نے کن کو نیست و نابود کر دیا۔

اگر ہماری جماعت کے بھی بعض فوت ہو جاتے ہیں تو اس میں حرج نہیں ہے کیونکہ صحابہؓ بھی جنگوں میں قتل ہوتے ہی تھے ہاں البتہ ایسے جن سے شماتت اعداء ہو سکے بچائے جاویں گے جب بدر اور اُحد کی لڑائیاں ہوتی تھیں تو کوئی سمجھتا تھا کہ امر فارق کیا ہے؟ کبھی ان کو فتح ہوتی کبھی صحابہؓ کو۔ تاہم بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکو خدا تعالیٰ اعجازی طور پر مرنے سے بچا لیتا ہے۔ دیکھو ابو بکرؓ و عمرؓ کو لڑائیوں میں بچا لیا۔ اس کا نام اعجاز ہوتا ہے ورنہ موت تو ہر ایک کے لیے ہے۔

فرمایا کہ:۔

موعود کون ہے

موعود وہ ہے جس کا ذکر مِنْکُمْ میں ہے جیسے کہ فرماتا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ..... (النور: ۵۶) ورنہ اس طرح خواہ صدہا مسیح آویں اور کسی اُمت کے ہوں وہ موعود نہ ہوویں گے کیونکہ وہ مِنْکُمْ سے باہر ہوں گے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کا وعدہ مِنْکُمْ کا ہے پھر باہر سے آنے والا کیسے موعود ہو سکتا ہے؟

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۲ مورخہ ۱۷؍جولائی ۱۹۰۳ء)

۸؍جولائی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

غیر مومن کی ماتم پُرسی

مرزا امام الدین جو اپنے آپ کو ہدایت کنندہ قوم لال بیگیاں مشہور کرتا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سخت ترین

دشمنوں سے تھا، ۶ ر جولائی کو فوت ہوگیا۔ چنانچہ اس کے جنازہ پر رسمی طور پر ہمارے معزز و مکرم دوست سید محمد علی شاہ صاحب بھی چلے گئے اور جنازہ پڑھ لینے کے پیچھے آپ کو اپنے اس عمل پر تأسف ہوا اور آپ نے ذیل کا توبہ نامہ شائع کیا جو ہم ناظرین الحکم کی دلچسپی کے لیے درج کرتے ہیں کہ:۔

"مَیں بذریعہ توبہ نامہ ہذا اس امر کو شائع کرتا ہوں کہ مَیں نے سخت غلطی کی ہے اور وہ یہ کہ مَیں نے غلطی سے مرزا امام الدین کا جو ۶ ر جولائی کو فوت ہوا ہے اور جس نے اپنی کتابوں میں ارتداد کیا ہے جنازہ پڑھا پس میں بذریعہ اشتہار ہذا یہ توبہ نامہ شائع کرتا ہوں اور ظاہر کرتا ہوں کہ مَیں امام الدین اور ان لوگوں سے بیزار ہوں جو اس کے جنازہ میں شامل ہوئے اور بالآخر مَیں دُعائے جنازہ واپس لیتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے اپنے گناہ کی مغفرت چاہتا ہوں۔

خاکسار محمد علی شاہ ....

اس پر (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے) فرمایا کہ:۔

کوئی شخص کسی بات پر ناز نہ کرے۔ فطرت انسان سے الگ نہیں ہوا کرتی۔ جس فطرت پر انسان اوّل قدم مارتا ہے پھر وہ اس سے الگ نہیں ہوتا یہ بڑے خوف کا مقام ہے۔ حُسنِ خاتمہ کے لیے ہر ایک کو دعا کرنی چاہیئے۔ عمر کا اعتبار نہیں۔ ہر شئے پر اپنے دین کو مقدم رکھو زمانہ ایسا آگیا ہے کہ پہلے تو خیالی طور پر اندازہ عمر کا لگایا جاتا تھا مگر اب تو یہ بھی مشکل ہے۔ دانشمند کو چاہیئے کہ ضرور موت کا انتظام کرے۔ مَیں اتنی دیر سے اپنی برادری سے الگ ہوں۔ میرا کسی نے کیا بگاڑ دیا۔ خدا تعالیٰ کے مقابل پر کسی کو معبود نہیں بنانا چاہیئے[۱]۔

ایک غیر مومن کی بیمار پُرسی اور ماتم پُرسی تو حُسنِ اخلاق کا نتیجہ ہے لیکن اس کے واسطے کسی شعائرِ اسلام کو بجالانا گناہ ہے۔ مومن کا حق کافر[۲] کو دینا نہیں چاہیئے اور نہ منافقانہ ڈھنگ اختیار کرنا چاہیئے۔

خدا تعالیٰ کی ذات گو مخفی ہے مگر اس کے انوار ظاہر ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مخفی نہیں۔

۱؎ البدر کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ایک دانشمند کے لیے ضرور ہے کہ موت کا انتظام کرے۔ خدا تو موجود ہے۔ اس کے لیے بھی کچھ فکر چاہیئے۔ ہم اس قدر عرصہ سے اپنی برادری سے الگ ہیں ہمارا کسی نے کیا بگاڑ لیا جو اَور کسی کا برادری بگاڑ لے گی۔ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (الطلاق: ۴) خدا کے مقابلہ پر کسی کو معبود نہ بنانا چاہیئے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۲)

۲؎ البدر میں ہے:۔ "مومن کا حق غیر مومن کو نہ دینا چاہیئے۔" (" " " " " ۲۰۳)

کامیابی اور خوشی کی موت تمام نبیوں سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سب نبیوں سے زیادہ کامیاب نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے

کی ہے۔ موسیٰ بھی کامیاب ہوئے لیکن موت نے اُن کو بھی سفر میں آگھیرا۔ دل میں تمنا ہوگی کہ اس سرزمین میں پہنچوں مگر وہ پوری نہ ہوئی۔ مسیح کی موت پر خیال کیا جاوے تو اس میں غائت درجہ کی ناکامی ہے۔ کل بارہ حواری تھے کسی کو بہشت کی کنجیاں ملنے کا وعدہ تھا وہ نہ ملیں۔ ایک نے تیس روپے نقد لے کر گرفتار کروا دیا۔ دوسرے نے لعنت[1] بھیجی۔ اگر یہ[2] مان بھی لیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر ہی چڑھ گئے تو بھی روتے ہی گئے ہوں گے خوشی اور کامیابی کی موت تو نصیب نہ ہوئی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں آنا اور پھر وہاں سے رخصت ہونا قطعی دلیل آپ کی نبوت پر ہے۔ آئے آپ اس وقت جبکہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم: ۴۲) کا مصداق تھا اور ضرورت ایک نبی کی تھی۔ ضرورت پر آنا بھی ایک دلیل ہے اور آپ اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ (النصر: ۲) کا آوازہ دیا گیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آپ کس قدر عظیم الشان کامیابی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ فوج در فوج لوگ داخل ہو رہے ہیں۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (النصر: ۴) یعنی وہ رب جس نے اس قدر کامیابی دکھلائی اس کی تسبیح و تحمید کر اور اُور انبیاء پر جو انعامات پوشیدہ رہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول دیئے گئے اور رحمت کے تمام امور اجلیٰ کر دیئے اور کوئی بھی مخفی نہ رکھا۔ اس حمد کا ثبوت اس آخری وقت پر آ کر دیا۔ احمد[3] کے معنے بھی (ہیں) حمد کرنے والا۔

دنیا میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں آیا جو اتنی بڑی کامیابی اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ لذت و سرور کی موت اگر ہوئی ہے تو فقط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہوئی ہے اور دوسرے کسی نبی کو بھی میسر نہیں ہوئی۔ یہ خدا کا فضل

---

[1] البدر میں ہے:۔ "ایک نے اُستاد پر لعنت کی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۳)

[2] البدر میں ہے:۔ "بفرض محال اگر مان لیا جاوے۔" (" " " " ")

[3] البدر میں ہے:۔

"اسی حمد کا ثبوت اب اس آخری وقت میں آ کر دیا ہے کہ ایک احمد آیا۔ احمد کے معنے ہیں حمد کرنے والا۔ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو ثابت کرے کہ اس قدر کامیابی کسی اَور کو ہوئی ہو۔ خوشی، مرادمندی اور لذت کی موت اگر حاصل ہوئی ہے تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی ہے اَور کسی نبی کو ہرگز نہیں ہوئی یہ خدا کا فضل ہے اس سے پتہ لگتا ہے کہ نفس ایسا پاک تھا کہ خدا کا اس قدر فضل ہوا اور آپ کی عصمت کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۳ مورخہ ۱۷ رجولائی ۱۹۰۳ء)

ہے اس لیے آپ کی عصمت کا یہ ایک بڑا ثبوت ملتا ہے۔ جیسے طبیب اُسے کہتے ہیں جو علاج کر کے مریض کو اچھا کر کے دکھلا دیوے ویسے ہی لا الٰہ الا اللہ سے ہر ایک رُوحانی مرض کا علاج کر کے آپ نے دکھلایا۔ اور اسی لیے دوسری تمام نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (المائدۃ: ۴) آج کافر نا اُمید ہو گئے گویا آپ کو کامیابی کے اس اعلیٰ نقطہ تک پہنچا دیا کہ کافر نامراد ہو گئے۔ کیا انجیل میں اس کے مقابل کوئی آیت ہے ہرگز نہیں۔ یسیح علیہ السلام کو تو فقط ایک یہودیوں کی اصلاح سپرد تھی اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا مگر ضعف[1] کی بات ہے کہ کوئی بات بھی پوری نہ ہوئی۔ اوّل اس کو بادشاہت کا وعدہ دیا تو پھر کہہ دیا کہ وہ آسمانی بادشاہت ہے۔ ایلیا کی بات پیش کی تو وہ ایسی کہ خود یحییٰ نے ایلیا ہونے سے انکار کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح علیہ السلام کا مقابلہ

پھر دیکھئے کہ مسیح کی گرفتاری کے لیے آدمی آگئے۔ دو گھنٹہ کے اندر ہی اندر آپ کو گرفتار کر لیا اور گرفتار کرنے والوں کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لیے کسریٰ کے سپاہی آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور پھر دوسرے دن صبح کو آپ اُن کو جواب دیتے ہیں کہ آج تمہارا خداوند مارا گیا اور میرے خدا نے اس کے لیے[2] شیرویہ کو اس پر مسلط کر دیا۔

اب دونو نبیوں کا مقابلہ کرلو۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے کسریٰ ہلاک ہو گیا۔ اس طرح لازم تھا کہ مسیح کی گرفتاری کے وقت کم از کم موٹے موٹے چھ سات آدمی مارے جاتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے خدا کا ارادہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رُعب جمایا جاوے گا۔

ایک آدمی کے دو خدمت گار ہوں کہ ایک تو رات دن خدمت کرتا ہے اور تنخواہ بھی لیتا ہے مگر گالی گلوچ بھی کھاتا ہے اور اُور مکروہات بھی دیکھتا ہے۔ ایک اَور ہے کہ بظاہر کام تو نہیں کرتا لیکن قرب اس کا بہت ہے۔ ہر وقت آقا رحمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اِس سے اُس کے اور آقا کے اندرونی تعلقات کا پتہ لگتا ہے کہ کس قدر بڑھے ہوئے ہیں یہی حال مسیح کا ہے کہ ان کی زندگی کیسی تلخی سے گذری ہے۔ گالی وغیرہ آپ

---

[1] البدر میں یہ فقرہ یوں لکھا ہے:۔ "مگر قسمت کی بات ہے کہ مسیح کی کوئی بات بھی پوری نہ ہوئی۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۲)

[2] البدر میں ہے:۔ "تمہارا خداوند آج رات کو مارا گیا اور میرے خدا نے اسی کے بیٹے شیرویہ کو اس پر مسلط کر دیا۔"

(حوالہ مذکور)

کھاتے رہے اور نصرت و فتح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال ہونا صداقت کی بڑی بھاری دلیل ہے۔[1]
مسیح کی قوم یہود تو آپ کے بھائی ہی تھے۔ مسیح بھی تورات کو مانتے تھے مگر پھر بھی ذرا سی بات پر اسقدر مخالفت ہوئی کہ انہوں نے سولی پر چڑھایا اور ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہان دشمن اور پھر کامیابی پر کامیابی ملی حتیٰ کہ آپ کے خلفاء کو بھی کامیابی ہوئی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۱۰-۱۱ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

---

۹ جولائی ۱۹۰۳ء

دربار شام

قبرِ مسیح علیہ السلام

بعض عیسائی اخباروں نے مسیح کی قبر واقعہ کشمیر کے متعلق ظاہر کیا ہے کہ یہ قبر مسیح کی نہیں بلکہ ان کے کسی حواری کی ہے۔ اس تذکرہ پر آپ نے فرمایا کہ:۔

اب تو ان لوگوں نے خود اقرار کر لیا ہے کہ اس قبر کے ساتھ مسیح کا تعلق ضرور ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اُنکے کسی حواری کی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ مسیح کی ہے۔ اب اس قبر کے متعلق یہ تاریخی صحیح شہادت ہے کہ وہ شخص جو اس میں مدفون ہے وہ شہزادہ نبی تھا اور قریباً اُنیس سو برس سے مدفون ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یہ شخص مسیح کا حواری تھا اب ان پر ہی سوال ہوتا ہے اور اُن کا فرض ہے کہ وہ ثابت کریں کہ مسیح کا کوئی حواری شہزادہ نبی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اور وہ اس طرف آیا تھا اور یہ یقیناً ثابت نہیں ہو سکتا۔ پس اس صورت میں بجز اس بات کے ماننے کے کہ یہ مسیح علیہ السلام کی ہی قبر ہے اَور کوئی چارہ نہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۹ ، ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء

مجلس قبل از عشاء

نشانات کی ضرورت

نشانات کی ضرورت پر فرمایا کہ:۔
اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے ورنہ دیکھا جاتا ہے کہ اس وقت

---

[1] البدر میں ہے: یہی حال مسیح کا ہے کہ اُن کی زندگی کیسی تلخی سے گذری ہے۔ گالی وغیرہ آپ کھاتے رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال کس طرح تائیدات الٰہیہ رہیں۔ دنیا ہو یا آخرت، خدا تعالیٰ کے فضل کا شامل حال ہونا صداقت کی بڑی دلیل ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۶)

کیا ہو رہا ہے۔ نماز روزہ وغیرہ سب لحاظداری ہے حقیقی نیکی کو لوگ جانتے نہیں کہ کیا شئے ہے۔ خدا کے خوف سے کسی شئے کو ترک کرنا یا لینا بالکل جاتا رہا ہے۔ غرضیکہ اس وقت بڑی بحث آپڑی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ مدد نہ کرے اور نشانات نہ دکھلائے تو پھر دہریہ کو فتح حاصل ہوتی ہے اور اس وقت صرف اس کی ہستی کا ثبوت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی غیرت کے ثبوت کی بھی ضرورت ہے۔ بعض لوگ تو گاڈ کہہ رہے ہیں بعض اس کے لیے ایک بیٹا تجویز کر رہے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بھی ایسی ضرورت آپڑی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے وقت کہا کہ اگر تُو اس جماعت کو ہلاک کر دیگا تو پھر تیری پرستش کرنے والا دنیا میں کوئی نہ رہے گا۔ یہی حال اس وقت ہے۔ پس اگر مہدی اور مسیح کا یہ زمانہ نہیں تو اَور کس وقت کا انتظار ہے۔ آنے والے نے تو صدی کے سر پر آنا تھا۔ اب بیس سال سے بھی زیادہ گذر گئے۔ زمانہ کی موجودہ حالت سے پتہ لگتا ہے کہ اب آخری فیصلہ خدا تعالےٰ کا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

---

۱۱ جولائی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

تمباکو

تمباکو کے مضرات پر ایک مختصر مضمون پڑھا گیا[1] جس میں کل امراض کو تمباکو کا نتیجہ قرار دیا گیا تھا اور تمباکو کی مذمت میں بہت مبالغہ کیا گیا تھا۔ اس کو سُنکر حضرت حجۃ اللہ نے فرمایا کہ:

اللہ تعالیٰ کے کلام اور مخلوق کے کلام میں کس قدر فرق ہوتا ہے[2] شراب کے مضار اگر بیان کئے ہیں تو اس کا نفع بھی بتا دیا ہے۔ اور پھر اس کو روکنے کے لیے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس کا ضرر نفع سے بڑھ کر ہے۔ دراصل کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی نفع نہ ہو مگر مخلوق کے کلام کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اب دیکھ لو۔ اس

---

[1] البدر میں ہے:۔
"تمباکو کے مضرات کے متعلق ایک انگریزی ٹریکٹ مجلس میں پڑھا جا رہا تھا۔"
(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ صفحہ ۲۰۹ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء)

[2] البدر سے:۔ "اللہ تعالیٰ اگر کسی شئے کے نقصانات بیان کرتا ہے تو ساتھ ہی منافع بھی بیان کرتا ہے۔"
(حوالہ مذکور)

نے اس کے مضرات ہی مضرات بتائے ہیں کسی ایک نفع کا بھی ذکر نہیں کیا۔[1]

تمباکو کے بارے میں اگرچہ شریعت نے کچھ نہیں بتایا لیکن ہم اس کو مکروہ جانتے ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہوتا تو آپ نہ اپنے لیے اور نہ اپنے صحابہ کے لیے کبھی اس کو تجویز کرتے بلکہ منع کرتے۔

غریب کو بدقسمت نہیں سمجھنا چاہیئے

فرمایا کہ:۔

غرباء نے دین کا بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن سے اُمراء محروم رہ جاتے ہیں وہ پہلے تو فسق و فجور اور ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں اور اسکے مقابلہ میں صلاحیت تقویٰ اور نیازمندی غرباء کے حصّہ میں ہوتی ہے۔ پس غرباء کے گروہ کو بدقسمت خیال نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سعادت اور خدا تعالےٰ کے فضل کا بہت بڑا حصّہ اس کو ملتا ہے۔[2]

یاد رکھو حقوق کی دو قسمیں ہیں ایک حق اللہ دوسرے حق العباد۔

حق اللہ میں بھی امراء کو دقت پیش آتی ہے[3] اور تکبر اور خود پسندی ان کو محروم کر دیتی ہے مثلاً نماز کے وقت ایک غریب کے پاس کھڑا ہونا بُرا[4] معلوم ہوتا ہے۔ اُن کو اپنے پاس بٹھا نہیں سکتے اور اس طرح پر وہ حق اللہ سے محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ مساجد تو دراصل بیت المساکین ہوتی ہیں۔ اور وہ ان میں جانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور اسی طرح وہ حق العباد میں خاص خاص خدمتوں میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ غریب آدمی تو ہر ایک قسم کی خدمت کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ پاؤں دبا سکتا ہے۔ پانی لا سکتا ہے۔ کپڑے دھو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کو اگر نجاست پھینکنے کا موقعہ ملے تو اس میں بھی اُسے دریغ نہیں ہوتا لیکن امراء ایسے کاموں میں ننگ و عار سمجھتے ہیں اور اس طرح پر اس سے بھی محروم رہتے ہیں۔ غرض امارت بھی بہت سی نیکیوں کے حاصل کرنے سے روک دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ مساکین پانچ سو برس اوّل جنّت میں جائینگے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں ہے:۔ "لیکن مخلوق کی کلام کو دیکھو کہ نقصانات کے بیان کرنے میں کس قدر مبالغہ کیا ہے اور تمباکو کے نفع کا نام تک بھی نہیں لیا۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ صفحہ ۲۰۹ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "خدا تعالیٰ کے ان پر بڑے فضل اور اکرام ہیں۔" (حوالہ مذکور)

[3] البدر میں ہے:۔ حق اللہ میں بھی امراء لوگ ہنسی اختیار کرتے ہیں۔" (حوالہ مذکور)

[4] البدر میں ہے۔ "عار معلوم ہوتا ہے۔" (حوالہ مذکور)

۱۲؍جولائی ۱۹۰۳ء

بعد نمازِ عصر

خواتین کو نصائح

جو کہ حضرت اقدس علیہ السلام نے ۱۲؍جولائی ۱۹۰۳ء کو اندرون خانہ بوقت بین العصر والمغرب فرمایا تھا اور دروازہ سے باہر دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو کر قلمبند کیا گیا۔ چونکہ اکثر بچگان بھی عورتوں کے ہمراہ تھے جو اکثر شور کر کے سلسلہ تسامع کا توڑ دیتے تھے اس لیے جہاں تک بشریت کی استعداد نے موقعہ دیا۔ اس کو بلفظہٖ نوٹ کیا گیا ہے۔

(ایڈیٹر)

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا مگر تاہم آپ کی بیویاں سب کام کر لیا کرتی تھیں جھاڑو بھی دے لیا کرتی تھیں اور ساتھ اس کے عبادت بھی کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک بیوی نے اپنی حفاظت کے واسطے ایک رسہ لٹکا رکھا تھا کہ عبادت میں اُونگھ نہ آئے۔ عورتوں کے لیے ایک ٹکڑا عبادت کا خاوندوں کا حق ادا کرنا ہے اور ایک ٹکڑا عبادت کا خدا کا شکر بجا لانا ہے۔ خدا کا شکر کرنا اور خدا کی تعریف کرنی یہ بھی عبادت ہے دوسرا ٹکڑا عبادت کا نماز کو ادا کرنا ہے۔

کوئی شخص نواب تھا۔ صبح کو نماز کے لیے نہیں اُٹھتا تھا۔ ایک مولوی نے اسے وعظ سنایا اس پر نواب نے اپنے خادم کو کہا کہ مجھ کو صبح کو اُٹھا دینا۔ خادم نے دو تین مرتبہ اس کو جگایا۔ جب ایک مرتبہ جگایا تو اس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ جب دوبارہ اس طرف ہو کر جگایا پھر اَور طرف ہو گیا۔ جب تیسری مرتبہ جگایا تو اُس نے اُٹھ کر اُس کو خوب مارا اور کہا کم بخت جب ایک مرتبہ نہیں اُٹھا تو تجھے معلوم نہ ہوا کہ ابھی نہ اُٹھوں گا۔ پھر کیوں جگایا؟ اور اتنا مارا کہ وہ بیچارہ بیہوش ہو گیا۔ آپ ہی نے تو مولوی سے وعظ سُنکر اس کو کہا تھا کہ مجھ کو اُٹھا دینا۔ پھر جب اس نے جگایا تو اس بیچارے کی شامت آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے پاس بہت سا حصہ جاگیر کا ہوتا ہے وہ ایسے غافل ہو جاتے ہیں کہ حق اللہ کا اُن کو خیال نہیں آتا۔ امراء میں بہت سا حصہ تکبّر کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے عبادت نہیں کر سکتے اور نہ دوسرا حصہ خلقت کی خدمت کا اُن سے ادا ہوتا ہے۔ خلقت کی خدمت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی غریب آدمی سلام کرتا ہے تو بھی بُرا مانتے ہیں۔ ایسا ہی عورتوں کا حال ہے کوئی چھوٹی عورت آوے تو چاہیئے کہ بڑی کو سلام کرے۔ یہ دو ٹکڑے شریعت کے ہیں حق اللہ اور حق العباد۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھو کہ کس قدر خدمات میں عمر کو گذارا۔ اور حضرت علیؓ کی حالت کو دیکھو کہ اتنے پیوند لگائے کہ جگہ نہ رہی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک بڑھیا کو ہمیشہ حلوہ کھلانا وطیرہ کر رکھا تھا۔ غور کرو کہ یہ کس قدر التزام تھا۔

جب آپ فوت ہوگئے تو اس بُڑھیا نے کہا کہ آج ابوبکرؓ فوت ہوگیا۔ اس کے پڑوسیوں نے کہا کہ کیا تجھ کو الہام ہوا یا وحی ہوئی ؟ تو اس نے کہا نہیں آج حلوا لے کر نہیں آیا اس واسطے معلوم ہوا کہ فوت ہوگیا۔ یعنی زندگی میں ممکن نہ تھا کہ کسی حالت میں بھی حلوا نہ پہنچے۔ دیکھو کس قدر خدمت تھی۔ ایسا ہی سب کو چاہیئے کہ خدمتِ خلق کرے۔

ایک بادشاہ اپنا گذارہ قرآن شریف لکھ کر کیا کرتا تھا۔

اگر کسی کو کسی سے کراہت ہووے اگرچہ کپڑے سے ہو یا کسی اَور چیز سے ہو تو چاہیئے کہ وہ اس سے الگ ہو جاوے مگر روبرو ذکر نہ کرے کہ یہ دلشکنی ہے اور دل کا شکستہ کرنا گناہ ہے اگر کھانا کھانے کو کسی کے ساتھ جی نہیں کرتا تو کسی اَور بہانہ سے الگ ہو جاوے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا (النور: ۶۲) مگر اظہار نہ کرے۔ یہ اچھا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کو تلاش کرنا ہے تو مسکینوں کے دل کے پاس تلاش کرو۔ اسی لیے پیغمبروں نے مسکینی کا جامہ ہی پہن لیا تھا۔ اسی طرح چاہیئے کہ بڑی قوم کے لوگ چھوٹی قوم کو ہنسی نہ کریں اور نہ کوئی یہ کہے کہ میرا خاندان بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میرے پاس جو آوگے تو یہ سوال نہ کروں گا کہ تمہاری قوم کیا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہوگا کہ تمہارا عمل کیا ہے۔ اسی طرح پیغمبر خدا نے فرمایا ہے اپنی بیٹی سے کہ اے فاطمہؓ خدا تعالیٰ ذات کو نہیں پوچھے گا۔ اگر تم کوئی بُرا کام کروگی تو خدا تعالیٰ تم سے اس واسطے درگذر نہ کرے گا کہ تم رسول کی بیٹی ہو پس چاہیئے کہ تم ہر وقت اپنا کام دیکھ کر کیا کرو۔ اگر کوئی چوڑھا اچھا کام کرے گا تو وہ بخشا جاوے گا اور اگر سید ہو کر کوئی بُرا کام کریگا تو وہ دوزخ میں ڈالا جاوے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے واسطے دعا کی وہ منظور نہ ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کو کہیں گے کہ اے اللہ تعالیٰ میں اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر اس کو پھر بھی رسہ ڈال کر دوزخ کی طرف گھسیٹ کر ذلت کے ساتھ لے جاویں گے (یہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہے کہ پیغمبر کی سفارش بھی کارگر نہ ہوگی) کیونکہ اس نے تکبر کیا تھا پیغمبروں نے غریبی کو اختیار کیا۔ جو شخص غریبی کو اختیار کریگا وہ سب سے اچھا رہے گا۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے غریبی کو اختیار کیا۔ کوئی شخص عیسائی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ حضرت نے اس کی بہت سی تواضع و خاطرداری کی۔ وہ بہت بھوکا تھا۔ حضرت نے اس کو خوب کھلایا کہ اس کا پیٹ بہت بھر گیا۔ رات کو اپنی رضائی عنایت فرمائی۔ جب وہ سو گیا تو اس کو بہت زور سے دست آیا کہ وہ روک نہ سکا اور رضائی میں ہی کردیا جب صبح ہوئی تو اُس نے سوچا کہ میری حالت کو دیکھ کر کراہت کریں گے شرم کے مارے وہ نکل کر چلا گیا۔ جب لوگوں نے دیکھا تو حضرت سے عرض کی کہ جو نصرانی عیسائی تھا وہ رضائی کو خراب کر گیا ہے۔ اس میں دست کیا ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ مجھے دو تاکہ میں صاف کروں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ ہم جو حاضر ہیں ہم صاف کردیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ میرا مہمان تھا اس لیے میرا ہی کام ہے اور اُٹھ کر پانی منگوا کر خود ہی

صاف کرنے لگے۔ وہ عیسائی جبکہ ایک کوس نکل گیا تو اس کو یاد آیا کہ اس کے پاس جو سونے کی صلیب تھی وہ چارپائی پر بھول آیا ہوں۔ اس لیے وہ واپس آیا تو دیکھا کہ حضرت اس کے پاخانہ کو رضائی پر سے خود صاف کر رہے ہیں۔ اس کو ندامت آئی اور کہا کہ اگر میرے پاس یہ ہوتی تو میں کبھی اس کو نہ دھوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسا شخص کہ جس میں اتنی بے نفسی ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پھر وہ مسلمان ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لڑکوں کی طرف راستہ میں دیکھا کرتے تھے تو اتنی شفقت کیا کرتے تھے کہ وہ لڑکے سمجھا کرتے کہ یہ ہمارا باپ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ جو عورتیں کسی اور قسم کی ہوں ان کو دوسری عورتیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں اور نہ مرد ایسا کریں کیونکہ یہ دل دکھانے والی بات ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اس سے مواخذہ کرے گا۔ یہ بہت بری خصلت ہے۔ یہ ٹھٹھا کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت برا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی ایسی بات ہو جس سے دل نہ دکھے وہ بات جائز رکھی ہے۔ جہاں تک ہو سکے ان باتوں سے پرہیز کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عمل والے کو میں کس طرح جزا دوں گا۔ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى۔ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰى۔ (النّازعات: ۳۸ تا ۴۰) جو شخص میرے حکموں کو نہیں مانے گا۔ میں اس کو بہت بری طرح سے جہنم میں ڈالوں گا اور ایسا ہو گا کہ آخر جہنم تمہاری جگہ ہوگی۔ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى۔ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى (النّازعات: ۴۱، ۴۲) اور جو شخص میری عدالت کے تخت کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے گا اور خیال رکھے گا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کا ٹھکانا جنت میں کروں گا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰى۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰى۔ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (عبس ۲ تا ۵) اس سورۃ کے نازل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت کے پاس چند قریش کے بڑے بڑے آدمی بیٹھے تھے۔ آپ ان کو نصیحت کر رہے تھے کہ ایک اندھا آ گیا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو دین کے مسائل تلا دو۔ حضرت نے فرمایا کہ صبر کرو۔ اس پر خدا تعالیٰ نے بہت غصہ کیا۔ آخر آپ اس کے گھر گئے اور اسے بلا کر لائے اور چادر بچھا دی اور کہا کہ تو بیٹھ۔ اس اندھے نے کہا کہ میں آپ کی چادر پر کیسے بیٹھوں؟ آپ نے وہ چادر کیوں بچھائی تھی؟ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کو راضی کریں۔ تکبر اور شرارت بری بات ہے۔ ایک ذرا سی بات سے ستر برس کے عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ایک شخص عابد تھا وہ پہاڑ پر رہا کرتا تھا اور مدت سے وہاں بارش نہ ہوئی تھی۔ ایک روز بارش ہوئی تو پتھروں پر اور روڑیوں پر بھی ہوئی تو اس کے دل میں اعتراض پیدا ہوا کہ ضرورت تو بارش کی کھیتوں اور باغات کے واسطے ہے یہ کیا بات ہے کہ پتھروں پر ہوئی۔ یہی بارش کھیتوں پر ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ اس پر خدا تعالیٰ نے اس کا سارا ولی پنا چھین لیا۔ آخر وہ بہت سا غمگین ہوا۔ اور کسی اور بزرگ سے استمداد کی تو آخر اس کو پیغام آیا کہ

تُونے اعتراض کیوں کیا تھا۔ تیری اس خطا پر عتاب ہوا ہے۔ اس نے کسی سے کہا کہ ایسا کر کہ میری ٹانگ میں رسہ ڈال کر پتھروں پر گھسیٹتا پھر۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں کروں؟ اس عابد نے کہا کہ جس طرح میں کہتا ہوں۔ اسی طرح کرو۔ آخر اس نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ اس کی دونو ٹانگیں پتھروں پر گھسیٹنے سے چھل گئیں۔ تب خدا نے فرمایا کہ بس کر اب معاف کر دیا۔ اب دیکھو کہ لوگ کتنے اعتراض کرتے ہیں۔ ذرا زیادہ بارش ہو جاوے تو کہتے ہیں کہ ہم کو ڈبونے لگ گیا ہے اور ذرا توقف بارش میں ہو تو کہتے ہیں کہ اب ہم کو مارنے لگا ہے۔ یہ اعتراض کیسے بُرے ہوتے ہیں۔ دیکھو تقویٰ کیسے گم ہو گیا ہے اگر ایک دو آنے رستے میں مِل جاویں تو جلدی سے اُٹھا لیتا ہے اور پھر اس کو کسی سے نہیں کہتا۔ حالانکہ تقوے کا کام یہ تھا کہ اس کو سب کو سُناتا اور جس کے ہوتے اسکے حوالہ کرتا۔ پھر کہتے ہیں کہ بارش نہیں ہوتی بارش کیسے ہو؟ اللہ تعالیٰ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے۔ اگر زیادہ بارش ہو تو دہائی دیتے ہیں۔ اگر دھوپ زیادہ ہو تو بھی دہائی دیتے ہیں۔ ان سب حالتوں میں انسان تقویٰ سے خالی ہوتا ہے۔ پس چاہیئے کہ صبر کرے اگر صبر نہ کرے تو پھر کافر ہو کر تو روٹی کھانی حرام ہے انسان کو چاہیئے کہ کبھی خدا تعالےٰ پر اعتراض نہ کرے۔

دیکھو ہمارے پیغمبرِ خدا کے ہاں ۱۲ لڑکیاں ہوئیں۔ آپ نے کبھی نہیں کہا کہ لڑکا کیوں نہ ہوا اور جب کوئی غم ہوتا تو اِنَّا لِلّٰہِ ہی کہتے رہے۔ اب اگر کسی کا لڑکا مر جاوے تو برس برس تک روتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کشائش دیوے تو تعریف کرتے ہیں مگر ذرا سختی آ جاوے تو فوراً پھر جاتے ہیں۔ ایک شخص کی یہاں بیوی فوت ہو گئی وہ فوراً دہریہ ہو گیا۔ انسان کو چاہیئے کہ علاقہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا رکھے کہ کبھی سختی آوے تو توڑنا نہ پڑے گویا کبھی نہیں آئی۔ حضرت ایوبؑ کتنے صابر تھے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ دیکھ میرا بندہ کتنا صابر ہے۔ اس نے کہا کہ کیوں نہ ہو بکریاں بہت ہیں آرام سے کھاتا پیتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں نے تجھ کو اس کی بکریوں پر مسلط کیا۔ اس نے سب کو فنا کر دیا اور حضرت ایوبؑ کے خادم نے خبر پہنچائی کہ تمہاری بکریاں سب مر گئیں۔ آپ نے فرمایا کہ تو یُوں کیوں کہتا ہے کہ میری بکریاں مر گئیں وہ تو خدا تعالیٰ کی تھیں اس نے اپنی امانت واپس لے لی۔ پھر شیطان سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھ میرا بندہ ایوبؑ کیسا صابر ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں اس کو یہ خیال ہے کہ اُونٹ بہت سے ہیں بکریاں فنا ہو گئیں تو کیا ہو گیا ان سے سب طرح کے کام چل سکتے ہیں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں نے تجھ کو اُونٹوں پر بھی مسلط کیا۔ پھر سب اونٹ فنا ہو گئے اور اسی طرح خادم نے خبر دی تو حضرت ایوبؑ نے وہی کہا کہ میرے نہیں تھے یہ تو خدا تعالیٰ نے دیئے تھے اُس نے واپس لے لیے۔ پھر کیا افسوس ہے۔ پھر شیطان سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھا میرا بندہ کیسا صابر ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے دل میں تقویت ہے کہ گائیاں بہتیری ہیں ان سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ آخر ان پر بھی اسی طرح شیطان کو مسلط کیا گیا۔ وہ بھی فنا

ہوگئیں اور حضرت ایوبؑ نے صبر کیا۔ پھر خدا تعالیٰ نے فرمایا تو شیطان نے جواب دیا کہ اس کے پاس فرزند بہتیرے ہیں دل میں جانتا ہے کہ کیا ہوا یہ جیتے ہیں تو بہت سا مال اکٹھا ہو جاوے گا۔ خدا تعالیٰ نے اس کے فرزندوں کو بھی وفات دے دی۔ پھر شیطان نے کہا کہ خدایا اس کی تندرستی بہت ہے اس کو اس کی بدولت سب کچھ مل سکتا ہے۔ آخر یہ ہوا کہ نہایت بیمار ہوگئے اور تندرستی بھی جاتی رہی مگر صبر کیا اور پھر خدا تعالےٰ نے شیطان سے کہا کہ میرا بندہ کیسا صابر ہے۔ شیطان چُپ سا ہوگیا۔ مگر ان کی بیوی جو ہمیشہ کھانا پکایا کرتی تھی شیطان اس کو راستے میں ملا اور ایک بڈھی کی شکل میں اس سے کہا کہ تیرا خاوند ایسا ہے ایسا ہے تُو اس کی کیوں خدمت کرتی ہے۔ اُس نے یہ بات حضرت ایوبؑ سے کہی۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو شیطان تھا تُو نے اس کی بات کیوں میرے پاس کہی مَیں اچھا ہو کر تجھ کو سَو بید ماروں گا۔ پھر خدا تعالےٰ کی رحمت ہوئی تو ایوب علیہ السلام کے پاس فرشتہ آیا اور اپنے پاؤں مار کر ایک چشمہ نکالا اس میں نہانے کے واسطے کہا۔ حضرت ایوبؑ اس میں نہا کر اچھے ہوگئے اور پھر بیوی کی طرف متوجہ ہوئے تو چونکہ آپ نے قسم کھائی تھی اللہ تعالےٰ نے سمجھایا کہ بیوی تمہاری بے قصور ہے صرف ایک جھاڑو بجائے سَو بید کے اس کے بدن سے چھُو دو تاکہ قسم جھوٹی نہ ہووے۔

اب دیکھو کہ کتنا صابر ہونا ان کا ثابت ہوا۔ ان کا قصّہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں باوجودیکہ صدہا سال گذر گئے تھے نقل کیا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ.... (البقرۃ: ۱۵۶) کبھی ہم تم کو نہایت فقر و فاقہ سے آزمائیں گے اور کبھی تمہارے بچے مرجاویں گے۔ تو جو لوگ مومن ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کا ہی مال تھا ہم بھی تو اسی کے ہیں۔ پس خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ انہی لوگوں نے جو صبر کرتے ہیں میرے مطلب کو سمجھا ہے۔ ان پر میری رحمتیں ہیں جن کا کوئی حد و حساب نہیں۔ تو دیکھو کہ یہ باتیں ہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے۔ غریب آدمی کے ساتھ تکبّر کے ساتھ پیش نہیں آنا چاہیئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ صفحہ ۲۱۰ - ۲۱۱ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء) نیز

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۱۵-۱۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

مجلس قبل از عشاء

ارتداد عن الاسلام کا ذکر

عبد الغفور نامی ایک شخص کے آریہ مذہب اختیار کرنے پر فرمایا کہ:۔

اس طرح کے ارتداد سے اسلام کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ یکجائی نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ آیا اسلام ترقی کر رہا ہے یا تنزل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جو بعض لوگ مرتد ہو جاتے تھے تو کیا ان سے اسلام

کو نقصان پہنچا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ پہلو انجامکار اسلام کو ہی مفید پڑتا ہے اور اس طرح سے اہلِ اسلام کے ساتھ اختلاط کی ایک راہ کھلتی ہے اور جب خدا تعالیٰ نے ایک جماعت کی جماعت اسلام میں داخل کرانی ہوتی ہے تو ایسا ہوا کرتا ہے کہ اہل اسلام میں سے کچھ ادھر چلے جاویں۔ خدا تعالیٰ کے کام بڑے دقیق اور اسرار سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آیا کرتے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ صفحہ ۲۰۹ مورخہ ۲۴؍ جولائی ۱۹۰۳ء)

۱۴؍ جولائی ۱۹۰۳ء

بعد نمازِ عصر

حضرت اقدس کا عورتوں کو وعظ

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۳،۴)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا اس کو اللہ تعالیٰ ایسے طور سے رزق پہنچائے گا کہ جس طور سے معلوم بھی نہ ہوگا۔ رزق کا خاص طور سے اس واسطے ذکر کیا کہ بہت سے لوگ حرام مال جمع کرتے ہیں۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے حکموں پر عمل کریں اور تقویٰ سے کام لیویں تو خدا تعالیٰ خود اُن کو رزق پہنچا دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف: ۱۹۷) جس طرح پر ماں بچے کی متولی ہوتی ہے اسی طرح پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں صالحین کا متکفل ہوتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کے دشمنوں کو ذلیل کرتا ہے اور اس کے مال میں طرح طرح کی برکتیں ڈال دیتا ہے۔ انسان بعض گناہ عمداً بھی کرتا ہے اور بعض گناہ اس سے ویسے بھی سرزد ہوتے ہیں۔ جتنے انسان کے عضو ہیں ہر ایک عضو اپنے اپنے گناہ کرتا ہے۔ انسان کا اختیار نہیں کہ بچے۔ اللہ تعالیٰ اگر اپنے فضل سے بچاوے تو بچ سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے گناہ سے بچنے کے لیے یہ آیت ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحہ: ۵) جو لوگ اپنے رب کے آگے انکسار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ شاید کوئی عاجزی منظور ہو جاوے تو اُن کا اللہ تعالیٰ خود مددگار ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص عابد بہت دعا کرتا تھا کہ یا اللہ تعالیٰ مجھ کو گناہوں سے آزادی دے اس نے بہت دعا کرنے کے بعد سوچا کہ سب سے زیادہ عاجزی کیونکر ہو۔ معلوم ہوا کہ کُتّے سے زیادہ عاجز کوئی نہیں تو اس نے اس کی آواز سے رونا شروع کیا کسی اَور شخص نے سمجھا کہ مسجد میں کُتّا آ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی میرا برتن پلید کر دیوے تو اس نے آکر دیکھا تو عابد ہی تھا کُتّا کہیں نہ دیکھا۔ آخر اس نے پوچھا کہ یہاں کُتّا رو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ مَیں ہی کُتّا ہوں۔ پھر پوچھا کہ تم ایسے کیوں رو

رہے تھے ؟ کہا کہ خدا تعالیٰ کو عاجزی پسند ہے اس واسطے مَیں نے سوچا کہ اس طرح میری عاجزی منظور ہو جاوے گی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لڑکے کے واسطے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاوے۔ اسی طرح انسان کو چاہیئے کہ دعا کرے۔ بہت سے شخص ایسے ہوتے ہیں کہ کسی گناہ سے نہیں بچتے، لیکن اگر اُن کو کوئی شخص بے ایمان یا کچھ اَور کہہ دیوے۔ تو بڑے جوش میں آتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو کوئی گناہ نہیں کرتے۔ پھر ہم کو یہ کیوں کہتا ہے۔ اس طرح انسان کو معلوم نہیں کہ کیا کیا گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ پس اُس کو کیا خبر ہے کہ کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے عیبوں کو شمار کرے اور دُعا کرے پھر اللہ تعالیٰ بچاوے تو بچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دُعا کرو مَیں مانوں گا۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱)

دُعا اور صُحبتِ صالحین

دو چیزیں ہیں ایک تو دُعا کرنی چاہیئے۔ دوسرا طریق یہ ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ راستبازوں کی صحبت میں رہو تاکہ انکی صحبت میں رہ کر کے تم کو پتہ لگ جاوے کہ تمہارا خدا قادر ہے۔ بینا ہے۔ سُننے والا ہے۔ دُعائیں قبول کرتا ہے اور اپنی رحمت سے بندوں کو صدہا نعمتیں دیتا ہے۔ جو لوگ ہر روز نئے گناہ کرتے ہیں وہ گناہ کو حلوے کی طرح شیریں خیال کرتے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ یہ زہر ہے کیونکہ کوئی شخص سنکھیا جان کر نہیں کھا سکتا۔ کوئی شخص بجلی کے نیچے نہیں کھڑا ہوتا اور کوئی شخص سانپ کے سوراخ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اور کوئی شخص کھانا ٹھگی نہیں کھا سکتا۔ اگرچہ اس کو کوئی دو چار روپے بھی دے۔ پھر باوجود اس بات کے جو یہ گناہ کرتا ہے کیا اس کو خبر نہیں ہے۔ پھر کیوں کرتا ہے ؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا دل مضر یقین نہیں کرتا۔ اس واسطے ضرور ہے کہ آدمی پہلے یقین حاصل کرے جب تک یقین نہیں غور نہیں کریگا اور کچھ نہ پاوے گا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے پیغمبروں کا زمانہ بھی دیکھ کر اُن کو ایمان نہ آیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے غور نہیں کی۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۱۶) ہم عذاب نہیں کیا کرتے جب تک کوئی رسول نہ بھیج دلویں اور وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّھْلِکَ قَرْیَۃً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا فَفَسَقُوْا فِیْھَا فَحَقَّ عَلَیْھَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰھَا تَدْمِیْرًا (بنی اسرائیل: ۱۷) پہلے امراء کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے۔ وہ ایسے افعال کرتے ہیں کہ آخر اُن کی پاداش میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ ان باتوں کو یاد رکھو اور اولاد کی تربیت کرو۔ زنا نہ کرو۔ کسی شخص کا خون نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ساری عبادتیں ایسی رکھی ہیں جو بہت عمدہ زندگی تک پہنچاتی ہیں۔ عہد کرو اور عہد کو پورا کرو۔ اگر تکبر کرو گی تو تم کو خدا ذلیل کریگا۔ یہ ساری باتیں بُری ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۸ صفحہ ۲۱۷-۲۱۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء)

شام کے وقت بوجہ دوران سر حضرت اقدس (علیہ السلام) نے نمازِ مغرب کے نوافل بیٹھ کر ادا کئے۔ بعد ازاں آندھی اور بارش کے آثار نمودار ہوئے اور تجویز ہوئی کہ نماز عشاء جمع کر لی جاوے چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طبیعت ناساز تھی اس لیے تشریف لے گئے مگر تاہم باجماعت نماز کا اس قدر آپ کو خیال تھا کہ تاکید فرمائی کہ تکبیر زور سے کہی جاوے کہ میں اندر سن لوں اور باجماعت نماز ادا ہو جاوے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ صفحہ ۲۱۰ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء)

---

۱۴ جولائی ۱۹۰۳ء

خدا تعالیٰ سچا دوست ہے

فرمایا کہ:-

دعویٰ مومن اور مسلم ہونے کا آسان ہے مگر جو سچے طور پر خدا تعالیٰ کا ساتھ دیوے تو خدا تعالیٰ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ہر ایک دل کو اس قسم کی سچائی کی توفیق نہیں ملا کرتی یہ صرف کسی کسی کا دل ہوتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ دوست بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں بعض زن مزاج کہ وفا نہیں کرتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ حق دوستی کو وفاداری کے ساتھ پورا ادا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وفادار دوست ہے اسی لیے تو وہ فرماتا ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الطلاق: ۴) کہ جو خدا کی طرف پورے طور پر آگیا اور اعداء وغیرہ کسی کی پروا نہ کی فَهُوَ حَسْبُهٗ تو پھر خدا تعالیٰ اس کے ساتھ پوری وفا کرتا ہے۔

ایک پیشگوئی

عنقریب ایسا ہوگا کہ شریر لوگ جو رعب داب رکھتے ہیں وہ کم ہوتے جاویں گے۔

گذشتہ چند ایام میں سخت گرمی تھی اور آج بفضلِ خدا بارش ہو جانے کی وجہ سے ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش کے ہو جانے سے درخت دھوئے دھائے نظر آ رہے تھے۔ آسمان، بادل اور ہر ایک در و دیوار نے بارش کی وجہ سے ایک خاص رنگ و روپ حاصل کیا تھا۔ اس پر خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور مجسم شکر انسان نے فرمایا کہ:-

خدا کے تصرفات بھی کیسے ہیں۔ ابھی کل کیا تھا اور آج کیا ہے۔

ایک مومن اور دنیا دار کی موت میں فرق

جس کا دل مُردہ ہو وہ خوشی کا مدار صرف دنیا کو رکھتا ہے مگر مومن کو خدا تعالیٰ سے بڑھ کر اور کوئی شئے پیاری نہیں ہوتی۔ جس نے یہ نہیں پہچانا کہ ایمان کیا ہے اور خدا کیا ہے۔ وہ دنیا سے کبھی آگے نکلتے ہی نہیں ہیں

جب تک دنیا ان کے ساتھ ہے۔ تب تک تو سب سے خوشی سے بولتے ہیں۔ بیوی سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ مگر جس دن دنیا گئی تو سب سے ناراض بیٹھے۔ مُنہ سُوجا ہوا ہے۔ ہر ایک سے لڑائی ہے گلہ ہے۔ شکوہ ہے حتٰی کہ خدا تعالےٰ سے بھی ناراض ہیں تو پھر خدا تعالیٰ ان سے کیسے راضی رہے۔ وہ بھی پھر ناراض ہو جاتا ہے۔

مگر بڑی بشارت مومن کو ہے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (الفجر: ۲۸،۲۹) اے نفس جو کہ خدا تعالیٰ سے آرام یافتہ ہے تو اپنے رب کی طرف راضی خوشی واپس آ۔ اس خوشی میں ایک کافر ہرگز شریک نہیں ہے۔ راضیة کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی مرادات کوئی نہیں رکھتا کیونکہ اگر وہ دُنیا سے خلاف مرادات جاوے تو پھر راضی تو نہ گیا۔ اسی لیے اس کی تمام مُراد خدا ہی خدا ہوتا ہے۔ اس کے مصداق صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کہ آپ کو یہ بشارت ملی۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (النصر: ۲) اور اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ (المائدة: ۴) بلکہ مومن کی خلاف مرضی تو اس کی نزع (جان کنی) بھی نہیں ہوا کرتی۔ ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ دُعا کیا کرتا تھا کہ مَیں طوس میں مروں، لیکن ایک دفعہ وہ ایک اَور مقام پر تھا کہ سخت بیمار ہوا اور کوئی امید زیست کی نہ رہی تو اس نے وصیت کی کہ اگر مَیں یہاں مر جاؤں تو مجھے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرنا۔ اسی وقت سے وہ رُو بصحت ہونا شروع ہو گیا حتٰی کہ بالکل تندرست ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی وصیت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ مومن کی علامت ایک یہ بھی ہے کہ اس کی دُعا قبول ہو۔ اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن: ۶۱) خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ میری دُعا تھی کہ طوس میں مروں۔ جب دیکھا کہ موت تو یہاں آتی ہے تو اپنے مومن ہونے پر مجھے شک ہوا۔ اس لیے مَیں نے یہ وصیت کی کہ اہلِ اسلام کو دھوکا نہ دوں۔ غرضیکہ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً صرف مومنوں کے لیے ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے مالداروں کی موت سخت نامرادی سے ہوتی ہے دنیا دار کی موت کے وقت ایک خواہش پیدا ہوتی ہے اور اسی وقت اُسے نزع ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اُسے عذاب دیوے اور اس کی حسرت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں تاکہ انبیاء کی موت جو کہ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً کی مصداق ہوتی ہے۔ اس میں اور دنیا دار کی موت میں ایک بیّن فرق ہو۔ دنیا دار کتنی ہی کوشش کرے مگر اس کی موت کے وقت حسرت کے اسباب ضرور پیش ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً کی موت مقبولین کی دولت ہے۔ اس وقت ہر ایک قسم کی حسرت دُور ہو کر اُن کی جان نکلتی ہے۔ راضی کا لفظ بہت عمدہ ہے اور ایک مومن کی مرادیں اصل میں دین کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ خدا تعالےٰ کی کامیابی اور اس کے دین کی کامیابی اس کا اصل مدعا ہوا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت ہی اعلیٰ ہے کہ جن کو اس قسم کی موت نصیب ہوئی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۸ صفحہ ۲۱۸ مورخہ ۳۱ ؍ جولائی ۱۹۰۳ء)

۱۶؍جولائی ۱۹۰۳ء

بعد نمازِ عصر

نظر نظر کا فرق

سلطان محمود سے ایک بزرگ نے کہا کہ جو کوئی مجھ کو ایک دفعہ دیکھ لیوے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ محمود نے کہا کہ یہ کلام تمہارا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ہے۔ اُن کو کفار ابولہب، ابوجہل وغیرہ نے دیکھا تھا۔ اُن پر دوزخ کی آگ کیوں حرام نہ ہوئی۔ اس بزرگ نے کہا کہ اے بادشاہ کیا آپ کو علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَھُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ (الاعراف: ۱۹۹) اگر دیکھا اور جھوٹا کاذب سمجھا تو کہاں دیکھا؟

حضرت ابوبکرؓ نے، فاطمہؓ[1] نے، حضرت عمرؓ نے اور دیگر اصحابؓ نے آپ کو دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آپ کو قبول کر لیا۔ دیکھنے والا اگر محبت اور اعتقاد کی نظر سے دیکھتا ہے تو ضرور اثر ہو جاتا ہے اور جو عداوت اور دشمنی کی نظر سے دیکھتا ہے تو اسے ایمان حاصل نہیں ہوا کرتا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر کوئی میرے پیچھے نماز ایک مرتبہ پڑھ لیوے تو وہ بخشا جاتا ہے۔ اس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ کے مصداق ہو کر نماز کو آپ کے پیچھے ادا کرتے ہیں تو وہ بخشے جاتے ہیں۔

اصل میں لوگ نمازیں دُنیا کے رونے روتے رہتے ہیں اور جو اصل مقصود نماز کا قرب الی اللہ اور ایمان کا سلامت لے جانا ہے اس کی فکر ہی نہیں حالانکہ ایمان سلامت لے جانا بہت بڑا معاملہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب انسان اس واسطے روتا ہے کہ مجھ کو باایمان اللہ تعالیٰ دنیا سے لیجاوے تو خدا تعالیٰ اس کے اوپر دوزخ کی آگ حرام کرتا ہے اور بہشت اُن کو ملیگا جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں حصولِ ایمان کیلئے روتے ہیں۔ مگر یہ لوگ جب روتے ہیں تو دنیا کے لیے روتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ان کو بُھلا دیگا۔

اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ (البقرۃ: ۱۵۳) تم مجھ کو یاد رکھو میں تم کو یاد رکھونگا یعنی آرام اور خوشحالی کے وقت تم مجھ کو یاد رکھو اور میرا قرب حاصل کرو تا کہ مصیبت میں مَیں تم کو یاد رکھوں۔ یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ مصیبت کا شریک کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان اپنے ایمان کو صاف کر کے اور دروازہ بند کر کے رووے بشرطیکہ پہلے ایمان صاف ہو تو وہ ہرگز بے نصیب اور نامراد نہ ہوگا۔ حضرت داؤدؑ فرماتے ہیں کہ مَیں بڈھا ہو گیا مگر مَیں نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو شخص صالح ہو اور باایمان ہو پھر اس کو دشواری پیش ہو اور

---

[1] ممکن ہے خدیجہؓ فرمایا ہو۔ (مرتب)

اس کی اولاد بے رزق ہو۔

پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓی (الکہف:۶۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰؑ وعظ فرما رہے تھے کسی نے پوچھا کہ آپ سے کوئی اَور بھی علم میں زیادہ ہے تو انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اُن کی پسند نہ آئی (یعنی یُوں کہتے کہ خدا کے بندے بہت سے ہیں جو ایک سے ایک علم میں زیادہ ہیں) اور حکم ہوا کہ تم فلاں طرف چلے جاؤ جہاں تمہاری مچھلی زندہ ہو جاوے گی وہاں تم کو ایک علم والا شخص ملے گا۔ پس جب وہ ادھر گئے تو ایک جگہ مچھلی بھول گئے۔ جب دوبارہ تلاش کرنے آئے تو معلوم ہوا کہ مچھلی وہاں نہیں ہے۔ وہاں ٹھہر گئے تو ایک ہمارے بندہ سے ملاقات ہوئی۔ اس کو موسیٰؑ نے کہا کہ مجھے اجازت ہے کہ آپ کے ساتھ رہ کر علم اور معرفت سیکھوں؟ اس بزرگ نے کہا کہ اجازت دیتا ہوں مگر آپ بدگمانی سے بچ نہیں سکیں گے کیونکہ جس بات کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور سمجھ نہیں دی جاتی تو اس پر صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ جب دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص ایک موقعہ پر بے محل کام کرتا ہے تو اکثر بدظنی ہو جاتی ہے۔ پس موسیٰؑ نے کہا کہ مَیں کوئی بدظنی نہ کروں گا اور آپ کا ساتھ دُوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر تو میرے ساتھ چلیگا تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کرنا۔ پس جب چلے تو ایک کشتی پر جا کر سوار ہوئے (یہاں پر حضرت اقدس علیہ السلام نے حضرت موسیٰؑ کا وہ تمام قصّہ ذکر کیا جو کہ سورہ کہف میں مذکور ہے۔ پھر اس دیوار کے خزانہ کی نسبت فرمایا کہ) اُس کو اس واسطے درست کر دیا کہ وہ دو یتیم بچوں کے کام آوے۔ اس واسطے یہ کام کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بچوں نے کوئی نیک کام نہ کیا تھا مگر اُن کے باپ کے نیک بخت اور صالح ہونے کے باعث خدا تعالیٰ نے ان بچوں کی خبرگیری کی۔

دیکھو کہاں یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے واسطے اس کی اولاد کا اس قدر خیال رکھا اور کہاں یہ کہ انسان غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور تباہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ پرواہ نہیں کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ سے ہر حال میں تعلق رکھتے ہیں۔ تو خدا تعالیٰ ان کو ضائع ہونے سے بچا لیتا ہے۔

دیکھو ایک انسان کے دن برگشتہ ہیں۔ کام اس کے خراب ہیں مگر خدا تعالیٰ رحم نہیں کرتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ قابلِ رحم ہی نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو انسان پر بڑا رحم ہے۔ ہزاروں گناہ بخشتا ہے۔ جب انسان بہت تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور سب طرح سے اسی کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِعْمَلْ مَا شِئْتَ فَاِنِّیْ غَفَرْتُ لَکَ یعنی جو تیری مرضی ہو کئے جا مَیں نے تجھے سب کچھ بخش دیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کی طرف جھانک کر دیکھا اور فرمایا اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (حٰمٓ السجدۃ:۴۱) یعنی جو چاہو سو کئے جاؤ۔ پس یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تو بڑا مہربان اور رحیم ہے

اور بہت رحم سے معاملہ کرتا ہے۔

فرمایا کہ:

وہ خدا جو کہ عرصہ سے مخفی چلا آتا تھا اب نقاب اُٹھا کر چہرہ دکھا رہا ہے۔ کیا آج تک کسی نے ایسا بولتا خدا دیکھا تھا جیسے کہ اب رات دن بول رہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے گدی نشین جو کہ دینی ضرورتوں سے غافل ہیں۔ ان کے ذکر پر فرمایا کہ:۔

اگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم یونہی ایک فقیر کی طرح گدی پر بیٹھے رہتے۔ تو صریح کامیابی جو کہ آپ نے دنیا میں دیکھ لی۔ کیسے نظر آتی۔ طاعونؑ کا ظاہر ہونا بھی خدا تعالےٰ کی رحمت ہے۔

رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْن

مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے کہ جب آپ ہر ایک قسم کے خلق سے ہدایت کو پیش کرتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپؐ نے اخلاق۔ صبر۔ نرمی اور نیز مار، ہر ایک طرح سے اصلاح کے کام کو پورا کیا اور لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی۔ مال دینے میں نرمی برتنے میں عقلی دلائل اور معجزات کے پیش کرنے میں آپ نے کوئی فرق نہیں رکھا۔ اصلاح کا ایک طریق مار بھی ہوتا ہے کہ جیسے ماں ایک وقت بچّہ کو مار سے ڈراتی ہے وہ بھی آپ نے برت لیا تو مار بھی ایک خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جو آدمی اَور کسی طریق سے نہیں سمجھتے خدا تعالےٰ اُن کو اس طریق سے سمجھاتا ہے کہ وہ نجات پاویں۔

خدا تعالیٰ نے چار صفات جو مقرر کی ہیں جو کہ سورہ فاتحہ کے شروع میں ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں سے کام لے کر تبلیغ کی ہے۔ مثلاً پہلے ربّ العٰلمین یعنی عام رُبوبیت ہے تو آیت مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر ایک جلوہ رحمانیت کا بھی ہے کہ آپ کے فیضان کا بدل نہیں ہے۔ ایسی ہی دوسری صفات۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۸ و ۲۹ صفحہ ۲۱۸، ۲۲۵، ۲۲۶ مورخہ ۳۱ جولائی و ۷ اگست ۱۹۰۳ء)

ؑ یہاں سے لے کر اخیر تک جو مضمون البدر میں ۱۶ جولائی کی ڈائری میں درج ہے۔ یہی مضمون الفاظ کے ردّ و بدل کے ساتھ الحکم میں ۲۱ جولائی کی ڈائری میں درج ہے۔ غالباً دو ڈائری نویس صاحبان میں سے کسی ایک سے سہواً ایسا ہو گیا ہے یعنی یا تو ۱۶ جولائی کی ڈائری غلطی سے ۲۱ جولائی کی ڈائری میں درج کر دی گئی ہے اور یا ۲۱ جولائی کی ڈائری سہواً ۱۶ جولائی کی ڈائری میں درج ہو گئی ہے۔ واللہ اعلم (مرتب)

۲۱ر جولائی ۱۹۰۳ء

ایک استفسار اور اس کا جواب

ایک شخص نے سوال کیا کہ ریلی برادرس وغیرہ کارخانوں میں سرکاری سیر ۸۰ روپے کا دیتے ہیں اور لیتے ۸۱ روپے کا ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ فرمایا:

جن معاملات میں بیع و شریٰ میں مقدمات نہ ہوں۔ فساد نہ ہوں۔ تراضی فریقین ہو اور سرکار نے بھی جُرم نہ رکھا ہو۔ عُرف میں جائز ہو۔ وہ جائز ہے۔

ہدایت کے مختلف ذرائع

مامور جب دنیا میں اصلاح اور اشاعتِ ہدایت کے لیے آتے ہیں تو وہ ہر طرح سے سمجھاتے ہیں۔ آخری علاج اور راہ سختی بھی ہے۔ دُنیا میں بھی یہی طریق جاری ہے کہ ابتداءً و اولاً نرمی کے ساتھ سمجھایا جاتا ہے۔ پھر اس کی خوبیاں اور مفاد بتا کر شوق دلایا جاتا ہے۔ آخر جب کسی طرح نہیں مانتے تو سختی ہوتی ہے۔ جیسے ماں ایک وقت بچہ کو مار سے ڈراتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر طریق عقل تبلیغ اور ہدایت کی تجویز کر سکتی ہے۔ اختیار کئے۔ یعنی اول ہر قسم کی نرمی سے، رفق، صبر اور اخلاق سے، عقلی دلائل اور معجزات سے کام لیا اور آخرالامر جب ان لوگوں کی شرارتیں اور سختیاں حد سے گذر گئیں تو اللہ تعالیٰ نے پھر اسی رنگ میں ان پر حجّت پوری کی اور سختی سے کام لیا۔ یہی حال اب ہو رہا ہے۔ خدا تعالیٰ نے دلائل سے سمجھایا۔ نشانات دکھائے اور آخر اب طاعون کے ذریعہ متوجہ کر رہا ہے اور ایک جماعت کو اس طرف لا رہا ہے۔

فرمایا:-

سورۃ فاتحہ میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات اربعہ بیان ہوئی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چاروں صفات کے مظہر کامل تھے۔ مثلاً پہلی صفت ربّ العالمین ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بھی مظہر ہوئے۔ جبکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) جیسے ربّ العالمین عام ربوبیت کو چاہتا تھا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات اور آپ کی ہدایت و تبلیغ کُل دُنیا اور کُل عالموں کے لیے قرار پائی۔

پھر دوسری صفت رحمٰن کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت کے بھی کامل مظہر ٹھہرے کیونکہ آپ کے فیوض و برکات کا کوئی بدل اور اجر نہیں۔ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (الفرقان: ۵۸) پھر آپ رحیمیت کے مظہر ہیں۔ آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے جو محنتیں اسلام کے لیے کیں اور ان خدمات میں جو تکالیف

اُٹھائیں وہ ضائع نہیں ہوئیں بلکہ ان کا اجر دیا گیا اور خود رسول اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف میں رحیم کا لفظ بولا ہی گیا ہے۔

پھر آپ مالکیت یوم الدین کے مظہر بھی ہیں۔ اس کی کامل تجلّی فتح مکّہ کے دن ہوئی ایسا کامل ظہور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اربعہ کا جو اُمّ الصفات ہیں اَور کسی نبی میں نہیں ہوا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ صفحہ ۱۹-۲۰ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۳ء)

۲۳؍جولائی ۱۹۰۳ء

ایک رؤیا فرمایا کہ:۔

رات کو مَیں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں ایک انب ہے جسے مَیں نے تھوڑا سا چُوسا تو معلوم ہوا کہ وہ تین پھل ہیں۔ جب کسی نے پوچھا کہ کیا پھل ہیں تو کہا کہ ایک آم ہے ایک طوبا[1] اور ایک اَور پھل ہے۔

اسلام سے ارتداد کی وجہ اسلام سے ارتداد کی وجہ پر ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

جب ایک قوم کا غلبہ اور اقبال ہوتا ہے تو خود غرض آدمی اغراض کے واسطے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۶ مورخہ ۷؍اگست ۱۹۰۳ء)

۲۴؍جولائی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

قبروں پر چڑھاوے ایک بھائی نے عرض کی کہ حضور بکرا وغیرہ جانور جو غیر اللہ تھانوں اور قبروں پر چڑھائے جاتے ہیں۔ پھر وہ فروخت ہو کر ذبح ہوتے ہیں کیا ان کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا:۔

شریعت کی بناء نرمی پر ہے سختی پر نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۷۴) سے یہ مراد ہے کہ جو ان مندروں اور تھانوں پر ذبح کیا جاوے یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جاوے اس کا کھانا

---

[1] الحکم میں "طوبیٰ" لکھا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۰ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۳ء)

تو جائز نہیں ہے لیکن جو جانور بیع وشریٰ میں آجاتے ہیں اس کی حلّت ہی سمجھی جاتی ہے زیادہ تفتیش کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔[1] دیکھو حلوائی وغیرہ بعض اوقات ایسی حرکات کرتے ہیں کہ اُن کا ذکر بھی کراہت اور نفرت پیدا کرتا ہے لیکن اُن کی بنی ہوئی چیزیں آخر کھاتے ہی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شیرینیاں تیار کرتے ہیں اور میلی کچیلی دھوتی میں بھی ہاتھ مارتے جاتے ہیں۔ اور جب کھانڈ تیار کرتے ہیں تو اس کو پاؤں سے ملتے ہیں چوڑھے چمار گڑ وغیرہ بناتے ہیں اور بعض اوقات جُوٹھے رس وغیرہ ڈال دیتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ ان سب کو استعمال کیا جاتا ہے اس طرح پر اگر تشدد ہو تو سب حرام ہو جاویں اسلام نے مالا یطاق تکلیف نہیں رکھی ہے بلکہ شریعت کی بنا نرمی پر ہے۔

اس کے بعد سائل مذکور نے پھر اسی سوال کی اَور باریک جزئیات پر سوال شروع کئے فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ (المائدۃ: ۱۰۲) بھی فرمایا ہے۔ بہت کھودنا اچھا نہیں۔

متقیوں کو اللہ تعالیٰ ابتلاؤں سے بچاتا ہے

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ متقی کو ایسی مشکلات میں نہیں ڈالتا۔[2] اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ اور وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ (النور: ۲۷) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متقیوں کو اللہ تعالیٰ خود پاک چیزیں بہم پہنچاتا ہے اور خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لیے ہیں۔ اگر انسان تقویٰ اختیار کرے اور باطنی طہارت اور پاکیزگی حاصل کرے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں پاکیزگی ہے۔ تو وہ ایسے ابتلاؤں سے بچالیا جاویگا۔ ایک بزرگ کی کسی بادشاہ نے دعوت کی اور بکری کا گوشت بھی پکایا اَور خنزیر کا بھی۔ اور جب کھانا رکھا گیا تو عمداً سؤر کا گوشت اس بزرگ کے سامنے رکھ دیا اور بکری کا اپنے دوستوں کے آگے۔ جب کھانا رکھا گیا اور کہا کہ شروع کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بزرگ پر بذریعہ کشف اصل حال کھول دیا۔ انہوں نے کہا ٹھہرو تقسیم ٹھیک نہیں اور یہ کہہ کر اپنے آگے کی رکابیاں ان کے آگے اور ان کے آگے کی اپنے آگے رکھتے جاتے تھے۔ اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے کہ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ۔ الآیۃ۔

---

[1] البدر میں مزید لکھا ہے۔ "کیونکہ اب جگن ناتھ وغیرہ مقامات پر لاکھوں حیوان چڑھتے ہیں اور روزمرہ فروخت ہو کر ذبح ہوتے ہوں گے اگر اُن کا کھانا حرام ہو تو پھر تو تکلیف مالا یطاق ہے"۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۶ مورخہ ۷ ؍اگست ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔ اور متقی کو تو کسی قسم کی تکلیف پیش نہیں آتی اور اسے حلال روزی پہنچانے کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے اور اس نے یہ وعدہ بھی فرمایا ہے کہ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ (النور: ۲۷)

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۶ مورخہ ۷ ؍اگست ۱۹۰۳ء)

غرض جب انسان شرعی امور کو ادا کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور بُری اور مکروہ باتوں سے اس کو بچا لیتا ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (یوسف : ۵۴) کے یہی معنے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۰ مورخہ ۱۰؍ اگست ۱۹۰۳ء)

۲۵؍ جولائی ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ایک الہام

فرمایا :-

کل مجھے الہام ہوا تھا اَلْفِتْنَةُ وَالصَّدَقَاتُ

فرمایا کہ :-

اب الہام بھی اسے کیا کہیں۔ ایسی صاف اور واضح وحی ہوتی ہے کہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش بالکل نہیں رہتی۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسی وحی ہوتو ہو ورنہ ہر وحی میں پیشگوئی ضرور ہوتی ہے۔

تقویتِ ایمان کی ضرورت

تقویتِ ایمان کی بڑی ضرورت ہے۔ بغیر ایمان کے اعمال مثلِ مُردہ کے ہوتے ہیں۔ ایمان ہو تو انسان کو وہ معرفت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ آسمان کی طرف مصعود ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو نہ برکات حاصل ہوتے ہیں نہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کو دیکھنے کے بعد جب کوئی عمل کیا جاوے تو جو اس عمل کی شان ہوگی تو کیا ویسی کسی دوسرے کی ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ جس قدر امراض عمل کی کمزوری اور تقویٰ کی کمزوری کے دیکھے جاتے ہیں ان سب کی اصل جڑ معرفت کی کمزوری ہے[۱]۔ ایک کیڑے کی بھی معرفت ہوتی ہے تو انسان اس سے ڈرتا ہے۔ پھر اگر خدا کی معرفت ہو تو اس سے کیوں نہ ڈرے؟ غرضکہ معرفت کی بڑی ضرورت ہے۔

---

[۱] الحکم میں ہے :- "ایمان کے ساتھ عمل کی ضرورت ہے ورنہ ایمان بدون عمل مُردہ ہے اور جب تک عمل نہ ہو وہ ثمرات اور نتائج پیدا نہیں ہوتے جو اعمال کے ساتھ وابستہ ہیں مگر اعمال کی قوت اور توفیق معرفت اور یقین سے پیدا ہوتی ہے جس قدر یہ قوت بڑھتی ہے اسی قدر اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی ہے اور وہ برکات حاصل ہوتی ہیں جن سے انسان آسمان کی طرف اُٹھایا جاتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو یقین کے ثمرات پیدا نہیں ہوتے جس قدر انسان شک و شبہ میں اور غفلت میں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں دیکھتا ہوں کہ اگرچہ ہماری جماعت تو بڑھ رہی ہے لیکن ابھی پوست ہی بڑھتا ہے۔ اگر مغز بڑھے تو بات ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا ہی قوت قدسیہ ہے کہ آپ پر ایمان لا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یک دفعہ ہی دنیا کا فیصلہ کر دیا۔ جان سے بڑھ کر کیا شئے ہوتی ہے۔ اپنے خون سے دین پر مہریں لگا دیں اب لوگ بیعت کرتے ہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ ساتھ ہی مخفی اغراض دنیا کے بھی لاتے ہیں کہ فلاں کام دنیا کا ہو جاوے۔ یہ ہو جاوے۔ یہ سچ ہے کہ جو مومن ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ ہر ایک مشکل اس کی آسان کر دیتا ہے مگر سب سے اول معرفت ضروری ہے پھر خدا تعالیٰ خود اس کی ہر ایک ضرورت کا کفیل ہو گا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۶ مورخہ ۷ راگست ۱۹۰۳ء)

---

۲۶ رجولائی ۱۹۰۳ء

مسیح موعود کے زمانہ میں درازیٔ عمر کا راز

احادیث میں جو آیا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں عمریں لمبی ہو جائیں گی۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ موت کا دروازہ بالکل بند ہو جائے گا اور کوئی شخص نہیں مرے گا۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مالی، جانی نصرت میں اس کے مخلص احباب ہوں گے۔ اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہوں گے۔ اُن کی عمریں دراز کر دی جائیں گی۔ اس واسطے کہ وہ لوگ نفع رساں وجود ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (الرعد: ۱۸) یہ امر قانونِ قدرت کے موافق ہے کہ عمریں دراز کر دی جائیں گی۔ اس زمانہ کو جو دراز کیا ہے یہ بھی اس کی رحمت ہے اور اس میں کوئی خاص مصلحت ہے۔

(اس پر حضرت حکیم الامت نے عرض کیا کہ مسلمانوں میں سب سے پہلا مجدد عمر بن عبد العزیز کو تسلیم

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اسی قدر اس کا ایمان کمزور ہے اور اس ایمان کے موافق اس کے اعمال کمزور۔ جس قدر امراض عمل کی کمزوری اور تقویٰ کی کمزوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی اصل جڑ معرفت کی کمی اور کمزوری ہے۔ ورنہ معرفت تو ایک ایسی لذیذ شئے ہے کہ یہ جس قدر بڑھتی ہے اسی قدر عمل کی طاقت ملتی ہے۔ ایک کیڑے کی معرفت بھی ہو تو انسان اُس سے ڈرتا ہے۔ اسے علم ہو کہ چیونٹی کے کاٹنے سے درد ہوتا ہے تو اس سے بھی ڈرتا ہے اور اس کے ضرر سے بچتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی معرفت ہو تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اس سے نہ ڈرے۔ اصل یہی معرفت ہے جس کے بغیر کوئی خوشی اور برکت حاصل نہیں ہو سکتی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۰ مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۰۳ء)

کیا ہے وہ کل دو برس تک زندہ رہے ہیں)

ازاں بعد حضرت حجۃ اللہ نے پھر اپنے سلسلہ کلام میں فرمایا:۔

محض خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے آج تک ہم کو محفوظ رکھا ہے اور جماعت کو ترقی دے رہا ہے اور اس کے ازدیادِ ایمان اور معرفت کے لیے حجج و براہین ظاہر کر رہا ہے یہانتک کہ کوئی پہلو تاریکی میں نہیں رہنے دیا۔

سلسلۂ احمدیہ

ہمارے سلسلہ کے لیے منہاجِ نبوت ایک زبردست آئینہ ہے۔ جاہل اس پر اپنی کم سمجھی سے اعتراض کرے تو منہاج نبوت اس کے منہ پر طمانچہ مارتا ہے جو بات ہونہار ہوتی ہے اس کے نشانات اور آثار خود بخود نظر آنے لگتے ہیں جو کام اللہ تعالیٰ نے ہمارے سُپرد کیا ہے اس کی تکمیل کی ہوائیں چل رہی ہیں اور دو طرح سے وہ ہو رہا ہے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے رہا ہے کہ ہماری طرف سے دن رات کوشش جاری ہے اور اشاعت اور تبلیغ کی راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ تائیدات الٰہیہ شامل حال ہوتی جاتی ہیں۔ دوسری طرف[1] خود ہمارے مخالفوں کی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔ اور اُن میں ہی ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے مذہب کو چھوڑتے جاتے ہیں اور اس کی برائیاں بیان کر رہے ہیں۔ گویا وہ اپنے مذہب و ملت کی عمارت کو یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ (الحشر: ۳) کا مصداق ہو کر خود ہی مسمار کر رہے ہیں۔

فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ جب تک اپنا چہرہ نہ دکھلا لے۔ ہرگز نہیں چھوڑے گا کیونکہ یقین کی ترقی کا سچا ذریعہ یہی ہے۔

دوزخ کے سات دروازے

فرمایا:۔

چند روز سے جو مستورات میں وعظ کا سلسلہ جاری ہے ایک روز یہ ذکر آگیا کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں اور بہشت کے آٹھ۔ اس کا کیا سِرّ ہے تو یک دفعہ ہی میرے دل میں ڈالا گیا۔ کہ اصول جرائم بھی سات ہی ہیں اور نیکیوں کے اُصول بھی سات۔ بہشت کا جو آٹھواں دروازہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا دروازہ ہے۔

دوزخ کے سات دروازوں کے جو اُصول جرائم سات ہیں ان میں سے ایک بدظنّی ہے۔ بدظنّی کے

---

[1] البدر میں ہے: "دوسرے یہ کہ ان کی کوششوں کا وبال اُلٹ کر انہی پر پڑتا ہے اور وہ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ (الحشر: ۳) کا خود مصداق ہو رہے ہیں۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۷ مورخہ ۷ راگست ۱۹۰۳ء)

ذریعہ بھی انسان ہلاک ہوتا ہے اور تمام باطل پرست بدظنی سے گمراہ ہوئے ہیں۔

دوسرا اصول تکبر ہے۔ تکبر کرنے والا اہلِ حق سے الگ رہتا ہے اور اسے سعادتمندوں کی طرح اقرار کی توفیق نہیں ملتی۔

تیسرا اصول جہالت ہے یہ بھی ہلاک کرتی ہے۔

چوتھا اصول اتباع ہوئی ہے۔

پانچواں اصول کورانہ تقلید ہے۔

غرض اسی طرح پر جرائم کے سات اصول ہیں[1] اور یہ سب کے سب قرآن شریف سے مستنبط ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان دروازوں کا علم مجھے دیا ہے۔ جو گناہ کوئی بتائے وہ ان کے نیچے آجاتا ہے۔ کورانہ تقلید اور اتباع ہوئی کے ذیل میں بہت سے گناہ آتے ہیں۔

جنّت کی نعماء

اسی طرح ایک دن میں نے بیان کیا کہ دوزخیوں کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ اُن کو زقّوم کھانے کو ملے گا اور بہشتیوں کو اس کے بالمقابل دودھ اور شہد کی نہریں اور قسم قسم کے پھل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا کیا ستر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بالمقابل بیان ہوئی ہیں۔ بہشت کی نعمتوں کا ذکر ایک جگہ کر کے یہ بھی فرمایا ہے۔ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرة: ۲۶) تو اس میں رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کے آم۔ خربوزے اور دوسرے پھل اور دنیا کا دُودھ اور شہد اُن کو یاد آجائے گا نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ مومن جو اخلاص اور محبت کیساتھ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اس ذوق شوق سے جو لذت اُن کو محسوس ہوتی ہے تو بہشت کی نعمتوں اور لذتوں کے حاصل ہونے پر وہ لذت اُن کو یاد آجائے گی کہ اس قسم کی لذت بخش نعمتیں ہمارے رب سے پہلے بھی ملتی رہی ہیں۔ چونکہ بہشتی زندگی اسی عالم سے شروع ہوتی ہے اس لیے ان نعمتوں کا ملنا بھی یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ورنہ بہشت کی نعمتوں کے بارہ میں تو آیا ہے کہ نہ اُن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا۔ تو ان دُنیوی پھلوں سے اُن کا رشتہ کیا ہوا؟

ایمان اور اعمال کی مثال قرآن شریف میں درختوں سے دی گئی ہے۔ ایمان کو درخت بتایا ہے اور اعمال اس کی آبپاشی کے لیے بطور نہروں کے ہیں۔ جب تک اعمال سے ایمان کے پودہ کی آبپاشی نہ ہو اس وقت تک وہ شیریں پھل حاصل نہیں ہوتے۔ بہشتی زندگی والا انسان خدا تعالیٰ کی یاد سے ہر وقت لذت پاتا ہے اور

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ باقی دو اصول ڈائری نویس صاحب قلمبند نہیں کر سکے۔ (مرتب)

جو بدبخت دوزخی زندگی والا ہے تو وہ ہر وقت اس دنیا میں زقوم ہی کھا رہا ہے اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے[1]۔ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (طٰہٰ : ۱۲۵) بھی اسی کا نام ہے جو قیامت کے دن زقوم کی صورت پر متمثل ہو جائے گی۔ غرض دونو صورتوں میں باہم رشتے قائم ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۳ء)

---

۲۹ جولائی ۱۹۰۳ء

بوقت نماز ظہر

نجات

برادرم ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب پروفیسر میڈیکل کالج لاہور نے آج لاہور کو جانا تھا۔ انہوں نے لاہور کے آریہ سماج کے اس اشتہار کا ذکر کیا جو انہوں نے مسئلہ نجات پر مباحثہ کے لیے شائع کیا ہے۔ اس پر حضرت حجۃ اللہ نے مختصراً نجات کے متعلق یہ تقریر بیان فرمائی۔ اس کا ماحصل یہ ہے۔ (ایڈیٹر)

فرمایا :-

نجات کے متعلق جو عقیدہ قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نجات نہ تو صوم سے ہے نہ صلوٰۃ سے نہ زکوٰۃ سے اور صدقات سے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے جس کو دُعا حاصل کرتی ہے۔ اسی لیے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحۃ : ۶) کی دعا سب سے اوّل تعلیم فرمائی ہے کیونکہ جب یہ دُعا قبول ہو جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتی ہے جس سے اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے کیونکہ جب انسان کی دُعا جو سچے دل اور خلوص نیت سے ہو قبول ہوتی ہے تو پھر نیکی اور اس کے شرائط ساتھ خود ہی مرتب ہو جاتے ہیں۔

اگر نجات کو محض اعمال پر منحصر کیا جاوے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور دُعا کو محض بے حقیقت سمجھا جاوے جیسا کہ آریہ سماج کا عقیدہ ہے تو یہ ایک باریک شرک ہے۔ کیونکہ اس کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یہ ہوگا کہ انسان خود بخود نجات پا سکتا ہے اور اعمال اس کے سوا اپنے اختیار میں ہیں جن کو وہ خود بخود بجا لاتا ہے تو اس صورت میں نجات کی کلید انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوئی اور خدا تعالیٰ سے نجات کا کچھ تعلق اور واسطہ نہ ہوا گویا وہ خود کوئی چیز نہ ہوا۔ اور اس کا عدم وجود برابر ٹھہرا (معاذ اللہ) مگر نہیں۔ ہمارا یہ مذہب نہیں ہے۔ ہمارا یہی عقیدہ ہے کہ نجات اس کے فضل سے ملتی ہے اور اسی کا فضل ہے جو اعمال صالحہ کی توفیق دی جاتی ہے

---

[1] البدر میں ہے۔ "مختلف حیل سے کما کر تلخ زندگی بسر کرتا ہے۔ وہی کمائی اسے قیامت کے دن زقوم کی شکل میں متمثل ہو کر ملیگی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۷)

اور خدا تعالیٰ کا فضل دُعا سے حاصل ہوتا ہے لیکن وہ دُعا جو اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتی ہے وہ بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ انسان کا ذاتی اختیار نہیں کہ وہ دُعا کے تمام لوازمات اور شرائط محویت، توکل تبتّل۔ سوز و گداز وغیرہ کو خود بخود مہیا کر لے۔ جب اس قسم کی دُعا کی توفیق کسی کو ملتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی جاذب ہو کر ان تمام شرائط اور لوازم کو حاصل کرتی ہے جو اعمال صالحہ کی رُوح ہیں۔ ہمارا نجات کے متعلق یہی مذہب ہے۔

چونکہ نجات کوئی مصنوعی اور بناوٹی بات نہیں کہ صرف زبان سے کہہ دینا اس کے لیے کافی ہو کہ نجات ہو گئی اس لیے اسلام نے نجات کا یہ معیار رکھا ہے کہ اس کے آثار اور علامات اسی دنیا[1] میں شروع ہو جائیں اور بہشتی زندگی حاصل ہو لیکن یہ صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔ باقی دوسرے مذاہب نے جو کچھ نجات کے متعلق بیان کیا ہے وہ یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مبطل ہے بلکہ فطرتِ انسانی کے خلاف اور عقلی طور پر بھی ایک بیہودہ امر ثابت ہوتا ہے وہ نجات ایسی ہے کہ جس کا کوئی اثر اور نمود اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کی مثال اس پھوڑے کی سی ہے جو باہر سے چمکتا ہے اور اس کے اندر پیپ ہے۔ نجات یافتہ انسان کی حالت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس کی تبدیلی نمایاں طور پر نظر آوے اور دوسرے تسلیم کریں کہ واقعی اس نے نجات پالی ہے اور خدا نے اس کو قبول کر لیا ہے لیکن کیا کوئی عیسائی جو خون مسیح کو نجات کا اکیلا ذریعہ سمجھتا ہے کہہ سکتا ہے کہ اس نے نجات پالی ہے اور نجات کے آثار و علامات اس میں پائے جاتے ہیں۔ مسیح کے صلیب ملنے تک تو شاید ان کی حالت کسی قدر اچھی ہو مگر بعد میں تو ہر دوسرا دن پہلے سے بدتر ہوتا گیا۔ یہانتک کہ اب تو فسق و فجور کے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا کیا یہ نجات کے آثار ہیں؟

آریوں کو بھی فضل سے کوئی تعلق نہیں وہ تو دستِ خود و دہانِ خود کے مصداق ہیں۔ اور اُن کے پرمیشر نے ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔ کسی کو نجات کامل مِل ہی نہیں سکتی۔ اور وہ تمام نجاست کے کیڑے علاوہ ان کیڑوں مکوڑوں کے جو موجود ہیں سب انسان ہیں جن کو نجات حاصل نہیں ہوئی تو بتاؤ کہ وہ اُور کسی کو کیا نجات دیگا جب اس قدر کثیر اور بے شمار تعداد ابھی باقی ہے۔

آریوں کی دُعا بھی ترمیم کے قابل ہے کیونکہ ان کی مکتی سے مراد جاودانی مکتی نہیں ہوتی بلکہ ایک محدود وقت تک انسان جُونوں سے نجات پاتا ہے اور چونکہ روحیں محدود ہیں اور نئی روح پرمیشر پیدا نہیں کر سکتا مجبوراً اُن نجات یافتہ کو نکال دیتا ہے۔ پس جب ان کے پرمیشر نے جاودانی مکتی ہی نہیں دینی تو دعا بھی ترمیم کر کے

[1] البدر میں ہے:۔ نجات کا اثر یہ ہے کہ اسی دنیا میں اس شخص کو بہشتی زندگی نصیب ہو۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (بنی اسرائیل: ۷۳) (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ صفحہ ۲۲۷ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۳ء)

یوں مانگنی چاہیئے کہ اے پرمیشر تو جو دائمی مکتی دینے کے قابل نہیں ہے تو ایک خاص وقت تک مجھے نجات دے اور پھر دھکا دیکر اسی دارالمحن دنیا میں بھیجدے اور فطرت بھی بدل ڈال کہ اس میں جاودانی نجات کا تقاضا ہی نہ رہے۔

مجھے تعجب ہے کہ یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ انسانی فطرت کا تقاضا جاودانی نجات کا ہے نہ عارضی کا۔ اور عارضی نجات والا جس کو یقین ہو کہ پھر انہیں تلخیوں میں بھیجا جاویگا کب خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے پرمیشر پر انسان کیا بھروسہ اور اُمید رکھ سکتا ہے۔ بقول شخصے ؎

باخویشتن چہ کردی کہ باکنی نظیری ؎ حقا کہ واجب آید زتو احتراز کردن

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ صفحہ ۱۰-۱۱ مورخہ ۱۷راگست ۱۹۰۳ء)

۳۰ر جولائی ۱۹۰۳ء

صداقت کا ایک معیار

فرمایا:۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو کس کو معلوم تھا کہ آپ کے ہاتھ سے اسلام سمندر کی طرح دنیا میں پھیل جاوے گا اور جب آپ نے دعویٰ کیا تو وہی تین چار آدمی آپ کے ہمراہ تھے جو کہ مسلمان ہوئے تھے اور ابوجہل وغیرہ آپ کو کیسے ذلیل اور حقیر خیال کرتے تھے لیکن اب اگر وہ زندہ ہوں تو اُن کو پتہ لگے کہ جسے وہ حقیر اور ذلیل خیال کرتے تھے خدا نے اس کی کیا عزت کی ہے۔

اعداء کی ذلت اور اپنی کامیابی پر فرمایا کہ:۔

اس کے متعلق حال میں پیشگوئی جو ہوئی ہے اگرچہ وہ ایک رنگ میں پوری ہو گئی ہے تاہم اُسے پوری ہوئی کہنا ہماری غلطی ہے۔ خدا جانے خدا کا کیا منشا ہے۔ اصل حد ایسی پیشگوئیوں کی وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران: ۵۶) ہے جو کہ بہت اسباب کو چاہتا ہے۔

دنیا میں حق پسند بہت تھوڑے ہیں اور اقبال پسند بہت زیادہ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ بہت سے صاحب اقبال کو اپنے برگزیدوں کے ساتھ کر دیا کرتا ہے تاکہ عوام الناس اُن کے ذریعہ سے ہدایت پاویں۔ کیونکہ عوام الناس میں حق پسندی اور عمیق عقل کم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ بڑے بڑے آدمیوں کو دیکھ کر اُن کے ذریعہ داخل ہوتے اور ہدایت پاتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۳ مورخہ ۱۴راگست ۱۹۰۳ء)

نیز (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ صفحہ ۱ مورخہ ۲۴راگست ۱۹۰۳ء)

۳۱ ؍ جولائی ۱۹۰۳ء

اسماء الٰہیہ کی تجلیات

بعض زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے اسم ضال کی تجلی ہوتی ہے اور بعض زمانہ میں اسم ہادی کی تجلی۔ نیک اور خداترس لوگ جس اسم کی تجلی ہوتی ہے اس کے نیچے آتے ہیں اور اپنے رنگ میں اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی ابن الوقت ہوتا ہے۔ اسم ضال کی تجلی کا زمانہ گذر چکا اور اب اسم ہادی کی تجلی کا وقت آیا ہے۔ اسی واسطے خود بخود طبیعتوں میں اس کفر اور شرک سے ایک بیزاری پیدا ہو رہی ہے جو عیسائی مذہب نے پھیلایا تھا۔ ہر طرف سے خبریں آ رہی ہیں کہ دُنیا میں ایک شور مچ گیا ہے اور وہ وقت آ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید دنیا میں پھیلے اور وہ شناخت کیا جاوے۔ اس کی طرف اشارہ کر کے براہین احمدیہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کُنْتُ کَنْزًا مَّخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ۔ اور پھر ایک جگہ فرمایا ہے۔ اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ۔

جن لوگوں کو کچھ بھی تعلق نہیں ہے وہ بھی مانتے ہیں کہ یہ زمانہ انقلابات کا زمانہ ہے ہر قسم کے انقلابات ہو رہے ہیں اور یہ سب انقلاب ایک آنے والے زمانہ کی خبر دیتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کامل طور پر ظاہر ہو گا۔

اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس قوم میں فسق و فجور پیدا ہو جاتا ہے۔ فاسق چونکہ زنانہ مزاج ہوتے ہیں اور فسق کی بنیاد ریت پر ہوتی ہے اس لیے وہ جلد تباہ ہوتے ہیں۔ ذرا سا مقابلہ ہوا اور سختی پڑے تو برداشت کی طاقت نہیں رکھتے۔

براہین میں نزولِ مسیح کا عقیدہ درج کرنے کی حقیقت

ایک شخص نے سوال کیا کہ براہین احمدیہ میں مسیح کے دوبارہ آنے کا اقرار درج ہے خدا تعالیٰ نے پہلے ہی کیوں ظاہر نہ کر دیا؟ فرمایا:۔

جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتایا ہم نے ظاہر کر دیا اور یہی ہماری سچائی کی دلیل ہے اگر منصوبہ بازی ہوتی تو ایسا کیوں لکھتے؟ مگر ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس براہین میں میرا نام عیسیٰ بھی رکھا گیا ہے اس کی بنیاد براہین سے پڑی ہوئی ہے اور علاوہ بریں سنت اللہ اسی طرح پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال سے پہلے کیوں نبوت کا دعویٰ نہ کر دیا؟ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مامور ہونے سے پہلے یوسف نجار کے ساتھ بڑھئی کا کام ہی کرتے رہے۔ غرض جب تک حکم نہیں ہوتا اعلان نہیں کرتے۔ دیکھو جب تک شراب کی حرمت

---

[1] یہ سوال اور اس کا جواب "البدر" نے یکم اگست کی ڈائری میں درج کیا ہے۔ (مرتب)

کا حکم نہیں ہوا تھا اس کی حرمت بیان نہیں کی گئی[1]۔ اسی طرح ہوا کرتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ نے ہم پر کھول دیا ہم نے دعویٰ کر دیا۔ بغیر اس کی اطلاع اور اذن کے کس طرح ہو سکتا تھا؟

پس یاد رکھو کہ ہر ایک نبی کو جب تک وحی نہ ہو وہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر ایک چیز کی اصل حقیقت تو وحی الٰہی سے ہی کھلتی ہے۔ یہی وجہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ یعنی تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا چیز ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی وحی آپ پر ہوئی تو پھر وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (یونس: ۱۰۵) آپ کو کہنا پڑا۔ اسی طرح آپ کے زمانہ وحی سے پیشتر مکہ میں بُت پرستی اور شرک، فسق و فجور ہوتا تھا لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وحی الٰہی کے آنے سے پہلے بھی آپ نے بُتوں کے خلاف وعظ کیا اور تبلیغ کی تھی لیکن جب فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر: ۹۵) کا حکم ہوا تو پھر ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کی اور ہزاروں مشکلات اور مصائب کی بھی پروا نہیں کی۔ بات یہی ہے کہ جب کسی امر کے متعلق وحی الٰہی آجاتی ہے تو پھر مامور اس کے پہنچانے میں کسی کی پروا نہیں کرتے اور اس کا چھپانا اسی طرح شرک سمجھتے ہیں جس طرح وحی الٰہی سے اطلاع پانے کے بغیر کسی امر کی اشاعت شرک سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اس بات کو جس کی اطلاع وحی الٰہی کے ذریعہ سے نہیں ملی بیان کرتا ہے تو گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُسے وہ سُوجھتا ہے جو خدا تعالیٰ کو بھی نہیں سوجھا اور اس گستاخی سے وہ مشرک ہو جاتا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہ تمام باتیں جو قرآن شریف میں درج ہیں قرآن شریف کے نزول سے پہلے ہی بیان کر دیتے تو پھر قرآن شریف کی کیا ضرورت رہ جاتی۔ غرض جو کچھ ہم پر خدا تعالیٰ نے کھولا اور جب کھولا ہم نے بیان کر دیا[2]

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۲۴ ؍اگست ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں ہے:۔ "ابتدا میں بعض صحابہ کرامؓ نے شراب پی ہوئی ہوتی تھی اور نماز پڑھ لیتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو منع نہیں کیا جب تک کہ آیت کریمہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء: ۴۴) نہ نازل ہوئی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۴ مورخہ ۱۴ ؍اگست ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔
"غرضکہ رسول وہی کام کرتا ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر: ۹۵) جس کا حکم نہ دیا جائے اس کے برخلاف کچھ کہنا یا کرنا گستاخی ہے (پس یہی وجہ تھی کہ مسیح کے آسمان پر زندہ ہونے کا جو عقیدہ عام اہلِ اسلام میں رائج تھا اُسے کتاب میں لکھ دیا گیا اور جب وحی الٰہی نے اُسے غلط ثابت کیا وہ غلطی ظاہر کر دی گئی۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۴ مورخہ ۱۴ ؍اگست ۱۹۰۳ء)

یکم اگست ۱۹۰۳ء

گناہ پر مواخذہ کی وجہ

ایک دوست کے تحریری سوال پر کہ اللہ تعالیٰ شرک کو کیوں معاف نہیں کرتا اور گناہ پر مؤاخذہ کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا:۔

گناہوں کے مؤاخذہ کے متعلق یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا سنت اللہ میں یہ داخل ہے یا نہیں؟ وہ ہمیشہ سے مؤاخذہ کرتا آیا ہے[1]۔ گناہ خواہ از قسم صغائر ہوں یا کبائر اس کا مؤاخذہ ضرور ہوتا ہے۔ اور انسان خود اپنی فطرت میں غور کرے کہ کیا وہ اپنے ماتحتوں اور متعلقین سے کوئی مؤاخذہ کرتا ہے یا نہیں۔ جب اُن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور وہ کوئی خطا کرتے ہیں۔ یہ فطرتی نقش اس بات پر ایک حجت اور گواہ ہے اور یہ بات کہ شرک کو نہیں بخشتا۔ اگر ایک ایک گناہ پر یہ سوال ہو تو پھر بہت بڑی وسعت دیکر اس سوال کو یوں کہنا پڑیگا کہ وہ ہر قسم کے گناہ کیوں معاف نہیں کر دیتا۔ سزا دیتا ہی کیوں ہے؟ یہ غلطی ہے پہلی اُمتوں پر گناہوں کے باعث عذاب آئے اور اب بھی اللہ تعالیٰ اسی طرح گناہوں کا مؤاخذہ کرتا ہے۔

ہاں ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے کہ گناہ گاروں کو ایسی سزا ابدی ملے گی کہ اس سے پھر کبھی نجات ہی نہ ہو گی بلکہ ہمارا یہ مذہب ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم گنہگاروں کو بچالے گا اور اسی لیے قرآن شریف میں جہاں عذاب کا ذکر کیا ہے وہاں فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ھود: ۱۰۸) فرمایا ہے۔

گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک بندوں کے اور ایک خدا کے۔ جیسے چوری ہے یہ عبد کا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی چوری شرک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو چُرا کر دوسرے کو دیتا ہے چونکہ یہ ایک بڑی زبردست ہستی کی چوری ہے اس لیے اس کی سزا بھی بہت ہی بڑی ملتی ہے۔

جو لوگ اس قسم کے سوال کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قانون اور مرضی کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں کہ جس گناہ کو یہ چاہیں اسے بخش دے اور جس کو نہ چاہیں اسے نہ بخشے اس طرح پر کیسے ہو سکتا ہے؟ یہاں دنیا میں اس کا نمونہ نہیں تو آخرت میں کیسے؟ کوئی وائسرائے کو لکھ دے کہ فلاں مجرم کو سزا نہ دی جائے

---

[1] البدر میں ہے:۔ "فرمایا۔ اگر شرک کو اللہ تعالیٰ بخش دے تو پھر زانی اور ہر ایک فاسق فاجر کو بھی بخش دینا چاہیئے اور پھر اس میں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ آیا اللہ تعالیٰ گناہوں کا بدلہ دیتا ہے کہ نہیں اور گناہوں کے بارے میں پہلی اُمتوں سے اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا تو اس کے جواب میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُمتوں کو گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے عذاب دیئے گئے تو پھر شرک جیسے گناہ کی سزا کیوں نہ دی جائے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۳ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء)

اور تعزیرات ہند کو موقوف کر دیا جائے تو کیا ایسی درخواست منظور ہو سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ اس طرح پر تو اباحت کی بنیاد رکھی جاتی ہے کہ جو چاہو سو کرو۔[1]

ایمان بالرسل کی ضرورت

پھر اسی خط میں ایک دوسرا سوال یہ بھی تھا کہ کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی؟ اس پر فرمایا کہ:۔

رسُول وہ ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور احسانات ہوتے ہیں پس جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ بہت خطرناک جرم کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ وہ شریعت کے سارے سلسلہ کو باطل کرنا چاہتا ہے اور حلت و حرمت کی قید اُٹھا کر اباحت کا مسئلہ پھیلانا چاہتا ہے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیسے نجات کا مانع نہ ہو؟ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو لا انتہا برکات اور فیوض لے کر آیا ہے اس کا انکار ہو اور پھر نجات کی اُمید۔ اس کا انکار کرنا ساری بدکاریوں اور بدمعاشیوں کو جائز سمجھنا ہے کیونکہ وہ ان کو حرام ٹھہراتا ہے۔[2]

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴؍ اگست ۱۹۰۳ء)

۲؍ اگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

درازی عمر کا اصل گُر

ہمارے مکرم مخدوم ڈاکٹر سید عبدالستار شاہ صاحب نے اپنی رُخصت کے ختم ہونے پر عرض کی کہ مَیں صبح جاؤں گا۔ فرمایا کہ:۔

---

[1] البدر میں ہے:۔ "پھر جس حال میں یہاں قانون میں ان کی دخل اندازی نہیں ہو سکتی تو خدا تعالیٰ کے قانون میں وہ کیوں تغیر و تبدل چاہتے ہیں؟" (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۳ مورخہ ۱۴؍ اگست ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "رسول وہ ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات ہزارہا ہوتے ہیں تو جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ بڑا گناہ کرتا ہے اور اصل میں جو شخص کہ رسول کا انکار کرتا ہے دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتا ہے کہ ہر ایک حرام حلال ہے۔ شراب بھی جائز ہے زنا بھی جائز ہے جھوٹ بھی جائز ہے گویا سب صغائر و کبائر جائز ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے منع کرتے ہیں اور وہ جب اُن کا انکار کرتا ہے تو اُن کی تعلیم کا بھی انکار کرتا ہے۔ یہ کب ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک حُکم کو تسلیم کرے لیکن جو وہ حکم لایا اس سے انکار کرے تو پھر وہ حُکم کیسے حُکم رہ سکتا ہے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۳)

خط وکتابت کا سلسلہ قائم رکھنا چاہیئے ۔

ڈاکٹر صاحب نے عرض کی کہ حضور میرا ارادہ بھی ہے کہ اگر زندگی باقی رہی تو انشاء اللہ بقیہ حصہ ملازمت پورا کرنے کے بعد مستقل طور پر یہاں ہی رہوں گا ۔ فرمایا :۔

یہ سچی بات ہے کہ اگر انسان توبۃ النصوح کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے اور لوگوں کو نفع پہنچاوے تو عمر بڑھتی ہے ۔ اعلاء کلمۃ الاسلام کرتا رہے اور اس بات کی آرزو رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پھیلے ۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان مولوی ہو یا بہت بڑے علم کی ضرورت ہے بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے ۔ یہ ایک اصل ہے جو انسان کو نافع الناس بناتی ہے اور نافع الناس ہونا درازی عمر کا اصل گر ہے[1] ۔ فرمایا :۔

تیس سال کے قریب گذرے کہ میں ایک بار سخت بیمار ہوا[2] ۔ اور اس وقت مجھے الہام ہوا اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ سے خلق خدا کو کیا کیا فوائد پہنچنے والے ہیں لیکن اب ظاہر ہوا کہ ان فوائد اور منافع سے کیا مراد تھی ۔

غرض جو کوئی اپنی زندگی بڑھانا چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ نیک کاموں کی تبلیغ کرے اور مخلوق کو فائدہ پہنچاوے ۔

جب اللہ تعالیٰ کسی دل کو ایسا پاتا ہے کہ اس نے مخلوق کی نفع رسانی کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اسے توفیق دیتا اور اس کی عمر دراز کرتا ہے ۔ جس قدر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی مخلوق کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے اُسی قدر اس کی عمر دراز ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا اور اس کی زندگی کی قدر کرتا ہے ، لیکن جس قدر وہ خدا تعالیٰ سے لاپروا اور لاابالی ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کی پروا نہیں کرتا ۔

انسان اگر اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی زندگی وقف نہ کرے اور اس کی مخلوق کے لیے نفع رساں نہ ہو تو یہ ایک بیکار اور نکمّی ہستی ہو جاتی ہے بھیڑ ۔ بکری بھی پھر اس سے اچھی ہے جو انسان کے کام تو آتی ہے لیکن یہ جب

---

[1] البدر میں ہے :۔ " زندگی کے لمبا کرنے کا ایک ہی گر ہے اور وہ یہ ہے جیسے کہ قرآن شریف میں لکھا ہے وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ۔ جو شئے انسان کو زیادہ فائدہ رساں ہوتی ہے وہ زمین میں بہت دیر قائم رہتی ہے ۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۴ مورخہ ۱۴ ر اگست ۱۹۰۳ء)

[2] البدر میں ہے :۔ قریب ۲۰ سال کا عرصہ گذرا ہے کہ ایک دفعہ مجھے سخت بخار چڑھا یہاں تک کہ میں نے سمجھا کہ اب آخری دم ہے اور جب میرا خیال قریب قریب یقین کے ہو گیا تو تفہیم ہوئی اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (حوالہ مذکور)

اشرف المخلوقات ہوکر اپنی نوع انسان کے کام نہیں آتا تو پھر بدترین مخلوق ہوجاتا ہے اسی کی طرف اشارہ کرکے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (التّین : ۵، ۶) میں گرایا جاتا ہے[1] پس یہ سچی بات ہے کہ اگر انسان میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرے اور مخلوق کو نفع پہنچاوے تو وہ جانوروں سے بھی گیا گذرا ہے اور بدترین مخلوق ہے۔

کامیابی کی موت بھی درازیٔ عمر ہے

اس جگہ ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو نیک اور برگزیدہ ہوتے ہیں چھوٹی عمر میں بھی اس جہان سے رخصت ہوتے ہیں[2] اور اس صورت میں گویا یہ قاعدہ اور اصل ٹوٹ جاتا ہے مگر یہ ایک غلطی اور دھوکا ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ کبھی نہیں ٹوٹتا مگر ایک اور صورت پر درازیٔ عمر کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا اصل منشاء اور درازیٔ عمر کی غائت تو کامیابی اور بامراد ہونا ہے پس جب کوئی شخص اپنے مقاصد میں کامیاب اور بامراد ہوجاوے اور اس کو کوئی حسرت اور آرزو باقی نہ رہے اور مرتے وقت نہایت اطمینان کے ساتھ اس دُنیا سے رخصت ہو تو وہ گویا پوری عمر حاصل کرکے مرا ہے اور درازیٔ عمر کے مقصد کو اس نے پالیا ہے۔ اُس کو چھوٹی عمر میں مرنے والا کہنا سخت غلطی اور نادانی ہے۔

صحابہ میں بعض ایسے تھے جنہوں نے بیس بائیس برس کی عمر پائی مگر چونکہ ان کو مرتے وقت کوئی حسرت اور نامرادی باقی نہ رہی بلکہ کامیاب ہوکر اُٹھے تھے اس لیے انہوں نے زندگی کا اصل منشاء حاصل کرلیا تھا۔

---

[1] یہاں عبارت چھوٹ ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ البدر میں ہے :۔
"قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ۔ یہ بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مخلوق کو فائدہ رسانی کے بعد اور خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے سے انسان پر یہ کلمہ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ صادق آتا ہے اور اگر وہ یہ نہیں کرتا ہے تو اسفل سافلین ہی میں رد کیا جاتا ہے۔ اگر انسان میں یہ باتیں نہیں ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرے اور مخلوق کو فائدہ پہنچاوے تو پھر کُتّے، بھیڑ، بکری وغیرہ جانوروں میں اور اس میں کیا فرق ہے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۴ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء)

[2] البدر سے :۔ "اگر انسان خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں مرجائے تو جانے کہ اس نے بڑی عمر حاصل کرلی ہے کیونکہ بڑی عمر کا اصل مدعا جو یہ تھا کہ مخلوق کو فائدہ پہنچا کر اور خدا تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرکے اپنے مولا کو راضی کرے وہ اس نے حاصل کرلیا اور مرتے وقت اس کے دل میں کوئی حسرت نہیں رہی۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۴)

نیتِ حسنہ کی اہمیت

اگر انسان نیکی نہ کر سکے تو کم از کم نیکی کی نیت تو رکھے کیونکہ ثمرات عموماً نیتوں کے موافق ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیوی حکام بھی اپنے قوانین میں نیت پر بہت بڑا مدار رکھتے ہیں اور نیت کو دیکھتے ہیں۔اسی طرح پر دینی اُمور میں بھی نیت پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں پس اگر انسان نیکی کرنے کا مصمم ارادہ رکھے اور نیکی نہ کر سکے تب بھی اس کا اجر مل جاویگا اور جو شخص نیکی کی نیت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو توفیق بھی دے دیتا ہے اور توفیق کا ملنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے دیکھا گیا ہے اور تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ انسان سعی سے کچھ نہیں کر سکتا۔نہ وہ صلحاء، سعداء وشہداء میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ اَور برکات اور فیوض کو پا سکتا ہے۔غرض ؎

نہ بزور نہ بزاری نہ بزر مے آید

بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ گوہرِ مقصود ملتا ہے اور حصولِ فضل کا اقرب طریق دُعا ہے۔

دُعا کے لوازمات

اور دُعا کامل کے لوازمات یہ ہیں کہ اس میں رقت ہو۔اضطراب اور گدازش ہو۔جو دُعا عاجزی، اضطراب اور شکستہ دلی سے بھری ہوئی ہو وہ خدا تعالیٰ کے فضل کو کھینچ لاتی ہے اور قبول ہو کر اصل مقصد تک پہنچاتی ہے۔مگر مشکل یہ ہے کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور پھر اس کا علاج یہی ہے کہ دعا کرتا رہے،خواہ کیسی ہی بے دلی اور بے ذوقی ہو لیکن یہ سیر نہ ہو۔تکلّف اور تصنّع سے کرتا ہی رہے۔اصل اور حقیقی دُعا کے واسطے بھی دعا ہی کی ضرورت ہے۔

بہت سے لوگ دُعا کرتے ہیں اور ان کا دل سیر ہو جاتا ہے وہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ کچھ نہیں بنتا۔مگر ہماری نصیحت یہ ہے کہ اس خاک بیزی ہی میں برکت ہے کیونکہ آخر گوہرِ مقصود اسی سے نکل آتا ہے اور ایک دن آجاتا ہے کہ جب اس کا دل زبان کے ساتھ متفق ہو جاتا ہے[1] اور پھر خود ہی وہ عاجزی اور رقت جو دُعا کے لوازمات ہیں پیدا ہو جاتے ہیں۔جو رات کو اُٹھتا ہے خواہ کتنی ہی عدم حضوری اور بے صبری ہو لیکن اگر وہ اس حالت میں بھی دُعا کرتا ہے کہ الٰہی دل تیرے ہی قبضہ و تصرف میں ہے تو اس کو صاف کر دے اور عین

---

[1] البدر سے:۔"اور اگر دُعا کو دل نہ چاہے اور پورا خشوع خضوع دُعا میں حاصل نہ ہو تو اس کے حصول کے واسطے بھی دُعا کرے اور اس بات سے ابتلا میں نہ پڑے کہ میری دعا تو صرف زبان پر ہی ہوتی ہے دل سے نہیں نکلتی۔دُعا کے جو لفظ ہوتے ہیں ان کو زبان سے ہی کہتا رہے۔آخر استقلال اور صبر سے ایک دن دیکھ لیگا کہ زبان کے ساتھ اس کا دل بھی شامل ہو گیا ہے اور عاجزی وغیرہ لوازمات دُعا میں پیدا ہو جائیں گے"۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۴ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء)

قبض کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے بسط چاہے تو اس قبض سے بسط نکل آئے گی اور رقت پیدا ہو جائے گی یہی وہ وقت ہوتا ہے جو قبولیت کی گھڑی کہلاتا ہے۔ وہ دیکھے گا کہ اس وقت رُوح آستانۂ الوہیت پر پانی کی طرح بہتی ہے اور گویا ایک قطرہ ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف گرتا ہے۔

مسیح علیہ السلام کی مضطربانہ دُعا

مَیں نے خیال کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ اور وہ حالتِ دعا کا ایک صحیح نقشہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی بد قضاء وقدر مقدر تھی اور وہ قبل از وقت اُن کو دکھائی گئی تھی اور انہوں نے بھی یہی سمجھا تھا کہ اس سے رہائی محال ہے اور پہلے نبیوں نے بھی ایسا ہی سمجھا تھا اور آثار بھی ایسے ہی نظر آتے تھے۔ اس واسطے انہوں نے بڑی بیکلی اور اضطراب کے ساتھ دُعا کی۔ انجیل میں اس کا نقشہ خوب کھینچ کر دکھایا ہے۔ پس ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قضاء وقدر کو جو موت کے رنگ میں مقدر تھی غشی کے ساتھ بدل دیا اور اُن کی دُعا سُنی گئی چنانچہ انجیل کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے جہاں لکھا ہے فَسُمِعَ لِتَقْوٰہُ۔ کہ اس کی دُعا اس کے تقویٰ کے باعث سُنی گئی اور خدا نے تقدیر ٹال دی اور موت غشی سے بدل گئی۔

اصل بات یہ ہے کہ اگر عیسائیوں کے کہنے کے موافق مان لیا جاوے کہ مسیح صلیب پر مر گیا تو اس موت کو لعنتی ماننا پڑے گا جس کا کوئی جواب عیسائیوں کے پاس نہیں بلکہ عیسائیوں پر ایک اَور مصیبت بھی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ پھر ان کو ماننا پڑیگا کہ مسیح کی یہ دُعا بھی جو اُس نے باغ میں ساری رات رو رو کر کی تھی قبول نہیں ہوئی اور ان میں اور چوروں میں جو اُن کے ساتھ صلیب پر لٹکائے گئے تھے کیا فرق ہوا؟ اُنہوں نے بھی تو صلیب پر مرنے سے بچنے کے لیے دُعا کی تھی اور انہوں نے بھی کی۔ نہ اُن کی قبول ہوئی اور نہ اِن کی۔ مگر ہمارا یہ مذہب نہیں ہے۔ جیسے ہمارے نزدیک مسیح کی موت لعنتی موت نہ تھی جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے ویسے ہی یہ بھی ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے۔

ایک نکتہ

اصل بات یہ ہے کہ یہ ایک باریک سِر ہوتا ہے جس کو ہر ایک شخص نہیں سمجھ سکتا۔ انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے ابتلا اور قضاء وقدر آیا کرتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی آیا اور دوسرے نبیوں پر بھی کسی نہ کسی رنگ میں آتے ہیں اور یہ ایک تجلّی ہوتی ہے جس کو دوسرے لوگ موت سمجھتے ہیں مگر یہ موت دراصل ایک زندگی کا دروازہ ہوتی ہے۔

باب الموت

صوفی کہتے ہیں کہ ہر ایک شخص کو جو خدا تعالیٰ سے ملنا چاہے ضروری ہے کہ وہ باب الموت سے گذرے۔ مثنوی میں اس مقام کے بیان کرنے میں ایک قصّہ نقل کیا ہے۔

(یہاں حضرت نے وہ قصہ بیان کیا[1])

پس یہ سچی بات ہے کہ نفس امارہ کی تاروں میں جو یہ جکڑا ہوا ہے اس سے رہائی بغیر موت کے ممکن ہی نہیں۔

مقامِ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ

اسی موت کی طرف اشارہ کرکے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ (الحجر : ۱۰۰) اس جگہ یقین سے مراد موت بھی ہے۔ یعنی انسان کی اپنی ہوا و ہوس پر پوری فنا طاری ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت رہ جاوے اور وہ یہاں تک ترقی کرے کہ کوئی جنبش اور حرکت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نہ ہو[2]۔

سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ موت انسان پر وارد ہو جاتی ہے تو سب عبادتیں ساقط ہو جاتی ہیں[3]۔ اور پھر خود ہی سوال کرتے ہیں کہ کیا انسان اباحتی ہو جاتا ہے اور سب کچھ اس کے لیے جائز

۱؎ البدر میں یہ قصہ بھی لکھا ہے :۔

"کہ ایک شخص کے پاس ایک طوطا تھا جب وہ شخص سفر کو چلا تو اس نے طوطے سے پوچھا کہ تو بھی کچھ کہہ۔ طوطے نے کہا کہ اگر تو فلاں مقام پر گذرے تو ایک بڑا درخت ملے گا اس پر بہت سے طوطے ہونگے ان کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ کھلی ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کرتے ہو اور ایک میں بے نصیب ہوں کہ قید میں ہوں۔ وہ شخص جب اس درخت کے پاس پہنچا تو اس نے طوطوں کو وہ پیغام پہنچایا۔ ان میں سے ایک طوطا درخت سے گرا اور پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔ اس کو یہ واقعہ دیکھکر کمال افسوس ہوا کہ اس کے ذریعہ سے ایک جان ہلاک ہوئی۔ مگر سوائے صبر کے کیا چارہ تھا۔ جب سفر سے وہ واپس آیا تو اس نے اپنے طوطے کو سارا واقعہ سُنایا اور اظہارِ غم کیا۔ یہ سُنتے ہی وہ طوطا بھی جو پنجرہ میں تھا پھڑکا اور پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔ یہ واقعہ دیکھکر اس شخص کو اَور بھی افسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ سے دو خون ہوئے۔ آخر اس نے طوطے کو پنجرے سے نکال کر باہر پھینک دیا تو وہ طوطا جو پنجرہ سے مُردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا اُڑ کر دیوار پر جا بیٹھا اور کہنے لگا کہ دراصل نہ وہ طوطا مرا تھا اور نہ میں۔ میں نے تو اس سے راہ پوچھی تھی کہ اس قید سے آزادی کیسے حاصل ہو؟ سو اُس نے مجھے بتایا کہ آزادی تو مر کر حاصل ہوتی ہے پس میں نے بھی موت اختیار کی تو آزاد ہو گیا۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۵ مورخہ ۱۴؍اگست ۱۹۰۳ء)

۲؎ البدر میں ہے :۔ "غرضکہ انسان کے لیے بھی ایک پنجرہ ہے جسے نفسِ امّارہ کہتے ہیں اس پنجرہ سے بھی وہ نہیں نکل سکتا جب تک کہ موت کو قبول نہ کرے۔" (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۵ مورخہ ۱۴؍اگست ۱۹۰۳ء)

۳؎ البدر سے :۔ "اس پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کیا ایسی موت کے آنے کے بعد انسان عبادت نہ کرے اور بیشک بدوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہو جاتا ہے ؟

پھر آپ ہی جواب دیا ہے کہ یہ بات نہیں کہ وہ اباحتی ہو جاتا ہے بلکہ بات اصل یہ ہے کہ عبادت کے اثقال اُس سے دُور ہو جاتے ہیں اور پھر تکلّف اور تصنّع سے کوئی عبادت وہ نہیں کرتا بلکہ عبادت ایک شیریں اور لذیذ غذا کی طرح ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور مخالفت اس سے ہو سکتی ہی نہیں اور خدا تعالیٰ کا ذکر اس کے لیے لذت بخش اور آرام دِہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہا جاتا ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۱) اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ نواہی کی اجازت ہو جاتی ہے۔ نہیں بلکہ وہ خود ہی نہیں کر سکتا اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ کوئی خصّی ہو اور اس کو کہا جاوے کہ تو جو مرضی ہے کر۔ تو وہ کیا کر سکتا ہے؟ اس سے فسق و فجور مراد لینا کمال درجہ کی بے حیائی اور حماقت ہے۔ یہ تو اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جہاں کشفِ حقائق ہوتا ہے۔ صوفی کہتے ہیں اسی کے کمال پر الہام ہوتا ہے اس کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہو جاتی ہے اس وقت اُسے یہ حکم ملتا ہے۔

پس اثقالِ عبادت اس سے دُور ہو کر عبادت اس کے لیے غذا شیریں کا کام دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرۃ: ۲۶) فرمایا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

میں مبتلا رہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ موت کے بعد یعنی جبکہ انسان نفسِ امّارہ سے جنگ کر کے اس پر غالب آ جاتا ہے اور فتح پا لیتا ہے تو پھر عبادت اور نیک اعمال کا بجا لانا اس کے لیے ایک طبعی امر ہوتا ہے جیسے انسان بلا تکلف میٹھی میٹھی مزہ دار چیزیں کھاتا رہتا ہے اور اُسے لذت آتی رہتی ہے۔ ایسے ہی بلا تکلف نیک اعمال اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں اور اس کی تمام لذت اور خوشی خدا تعالیٰ کی عبادت میں ہوتی ہے اور جب تک وہ نفس سے جنگ کرتا رہتا ہے تبھی تک اُسے ثواب بھی ملتا ہے لیکن جب اس نے موت حاصل کر لی اور نفس پر فتح پالی تو پھر تو جنت میں داخل ہو گیا۔ اب ثواب کا ہے کا؟ یہی وہ جنت ہے جو انسان کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے اور قرآن شریف میں دو جنتوں کا بیان ہے جیسے کہ لکھا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن: ۴۷) یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنتیں ہیں ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دنیا والی جنت وہ ہے جو کہ اس درجہ کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کر انسان کی اپنی کوئی مشیت نہیں رہتی بلکہ خدا تعالیٰ کی مشیت اس کی اپنی مشیت ہوتی ہے اور جیسے ایک انسان کو خصّی کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تو زنا کاری وغیرہ حرکات کا مرتکب ہی نہیں ہو سکتا ویسے ہی یہ شخص خصّی کر دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی بدی نہیں ہو سکتی۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۵ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء)

گناہ سے نجات کیسے ہو؟

فرمایا:-

گناہ سے نجات محض خدا تعالیٰ کے فضل اور تصرف سے ملتی ہے جب وہ تصرف کرتا ہے اور دل میں وعظ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر ایک نئی قوت انسان کو ملتی ہے جو اس کے دل کو گناہ سے نفرت دلاتی ہے اور نیکیوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

ایمان کیلئے ابتلا ضروری شئے ہے

ایک شخص نے اپنی تکالیف اور ابتلاؤں کا ذکر کیا۔

فرمایا:۔

جب اللہ تعالیٰ کسی آسمانی سلسلہ کو قائم کرتا ہے تو ابتلا اس کی جزو ہوتے ہیں جو اس سلسلہ میں داخل ہوتا ہے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کوئی نہ کوئی ابتلا آوے تاکہ اللہ تعالیٰ سچے اور مستقل مزاجوں میں امتیاز کر دے اور صبر کرنے والوں کے مدارج میں ترقی ہو۔ ابتلا کا آنا بہت ضروری ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت: ۳) کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہنے پر ہی چھوڑ دیئے جاویں کہ ہم ایمان لائے اور ان پر کوئی ابتلا نہ آوے ایسا کبھی نہیں ہوتا خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے کہ وہ غداروں اور کچوں کو الگ کر دے۔ پس ایمان کے بعد ضروری ہے کہ انسان دکھ اٹھائے بغیر اس کے ایمان کا کچھ مزا ہی نہیں ملتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں اور انہوں نے کیا کیا دکھ اٹھائے۔ آخر ان کے صبر پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو بڑے بڑے مدارج اور مراتب عالیہ عطا کئے انسان جلد بازی کرتا ہے اور ابتلا آتا ہے تو اس کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دنیا ہی رہتی ہے[لہ] اور نہ دین ہی رہتا ہے مگر جو صبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ہوتا ہے اور ان پر انعام و اکرام کرتا ہے۔ اس لیے کسی ابتلا پر گھبرانا نہیں چاہیئے ابتلا مومن کو اللہ تعالیٰ کے اَور بھی قریب کر دیتا ہے اور اس کی وفاداری کو مستحکم بناتا ہے لیکن کچے اور غدار کو الگ کر دیتا ہے۔

ایک شخص نے ذکر کیا کہ میرا ایک ساتھی تھا مگر اُسے جماعت میں داخل ہونے کے بعد کچھ تکالیف پہنچیں تو وہ الگ ہو گیا فرمایا:۔

تم شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس ابتلا سے بچا لیا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ تلواروں سے ڈرایا جاتا تھا اور وہ لوگ اس کے مقابلہ پر کیا کرتے تھے۔ خدائے تعالیٰ سے دُعائیں مانگتے اور کہتے رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ

لہ البدر میں یہ عبارت یوں ہے:- "انسان چونکہ جلد باز ہوتا ہے اسلیئے خدا کے ابتلا سے وُہ گھبرا جاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ صبر کے کیا کیا ثمرات ہیں جو اُسے ملنے والے ہیں اس لیے صبر کرنا بہت ضروری ہے۔"

(البدر جلد نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۵ مورخہ ۱۴/ اگست ۱۹۰۳ء)

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرۃ: ۲۸۷) مگر آج کل تو خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ تلوار سے نہیں ڈرایا جاتا۔ اصل یہ ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں رہنے کے لائق نہیں پاتا اُن کو الگ کر دیتا ہے وہ ایمان کے بعد مرتد اس لیے ہوتے ہیں کہ قیامت کو جب وہ اپنے رفیق کو جنّت میں دیکھیں تو اُن کی حسرت اَور بھی بڑھے۔ اس وقت وہ کہینگے کاش ہم اپنے رفیق کے ساتھ ہوتے۔

اپنی ہی کمزوری ہے جو ذرا ذرا سی بات پر یہ لوگ گھبرا جاتے ہیں ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کو اپنا رازق سمجھ لیں اور اس پر ایمان رکھیں تو ایک جُرات اور دلیری پیدا ہو جاتی ہے پس ساری باتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ صبر اور استقلال سے کام لینا چاہیئے اور خدا تعالیٰ سے ثبات قدم کی دُعا مانگتے رہو۔

کسی کا مُرتد ہو جانا کچھ میرے سلسلہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ منہاج نبوت کے ساتھ یہ بات لازمی ہے۔ نبیوں کے سلسلے میں یہ نظیریں ملتی ہیں۔ ہم کو کوئی افسوس نہیں۔ البتہ ایسے لوگوں پر رحم آتا ہے کیونکہ اُن کو دوچند عذاب ہوگا اس لیے کہ وہ ایمان لاکر مُرتد ہوئے اور پھر بہشت کے پاس پہنچ کر واپس ہوئے یہ حسرت کا عذاب ہوگا۔

مشکلات سے مت ڈرو خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر دُکھ اور مصیبت اور بے عزّتی اُٹھانے کے لیے تیار رہو تا خدا تعالیٰ تمہارے مصائب کو دور کرے اور تمہاری آبرو کا خود محافظ ہو۔

مومن وہی ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کے ساتھ وفادار ہوتا ہے۔ جب ایمان لے آیا پھر کسی کی دھمکی کی کیا پروا ہے تم نے دین کو دُنیا پر مقدم کیا ہے اور یہ اقرار کر چکے ہو۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے لیے وطن، احباب اور ساری آسائشوں کو چھوڑتا ہے وہ اس کے لیے سب کچھ مہیا کرتا ہے۔ اب چاہیئے کہ صادقوں کی طرح ثابت قدم رہے کیونکہ خدا تعالیٰ صادق کا ساتھ دیتا ہے اور اس کو بڑے بڑے درجے عطا کرتا ہے خدائے تعالےٰ اس وقت صادقوں کی جماعت تیار کر رہا ہے۔ جو صادق نہیں وہ آج نہیں کل چلا جائے گا اور اس سلسلہ سے الگ ہو کر رہے گا مگر صادق کو خدا تعالیٰ ضائع نہیں کریگا[1]

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ صفحہ ۲ تا ۴ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء)

---

[1] البدر میں مزید یہ بھی لکھا ہے:۔

"مخالفوں کے پیچھے نماز نہ پڑھو کیونکہ وہ جان بوجھ کر دشمنی کرتے ہیں اور حق کے خلاف کرتے ہیں۔ جماعت کے امام کو تو مومن ہونا چاہیئے اور یہ اُلٹے مکفر ہیں۔ پس یہ کیسے مستحق ہیں کہ امام بنیں۔ اگر یہ جائز ہوتا کہ مسلمانوں کی نماز کا امام کافر و منافق ہو تو پھر صحابہ کرام نے کیوں مخالفوں کے پیچھے نماز نہ پڑھی؟ جس حال میں یہ لوگ ہمیں نہیں مانتے تو پھر ہمارے مکفر مکذب ہی ہیں۔ خواہ کہیں خواہ نہ کہیں۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ صفحہ ۲۳۵ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء)

۳؍اگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

دُعا کے اثر اور قبولیت کو توجہ کیساتھ تعلق ہے

امریکہ سے جناب مفتی محمد صادق صاحب کے ذریعہ ایک ڈاکٹر کی بیوی نے اپنے کسی عارضہ کے لیے دعا کی درخواست کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ:

اس کو جواب میں لکھا جاوے کہ اس میں شک نہیں کہ دُعاؤں کی قبولیت پر ہمارا ایمان ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے مگر دُعاؤں کے اثر اور قبولیت کو توجہ کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے اور پھر حقوق کے لحاظ سے دُعا کے لیے جوش پیدا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کا حق سب پر غالب ہے۔ اس وقت دنیا میں شرک پھیلا ہوا ہے اور ایک عاجز انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے۔ اس لیے فطرتی طور پر ہماری توجہ اس طرف غالب ہو رہی ہے کہ دنیا کو اس شرک سے نجات ملے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت قائم ہو اس کے سوا دوسری طرف ہم توجہ کر ہی نہیں سکتے۔ اور یہ بات ہمارے مقاصد اور کام سے دُور ہے کہ اس کو چھوڑ کر دوسری طرف توجہ کریں بلکہ اس میں ایک قسم کی معصیت کا خطرہ ہوتا ہے۔

ہاں یہ میرا ایمان ہے کہ بیماروں یا مصیبت زدوں کے لیے توجہ کی جاوے تو اس کا اثر ضرور ہوتا ہے بلکہ ایک وقت یہ امر بطور نشان کے بھی مخالفوں کے سامنے پیش کیا گیا اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا۔ اس وقت میری ساری توجہ اسی ایک امر کی طرف ہو رہی ہے کہ یہ مخلوق پرستی دُور ہو اور صلیب ٹوٹ جاوے۔ اس لیے ہر کام کی طرف اس وقت میں توجہ نہیں کر سکتا۔ خدا تعالیٰ نے مجھے اسی طرف متوجہ کر دیا ہے کہ یہ شرک جو پھیلا ہوا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا بنایا گیا ہے اس کو نیست و نابود کر دیا جاوے۔ یہ جوش سمندر کی طرح میرے دل میں ہے اسی لیے ڈوئی کو لکھا ہے کہ وہ مقابلہ کے لیے نکلے۔ پس تم صبر کرو جب تک کہ ایک دُعا کا فیصلہ ہو جاوے۔ اس کے بعد ایسے امور کی طرف بھی اللہ تعالیٰ چاہے تو توجہ ہو سکتی ہے لیکن دعا کرانے والے کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ سے صلح کرے۔ اپنے گناہوں سے توبہ کرے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تم اپنے آپ کو درست کرو اور یہ یقیناً سمجھ لو کہ انسان کا پرستار کبھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

مسیح کی زندگی کے حالات پڑھو تو صاف معلوم ہو گا کہ وہ خدا نہیں ہے۔ اس کو اپنی زندگی میں کسقدر کوفتیں اور کلفتیں اُٹھانی پڑیں اور دعا کی عدم قبولیت کا کیسا بُرا نمونہ اس کی زندگی میں دکھایا گیا ہے خصوصاً باغ والی دُعا جو ایسے اضطراب کی دُعا ہے وہ بھی قبول نہ ہوئی اور وہ پیالہ ٹل نہ سکا۔ پس ایسی حالت میں

مقدم یہ ہے کہ تم اپنی حالت کو درست کرو اور انسان کی پرستش چھوڑ کر حقیقی خدا کی پرستش کرو۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۷ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

بلا تاریخ

آسمانی نزول سے مراد

مسیح کے آسمانی نزول سے یہ مراد ہے کہ اس کے ساتھ آسمانی اسباب ہوں گے اور اس کا تعلق سماوی علوم سے ہوگا اور ایسا ہی فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھنے سے مراد ہے۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ کا لطیفہ تھا جس کو کم فہم لوگوں نے ایک چھوٹی اور موٹی سی بات بنا لیا ہے جو صحیح نہیں۔

فرمایا:۔

دشمن کی دشمنی بھی ایک وقعت رکھتی ہے۔ ہزاروں شہدے فقیر پھرتے ہیں مگر کوئی ان کو نہیں پوچھتا اور نہ ان کا مقابلہ کرتا ہے مگر ہمارے مقابلہ میں ہر قسم کے حیلے کئے جاتے ہیں اور ہر ایک پہلو سے کوشش کی جاتی ہے کہ ہم کو نقصان پہنچایا جاوے اور وہ اس مقابلہ کے لیے ہزاروں روپیہ بھی خرچ کر چکے ہیں۔ ان کی مخالفت بھی ان نشانات کا جو ظاہر ہو رہے ہیں ایک روک بن جاتی ہے۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۷ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۶؍ اگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

جنون کے اسباب

فرمایا کہ:۔

دو قوتیں انسان کو منجر بہ جنون کر دیتی ہیں۔ ایک بدظنی اور ایک غضب جبکہ افراط تک پہنچ جاویں۔ ایک شخص کا حال سنا کہ وہ نماز پڑھا کرتا تھا کہ اوّل ابتدا جنون کی اس طرح سے شروع ہوئی کہ اسے نماز کی نیت کرنے میں شبہ پیدا ہونے لگا اور جب پیچھے اس امام کے کہا کرے تو امام کی طرف انگلی اٹھا دیا کرے۔ پھر اس کی تسلی اس سے نہ ہوتی تو امام کے جسم کو ہاتھ لگا کر کہا کرے کہ "پیچھے اس امام کے" پھر اور ترقی ہوئی تو ایک دن امام کو دھکا دیکر کہا کہ "پیچھے اس امام کے"۔

پس لازم ہے کہ انسان بدظنی اور غضب سے بہت بچے سوائے راستبازوں کے باقی جسقدر لوگ دنیا میں

ہوتے ہیں ہر ایک کچھ نہ کچھ حصّہ جنون کا ضرور رکھتا ہے۔ جس قدر قویٰ اُن کے ہوتے ہیں ان میں ضرور افراط تفریط ہوتی ہے اور اس سے جنون ہوتا ہے۔

غضب اور جنون میں فرق یہ ہے کہ اگر سرسری دَورہ ہو تو اُسے غضب کہتے ہیں اور اگر وہ مستقل استحکام پکڑ جاوے تو اس کا نام جنون ہے۔

جنّت میں چاندی کا ذکر کیوں ہے

چاندی پر ذکر ہوا۔ فرمایا کہ:۔

چاندی کے بیچ میں ایک جوہر محبت ہے اس لیے یہ زیادہ مرغوب ہوتی ہے۔ اکثر لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جنت کی نعماء میں چاندی کے برتنوں کا ذکر ہے حالانکہ اس سے بیش قیمت سونا ہے۔ وہ لوگ اس راز کو جو کہ خدا تعالیٰ نے چاندی میں رکھا ہے نہیں سمجھے۔ جنّت میں چونکہ غِل اور کینہ اور بُغض وغیرہ نہیں ہوگا اور آپس میں محبت ہوگی اور چونکہ چاندی میں جوہرِ محبت ہے اس لیے اس نسبتِ باطنی سے جنّت میں اس کو پسند کیا گیا ہے۔ اس میں جوہرِ محبت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر طرفین میں لڑائی ہو تو چاندی دے دینے سے صلح ہو جاتی ہے اور کدورت دُور ہو جاتی ہے۔ کسی کی نظرِ عنایت حاصل کرنی ہو تو چاندی پیش کی جاتی ہے۔ علوم یا تو قیاس سے معلوم ہوتے ہیں اور یا تجربہ سے۔ چاندی کے اس اثر کا پتہ تجربہ سے لگتا ہے۔ خواب میں اگر ایک کسی مسلمان کو چاندی دے تو اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اُسے اسلام سے محبت ہے اور وہ مسلمان ہو جاوے گا۔

کثرتِ شراب خوری کا نتیجہ

اکثر دفعہ جب تک ایک شئے کی کثرت نہ ہو تو اس کے خواص کا پتہ نہیں لگتا۔ شراب کی کثرت جو اس وقت یورپ وغیرہ میں ہے اگر یہ نہ ہوتی تو اس کے بدنتائج کیسے ظاہر ہوتے جس سے اس وقت دنیا پناہ پکڑنا چاہتی ہے اور اس کی کثرت سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی خوبی کھلتی ہے جنہوں نے ایسی شئے کو منع اور حرام فرمایا۔

اگر مسیح کی مقصود بالذات زمین ہی تھی کہ آخر عمر میں اُنہوں نے زمین پر ہی آنا تھا تو پھر اتنا عرصہ آسمان پر رہنے سے کیا فائدہ؟ یہی وقت زمین پر بسر کرتے کہ لوگوں کو اُن کی ذات اور تعلیم سے فائدہ ہوتا اور قوم گمراہی سے بچی رہتی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۱ صفحہ ۲۴۱ مورخہ ۲۱ راگست ۱۹۰۳ء)

☆ ☆ ☆

۸؍اگست ۱۹۰۳ء

اعلائے کلمۃ الاسلام

اہل اسلام کی موجودہ حالت پر فرمایا کہ :۔

جب تک ان لوگوں میں اعلائے کلمۃ اللہ کا خیال تھا اور اس کو انہوں نے اپنا مقصود بنایا ہوا تھا جب تک ان کی نظریں خدا پر تھیں خدا تعالیٰ بھی اُن کی نصرت کرتا تھا۔ مگر بعد ازاں جب اغراض بدل گئے تو خدا نے بھی چھوڑ دیا۔ اور اب اُن کی نظر انسانوں پر ہے سلطنتوں کی بھی یہی حالت ہے کہ اعلائے کلمۃ الاسلام کا کسی کو خیال نہیں ہے۔ خود روم میں ردِّ نصاریٰ میں ایک چھوٹا سا رسالہ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ سلطان محافظ حرمین ہے بلکہ حرمین خود محافظ سلطان ہیں۔

فرمایا کہ :۔

انسان کے اندر جو نُور اور شعاع اعلائے کلمۃ الاسلام کا ہوتا ہے وہ انسان کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۱ صفحہ ۲۴۲ مورخہ ۲۱؍اگست ۱۹۰۳ء)

۹؍اگست ۱۹۰۳ء

دربار شام

حقوق العباد

بیمار پُرسی اور کسی میّت کی تجہیز و تکفین کی نسبت ذکر ہوا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ :۔

ہماری جماعت کو اس بات کا بہت خیال چاہیئے کہ اگر ایک شخص فوت ہو جاوے تو حتی الوسع سب جماعت کو اس کے جنازہ میں شامل ہونا چاہیئے۔ اور ہمسایہ کی ہمدردی کرنی چاہیئے۔ یہ تمام باتیں حقوق العباد میں داخل ہیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ جس تعلیم اور درجہ تک خدا تعالیٰ پہنچانا چاہتا ہے۔ اس میں ابھی بہت کمزوری ہے۔ صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم ایمان دار ہیں بلکہ اس ایمان کو طلب کرنا چاہیئے جسے خدا چاہتا ہے بھائیوں کے حقوق کو اور ہمسایوں کے حقوق کو شناخت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ زبان سے کہہ لینا کہ ہم جانتے ہیں بیشک آسان ہے مگر سچی ہمدردی اور اخوت کو برت کر دکھلانا مشکل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمام حرکات۔ اعمال افعال کے لیے ایمان مثل ایک انجن کے ہے۔ جب ایمان ہوتا ہے تو سب حقوق خود بخود نظر آتے جاتے ہیں اور بڑے بڑے اعمال اور ہمدردی خود ہی انسان کرنے لگتا ہے۔ ایمان کا تخم آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے، لیکن

یہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۱ صفحہ ۲۴۲ مورخہ ۲۱؍اگست ۱۹۰۳ء)

۱۰؍اگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

گنڈے اور تعویذ کی تاثیرات

شام کے وقت ایک صاحب نے گنڈے تعویذات کی تاثیرات کی نسبت استفسار کیا حضرت اقدس نے فرمایا کہ:-

ان کا اثر ہونا تو ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اس قسم کے علاج تصورات کی مد میں آجاتے ہیں کیونکہ تصورات کو انسان پر اثر اندازی میں بڑا اثر ہے۔ اس سے ایک کو ہنسا دیتے ہیں ایک کو رلا دیتے ہیں اور کئی چیزیں جو کہ واقعی طور پر موجود نہ ہوں دوسروں کو دکھلا دیتے ہیں اور بعض امراض کا علاج ہوتا ہے۔ اکثر اوقات تعویذوں سے فائدہ بھی نہیں ہوتا تو آخر تعویذ دینے والے کو کہنا پڑتا ہے کہ اب میری پیش نہیں چلتی۔

اُمّتِ مرحومہ

یہ امتِ مرحومہ اس واسطے بھی کہلاتی ہے کہ ان ٹھوکروں سے بچ جاوے جو اس سے پہلی اُمتوں کو پیش آئی ہیں[1]

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۱ صفحہ ۲۴۲ مورخہ ۲۱؍اگست ۱۹۰۳ء)

۱۱؍اگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

جان الیگزینڈر ڈوئی

مسٹر ڈوئی الیاس جس کو حضرت اقدس نے مقابلہ پر بلایا ہے اب کثرت سے اس کا چرچا امریکہ اور انگلستان کی اخباروں میں اس مقابلہ پر ہو رہا ہے اور ہندوستان سے باہر کل عیسائی دنیا نے اس مقابلہ کو مذاہب کی سچائی کا حقیقی معیار قرار دیا ہے حتیٰ کہ دہریہ منش انسان جو کہ ان ممالک میں رہتے ہیں۔ ان کے ایمان کے لیے بھی اس مقابلہ دعا نے ایک راہ کھول دی ہے اور جس عدل اور انصاف پر یہ مقابلہ حضرت اقدس نے مبنی رکھا ہے اس کی شہادت خود یورپ اور امریکہ نے ان الفاظ

---

[1] اس ڈائری کے آخر میں "باقی آئندہ" لکھا ہے لیکن آئندہ اشاعتوں میں کہیں اس کا تسلسل موجود نہیں (مرتب)

میں دی ہے کہ اس مقابلہ میں مرزا صاحب نے کوئی پہلو رعایت کا اپنے لیے نہیں رکھا کہ جس سے ڈوئی کو انکار کرنے کی گنجائش ہو۔ آج کل وہی اخبار یں پڑھی جاتی ہیں۔ ان اخباروں کو سُنکر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ:۔

یہ ہمارا مقابلہ صرف مسٹر ڈوئی ہی سے نہیں ہے بلکہ تمام عیسائیوں کے مقابلہ پر ہے اور یہ بھی ایک طریق ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کسرِ صلیب کریگا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنے والے مسیح کے خادم فرشتے ہوں گے۔ ان الفاظ سے اس کی کمزوری نکلتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس زمینی ہتھیار نہ ہوں گے بلکہ جو کام زمینی ہتھیاروں سے ہوتا ہے وہ دُعا کے ذریعہ سے آسمان کے فرشتے خود کرتے رہیں گے۔ مشکوٰۃ میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں عیسائیوں کے ساتھ کوئی شخص مقابلہ نہ کرسکے گا مگر ہاں مسیح موعود دُعاؤں سے مقابلہ کریگا سو اب وہ مقابلہ آپڑا ہوا ہے جس سے اسلام اور عیسائیت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ صفحہ ۲۴۹ مورخہ ۲۸ راگست ۱۹۰۳ء)

---

۱۴ راگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

قادیان میں ایک عیسائی کی آمد

ایک عیسائی گل محمد نامی جو کہ غالباً دو چار سال سے مذہب عیسوی میں داخل ہیں اور بنوں کے باشندے ہیں اور آج کل لاہور کے ڈیوینٹی کالج میں قیام پذیر ہیں مذہبی تحقیقات کی غرض سے ۱۴ راگست ۱۹۰۳ء کو قادیان آکر اُسی دن بعد از نماز مغرب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اقدس نے پہلے ان سے معمولی حالات سکونت وغیرہ کے متعلق دریافت کئے جس کے بعد عیسائی صاحب نے اپنے مقصد کا اظہار کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ کتنی مدت یہاں ٹھہریں گے؟ اس کا جواب گل محمد صاحب نے یہ دیا کہ مَیں تو کل ہی چلا جاؤں گا۔ جس پر حضرت اقدس اور سب سامعین کو نہایت حیرانی ہوئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بڑے زور کے ساتھ اصرار سے کہا کہ

آپ یہاں دو تین ہفتہ تک ٹھہریں۔ یہ مذہبی معاملہ ہے جس کا نتیجہ کفر یا ایمان ہے۔ اس میں ایسی جلد بازی مناسب نہیں اور نہیں تو آپ کم از کم ایک ہفتہ ہی ٹھہریں اور مذہبی امور دریافت کریں۔ ہم حتی الوسع آپ کو سمجھاتے رہیں گے۔

حضرت نے یہاں تک بھی فرمایا کہ :۔

ہم ہر طرح سے آپ کے مکان ۔ خوراک وغیرہ کا بندوبست کرتے ہیں بلکہ یہاں رہنے میں آپ کا کچھ مالی نقصان ہے تو وہ بھی دینے کو تیار ہیں اور اگر آپ کی کچھ ملازمت اور تنخواہ ہے تو اس عرصہ کے لیے وہ بھی دے دیں گے ۔

مگر گل محمد نے کوئی بات منظور نہ کی اور یہی کہا کہ کل میں ضرور چلا جاؤں گا ۔ اسی وقت آپ میرے ساتھ سوال و جواب کریں ۔ حضرت نے اس امر کو نامنظور کیا اور بہت سمجھایا کہ

یہ مذہبی معاملہ ہے ہم اس میں ایسی جلد بازی ہرگز نہیں کر سکتے اور نہ ہم اس امر کی پرواہ رکھتے ہیں کہ آپ باہر جاکر لوگوں کو کیا کچھ کہیں گے یا سُنائیں گے ۔ اگر آپ کو حق کی طلب ہے تو آپ چند روز ہمارے پاس ٹھہر جائیں

بلکہ یہ بھی فرمایا کہ :

اگر آپ کا ہرج ہے تو ہم دو چار روپیہ روز تک بھی دینے کو تیار ہیں ۔

مگر گل محمد صاحب نے کوئی بات نہ مانی اور کہا کہ اچھا میں پھر آؤں گا مگر صرف چار دن کے لیے ۔

حضرت نے فرمایا کہ :۔

کم از کم دس دن ضروری ہیں

مگر جب گل محمد صاحب نے کہا کہ میں چار دن سے زائد بالکل نہیں ٹھہر سکتا تو بالآخر حضرت نے چار دن ہی منظور فرما لیے اور گل محمد صاحب کی درخواست پر اسی وقت ایک عہدنامہ تحریر ہوا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

نقل عہدنامہ منجانب گُل محمد عیسائی

"گُل محمد صاحب کی تحریک کے مطابق جو اجازت ان کو یہاں قادیان آنے کے لیے شیخ عبدالرحمٰن صاحب نے تحریر کی تھی کہ وہ اپنے مشکلات مذہبی کے حل کرنے کے لیے قادیان حضرت اقدس کے پاس آسکتے ہیں ۔ اس کے مطابق وہ یہاں آ کر ۱۴ / اگست ۱۹۰۳ء کو بعد نماز مغرب حضرت صاحب کے پاس آئے مگر چونکہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے کل ہی واپس جانا ہے اور وہ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے اور حضرت صاحب بھی گورداسپور جانے کے سبب سے ان کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے ۔ اس لیے یہ قرار پایا کہ گُل محمد صاحب ابتدائی ہفتہ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں چار دن کے لیے یہاں آئیں اور اپنا ایک سوال تحریری پیش کریں جس کا جواب حضرت مرزا صاحب تحریری دیں گے اور اس جواب کے بعد اگر گُل محمد صاحب کی تشفی نہ ہو تو اسی سوال

کے متعلق کچھ اَور دریافت کر سکتے ہیں جس کا جواب حضرت صاحب دیں گے اور یہی سلسلہ چار دن تک رہے گا۔ اس سوال و جواب کے شرائط یہ ہیں کہ ہر روز پانچ گھنٹہ اس پر خرچ ہوں گے۔ یعنی ہر ایک فریق کے لیے اڑھائی گھنٹے اور جس فریق کو ایک دن میں اڑھائی گھنٹے سے کم وقت ملنے کا موقعہ ملے وہ اتنا ہی وقت دوسرے دن لے سکیگا لیکن چوتھے دن کی شام کو بہر حال یہ امر ختم ہوگا سوائے اس کے کہ ان چار دنوں کے اندر کوئی فریق کسی وجہ سے جو معمولی حوائج اور ضروریات کے علاوہ ہو پورا وقت نہ دے سکے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اس وقت کو چار دن کے بعد پورا کرے اور اگر چار دن کے اندر ہی مثلاً پہلے ہی دن حضرت صاحب فرماویں کہ جو ہم نے کہنا تھا کہہ چکے اور اب زیادہ اَور کچھ نہیں کہنا تو گُل محمد صاحب کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت چلے جاویں۔ گُل محمد صاحب کی طرف سے صرف ایک ہی سوال پیش ہوگا خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو اور فریقین کو اختیار نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کے وقت میں کسی کی بات کو قطع کریں۔

(دستخط حضرت میرزا غلام احمد صاحب) دوسرے کاغذ پر ہوئے (گُل محمد)

۱۵ر اگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

لعنتِ خدا سے مراد

فرمایا:۔ خدا کے نزدیک لعنت وہ نہیں ہوتی جو کہ عام لوگوں کے نزدیک ہوتی ہے بلکہ خدا کی لعنت سے مراد دنیا اور آخرت کی لعنت ہے (یعنی ہر) دو کی ذلّت ہے۔

قرآن کس طرح سے مصدقِ انجیل ہے؟

فرمایا کہ:۔ قرآن شریف انجیل کی تصدیق قول سے نہیں کرتا بلکہ فعل سے کرتا ہے کیونکہ جو حصہ انجیل کی تعلیم کا قرآن کے اندر شامل ہے اس پر قرآن نے عملدرآمد کروا کے دکھلا دیا ہے اور اسی لیے ہم اسی حصہ انجیل کی تصدیق کر سکتے ہیں جس کی قرآن کریم نے تصدیق کی ہے ہمیں کیا معلوم کہ باقی کا رطب ویابس کہاں سے آیا۔ ہاں اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پھر آیت وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ (المائدۃ: ۴۸) میں جو لفظ انجیل عام ہے اس سے کیا مراد ہے وہاں یہ بیان نہیں ہے کہ انجیل کا وہ حصہ جس کا مصدق قرآن ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں الْإِنْجِيل سے مراد اصل انجیل اور توریت ہے جو

قرآن کریم میں درج ہو چکیں۔ اگر یہ نہ مانا جاوے تو پھر بتلایا جاوے کہ اصل انجیل کونسی ہے۔ کیونکہ آجکل کی مروجہ اناجیل تو اصل ہو نہیں سکتیں۔ ان کی اصلیت کس کو معلوم ہے اور یہ بھی خود عیسائی مانتے ہیں کہ اس کا فلاں حصہ الحاقی ہے۔

پھر ایک اور بات دیکھنے والی ہے کہ انجیل میں سے عیسیٰؑ کی موت اور بعد کے حالات اور توریت میں موسیٰؑ کی موت کا حال درج ہے۔ تو کیا اب ان کتابوں کا نزول دونوں نبیوں کی وفات کے بعد تک ہوتا رہا؟ اس سے ثابت ہے کہ موجودہ کتب اصل کتب نہیں ہیں اور نہ اب ان کا میسر آنا ممکن ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ صفحہ ۲۵۰ مورخہ ۲۸ راگست ۱۹۰۳ء)

---

۱۶ راگست ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

سوال:۔ اگر ایسی خبر کوئی مشہور ہو کہ مرزا جی فوت ہو گئے ہیں تو کیا اس الہام کی بناء پر جو کہ حضور کو ۸۰ سال کے قریب عمر کے لیے ہوا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہیں یہ خبر بالکل جھوٹی ہے؟

جواب:۔ فرمایا کہ:۔

ہاں تم کہہ سکتے ہو کیونکہ یہ الہام تو کتابوں اور اشتہاروں میں درج ہو چکا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ صفحہ ۲۵۰ مورخہ ۲۸ راگست ۱۹۰۳ء)

---

۱۷ راگست ۱۹۰۳ء

سفر گورداسپور

سفر سے پہلے نمازوں کا جمع کرنا

آج ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے حضرت اقدس گورداسپور کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ صاحبزادہ میاں بشیر الدین محمود بھی تھے۔ سٹیشن[۱] کے قریب جو سرائے تھی۔ اس میں حضور علیہ السلام نے نزول فرمایا۔ مغرب وعشاء کی نمازیں یہاں جمع کر کے پڑھی گئیں۔

---

[۱] بٹالہ کا اسٹیشن مراد ہے۔ (مرتب)

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنفُسُكُمْ

حضور علیہ السلام نماز ادا فرما رہے تھے اور آپ کی طبیعت ناساز تھی کہ نماز کے اندر طبیعت میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ انگور ملیں تو وہ کھائے جائیں مگر چونکہ نزدیک و دُور اُن کا ملنا محال تھا اس لیے کیا ہو سکتا تھا کہ اس اثنا میں ایک صاحب جناب حکیم محمد حسین صاحب ساکن بلب گڈھ ضلع دہلی جو کہ حضرت اقدس کے مخلص خدام سے ہیں قادیان سے واپس ہو کر حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ایک ٹوکری انگوروں اور دوسرے ثمرات مثل انار وغیرہ کے حضرت کی خدمت میں پیش کی اور بیان کیا کہ مجھے علم نہ تھا کہ حضور بٹالہ تشریف لائے ہیں۔ میں قادیان چلا گیا۔ وہاں معلوم ہوا تو اسی وقت میں واپس ہوا اور یہ پھل حضور کے لیے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ صفحہ ۲۵۰ - ۲۵۱ مورخہ ۲۸ راگست ۱۹۰۳ء)

---

۱۸ راگست ۱۹۰۳ء

ایک رؤیاء

فجر کو اُٹھ کر حضرت اقدس نے نماز باجماعت ادا کی۔ چونکہ سفر کی تکان تھی... اس لیے آپ نے تھوڑی دیر آرام فرمایا اور پھر اُٹھ کر فرش پر جلوہ افروز ہوئے اور یہ رؤیا بیان کی۔

ایک خوان میرے آگے پیش ہوا ہے اس میں فالودہ معلوم ہوتا ہے اور کچھ فیرنی بھی رکابیوں میں ہے۔ میں نے کہا کہ چمچہ لاؤ تو کسی نے کہا کہ ہر ایک کھانا عمدہ نہیں ہوتا۔ سوائے فرنی اور فالودہ کے۔

اس کے بعد آپ نے خدا کا کلام جو کہ آپ پر (نازل) ہوا سنایا۔ (پھر) فرمایا کہ

خدا تعالیٰ کی طرف سے تسلی

ہر ایک بات میں خدا تعالیٰ کا سلسلۂ تسکین کا چلا آتا ہے جس سے ان لوگوں کا رد ہوتا ہے جو ان مقدموں پر اعتراض کرتے ہیں۔

(یعنی اگر یہ مقدمات خدا تعالیٰ کی رضا مندی کا موجب اور دین کی تائید کا باعث نہ ہوتے تو پھر خدا تعالیٰ ان کے متعلق بشارت کیوں دیتا)

فرمایا کہ:۔

بعض کوتاہ اندیش ہی اعتراض کرتے ہیں ورنہ ہم اگر مقدمہ باز ہوتے تو جس وقت ڈگلس صاحب نے کہا تھا

---

[۱] و [۲] یہ ڈائری نویس کے نوٹ معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم (مرتب)

کہ تم مقدمہ کرو تو ہم اس وقت کر دیتے۔ اور ایک تھیلا بھرا ہوا ہمارے پاس ہے جس میں گندی گالیاں دی گئی ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اُن پر مقدمہ کرتے لیکن ہم نے محض للّٰہ صبر کیا ہوا ہے۔ فرمایا:۔

وہ جو زمین آسمان کا مالک ہے جب وہ تسلّی دیوے تو انسان کسقدر تسلّی پاتا ہے۔

خدا کا کلام صیغہ واحد اور جمع میں

خدا تعالیٰ جب توحید کے رنگ میں بولے تو وہ بہت ہی پیار اور محبت کی بات ہوتی ہے اور واحد کا صیغہ محبت کے مقام پر بولا جاتا ہے۔ جمع کا صیغہ جلالی رنگ میں آتا ہے جہاں کسی کو سزا دینی ہوتی ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ صفحہ ۲۵۱ مورخہ ۲۸ راگست ۱۹۰۳ء)

بلا تاریخ[1]

کتاب کیساتھ استاد کی ضرورت

بعض احباب آمدہ از لاہور نے عبداللہ چکڑالوی صاحب کے خیالات اور اعتقادات کا ذکر کیا۔

اس پر حضور مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حَکَمْ اور عدل نے فرمایا کہ:۔

ہر ایک شئے کے لیے استاد کی ضرورت ہے ورنہ تم دیکھ لو جس قدر تصانیف ہر ایک فن اور علم کے متعلق موجود ہیں کیا مصنفین نے اپنی طرف سے کوئی بخل رکھا ہے۔ ہر ایک بات کی بڑی تفصیل کی ہے۔ اگر بخل کا ظن ہو سکتا ہے تو ایک پر ہو گا دو پر ہو گا نہ لاکھوں پر۔ مگر تاہم دیکھا گیا ہے کہ علم کا خاصہ ہی یہی ہے کہ بلا اُستاد کے نہیں آتا۔ اور نبی بھی ایک استاد ہوتا ہے جو کہ خدا کی کلام کو سمجھا کر اس پر عمل کرنے کا طریق بتلاتا ہے۔ دیکھو میں الہام بیان کرتا ہوں تو ساتھ ہی تفہیم بیان کر دیتا ہوں اور یہ عادت نہ انسانوں میں دیکھی جاتی ہے نہ خدا میں۔ کہ ایک علمی بات بیان کر کے پھر اسے عملدر آمد میں لانے کے واسطے نہ سمجھاوے۔ جو استاد کا محتاج نہیں ہے وہ ضرور ٹھوکر کھائے گا۔ جیسے طبیب بلا استاد کے طبابت کرے تو دھوکا کھاوے گا۔ ایسے ہی جو شخص بلا توسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اگر خود بخود قرآن سمجھتا ہے تو ضرور دھوکا کھاوے گا

مفتری کا انجام

فرمایا:۔

مفتری تھک جاتا ہے اور اس کا پول خود لوگوں پر ظاہر ہو جاتا ہے اور

---

[1] ان ملفوظات کے شروع میں ایڈیٹر صاحب "البدر" نے یہ نوٹ دیا ہے کہ "گذشتہ اشاعت سے آگے سلسلہ کیلئے دیکھو اخبار ۳۲ جلد ۲ صلہ" نمبر ۳۲ میں ۱۱ تا ۱۸ اگست کی ڈائریاں چھپی ہیں مگر ان میں سے کسی ڈائری کے آخر میں "باقی آئندہ" کے الفاظ درج نہیں جس سے پتہ چلے کہ یہ ملفوظات فلاں ڈائری کے تسلسل میں ہیں۔ (مرتّب)

یا اُسے ذلت دامنگیر ہوتی ہے۔ کیونکہ روز بروز کیسے افتراء کر سکتا ہے۔ افتراء جیسی کچی شئے کوئی نہیں ہوتی حتّٰی کہ شیشہ بھی اتنا کچا نہیں ہوتا جس قدر افتراء ہوتا ہے اور چونکہ مفتری کے بیان میں قوتِ جاذبہ نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کی بدبُو بہت جلد پھیل جاتی ہے۔

قتلِ انبیاء کا مسئلہ

ایک صاحب نے سوال کیا کہ توریت میں جھُوٹے نبی کی یہ علامت لکھی ہے کہ وہ قتل کیا جاوے اور ادھر ایسی عبارتیں بھی ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نبی قتل ہوئے تو پھر وہ علامت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ فرمایا:۔

راستباز کی یہی نشانی ہے کہ جس مطلب کے لیے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے جب تک وہ پورا نہ ہولے یا کم از کم اس کے پورا ہونے کی ایسی بنیاد نہ ڈال دے کہ اسے تنزّل نہ ہو تب تک وہ نہ مرے۔ مگر ایک کذّاب سے یہ بات کب ہو سکتی ہے۔ قتل سے مراد یہ ہے کہ اُس قتل میں ناکامی اور نامرادی ساتھ نہ ہو اور جب تک ایک انسان اپنا کام پورا کر چکے تو پھر خود مر جاوے یا کسی کے ہاتھ سے مارا جائے تو کیا موت تو بہرحال آنی ہی ہے کسی صورت میں آگئی اس میں کیا حرج ہے اور کامیابی کی موت پر کسی کو بھی تعجب نہیں ہوا کرتا اور نہ دشمن کو خوشی ہوتی ہے۔ قرآن شریف کے صریح الفاظ سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ نے قتلِ نبی حرام کیا ہو بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ (آل عمران : ۱۴۵) جس سے قتلِ انبیاء کا جواز معلوم ہوتا ہے اب جنگوں کے بیچ میں ہزاروں افسر مارے جاتے ہیں لیکن اگر اُن کی موت کامیابی اور فتح اور نصرت کی ہو تو اس پر کوئی رنج نہیں کرتا بلکہ خوشی کرتے ہیں اور جو خدا کے اہل ہوتے ہیں ان کا قتل تو اُن کے لیے زندگی ہے کہ اپنے قائمقام ہزاروں چھوڑ جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اس وقت ہوئی کہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم : ۴۲) کا مصداق تھا اور گئے اس وقت جبکہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (النصر : ۲) کی سَنَد آپ کو مل گئی۔ پس اگر آپ کو کامیابی نہ ہوتی لیکن آپ کسی کے ہاتھ سے قتل بھی نہ ہوئے تو اس سے کیا فائدہ تھا؟ اور یہ کونسا مقام فخر کا ہے۔ ہاں جب ایک شخص سلطنت قائم کرتا ہے اور اپنے قائمقام مظفر و منصور چھوڑتا ہے تو کیا پھر دشمن کی خوشی کا موجب ہو سکتا ہے؟ بڑی سے بڑی ذلت یہ ہے کہ ناکامی اور نامرادی کی موت آوے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کامیابی کی حالت میں قتل کئے جاتے تو اس سے آپ کی شان میں کیا حرف آ سکتا تھا؟ یہ بھی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دی گئی تھی آپ کی موت میں اس زہر کا بھی دخل تھا مگر ہم کہتے ہیں کہ جب آپ کی موت ایسی حالت میں ہوئی کہ کافر اس بات سے نا اُمید ہو گئے کہ ان کا دین پھر عود کریگا تو ایسی حالت میں اگر آپ زہر یا قتل سے مرتے تو کونسی قابلِ اعتراض بات تھی؟ دین تو تباہ نہیں ہو سکتا تھا غرضیکہ

توریت میں جس قتل کا ذکر ہے تو اس سے نامرادی اور ناکامی کی موت مراد ہے۔ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام قریبی رشتہ دار تھے۔ یحییٰؑ کے قتل ہو جانے سے دین پر کوئی تباہی نہ آسکتی تھی۔ اگر یحییٰ قتل ہوئے تو پھر عیسیٰؑ اُن کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یحییٰؑ کوئی صاحب شریعت نہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وعدہ توریت کا صاحبِ شریعت کے لیے ہو۔ انگریزوں اور سکھوں کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ سکھ لوگ ان میں اکثر انگریزوں کو قتل کرتے رہے لیکن اب جس حالت میں کہ انگریز فاتح اور بادشاہ ہیں تو کیا سکھ یہ فخر کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس قدر انگریزوں کو قتل کیا۔ یہ کوئی جگہ فخر کی نہیں ہے کیونکہ آخر میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ زندہ وہ ہوتا ہے جس کا سکہ چلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کروڑ ہا مسلمان موجود ہیں اور ابوجہل کے بعد اس کا تابع کوئی نہیں بلکہ اس کی اولاد ہونے کا کوئی نام نہیں لیتا۔ تو کیا اب ابوجہل کی طرف سے کوئی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو فلاں جگہ شکست دی تھی یا کوئی بیوقوف اگر یہ کہے کہ ہوا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مر گئے اور ابوجہل بھی تو یہ اس کی غلطی ہے۔ مقابلہ تو کامیابی سے ہوتا ہے۔ ابوجہل کا نام ندارد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تو تخت موجود ہے۔

انبیاء کو خدا ذلیل نہیں کیا کرتا۔ انبیاء کی قوتِ ایمانی یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینا وہ اپنی سعادت جانیں۔ اگر کوئی موسیٰ علیہ السلام کے قصّہ پر نظر ڈال کر اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ وہ ڈرتے تھے تو یہ بالکل فضول امر ہے اور اس ڈر سے یہ مراد ہرگز نہیں۔ کہ ان کو جان کی فکر تھی بلکہ ان کو یہ خیال تھا کہ منصبِ رسالت کی بجا آوری میں کہیں اس کا اثر بُرا نہ پڑے۔

میرے نزدیک مومن وہی ہے کہ اگر اس نے خدا تعالیٰ کی راہ میں جان نہ دی ہو تو وہ روحانی طور پر ضرور جان دے کر شہید ہو چکا ہو۔ پس اگر موسیٰؑ کو جان کا ہی خوف تھا۔ تو اس سے (اگر یہ افواہ سچ ہے کہ شہزادہ پیر مولوی عبد اللطیف خاں صاحب سنگسار کر کے مارے گئے ہیں) عبد اللطیف صاحب ہی اچھے رہے جنہوں نے ایمان نہ دیا اور جان دیدی پس ہمارا تو یہی خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ مَیں نامُراد مارا جاؤں اور فرضِ رسالت ادا نہ ہو۔

اگر کسی بات میں شرّ ہو تو یہ عادت اللہ نہیں کہ وہ مجھے اطلاع نہ دے۔

مہمان نوازی

آپ نے منتظمان باورچی خانہ کو تاکید کی کہ آج کل موسم بھی خراب ہے اور جس قدر لوگ آئے ہوئے ہیں یہ سب مہمان ہیں اور مہمان کا اکرام کرنا چاہیئے۔ اس لیے کھانے وغیرہ کا انتظام عمدہ ہو۔ اگر کوئی دُودھ مانگے دُودھ دو۔ چائے

مانگے چائے دو۔ کوئی بیمار ہو تو اس کے موافق الگ کھانا اسے پکا دو۔

اس کے[1] بعد عدالت کا وقت قریب آگیا اور حضرت اقدس اور دیگر احباب کھانا وغیرہ تناول فرماکر عدالت کو روانہ ہوئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ صفحہ ۲۵۷ - ۲۵۸ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء)

---

۲۰ اگست ۱۹۰۳ء

بوقتِ شام

مامور کی دشمنی

فرمایا کہ:-

دشمنی دشمنوں کی یہ بھی ایک قبولیت ہوتی ہے اور منجانب اللہ نصیب ہوتی ہے۔

رسول کا عالم الغیب ہونا

اکثر لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ رسول عالم الغیب ہوتے ہیں چنانچہ بعض تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی نسبت یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کا دعویٰ عالم الغیب ہونے کا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:-

یہ ان لوگوں کی غلطی ہے۔ عالم الغیب ہونا اور شئے ہے اور موید من اللہ ہونا اَور شئے ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ صفحہ ۲۵۸ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء)

---

۲۱ اگست ۱۹۰۳ء

وحی منقطع ہوگئی ہے یا برابر جاری ہے

ایک صاحب نے سوال کیا کہ انقطاعِ وحی کی نسبت جو حکم آچکا ہے تو پھر اب وحی کیوں ہوئی اور آجتک سوائے جناب کے اَور کسی نے کیوں صاحب وحی ہونے کا دعویٰ نہ کیا؟

حضرت اقدس:- اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آجتک کسی نے دعویٰ نہ کیا؟

سائل:- جہانتک میری معلومات ہیں وہاں تک میں نے نہیں دیکھا۔

حضرت اقدس:- آپ کی معلومات تو چند ایک کتابیں حدیث کی یا اَور دوسری ہونگی اس سے کیا پتہ لگتا ہے اگر

---

[1] یہ ملفوظات ۱۸، یا ۱۹ اگست ۱۹۰۳ء کے ہیں۔ ان دنوں حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام مقدمہ کے سلسلہ میں گورداسپور تشریف فرما تھے اور انہی ایام کی یہ ڈائری ہے۔ جیسا کہ اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ (مرتب)

اس میں الف لام کی رعایت نہ کی جاوے تو پھر اس سے بہت سے فساد لازم آویں گے اور انسان ضلالت میں جا پڑے گا۔ یہ امر ضروری ہے کہ وحی شریعت اور وحی غیر شریعت میں فرق کیا جاوے بلکہ اس امتیاز میں تو جانوروں کو جو وحی ہوتی ہے اسکو بھی مدِ نظر رکھا جاوے۔ بھلا آپ تبلا دیں کہ قرآن شریف میں جو یہ لکھا ہے۔ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (النحل : ٦٩) تو اب آپ کے نزدیک شہد کی مکھی کی وحی ختم ہو چکی ہے یا جاری ہے ؟

سائل :۔ جاری ہے۔

حضرت اقدس :۔ جب مکھی کی وحی اب تک منقطع نہیں ہوئی تو انسانوں پر جو وحی ہوتی ہے وہ کیسے منقطع ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ فرق ہے کہ ال کی خصوصیت سے اس وحی شریعت کو الگ کیا جاوے ورنہ یوں تو ہمیشہ ایسے لوگ اسلام میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے جن پر وحی کا نزول ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس وحی کے قائل ہیں اور اگر اس سے یہ مانا جاوے کہ ہر ایک قسم کی وحی منقطع ہو گئی ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ امور مشہودہ اور محسوسہ سے انکار کیا جاوے۔ اب جیسے کہ ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ خدا کی وحی نازل ہوتی ہے۔ پس اگر ایسے شہود اور احساس کے بعد کوئی حدیث اس کے مخالف ہو تو کہا جاویگا کہ اس میں غلو ہے۔ خود غزنوی والوں نے ایک کتاب حال میں لکھی ہے۔ جس میں عبداللہ غزنوی کے الہامات درج کئے ہیں۔

پھر جس حال میں یہ سلسلہ موسوی سلسلہ کے قدم بقدم ہے اور موسوی سلسلہ میں برابر جاری رہی تھی حتیٰ کہ عورتوں کو وحی ہوتی رہی تو کیا وجہ ہے کہ محمدی سلسلہ میں وہ بند ہو۔ کیا اس امت کے اخیار اُن عورتوں سے بھی گئے گذرے ہوئے ؟

علاوہ اس کے اگر وحی نہ ہو تو پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (الفاتحۃ : ٦-٧) کے کیا معنے ہوں گے۔ کیا یہاں انعام سے مراد گوشت پلاؤ وغیرہ ہے یا خلعتِ نبوت اور مکالمۂ الٰہی وغیرہ جو کہ انبیاء کو عطا ہوتا رہا۔ غرضکہ معرفت تمام انبیاء کو سوائے وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی جس غرض کے لیے انسان اسلام قبول کرتا ہے۔ اس کا مغز یہی ہے کہ اسکے اتباع سے وحی ملے۔

اور پھر اگر وحی منقطع ہوئی مانی بھی جاوے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی منقطع ہوئی نہ اس کے اظلال اور آثار بھی منقطع ہوئے۔

مسئلہ بروز

سائل :۔ بروز کسے کہتے ہیں ؟

حضرت اقدس :۔ جیسے شیشہ میں انسان کی شکل نظر آتی ہے حالانکہ وہ شکل بذاتِ خود

الگ قائم ہوتی ہے اس کا نام بروز ہے۔ اس کا سِرّ سورۃ فاتحہ میں ہی ہے جیسے کہ لکھا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝
(الفاتحہ: ۶-۷) تمام مفسّروں نے مغضوب سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ لیے ہیں اور پھر یہ آیت ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: ۱۵) اور آیت وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (الاعراف: ۱۳۰)
یہ آیتیں بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک ان میں سے اہلِ اسلام کی نسبت ہے اور ایک یہود کی نسبت۔ پس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر طرح کا انعام کروں گا اور پھر دیکھونگا کہ کس طرح شکر کرتے ہو۔

اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اہلِ یہود کو کونسی بڑی مصیبت تھی تو وہ دو بڑی مصیبتیں ہیں۔ ایک یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا گیا اور ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا گیا۔ پس مماثلت کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے بھی وہی دو انکار رکھے تھے۔ مگر وہاں شمار میں الگ الگ دو وجود تھے اور یہاں نام الگ الگ ہیں مگر وہ وجود جس میں ان دونوں کا بروز ہو ایک ہی ہے۔ ایک بروز عیسوی اور ایک محمدی۔ اور صرف نام کے لحاظ سے اہلِ اسلام یہود کے بروز اس طرح سے قرار پائے کہ انہوں نے مسیح اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا اور وہ مماثلت پوری ہوگئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اُمت میں بروزی طور پر وہی کرتوت یہودیوں والی پُوری ہونی تھی اور یہ اس طرف اشارہ کرتی تھیں کہ آنے والا دو رنگ لے کر آوے گا۔ اسی لیے مہدی اور مسیح کے زمانہ کی علامات ایک ہی ہیں اور ان دونو کا فعل بھی ایک ہی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹ مورخہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۳ء)

۲۲؍اگست ۱۹۰۳ء

اشاعتِ فحش سے بچیں

عام طور پر یہ ایک مرض لوگوں میں دیکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مرد یا عورت کی نسبت یہ بیان کرے کہ وہ بدکار ہے یا اس کا دوسرے سے تعلق بدکاری کا ہے تو چونکہ نفس اپنے معلومات کی وسعت سے لذت پاتا ہے۔ اس لیے اس راوی کے بیان پر بلاتحقیق یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ بالکل سچا ہے اور اُسے شہرت دینے میں سعی کی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے نیک مرد اور نیک عورتوں کی نسبت ناپاک خیال لوگوں کے دلوں میں متمکن ہو جاتے ہیں اور جن کی شہرت ہوتی ہے اُن

کے دلوں پر اس سے کیا صدمہ گذرتا ہے اس کو ہر ایک محسوس نہیں کر سکتا۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے ایسی شہرت دینے والوں کے لیے اسّی دُرّے سزا مقرر فرمائی ہے۔

اس مضمون کے متعلق حضرت اقدس نے فرمایا کہ

خدا تعالیٰ نے اپنی پاک کلام میں شہرت دینے والوں کے لیے بشرطیکہ وہ اُسے ثابت نہ کر سکیں اسّی دُرّے سزا رکھی ہے اس لیے کہ جو شہرت دیتا ہے اسے اس مقدمہ میں مدعی گردانا گیا ہے اور اسی سے چار گواہ طلب کئے گئے ہیں کہ اگر وہ سچا ہے تو اپنے علاوہ چار گواہ رویت کے لاوے۔ یہ غلطی ہے کہ ایسے شخص کو بھی گواہوں میں شمار کیا جاوے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ صفحہ ۲۵۹ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء)

---

۲۴ راگست ۱۹۰۳ء

ایک رؤیا

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک رؤیا بوقتِ عصر سُنایا۔ فرمایا کہ:۔

مَیں نے دیکھا کہ ایک بلی ہے اور گویا کہ ایک کبوتر ہمارے پاس ہے وہ اس پر حملہ کرتی ہے۔ بار بار ہٹانے سے باز نہیں آتی تو آخر مَیں نے اس کا ناک کاٹ دیا ہے اور خون بہہ رہا ہے۔ پھر بھی باز نہ آئی تو مَیں نے اسے گردن سے پکڑ کے اس کا منہ زمین سے رگڑنا شروع کیا۔ بار بار رگڑتا تھا لیکن پھر بھی سر اُٹھاتی جاتی تھی تو آخر مَیں نے کہا کہ آؤ اسے پھانسی دیدیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ صفحہ ۲۶۵ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء)

---

۳۱ راگست ۱۹۰۳ء

مسلمانوں کے ادبار کا باعث

اہلِ اسلام کے ادبار اور اُن کے تنزّل کا ذکر ہوا فرمایا کہ:۔

اس کا باعث خود ان کی شامتِ اعمال ہے کیونکہ زمین پر کچھ نہیں ہوتا جبکہ اوّل آسمان پر نہ ہولے۔ اکثر لوگ حکام کی سختی اور ظلم کی شکایت کیا کرتے ہیں لیکن اگر یہ لوگ خود ظالم نہ ہوں تو خدا تعالیٰ ان پر کبھی ظالم حاکم مسلط نہ کرے۔ زمانہ کی حالت کا اندازہ اسی سے کر لو کہ ہم ہزاروں روپے دینے کو تیار ہیں کہ کوئی جماعت آکر یہاں رہے۔ ہم ان کی مہمان نوازی کریں اور حتی الوسع ہر ایک قسم کا آرام دیویں اور وہ شرافت سے اپنے شکوک و شبہات پیش کریں اور قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ہماری باتیں سُنیں اور پھر سمجھیں اور غور کریں کہ جو کچھ عقیدہ اسلام کے متعلق انہوں نے اختیار کیا ہوا ہے اس سے کسقدر فساد اور ہتک اسلام کی اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لازم آتی ہے اور عیسائیوں کو کس قدر مدد ملتی ہے مگر ان لوگوں کو پروا نہیں ہے گھر بیٹھے ہی دو دو پیسہ کی کتابیں بنا کر جو کچھ جھوٹ اور افتراء چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں (جب مذہب کے بارے میں اس قدر بے پرواہی ہے تو کیوں ان پر ادبار نہ آوے)۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی حقیقت

ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن شریف میں جو یہ لکھا ہے کہ خواہ کوئی یہودی ہو خواہ صابی ہو خواہ نصرانی ہو تو جو کوئی اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان لا دے تو اسے حزن نہ ہوگا تو اس صورت میں اکثر ہندو لوگ بھی اس بات کے مستحق ہیں کہ وہ نجات پاویں کیونکہ وہ رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اگرچہ عمل نہیں کرتے اور اُن کی تعظیم کرتے ہیں۔ فرمایا:۔

اللہ پر ایمان لانے کے معنے آپ نے کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ جو عیسیٰؑ پر ایمان لا وے وہ بھی اللہ پر ایمان لانے والا ہے؟ اللہ پر ایمان لانے کے یہ معنے ہیں کہ اسے ان تمام صفات سے موصوف مانا جاوے جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے مثلاً رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ تمام محامد والا۔ رسولوں کو بھیجنے والا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے والا۔ اب آپ ہی بتلاویں کہ قرآن شریف میں لفظ اللہ کے یہ معنے ہیں کہ نہیں؟ پھر جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا۔ قرآن کو نہیں مانتا تو اس نے کیا اُس اللہ کو مانا جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ جیسے گلاب کے پھول سے خوشبو دُور کر دی جاوے تو پھر وہ گلاب کا پھُول پھُول نہیں رہتا اور اسے پھینک دیتے ہیں۔ پس اسی طرح اللہ کو ماننے والا وہی ہوگا جو اُسے اُن صفات کے ساتھ مانے جو قرآن نے بیان کئے ہیں۔

سائل:۔ لیکن بعض ہندو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں اگرچہ برائے نام ہندو ہیں اور عمل بھی ہندوؤں والے۔ تو یہاں چونکہ لفظ ایمان کا ہے کہ جو ایمان لا وے تو پھر وہ مستحق ہیں کہ نہیں کہ ان پر خوف اور حزن نہ ہو۔

فرمایا کہ:۔

اقرار اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ انسان اس پر عمل بھی کرے۔ اگر انسان نماز روزہ وغیرہ کا اقرار تو کرتا ہے مگر فعل ایک دن بھی بجا نہیں لاتا تو اس کا نام اقرار نہ ہوگا۔ اگر آپ کے ساتھ ایک شخص کئی اقرار کرے کہ میں یہ کروں گا وہ کروں گا لیکن عملی طور پر ایک بھی پورا نہ کرے تو کیا تم اس کے اقرار کو اقرار کہو گے؟

عذاب کی حقیقت

سائل:۔ چونکہ اس کا اقرار زبان سے تو ہے اس لیے عذاب میں تو ضرور رعایت چاہیئے۔

فرمایا:۔

ہمارا مذہب یہ ہے کہ دنیا میں جو عذاب ملتے ہیں وہ ہمیشہ شوخیوں اور شرارتوں سے ملتے ہیں۔ انبیاء اور مامورین کے جس قدر منکر گذرے ہیں ان پر عذاب اسی وقت نازل ہوا جبکہ ان کی شرارت اور شوخی حد سے تجاوز کر گئی۔ اگر وہ لوگ حد سے تجاوز نہ کرتے تو اصل گھر عذاب کا آخرت ہے۔ ورنہ اس طرح سے دیکھ لو کہ ہزاروں کافر ہیں جو کہ اپنا کاروبار کرتے ہیں اور پھر کفر پر ہی مرتے ہیں مگر دنیا میں کوئی عذاب ان کو نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ماموُر من اللہ کے مقابلہ پر آکر شوخی اور شرارت میں حد سے نہیں بڑھتے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آخرت میں بھی ان کو عذاب نہ ہوگا۔ دنیاوی عذاب کے لیے ضروری ہے کہ انسان تکذیبِ مُرسل، استہزاء اور ٹھٹھے میں اور ایذاء میں حد سے بڑھے اور خدا کی نظر میں اُن کا فساد، فسق اور ظلم اور آزار نہایت درجہ پر پہنچ گیا ہو۔ اگر ایک کافر مسکین صورت رہے گا اور اس کو خوف دامنگیر ہوگا تو گو وہ اپنی ضلالت کی وجہ سے جہنم کے لائق ہے مگر عذابِ دنیوی اس پر نازل نہ ہوگا۔

اگر کفارِ مکہ چُپ چاپ اور اخلاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش آتے تو یہ عذاب اُن کو جو ظاہر گز نہ ملتا۔ ایک جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (بنی اسرائیل:۱۷) کہ جب کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ارادہ الٰہی ہوتا ہے تو اس وقت ضرور وہاں کے لوگ بدکاریوں میں حدِ اعتدال سے نکل جاتے ہیں۔

پھر ایک اور جگہ ہے وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (القصص:۶۰) جس سے ثابت ہے کہ کوئی بستی نہیں ہلاک ہوتی مگر اس حالت میں کہ جب اس کے اہل ظلم پر کمربستہ ہوں۔ فسق کے معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔

اب دیکھو ہزاروں ہندو ہیں مگر مانتے نہیں انکار کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر لیکھرام کے پیٹ میں چھُری چلی؟ اس کی وجہ اس کی زبان تھی کہ جب اُس نے اُسے بیبا کانہ کھولا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سبّ و شتم کرنے میں حد سے بڑھ گیا۔ اور ایک مدِ مقابل بن کر خود نشان طلب کیا تو وہی اس کی زبان چھُری بن کر اس کی جان کی دشمن ہو گئی غرضکہ اصل گھر عذاب کا آخرت ہے اور دنیا میں عذاب شوخی، شرارت میں حد سے تجاوز کرنے سے آتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی یہ بات مشہور ہے کہ پرمیشر اور عَت کا بَیر (دشمنی) ہے۔ عَت کے معنے حد درجہ تک ایک بات کو پہنچا دینا (عَت کا لفظ عربی ہے جیسے قرآن شریف میں عتو ہے)۔

تفاوت وطبقاتِ عذاب

مَیں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ عذاب یکساں سب کو ہو۔ کفر سب ایک جیسے نہیں ہوتے تو عذاب کیسے ایک جیسا سب کو ہو۔ بعض کافر ایسے ہیں کہ ایسے پہاڑوں میں رہتے ہیں کہ وہاں اب تک رسالت کی خبر نہیں۔ اسلام کی خبر نہیں تو ان کا کُفر

ابوجہل والا کفر تو نہ ہوگا۔ جس حال میں ایک نہایت درجے کا شریر اور مکذب باوجود علم کے پھر انکار کرتا ہے تو اسکے عذاب اور دوسرے کے عذاب میں جو اس قدر شرارت نہیں کرتے ضرور فرق ہونا چاہیئے، لیکن ان طبقات عذاب کی کہ یہ کسقدر ہیں اور کس طرح سے ان کی تقسیم ہے اس کی ہمیں خبر نہیں اس کا علم خدا کو ہے۔ ہاں چونکہ خدا کی طرف ظلم منسوب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے طبقات کا ہونا ضروری ہے۔

ہمارا مذہب

احادیث کی نسبت ذکر ہوا۔ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے اپنا مذہب بتلایا جو کہ اکثر دفعہ شائع ہو چکا ہے کہ

سب سے مقدم قرآن ہے اس کے بعد سنّت اس کے بعد حدیث۔

اور حدیث کی نسبت فرمایا کہ :۔

ضعیف سے ضعیف حدیث بھی بشرطیکہ وہ قرآن کے معارض نہ ہو اس پر عمل کرنا چاہیئے کیونکہ جس حال میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہے تو یہ ادب اور محبت کا تقاضا ہونا چاہیئے کہ اس پر عملدرآمد ہو اور ہمارا یہ مدعا ہرگز نہیں کہ اُئمہ دین کی ان کوششوں کو جو محض دین کے لیے انہوں نے کیں ضائع کر دیویں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس حال میں کوئی بات ان کی یا کوئی حدیث ہی باوجود تاویلات کے بھی قرآن شریف سے مطابقت نہ کھاوے تو پھر قرآن کو مقدم رکھ کر اسے ترک کر دیا جاوے کیونکہ جب ضدین جمع ہونگی تو ایک کو تو ضرور ترک کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں تم قرآن کو ترک مت کرو اور اس کے غیر کو ترک کر دو۔ مثلاً ایک مسئلہ وفاتِ مسیح کا ہی ہے۔ جس حال میں قرآن شریف سے وفات ثابت ہے تو اب ہم اس دوسری حدیث کو جو اس کے مخالف ہو یا کسی کے قول کو کیوں مانیں؟ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (المائدۃ: ۱۱۸) میں دو باتیں خدا تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ ایک تو مسیح کی وفات دوسرے اس کے دنیا میں آنے کی نفی کی ہے کیونکہ اگر وہ قیامت سے پیشتر دنیا میں دوبارہ آچکا ہے تو اس کا کُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ کہنا غلط ہے۔ اس صورت میں یا تو مسیح جھوٹے ہوں گے یا نعوذ باللہ جھوٹ کا الزام خدا تعالیٰ پر آوے گا تو ایسی صورت میں ہم قرآن کو مقدم رکھیں گے جس نے وفات کو بڑے بیّن طور پر ثابت کر دیا ہے۔

عورتوں کیلئے جمعہ کا استثناء

ایک صاحب نے عورتوں پر جمعہ کی فرضیت کا سوال کیا۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ :۔

اس میں تعامل کو دیکھ لیا جاوے اور جو امر سنّت اور حدیث سے ثابت ہے اس سے زیادہ ہم اس کی تفسیر کیا کر سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو جب مستثنیٰ کر دیا ہے تو پھر یہ حکم صرف مردوں کیلئے ہی رہا۔

احتیاطی نماز اہلِ اسلام میں سے بعض ایسے بھولے بھالے بھی ہیں کہ جمعہ کے دن ایک توجمعہ کی نماز پڑھتے ہیں پھر اس کے بعد اس احتیاط سے کہ شاید جمعہ ادا نہ ہوا ہو، ظہر کی نماز بھی پوری ادا کرتے ہیں اس کا نام انہوں نے احتیاطی رکھا ہوا ہے۔ اس کے ذکر پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ

یہ غلطی ہے اور اس طرح سے کوئی نماز بھی نہیں ہوتی کیونکہ نیّت میں اس امر کا یقین ہونا ضروری ہے کہ مَیں فلاں نماز ادا کرتا ہوں اور جب نیّت میں شک ہوا تو پھر وہ نماز کیا ہوئی؟

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ صفحہ ۲۶۵-۲۶۶ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء)

یکم ستمبر ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ایک رویاء فرمایا کہ:۔

آج خواب میں ایک فقرہ منہ سے یہ نکلا

فیئر مین FAIR MAN

خداشناسی کا واحد ذریعہ فرمایا کہ:۔

خدا کی شناخت کے واسطے سوائے خدا کے کلام کے اَور کوئی ذریعہ نہیں ہے ملاحظۂ مخلوقات سے انسان کو یہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سے صرف ضرورت ثابت ہوتی ہے پس ایک شئی کی نسبت ضرورت کا ثابت ہونا اَور امر ہے اور واقعی طور پر اس کا موجود ہونا اَور امر ہے یہی وجہ ہے کہ حکماءِ متقدمین سے جو لوگ محض قیاسی دلائل کے پابند رہے ہیں اور ان کی نظر صرف مخلوقات پر رہی۔ انہوں نے اس میں بہت بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں اور کامل یقین ان کو جو ہے کے مرتبہ تک پہنچتا ہے نصیب نہ ہوا یہ صرف خدا کا کلام ہے جو یقین کے اعلیٰ مراتب تک پہنچاتا ہے۔ خدا کا کلام تو ایک طور سے خدا کا دیدار ہے اور یہ شعر اس پر خوب صادق آتا ہے ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ؎ بساکیں دولت از گفتار خیزد

خدا تعالیٰ قادر ہے کہ جس شئے میں چاہے طاقت بھر دیوے۔ پس اپنے دیدار والی طاقت اس نے اپنی گفتار میں بھر دی ہے۔ انبیاء نے اسی گفتار پر ہی تو اپنی جانیں دیدی ہیں۔ کیا کوئی مجازی عاشق اس طرح

کر سکتا ہے؟ اس گفتار کی وجہ سے کوئی نبی اس میدان میں قدم رکھ کر پھر پیچھے نہیں ہٹا اور نہ کوئی نبی کبھی بے وفا ہوا ہے۔ جنگِ اُحد[لہ] کے واقعہ کی نسبت لوگوں نے تاویلیں کی ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ خدا کی اس وقت جلالی تجلی تھی اور سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اَور کسی کو برداشت کی طاقت نہ تھی۔ اس لیے آپ وہاں ہی کھڑے رہے اور باقی اصحاب کا قدم اُکھڑ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جیسے اس صدق وصفا کی نظیر نہیں ملتی جو آپ کو خدا سے تھا ایسا ہی ان الٰہی تائیدات کی نظیر بھی کہیں نہیں ملتی جو آپ کے شاملِ حال ہیں۔ مثلاً آپ کی بعثت اور رُخصت کا وقت ہی دیکھ لو۔

مسیح کا آسمان پر جانا

بار بار خیال آتا ہے کہ اگر مسیح آسمان پر گئے تو کیوں گئے؟ یہ ایک بڑا تعجب خیز امر ہے۔ کیونکہ جب زمین پر اُن کی کارروائی دیکھی جاتی ہے تو بیساختہ اُن کا آسمان پر جانا اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی ٭ کہ با آسماں نیز پرداختی

گویا یہ شعر بالکل اس واقعہ کے لیے شاعر کے منہ سے نکلا ہے۔ کوئی پوچھے کہ انہوں نے آسمان پر جا کر آج تک کیا بنایا۔ اگر زمین پر رہتے تو لوگوں کو ہدایت ہی کرتے مگر اب دو ہزار برس تک جو اُن کو آسمان پر بٹھاتے ہیں تو اُن کی کارروائی کیا دکھلا سکتے ہیں۔ جو بات ہم کہتے ہیں اور جس کی تائید میں قرآن اور حدیث بھی ہمارے ساتھ ہے وہ ان کی شانِ نبوت کے ساتھ خوب چسپاں ہوتی ہے کہ جب ان لوگوں نے حضرت مسیح کو نہ مانا تو آپ دوسرے نبیوں کی طرح دوسرے ملک میں ہجرت کر کے چلے گئے۔

اور پھر ایسے فرضی اوصاف ان کے لیے وضع کرتے ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک اور ہجو ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار نے سوال کیا۔ کہ آپ آسمان پر چڑھ کر بتلاویں تو آپ نے یہ معجزہ اُن کو نہ دکھلایا اور سُبْحَانَ رَبِّیْ (بنی اسرائیل: ۹۴) کا جواب دیا گیا اور یہاں بلا درخواست کسی کافر کے خود خدا تعالیٰ مسیح کو آسمان پر لے گیا تو گویا خدا تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی نظروں میں ہیٹا کرانا چاہا۔ کیا وہ خدا اَور تھا اور یہ اَور تھا؟

اگرچہ لوگ ہمیں ایسی باتوں سے کافر دجال وغیرہ کہتے ہیں مگر یہ ہمارا فخر ہے کیونکہ قرآن کی تائید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قائم کرنے کے لیے یہ خطابات ہمیں ملتے ہیں ؎

بعد از خدا بعشقِ محمد مخمرم ٭ گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

لہ جنگ حُنین کا واقعہ ہے۔ رپورٹر کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ (مرتب)

مسئلہ تقدیر آریہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں لکھا ہے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (البقرۃ: ۸) کہ خدا نے دلوں پر مُہر کر دی ہے تو اس میں انسان کا کیا قصور؟ یہ ان لوگوں کی کوتاہ اندیشی ہے کہ کلام کے ماقبل اور مابعد پر نظر نہیں ڈالتے ورنہ قرآن شریف نے صاف طور پر بتلایا ہے کہ یہ مُہر جو خدا تعالیٰ کی طرف سے لگتی ہے یہ دراصل انسانی افعال کا نتیجہ ہے کیونکہ جب ایک فعل انسان کی طرف سے صادر ہوتا ہے تو سنّت اللہ یہی ہے کہ ایک فعل خدا تعالیٰ کی طرف سے بھی صادر ہو جیسے ایک شخص جب اپنے مکان کے دروازے بند کر دے تو یہ اس کا فعل ہے اور اس پر خدا تعالیٰ کا فعل یہ صادر ہوگا کہ اس مکان میں اندھیرا کر دے کیونکہ روشنی اندر آنے کے جو ذریعے تھے وہ اس نے خود اپنے لیے بند کر دیئے۔ اسی طرح اس مُہر کے اسباب کا ذکر خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں دوسری جگہ کیا ہے۔ جہاں لکھا ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَہُمْ (الصف: ۶) کہ جب انہوں نے کجی اختیار کی۔ تو خدا نے اُن کو کج کر دیا۔ اسی کا نام مہر ہے لیکن ہمارا خدا ایسا نہیں کہ پھر اس مُہر کو دُور نہ کر سکے۔ چنانچہ اس نے اگر مُہر لگنے کے اسباب بیان کئے ہیں تو ساتھ ہی وہ اسباب بھی بتلا دیئے ہیں جن سے یہ مُہر اُٹھ جاتی ہے جیسے کہ یہ فرمایا ہے فَاِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا (بنی اسرائیل: ۲۶)

لیکن کیا آریوں کا پرمیشر ایسا ہے کہ تناسخ کی رُو سے جو مُہر وہ ایک انسان پر لگاتا ہے پھر اُسے اُٹھا سکے؟ گناہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ دوسرے گناہ کی انسان کو جرأت دلاتا ہے اور اس سے قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے حتیٰ کہ گناہ انسان کو مرغوب ہو جاتا ہے لیکن ہمارے خدا نے تو پھر بھی توبہ کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر کوئی شخص نادم ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو وہ بھی رجوع کرتا ہے مگر آریوں کے لیے یہ کہاں نصیب؟ اُن کا پرمیشر جو مُہر لگاتا ہے اسے اُکھاڑنے پر تو وہ خود بھی قادر نہیں۔ پس اس میں مسئلہ تقدیر کا اعتراض آریوں پر ہے نہ کہ اہلِ اسلام پر۔

توبہ ایک موت ہے ہاں توبہ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ انسان زبان سے توبہ توبہ کہہ لیوے۔ بلکہ ایک شخص تائب اس وقت کہا جاتا ہے کہ گذشتہ حالت پر سچے دل سے نادم ہو کر آئندہ کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ پھر یہ کام نہ کرے گا اور اپنے اندر تبدیلی کرتا ہے اور جن شہوات عادات وغیرہ کا وہ عادی ہوتا ہے ان کو چھوڑتا ہے اور تمام یار دوست، گلی کوچے اُسے ترک کرنے پڑتے ہیں کہ جن کا معاصی کی حالت میں اس سے تعلق تھا۔ گویا توبہ ایک موت ہے جو وہ اپنے اوپر وارد کرتا ہے۔ جب ایسی حالت میں وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تو پھر خدا تعالیٰ بھی اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ گناہ کے ارتکاب میں ایک حصّہ قضا و قدر کا ہے کہ بعض اندرونی اعضاء اور قویٰ کی ساخت

اس قسم کی ہوتی ہے کہ انسان سے گناہ سرزد ہو پس اس لیے ضروری تھا کہ ارتکاب معاصی میں جسقدر حصہ قضاوقدر کا ہے اس میں خداتعالیٰ رعایت دیوے اور اس بندے کی توبہ قبول کرے اور اسی لیے اس کا نام تواب ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ صفحہ ۲۶۶، ۲۶۷ مورخہ ۱۱ستمبر ۱۹۰۳ء)

۴ستمبر ۱۹۰۳ء

ایک رؤیا اور الہام فرمایا کہ:۔ اسہال آنے سے میری طبیعت میں کچھ کمزوری پیدا ہوگئی۔ ایک تھوڑی سی غنودگی میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دونوں طرف دو آدمی پستولیں لیے کھڑے ہیں۔ اس اثناء میں مجھے الہام ہوا

فِیْ حِفَاظَۃِ اللّٰہِ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۵ صفحہ ۲۸۰ مورخہ ۱۸ستمبر ۱۹۰۳ء)

بلاتاریخ[1]

اسم اعظم ایک دن بوقت ظہر فرمایا کہ ہیضہ کے لیے ہم تو نہ کوئی دوا بتلاتے ہیں نہ نسخہ۔ صرف یہ بتلاتے ہیں کہ راتوں کو اٹھ کر دعا کریں اور اسم اعظم رَبِّ کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُکَ رَبِّ فَاحْفَظْنِیْ وَانْصُرْنِیْ وَارْحَمْنِیْ کی تکرار نماز کے رکوع سجود وغیرہ میں اور دوسرے وقتوں میں کریں۔ یہ خدا نے اسم اعظم تبلایا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۵ صفحہ ۲۸۰ مورخہ ۱۸ستمبر ۱۹۰۳ء)

۹ستمبر ۱۹۰۳ء

وبائی امراض کا الہامی علاج فرمایا:۔ مجھے الہام ہوا۔

سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ

---

[1] یہ ڈائری ۴ تا ۸ ستمبر ۱۹۰۳ء میں سے کسی دن کی ہے (مرتب)

پھر چونکہ بیماری وبائی کا بھی خیال تھا۔ اس کا علاج خدا تعالیٰ نے یہ بتلایا کہ اسکے ان ناموں کا ورد کیا جاوے

یَا حَفِیْظُ ۔ یَا عَزِیْزُ ۔ یَا رَفِیْقُ

رفیق خدا تعالےٰ کا نیا نام ہے جو کہ اس سے پیشتر اسماء باری تعالےٰ میں کبھی نہیں آیا۔[1]

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۵ صفحہ ۲۸۰ مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۰۳ء)

---

۱۴ ستمبر ۱۹۰۳ء

ضرورت کیلئے تصویر کا جواز

ایک احمدی صاحب نے سوال کیا کہ گاؤں کے لوگ اس لیے تنگ کرتے ہیں کہ آپ نے تصویر کھنچوائی ہے اسکا ہم کیا جواب دیویں؟

فرمایا کہ:۔

انسان جب دنیاوی ضرورتوں کے لیے ہر وقت پیسہ روپیہ وغیرہ جیب میں رکھتا ہے جن پر تصویر وغیرہ بنی ہوئی ہوتی ہے تو پھر دینی ضرورت کے لیے تصویر کا استعمال کیوں روا نہیں ہوسکتا۔ ان لوگوں کی شال لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الصف : ۳) کی ہے کہ خود تو ایک فعل کرتے ہیں اور دوسروں کو اسے معیوب بتلاتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے نزدیک تصویر حرام ہے تو ان کو چاہیئے کہ کُل مال و زر باہر نکال کر پھینک دیں اور پھر ہم پر اعتراض کریں اور یہ مُلّاں لوگ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ ایک پیسہ کو تو وہ ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکتے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۶ صفحہ ۲۸۱ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء)

---

۱۷ ستمبر ۱۹۰۳ء

جذب اور کشش سچے مذہب کی علامت ہیں

بعض احباب کی طرف سے یہ درخواست ہوئی کہ آریوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے کہ یہ بہت بڑھے جاتے ہیں۔ فرمایا کہ:۔

---

[1] الحکم میں ہے :۔ "اللہ تعالیٰ کے اسم رفیق کے استعمال کا یہ جدید اسلوب ہے۔"
(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۶ صفحہ ۱۵ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۳ء)

انہوں نے کیا ترقی کرنی ہے۔ وہ مذہب ترقی کرتا ہے جس میں کچھ روحانیت ہوتی ہے۔ نہ ان میں روحانیت ہے اور نہ وہ کشش مقناطیسی ہے جس سے ایک قوم ترقی کر سکتی ہے۔ وہ ایک خاص کشش ہوتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور تمام پاکیزہ دلوں کو وہ محسوس ہوتی ہے اور جو اس سے متاثر ہوتے ہیں وہ ایک فوق العادت زندگی کا نمونہ دکھلاتے ہیں اور ہیروں کے ٹکڑوں کی طرح اس کشش کی چمک نظر آتی ہے اور جس کو وہ کشش عطا ہوتی ہے وہ الٰہی طاقتوں کا سرچشمہ ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی نادر اور مخفی قدرتیں جو عام طور پر ظاہر نہیں ہوتیں، ایسے شخص کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہیں اور اسی کشش سے اُنکو کامیابی ہوتی ہے۔ دنیا میں جسقدر انبیاء آئے ہیں کیا وہ دنیا کے سارے مکر و فریب اور فلسفے سے پُورے واقف ہو کر آتے ہیں جس سے وہ مخلوق پر غالب ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُن میں ایک کشش ہوتی ہے جس سے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور جب دعا کی جاتی ہے وہ کشش کے ذریعہ سے زہریلے مادہ پر جو لوگوں کے اندر ہوتا ہے اثر کرتی ہے اور اس روحانی مریض کو تسلی اور تسکین بخشتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کہ بیان میں ہی نہیں آسکتی اور اصل مغز شریعت کا یہی ہے کہ وہ کشش طبیعت میں پیدا ہو جاوے۔ سچا تقویٰ اور استقامت بغیر اس صاحبِ کشش کی موجودگی کے پیدا نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے سوا قوم بنتی ہے یہی کشش ہے جو کہ دلوں میں قبولیت ڈالتی ہے۔ اس کے بغیر ایک غلام اور نوکر بھی اپنے آقا کی خاطر خواہ فرماں برداری نہیں کر سکتا اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے نوکر اور غلام جن پر بڑے انعام و اکرام کئے گئے ہوں آخر کار نمک حرام نکل آتے ہیں۔ بادشاہوں کی ایک تعداد کثیر ایسے غلاموں کے ہاتھوں سے ذبح ہوتی رہی، لیکن کیا کوئی ایسی نظیر انبیاء میں دکھلا سکتا ہے کہ کوئی نبی اپنے کسی غلام یا مرید سے قتل ہوا ہے؟ مال اور زر یا اور کوئی اور ذریعہ دل کو اس طرح سے قابو نہیں کر سکتا جس طرح سے یہ کشش قابو کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ کیا بات تھی کہ جس کے ہونے سے صحابہؓ نے اس قدر صدق دکھایا اور انہوں نے نہ صرف بُت پرستی اور مخلوق پرستی ہی سے مُنہ موڑا بلکہ درحقیقت اُن کے اندر سے دنیا کی طلب ہی مسلوب ہوگئی اور وہ خدا کو دیکھنے لگ گئے وہ نہایت سرگرمی سے خدا تعالیٰ کی راہ میں ایسے فدا تھے کہ گویا ہر ایک ان میں سے ابراہیم تھا۔ انہوں نے کامل اخلاص سے خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر کرنے کے لیے وہ کام کئے جس کی نظیر بعد اس کے کبھی پیدا نہیں ہوئی اور خوشی سے دین کی راہ میں ذبح ہونا قبول کیا بلکہ بعض صحابہؓ نے جو یک لخت شہادت نہ پائی تو اُن کو خیال گذرا کہ شاید ہمارے صدق میں کچھ کسر ہے جیسے کہ اس آیت میں اشارہ ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ (الاحزاب: ۲۴) یعنی بعض تو شہید ہو چکے تھے اور بعض منتظر تھے کہ کب شہادت نصیب ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان لوگوں کو دوسروں کی طرح حوائج نہ تھے اور اولاد کی محبت اور دوسرے تعلقات نہ تھے؟ مگر اس کشش نے

ان کو ایسا مستانہ بنا دیا تھا کہ دین کو ہر ایک شئے پر مقدم کیا ہوا تھا۔

اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (الشعرآء: ۴) کی تفسیر میں ایک نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال پیدا ہوا ہوگا کہ مجھ میں شاید وہ کامل کشش نہیں ہے ورنہ ابوجہل راہِ راست پر آجاتا۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ آپ میں کشش تو کامل تھی لیکن بعض فطرتیں ہی ایسی ہوجاتی ہیں کہ وہ اس قابل نہیں رہتیں کہ نُور کو قبول کریں اس لیے ایسے لوگوں کا محروم رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

دنیا اور مافیہا پر دین کو مقدم کر لینا بغیر کشش الٰہی کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ جن لوگوں میں یہ کشش نہیں ہوتی وہ ذرا سے ابتلا سے تبدیل مذہب کر لیتے ہیں اور حکومت کے دباؤ سے فوراً ہاں میں ہاں ملانے لگ جاتے ہیں۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ ایک لاکھ تک ہوگئے تھے مگر چونکہ اس میں وہ کشش نہ تھی اس لیے آخر کار سب کے سب فنا ہوگئے۔

غرضیکہ کسی کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہی ہے کہ اس کو کشش دی جاوے، اور یہی بڑا معجزہ ہے جو کہ لکھوکھا انسانوں کو اس کا گرویدہ اور جاں نثار بنا دیتی ہے۔ کسی ایک کو اپنا گرویدہ کرنا محال ہوتا ہے کوئی کرکے دیکھے تو حال معلوم ہو۔ سینکڑوں روپے خرچ ہوجاتے ہیں مگر آخر کار دشمنی ہی ہوتی ہے چہ جائیکہ ایک عالم کو اپنا گرویدہ کر لیا جاوے یہ بغیر اس کشش کے حاصل نہیں ہوتا جو خدا سے عطا ہو۔ بادشاہوں کے رُعب اور دھمکیاں اور ایک دنیا بھر کا اس کے مقابلہ پر آجانا یہ سب اس کشش کے گرویدوں کو تذبذب میں نہیں پڑنے دیتیں۔

ابھی تک ان آریوں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ سچا تقویٰ کیا شئے ہے۔ یہ اس وقت پتہ لگتا ہے کہ جب اوّل وہ اپنی بیماری کو سمجھیں۔ جب تک ایک انسان اپنے آپ کو بیمار نہیں خیال کرتا تو وہ علاج کیا کراوے گا۔ تزکیۂ نفس ایک ایسی شئے ہے کہ خود بخود نہیں ہوسکتا اس لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم: ۳۳) کہ تم یہ خیال نہ کرو کہ ہم اپنے نفس یا عقل کے ذریعہ سے خود بخود مزکی بن جاوینگے۔ یہ بات غلط ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔ جہالت ایک ایسی زہر ہے کہ جیسے انسان چنگا بھلا پھرتا ہوا فوراً ہیضہ وغیرہ سے ہلاک ہوجاتا ہے اور اس سے پیشتر گمان بھی نہیں ہوتا کہ میں مرجاؤں گا، ایسے ہی جہالت ہلاک کردیتی ہے اس کا علاج بلا انبیاء علیہم السلام کے نہیں ہوسکتا۔ اُن کی صحبت میں رہنے سے انسان کے اندر وہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ جس سے اُسے اپنے مرض کا پتہ لگتا ہے۔ ورنہ خشک لفاظی اور چرب زبانی سے انسان کو یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ صرف یہ کہنا کہ ہم نے زنا نہیں کیا۔ چوری نہیں کی۔ اس سے تزکیۂ نفس نہیں پایا جاتا اور نہ اس کا نام سچی پاکیزگی ہے۔ یہ ایک ایسی شئے ہے کہ اس پر عمل کرنا تو درکنار سمجھنا ہی مشکل ہے جسے خدا تعالیٰ چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ یہ تو ایک قسم کی موت ہے جو انسان کو اپنے نفس پر وارد کرنی پڑتی

ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۶ صفحہ ۲۸۲ مورخہ ۲۵ستمبر ۱۹۰۳ء)

۲۳ستمبر ۱۹۰۳ء

(بوقت صبح بمقام گورداسپور)

ایک رؤیا مَیں نے ایک قلم لکھنے کے واسطے اُٹھائی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کی ایک زبان ٹوٹی ہوئی ہے تو مَیں نے کہا کہ محمد افضل نے جو پَر (نب) بھیجے ہیں ان میں سے ایک لگا دو۔ وہ پَر تلاش کئے جا رہے ہیں کہ اس اثناء میں میری آنکھ کُھل گئی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۷ صفحہ ۲۹۰ مؤرخہ ۲؍اکتوبر ۱۹۰۳ء)

کثرتِ اولاد سے جماعت کو بڑھائیں مفتی فضل الرحمٰن صاحب احمدی قادیانی نے ذیل کے ملفوظات حضرت امام الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام مجھے پہنچائے ہیں۔

۲۳ستمبر ۱۹۰۳ء کو علی الصباح جب مفتی صاحب موصوف نے حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب کے ہاں فرزندِ ارجمند کی ولادت کی خبر حضرت امام الزمان علیہ السلام کو گورداسپور جاکر پہنچائی تو آپ نے فرمایا:۔

مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کیونکہ اس سے پیشتر مولوی صاحب کو اولاد کا بہت صدمہ پہنچا ہوا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اس کا نام عبدالقیوم رکھا جائے۔

پھر فرمایا کہ:۔

میرا تو یہی جی چاہتا ہے کہ میری جماعت کے لوگ کثرتِ ازدواج کریں اور کثرتِ اولاد سے جماعت کو بڑھادیں مگر شرط یہ ہے کہ پہلی بیویوں کے ساتھ دوسری بیوی کی نسبت زیادہ اچھا سلوک کریں تاکہ اسے تکلیف نہ ہو۔ دوسری بیوی پہلی بیوی کو اسی لیے ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ وہ خیال کرتی ہے کہ میری غور و پرداخت اور حقوق میں کمی کی جاویگی مگر میری جماعت کو اس طرح نہ کرنا چاہیئے۔ اگرچہ عورتیں اس بات سے ناراض ہوتی ہیں مگر مَیں تو یہی تعلیم دوں گا۔ ہاں یہ شرط ساتھ رہے گی کہ پہلی بیوی کی غور و پرداخت اور اس کے حقوق دوسری کی نسبت زیادہ توجہ اور غور سے ادا ہوں اور دوسری سے اُسے زیادہ خوش رکھا جائے۔ ورنہ

یہ نہ ہو کہ بجائے ثواب کے عذاب ہو۔ عیسائیوں کو بھی اس امر کی ضرورت پیش آئی ہے اور بعض دفعہ پہلی بیوی کو زہر دیکر دوسری کی تلاش سے اس کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تقویٰ کی عجیب راہ ہے مگر بشرطیکہ انصاف ہو۔ اور پہلی کی نگہداشت میں کمی نہ ہو۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۱۱ مورخہ ۱۶؍ فروری ۱۹۰۴ء)

۲۴؍ ستمبر ۱۹۰۳ء

رُوحانیت اور پاکیزگی کی ضرورت

آپ نے ایک ذکر پر فرمایا کہ:۔

کوئی دنیا کا کاروبار چھوڑ کر ہمارے پاس بیٹھے تو ایک دریا پیشگوئیوں کا بہتا ہوا دیکھے جیسے کہ کل قلم والی پیشگوئی پوری ہوئی ہے۔

رُوحانیت اور پاکیزگی کے بغیر کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔ قرآن شریف نے بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر دنیا کی کیا حالت تھی۔ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (محمد: ۱۳) پھر جب انہی لوگوں نے اسلام قبول کیا تو فرماتا ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان: ۶۵) جب تک آسمان سے تریاق نہ ملے تو دل درست نہیں رہتا۔ انسان آگے قدم رکھتا ہے مگر وہ پیچھے پڑتا ہے قدسی صفات اور فطرت والا انسان ہو تو وہ مذہب چل سکتا ہے اس کے بغیر کوئی مذہب ترقی نہیں کر سکتا۔ اور اگر کرتا بھی ہے تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۷ صفحہ ۲۹۰ مورخہ ۲؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۲۹؍ ستمبر ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

بیعت کی غرض

بیعت لینے کے بعد حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی:

ہر ایک شخص جو میرے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی بیعت کی کیا غرض ہے؟ کیا وہ دنیا کے لیے بیعت کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔ بہت سے ایسے بدقسمت انسان ہوتے ہیں کہ اُن کی بیعت کی غایت اور مقصود صرف دنیا ہوتی ہے ورنہ بیعت سے اُن کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اور وہ حقیقی یقین اور معرفت کا نور جو حقیقی بیعت کے نتائج اور ثمرات ہیں ان میں پیدا نہیں ہوتا۔

ان کے اعمال میں کوئی خوبی اور صفائی نہیں آتی۔ نیکیوں میں ترقی نہیں کرتے۔ گناہوں سے بچتے نہیں۔ ایسے لوگوں کو جو دنیا کو ہی اپنا اصل مقصود ٹھہراتے ہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ

دُنیا روزے چند آخر کار با خداوند

یہ چند روزہ دنیا تو ہر حال میں گذر جاوے گی خواہ تنگی میں گذرے خواہ فراخی ہیں۔ مگر آخرت کا معاملہ بڑا سخت معاملہ ہے وہ ہمیشہ کا مقام ہے اور اس کا انقطاع نہیں ہے۔ پس اگر اس مقام میں وہ اسی حالت میں گیا کہ خدا تعالےٰ سے اس نے صفائی کر لی تھی اور اللہ تعالےٰ کا خوف اس کے دل پر مستولی تھا اور وہ معصیت سے توبہ کر کے ہر ایک گناہ سے جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہ کر کے پکارا ہے بچتا رہا تو خدا تعالیٰ کا فضل اس کی دستگیری کرے گا اور وہ اس مقام پر ہوگا کہ خدا اس سے راضی ہوگا اور وہ اپنے رب سے راضی ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں کیا بلکہ لاپرواہی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی ہے تو پھر اس کا انجام خطرناک ہے اس لیے بیعت کرتے وقت یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ بیعت کی کیا غرض ہے اور اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر محض دنیا کی خاطر ہے تو بے فائدہ ہے لیکن اگر دین کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے تو ایسی بیعت مبارک اور اپنی اصل غرض اور مقصد کو ساتھ رکھنے والی ہے جس سے ان فوائد اور منافع کی پوری امید کی جاتی ہے جو سچی بیعت سے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسی بیعت سے انسان کو دو بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے اور حقیقی توبہ انسان کو خدا تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے اور اس سے پاکیزگی اور طہارت کی توفیق ملتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ (البقرۃ: ۲۲۳) یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور نیز ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو گناہوں کی کشش سے پاک ہونیوالے ہیں۔ توبہ حقیقت میں ایک ایسی شئے ہے کہ جب وہ اپنے حقیقی لوازمات کے ساتھ کی جاوے تو اس کیساتھ ہی انسان کے اندر ایک پاکیزگی کا بیج بویا جاتا ہے جو اس کو نیکیوں کا وارث بنا دیتا ہے۔ یہی باعث ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہوتا ہے کہ گویا اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یعنی توبہ سے پہلے کے گناہ اس کے معاف ہو جاتے ہیں۔ اس وقت سے پہلے جو کچھ بھی اس کے حالات تھے اور جو بیجا حرکات اور بے اعتدالیاں اس کے چال چلن میں پائی جاتی تھیں اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے اُن کو معاف کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد صُلح باندھا جاتا ہے اور نیا حساب شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اس نے خدا تعالیٰ کے حضور سچے دل سے توبہ کی ہے تو اسے چاہیئے کہ اب اپنے گناہوں کا نیا حساب نہ ڈالے اور پھر اپنے آپ کو گناہ کی ناپاکی سے آلودہ نہ کرے بلکہ ہمیشہ استغفار اور دُعاؤں کے ساتھ اپنی طہارت اور صفائی کی طرف متوجہ رہے اور خدا تعالیٰ کو راضی اور خوش کرنے کی فکر میں لگا رہے اور اپنی اس زندگی کے

حالات پر نادم اور شرمسار رہے جو توبہ کے زمانہ سے پہلے گذری ہے۔

انسان کی عمر کے کئی حصے ہوتے ہیں اور ہر ایک حصہ میں کئی قسم کے گناہ ہوتے ہیں مثلاً ایک حصہ جوانی کا ہوتا ہے جس میں اس کے حسب حال جذباتِ کسل و غفلت ہوتی ہے۔ پھر دوسری عمر کا ایک حصہ ہوتا ہے جس میں دغا۔ فریب۔ ریاکاری اور مختلف قسم کے گناہ ہوتے ہیں۔ غرض عمر کا ہر ایک حصہ اپنی طرز کے گناہ رکھتا ہے۔

پس یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے توبہ کا دروازہ کھُلا رکھا ہے اور وہ توبہ کرنے والے کے گناہ بخش دیتا ہے اور توبہ کے ذریعہ انسان پھر اپنے رب سے صلح کر سکتا ہے۔ دیکھو انسان پر جب کوئی جُرم ثابت ہو جائے تو وہ قابلِ سزا ٹھہر جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ (طٰهٰ:۷۵) یعنی جو اپنے ربّ کے حضور مجرم ہو کر آتا ہے اس کی سزا جہنم ہے وہاں وہ نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ یہ ایک جُرم کی سزا ہے اور جو ہزاروں لاکھوں جرموں کا مرتکب ہو اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص عدالت میں پیش ہو اور بعد ثبوت اس پر فردِ قرار دادِ جرم بھی لگ جاوے اور اس کے بعد عدالت اس کو چھوڑ دے تو کس قدر احسانِ عظیم اس حاکم کا ہوگا۔ اب غور کرو کہ یہ توبہ وہی بریت ہے جو فردِ قرار دادِ جُرم کے بعد حاصل ہوتی ہے توبہ کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ پہلے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

اس لیے انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھے کہ کس قدر گناہوں میں وہ مبتلا تھا۔ اور اُن کی سزا کس قدر اس کو ملنے والی تھی جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے معاف کر دی۔ پس تم نے جو اب توبہ کی ہے چاہیئے کہ تم اس توبہ کی حقیقت سے واقف ہو کر ان تمام گناہوں سے بچو جن میں تم مبتلا تھے اور جن سے بچنے کا تم نے اقرار کیا ہے۔ ہر ایک گناہ خواہ وہ زبان کا ہو یا آنکھ یا کان کا۔ غرض ہر اعضاء کے جُدا جُدا گناہ ہیں۔ اُن سے بچتے رہو۔ کیونکہ گناہ ایک زہر ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ گناہ کی زہر وقتاً فوقتاً جمع ہوتی رہتی ہے اور آخر اس مقدار اور حد تک پہنچ جاتی ہے جہاں انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ پس بیعت کا پہلا فائدہ توبہ ہے کہ یہ گناہ کے زہر کے لیے تریاق ہے۔ اس کے اثر سے محفوظ رکھتی ہے اور گناہوں پر ایک خطِ نسخ پھیر دیتی ہے۔

دوسرا فائدہ اس توبہ سے یہ ہے کہ اس توبہ میں ایک قوت و استحکام ہوتا ہے جو مامور من اللہ کے ہاتھ پر سچے دل سے کی جاتی ہے۔ انسان جب خود توبہ کرتا ہے تو وہ اکثر ٹوٹ جاتی ہے۔ بار بار توبہ کرتا اور بار بار توڑتا ہے مگر مامور من اللہ کے ہاتھ پر جو توبہ کی جاتی ہے جب وہ سچے دل سے کریگا تو چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے موافق ہوگی وہ خدا خود اسے قوت دیگا اور آسمان سے ایک طاقت ایسی دی جاوے گی جس سے وہ اس پر قائم رہ سکے گا۔ اپنی توبہ اور مامور کے ہاتھ پر توبہ کرنے میں یہی فرق ہے کہ پہلی کمزور ہوتی ہے دوسری مستحکم۔ کیونکہ اسکے

ساتھ مامور کی اپنی توجہ، کشش اور دعائیں ہوتی ہیں جو توبہ کرنے والے کے عزم کو مضبوط کرتی ہیں اور آسمانی قوت اُسے پہنچاتی ہیں جس سے ایک پاک تبدیلی اس کے اندر شروع ہو جاتی ہے اور نیکی کا بیج بویا جاتا ہے جو آخر ایک بار دار درخت بن جاتا ہے۔

پس اگر صبر اور استقامت رکھوگے تو تھوڑے دنوں کے بعد دیکھوگے کہ تم پہلی حالت سے بہت آگے گذر گئے ہو۔

غرض اس بیعت سے جو میرے ہاتھ پر کی جاتی ہے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ گناہ بخشے جاتے ہیں اور انسان خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق مغفرت کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے مامور کے سامنے توبہ کرنے سے طاقت ملتی ہے اور انسان شیطانی حملوں سے بچ جاتا ہے۔ یاد رکھو کہ اس سلسلہ میں داخل ہونے سے دنیا مقصود نہ ہو بلکہ خدا تعالیٰ کی رضا مقصود ہو۔ کیونکہ دنیا تو گذرنے کی جگہ ہے وہ تو کسی نہ کسی رنگ میں گذر جائے گی ؎

شبِ تنور گذشت و شبِ سمور گذشت

دنیا اور اس کے اغراض اور مقاصد کو بالکل الگ رکھو۔ ان کو دین کے ساتھ ہرگز نہ ملاؤ کیونکہ دنیا فنا ہونے والی چیز ہے اور دین اور اس کے ثمرات باقی رہنے والے۔ دنیا کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ہر آن اور ہر دم میں ہزاروں موتیں ہوتی ہیں۔ مختلف قسم کی وبائیں اور امراض دنیا کا خاتمہ کر رہی ہیں کبھی ہیضہ تباہ کرتا ہے۔ اب طاعون ہلاک کر رہی ہے۔ کسی کو کیا معلوم ہے کہ کون کب تک زندہ رہے گا۔ جب موت کا پتہ نہیں کہ کس وقت آجائے گی۔ پھر کیسی غلطی اور بیہودگی ہے کہ اس سے غافل رہے اس لیے ضروری ہے کہ آخرت کی فکر کرو جو آخرت کی فکر کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا میں اس پر رحم کریگا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب انسان مومن کامل بنتا ہے تو وہ اُس کے اور اُس کے غیر میں فرق رکھدیتا ہے اس لیے پہلے مومن بنو۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ بیعت کی خالص اغراض کے ساتھ جو خدا ترسی اور تقویٰ پر مبنی ہیں۔ دنیا کے اغراض کو ہرگز نہ ملاؤ نمازوں کی پابندی کرو اور توبہ و استغفار میں مصروف رہو۔ نوعِ انسان کے حقوق کی حفاظت کرو۔ اور کسی کو دُکھ نہ دو۔ راستبازی اور پاکیزگی میں ترقی کرو تو اللہ تعالیٰ ہر قسم کا فضل کر دیگا۔ عورتوں کو بھی اپنے گھروں میں نصیحت کرو کہ وہ نماز کی پابندی کریں اور ان کو گلہ شکوہ اور غیبت سے روکو۔ پاکبازی اور راستبازی ان کو سکھاؤ۔ ہماری طرف سے صرف سمجھانا شرط ہے اس پر عملدرآمد کرنا تمہارا کام ہے۔

پانچ وقت اپنی نمازوں میں دعا کرو۔ اپنی زبان میں بھی دعا کرنی منع نہیں ہے۔ نماز کا مزا نہیں آتا ہے جب تک حضور نہ ہو اور حضورِ قلب نہیں ہوتا ہے جب تک عاجزی نہ ہو عاجزی جب پیدا ہوتی ہے جو یہ سمجھ آجائے کہ کیا پڑھتا ہے اس لیے اپنی زبان میں اپنے مطالب پیش کرنے کے لیے جوش اور اضطراب پیدا

ہو سکتا ہے مگر اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نماز کو اپنی زبان ہی میں پڑھو۔ نہیں میرا یہ مطلب ہے کہ مسنون ادعیہ اور اذکار کے بعد اپنی زبان میں بھی دُعا کیا کرو۔ ورنہ نماز کے ان الفاظ میں خدا نے ایک برکت رکھی ہوئی ہے۔ نماز دُعا ہی کا نام ہے۔ اس لیے اس میں دعا کرو کہ وہ تم کو دنیا اور آخرت کی آفتوں سے بچاوے اور خاتمہ بالخیر ہو۔ اپنے بیوی بچوں کے لیے بھی دُعا کرو۔ نیک انسان بنو اور ہر قسم کی بدی سے بچتے رہو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۸ صفحہ ۲ بابت ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۳۰؍ ستمبر ۱۹۰۳ء

ہمیشہ موت کو یاد رکھو

ابو سعید صاحب احمدی نے حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کی کہ میں دو تین یوم کے بعد واپس رنگون جانیوالا ہوں حضور سے درخواست ہے کہ میرے حق میں دُعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ:

انشاء اللہ تعالیٰ دعا کروں گا۔ دنیا ایسے ہی تفرقہ کی جگہ ہے۔ ہمیشہ موت کو یاد رکھو چند روز زندگی ہے اس پر نازاں نہ ہونا چاہیئے۔ جو راستی پر ہو اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والا ہو تو خدا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔[1]

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۲۹۸ مورخہ ۹؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۴؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء[2]

(بوقت ظہر)

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام ظہر کی نماز ادا کر کے تشریف لے جا رہے تھے کہ سیٹھ احمد دین صاحب آمدہ از جہلم نے عرض کی کہ گذشتہ ایام میں ایک شخص بیعت کر کے گیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ میری علمی

---

[1] البدر میں مزید یہ فقرہ ہے۔ "اور تمام کام تمہارے اس کی مرضی کے موافق ہوں۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۲۹۸ بابت ۹؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

[2] یہ ڈائری بعینہٖ انہی الفاظ میں الحکم جلد ۷ نمبر ۳۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷؍ اکتوبر میں یکم اکتوبر کی لکھی ہے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ "الحکم" کو غلطی لگی ہے کیونکہ "البدر" نے لکھا ہے کہ یکم اکتوبر کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بوجہ علالتِ طبع تشریف نہیں لائے۔ واللہ اعلم بالصواب (مرتب)

معلومات بہت کم ہیں اور مجھے آپ کے دعاوی کے دلائل اب تک معلوم نہیں ہوئے اس لیے میرے لیے دعا فرمائی جاوے۔ اس پر آپ نے سیٹھ صاحب کو مختصراً دلائل اپنے دعاوی پر سنائے کہ اس شخص کو سمجھا دیئے جائیں۔ اور نیز یہ بھی فرمایا کہ:۔

خدائی کے مستحق اگر ہو سکتے تھے تو ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے تھے۔ کیونکہ آپ کا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ حالانکہ عیسیٰؑ کے اَور بھائی اور بہن تھے۔ ان کمبخت عیسائیوں کو اتنا خیال نہیں آتا کہ عیسیٰؑ کے پانچ بھائی اور دو بہنیں تھیں جو کہ مریم کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھیں۔ پس کیا وجہ ہے کہ مریم کو خداؤں کی ماں اور مسیح کے بھائیوں کو خدا نہ کہا جاوے۔

مرکز میں آکر پختگی حاصل کریں

ہمیں بہت افسوس ہے کہ بعض لوگ کچے آتے ہیں اور کچے ہی چلے جاتے ہیں حالانکہ یہ ان کا فرض ہے کہ یہاں آکر چند روز رہیں اور اپنے شبہات پیش کر کے پختگی حاصل کریں۔ پھر اُن سے دُوسرے مخالف اور عیسائی ایسے بھاگیں گے جیسے لاحول سے شیطان بھاگتا ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ کس طرح شیطان کے بہکانے میں آجاتے ہیں مگر یہ سب ایمان کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔ بھلا مومن کیا اور شیطان کا بہکانا کیا۔ معلوم ہوتا ہے جو بہکتا ہے وہ خود شیطان ہے۔ ورنہ سوچ کر دیکھا جاوے کہ اب ہمارے مخالفوں کے ہاتھ میں کیا رہ گیا ہے۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ جو کچھ رطب ویابس اُن کے ہاتھ میں ہے وہ ایک ایک حرف پورا ہو۔ حالانکہ نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ یہودیوں کی احادیث اس قدر تھیں کہ وہ نہ حضرت عیسیٰ پر حرف بحرف پوری ہوئیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اور اسی لیے بہتوں نے ٹھوکر کھائی مگر بعض یہودی جو مسلمان ہوگئے تو اس کی یہ وجہ تھی کہ جس قدر حصہ ان احادیث کا پورا ہوگیا انہوں نے اس کو سچا مان لیا اور جو نہ پورا ہوا۔ اس کو رطب و یابس جان کر چھوڑ دیا یا اُن کے اَور معنے کر لئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پھر اُن کو اسلام نصیب نہ ہوتا اور پھر اس کے علاوہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار وبرکات بھی دیکھے۔ ہر ایک قوم کے پاس کچھ سچی کچھ جھوٹی، کچھ صحیح اور کچھ غلط روایات ہوتی ہیں۔ اگر انسان اسی بات پر اَڑ جائے کہ سب کی سب پوری ہوں تو اس طرح سے کوئی شخص مان نہیں سکتا۔ حَکَم کے یہی معنے ہیں ان میں سے سچّی اور جھوٹی کو الگ کر کے دکھا دیوے۔

ہر ایک جو بیعت کرتا ہے اسے واجب ہے کہ ہمارے دعویٰ کو خوب سمجھ لیوے ورنہ اُسے گناہ ہوگا۔

☆ ☆ ☆

دربارِ شام[1]

موت سے بڑھکر کون ناصح ہوسکتا ہے؟

موت اور اس کی تلخیوں کا ذکر چل پڑا۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا:۔

انسان[2] ان موتوں سے عبرت نہیں پکڑتا حالانکہ اس سے بڑھ کر اَور کون ناصح ہوسکتا ہے جسقدر انسان مختلف بلاد اور ممالک میں مرتے ہیں۔ اگر یہ سب جمع ہوکر ایک دروازہ سے نکلیں تو کیا عبرت کا نظارہ ہو۔

پھر مختلف امراض اس قسم کے ہیں کہ ان میں انسان کی پیش نہیں جاتی۔ ایک دفعہ ایک شخص میرے پاس آیا اس نے بیان کیا کہ میرے پیٹ میں رسولی پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ دن بدن بڑھ کر پاخانہ کے راستہ کو بند کرتی جاتی ہے۔ جس ڈاکٹر کے پاس مَیں گیا ہوں وہ یہی کہتا ہے کہ اگر یہ مرض ہمیں ہوتی تو ہم بندوق مار کر خودکشی کر لیتے۔ آخر وہ بیچارہ اسی مرض سے مر گیا۔

بعض لوگ ایسے مسلول ہوتے ہیں کہ ایک ایک پیالہ پیپ کا اندر سے نکلتا ہے۔ ایک دفعہ ایک مریض آیا۔ اس کی یہی حالت تھی۔ صرف اس کا پوست ہی رہ گیا تھا۔ اور وہ سمجھدار بھی تھا مگر تاہم وہ یہی خیال کرتا تھا کہ مَیں زندہ رہوں گا۔

انسان کی سخت دلی اصل میں اُمیدوں پر ہوتی ہے۔ لیکن انبیاء کی یہ حالت نہیں ہوتی جسقدر انبیاء ہوئے ہیں سب کی یہ حالت رہی ہے کہ اگر شام ہوئی ہے تو صبح کو ان کی اُمید نہیں کہ ہم زندہ رہیں گے اور اگر صبح ہوئی ہے تو شام کی اُمید نہیں کہ ہم زندہ رہیں گے۔ جب تک انسان کا یہ خیال نہ ہو کہ مَیں ایک مرنے والا ہوں تب تک وہ غیر اللہ سے دل لگانا چھوڑ نہیں سکتا اور آخر اس قسم کے افکار میں جان دیتا ہے۔ مرنے کے

---

[1] "الحکم" نے ڈائری پر ۳؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء کی تاریخ لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ "البدر" نے یکم تا ۳؍ اکتوبر کے متعلق مندرجہ ذیل نوٹ شائع کیا ہے:۔

"یکم اکتوبر ۱۹۰۳ء کو حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام مغرب و عشاء کی نماز باجماعت میں شامل نہیں ہوئے۔ نصیب اعداء آپ کی طبیعت بیمار تھی۔ ۲؍ - ۳؍ اکتوبر کو کوئی ذکر قابلِ ابلاغ ناظرین نہیں ہوا۔ ۳؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو پھر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام بوجہ علالتِ طبع شامل جماعت مغرب وعشاء نہ ہوسکے۔"

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۲۹۸ مورخہ ۹؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء) مرتب)

[2] الحکم میں اس سے پہلے یہ عبارت بھی ہے:۔ "قاعدہ کی بات ہے کہ انسان کو جو چیز مضر ہوتی ہے ایک دو بار کے تجربہ اور مشاہدہ کے بعد اس کو چھوڑ دیتا ہے لیکن ہر روز موت کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ جنازے نکلتے ہیں مگر ان موتوں سے یہ عبرت حاصل نہیں کرتا۔" (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۸ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

وقت کا کسی کو کیا علم ہوتا ہے۔ موت تو ناگہانی آجاتی ہے۔ اگر کوئی غور کرے تو اُسے معلوم ہو کہ یہ دنیا اور اس کے مال و متاع اور حظّ سب فانی اور جھوٹے ہیں۔ آخر کار وہ یہاں سے تہیدست جاوے گا اور اصل مطلوب جس سے وہ خوش رہ سکتا ہے وہ خدا سے دل لگانا ہے اور گناہ کی دلیری سے آزاد رہنا۔ کہنے کو یہ آسان ہے اور ہر ایک زبان سے کہہ سکتا ہے کہ میرا دل خدا سے لگا ہوا ہے مگر اس کا کرنا مشکل ہے۔ ایک دوکاندار کو دیکھو کہ وہ وزن تو کم تولتا ہے مگر زبان سے صوفیانہ کافیاں ایسی گاتا جاوے گا کہ دوسرے کو معلوم ہو کہ یہ بڑا خدا رسیدہ ہے۔ ایسی حالت میں لفظ اور باتیں تو زبان سے نکلتی ہیں مگر دل اُس کی تکذیب کرتا ہے۔ سجادہ نشینوں کو ایسے قصّے یاد ہوتے ہیں کہ دوسرا انسان سُن کر گرویدہ ہو جاتا ہے حالانکہ خود ان کا عمل درآمد اُن پر مطلق نہیں ہوتا۔ مگر تاہم ایسے انسان بھی ہوتے ہیں کہ وہ بات کو سمجھ لیتے ہیں اور اس دنیا اور مافیہا کا چھوڑنا ان پر آسان ہوتا ہے۔ جیسے کہ ابراہیم ادہم وغیرہ بادشاہ ہوئے ہیں کہ انہوں نے سلطنت کو ترک کر دیا۔ جب خوفِ الٰہی اُن کے قلب پر غالب ہوا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب دنیا اور یہ خوف ایک جا جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لیے دنیا کو چھوڑ دیا۔

جب ایک شخص ایک ناپائدار لذّت میں مصروف ہو تو جب اسے چھوڑیگا۔ اسی قدر اُسے رنج ہوگا۔ دنیا سے دل لگانے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور آئندہ نیکی کی مناسبت اس سے نہیں رہتی۔ مسلمانوں میں اگرچہ فاسق فاجر بادشاہ بھی گذرے ہیں مگر ایسے بھی بہت ہیں کہ انہوں نے پاکبازی اور راستی اختیار کی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۲۹۸ - ۲۹۹ مورخہ ۹ر اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۵ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

ایک عیسائی سے گفتگو

وہ تمام اخبارات جو کہ ردِّ نصاریٰ کے بارے میں یورپ اور امریکہ سے آئے تھے پڑھے جانے کے بعد میاں گل محمد[1] صاحب نے حضرت اقدسؑ کو اپنی طرف مخاطب کیا اور کہا کہ مَیں آپ کے کہنے کے مطابق آیا ہوں۔

حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ

ہم نے تو آپ کو بذریعہ تار اور خط کے منع کر دیا تھا کہ آپ نہ آویں۔ علالتِ طبع اور ایک ضروری کام میں معروفیت کی وجہ سے فرصت نہیں۔ اب آپ آگئے ہیں تو مجھے آپ کے آنے کی خوشی ہے اور مَیں چاہتا ہوں کہ کوئی تحقیق کے

---

[1] عیسائی (مرتّب)

واسطے میرے پاس آوے۔ زمانہ دن بدن راستی اختیار کرتا جاتا ہے۔ عیسائی مذہب کی تردید اور کسرِ صلیب کیلئے جو کچھ مجھے خدا نے عطا کیا ہے اس کو تبلانے کو مَیں ہر وقت تیار ہوں، لیکن دوسرے موقعہ پر جب آپ آوینگے تو جیسے آپ کا حق ہوگا کہ سوال کریں ویسا ہی میرا حق ہوگا کہ ایک سوال کروں اور وہ سوال صرف مسیح کی الوہیت تثلیث اور چال چلن کی نسبت ہوگا۔ لیکن جیسے مَیں نے اس سوال کو مشخص کر دیا ہے ویسے ہی آپ کو لازم ہے کہ آپ بھی اپنے سوال کو مشخص کر دیویں کہ تیاری کا موقعہ مِل جاوے۔

گل محمد صاحب:۔ ہاں آپ بھی ایک سوال کریں جیسے مجھے تلاشِ حق کی ضرورت ہے ویسے ہی آپ پر ضروری ہے کہ آپ اظہارِ حق کریں۔

حضرت اقدس:۔ یہ آپ سچ کہتے ہیں مگر میرے اظہارِ حق کی شہادت تو یورپ اور امریکہ دے رہا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے اخبارات پڑھے گئے ہیں۔

گل محمد صاحب:۔ لیکن ایک بات ضروری ہے کہ اگر مَیں دوسرے موقعہ پر آؤں اور آپ کو پھر فرصت نہ ہو تو چونکہ مَیں ایک غریب آدمی ہوں اس لیے آمد و رفت کا خرچہ آپ پر ہوگا۔

حضرت اقدس:۔ اگر غریب ہو تو آمد و رفت کا کرایہ ہم دیدیا کریں گے اگر ہم اس طرح بوجہ نہ ہونے فرصت کے سو دفعہ واپس کریں گے تو سو دفعہ کرایہ دیں گے۔

میاں گل محمد صاحب نے کرایہ اس دفعہ کا طلب کیا اور اسی وقت ان کی غربت کا خیال کرکے ان کی درخواست پر تین روپے ان کو دے دیئے گئے۔ ان باتوں پر بعض احباب میں چرچا ہوا تو میاں گل محمد صاحب نے حضرت اقدس کو مخاطب ہو کر کہا۔

گل محمد صاحب:۔ آپ تو تمسخر کرتے ہیں۔

حضرت اقدس:۔ یہ یاد رکھئے۔ ہمارے کام محض لِلّٰہ ہیں۔ یہاں تمسخر اور مذاق نہیں ہے۔ ہم تو ہر ایک بار اپنے اوپر ڈالتے ہیں۔ اگر تمسخر ہوتا تو یہ زیر باری کیوں اختیار کرتے اور تین روپیہ آپ کو دے دیتے بلکہ تلاشِ حق کے لیے تو کوئی لنڈن سے بھی چل کر آوے۔ تو ہم اس کا کرایہ دینے کو تیار ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۹ صفحہ ۳۰۵ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

---

۶ راکتوبر ۱۹۰۳ء

آج کے دن میاں گُل محمد صاحب نے پھر ایک حجت کھڑی کی اور حضرت اقدس کی تحریر لینے کی

کوشش کی تاکہ لاہور میں وہ پیش کر سکیں۔ چونکہ حضرت اقدس کتاب تذکرۃ الشہادتین کی تصنیف میں مصروف تھے اور آپ کو بالکل فرصت نہ تھی آپ نے مفتی محمد صادق صاحب کو جنہوں نے میاں گُل محمد صاحب سے ملاقات اور گفتگو میں کافی انٹرسٹ لیا تھا فرمایا کہ وہ جواب دیویں مگر میاں گُل محمد صاحب کس کی مانتے تھے۔ آخر اُن کے بڑے اصرار سے حضرت اقدس نے پھر اُن کو ایک تحریر دی جس کی نقل ہم ذیل میں کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

نقل رقعہ منجانب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

بشرط خیر و عافیت اور نہ پیش آنے کسی مجبوری کے میری طرف سے یہ وعدہ ہے کہ اگر ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء کے بعد میاں گُل محمد صاحب اس بات کی مجھے اطلاع دیں کہ وہ قادیان میں آنے کیلئے تیار ہیں تو مَیں اُن کو بُلا لوں گا تا جو سوال کرنا ہو وہ کریں۔ سوال صرف ایک ہوگا اور فریقین کے لیے جواب اور جواب الجواب دینے کے لیے چار دن کی مہلت ہوگی اور انہی چار دنوں کے اندر میرا بھی حق ہوگا کہ یسوع مسیح اور اُس کی خدائی کی نسبت یا انجیل اور توریت کے تناقض کی نسبت جو عیسائیوں کے موجودہ عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے، کوئی سوال کروں۔ ایسا ہی ان کا حق ہوگا کہ وہ جواب دیں۔ پھر میرا حق ہوگا کہ جواب الجواب دوں۔ اور یہ امر ضروری ہوگا کہ میاں گُل محمد صاحب قادیان سے جانے سے پہلے مجھے اطلاع دیں کہ وہ اسلام یا قرآن شریف پر کیا اعتراض کرنا چاہتے ہیں تا ہم بھی دیکھیں کہ واقعی وہ اعتراض ایسا ہے کہ یسوع مسیح کی انجیل یا اس کے چال چلن یا اس کے نشانوں پر وارد نہیں ہوتا۔ گو مجھے بہت افسوس ہے کہ ایسے لوگوں کو مخاطب کروں کہ اب بھی اور اس زمانہ میں اُس شخص کو جس کے انسانی ضعف اُس کی اصل حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ خدا کر کے مانتے ہیں۔ مگر ہمارا فرض ہے کہ ذلیل سے ذلیل مذہب والوں کو بھی ان کے چیلنج کے وقت ردّ نہ کریں اس لیے ہم ردّ نہیں کرتے۔ بالآخر یہ ضروری ہے کہ وہ اپنا صحیح اور پورا پتہ لکھ کر مجھے دیں تا میرے جواب کے پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آوے یعنی لاہور میں کہاں اور کس محلہ میں رہتے ہیں اور پورا پتہ کیا ہے مکرّر یہ کہ آپ کے اطمینان کے لیے جیسا کہ رات کو آپ نے تقاضا کیا تھا مَیں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ میرے لکھنے پر قادیان میں آویں اور میری کسی مجبوری سے بغیر مباحثہ کے واپس جاویں تو مَیں دو طرفہ آپ کو لاہور کا کرایہ دوں گا اور جو رات کو آپ کو مبلغ تین روپے دیئے گئے ہیں۔ اس میں آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ کسی حرجہ کی رُو سے آپ کا یہ حق تھا کیونکہ جس حالت میں ہم نے اپنی گرہ سے خرچ اُٹھا کر آپ کو روکنے کے لیے لاہور میں تار بھیج دیا تھا اور تین خط بھی بھیجے پھر اس صورت میں آپ کا یہ نقصان آپ کے ذمہ تھا مگر مَیں نے محض مذہبی مروّت کے طور پر آپ کو تین روپے دیئے ورنہ کچھ آپ کا حق نہ تھا۔ ایسا ہی اس وقت تک کہ آپ کی

نیت میں کوئی صریح تعصب مشاہدہ نہ کروں ایسا ہی ہر ایک دفعہ بغیر آپ کے کسی حق کے کرایہ دے سکتا ہوں محض ایک نادار خیال کرکے نہ کسی اَور وجہ سے۔

الراقم خاکسار میرزا غلام احمد

۶ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

یہ رقعہ لے کر پھر بھی میاں گُل محمد کو قرار نہ آیا اور جبکہ ظہر کے وقت حضرت اقدس تشریف لائے تو کہنے لگے جو الفاظ میں ایزاد کرانا چاہتا ہوں وہ کر دو مگر خدا کے مسیح نے اسے مناسب نہ جانا اور آخر میاں گُل محمد صاحب رخصت ہوئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۹ صفحہ ۳۰۵، ۳۰۶ مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۱۴ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

دُنیا کی تلخیاں

حضرت اقدس نے شام کے وقت ایک مختصر تقریر دُنیا کی تلخیوں پر فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعجب ہے کہ انسان اس (دُنیا) میں راحت اور آرام طلب کرتا ہے حالانکہ اس میں بڑی بڑی تلخیاں ہیں۔ خویش و اقارب کو ترک کرنا۔ دوستوں کا جُدا ہونا۔ ہر ایک محبوب سے کنارہ کشی کرنا۔ البتہ آرام کی صورت یہی ہے کہ خدا تعالےٰ کے ساتھ دل لگایا جاوے جیسے کہا ہے کہ

جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

انسان ایک لحظہ میں خوشی کرتا ہے تو دوسرے لحظہ میں اسے رنج ہوتا ہے لیکن اگر رنج نہ ہو تو پھر خوشی کا مزا نہیں آتا جیسے کہ پانی کا مزا اسی وقت آتا ہے جبکہ پیاس کا درد محسوس ہو اس لیے درد مقدم ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۹ صفحہ ۳۰۶ مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

دربارِ شام

شام کے وقت ایک صاحب نے ایک بیگم صاحبہ کا پیغام آکر دیا کہ وہ کہتی ہیں کہ اگر میرا فلاں فلاں کام

ہو جاوے تو میرا سب جان و مال آپ پر قربان ہے حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کی شرط نہ کرنی چاہیئے اور نہ خدا تعالیٰ رشوت چاہتا ہے ہم بھی دُعا کریں گے اور اُن کو بھی چاہیئے کہ عجز و انکسار سے اس کی بارگاہ میں دُعا کریں۔

قرآن شریف و حدیث کا مقام

حضرت اقدس نے قرآن شریف اور حدیث کے ذکر پر فرمایا کہ:

اگر صرف احادیث پر انحصار کیا جاوے اور قرآن شریف سے اس کی صحت نہ کی جاوے تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک انسان کے سر کو کاٹ دیا جاوے اور صرف بال ہاتھ میں رکھ لیے جاویں اور کہا جاوے کہ یہی انسان ہے۔ حالانکہ بال کی زینت اور خوبی اسی وقت ہے جبکہ انسان کے ساتھ ہوں۔ ایسے ہی حدیث اسی وقت کوئی شئے اور قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے جبکہ قرآن شریف اس کے ساتھ ہو۔ احادیث کے اُوپر نہ تو خدا کی مُہر ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور قرآن شریف کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ (الحجر:۱۰) اسی لیے ہمارا یہ مذہب ہے کہ قرآن شریف سے معارض نہ ہونے کی حالت میں ضعیف سے ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا جاوے لیکن اگر کوئی قصہ جو کہ قرآن شریف میں مذکور ہے اور حدیث میں اس کے خلاف پایا جاوے مثلاً قرآن میں لکھا ہے کہ اسحاقؑ ابراہیمؑ کے بیٹے تھے اور حدیث میں لکھا ہو کہ وہ نہیں تھے تو ایسی صورت میں حدیث پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے۔ مسیح موعود کی نسبت ان کا یہ خیال کہ وہ اسرائیلی مسیح ہوگا بالکل غلط ہے۔ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے کہ وہ تم میں سے ہوگا جیسا سورۃ نُور میں ہے وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ (النور:۵۶) پھر بخاری میں بھی منکم ہی ہے پھر مسلم میں بھی مِنۡکُمۡ ہی صاف لکھا ہے۔ ان کمبختوں کو اس قدر خیال نہیں آتا کہ اگر اسی مسیح نے پھر آنا تھا تو مِنۡکُمۡ کی بجائے مِنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لکھا ہوتا۔ اب قرآن شریف اور احادیث تو پکار پکار کر منکم کہہ رہے ہیں مگر ان لوگوں کا دعویٰ مِنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کا ہے سوچ کر دیکھو کہ قرآن کو چھوڑیں یا ان کو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۹ صفحہ ۳۰۶ مورخہ ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۱۸؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء

دُعا اور صبر و رضا کے مقامات

اس سے بڑھ کر انسان کے لیے فخر نہیں کہ وہ خدا کا ہو کر رہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں وہ اُن سے مساوات بنا لیتا ہے۔

کبھی ان کی مانتا ہے اور کبھی اپنی منواتا ہے ایک طرف فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) دوسری طرف فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (البقرۃ: ۱۵۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مقام دُعا کا نہیں ہوتا۔ نَبْلُوَنَّکُمْ کے موقعہ پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (البقرۃ: ۱۵۷) کہنا پڑے گا۔ یہ مقام صبر اور رضا کے ہوتے ہیں لوگ ایسے موقعہ پر دھوکا کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دُعا کیوں قبول نہیں ہوتی ان کا خیال ہے کہ خدا ہماری مٹھی میں ہے جب چاہیں گے منوالیں گے۔ بھلا امام حسین علیہ السلام پر جو ابتلا آیا تو کیا انہوں نے دعا نہ مانگی ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر بچے فوت ہوئے تو کیا آپ نے دُعا نہ کی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ یہ مقام صبر اور رضا کے ہوتے ہیں۔

---

۱۹ / اکتوبر ۱۹۰۳ء

توبہ کی حقیقت

آریہ لوگ جو توبہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ پرمیشر صرف توبہ کرنے سے گناہ بخشتا ہے اور ان بداعمالیوں کے نتائج نہیں ملتے جو اس نے کئے اس لیے یہ انصاف سے بعید ہے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:-

ان لوگوں کو توبہ کی حقیقت کا علم نہیں۔ توبہ اس بات کا نام نہیں کہ صرف منہ سے توبہ کا لفظ کہہ دیا جاوے بلکہ حقیقی توبہ یہ ہے کہ نفس کی قربانی کی جاوے۔ جو شخص توبہ کرتا ہے وہ اپنے نفس پر انقلاب ڈالتا ہے گویا دوسرے لفظوں میں وہ مرجاتا ہے۔ خدا کے لیے جو تغیر عظیم انسان دُکھ اُٹھا کر کرتا ہے تو وہ اس کی گذشتہ بداعمالیوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ جس قدر ناجائز ذرائع معاش کے اس نے اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں ان کو وہ ترک کرتا ہے۔ عزیز دوستوں اور یاروں سے جُدا ہوتا ہے۔ برادری اور قوم کو اسے خدا کے واسطے ترک کرنا پڑتا ہے جب اس کا صدق کمال تک پہنچ جاتا ہے تو وہی ذات پاک تقاضا کرتی ہے کہ اس قدر قربانیاں جو اس نے کی ہیں وہ اس کے اعمال کے کفارہ کے لیے کافی ہوں۔

اہلِ اسلام میں اب صرف الفاظ پرستی رہ گئی ہے اور وہ انقلاب جسے خدا چاہتا ہے وہ بھول گئے ہیں اس لیے انہوں نے توبہ کو بھی الفاظ تک محدود کر دیا ہے، لیکن قرآن شریف کا منشا یہ ہے کہ نفس کی قربانی پیش کی جاوے۔ مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ (الاحزاب: ۲۴) دلالت کرتا ہے کہ وہ توبہ یہ ہے جو انہوں نے کی اور مَنْ یَّنْتَظِرُ بتلاتا ہے کہ وہ یہ توبہ ہے جو انہوں نے کر کے دکھلائی ہے اور وہ منتظر ہیں۔

جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف بکلّی آجاتا ہے اور نفس کی طرف کو بکلّی چھوڑ دیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کا

دوست ہو جاتا ہے تو کیا وہ پھر دوست کو دوزخ میں ڈال دیگا؟ نَحْنُ اَوْلِيَآءُ اللّٰہِ[1] سے ظاہر ہے کہ احباء کو دوزخ میں نہیں ڈالتے۔

۲۰؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء

ایک رؤیا شام کے وقت حضرت اقدس نے ذیل کی رؤیا بیان فرمائی کہ:۔
ایک بڑا تخت مربع شکل کا ہندوؤں کے درمیان بچھا ہوا ہے جس پر مَیں بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک ہندو کسی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ کرشن جی کہاں ہیں؟ جس سے سوال کیا گیا وہ میری طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ یہ ہے۔ پھر تمام ہندو روپیہ وغیرہ نذر کے طور پر دینے لگے۔ اتنے ہجوم میں سے ایک ہندو بولا

ہے کرشن جی رَوِدّر گوپال

(یہ ایک عرصہ دراز کی رؤیا ہے)

۲۱؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء

امامت نہ کرانے کی وجہ امامتِ نماز کی نسبت ایک شخص نے سوال کیا کہ حضور کس لیے نماز نہیں پڑھاتے؟ فرمایا کہ:۔
حدیث میں آیا ہے کہ مسیح جو آنے والا ہے وہ دوسروں کے پیچھے نماز پڑھے گا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۱ و ۴۲ صفحہ ۳۲۲ مورخہ ۲۹؍ اکتوبر و ۸؍ نومبر ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭

---

[1] ڈائری نویس یا کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے مضمون کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدۃ: ۱۹) سے استدلال فرمایا ہوگا کہ "احباء کو دوزخ میں نہیں ڈالتے۔" واللہ اعلم بالصواب (مرتب)

۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

ایک آسٹریلوی نومسلم کے استفسارات کے جوابات

ایک یورپین صاحب ..... ہمراہی میاں معراج الدین عمر و حکیم نور محمد صاحب احمدی .... عصر کے وقت قادیان پہنچ گئے جہاں قادیانی احمدی احباب نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ نمازِ مغرب میں وہ جماعت کے ساتھ شامل ہوئے ...... بعد ادائیگی نماز میاں معراج الدین صاحب عمر نے ان کو حضرت اقدس سے انٹروڈیوس کیا اور ان کے مزید حالات سے یُوں اطلاع دی کہ

یہ ایک صاحب ہیں جو کہ آسٹریلیا سے آئے ہیں۔ ۷ سال سے مشرّف باسلام ہیں اخبارات میں بھی آپ کا چرچا رہا ہے۔ آسٹریلیا سے یہ لنڈن گئے اور وہاں سفیرِ روم سے انہوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ اسلامی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ سفیرِ روم نے ان کو کہا کہ تم قاہرہ (دار السلطنت) مصر میں جاؤ مگر تاہم مشورہ کے طور پر لارڈ سٹینلے نے اُن کو مشورہ دیا کہ تمہارا یہ مدعا بمبئی میں حاصل ہوگا یہ وہاں پھرتے ہوئے کلکتہ آئے۔ راستہ میں ایک رؤیا دیکھی۔ اور اس جگہ سے لاہور آئے۔ جہاں کہ انہوں نے حضور کا تذکرہ سُنا۔ اب زیارت کے لیے یہاں حاضر ہوئے۔

اب ہم ذیل میں وہ گفتگو درج کرتے ہیں جو کہ نومسلم صاحب اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیان ہوئی۔ مشرّف باسلام ہو کر ان کا نام محمد عبدالحق رکھا گیا تھا۔

ذیل کی گفتگو جو کہ محمد عبدالحق صاحب اور حضرت اقدس کے مابین ہوئی۔ اس کے ترجمان خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے پلیڈر تھے۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ مَیں جہاں کہیں پھرتا رہا ہوں میرا واسطہ ایسے مسلمانوں سے رہا ہے جو یا تو خود انگریزی جانتے تھے اور بالمشافہ مجھ سے گفتگو کرتے تھے اور یا بذریعہ ترجمان کے ہم اپنے مطالب کا اظہار کرتے تھے مَیں نے ایک حد تک لوگوں کے خیالات سے فائدہ اُٹھایا اور بیرونی دنیا میں جو اہلِ اسلام ہیں انکے کیا حالات اور خیالات ہیں۔ اس کے تعارف کی آرزو رہی۔ رُوحانی طور سے جو میل جول ایک کو دوسرے سے ہوسکتا ہے اس کے لیے زباندانی کی ضرورت نہیں ہے اور اس رُوحانی تعلق سے انسان ایکدوسرے سے جلد مستفید ہوسکتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ ہمارے مذہبِ اسلام کے طریق کے موافق روحانی طریق صرف دعا اور توجہ ہے

لیکن اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے وقت چاہیئے کیونکہ جب تک ایک دوسرے کے تعلقات گاڑھے نہ ہوں اور دلی محبت کا رشتہ قائم نہ ہو جائے تب تک اس کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ ہدایت کا طریق یہی دُعا اور توجہ ہے۔ ظاہری قیل و قال اور لفظوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ میری فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ رُوحانی اتحاد کو پسند کرتی ہے میں اسی کا پیاسا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس سے بھر جاؤں۔ جس وقت سے میں قادیان میں داخل ہوا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرا دل تسلی پا گیا ہے اور اب تک جس جس سے میری ملاقات ہوئی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے میرا دیرینہ تعارف ہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام:۔ خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت ہے کہ ہر ایک رُوح ایک قالب کو چاہتی ہے جب وہ قالب تیار ہوتا ہے تو اس میں نفخ رُوح خود بخود ہو جاتا ہے۔ آپ کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ جو حقیقت خدا تعالیٰ نے مجھ پر کھولی ہے اُس سے آہستہ آہستہ آگاہی پا لیویں۔ عام اہلِ اسلام میں جس قدر عقائد اشاعت پائے ہوئے ہیں اُن میں بہت سی غلطیاں ہیں اور یہ غلطیاں ان میں عیسائیوں کے میل جول سے آئی ہیں، لیکن اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسلام کا پاک اور منور چہرہ دنیا کو دکھلاوے رُوحانی ترقی کے لیے عقیدہ کی صفائی ضروری ہے۔ جس قدر عقیدہ صاف ہوگا اسی قدر ترقی ہوگی۔

دُعا اور توجہ کی ضرورت اس امر میں اس لیے ہوتی ہے کہ بعض لوگ غفلت کی وجہ سے محجوب ہوتے ہیں اور بعض کو تعصب کی وجہ سے حجاب حائل ہوتا ہے اور بعض اس لیے حجاب میں رہتے ہیں کہ اہلِ حق سے اُن کو ارادت نہیں ہوتی مگر جب تک خدا دستگیری نہ کرے یہ حجاب دُور نہیں ہوتے۔ پس اس لیے توجہ اور دعا کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ حجاب دُور ہوں۔ جب سے یہ سلسلہ نبوت کا قائم ہے تب سے یہ اسی طرح چلا آتا ہے کہ ظاہری قیل و قال اس میں کچھ نہیں بناتی ہمیشہ توجہ اور دُعا سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

دیکھو ایک زمانہ وہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا تھے مگر لوگ حقیقی تقویٰ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے حالانکہ اب اس وقت لاکھوں مولوی اور واعظ موجود ہیں۔ لیکن چونکہ دیانت نہیں، وہ رُوحانیت نہیں اس لیے وہ اثر اندازی بھی اُن کے اندر نہیں ہے۔ انسان کے اندر جو زہریلا مواد ہوتا ہے وہ ظاہری قیل و قال سے دُور نہیں ہوتا۔ اس کے لیے صحبتِ صالحین اور ان کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے فیضیاب ہونے کے لیے اُن کے ہم رنگ ہونا اور جو عقائدِ صحیحہ خدا نے اُن کو سمجھائے ہیں ان کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ جب آپ کو اس بات کا علم ہو جاوے گا کہ فلاں فلاں عقائد ہیں جن میں عام اہلِ اسلام کا اور ہمارا اختلاف ہے تو پھر آپ کی طاقت (اثر اندازی) بڑھ جاوے گی اور آپ اس رُوحانیت سے مستفید ہوں گے جس کی

تلاش میں آپ ہیں۔

محمد عبد الحق صاحب :۔ مجھے ہمیشہ اس امر کی تلاش رہی ہے کہ روحانی اتحاد اور اُنس کسی سے حاصل ہو اور اسی لیے مَیں جہاں کہیں پھرتا رہا ہوں ہمیشہ قدرتی نظاروں سے بطور تفاؤل سبق حاصل کرتا رہا ہوں۔ اسی طرح آج مَیں دیکھتا ہوں کہ میرا آنا اور نئے چاند کا پیدا ہونا (آج شعبان کا چاند نظر آیا تھا) ایک ساتھ ہے۔ چاند کے ابتدائی دن چونکہ ترقی اور حصولِ کمال کے ہوتے ہیں جیسے جیسے یہ ترقی کریگا اور کمال کو پہنچے گا ویسے ہی مَیں بھی ترقی اور کمال کو پہنچوں گا (بشرطیکہ قادیان میں مستقل قیام رہا) میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مَیں آج ہی ایسے موقعہ پر یہاں وارد ہوں گا جبکہ نئے چاند کا ظہور ہوگا۔ کلکتہ میں جو خط بعض لوگوں نے مجھے دیئے اگر مَیں اُن پر عملدرآمد کرتا تو کہیں کا کہیں ہوتا مگر یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کی تلاش میں مَیں ہوں وہ لوگ یہی ہیں۔ رنگون میں مَیں نے آپ کے حالات سُنے اور چند ایک تصانیف بھی دیکھی تھیں۔ مگر مجھے آپ کا پتہ معلوم نہ ہوا اور نہ یہ اُمید تھی کہ اس قدر جلد مَیں یہاں پہنچ جاؤں گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام :۔ ان باتوں سے فراست تو گواہی دیتی ہے کہ آپ ہماری شرائط کے موافق ہونگے اور خدا چاہے تو آخر بھی قبول کر سکیں گے۔ لیکن یاد رکھو کہ سنّت اللہ یوں ہے کہ دو باتیں اگر ہوں تو انسان حصولِ فیض میں کامیاب ہوتا ہے ایک یہ کہ وقت خرچ کرکے صحبت میں رہے اور اس کے کلام کو سُنتا رہے اور اثنائے تقریر یا تحریر میں اگر کوئی شبہ یا دغدغہ پیدا ہو تو اُسے مخفی نہ رکھے بلکہ انشراحِ صدر سے اسی وقت ظاہر کرے تاکہ اسی آن میں تدارک کیا جاوے اور وہ کانٹا جو دل میں چُبھا ہے نکالا جاوے تاکہ وہ اس کے ساتھ روحانی توجہ سے استفادہ حاصل کر سکے۔

ایک بات یہ کہ صبر سے صُحبت میں رہے اور ہر ایک بات توجہ سے سُنے اور شبہ کو مخفی نہ رکھے کیونکہ شبہ مہلک اثر رکھتا ہے جو کہ اندر ہی اندر سرایت کرکے ہلاک کر دیتا ہے اور اکثر آدمی اس سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب آسمان سے ایک نیا انتظام ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی مامور آتا ہے اور چونکہ اس کا فعل یہی ہوتا ہے کہ ہر ایک فرقہ کی غلطی نکالے اس لیے سب لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں اور ہر طرح سے اذیت اور تکلیف دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو جب کوئی اس کے سلسلہ میں داخل ہوتا ہے تو اُسے بھی یہ تمام دُکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ دشمنوں کے خطرناک حملے اس پر بھی ہوتے ہیں۔ ہر ایک دوست اور اپنا بیگانہ دشمن ہو جاتا ہے اور جس جس پر اسے اُمید ہوتی ہے وہ تمام خاک میں ملتی ہے۔ ناامیدی اور مایوسی کی سخت دشوار گذار راہ میں داخل ہونا پڑتا ہے جس قدر امیدیں عزت اور آبرو اور جاہ اور منزلت کے

---

[1] (البدر جلد ۲ نمبر ۴۰ صفحہ ۳۱۸ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

حصول کی لوگوں سے اس نے باندھی ہوتی ہیں۔ان سب پر پانی پھر جاتا ہے جیسا کہ دنیا کی یہ قدیمی سنت چلی آئی ہے ان تمام نا امیدیوں اور مایوسیوں کے لیے تیار رہنا اور ان کا برداشت کرنا ضروری ہے۔ انسان اگر شیر دل ہو کر ان کا مقابلہ کرے تو ٹھہر سکتا ہے ورنہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ شوق سے اس میدان میں داخل ہوتے ہیں مگر جب یہ تمام بوجھ ان پر پڑتے ہیں تو آخر کار دُنیا کی طرف جُھک جاتے ہیں۔ان کا قلب اس نقصان کو جو دنیا اور اُس کے اہل سے پہنچتا ہے برداشت نہیں کر سکتا۔اس لیے اُن کا انجام اُن کے اول سے بھی بدتر ہوتا ہے تو یہ امر ضروری ہے کہ دنیا کا لعن طعن برداشت کر کے اور ہر طرح سے نا امیدیوں کے لیے تیار ہو کر اگر داخلِ سلسلہ ہو تو حق کو جلد پاوے گا اور جو کچھ اُسے ابتدا میں چھوڑنا پڑیگا وہ سب آخر کار اللہ تعالیٰ اُسے دیدے گا۔ایک تخم جس کے لیے مقدر ہے کہ وہ پھل لاوے اور بڑا درخت بنے ضرور ہے کہ اول چند دن مٹی کے نیچے دبا رہے تب وہ درخت بن سکے گا۔اس لیے صبر ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو گرا دے پھر قدرتِ الٰہی اُسے اُٹھاوے جس سے اس کا نشوونما ہو۔مسٹر ویب پہلی دفعہ اسی طرح ہماری طرف جُھکے مگر پیچھے وہ قائم نہ رہ سکے اب وہ تمام باتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ بذریعہ خط و کتابت مسٹر ویب سے میری ملاقات ہے اور مَیں ان کو اُس وقت سے جانتا ہوں جبکہ وہ ہندوستان میں آئے اور ان کے حالات سے خوب واقف ہوں اور جو شرائط اپنے سلسلہ میں داخل ہونے کے آپ نے بیان کئے ہیں مَیں انہی کو اسلام کی شرائط خیال کرتا ہوں جو مسلمان ہوگا اس کے لیے ان تمام باتوں کا نشانہ ہونا ضروری ہے آپ کے ساتھ ملنے سے جو نقصانات مجھ کو ہو سکتے ہیں اکثر مسلمان لوگوں نے اوّل ہی سے مجھے اُن کی اطلاع دی ہے اور باوجود اس اطلاع اور علم کے میں یہاں آیا ہوں۔

حضرت اقدس علیہ السلام:۔ ہمارے اُصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم ایک سادہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ تمام تکلفات جو کہ آج کل یورپ نے لوازمِ زندگی بنا رکھے ہیں اُن سے ہماری مجلس پاک ہے رسم و عادت کے ہم پابند نہیں ہیں۔اس حد تک ہر ایک عادت کی رعایت رکھتے ہیں کہ جس کے ترک سے کسی تکلیف یا معصیت کا اندیشہ ہو۔باقی کھانے پینے اور نشست و برخاست میں ہم سادہ زندگی کو پسند کرتے ہیں۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ جب سے مَیں اسلام میں داخل ہوا ہوں اور رُوحانیت سے حصہ لیا ہے مَیں سادگی سے محبت کرتا ہوں اسی لیے اگر یہاں رہوں تو مجھے تکلیف نہ ہوگی۔ دنیا میں مَیں نے جسقدر سفر کیا ہے اس سے مجھے تجربہ ہوا ہے کہ سادہ زندگی والا اور گوشہ نشین انسان بہت آرام سے زندگی بسر کرتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۱ - ۴۲ صفحہ ۳۲۴ - ۳۲۵ مورخہ ۲۹ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۰۳ء)

۲۳؍اکتوبر ۱۹۰۳ء

محمد عبدالحق صاحب کی طرف سے میاں معراج الدین صاحب عمر نے بیان کیا کہ آج یہ صاحب حضرت حکیم نورالدین صاحب سے قرآن کریم کے کچھ معانی سنتے رہے ہیں اور ان کو سُن کر ان کی یہ رائے قرار پائی ہے کہ اس قسم کے ترجمہ کی بڑی ضرورت ہے اکثر لوگوں نے دوسرے ترجموں سے دھوکا کھایا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ حضور کی طرف سے ایک ترجمہ شائع ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ میرا خود بھی یہ ارادہ ہے کہ ایک ترجمہ قرآن شریف کا ہمارے سلسلہ کی طرف سے نکلے۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ اس کی ضرورت یورپین لوگوں میں مجھ سے زیادہ کوئی اور محسوس نہیں کر سکتا۔ سب آدمی میری طرح متلاشی حق ہیں اور حق کو بہت جدوجہد سے دریافت کرنے کے بعد پھر اُن غلط ترجموں کے ذریعہ سے ضلالت کی طرف جانا پڑتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ صرف قرآن کا ترجمہ اصل میں مفید نہیں جب تک اس کے ساتھ تفسیر نہ ہو مثلاً غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ (الفاتحۃ:۷) کی نسبت کسی کو کیا سمجھ آسکتا ہے کہ اس سے مراد یہود نصاریٰ ہیں جب تک کہ کھول کر نہ بتلایا جاوے اور پھر یہ دُعا مسلمانوں کو کیوں سکھلائی گئی۔ اس کا یہی منشا تھا کہ جیسے یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کر کے خدا کا غضب کمایا ایسے ہی آخری زمانہ میں اس اُمّت نے بھی مسیح موعود کا انکار کر کے خدا کا غضب کمانا تھا۔ اسی لیے اوّل ہی ان کو بطور پیشگوئی کے اطلاع دی گئی کہ سعید رُوحیں اس وقت غضب سے بچ سکیں۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ مَا قَتَلُوۡہُ وَ مَا صَلَبُوۡہُ وَ لٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ (النساء:۱۵۸) کی نسبت بیان کیا کہ

عوام اہلِ اسلام اور بعض تفاسیر میں اس کی نسبت لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ایک اور آدمی مسیح کی شکل کا بن گیا اُسے پھانسی دی گئی اور مسیح آسمان پر چلا گیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ عام محاورہ زبان میں اگر یہ کہا جاوے کہ فلاں مصلوب ہوا یا پھانسی دیا گیا تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ صلیب پر اس کی جان نکل گئی۔ اگر کوئی مجرم پھانسی پر لٹکایا جاوے مگر اس کی جان نہ نکلے۔ اور زندہ اُتار لیا جاوے تو کیا اس کی نسبت پھانسی دیا گیا یا مصلوب کا لفظ بولا جاوے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کی نسبت یہ الفاظ بولنے ہی جرم ہوں گے۔ مصلوب اُسے کہتے ہیں

کہ جس کی جان صلیب پر نکل جاوے اور جس کی جان نہ نکلے اسے مصلوب نہیں کہتے خواہ وہ صلیب پر چڑھا کر اتار دیا گیا ہو۔ یہودی زندہ موجود ہیں ان سے دریافت کر لو کہ آیا مصلوب کے یہ معنے ہیں جو ہم کرتے ہیں یا وہ جو ہمارے مخالف کرتے ہیں پھر محاورہ زبان کو بھی دیکھنا چاہیئے مَا صَلَبُوْہُ کہا گیا تھا ہی مَا قَتَلُوْہُ رکھ دیا کہ بات سمجھ میں آجاوے کہ صلیب سے مراد جان لینی تھی جو کہ نہیں لی گئی اور صلیبی قتل وقوع میں نہیں آیا۔

شُبِّہَ لَھُمْ (النساء : ۱۵۸) کے معنے ہیں مشبّہ بالمصلوب ہو گیا اس میں لوگوں کا یہ قول کہ کوئی اَور آدمی مسیح کی شکل بن گیا تھا بالکل باطل ہے عقل بھی اسے قبول نہیں کرتی اور نہ کوئی روایت اس کے بارے میں صحیح موجود ہے۔ بھلا سوچ کر دیکھو کہ اگر کوئی اَور آدمی مسیح کی شکل بن گیا تھا تو وہ دو حال سے خالی نہ ہوگا یا تو مسیح کا دوست ہوگا یا اس کا دشمن۔ اگر دوست ہوگا تو یہ اعتراض ہے کہ جس لعنت سے خدا نے مسیح کو بچانا چاہا وہ اس کے دوست کو کیوں دی؟ اس سے خدا ظالم ٹھہرتا ہے اور اگر وہ دشمن تھا تو اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ مسیح کی جگہ پھانسی ملتا اس نے دوہائی دی ہو گی اور چلّایا ہوگا کہ میرے بیوی بچوں سے پوچھو میرا فلاں نام ہے اور مَیں مسیح نہیں ہوں۔ پھر اکثر موجودہ آدمیوں کی تعداد میں سے بھی ایک آدمی کم ہو گیا ہوگا۔ جس سے معاً پتہ لگ سکتا تھا کہ یہ شخص مسیح نہیں۔ غرضیکہ ہر طرح سے یہ خیال باطل ہے اور شُبِّہَ لَھُمْ (النساء : ۱۵۸) سے مراد مُشَبَّہ بِالْمَصْلُوْب ہے۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ یہ خیال یورپ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کرے گا کیونکہ وہاں لوگوں کو دھوکا دیا گیا ہے اور کچھ کا کچھ سمجھایا گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ عام لوگ جو بیان کرتے ہیں یہ منشا قرآنِ کریم کا ہرگز نہیں ہے اور اس سے لوگوں کو دھوکا لگا ہے۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ اسلام کے عقاید ہم تک عیسائیوں کے ذریعہ پہنچے ہیں اور اسلام کا اصل چہرہ دیکھنے کے واسطے مَیں باہر نکلا ہوں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ یہ خدا کا بڑا فضل ہے اور خوش قسمتی آپ کی ہے کہ آپ اِدھر آنکلے۔ یہ بات واقعی سچ ہے کہ جو مسلمان ہیں یہ قرآنِ شریف کو بالکل نہیں سمجھتے لیکن اب خدا کا ارادہ ہے کہ صحیح معنے قرآن کے ظاہر کرے خدا نے مجھے اسی لیے مامور کیا ہے اور مَیں اس کے الہام اور وحی سے قرآنِ شریف کو سمجھتا ہوں قرآنِ شریف کی ایسی تعلیم ہے کہ اس پر کوئی اعتراض نہیں آسکتا اور معقولات سے ایسی پُر ہے کہ ایک فلاسفر کو بھی اعتراض کا موقعہ نہیں ملتا مگر ان مسلمانوں نے قرآنِ کریم کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایسی ایسی باتیں بنا کر قرآنِ شریف کی طرف منسوب کرتے ہیں جس سے قدم قدم پر اعتراض وارد ہوتا ہے اور ایسے

دعاوی اپنی طرف سے کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں نہیں ہے اور وہ سراسر اس کے خلاف ہیں مثلاً اب یہی واقعہ صلیب کا دیکھو کہ اس میں کسقدر افتراء سے کام لیا گیا ہے اور قرآنِ کریم کی مخالفت کی گئی ہے اور یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بھی برخلاف ہے۔

اس کے بعد حضرت اقدس نے لفظ تَوَفّی کی نسبت سمجھایا کہ اس میں اہلِ اسلام نے کیا ٹھوکر کھائی ہے اور بتلایا کہ:

صرف مسیح کے واقعہ میں اس کے معنے اُٹھا لینے کے کرتے ہیں حالانکہ اسی قرآن میں اور جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اور لُغت اور دوسری کتبِ عربیہ سب جگہ اس کا ترجمہ موت کرتے ہیں۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ یہ ضروری کام ہے جو کہ آپ نے اختیار کیا ہے اور اس کی ضرورت نہ صرف اہلِ اسلام کو ہے بلکہ عیسائیوں کو بھی سخت ہے مجھے قادیان میں آنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سلسلہ بہت ہی مفید ہے اور ابتدا سے میری یہ خواہش ہے کہ اس قدر عظیم الشان کام کے واسطے جیسے کہ یہ ہے خدا تعالیٰ مجھے بھی ایک ہتھیار بنا دے اور اس میں سے مجھے بھی حصہ ملے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:۔ ہم ہمیشہ دُعا کرتے ہیں اور ہماری ہمیشہ سے یہ آرزو ہے کہ یورپین لوگوں میں سے کوئی ایسا نکلے جو اس سلسلہ کے لیے زندگی کا حصہ وقف کرے لیکن ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ کچھ عرصہ صحبت میں رہ کر رفتہ رفتہ وہ تمام ضروری اُصول سیکھ لیوے جن سے اہلِ اسلام پر سے ہر ایک داغ دُور ہو سکتا ہے اور وہ تمام قوت اور شوکت سے بھرے ہوئے دلائل سمجھ لیوے۔ جن سے یہ مرحلے ہو سکتا ہے تب وہ دوسرے ممالک میں جا کر اس خدمت کو ادا کر سکتا ہے اس خدمت کے برداشت کرنے کے لیے ایک پاک اور قوی روح کی ضرورت ہے جس میں یہ ہوگی وہ اعلیٰ درجہ کا مفید انسان ہوگا اور خدا کے نزدیک آسمان پر ایک عظیم الشان انسان قرار دیا جاوے گا۔

محمد عبدالحق صاحب:۔ مَیں کل یہاں سے رخصت ہوں گا اور ایک ضروری خدمت کو سرانجام دینے کے لیے جو کہ بنی نوع انسان کی خدمت پر مبنی ہے آخر دسمبر تک ہندوستان کے مختلف مقامات پر دورہ کروں گا۔ وہ آسٹریلیا میں ہندوستانی تاجروں کی بندش کو آزاد کرانے کی تجویز ہے۔ اس دورہ کے بعد پھر مَیں دیکھونگا کہ مَیں کونسی راہ اختیار کروں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام: قرآن شریف کی تفسیر تو اپنے وقت پر ہوگی لیکن اگر خدا آپ کے دل میں ڈالے اور آپ یہاں آکر رہیں تو قرآن شریف کے اس حصہ کی تفسیر سردست کر دی جاوے جس پر ہر ایک غیر مذہب نے کم فہمی سے اعتراض کئے ہیں یا اہلِ اسلام نے اُن کے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ اوّل اس کی فہرست تیار کر لی جاوےگی

اور وہ بہت بڑی نہ ہوگی کیونکہ ایک ہی اعتراض کو ہر ایک فرقہ نے بار بار تکرار سے بیان کیا ہے اس لیے وقتاً فوقتاً اگر اس کی حقیقت آپ کے ذہن نشین کردی جاوے تو اس حصہ کی تفسیر ہو جاوے اور اس کے ذریعہ سے یورپ میں ہر ایک اعتراض کا جواب دیا جا سکے اور اس طرح سے جو دھوکا اہلِ یورپ کو لگا ہے وہ نکل جاوے گا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۱-۴۲ صفحہ ۳۲۲ تا ۳۲۳ مورخہ ۲۹ ؍اکتوبر و ۸ ؍نومبر ۱۹۰۳ء)

---

۲۴ ؍اکتوبر ۱۹۰۳ء

ظہر کے وقت حضرت اقدس علیہ السلام نے یہ تقریر فرمائی :۔

ترکِ دنیا کی اہمیت

جو شخص دنیا کو ردّ نہیں کر سکتا وہ ہمارے سلسلہ کی طرف نہیں آسکتا۔ دیکھو حضرت ابو بکرؓ نے سب سے اوّل دُنیا کو ردّ کیا اور آپ کی آخری پوشاک یہی تھی کہ کمبل پہن کر آپ آ حاضر ہوئے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب سے اوّل تخت پر جگہ دی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ آپ نے سب سے اوّل فقر اختیار کیا تھا۔ خدا تعالیٰ کی ذات پاک ہے کہ کسی کا قرضہ اپنے ذمہ نہیں رکھتی۔ اوائل میں نقصان ضرور ہوتے ہیں۔ دوستوں یاروں کے تعلقات قطع کرنے پڑتے ہیں لیکن ان سب کا بدلہ آخر کار دیتا ہے۔ ایک چوڑھے اور چمار کی خاطر جب ایک کام کیا جاوے اور تکلیف برداشت کی جاوے تو وہ اپنے ذمہ نہیں رکھتا تو پھر خدا کس لیے اپنے ذمہ رکھے وہ آخر کار سب کچھ دیدیتا ہے۔

بارہا ہم نے سمجھایا ہے کہ جس شخص کو اَور اَور اغراض سوائے دین کے ہیں وہ ہمارے سلسلہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر پار اُترنا مشکل ہے اس لیے جو ہمارے پاس آویگا وہ مر کر آوے گا لیکن خدا اس کی قدر کریگا اور وہ نہ مرے گا جب تک کہ دُنیا میں کامیابی نہ دیکھ لے جو کچھ برباد کر کے آویگا خدا اُسے سب کچھ پھر دیگا۔ لیکن ایک دنیا دار قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان خود ہی غداری کرتا ہے کہ نام تو خدا کی طرف آنے کا کرتا ہے اور اس کی نظر اہلِ دنیا کی طرف ہوتی ہے۔

جو قدر اس سلسلہ میں داخل ہونے کی اس وقت ہے وہ بعد ازاں نہ ہوگی۔ مہاجرین وغیرہ کی نسبت قرآن شریف میں کیسے کیسے الفاظ آئے ہیں جیسے رضی اللہ عنہم۔ لیکن جو لوگ فتح کے بعد داخل ہوئے کیا اُن کو بھی یہ کہا گیا؟ ہرگز نہیں۔ ان کا نام ناس رکھا گیا۔ اور لوگوں سے بڑھ کر کوئی خطاب ان کو نہ ملا۔ خدا کے نزدیک عزتوں اور خطابوں کے یہی وقت ہوتے ہیں کہ جب اس سلسلہ میں داخل ہونے سے برادری، رشتہ دار وغیرہ سب دشمنِ جان ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ شرک کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کچھ حصہ اس کا ہو اور کچھ غیر کا بلکہ ایک

جگہ فرماتا ہے کہ اگر تم کچھ مجھ کو دینا چاہتے ہو اور کچھ بُتوں کو تو سب کا سب بُتوں کو دیدو۔

اِس وقت کا تخم بویا ہوا ہرگز ضائع نہیں ہو گا۔ کیا آج تک کے تجربہ نے ان لوگوں کو بتلا نہیں دیا کہ یہ پودا ضائع ہونے والا نہیں۔ قرآن شریف، احادیثِ صحیحہ اور نشاناتِ آسمانی سب ہماری تائید میں ہیں اور بیّن طور پر سب کچھ ثابت ہو گیا ہے۔ اب جو اس سے فائدہ نہ اُٹھاوے وہ موردِ غضبِ الٰہی ہے۔ خدا غفور اور کریم، حنّان اور منّان ہے مگر یہ انسان کی شوخی اور بدبختی ہے کہ اس کے مائدہ کو وہ ردّ کرتا ہے اور غضب کا مستحق ہو جاتا ہے اگر یہ انسان کا کاروبار ہوتا تو کب کا تباہ ہو جاتا۔ انسان کو خدا کا خوف اور ڈر رکھنا چاہیئے اور برادری اور رسوم سے ڈر کر خدا کی راہ کو ترک نہ کرنا چاہیئے۔ جب انسان کا مددگار اور معاون خدا ہو جاتا ہے تو پھر اُسے کوئی کمی نہیں۔ خدا داری چہ غم داری۔ اس قدر انبیاء جو آئے ہیں کیا خدا نے اُن سے کسی قسم کی دغا کی ہے جو اب کسی سے کریگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ ہر وقت جان کا خطرہ تھا۔ ہر ایک طرف سے دھمکی ملتی تھی مگر کیا لوگوں نے اور قوم اور برادری نے آپ کو تباہ کر دیا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ خود تباہ ہوئے اور آج کوئی ایک بھی نہیں جو اپنے آپ کو ابوجہل کی اولاد بتلاتا ہو مگر آنحضرتؐ کے نام لیواؤں اور آپ کی اولاد سے دنیا بھری پڑی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۴۔ ۴۲ صفحہ ۳۲۳ مورخہ ۲۹ راکتوبر و ۸ رنومبر ۱۹۰۳ء)

---

۳۰ راکتوبر ۱۹۰۳ء

طاعون کا نشان

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد حضرت اقدس حسب دستور شہ نشین پر جلوہ افروز ہوئے اور طاعون کا ذکر ہوا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:-

خدا تعالیٰ نے اگرچہ جماعت کو وعدہ دیا ہے کہ وہ اسے اس بلا سے محفوظ رکھے گا۔ مگر اس میں بھی شرط لگی ہوئی ہے کہ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (الانعام: ۸۳) کہ جو لوگ اپنے ایمانوں کو ظلم سے نہ ملا دیں گے وہ امن میں رہیں گے۔ پھر دار کی نسبت وعدہ دیا تو اس میں بھی شرط رکھدی اِلَّا الَّذِيْنَ عَلَوْا مِنْ اِسْتِكْبَارٍ اس میں عَلَوْا کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ جس قسم کی اطاعت انکساری کے ساتھ چاہیئے وہ بجا نہ لاوے۔ جب تک انسان حُسنِ نیتی جس کو حقیقی سجدہ کہتے ہیں بجا نہ لاوے تب تک وہ دار میں نہیں ہے اور مومن ہونے کا دعویٰ بے فائدہ ہے۔

لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ میں شرک سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہندوؤں کی طرح پتھروں کے بُتوں یا اَور مخلوقات کو سجدہ کیا۔ بلکہ جو شخص ماسوی اللہ کی طرف مائل ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے حتّٰی کہ دل میں جو

منصوبے اور چالاکیاں رکھتا ہے۔ ان پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ بھی شرک ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا حال بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اُن کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ بتلاؤ اللہ تعالےٰ سے معاملہ کیسے ہوا تو انہوں نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا عمل لایا ہے۔ مَیں نے کہا اَور عمل تو کوئی نہیں ہے صرف یہ ہے کہ مَیں نے عمر بھر شرک نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تُو نے یوم اللّبن کے دن بھی شرک نہ کیا تھا کہ دُودھ پی کر کہا کہ اس سے پیٹ میں درد ہوئی ہے گویا دُودھ کو خدا سمجھ لیا تھا اور خدا پر سے جو حقیقی فاعل ہے نظر اُٹھ گئی تھی۔

نفسانی جذبات ہزاروں قسم کے ہیں جو کہ انسان کو لگے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھا جاوے تو سر سے لیکر پاؤں تک ظلم ہی ظلم ہے۔ سر تکبر اور گھمنڈ کی جگہ ہے۔ آنکھ بُرے خیالات کا مقام ہے۔ غضب کی نظر سے بھی انسان اسی سے دوسرے کو دیکھتا ہے۔ کان بیجا باتیں سُنتے ہیں۔ زبان بُری باتیں بولتی ہے۔ گردن اکڑتی ہے۔ صدور میں کن کن بُری باتوں کی خواہش ہوتی ہے۔ نیچے کا طبقہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ فسق و فجور میں جہان اسی کے باعث مبتلا ہے پاؤں بھی بیجا مقامات پر چل کر جاتے ہیں۔ غرض یہ ایک لشکر اور جماعت ہے جسے سنبھال کر رکھنا انسان کا کام ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

ایک طرف تو خدا نے کشتی کا حوالہ دیا ہے کہ جو اس میں چڑھے گا وہ نجات پاوے گا اور ایک طرف حکم دیا ہے وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (ھود: ۳۸) یہاں بھی ظلم کی نسبت ہی فرمایا کہ جو لوگ ظالم ہیں تو ان کی نسبت بات ہی نہ کر۔ خوفِ الٰہی اور تقویٰ بڑی برکت والی شئے ہے۔ انسان میں اگر عقل نہ ہو مگر یہ باتیں ہوں تو خدا اسے اپنے پاس سے برکت دیتا ہے اور عقل بھی دے دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (الطلاق: ۳) اس کے یہی معنے ہیں کہ جس شئے کی ضرورت اسے ہوگی اس کے لیے وہ خود راہ پیدا کر دیگا بشرطیکہ انسان متقی ہو۔ لیکن اگر تقویٰ نہ ہوگا تو خواہ فلاسفر ہی ہو وہ آخر کار تباہ ہوگا۔ دیکھو کہ اسی ہندوستان پنجاب میں کسقدر عالم تھے مگر اُن کے دلوں میں اور نہ باتوں میں تقویٰ نہ رہا۔ محمد حسین کی حالت دیکھو کیسی گندی اور فحش باتیں اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ میں لکھتا رہا۔ اگر تقویٰ ہوتا تو وہ کب ایسی باتیں لکھ سکتا تھا۔

اس کے بعد چند احباب نے بیعت کی اور بعد بیعت حضرت اقدس نے ایک طویل تقریر فرمائی جو کہ ذیل میں درج ہے:-

حقیقتِ بیعت اور اس سے فیض پانے کی راہ

یہ بیعت جو ہے اس کے معنے اصل میں اپنے تئیں بیچ دینا ہے۔ اس کی برکات اور تاثیرات اسی شرط سے وابستہ ہیں جیسے ایک تخم زمین میں بویا جاتا ہے تو اسکی ابتدائی حالت یہی ہوتی ہے کہ گویا وہ کسان کے

ہاتھ سے بویا گیا اور اس کا کچھ پتہ نہیں کہ اب وہ کیا ہوگا لیکن اگر وہ تخم عمدہ ہوتا ہے اور اس میں نشوونما کی قوت موجود ہوتی ہے تو خدا کے فضل سے اور اس کسان کی سعی سے وہ اُوپر آتا ہے اور ایک دانہ کا ہزار دانہ بنتا ہے اسی طرح سے انسان بیعت کنندہ کو اول انکساری اور عجز اختیار کرنی پڑتی ہے اور اپنی خودی اور نفسانیت سے الگ ہونا پڑتا ہے تب وہ نشوونما کے قابل ہوتا ہے لیکن جو بیعت کے ساتھ نفسانیت بھی رکھتا ہے اُسے ہرگز فیض حاصل نہیں ہوتا۔ صوفیوں نے بعض جگہ لکھا ہے کہ اگر مرید کو اپنے مرشد کے بعض مقامات پر بظاہر غلطی نظر آوے تو اسے چاہیئے کہ اس کا اظہار نہ کرے اگر اظہار کریگا تو حبطِ عمل ہو جاوے گا (کیونکہ اصل میں وہ غلطی نہیں ہوتی صرف اس کے فہم کا اپنا قصور ہوتا ہے) اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دستور تھا کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس طرح سے بیٹھتے تھے جیسے سر پر کوئی پرندہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان سر اُوپر نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ تمام ان کا ادب تھا کہ حتی الوسع خود کبھی کوئی سوال نہ کرتے۔ ہاں اگر باہر سے کوئی نیا آدمی آکر کچھ پوچھتا تو اس ذریعہ سے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلتا وہ سُن لیتے صحابہ بڑے متادّب تھے اس لیے کہا ہے کہ اَلطَّرِیْقَۃُ کُلُّھَا اَدَبٌ۔ جو شخص ادب کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے تو پھر شیطان اس پر دخل پاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی نوبت ارتداد کی آجاتی ہے۔ اس ادب کو مدِنظر رکھنے کے بعد انسان کو لازم ہے کہ وہ فارغ نشین نہ ہو۔ ہمیشہ توبہ استغفار کرتا رہے اور جو جو مقامات اسے حاصل ہوتے جاویں ان پر یہی خیال کرے کہ میں ابھی قابلِ اصلاح ہوں اور یہ سمجھ کر کہ بس میرا تزکیۂ نفس ہوگیا وہاں ہی نہ اڑ بیٹھے۔

منافق کون ہے

یاد رکھو منافق وہی نہیں ہے جو ایفائے عہد نہیں کرتا یا زبان سے اخلاص ظاہر کرتا ہے مگر دل میں اس کے کفر ہے۔ بلکہ وہ بھی منافق ہے جس کی فطرت میں دورنگی ہے۔ اگرچہ وہ اس کے اختیار میں نہ ہو۔ صحابہ کرامؓ کو اس دورنگی کا بہت خطرہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ رو رہے تھے تو حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو؟ کہا کہ اس لیے روتا ہوں کہ مجھ میں نفاق کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ جب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتا ہوں تو اس وقت دل نرم اور اس کی حالت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر جب اُن سے جُدا ہوتا ہوں تو وہ حالت نہیں رہتی۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ یہ حالت تو میری بھی ہے پھر دو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کُل ماجرا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم منافق نہیں ہو۔ انسان کے دل میں قبض اور بسط ہوا کرتی ہے۔ جو حالت تمہاری میرے پاس ہوتی ہے اگر وہ ہمیشہ رہے تو فرشتے تم سے مصافحہ کریں۔

تو اب دیکھو کہ صحابہ کرامؓ اس نفاق اور دورنگی سے کس قدر ڈرتے تھے۔ جب انسان جُرأت اور دلیری

سے زبان کھولتا ہے تو وہ بھی منافق ہوتا ہے۔ دین کی ہتک ہوتی سُنے اور وہاں کی مجلس نہ چھوڑے یا اُنکو جواب نہ دے تب بھی منافق ہوتا ہے۔ اگر مومن کی سی غیرت اور استقامت نہ ہو تب بھی منافق ہوتا ہے جب تک انسان ہر حال میں خدا کو یاد نہ کرے تب تک نفاق سے خالی نہ ہوگا اور یہ حالت تم کو بذریعہ دعا حاصل ہوگی۔ ہمیشہ دُعا کرو کہ خدا تعالیٰ اس سے بچاوے۔ جو انسان داخل سلسلہ ہو کر پھر بھی دو رنگی اختیار کرتا ہے تو وہ اس سلسلہ سے دُور رہتا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے منافقوں کی جگہ اسفل السافلین رکھی ہے کیونکہ ان میں دو رنگی ہوتی ہے اور کافروں میں یکرنگی ہوتی ہے۔

گریہ وزاری کی اہمیت

صوفیوں نے لکھا ہے کہ اگر چالیس دن تک رونا نہ آوے تو جانو کہ دل سخت ہو گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا (التوبة: ۸۲) کہ ہنسو تھوڑا اور روؤ بہت مگر اس کے برعکس دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ہنستے بہت ہیں۔ اب دیکھو کہ زمانہ کی کیا حالت ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان ہر وقت آنکھوں سے آنسو بہاتا رہے بلکہ جس کا دل اندر سے رو رہا ہے وہی روتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ دروازہ بند کر کے اندر بیٹھ کر خشوع اور خضوع سے دُعا میں مشغول ہو اور بالکل عجز و نیاز سے خدا تعالیٰ کے آستانہ پر گر پڑے تاکہ وہ اس آیت کے نیچے نہ آوے۔ جو بہت ہنستا ہے وہ مومن نہیں۔ اگر سارے دن کا نفس کا محاسبہ کیا جاوے تو معلوم ہو کہ ہنسی اور تمسخر کی میزان زیادہ ہے اور رونے کی بہت کم ہے۔ بلکہ اکثر جگہ بالکل ہی نہیں ہے۔ اب دیکھو کہ زندگی کس قدر غفلت میں گذر رہی ہے اور ایمان کی راہ کسقدر مشکل ہے گویا ایک طرح سے مرنا ہے اور اصل میں اسی کا نام ایمان ہے۔

ایمان کی حقیقت

جب لوگوں کو تبلیغ کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں۔ کیا ہم نماز نہیں پڑھتے۔ کیا ہم روزہ نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کو حقیقت ایمان کا علم نہیں ہے۔ اگر علم ہوتا تو وہ ایسی باتیں نہ کرتے۔ اسلام کا مغز کیا ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی یہ عادت قدیم سے چلی آئی ہے کہ جب مغز اسلام چلا جاتا ہے تو اس کے از سرِ نو قائم کرنے کے واسطے ایک کو مامور کر کے بھیج دیتا ہے تاکہ کھائے ہوئے اور مرے ہوئے دل پھر زندہ کئے جاویں مگر ان لوگوں کی غفلت اس قدر ہے کہ دلوں کی مُردگی محسوس نہیں کرتے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرة: ۱۱۳) یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے اور نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لیے قائم ہو جاوے گویا اس کے قویٰ خدا تعالیٰ کے لیے مر جاتے ہیں گویا وہ اس کی راہ میں ذبح ہو جاتا ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اس اسلام کا نمونہ دکھلایا کہ ارادہ

الٰہی کی بجا آوری میں اپنے نفس کو ذرہ بھی دخل نہ دیا اور ایک ذرا سا اشارہ سے بیٹے کو ذبح کرنا شروع کر دیا مگر یہ لوگ اسلام کی اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جو کام ہیں ان میں ملونی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان میں سے رسالہ جاری کرتا ہے تو اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ روپیہ کما دے بال بچے کا گذارہ ہو۔ ابھی حال میں ایک شخص کا خط آیا ہے لکھتا ہے کہ میں نے عبدالغفور کے مُرتد ہونے پر اس کی کتاب ترکِ اسلام کے جواب میں ایک رسالہ لکھنا شروع کیا ہے۔ امداد فرماویں۔ ان لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اسلام کیا شئے ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نفخ رُوح اس میں نہیں لیکن رسالہ لکھنے کو تیار ہے۔ ایسے شخص کو چاہیئے تھا کہ اوّل تزکیۂ نفس کیلئے خود یہاں آتا اور پوچھتا اور اوّل خود اپنے اسلام کی خبر لیتا، لیکن عقل، دیانت اور سمجھ ہوتی تو یہ کرتا۔ مقصود تو اپنی معاش ہے اور رسالہ کو ایک بہانہ بنایا ہے۔ ہر ایک جگہ یہی بدبُو آتی ہے کہ جو کام ہے خدا کے لیے نہیں بیوی بچوں کے لیے ہے۔ جو خدا کا ہو جاتا ہے تو خدا اس کا ہو جاتا ہے اور اس کی تائیدیں اور نصرت کا ہاتھ اس کے کاموں سے معلوم ہو جاتا ہے اور آخر کار انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ ایک غیب کا ہاتھ ہے جو اُسے ہر میدان میں کامیاب کر رہا ہے۔ انسان اگر اس کی طرف چل کر آوے تو وہ دوڑ کر آتا ہے اور اگر وہ اس کی طرف تھوڑا سا رجوع کرے تو وہ بہت رجوع ہوتا ہے۔ وہ بخیل نہیں ہے سخت دل نہیں ہے۔ جو کوئی اس کا طالب ہے تو اس کا اوّل طالب وہ خود ہوتا ہے۔ لیکن انسان اپنے ہاتھوں سے اگر ایک مکان کے دروازے بند کر دیوے تو کیا روشنی اس کے اندر جاوے گی؟ ہرگز نہیں۔ یہی حال انسان کے قلب کا ہے۔ اگر اس کا قول و فعل خدا تعالیٰ کی رضا کے موافق نہ ہوگا اور نفسانی جذبات کے تلے وہ دبا ہوا ہوگا تو گویا دل کے دروازے خود بند کرتا ہے کہ خدا کا نُور اور روشنی اس میں داخل نہ ہو، لیکن اگر وہ دروازوں کو کھولے گا تو معاً نُور اس کے اندر داخل ہوگا۔

ابدال، قطب اور غوث وغیرہ جس قدر مراتب ہیں یہ کوئی نماز اور روزوں سے ہاتھ نہیں آتے۔ اگر ان سے یہ مل جاتے تو پھر یہ عبادات تو سب انسان بجا لاتے ہیں۔ سب کے سب ہی کیوں نہ ابدال اور قطب بن گئے۔ جب تک انسان صدق وصفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کا بندہ نہ ہوگا۔ تب تک کوئی درجہ ملنا مشکل ہے۔ جب ابراہیم کی نسبت خدا تعالیٰ نے شہادت دی وَ اِبْرٰھِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی (النجم: ۳۸) کہ ابراہیم وہ شخص ہے جس نے اپنی بات کو پورا کیا۔ تو اس طرح سے اپنے دل کو غیر سے پاک کرنا اور محبتِ الٰہی سے بھرنا، خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق چلنا اور جیسے ظِلّ اصل کا تابع ہوتا ہے ویسے ہی تابع ہونا کہ اس کی اور خدا کی مرضی ایک ہو کوئی فرق نہ ہو۔ یہ سب باتیں دُعا سے حاصل ہوتی ہیں۔ نماز اصل میں دعا کے لیے ہے کہ ہر ایک مقام پر دُعا کرے، لیکن جو شخص سویا ہوا نماز ادا کرتا ہے کہ اُسے اس کی خبر ہی نہیں ہوتی تو وہ اصل میں نماز نہیں۔ جیسے دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ پچاس پچاس سال نماز پڑھتے ہیں، لیکن ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا حالانکہ نماز وہ شئے ہے کہ جس سے پانچ

دن میں رُوحانیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بعض نمازیوں پر خدا تعالیٰ نے لعنت بھیجی ہے جیسے فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (الماعون : ۵) وَیْل کے معنے لعنت کے بھی ہوتے ہیں پس چاہیئے کہ ادائیگی نماز میں انسان سُست نہ ہو اور نہ غافل ہو۔ ہماری جماعت اگر جماعت بننا چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ ایک موت اختیار کرے۔ نفسانی امور اور نفسانی اغراض سے بچے اور اللہ تعالیٰ کو سب شئے پر مقدم رکھے۔ بہت سی ریا کاریوں اور بیہودہ باتوں سے انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ پوچھا جاوے تو لوگ کہتے ہیں کہ برادری کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکتا۔ ایک حرام خور کہتا ہے کہ بغیر حرام خوری کے گذارہ نہیں ہو سکتا۔ جب ہر ایک حرام گذارہ کے لیے انہوں نے حلال کر لیا تو پوچھو کہ خدا کیا رہا؟ اور تم نے خدا کے واسطے کیا کیا؟ ان سب باتوں کو چھوڑنا موت ہے جو بیعت کر کے اس موت کو اختیار نہیں کرتا تو پھر یہ شکایت نہ کرے کہ مجھے بیعت سے فائدہ نہیں ہوا۔ جب ایک انسان ایک طبیب کے پاس جاتا ہے تو جو پرہیز وہ بتلاتا ہے اگر اُسے نہیں کرتا تو کب شفا پا سکتا ہے، لیکن اگر وہ کریگا تو یوماً فیوماً ترقی کرے گا یہی اُصول یہاں بھی ہے۔

جنّت کی حقیقت

کوئی بات سوائے خدا تعالیٰ کے فضل کے حاصل نہیں ہو سکتی اور جسے اس دُنیا میں فضل حاصل ہوگا اسے ہی آخرت میں بھی ہوگا جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل: ۷۳) اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ان حواس کے حصول کی کوشش اسی جہان میں کرنی چاہیئے کہ جس سے انسان کو بہشتی زندگی حاصل ہوتی ہے اور وہ حواس بلا تقویٰ کے نہیں مل سکتے۔ اِن آنکھوں سے انسان خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا، لیکن تقویٰ کی آنکھوں سے انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ اگر وہ تقویٰ اختیار کریگا تو وہ محسوس کریگا کہ خدا مجھے نظر آرہا ہے اور ایک دن آویگا کہ خود کہہ اُٹھے گا کہ میں نے خدا کو دیکھ لیا۔ اسی بہشتی زندگی کی تفصیل جو کہ متقی کو اسی دُنیا میں حاصل ہوتی ہے قرآن شریف میں ایک اور جگہ بھی پائی جاتی ہے جیسے لکھا ہے كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرة: ۲۶) جب وہ عالمِ آخرت میں ان درختوں کے اُن پھلوں سے جو دُنیا کی زندگی میں ہی اُن کو مِل چکے تھے پائیں گے تو کہہ دیویں گے کہ یہ تو وہ پھل ہیں جو کہ ہمیں اوّل ہی دیئے گئے تھے کیونکہ وہ ان پھلوں کو اُن پہلے پھلوں سے مشابہ پاویں گے۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دُنیا میں جو نعمتیں مثل دودھ۔ شہد۔ گھی اور انار اور انگور وغیرہ انہوں نے کھائی ہیں وہی ان کو وہاں جنّت میں ملیں گے اور وہاں ان چیزوں کے مہیا کرنے کے لیے بہت سے باغات۔ درخت۔ مالی اور بیل وغیرہ اور گائے بھینسوں کے ریوڑ ہوں گے اور درختوں پر شہد کی مکھیوں کے چھتے ہوں گے جن سے شہد اُتار کر اہلِ جنّت کو دیا جاوے گا۔ یہ سب غلط خیال ہیں اگر جنّت کی یہی نعمت

ہے جو اُن کو دنیا میں ملتی رہی اور آخرت میں بھی ملے گی تو مومنوں اور کافروں میں کیا فرق رہا؟ ان سب چیزوں کے حاصل کرنے میں تو کافر اور مشرک بھی شریک ہیں۔ پھر اس میں بہشت کی خصوصیت کیا ہے؟ لیکن قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ بہشت کی نعمتیں ایسی چیزیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں۔ نہ کسی کان نے سنیں اور نہ دلوں میں گذریں۔ اور ہم دنیا کی نعمتوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ سب آنکھوں نے دیکھیں، کانوں نے سنیں اور دل میں گذری ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان جنتی نعمتوں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے مگر وہ اصل میں اَور ہیں ورنہ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرۃ: ۲۶) کے کیا معنے ہوں گے۔ اس کے وہی معنے ہیں جو کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل: ۷۳) کے ہیں۔ دوسرے مقام پر قرآن شریف فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمان: ۴۷) جو شخص خدا تعالیٰ سے خائف ہے اور اس کی عظمت اور جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کے لیے دو بہشت ہیں ایک یہی دُنیا اور دوسری آخرت۔ جو شخص سچے اور خالص دل سے نقشِ ہستی کو اس کی راہ میں مٹا کر اس کے متلاشی ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں تو اُس میں اُن کو ایک قسم کی لذت شروع ہو جاتی ہے۔ اور اُن کو وہ رُوحانی غذائیں ملتی ہیں جو رُوح کو روشن کرتی اور خدا تعالیٰ کی معرفت کو بڑھاتی ہیں۔ ایک جگہ پر شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب انسان عارف ہو جاتا ہے تو اُس کی نماز کا ثواب مارا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کی نماز اب بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی بلکہ یہ معنے ہیں کہ چونکہ اب اُسے لذت شروع ہو گئی ہے تو جو اجر اس کا عنداللہ تھا وہ اب اُسے دنیا میں ملنا شروع ہو گیا ہے جیسے ایک شخص اگر دودھ میں برف اور خوشبو وغیرہ ڈال کر پیتا ہے تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اُسے ثواب ہو گا کیونکہ لذت تو اس نے اس کی یہیں حاصل کر لی۔ خدا تعالیٰ کی رضامندی اور کسی عمل کی قبولیت اَور شئے ہے اور ثواب اَور شئے ہے۔ ہر ایک لفظ اپنے اپنے مقام کے لیے چسپاں ہوتا ہے اسی لحاظ سے شیخ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ عارف کی نماز کا ثواب مارا جاتا ہے جو اہلِ حال ہوتا ہے وہ اپنی جگہ پورے بہشت میں ہوتا ہے اور جب انسان کو خدا تعالیٰ سے پورا تعلق ہو جاتا ہے تو اغلال اور اثقال جس قدر بوجھ اس کی گردن میں ہوتے ہیں وہ سب اُٹھائے جاتے ہیں وہ لذت جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی عبادت میں حاصل ہوتی ہے وہ اَور ہے اور جو اکل و شرب اور جماع وغیرہ میں حاصل ہوتی ہے وہ اَور ہے۔ لکھا ہے کہ اگر ایک عارف دروازہ بند کر کے اپنے مولا سے راز و نیاز کر رہا ہو تو اُسے اپنی عبادت اور اس راز و نیاز کے اظہار کی بڑی غیرت ہوتی ہے اور وہ ہرگز اُس کا افشا پسند نہیں کرتا۔ اگر اس وقت کوئی دروازہ کھول کر اندر چلا جاوے تو وہ ایسا ہی نادم اور پشیمان ہوتا ہے جیسے زانی زنا کرتا پکڑا جاتا ہے۔ جب اس لذت کی حد کو انسان پہنچ جاتا ہے تو اس

کا حال اَور ہوتا ہے اور اسی حالت کو یاد کر کے وہ جنت میں کہیگا کہ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرۃ: ۲۶) بہشتی زندگی کی بنیاد یہی دُنیا ہے۔ بعد مرنے کے جب انسان بہشت میں داخل ہوگا تو یہی کیفیت اور لذت اُسے یاد آویگی۔ تو اسی بات کا طالب ہر ایک کو ہونا چاہیئے۔

نیکی کیا ہے؟

گناہوں کا چھوڑنا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے یہ ایک ذلیل کام ہے اگر کوئی کہے کہ مَیں چوری نہیں کرتا۔ زنا نہیں کرتا۔ خون نہیں کرتا اور فسق و فجور نہیں کرتا تو کوئی خوبی کی بات نہیں اور نہ خدا پر یہ احسان ہے کیونکہ اگر وہ ان باتوں کا مرتکب نہیں ہوتا تو اُن کے بدنتائج سے بھی وہی بچا ہوا ہے۔ کسی کو اس سے کیا؟ اگر چوری کرتا گرفتار ہوتا سزا پاتا۔ اس قسم کی نیکی کو نیکی نہیں کہا کرتے۔

ایک شخص کا ذکر ہے کہ ایک کے ہاں مہمان گیا۔ بیچارے میزبان نے بہت تواضع کی تو مہمان آگے سے کہنے لگا کہ حضرت آپ کا کوئی احسان مجھ پر نہیں ہے احسان تو میرا آپ پر ہے کہ آپ اتنی دفعہ باہر آتے جاتے ہیں اور کھانا وغیرہ تیار کروانے اور لانے میں دیر لگتی ہے۔ مَیں پیچھے اکیلا با اختیار ہوتا ہوں چاہوں تو گھر کو آگ لگا دوں یا آپ کا اَور نقصان کر چھوڑوں تو اس میں آپ کا کسقدر نقصان ہو سکتا ہے۔ تو یہ میرا اختیار ہے کہ مَیں کچھ نہیں کرتا۔ ایسا خیال ایک بد آدمی کا ہوتا ہے کہ وہ بدی سے بچ کر خدا تعالیٰ پر احسان کرتا ہے اس لیے ہمارے نزدیک ان تمام بدیوں سے بچنا کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے پاک تعلقات قائم کئے جاویں اور اس کی محبت ذاتی رگ و ریشہ میں سرایت کر جاوے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل: ۹۱) خدا تعالیٰ کے ساتھ عدل یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو یاد کر کے اُس کی فرماں برداری کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور اُسے پہچانو اور اس پر ترقی کرنا چاہو تو درجہ احسان کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس کی ذات پر ایسا یقین کر لینا کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور جن لوگوں نے تم سے سلوک نہیں کیا ان سے سلوک کرنا۔ اور اگر اس سے بڑھ کر سلوک چاہو تو ایک اَور درجہ نیکی کا یہ ہے کہ خدا کی محبت طبعی محبت سے کرو۔ نہ بہشت کی طمع نہ دوزخ کا خوف ہو۔ بلکہ اگر فرض کیا جاوے کہ نہ بہشت ہے نہ دوزخ ہے تب بھی جوشِ محبت اور اطاعت میں فرق نہ آوے۔ ایسی محبت جب خدا تعالیٰ سے ہو تو اس میں ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی فتور واقع نہیں ہوتا۔

اور مخلوقِ خدا سے ایسے پیش آؤ کہ گویا تم اُن کے حقیقی رشتہ دار ہو۔ یہ درجہ سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ احسان میں ایک مادہ خود نمائی کا ہوتا ہے اور اگر کوئی احسان فراموشی کرتا ہو تو محسن جھٹ کہہ اُٹھتا ہے کہ مَیں نے تیرے ساتھ فلاں احسان کئے لیکن طبعی محبت جو کہ ماں کو بچے کے ساتھ ہوتی ہے اس میں کوئی خود نمائی نہیں ہوتی بلکہ

اگر ایک بادشاہ ماں کو یہ حکم دیوے کہ تو اس بچے کو اگر مار بھی ڈالے تو تجھ سے کوئی باز پرس نہ ہو گی تو وہ کبھی یہ بات سُننا گوارا نہ کرے گی اور اس بادشاہ کو گالی دے گی۔ حالانکہ اسے علم بھی ہو کہ اس کے جوان ہونے تک میں نے مرجانا ہے مگر پھر بھی محبت ذاتی کی وجہ سے وہ بچہ کی پرورش کو ترک نہیں کرے گی۔ اکثر دفعہ ماں باپ بوڑھے ہوتے ہیں اور ان کو اولاد ہوتی ہے تو ان کی کوئی امید بظاہر اولاد سے فائدہ اٹھانے کی نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کے پھر بھی وہ اس سے محبت اور پرورش کرتے ہیں۔ یہ ایک طبعی امر ہوتا ہے جو محبت اس درجہ تک پہنچ جاوے اسی کا اشارہ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل : ۹۱) میں کیا گیا ہے کہ اس قسم کی محبت خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ نہ مراتب کی خواہش نہ ذلت کا ڈر۔ جیسے آیت لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا (الدھر : ۱۰) سے ظاہر ہے غرضکہ یہ باتیں ہیں جن کو یاد رکھنا چاہیئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ صفحہ ۳۳۴ تا ۳۳۵ مورخہ ۱۶ / نومبر ۱۹۰۳ء)

یکم نومبر ۱۹۰۳ء

تہجد کی نماز کا طریق

عبدالعزیز صاحب سیالکوٹی نے لائل پور میں یہ مسئلہ بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز اس طرح سے جیسا کہ اب تعامل اہل اسلام ہے بجا نہ لاتے بلکہ آپ صرف اُٹھ کر قرآن پڑھ لیا کرتے اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ یہی مذہب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے ...... حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں بوساطت منشی نبی بخش صاحب اور مولوی نورالدین صاحب یہ امر تحقیق کے لیے پیش کیا گیا جس پر حضرت امام الزمان علیہ السلام نے مفصلہ ذیل فتویٰ دیا۔

میرا یہ مذہب ہرگز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر فقط قرآن شریف پڑھ لیا کرتے تھے اور بس۔ میں نے ایک دفعہ یہ بیان کیا تھا کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو یا کوئی اور ایسی وجہ ہو کہ وہ تہجد کے نوافل ادا نہ کر سکے تو وہ اُٹھ کر استغفار، درود شریف اور الحمد شریف ہی پڑھ لیا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نوافل ادا کرتے۔ آپ کثرت سے گیارہ رکعت پڑھتے آٹھ نفل اور تین وتر۔ آپ کبھی ایک ہی وقت میں ان کو پڑھ لیتے اور کبھی اس طرح سے ادا کرتے کہ دو رکعت پڑھ لیتے اور پھر سو جاتے اور پھر اُٹھتے اور دو رکعت پڑھ لیتے اور سو جاتے۔ غرض سو کر اور اُٹھ کر نوافل اسی طرح ادا کرتے جیسا کہ اب تعامل ہے اور جس کو اب چودھویں صدی گذر رہی ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ صفحہ ۳۳۵ مورخہ ۱۶ / نومبر ۱۹۰۳ء)

---

۴ نومبر ۱۹۰۳ء

بوقتِ ظہر

تقریر حضرت اقدس علیہ السلام

حضرت اقدس امام صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام بوقت ظہر حسب معمول اندر سے مسجد مبارک میں تشریف لائے اور مسند کو زیب نشست بخش کر مولوی برہان الدین صاحب جہلمی سے مخاطب ہوکر فرمایا[1] کہ:

آپ کے چہرہ پر آثار پژمردگی و پریشانی وحیرانی کیسے نظر آرہے ہیں؟

عرض کی کہ حضور وجہ تو صرف یہی ہے کہ اب دوسرا کنارہ یعنی جہانِ ثانی نظر آرہا ہے کیونکہ بوجہ پیرانہ سالی کے اب عالمِ آخرت کا ہی خیال رہتا ہے۔ گنتی ہی کے دن اب باقی سمجھنے چاہئیں۔ مزید برآں عارضہ ضعف اور بھی اس کے سریع الوقوع ہونے پر شاہد ہے اور ضعف کا یہ باعث ہے کہ ابتداء میں کچھ مراقبہ ونفی واثبات کا کسی قدر شغل رکھا ہے جس سے یہ ضعف لاحق حال ہو گیا ہے۔

یہ سُنکر حضرت اقدس نے ایک معانی خیز اور پُر معارف لب ولہجہ کیساتھ فرمایا کہ:

بقیہ ایام زندگی قادیان میں گذاریں

جب یہ حالت ہے تب تو ضرور ہی ان تمام عارضی تجرات کو یکسو رکھ کر صرف ایک ہی آستانہ بارگاہِ ایزدی پر نظر رکھنی چاہیئے کیونکہ ہر ایک سعادت کیش ومتلاشی حق رُوح کا یہی مامن اور یہی ملجا وماویٰ ہے اور چونکہ یہ مسلّم امر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے مقرب کے پاس رہنا گویا ایک طرح سے خود خدا تعالیٰ کے پاس رہنا ہوتا ہے اس واسطے اب آپ کو باقی ایام زندگی اس جگہ قادیان میں گذارنے چاہئیں اور یہاں آکر ڈیرا لگا دینا چاہیئے اور اس شعر پر کاربند ہونا چاہیئے۔

چو کار عمر ناپیدا است بارے ایں اولیٰ
کہ روز واقعہ پیش نگار خود باشد

یہاں تو مقولہ "یک در گیر ومحکم گیر" پر عمل کرنا ضروری ولازمی ہے۔ ہر ایک کے لیے مناسب وواجب ہے کہ حسبِ استطاعت اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرکے پوری سعی کرے تاکہ ٹھیک وقت پر سفرِ منزلِ محبوب حقیقی کے لیے تیاری کر سکے۔ بغیر جوشِ محبت کے اس راہ پر قدم مارنا بڑا مشکل ہے اور ساتھ ہی اس پر

---

[1] یہ تقریر مولوی برہان الدین صاحب کو مخاطب فرما کر فرمائی اور اس تقریر کے نوٹ چوہدری اللہ دادخان صاحب کلرک صدر شاہ پور نے لیے اور بعد ازاں ان نوٹوں کو اپنے الفاظ میں مرتب کرکے موقعہ بہ موقعہ حضرت اقدس علیہ السلام کے اشعار بھی چسپاں کئے۔ (مرتب)

استقلال واستقامت ضروری ہے جب یہ امر حاصل ہو جاوے تو پھر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جذب القلوب کا عمل بتدریج خود بخود شروع ہو جاوے گا جس سے صادقین کی معیت کی توفیق ملے گی اور اس صیقل تعشق الٰہی سے زنگار آئینۂ دِل محو ہو کر تزکیۂ نفس و تطہیرِ قلب نصیب ہوگا۔ مگر تلاشِ حق کا بیج بونا مقدم ہے جس سے صدق وصفا کا پُرثمر نخل پیدا ہوتا ہے اور محبت ذات ربانی کی آب پاشی سے نشو ونما پاتا ہے۔

بمنزلِ جاناں رسد ہماں مردے
کہ ہمدم درتلاشِ او دواں باشد

آپ اپنی پہلی حالت کو یاد کریں جبکہ آغاز سال ۱۸۸۶ء میں صرف حسبۃً للہ کا جوش آپکو کشاں کشاں یہاں لایا تھا اور آپ پاپیادہ افتاں وخیزاں اس قدر دُور فاصلہ سے پہلے قادیان پہنچے تھے اور جب کہ ہم کو اس جگہ نہ پایا تو اسی بیتابی وبے قراری کے جوش میں تنگا پو کرکے پیدل ہی ہمارے پاس ہوشیار پور جا پہنچے تھے اور جب وہاں سے واپس ہونے لگے تو اس وقت ہم سے جُدا ہونا آپ کو بڑا شاق گذرتا تھا۔ اب تو ایسا وقت آگیا ہے کہ آپ کو آگے ہی قدم مارنا چاہیئے نہ یہ کہ اُلٹا تساہل وتکاسل میں پڑیں۔ اب تو زمانہ بزبانِ حال کہہ رہا ہے اور نشانات وعلامات سماوی باآوازِ دُہل پکار رہے ہیں کہ

چنیں زمانہ چنیں دور ایں چنیں برکات — تو بے نصیب روی وہ چہ ایں شقا باشد
فلک قریب زمیں شد زبارشِ برکات — کجاست طالبِ حق تا یقین فزا باشد
بجز اسیریٔ عشقِ رخش رہائی نیست — بدردِ اُو ہمہ امراض را دوا باشد

غرض کہ پوری مستعدی وہمت سے استقلال دکھلاویں۔ یہ آثار پژمردگی ہیں برمحل معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں کا رہنا تو ایک قسم کا آستانۂ ایزدی پر رہنا ہے۔ اس حوضِ کوثر سے وہ آبِ حیات ملتا ہے کہ جس کے پینے سے حیاتِ جاودانی نصیب ہوتی ہے جس پر ابدالآباد تک موت ہرگز نہیں آسکتی۔ اچھی طرح کمربستہ ہو کر پورے استقلال سے اس صراطِ مستقیم کے راہ رَو بنیں اور ہر قسم کی دنیاوی روکاوٹوں اور نفسانی خواہشوں کی ذرہ پروا نہ کرکے اللہ تعالیٰ کے صادق مامور کی پوری معیت کریں تاکہ حکم "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" کی فرمانبرداری کا سنہری تمغہ آپ کو حاصل ہو۔

یاد رکھیں کہ راستی وصداقت کے فرزند ہمیشہ جاہ وجلال کے تاج زریں کے وارث ہوا کرتے ہیں۔ راستبازی کے حاسد دشمنوں کا جو انجام ہوا کرتا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں ؎

بسوزد آنکہ نہ سوزد بصدق در رہِ یار
بمیرد آنکہ گریزندہ از فنا باشد

معلوم نہیں کہ آپ کو جہلم سے کیوں اُنس ہے حالانکہ اس کی میم نسبتی کو حذف کرنے کے بعد تو جہل ہی جہل رہ جاتا ہے۔ بھلا فہم و ذکاء کو جہل سے کیا نسبت؟

مولوی صاحب نے عرض کی کہ حضور واقعی یہ تو سچ ہے کہ جہلم بمعنی جہل من ہی ہے آخری میم نسبتی ہے۔ فرمایا کہ:

جب یہ حال ہے تو ایسے جہل کو ترک کرنا چاہئیے۔ وہاں کی رہائش کو یہاں کی رہائش پر کسی طرح بھی ترجیح نہیں ہو سکتی۔ پھر ایسی حالت میں مامور من اللہ کی صحبت نہایت ضروری بلکہ مغتنمات سے ہے خوش قسمت وہ جنکو یہ نعمت غیر مترقبہ نصیب ہو۔ جو شخص سب کچھ چھوڑ کر اس جگہ آکر آباد نہیں ہوتا یا کم از کم ایسی تمنا دل میں نہیں رکھتا اس کی حالت کی نسبت مجھے بڑا اندیشہ ہے کہ مبادا وہ پاک کرنے والے تعلقات میں ناقص نہ رہے۔ اپنے گھروں، وطنوں اور املاک کو چھوڑ کر میری ہمسائیگی کے لیے قادیان میں بود و باش کرنا "اصحاب الصفہ" کا مصداق بننا ہے۔

اور یہ تو ایک ابتدائی مرحلوں میں سے ہے ورنہ مردانِ خدا کو تو اگر اس سے بھی صدہا درجہ بڑھکر دشواریاں و مصیبتوں کا سامنا ہو تاہم وہ انکی کچھ پروا نہیں کرتے بلکہ وفور جذبۂ عشقِ محبوب حقیقی سے آگے ہی قدم مارتے ہیں اور اپنا تمام دھن، من، تن اسی راہ میں صرف کر دینے کو عین اپنی سعادت و خوش قسمتی سمجھتے ہیں اور یہی ان کا مقصود بالذات ہوتا ہے کہ دنیوی علائق کے جالوں کو توڑ کر اور اس کے پھندوں سے مخلصی پاکر اس جمیع محامد کی جامع ذات ستودہ صفات کے آستانہ سراپا برکت خیز پر پہنچنے کا شرف حاصل کریں۔

نتابد از رہِ جانانِ خود سر اخلاص	اگرچہ سیلِ مصیبت بزور ہا باشد
براہِ یارِ عزیز از بلا نہ پرہیزد	اگرچہ در رہِ آں یار اژدہا باشد
بدولتِ دوجہاں سُرفرو نمے آرند	بعشقِ یار دلِ زارِ شاں دوتا باشد

مَیں پھر توجہ دلاتا ہوں کہ در حقیقت اصولِ استقامت یہی ہے۔ کلام مجید میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حٰمٓ السجدة: ۳۱) یعنی جو اللہ تعالیٰ کی طرف آجاتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہی راستہ پر نہیں آتے بلکہ اسی صراط مستقیم پر استقامت بھی دکھلاتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ تطہیر و تنویر قلوب کی منزلیں طے کر لیتے ہیں اور بعد انشراحِ صدر کے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کو حاصل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنی خاص نعمتوں سے متمتع فرماتا ہے۔ محبت و ذوقِ الٰہی ان کی غذا ہو جاتی ہے۔ مکالمہ الٰہی، وحی، الہام و کشف وغیرہ انعاماتِ الٰہی سے مشرف و بہرہ مند کئے جاتے ہیں۔ درگاہِ رب العزت سے طمانیت و سکینت اُن پر اُترتی ہے۔ حُزن و مایوسی اُن کے نزدیک تک نہیں پھٹکتی۔ ہر وقت جذبہ محبت و

ولولۂ عشق الٰہی میں سرشار رہتے ہیں گویا لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (البقرۃ: ۱۱۳) کے پورے مصداق ہوجاتے ہیں۔ ما درّ ما قال ۔

کلید ایں ہمہ دولت محبّت است و وفا
خوشا کسیکہ چنیں دولتش عطا باشد

غرض استقامت بڑی چیز ہے۔ استقامت ہی کی بدولت تمام گروہ انبیاء ہمیشہ مظفر و منصور و بامراد ہوتا چلا آیا ہے۔ ذات تقدس مآب باری تعالیٰ کے ساتھ ایک خالص ذاتی تعلق و گہرا پیوند قائم کرنا چاہیئے۔ جب یہ تعلق پورا قائم ہوجاوے پھر ہر ایک قسم کے خوف و خطر سے انسان محفوظ و مطمئن ہوجاتا ہے اور انشراحِ صدر کے بعد تمام بوجھ ہلکے ہوجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ ان کو "ہر کہ در ایزدی یافت باز بر درِ دیگر نتاخت" پر حق الیقین ہو جاتا ہے اور اس کی پُر ثمر تاثیرات اُن کے لوحِ قلب پر منقش ہو جاتی ہیں اور اُنکے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہوتی ہیں اور بوجہ استیلائے محبّت و تعشقِ الٰہی و شہود و عظمت و جلال ذات کبریائی ان کے قلبِ سلیم کا یہی وِرد ہوجاتا ہے ۔

نہ از چینم حکایت کن نہ از روم ❊ کہ دارم دلستانے اندریں بُوم
چوں رُوئے خوب او آید بیادم ❊ فراموشم شود موجود و معدوم

آپ اپنے سارے جسم و جان روح و رواں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ہوجاویں۔ پھر خدا تعالیٰ خود بخود تم سب کا حافظ و ناصر معین و کارساز ہوجاوے گا۔ چاہیئے کہ انسان کے تمام قویٰ آنکھ۔ کان۔ دل۔ دماغ۔ دست و پا جملہ متمسک باللہ ہوجاویں۔ ان میں کسی قسم کا اختلاف نہ رہے۔ اسی میں تمام کامیابیاں و نصرتیں ہیں۔ یہی اصل مراقبہ ہے۔ اسی سے حرارتِ قلبی و رُوحانیت پیدا ہوتی ہے اور اسی کی بدولت ایمانِ کامل نصیب ہوتا ہے۔

سب سے اوّل تو انسان کو اپنا مرض معلوم کرنا چاہیئے۔ جب تک مرض کی تشخیص نہ ہو علاج کیا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطمینان نہ پانا یہی خطرناک مرض ہے۔ یہ وہ حالت ہے جبکہ انسان نفسِ امّارہ کے زیرِ حکم چل رہا ہوتا ہے۔ اس وقت صرف محرکاتِ بدی یعنی شیطان ہی کی اس پر حکومت ہوتی ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ سے دُور اُفتادہ ہلاک ہونے والی ناپاک روحوں کا اس پر اثر ہوتا ہے۔

اس سے ذرا اُوپر انسان ترقی کرتا ہے تو اس وقت اس کا اپنے نفس کے ساتھ ایک جہاد شروع ہو جاتا ہے اس کی ایسی حالت کا نام لوّامہ ہے۔ اس وقت اگرچہ محرکاتِ بدی سے اس کو پوری مخلصی نہیں ہوتی مگر محرکاتِ نیکی یعنی ملائکہ کی پاک تحریکات کی تاثیریں بھی اس پر مؤثر ہونے لگ جاتی ہیں۔ ان نیک تحریکات کی قوت و طاقت سے نفسِ امّارہ سے اس کی ایک قسم کی کُشتی ڈٹ جاتی ہے اور ان کی مدد سے تحریکاتِ بدی پر

غلبہ پاتے پاتے زینہ ترقی پر چڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور اگر فضلِ ایزدی شامل حال ہو تو بتدریج ترقی کرتا جاتا ہے۔ آخر کار اس نفسِ لوامہ کی کشتی جیت لینے پر تمام تحریکاتِ بدی کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس مرحلہ سے اُوپر چڑھنے پر وہ ناپاک رُوحوں کی بُری تحریکات کے نتائج بد سے بالکل محفوظ ہو کر امن الٰہی میں آجاتا ہے۔ اس حالتِ کامیابی وظفر مندی وفائز المرامی کا نام مطمئنہ ہے۔ اس وقت وہ ذات باری تعالیٰ سے آرام یافتہ ہوتا ہے اور اسی منزل پر پہنچ کر سالک کا سلوک ختم ہو جاتا ہے۔ تمام تکلفات اُٹھ جاتے ہیں۔ اور بلحاظ مدارجِ روحانیت کے یہی جد وجہد کی انتہا اور اس کا مقصود ذاتی ہوتا ہے۔ اس گوہر مقصود کے حصول پر وہ پورا کامیاب وفائز المرام ہو جاتا ہے۔ ہماری بعثت کی علتِ غائی بھی تو یہی ہے کہ رستہ منزلِ جاناں کے بھولے بھٹکوں، دل کے اندھوں جذامِ ضلالت کے مبتلاؤں۔ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والے کور باطنوں کو صراطِ مستقیم پر چلا کر وصالِ ذات ذوالجلال کا شیریں جام پلایا جاوے اور عرفانِ الٰہی کے اس نقطہ انتہائی تک اُن کو پہنچایا جاوے تا کہ اُن کو حیاتِ ابدی وراحتِ دائمی نصیب ہو اور جوارِ رحمتِ ایزدی میں جگہ لے کر مست وسرشار رہیں۔

ہماری معیّت اور رفاقت کی پاک تاثیرات کے ثمراتِ حسنہ بالکل صاف ہیں۔ ہاں ان کے ادراک کیلئے فہم رسا چاہیئے۔ ان کے حصول کے لیے رُشد وصفا چاہیئے۔ ساتھ ہی استقامت کے لیے اتقا چاہیئے ورنہ ہماری جانب سے تو چار دانگ کے عالم کے کانوں میں عرصہ سے کھول کھول کر منادی ہو رہی ہے ؎

بیا آمدم کہ رہِ صدق را درخشانم ⁂ بدلستاں برم آنرا کہ پارسا باشد
کسیکہ سایۂ بالِ ہماش سود نداد ⁂ بیا یدش کہ دو روزے بظلِ ما باشد
گلے کہ روئے خزاں را گہے نخواہد دید ⁂ بباغِ ماست اگر قسمتت رسا باشد

ہم نے تو اس مائدہ الٰہی کو ہر کس وناکس کے آگے رکھنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا مگر آگے اُن کی اپنی قسمت۔ وما علینا الا البلاغ۔

مسیح موعود کی مخالفت

اس سے تھوڑا زمانہ پہلے بڑے بڑے علماء لکھ گئے تھے کہ مہدی موعود ومسیح مسعود کی آمد کا زمانہ بالکل قریب ہے بلکہ بعض نے اس کی تائید میں اپنے اپنے مکاشفات بھی لکھے تھے۔ جب اس نعمت کا وقت آیا تو تمام یہودی سیرتوں نے اسکے قبول کرنے سے اعراض کر دیا ہے اور صرف انکار پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ تکذیب پر ایسے تُلے ہوئے ہیں کہ جس کا کوئی حد وحساب نہیں۔ مخالفت کا کوئی پہلو چھوڑ نہیں رکھا۔ ہر دجالیت ویہودیت کو عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ہر وقت فساد وشرارت کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ کونسا ایذا وتکلیف دہی کا راہ ہے جس پر وہ نہیں چلے ہماری تخریب واستیصال کے لیے کونسا میدان تدبیر ہے جو اُن کی اسپانِ مخالفت کی دوڑ دھوپ سے بچ

رہا ہے۔ استہزاء و تضحیک کا کونسا پہلو باقی چھوڑا گیا ہے۔ یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (یٰس: ۳۱) مگر اُن کی یہ فتنہ پردازیاں وگربہ مکاریاں کچھ بھی عند اللہ وقعت نہیں رکھتیں۔ چہ جائیکہ ان کو کبھی کامیابی کا منہ دیکھنا بھی نصیب ہو۔ ؎

چراغیکہ ایزد برفروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

سچ پوچھو تو اُن کی یہ مخالفتیں ہماری مزرعۂ کامیابی کے لیے کھاد کا کام دے رہی ہیں کیونکہ اگر مخالفوں سے میدان صاف ہو جاوے تو اس میدان کے مردانِ کارزار کے جوہر کس طرح ظاہر ہوں اور انعاماتِ الٰہی کی غنیمت سے اُن کو کس طرح حصہ نصیب ہو اور اگر اعداء کی مخالفت کا بحرِ مواج پایاب ہو جاوے تو اس کے غواصوں کی کیا قدر ہو اور وہ بحرِ معانی کے بے بہا گوہر کو کس طرح حاصل کر سکیں۔ ما در ما قیل ؎

گر نبودے درمقابل روئے مکروہ و سیاہ ٭ کس چہ دانستے جمال شاہد گلفام را
گر نیفتادے بخصمے کار در جنگ و نبرد ٭ کے شود جوہر عیاں شمشیر خوں آشام را

اس مخالفت کا کوئی ایسا ہی سِرّ معلوم ہوتا ہے ورنہ ان کی مخالفت کے ارادے عند اللہ کیا قدر رکھتے ہیں اس ذات قادرِ مطلق کا تو صاف حکم ہے إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (المائدۃ: ۵۷) اور اس جنگ و جدال کا آخری انجام بھی بتا دیا ہے کہ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف: ۱۲۹) مگر افسوس کہ بایںہمہ کوتاہ اندیش نہیں سمجھتے حالانکہ اس نصرتِ الٰہی و تائید ایزدی کا انہیں مشاہدہ و تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے اور ان کی مذلت و خسران و نامرادی کا انجام بھی کوئی پوشیدہ نہیں ہے کیوں نہ ہو ؎

خدا کے پاک لوگوں کو خدا سے نصرت آتی ہے ٭ جب آتی ہے تو پھر عالم کو اک عالم دکھاتی ہے
وہ بنتی ہے ہوا اور ہر خسِ رہ کو اُڑاتی ہے ٭ وہ ہو جاتی ہے آگ اور ہر مخالف کو جلاتی ہے
غرض رُکتے نہیں ہرگز خدا کے کام بندوں سے ٭ بھلا خالق کے آگے خلق کی کچھ پیش جاتی ہے

قطع نظر ان یبوست مجسم مولویوں اور خشک ملانوں کے موجودہ زمانہ کے فقراء کا گروہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان میں ریاکاری و ذاتی اغراض کی ایک زہر ہوتی ہے جو آخر کار اُن کو ہلاک کر ڈالتی ہے۔ ان کا ہر ایک قول و فعل و عمل ان کی نفسانی اغراض کے تابع ہوتا ہے اور اس میں کوئی نہ کوئی نہاں در نہاں ذاتی غرض مرکوز خاطر ہوتی ہے۔ مثلاً خواہش مسخرات و طلبِ دنیا و جاہ طلبی وغیرہ وغیرہ تاکہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں اور اُن کی دنیوی عزت و مال و متاع میں ترقی ہو جس سے اپنے نفسِ امارہ کو خوش رکھیں۔ یہ ایسا سمِ قاتل ہے کہ اس کا انجام ہلاکت ہے بعض ان میں سے زمین کھود کر چلہ کرتے ہیں۔ نہ یہ حکم الٰہی ہے اور نہ سنت نبوی۔ ریاکاری و مکاری کا خود تراشیدہ

ایک خاصہ ڈھنگ ہے تاکہ لوگوں کو دامِ تزویر میں لایا جاوے اور یہی اُن کی دلی غرض ہوتی ہے اُن کے ایسے عملوں کی مثال میدانی سراب جیسی ہے کہ وہ دُور سے تو خوش نما مصفّٰی پانی دکھائی دیتا ہے مگر نزدیک جانے پر اس کی اصل حقیقت کُھل جاتی ہے کہ وہ تو صرف آنکھوں کا دھوکا ہی دھوکا تھا۔ اس وقت تشنگانِ آبِ زلال کو بجز حسرت و پشیمانی کے اَور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے ریاکاروں کو جہنّم سے حصّہ ملتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ سے وہ بالکل بیگانے اور کوچۂ یارِ حقیقی سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں وہ معرفتِ الٰہی میں دل کے مُردہ اور تن بگور ہوتے ہیں۔ شاید ایسوں ہی کے لیے یہ خطاب ہے۔

کاملاں حیّ اند در زیرِ زمیں
تو بگوری با حیاتِ ایں چنیں

ان کی موت کی حالت عوام کالانعام سے بدتر ہوتی ہے۔ کیونکہ عوام تو سیدھے پن سے جیسا اُنکو سمجھ میں آتا ہے ایسا ہی عمل کر لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں کوئی تکلّف نہیں ہوتا بالکل سادگی سے دین العجائز پر چلتے ہیں۔ مگر موجودہ فقراء کا گروہ تو عمداً اغراضِ نفسانی کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ان تمام ریاکاری کے کاموں کو ایک مزوّرانہ طلسمات کے رنگ میں ظاہر کر رہا ہے۔ انہیں عاقبت کی کچھ پروا نہیں۔

مناز بر کلہ سبز و خرقہ پشمین
کہ زیرِ دلق ملمع فریب ہا باشد

سو ہماری جماعت کو چاہیئے کہ ایسے تصنعات سے اپنے آپ کو بچاویں اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راہ اور سنّتِ نبوی پر محکم قدم رکھ کر چلیں تا منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے اُن کو کوئی روک حائل نہ ہو اور یہ چند روزہ زندگی رائیگاں نہ جاوے جو آخرت میں سخت ندامت، ذلّت و حسرت کا باعث ہووے اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو توفیق دیوے کہ وہ محض ابتغاء لمرضاتِ اللہ کی غرض سے راہِ مستقیم پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاویں اور تخلیقِ انسانی کے اصل مدعا کو پورا کریں۔ آمین ثم آمین (۴ر نومبر ۱۹۰۳ء)

(نوٹ:۔ باستثناء ایک شعر کے جو سرِ عنوان درج ہے۔ باقی اشعار مندرجہ مضمون ہذا حضرت اقدس جناب امام صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اثنائے تقریر میں نہیں فرمائے تھے مگر چونکہ بجز ایک شعر ۔

بمنزلِ جاناں رسد ہماں مردے
کہ ہمہ دم در تلاشِ او دواں باشد

کے جو بوقت تحریرِ مضمون ہذا کے لیے بے ساختہ روانی طبع سے احقر کے منہ سے نکل گیا ہے باقی

ماندہ اکثر اشعار نے خود حضرت اقدس ہی کی زبان گوہر فشاں سے جنم لیا ہوا ہے اور ان مواقع پر چسپاں بھی تھے اس واسطے مناسب مواقع پر لکھ دیئے گئے ہیں۔ بذاتِ خود بھی یہ حقائق معارف کا ایک خزینہ ہیں۔ وثوق کامل ہے کہ ان کا ان مواقعات مناسبہ پر چسپاں ہونا بفضلہٖ تعالیٰ بہت سے سعید فطرت وراستی پسند طبائع کو تکشیف حقائق و تلخیص دقائق میں مدد دیگا جس سے انکو احقاقِ حق وابطالِ باطل کی توفیق ملے گی۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ آمین ثم آمین۔ والسلام۔ ۵ رنومبر ۱۹۰۳ء۔

امام صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کمترین خادم

احقر العباد الہ داد احمدی کلارک ضلع شاہ پور۔ حال وارد قادیان)

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۵ صفحہ ۳۵۲ تا ۳۵۴ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء)

نیز (الحکم جلد ۷ نمبر ۴۴-۴۵ صفحہ ۷-۸ مورخہ ۳۰ رنومبر و ۱۰ ردسمبر ۱۹۰۳ء)

---

۵ رنومبر ۱۹۰۳ء

اولیاء و اصفیاء پر مصائب کی وجہ

فرمایا کہ:

آج کل ہندوستان سے ایک عورت آئی ہوئی ہے (ان کے خاوند بھی آئے ہوئے تھے) وہ اکثر سوال کرتی رہتی ہیں اور مَیں اُن کو سمجھایا کرتا ہوں۔ ایک دن سوال کیا کہ اولیاء اور پیغمبروں پر بڑی بڑی مصیبت آتی ہے اور وہ ہمیشہ مصیبت کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ تو مَیں نے جواب دیا کہ یہ بات غلط ہے اور قرآن شریف کے بھی بالکل برخلاف ہے۔ خدا تعالیٰ کے اولیاء اور نبیوں پر تو ہمیشہ اس کے انعامات ہوتے ہیں وہ ان کا ہر مقام میں حافظ و ناصر ہوتا ہے پھر ان پر مصیبت کے کیا معنے؟ عملی طور پر دیکھ لو کہ حضرت موسیٰؑ کو کیا کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کا دشمن غرقاب کیا گیا اور موسیٰؑ کو اس پر فتح حاصل ہوئی۔ پھر داؤد کو دیکھ لو۔ عیسیٰؑ کو دیکھو کہ اُن کے دشمن ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتے رہے اور یہ سب کامیاب ہوتے رہے۔ ہمارے پیغمبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عروج حاصل ہوا کیا اس کی نظیر مل سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز ہرگز یہ لوگ فقر اور ذلّت کے مصداق نہیں ہوتے۔ اَلدُّنْیَا سِجْنٌ لِّلْمُؤْمِنِ میں اگر سجن کے معنی نسبتی کریں کہ اہل اللہ کو جو کچھ جنّت میں ملے گا اس کے مقابلہ میں یہ دُنیا سجن ہے تو ٹھیک ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اپنے اولیاء کو کبھی عذاب نہیں کرتے بلکہ اس دلیل سے یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کی تردید کرتا ہے ان دونوں نے دعویٰ کیا تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ کہ ہم خدا کے پیارے اور بمنزلہ اس

کی اولاد کے ہیں تو اس کا جواب خدا تعالیٰ نے یہ دیا کہ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ (المائدۃ:۱۹) کہ اگر تم خدا کے پیارے اور بمنزلہ اس کی اولاد کے ہو تو پھر تمہاری شامتِ اعمال پر تم کو وہ دُکھ اور تکالیف کیوں دیتا ہے؟ پس اس سے ثابت ہے کہ جو خدا کے پیارے ہوتے ہیں ان کو دنیا میں دُکھ نہیں ہوتا اور وہ ہر ایک قسم کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ)۔ پس اگر اس کے پیاروں کو عذاب ہوتا رہے تو پھر کافروں میں اور ان میں کیا فرق ہوا؟ انبیاء پر اگر کوئی واقعہ مصیبت کے رنگ میں آتا ہے تو اس سے خدا تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ ان کے اخلاق کو وہ دنیا پر ظاہر کرے کہ جو ہماری طرف سے آتے ہیں اور ہمارے ہو جاتے ہیں۔ وہ کن اخلاقِ فاضلہ کے صاحب ہوتے ہیں۔ امام حسینؓ پر بھی ایسا واقعہ گذرا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایسے واقعات گذرے مگر صبر اور استقلال اور خدا تعالیٰ کی رضا کو کس طرح مقدم رکھ کر بتلایا۔

انسان کے اخلاق ہمیشہ دو رنگ میں ظاہر ہو سکتے ہیں یا ابتلاء کی حالت میں اور یا انعام کی حالت میں۔ اگر ایک ہی پہلو ہو اور دوسرا نہ ہو تو پھر اخلاق کا پتہ نہیں مل سکتا۔ چونکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مکمل کرنے تھے۔ اس لیے کچھ حصّہ آپ کی زندگی کا مکّی ہے اور کچھ مدنی۔ مکّہ کے دشمنوں کی بڑی بڑی ایذا رسانی پر صبر کا نمونہ دکھایا اور باوجود ان لوگوں کے کمال سختی سے پیش آنے کے پھر بھی آپ ان سے حلم اور بردباری سے پیش آتے رہے اور جو پیغام خدا تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اس کی تبلیغ میں کوتاہی نہ کی۔ پھر مدینہ میں جب آپ کو عروج حاصل ہوا اور وہی دشمن گرفتار ہو کر پیش ہوئے تو ان میں سے اکثروں کو عفو کر دیا۔ باوجود قوتِ انتقام پانے کے پھر انتقام نہ لیا۔

مولوی عبد اللطیف صاحب کا نمونہ صبر و استقلال

اب حال میں مولوی عبد اللطیف صاحب شہید مرحوم کا نمونہ دیکھ لو کہ کس صبر اور استقلال سے انہوں نے جان دی ہے۔ ایک شخص کو بار بار جان جانے کا خوف دلایا جاتا ہے اور اس سے بچنے کی امید دلائی جاتی ہے کہ اگر تُو اپنے اعتقاد سے بظاہر توبہ کر دے تو تیری جان نہ لی جاوے گی۔ مگر انہوں نے موت کو قبول کیا اور حق سے روگردانی پسند نہ کی۔ اب دیکھو اور سوچو کہ اسے کیا کیا تسلّی اور اطمینان خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہو گا کہ وہ اس طرح پر دنیا و مافیہا پر دیدہ دانستہ لات مارتا ہے اور موت کو اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی توبہ کرتے تو خدا جانے امیر نے کیا کچھ اس کی عزت کرنی تھی مگر انہوں نے خدا کے لیے تمام عزتوں کو خاک میں ملایا اور جان دینی قبول کی۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ آخر دم تک اور سنگساری کے آخری لمحہ تک ان کو مہلت توبہ کی دی جاتی ہے اور وہ خوب جانتے تھے کہ میرے بیوی بچے ہیں۔ لاکھہا روپے کی جائداد ہے۔ دوست یار بھی ہیں۔ ان تمام نظاروں کو پیش چشم رکھ کر اس آخری موت

کی گرمی میں بھی جان کی پروانہ کی۔ آخر ایک سرور اور لذت کی ہوا اُن کے دل پر چلتی تھی جس کے سامنے یہ تمام فراق کے نظارے ہیچ تھے۔ اگر اُن کو جبراً قتل کر دیا جاتا اور جان کے بچانے کا موقعہ نہ دیا جاتا تو اَور بات تھی۔ مجبوراً تو ایک عورت کو بھی انسان قتل کر سکتا ہے مگر ان کو بار بار موقعہ دیا گیا۔ باوجود اس مہلت ملنے کے پھر موت اختیار کرنی بڑے ایمان کو چاہتی ہے۔ اولیاء اللہ کی ایک خصلت ہوتی ہے کہ وہ موت کو پسند کرتے ہیں سو انہوں نے ظاہر کی۔

ہمارے کام کا انسان

ہمارے کام کا وہ انسان ہو سکتا ہے جبکہ ایک مدت اور نہیں تو کم از کم ایک سال ہماری مجلس میں رہے اور تمام ضروری امور کو سمجھ لیوے اور ہم اطمینان پا جاویں کہ تہذیبِ نفس اسے حاصل ہو گئی ہے۔ تب وہ بطور سفیر وغیرہ کے یورپ وغیرہ ممالک میں جا سکتا ہے مگر تہذیبِ نفس مشکل مرحلہ ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا آسان مگر یہ مشکل۔ دینی تعلیم کے لیے بہت علوم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ طہارتِ قلب اَور شئے ہے۔ خدا ایک نور جب دل میں پیدا کر دیتا ہے تو اس سے علوم خود حاصل ہوتے جاتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۵ صفحہ ۳۵۴ - ۳۵۵ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء)

۱۰ر نومبر ۱۹۰۳ء

بوقتِ ظہر

اپنے آپکو ہر آن خدا تعالیٰ کا محتاج سمجھو

شیخ فضل الٰہی صاحب سوداگر رئیس صدر بازار راولپنڈی اور جناب محمد رمضان صاحب ٹھیکیدار جہلم اور چند دیگر اصحاب نے بیعت کی۔ بعد بیعت حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذیل کی تقریر فرمائی۔

مذہب یہی ہے کہ انسان خوب غور کرے اور دیکھے اور عقل سے سوچے کہ وہ ہر آن میں خدا کا محتاج ہے اور اسکی طرف عجز سے انسان کی جان پر، مال پر، آبرو پر بڑے بڑے مصائب اور حملے ہوتے ہیں، لیکن سوائے خدا کے اور کوئی نجات دینے والا نہیں ہوتا اور ان موقعوں پر ہر ایک قسم کا فلسفہ خود بخود شکست کھا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے ایسے اصولوں پر قائم ہونا چاہا ہے کہ جن میں وہ خدا کی حاجت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ "انشاء اللہ" بھی زبان سے نکالنا ان کے نزدیک معیوب ہے مگر پھر بھی جب موت کا وقت آتا ہے تو اُن کو اپنے خیالات کی حقیقت معلوم

ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر آن میں اور اپنے ہر ایک ذرہ کے قیام کے لیے انسان کو خدا کی حاجت اور ضرورت ہے اور اگر وہ انانیت سے نکل کر غور سے دیکھے تو تجربہ سے اسے خود پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ کسقدر غلطی پر تھا اپنے آپ کو ہر آن میں خدا کا محتاج جاننا اور اس کے آستانہ پر سر رکھنا ہی اسلام ہے اور اگر کوئی مسلمان ہو کر اسلام کے طریق کو اختیار نہیں کرتا اور اس پر قدم نہیں مارتا تو پھر اس کا اسلام ہی کیا ہے؟ اسلام نام ہے خدا کے آگے گردن جھکا دینے کا۔ ذرا سوچکر دیکھو کہ اگر انسان کو ایک سوئی نہ ملے تو اس کا کسقدر حرج ہوتا ہے تو پھر کیا خدا کا وجود ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی ضرورت انسان کو نہ ہو اور اس کے وجود کے بغیر وہ زندہ رہ سکے؟ جب تک انسان کو صحت، مال، اقتدار حاصل ہوتا ہے تب تک تو اس کا یہ مذہب ہوتا ہے کہ اسباب پر توکل اور بھروسہ کرے اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا محتاج نہ جانے، لیکن جب مصائب اور مشکلات آکر پڑتے ہیں تو اس وقت یہ مذہب خود بخود بدلنا پڑتا ہے۔ اسی لیے جو لوگ مصائب اور شدائد کا نشانہ رہتے ہیں اُن کا مذہب ہی اور ہوتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسے وجود کی ضرورت ہے جو طاقت والا ہو اور ہمیں پناہ دے سکے۔

ایک صاحب محمد رمضان ہوتے تھے وہ خدا کے قائل نہ تھے مگر جب مرض الموت نے آکر اُن کو پکڑا تو آخر اپنا مذہب بدلا اور اس وقت کہتے تھے کہ اگر ایک دفعہ مجھے تندرستی حاصل ہو جاوے تو میں پھر کبھی خدا کے وجود سے منکر نہ ہوں گا۔ اس لیے انسان کو لازم ہے کہ ہمیشہ غفلت سے پرہیز کرے اور اس ذات پر نظر رکھے جس کے بغیر ایک ذرہ کا قیام بھی مشکل ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کے یہی معنے ہیں کہ انسان اس کی طرف بار بار رجوع کرے اور اس کے مقابلہ پر کسی اَور وجود اور شئے کو متصرف اور مقتدر نہ جانے جو شخص ایک بکری رکھتا ہے تو اس سے اسی وقت مستفید ہوتا ہے دودھ حاصل کرتا ہے لیکن جس نے خدا کا نام لے کر اس کی ضرورت کو بالکل محسوس نہ کیا اور نظرِ استخفاف سے اُسے دیکھا اور ایک فرضی بُت کی طرح اس کے وجود کو سمجھا تو خدا کو اس شخص کی کیا پرواہ ہے۔

انسان پر جو انقلابات آتے ہیں وہ اس ہستی کی ضرورت کو خود ثابت کرتے ہیں۔ اس جماعت میں داخل ہو کر اوّل تغیر زندگی میں کرنا چاہیئے کہ خدا پر ایمان سچا ہو کہ وہ ہر مصیبت میں کام آتا ہے۔ پھر اس کے احکام کو نظرِ خفت سے ہرگز نہ دیکھا جاوے بلکہ ایک ایک حکم کی تعظیم کی جاوے اور عملاً اس تعظیم کا ثبوت دیا جاوے مثلاً نماز کا حکم ہے۔ جب ایک شخص اسے بجا لاتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے تو بعض لوگ اس سے تمسخر کرتے ہیں اور آج کل بہت لوگ نام کے مسلمان ہیں جو کہ ارکانِ نماز کی بجا آوری کو ایک بیہودہ حرکت کہتے ہیں لیکن ایک مومن کو ہرگز لازم نہیں کہ ان باتوں اور ہنسی اور استہزاء سے وہ اس کی ادائیگی کو ترک کرے۔ لوگوں کے ایسے

خیالات اور خدا کے احکام کو نظرِ استخفاف سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ عذاب کو چاہتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی مُردوں کی سی ہے۔ انبیاء کے سلسلہ پر کہ جس کے ذریعہ سے ایمان حاصل ہوتا ہے اُن کو ایمان نہیں ہے، مگر ہم سچی اور حقیقی رؤیت سے گواہی دیتے ہیں کہ خدا برحق ہے اور سلسلہ انبیاء کا برحق ہے۔ مرنے پر ان لوگوں کو پتہ لگے گا کہ جنت اور دوزخ سب کچھ جس سے آج یہ منکر ہیں، برحق ہے۔

رعایتِ اسباب

جب سے آزادی کے خیالات اور تعلیم نے دلوں اور دماغوں میں جگہ لی ہے اُس وقت سے بہت بگاڑ پھیلا ہے۔ خیالات ایسے پراگندہ ہوئے ہیں کہ شریعت کو خود ترمیم کر لیا ہے۔ دنیا کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے۔ شریعت نے ایک حد تک رعایتِ اسباب کی اجازت دی ہے۔ مثلاً اگر ایک قطعہ زمین کا ہو اور اُسے کاشت نہ کیا جاوے تو اس کی نسبت سوال ہوگا کہ کیوں کاشت نہ کیا؟ مگر بہمہ وجوہ اسباب پر سرنگوں ہونا اور اسی پر بھروسہ کرنا اور خدا پر توکل چھوڑ دینا یہ شرک ہے، اور گویا خدا کی ہستی سے انکار۔ رعایتِ اسباب اس حد تک کرنی چاہیئے کہ شرک لازم نہ آوے۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ ہم رعایتِ اسباب سے منع نہیں کرتے مگر اس پر بھروسہ کرنے سے منع کرتے ہیں۔ دل بایار اور دست باکار والی بات ہونی چاہیئے، لیکن حال میں دیکھا جاتا ہے کہ زبانوں پر تو سب کچھ ہے توکل بھی ہے۔ توحید بھی ہے مگر دل میں مقصود بالذات صرف دنیا کو بنا رکھا ہے۔ رات دن اسی خیال میں ہیں کہ مال بہت سا مل جاوے۔ عزت دنیا میں حاصل ہو۔ یہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم زہر کھا رہے ہیں جس نے ہلاک کر دینا ہے۔

ہماری شریعت اور ہمارا دین دنیا میں کوشش کرنے سے نہیں روکتے صرف اتنی بات ہے کہ دین کو مقدم رکھ کر اگر کوشش کرے تو تلاشِ اسباب جرم نہیں ہاں ایسے طور پر جسے خدا نے حرام ٹھہرایا ہے نہ ہو۔ جیسے کہ رشوت اور ظلم وغیرہ سے روپیہ کمایا جاتا ہے۔ اگر خدا کی راہ میں صرف کرنے، اولاد پر خرچ کرنے اور صدقات وغیرہ کے لیئے تلاشِ اسباب کی جائے تو ہرج نہیں کیونکہ مال بھی تو ذریعہ قربِ الٰہی ہوتا ہے مگر خدا کو بالکل چھوڑ دینا اور بالکل اسباب کا ہو رہنا یہ ایک جذام ہے اور جب تک کہ قبضِ روح نہ ہو جاوے اس کی خبر نہیں ہوتی۔ خدا سے ڈرنا اور تقویٰ اختیار کرنا یہ بڑی نعمت ہے جسے حاصل کرنا چاہیئے اور متکبّر گردن کش نہ ہونا چاہیئے۔

حقیقی اخلاق

اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو آج کل کے نوتعلیم یافتہ پیش کرتے ہیں کہ ملاقات وغیرہ میں زبان سے چاپلوسی اور مداہنہ سے پیش آتے ہیں اور دلوں میں نفاق اور کینہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ اخلاق قرآن شریف کے خلاف ہیں۔ دوسری قسم اخلاق کی یہ ہے کہ سچی ہمدردی کرے۔ دل میں نفاق نہ ہو اور چاپلوسی اور مداہنہ وغیرہ سے کام نہ لے جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل: ۹۱) تو یہ کامل طریق ہے اور ہر ایک

کامل طریق اور ہدایت خدا کے کلام میں موجود ہے جو اس سے روگردانی کرتے ہیں وہ اَور جگہ ہدایت نہیں پا سکتے اچھی تعلیم اپنی اثراندازی کے لیے دل کی پاکیزگی چاہتی ہے جو لوگ اس سے دُور ہیں اگر عمیق نظر سے اُن کو دیکھو گے تو اُن میں ضرور گند نظر آئے گا۔ زندگی کا اعتبار نہیں ہے۔ نماز، صدق و صفا میں ترقی کرو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۶ صفحہ ۳۶۲ - ۳۶۳ مورخہ ۸؍ دسمبر ۱۹۰۳ء)

بلا تاریخ

ایمان کی حقیقت

ایمان اس بات کو کہتے ہیں کہ اس حالت میں مان لینا جبکہ ابھی علم کمال تک نہیں پہنچا اور شکوک اور شبہات سے ہنوز لڑائی ہے۔ پس جو شخص ایمان لاتا ہے یعنی باوجود کمزوری اور نہ مہیا ہونے کل اسباب یقین کے اس بات کو اغلب احتمال کی وجہ سے قبول کر لیتا ہے وہ حضرتِ احدیت میں صادق اور راستباز شمار کیا جاتا ہے اور پھر اس کو موہبت کے طور پر معرفتِ تامہ حاصل ہوتی ہے اور ایمان کے بعد عرفان کا جام اس کو پلایا جاتا ہے۔ اس لیے ایک مردِ متقی رسولوں اور نبیوں اور مامورین من اللہ کی دعوت کو سُن کر ہر ایک پہلو پر ابتداء امر میں ہی حملہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ حصہ جو کسی مامور من اللہ ہونے پر بعض صاف اور کھلے کھلے دلائل سے سمجھ آجاتا ہے۔ اسی کو اپنے اقرار اور ایمان کا ذریعہ ٹھہرا لیتا ہے اور وہ حصہ جو سمجھ میں نہیں آتا اس میں سنّتِ صالحین کے طور پر استعارات اور مجازات قرار دیتا ہے اور اس طرح تناقض کو درمیان سے اُٹھا کر صفائی اور اخلاص کیساتھ ایمان لے آتا ہے تب خدا تعالیٰ اسی کی حالت پر رحم کر کے اور کسی کے ایمان پر راضی ہو کر اور اسکی دُعاؤں کو سُن کر معرفتِ تامہ کا دروازہ اس پر کھولتا ہے اور الہام اور کشوف کے ذریعہ سے اور دوسرے آسمانی نشانوں کے وسیلہ سے یقینِ کامل تک اس کو پہنچاتا ہے لیکن متعصب آدمی جو عناد سے پُر ہوتا ہے ایسا نہیں کرتا اور نہ وہ اُن اُمور کو جو حق کے پہچاننے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں تحقیر اور توہین کی نظر سے دیکھتا ہے اور ٹھٹھے اور ہنسی میں اُن کو اُڑا دیتا ہے اور وہ امور جو ہنوز اس پر مشتبہ ہیں ان کو اعتراض کرنے کی دستاویز بناتا ہے اور ظالم طبع لوگ ہمیشہ ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

آیاتِ بیّنات، محکمات اور آیات متشابہات

چنانچہ ظاہر ہے کہ ہر ایک نبی کی نسبت جو پہلے نبیوں نے پیشگوئیاں کیں ان کے ہمیشہ دو حصے ہوتے رہے ہیں۔ ایک بیّنات اور محکمات جن میں کوئی استعارہ نہ تھا اور کسی تاویل کی محتاج نہ تھیں اور ایک متشابہات جو محتاجِ تاویل تھیں اور بعض استعارات اور مجازات کے پردے میں محجوب تھیں۔ پھر ان نبیوں کے ظہور اور بعثت کے وقت جو اُن پیشگوئیوں کے محتاج تھے دو فریق ہوتے رہے ہیں۔ ایک فریق

سعیدوں کا جنہوں نے بیّنات کو دیکھ کر ایمان لانے میں تاخیر نہ کی اور جو حصّہ متشابہات کا تھا اس کو استعارات اور مجازات کے رنگ میں سمجھ لیا۔ آئندہ کے منتظر رہے اور اس طرح پر حق کو پالیا اور ٹھوکر نہ کھائی۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے وقت میں بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلی کتابوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت دو طور کی پیشگوئیاں تھیں ایک یہ کہ وہ مسکینوں اور عاجزوں کے پیرایہ میں ظاہر ہوگا۔ اور غیر سلطنت کے زمانہ میں آئے گا اور داؤد کی نسل سے ہوگا اور حلم اور نرمی سے کام لے گا اور نشان دکھلائے گا اور دوسری قسم کی یہ پیشگوئیاں تھیں کہ وہ بادشاہ ہوگا اور بادشاہوں کی طرح لڑے گا اور یہودیوں کو غیر سلطنت کی ماتحتی سے چھڑا دیگا اور اس سے پہلے ایلیا نبی دوبارہ دُنیا میں آئے گا اور جب تک ایلیا نبی دوبارہ دُنیا میں نہ آوے وہ نہیں آئے گا۔ پھر جب حضرت عیسٰیؑ نے ظہور فرمایا تو یہود دو فریق ہوگئے۔ ایک فریق جو بہت ہی کم اور قلیل التعداد تھا۔ اس نے حضرت مسیح کو داؤد کی نسل سے پاکر اور پھر اُن کی مسکینی اور عاجزی اور راستبازی دیکھکر اور پھر آسمانی نشانوں کو ملاحظہ کرکے[۱] اور نیز زمانہ موجودہ کو دیکھ کر کہ وہ ایک نبی مصلح کو چاہتی ہے اور پہلی پیشگوئیوں کے قرار داد وقتوں کا مقابلہ کرکے یقین کرلیا کہ یہ وہی نبی ہے جس کا اسرائیل کی قوم کو وعدہ دیا گیا تھا۔ سو وہ حضرت مسیح پر ایمان لائے اور اُن کے ساتھ ہوکر طرح طرح کے دُکھ اُٹھائے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک اپنا صدق ظاہر کیا لیکن جو بدبختوں کا گروہ تھا اُس نے کُھلی کُھلی علامتوں اور نشانوں کی طرف ذرہ التفات نہ کیا۔ یہانتک کہ زمانہ کی حالت پر بھی ایک نظر نہ ڈالی اور شریرانہ حجّت بازی کے ارادے سے دوسرے حصّہ کو جو متشابہات کا حصّہ تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت گُستاخی سے اس مقدس کو گالیاں دینی شروع کیں اور اس کا نام ملحد اور بے دین اور کافر رکھا اور یہ کہا کہ یہ شخص پاک نوشتوں کے اُلٹے معنے کرتا ہے اور اس نے ناحق ایلیاہ نبی کے دوبارہ آنے کی تاویل کی ہے اور نصِ صریح کو اس کے ظاہر سے پھیرا ہے اور ہمارے علماء کو مکار اور ریاکار کہتا ہے اور کتب مقدسہ کے اُلٹے معنے کرتا ہے اور نہایت شرارت سے اس بات پر زور دیا کہ نبیوں کی پیشگوئیوں کا ایک حرف بھی صادق نہیں آتا وہ نہ بادشاہ ہوکر آیا اور نہ غیر قوموں سے لڑا اور نہ ہم کو اُن کے ہاتھ سے چھوڑایا اور نہ اس سے پہلے ایلیاء نبی نازل ہوا پھر وہ مسیح موعود کیونکر ہوگیا۔

غرض ان بدقسمت شریروں نے سچائی کے انوار اور علامات پر نظر ڈالنا نہ چاہا۔ اور جو حصہ متشابہات کا پیشگوئیوں میں تھا اس کو ظاہر پر حمل کرکے بار بار پیش کیا۔ یہی ابتلاء ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اکثر یہودیوں

---

[۱] پیشگوئیوں میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تمام باتیں ایک ہی وقت میں پوری ہوجائیں بلکہ تدریجاً پوری ہوتی رہتی ہیں اور ممکن ہے کہ بعض باتیں ایسی بھی ہوں کہ مامور کی زندگی میں پوری نہ ہوں اور کسی دوسرے کے ہاتھ سے جو اس کے متبعین میں سے ہو پوری ہوجائیں۔

کو پیش آیا۔ انہوں نے بھی اپنے اسلاف کی عادت کے موافق نبیوں کی پیشگوئیوں کے اس حصہ سے فائدہ اُٹھانا نہ چاہا جو بینات کا حصہ تھا اور متشابہات جو استعارات تھے اپنی آنکھ کے سامنے رکھ کر یا تحریف شدہ پیشگوئیوں پر زور دے کر اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دولتِ اطاعت سے جو سیدالکونین ہے محروم رہ گئے اور اکثر عیسائیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ انجیل کی کُھلی کُھلی پیشگوئیاں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تھیں۔ اُن کو تو ہاتھ تک نہ لگایا اور جو سنّت اللہ کے موافق پیشگوئیوں کا دوسرا حصہ یعنی استعارات اور مجازات تھے اُن پر گر پڑے اس لیے حقیقت کی طرف راہ نہ پا سکے، لیکن ان میں سے وہ لوگ جو حق کے طالب تھے اور جو پیشگوئیوں کی تحریر میں طرز و عادتِ الٰہی ہے اس سے واقف تھے انہوں نے انجیل کی ان پیشگوئیوں سے جو آنے والے بزرگ نبی کے بارے میں تھیں فائدہ اُٹھایا اور مشرف باسلام ہوئے اور جس طرح یہود میں سے اس گروہ نے جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے تھے پیشگوئیوں کے بیّنات سے دلیل پکڑی تھی اور متشابہات کو چھوڑ دیا تھا ایسا ہی ان بزرگ عیسائیوں نے بھی کیا اور ہزارہا نیک بخت انسان ان میں سے اسلام میں داخل ہوئے۔ غرض ان دونوں قوموں یہود و نصاریٰ میں سے جس گروہ نے متشابہات پر جم کر انکار پر زور دیا اور بینات پیشگوئیوں سے جو ظہور میں آئیں فائدہ نہ اٹھایا ان دونوں گروہ کا قرآن شریف میں جا بجا ذکر ہے اور یہ ذکر اس لیے کیا گیا کہ تا ان کی بدبختی کے ملاحظہ سے مسلمانوں کو سبق حاصل ہو اور اس بات سے متنبہ رہیں کہ یہود و نصاریٰ کی مانند بیّنات کو چھوڑ کر اور متشابہات میں پڑ کر ہلاک نہ ہو جائیں اور ایسی پیشگوئیوں کے بارے میں جو مامور من اللہ کے لیے پہلے سے بیان کی جاتی ہیں اُمید نہ رکھیں کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کی رُو سے ظاہری طور پر ہی پوری ہوں گی بلکہ اس بات کے ماننے کے لیے تیار رہیں کہ کہ قدیم سنّت اللہ کے موافق بعض حصے ایسی پیشگوئیوں کے استعارات اور مجازات کے رنگ میں بھی ہوتے ہیں اور اسی رنگ میں وہ پُوری بھی ہو جاتی ہیں مگر غافل اور سطحی خیال کے انسان ہنوز انتظار میں لگے رہتے ہیں کہ گویا ابھی وہ باتیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ آئندہ ہوں گی۔ جیسا کہ یہود ابھی تک اس بات کو روتے ہیں کہ ایلیاء نبی دوبارہ دنیا میں آئے گا اور پھر ان کا مسیح موعود بڑے بادشاہ کی طرح ظاہر ہوگا اور یہودیوں کو امارت اور حکومت بخشے گا حالانکہ یہ سب باتیں پوری ہو چکیں اور اس پر انیس سو برس کے قریب عرصہ گذر گیا اور آنے والا آبھی گیا اور اس دُنیا سے اُٹھایا بھی گیا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ صفحہ ۳۷۲ مورخہ ۱۶؍ دسمبر ۱۹۰۳ء)

محکم اور متشابہ پیشگوئیاں

یہ بات نہایت کارآمد اور یاد رکھنے کے لائق تھی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مامور ہو کر آتے ہیں خواہ وہ رسول ہوں یا نبی یا محدث اور مجدد۔ ان کی نسبت جو پہلی کتابوں میں یا رسولوں کی معرفت پیشگوئیاں کی جاتی ہیں اُن کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ علامات جو ظاہری طور پر وقوع میں آتی ہیں اور ایک متشابہات جو استعارات اور مجازات کے رنگ میں ہوتی ہیں پس جن

کے دلوں میں زیغ اور کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور طالب صادق بینات اور محکمات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہود اور عیسائیوں کو یہ ابتلاء پیش آچکے ہیں پس مسلمانوں کے اُولُوا الابصار کو چاہیئے کہ ان سے عبرت پکڑیں اور صرف متشابہات پر نظر رکھ کر تکذیب میں جلدی نہ کریں اور جو باتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے کھل جائیں ان سے اپنی ہدایت کے لیے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شک یقین کو رفع نہیں کر سکتا۔ پس پیشگوئیوں کا وہ دوسرا حصہ جو ظاہری طور پر ابھی پورا نہیں ہوا وہ ایک امر شکی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایلیاء کے دوبارہ آنے کی طرح وہ حصہ استعارہ یا مجاز کے رنگ میں پورا ہو گیا ہو مگر انتظار کرنے والا اس غلطی میں پڑا ہو کہ وہ ظاہری طور پر کسی دن پورا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض احادیث کے الفاظ محفوظ نہ رہے ہوں کیونکہ احادیث کے الفاظ وحی متلو کی طرح نہیں اور اکثر احادیث احاد کا مجموعہ ہیں۔ اعتقادی امر تو الگ بات ہے جو چاہو اعتقاد رکھو مگر واقعی اور حقیقی فیصلہ یہی ہے کہ احاد میں عند العقل امکان تغیرِ الفاظ ہے۔ چنانچہ ایک ہی حدیث جو مختلف طریقوں اور مختلف راویوں سے پہنچتی ہے اکثر ان کے الفاظ اور ترتیب میں بہت سا فرق ہوتا ہے حالانکہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی منہ سے نکلی ہے۔ پس صاف سمجھ آتا ہے کہ چونکہ اکثر راویوں کے الفاظ اور طرزِ بیان جُدا جُدا ہوتے ہیں اس لیے اختلاف پڑ جاتا ہے اور نیز پیشگوئیوں کے متشابہات کے حصہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض واقعات پیشگوئیوں کے جن کا ایک ہی دفعہ ظاہر ہونا امید رکھا گیا ہے وہ تدریجاً ظاہر ہوں یا کسی اَور شخص کے واسطہ سے ظاہر ہوں جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی کہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کُنجیاں آپ کے ہاتھ پر رکھی گئی ہیں حالانکہ ظاہر ہے کہ پیشگوئی کے ظہور سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو چکے تھے اور آنجناب نے نہ قیصر اور کسریٰ کے خزانہ کو دیکھا اور نہ کُنجیاں دیکھیں مگر چونکہ مقدر تھا کہ وہ کُنجیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وجود ظلّی طور پر گویا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی تھا اس لیے عالمِ وحی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ قرار دیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ دھوکا کھانے والے اسی مقام پر دھوکا کھاتے ہیں وہ اپنی بدقسمتی سے پیشگوئی کے ہر حصہ کی نسبت یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ ظاہری طور پر ضرور پورا ہوگا اور پھر جب وقت آتا ہے اور کوئی مامور من اللہ آتا ہے تو جو جو علامتیں اس کے صدق کی نسبت ظاہر ہو جائیں ان کی کچھ پروا نہیں رکھتے اور جو علامتیں ظاہری صورت میں پوری نہ ہوں یا ابھی اُن کا وقت نہ آیا ہو ان کو بار بار پیش کرتے ہیں۔ ہلاک شدہ اُمتیں جنہوں نے سچے نبیوں کو نہیں مانا۔ اُن کی ہلاکت کا اصل موجب یہی تھا اپنے زعم میں تو وہ لوگ اپنے تئیں بڑے ہوشیار جانتے رہے ہیں مگر ان کے اس طریق نے قبولِ حق سے اُن کو بے نصیب رکھا۔

یہ عجیب ہے کہ پیشگوئیوں کی نافہمی کے بارے میں جو کچھ پہلے زمانہ میں یہود اور نصاریٰ سے وقوع میں آیا اور انہوں نے سچوں کو قبول نہ کیا۔ ایسا ہی میری قوم مسلمانوں نے میرے ساتھ معاملہ کیا۔ یہ تو ضروری تھا کہ قدیم سنت اللہ

کے موافق وہ پیشگوئیاں جو مسیح موعود کے بارے میں کی گئیں وہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہوتیں۔ ایک حصہ بیّنات کا جو اپنی ظاہری صورت پر واقع ہونے والا تھا اور ایک حصہ متشابہات کا جو استعارات اور مجازات کے رنگ میں تھا لیکن افسوس کہ اس قوم نے بھی پہلے خطا کار لوگوں کے قدم پر قدم مارا اور متشابہات پر اڑ کر ان بیّنات کو رد کر دیا جو نہایت صفائی سے پوری ہوگئی تھیں حالانکہ شرط تقویٰ یہ تھی کہ پہلی قوموں کے ابتلاؤں کو یاد کرتے۔ متشابہات پر زور نہ مارتے اور بیّنات سے یعنی ان باتوں اور ان علامتوں سے جو روز روشن کی طرح کھل گئی تھیں فائدہ اُٹھاتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی وہ پیشگوئیاں پیش کی جاتی ہیں۔ جن کے اکثر حصّے نہایت صفائی سے پورے ہو چکے ہیں تو نہایت لاپرواہی سے اُن سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور پیشگوئیوں کی بعض باتیں جو استعارات کے رنگ میں تھیں پیش کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حصہ پیشگوئیوں کا کیوں ظاہری طور پر پورا نہیں ہوا۔ اور بایں ہمہ جب پہلے مکذبوں کا ذکر آوے جنہوں نے بعینہٖ ان لوگوں کی طرح واقع شدہ علامتوں پر نظر نہ کی اور متشابہات کا حصّہ جو پیشگوئیوں میں تھا اور استعارات کے رنگ میں تھا اس کو دیکھ کر کہ وہ ظاہری طور پر پورا نہیں ہوا حق کو قبول نہ کیا۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم ان کے زمانہ میں ہوتے تو ایسا نہ کرتے حالانکہ اب یہ لوگ ایسا ہی کر رہے ہیں جیسا کہ ان پہلے مکذبوں نے کیا۔ جن ثابت شدہ علامتوں اور نشانوں سے قبول کرنے کی روشنی پیدا ہو سکتی ہے اُن کو قبول نہیں کرتے اور جو استعارات اور مجازات اور متشابہات ہیں اُن کو ہاتھ میں لیے پھرتے ہیں اور عوام کو دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ باتیں پوری نہیں ہوئیں۔ حالانکہ سنت اللہ کی تعلیم کے طریق کے موافق ضرور تھا کہ وہ باتیں اس طرح پوری نہ ہوتیں جس طرح ان کا خیال ہے یعنی ظاہری اور جسمانی صورت پر۔ بیشک ایک حصہ ظاہری طور پر اور ایک حصّہ مخفی طور پر پورا ہو گیا لیکن اس زمانہ کے متعصب لوگوں کے دلوں نے نہیں چاہا کہ قبول کریں۔ وہ تو ہر ایک ثبوت کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں کو انسان کی مکاری خیال کرتے ہیں۔ جب خدائے قدوس کے پاک الہاموں کو سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان کا افتراء ہے مگر اس بات کا جواب نہیں دے سکتے کہ کیا کبھی خدا پر افتراء کرنے والے کو مفتریات کے پھیلانے کے لیے وہ مہلت ملی جو سچے ملہموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی۔ کیا خدا تعالیٰ نے نہیں کہا کہ الہام کا افتراء کے طور پر دعویٰ کرنے والے ہلاک کئے جائیں گے اور خدا پر جھوٹ بولنے والے پکڑے جائیں گے۔ یہ تو توریت میں بھی ہے کہ جھوٹا نبی قتل کیا جائے گا اور انجیل میں بھی ہے کہ جھوٹا جلد فنا ہوگا اور اس کی جماعت متفرق ہو جائے گی۔ کیا کوئی ایک نظیر بھی ہے کہ جھوٹے مُلہَم نے جو خدا پر افتراء کرنے والا تھا ایام افتراء میں وہ عمر پائی جو اس عاجز کو ایامِ دعوتِ الہام میں ملی؟ بھلا اگر کوئی نظیر ہے تو پیش تو کرو۔ مَیں نہایت پُرزور دعویٰ سے کہتا ہوں کہ دنیا کی ابتدا سے آج تک ایک نظیر بھی نہیں ملے گی۔

پس کیا کوئی ایسا ہے کہ اس محکم اور قطعی دلیل سے فائدہ اٹھاوے اور خدا تعالیٰ سے ڈرے؟ مَیں نہیں کہتا کہ بُت پرست عمر نہیں پاتے یا دہریہ یا انا الحق کہنے والے جلد پکڑے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان غلطیوں اور ضلالتوں کی سزا دینے کے لیے دوسرا عالم ہے لیکن مَیں یہ کہتا ہوں کہ جو شخص خدا تعالیٰ پر الہام کا افترا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الہام مجھ کو ہوا حالانکہ جانتا ہے کہ وہ الہام اس کو نہیں ہوا وہ جلد پکڑا جاتا ہے اور اس کی عمر کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ قرآن اور انجیل اور توریت نے یہی گواہی دی ہے عقل بھی یہی گواہی دیتی ہے اور اس کے مخالف کوئی منکر کسی تاریخ کے حوالہ سے ایک نظیر بھی پیش نہیں کر سکتا اور نہیں دکھلا سکتا کہ کوئی جھوٹا الہام کا دعویٰ کرنے والا پچیس برس تک یا اٹھارہ برس تک جھوٹے الہام دُنیا میں پھیلاتا رہا اور جھُوٹے طور پر خدا کا مقرب اور خدا کا مامور اور خدا کا فرستادہ اپنا نام رکھا اور اس کی تائید میں سالہائے دراز تک اپنی طرف سے الہامات تراش کر مشہور کرتا اور پھر وہ باوجود ان مجرمانہ حرکات کے پکڑا نہ گیا۔ کیا اُمید کی جاتی ہے کہ کوئی ہمارا اس سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ان کے دل جانتے ہیں کہ وہ ان سوالات کے جواب دینے سے عاجز ہیں مگر پھر بھی انکار سے باز نہیں آتے۔ بلکہ بہت سے دلائل سے ان پر حجّت وارد ہو گئی۔ مگر وہ خوابِ غفلت میں سو رہے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۸ صفحات ۳۸۲، ۳۸۳ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء)

۹ر دسمبر ۱۹۰۳ء

ابراہیم علیہ السلام کو معجزانہ طور پر آگ سے بچایا جانا

جماعت میں سے ایک ہمارے مکرم دوست نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے متعلق دریافت کیا کہ آریہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ

ان لوگوں کے اعتراض کی اصل جڑ معجزات اور خوارق پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ ہم خدا تعالیٰ کے فضل سے دعویٰ کرتے ہیں اور اسی لیے خدا تعالیٰ نے ہمیں مبعوث کیا ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر معجزات اور خوارقِ انبیاء کے مذکور ہوئے ہیں اُن کو خود دکھا کر قرآن کی حقانیت کا ثبوت دیں۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر دُنیا کی کوئی قوم ہمیں آگ میں ڈالے یا کسی اَور خطرناک عذاب اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہے تو خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق ضرور ہمیں محفوظ رکھے گا۔

بعد اس کے خدا تعالیٰ کے تصرفات اور اپنے بندوں کو عجیب طرح ہلاکت سے نجات دینے کی مثالیں

دیتے رہے اور اسی کے ضمن میں فرمایا :۔

مسیح موعود علیہ السلام کی معجزانہ حفاظت

ایک دفعہ کا ذکر ہے جب مَیں سیالکوٹ میں تھا۔ ایک مکان میں مَیں اور چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے بجلی پڑی اور ہمارا سارا مکان دھوئیں سے بھر گیا اور اس دروازہ کی چوکھٹ جس کے متصل ایک شخص بیٹھا ہوا تھا ایسی چیری گئی جیسے آرے سے چیری جاتی ہے۔ مگر اس کی جان کو کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا لیکن اسی دن۔ بجلی تیجا سنگھ کے شوالہ پر بھی پڑی اور ایک لمبا راستہ اس کے اندر کو چکر کھا کر جاتا تھا جہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تمام چکر بجلی نے بھی کھائے اور جا کر اس پر پڑی اور ایسا جلایا کہ بالکل ایک کوئلے کی شکل اسے کر دیا پھر یہ خدا کا تصرف نہیں تو اَور کیا ہے کہ ایک شخص کو بچا لیا اور ایک کو مار دیا۔ خدا نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے وہ وعدہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کا ہے۔

آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے

پس اسے کوئی مخالف آزما لے اور آگ جلا کر ہمیں اس میں ڈال دے آگ ہرگز ہم پر کام نہ کرے گی اور وہ ضرور ہمیں اپنے وعدہ کے موافق بچالے گا۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم خود آگ میں کودتے پھریں۔ یہ طریق انبیاء کا نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ : ۱۹۶) پس ہم خود آگ میں دیدہ دانستہ نہیں پڑتے۔ بلکہ یہ حفاظت کا وعدہ دشمنوں کے مقابلہ پر ہے کہ اگر وہ آگ میں ہمیں جلانا چاہیں تو ہم ہرگز نہ جلیں گے۔ اس لیے میرا ایمان تو یہ ہے کہ ہمیں تکلّف اور تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے خدا کے باطنی تصرفات ہیں ویسے ہی ظاہری بھی ہم مانتے ہیں بلکہ اسی لیے خدا نے اوّل ہی سے الہام کر دیا ہوا ہے کہ آگ سے ہمیں مت ڈراؤ آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے۔

بجز اس طریق کے کہ خدا خود ہی تجلّی کرے اَور کوئی دوسرا طریق نہیں ہے جس سے اس کی ذات پر یقین کامل حاصل ہو لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام : ۱۰۴) سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اَبصار پر وہ آپ ہی روشنی ڈالے تو ڈالے۔ اَبصار کی مجال نہیں ہے کہ خود اپنی قوت سے اسے شناخت کر لیں ان دنوں میں گھر میں کس قدر تکلیف رہی۔ گھر بھر بیماری میں مبتلا تھا لیکن اس نے اوّل ہی تسلّی دے دی تھی کہ

خوش باش عاقبت نکو خواہد بود

آریوں کی خدمتِ اسلام

آریوں کی زبان درازیاں ہمیں کیا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ انکے مذہب کی حالت تو افاقۃ الموت ہی معلوم ہوتی ہے۔ طبیبوں نے مانا ہے کہ ایسا ہوا کرتا ہے کہ جب ایک شخص مرنے کے قریب ہوتا ہے تو بعض اوقات اُٹھ کر بیٹھ جایا کرتا ہے اور معلوم ہوتا

ہے کہ تندرست ہے مگر معاً موت آ دباتی ہے۔ سو ان کا شور و شر بھی ایسا ہی ہے۔ جس مذہب میں روحانیت اور خدا سے صافی تعلق نہیں ہوتا وہ بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے۔ آریوں کی شوخی اور اس جوش و خروش سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زبان درازیوں اور شوخیوں کا بہت جلد خاتمہ ہوگا۔ جب موسم بہار ہوتا ہے تو بہت سے کیڑے پیدا ہوتے ہیں پھر جب اُن کو پَر لگتے ہیں تو وہ بہت جلد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اب خدا کے فضل سے اسلام کے لیے موسم بہار ہے ضرور ہے کہ ایسے کیڑے پیدا ہوں۔ اب اُن کو پَر لگ گئے ہیں پس یہ بھی تھوڑی مدت کے مہمان ہیں۔ اور اگر ذرا اور غور سے دیکھا جاوے اور اُن کے سب و شتم کو الگ کر دیا جاوے تو ایک طرح سے انہوں نے خدمتِ اسلام کی ہے کیونکہ زمانہ فیج اعوج تھا اور مولویوں وغیرہ سے کب یہ بات ہوئی تھی کہ اس قدر ہندوؤں سے بُت پرستی وغیرہ ترک کرواتے۔ ان لوگوں نے جو ہزاروں دیویوں اور بتوں کو ترک کیا ہے یہ خدمتِ اسلام ہی ہے۔ ذرا روحانیت ان میں آئی تو فوج در فوج اسلام میں داخل ہوں گے۔ پہلے زمانوں میں جب ہندو مسلمان ہوتے تھے وہ درحقیقت انتشارِ رُوحانیت کا زمانہ نہ تھا۔ اس لیے گمراہ رہے۔ اب جب رُوحانیت اُن میں پیدا ہوئی اور حق کو اُنہوں نے شناخت کر لیا تو بڑی شرح صدر اور زور سے اسلام میں داخل ہوں گے۔ یاد رکھو ایسے لوگوں سے ہرگز ڈرنا نہ چاہیئے۔ ڈرنا ایسے شخص سے چاہیئے کہ جس میں روحانیت ہو اس لیے کہ اس کا حملہ خدا کا حملہ ہوتا ہے۔

یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ کے معنے

یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ مسیح آ کر اپنے ہاتھ سے صلیبوں کو توڑتا پھرے گا بلکہ کسرِ صلیب میں یہ بات داخل ہے اور ہر ایک اُسے بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں کسرِ صلیب کے سامان خود مہیا ہو جاویں گے۔ اس کام کو ایک انسان (مسیح) کی طرف منسوب کرنا میرے نزدیک شرک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسیح موعود ایسے زمانے کا آدمی ہوگا جس میں یہ سامان موجود ہوں گے اور وہ اس وقت موجود ہیں۔ درحقیقت صلیب کا کاسر مسیح موعود نہ ہوگا بلکہ خود خدا ہوگا۔ اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ کوئی عیسائی دُنیا میں نہ رہے گا اسلام ہی اسلام ہوگا جبکہ خدا تعالیٰ خود قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ اُن کا وجود قیامت تک رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ کا مذہب ہلاک ہوگا اور عیسائیت نے جو عظمت دلوں پر حاصل کی ہے وہ نہ رہے گی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ صفحہ ۳۷۳، ۳۷۴ مورخہ ۱۶؍دسمبر ۱۹۰۳ء)

٭ ٭ ٭

۱۱؍دسمبر ۱۹۰۳ء

خلقِ طیور اور احیاءِ موتٰی کی حقیقت

شام کے بعد حضرت مولوی نورالدین صاحب نے عرض کیا کہ دھرمپال (نو آریہ) نے خلقِ طیور پر اور احیاءِ موتٰی پر بھی اعتراض کیا ہے۔ اس پر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ:۔

اصل میں خلقِ طیور اور احیاءِ موتٰی پر ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اس سے ایسے پرندے مراد ہیں جن کا ذبح کر کے گوشت بھی کھایا جا سکے اور نہ احیاءِ موتٰی سے یہ مطلب ہے کہ حقیقی مُردہ کا احیاء کیا گیا بلکہ مراد یہ ہے کہ خلقِ طیور اس قسم کا تھا کہ حدِ اعجاز تک پہنچا ہوا تھا اور احیاءِ موتٰی کے یہ معنے ہیں کہ اوّل رُوحانی زندگی عطا کی جاوے اور دوسرے یہ کہ بذریعہ دُعا ایسے انسان کو شفا دی جاوے کہ وہ گویا مُردوں میں شمار ہو چکا ہو جیسا کہ عام بول چال میں کہا جاتا ہے کہ فلاں تو مَر کر جیا ہے۔ لیکن ان باتوں کو لکھنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ اُن سے صاف طور پر پوچھا جاوے کہ آیا تم لوگ صورتِ اعجاز کے قائل ہو یا نہیں؟ پس اگر وہ منکر ہیں تو اُن کو چاہیئے کہ اشتہار دے دیں اور بہت صاف لفظوں میں دیں پھر شاید اللہ تعالیٰ کوئی اَور کرشمۂ قدرت دکھاوے۔ اگرچہ ایک دفعہ وہ ان کو قائل بھی کر چکا ہے۔ ہم ان کی یہ باتیں فرداً فرداً نہیں سنتے کہ عصائے موسٰیؑ کیا تھا اور خلقِ طیور کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

معجزہ نمائی کا دعوٰی

خدا کا فضل ہمارے شاملِ حال ہے اور وہ ہر وقت ہماری تائید کے لیے تیار ہے وہ صورتِ اعجاز کا انکار شائع کر دیں۔ پھر خدا تعالیٰ کی تائید دیکھ لیویں۔ قرآن کریم میں جس قدر معجزات آ گئے ہیں۔ ہم اُن کے دکھانے کو زندہ موجود ہیں خواہ قبولیتِ دُعا کے متعلق ہوں خواہ اَور رنگ کے معجزہ کے۔ معجزہ کے منکر کا یہی جواب ہے کہ اس کو معجزہ دکھایا جاوے اس سے بڑھ کر اَور کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ صفحہ ۳۷۴ مورخہ ۱۶؍دسمبر ۱۹۰۳ء)

۱۲؍دسمبر ۱۹۰۳ء

الہام

اِنِّیْ حِمَی الرَّحْمٰنِ (مَیں خدا کی باڑ ہوں)۔ فرمایا:۔
یہ خطاب میری طرف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعداء طرح طرح کے منصوبے کرتے

ہوویں گے ایک شعر بھی اس مضمون کا ہے۔

اے آنکہ سوئے من بدویدی بصد تبر ؎ از باغباں بترس کہ من شاخ مثمرم

حضرت مولٰنا نور الدین صاحب نے خدمت والا میں عرض کی کہ عُزیر کے

بعث بعد الموت

قصہ کی بابت ایک دفعہ حضور نے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ واقعہ بعث بعد الموت میں انہوں نے دیکھا اس پر آپ نے فرمایا کہ

مرنے کے بعد ایک بعث ہوتا ہے جیسے کہ حدیث میں ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ خدا سے بہت ڈرتا تھا لیکن خدا کی قدرتوں کا اُسے علم نہ تھا۔ تو اس نے وصیت کی کہ جب مَیں مَر جاؤں تو مجھے جلا دینا اور میری خاک کو دریا میں ڈال دینا (تاکہ میرے اجزاء ایسے منتشر ہوجاویں کہ پھر جمع نہ ہو سکیں) جب وہ مرگیا تو اُس کے وُرثاء نے ایسا ہی کیا۔ لیکن خدا نے اسے عالم برزخ میں پھر زندہ کیا اور پوچھا کہ کیا تو اس بات کو نہ جانتا تھا کہ ہم تیرے اجزاء کو ہر ایک مقام سے جمع کر سکتے ہیں اور تجھے ہماری قدرتوں کا علم نہ تھا۔ اس نے بیان کیا کہ چونکہ مجھے اپنے گناہوں کی سزا کا خوف تھا۔ اس لیے مَیں نے یہ تجویز کی تھی۔ آخر اس خوف کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اُسے بخش دیا۔ تو یہ بھی ایک قسم کا بعث ہے جو کہ قبل قیامت ہوتی ہے۔ اس خیال پر مَیں نے کہا ہوگا۔ مرنے کے بعد ایک ایسی حالت میں بھی انسان پڑتا ہے کہ اسے اپنے وجود کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ ایک نوم کی قسم ہوتی ہے مولوی عبد اللطیف صاحب نے جو شہادت سے اول یہ کہا تھا کہ چھ دن کے بعد زندہ ہو جاؤں گا۔ اُس کے معنے بھی یہ ہو سکتے ہیں کہ چھ دن کے بعد میری بعث ہوگی۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔

خارقِ عادت امور کا مشاہدہ

فرمایا کہ

اسی طرح ہم ہر ایک خوارقِ عادت امر پر ایمان لاتے ہیں اور اس امر کی ضرورت نہیں کہ اُس کی تفصیل بھی معلوم ہو۔ بعض وقت ایک آواز آتی ہے لیکن کوئی کلام کرنے والا معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت حیرانی ہوتی ہے۔ تو اس وقت کیا کیا جاوے؟ آخر ایمان لانا پڑتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ ایسے اُمور میں آکر انسان کو عرفان سے پھر ایمان کی طرف عود کرنا پڑتا ہے۔

حال میں ایک اخبار میں دیکھا گیا کہ ایک شخص نے کہا کہ مَیں نے ایک ایسی ہانڈی کا پکا ہوا سالن کھایا ہے جو کہ میری پیدائش سے تیس برس پیشتر کی پکی ہوئی تھی۔ جب انسان ہوا وغیرہ سے محفوظ رکھ کر ایک شئے کو اس قدر عرصہ دراز سے محفوظ رکھ سکتا ہے تو اگر خدا رکھے تو کیا بعید ہے۔

اگر یہ لوگ خوارقِ عادت کی جزئیات پر اعتراض کرتے ہیں تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شاید ۳۰۰۰ معجزات ہوں گے۔ ہم ان کے ایسے لاکھوں خوارقِ عادت پیش کر کے اعتراض کر سکتے ہیں ان کا کیا جواب

دیں گے؟ ہم تو ان باتوں کو ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی قدرت کے تصرفات دیکھتے ہیں۔ یہ کہاں تک اعتراض کریں گے خدا شناسی کا مزا یہی ہے کہ ہر ایک قسم کی قدرت کا جلوہ نظر آوے۔

آریوں کی حالت

آریوں کے خدا کی مثال تو ایسی ہے جیسے کسی کے ہاتھ میں ہڈی ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی قدرتوں پر ان کو ایمان نہیں ہے اور جب یہ نہ ہوا تو پھر اس سے نہ خوف ہوا نہ طمع نہ محبت نہ عبادت۔ ان کے لیے یہ جواب کافی ہے کہ جیسے ایک اندھے آدمی کے نزدیک ہر ایک رؤیت قابلِ اعتراض ہوتی ہے ویسے ہی وہ بھی ان باتوں کے محسوس کرنے سے معذور ہیں کیونکہ ہر ایک شے کی حس الگ الگ ہے۔ جیسے آنکھ کی حس ہے۔ تو اس سے کان کوئی فائدہ نہیں پا سکتا اور ناک کی حس کو آنکھ شناخت نہیں کر سکتی ایسے ہی ایک انسان جو کہ اعلیٰ قسم کے قویٰ لے کر آیا ہے اور اُسے امور ماوراء العقل کو محسوس کرنے کی قوت دی گئی ہے تو جو وہ دیکھتا ہے اگر دوسرے نہ دیکھیں تو سوائے اعتراض کے اور کیا کر سکتے ہیں؟ آریوں کی مشابہت اس شخص سے ہو سکتی ہے جس کی ایک آنکھ یا کان نہ ہو اور وہ دوسرے کی آنکھ کان دیکھ کر اعتراض کرے۔ وہ لوگ ان باتوں سے محروم ہیں اس لیے اعتراض کرتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۸ صفحہ ۳۸۳ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء)

۲۰ر دسمبر ۱۹۰۳ء

بوقتِ ظہر

خدمتِ دین میں آنے والی موت

حکیم آل محمد صاحب تشریف لائے اور حضرت اقدس علیہ السلام سے نیاز حاصل کیا اور عرض کی کہ امروہہ میں میرا یہی کام رہا ہے کہ اس سلسلہ الٰہی کی تبلیغ کروں اور اسی خدمت میں میری جان نکل جاوے۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

اس سے بڑھ کر اَور کیا دینی خدمت ہو گی مرنا تو ہر ایک نے ہی ہے اور اس جان نے ایک دن اس قالب کو چھوڑنا ضرور ہے مگر کیا عمدہ وہ موت ہے جو خدمتِ دین میں آوے۔

بعد نماز مغرب

بے صبری سے ابتلاء پیش آتا ہے

ایک نوجوان نے آکر حضرت اقدس سے ملاقات کی اور عرض کی کہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو

حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ کہو

تب انہوں نے اپنی ایک رؤیا سنائی جو کہ عرصہ اڑھائی سال کا ہوا دیکھی تھی۔ اس میں ان کو بتلایا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ آگئے ہوئے ہیں اور وہ مرزا قادیان والا ہے۔ پھر اس کی تائید میں انہوں نے اور چند خوابیں دیکھی تھیں وہ بھی سنائیں۔

حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ

یہ ایک دوسرے کی تائید میں ہیں۔

اس اثناء میں جوشیلا نوجوان بول اُٹھا کہ جب تک میرا دل تسلی نہ پکڑے گا۔ نہ مانوں گا اور بیعت نہ کروں گا۔ چونکہ ان کلمات سے خدا تعالیٰ کے انعامات واکرام کی قدر ناشناسی مترشح ہوتی تھی۔

اس پر خدا کے برگزیدہ نے فرمایا:۔

خدا کی قدیم سے عادت ہے کہ صابروں کے سب کام وہ آپ کرتا ہے اور بے صبری سے ابتلا پیش آتا ہے۔ ہماری شریعت میں طلبِ اسباب حرام نہیں ہے ان پر بھروسہ اور توکل ضرور حرام ہے اس لیے کوشش کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں قسم کھاتا ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا (النّٰزعٰت:۶) ماسوا اس کے خدا پر توکل اور دُعا کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔

سعید آدمی جلد باز نہیں ہوتا اور نہ وہ خدا تعالیٰ سے جلد بازی کرتا ہے خدا کا قانونِ قدرت ہے کہ ہر ایک امر بتدریج ہوتا ہے۔ آج تخم ریزی کرو تو وہ آہستہ آہستہ ایک دانہ سے ایک درخت بن جاوے گا۔ آج اگر رحم میں نطفہ پڑے تو وہ آخر نَو ماہ میں جاکر بچہ بنے گا خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب بدلہ دیا جائے گا۔ سنت اللہ کی اتباع انسان کو کرنی چاہیئے۔ جب تک خدا خود رُشد اور ہدایت نہ دے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔

مومنوں کے طبقات

انبیاء کی صحبت میں کس کس قدر لوگ رہتے تھے مگر سب ایک وقت ایمان نہیں لائے۔ کوئی کسی وقت اور کوئی کسی وقت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا اس نے آپ کا مبارک زمانہ دیکھا مگر ایمان نہ لایا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ دیکھا پھر بھی ایمان نہ لایا۔ اس سے وجہ پوچھی گئی تو بتلایا کہ کچھ میرے شبہات باقی تھے اور کچھ آثار پورے ہونے

والے تھے چونکہ اب وہ پورے ہوئے ہیں اس لیے اب مَیں ایمان لایا ہوں۔
لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ خدا نے مومنوں کے مختلف طبقات پیدا کئے ہیں لیکن ان میں سے وہ لوگ بہت تعریف کے قابل ہیں جو کسی راستباز کو چہرہ دیکھ کر شناخت کر لیتے ہیں۔

ایمان لانے والے تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں ایک تو وہ جو چہرہ دیکھ کر ایمان لاتے ہیں دوسرے وہ جو نشان دیکھ کر مانتے ہیں۔ تیسرا ایک ارذل گروہ کہ جب ہر طرح سے غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور کوئی وجہ ایمان بالغیب کی باقی نہیں رہتی تو اس وقت ایمان لاتے ہیں جیسے فرعون کہ جب غرق ہونے لگا تو اس وقت اقرار کیا۔

عمر کا اعتبار نہیں ہے غافل رہ کر اس بات کی انتظار کرنا کہ خدا خود خبر دیوے یہ نادانی ہے اب تو خود وقت ہی ایسا ہے کہ انسان خود سمجھ سکتا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کی کیا حالت ہے۔ ظاہری اور باطنی طور پر صلیبی مذہب غالب ہو گیا ہے تو کیا اب ان وعدوں کی رُو سے جو کہ قرآن میں ہیں یہ وقت نہ تھا کہ خدا اپنے دین کی مدد کرتا۔ اس کے علاوہ مدعی اور اس کے دعویٰ کے دلائل کو دیکھے اور غور کرے۔ جو پیاسا ہے وہ دور رہ کر کنوئیں سے یہ کہے کہ پانی میرے مُنہ میں خود بخود آجاوے یہ نادانی ہے اور ایسا شخص خدا کی بے ادبی کرتا ہے۔

متقی کی تعریف

تقویٰ اس بات کا نام ہے کہ جب وہ دیکھے کہ مَیں گناہ میں پڑتا ہوں تو دُعا اور تدبیر سے کام لیوے ورنہ نادان ہوگا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ (الطلاق: ۳-۴) کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ ہر ایک مشکل اور تنگی سے نجات کی راہ اس کے لیے پیدا کر دیتا ہے متقی درحقیقت وہ ہے کہ جہانتک اس کی قدرت اور طاقت ہے وہ تدبیر اور تجویز سے کام لیتا ہے جیسا کہ قرآن شریف کے شروع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ الٓمّٓ ۔ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۔ (البقرۃ: ۲-۴)

ایمان بالغیب کے یہ معنے ہیں کہ وہ خدا سے اڑ نہیں باندھتے۔ بلکہ جو بات پردۂ غیب میں ہو اس کو قرائن مرجحہ کے لحاظ سے قبول کرتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ صدق کے وجوہ کذب کے وجوہ پر غالب ہیں۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ انسان یہ خیال رکھے کہ آفتاب کی طرح ہر ایک امر اس پر منکشف ہو جاوے۔ اگر ایسا ہو تو پھر تبلاؤ کہ اس کے ثواب حاصل کرنے کا کونسا موقعہ ملا؟ کیا اگر ہم آفتاب کو دیکھ کر کہیں کہ ہم اُس پر ایمان لائے تو ہم کو ثواب ملتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس میں غیب کا پہلو کوئی بھی نہیں، لیکن جب

ملائکہ، خدا اور قیامت وغیرہ پر ایمان لاتے ہیں تو ثواب ملتا ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ان پر ایمان لانے میں ایک پہلو غیب کا پڑا ہوا ہے۔ ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ اخفاء بھی ہو اور طالب حق چند قرائن صدق کے لحاظ سے ان باتوں کو مان لے۔

اور وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ: ۴) کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ ہم نے ان کو عقل، فکر، فہم فراست اور رزق اور مال وغیرہ عطا کیا ہے اس میں سے خدا تعالیٰ کی راہ میں اس کے لیے صرف کرتے ہیں یعنی فعل کے ساتھ بھی کوشش کرتے ہیں۔ پس جو شخص دعا اور کوشش سے مانگتا ہے وہ متقی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحۃ: ۵) یاد رکھو کہ جو شخص پورے فہم اور عقل اور زور سے تلاش نہیں کرتا وہ خدا کے نزدیک ڈھونڈنے والا نہیں قرار پاتا اور اس طرح سے امتحان کرنے والا ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ کوششوں کیساتھ دعا بھی کرتا ہے اور پھر اسے کوئی لغزش ہوتی ہے تو خدا اُسے بچاتا ہے اور جو آسانی تن کے ساتھ دروازہ پر آتا ہے اور امتحان لیتا ہے تو خدا کو اُس کی پروا نہیں ہے۔ ابوجہل وغیرہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تو نصیب ہوئی اور وہ کئی دفعہ آپ کے پاس آیا بھی لیکن چونکہ آزمائش کے لیے آتا رہا اس لیے گر گیا اور اسے ایمان نصیب نہ ہوا۔

بیعت ہم پر احسان نہیں

اگر کوئی شخص بیعت کر کے یہ خیال کرتا ہے کہ ہم پر احسان کرتا ہے تو یاد رکھے کہ ہم پر کوئی احسان نہیں بلکہ یہ خدا کا اس پر احسان ہے کہ اس نے یہ موقعہ اُسے نصیب کیا۔ سب لوگ ایک ہلاکت کے کنارے پر پہنچے ہوئے تھے۔ دین کا نام و نشان نہ تھا اور تباہ ہو رہے تھے۔ خدا نے اس کی دستگیری کی (کہ یہ سلسلہ قائم کیا) اب جو اس مائدہ سے محروم رہتا ہے وہ بے نصیب ہے لیکن جو اس کی طرف آوے۔ اُسے چاہیئے کہ اپنی پوری کوشش کے بعد دُعا سے کام لیوے۔ جو شخص اس خیال سے آتا ہے کہ آزمائش کرے کہ فلاں سچا ہے یا جھوٹا وہ ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ آدمؑ سے لیکر اس وقت تک کوئی ایسی نظیر نہ پیش کرسکو گے کہ فلاں شخص فلاں نبی کے پاس آزمائش کے لیے آیا اور پھر اسے ایمان نصیب ہوا ہو۔ پس چاہیئے کہ خدا کے آگے روئے اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر گریہ وزاری کرے کہ خدا اُسے حق دکھا دے۔

دلیلِ صداقت

وقت خود ایک نشان ہے اور وہ بتلا رہا ہے کہ اس وقت ایک مصلح کی ضرورت ہے۔ اب وقت آزمائش اور امتحان کا ہرگز نہیں ہے۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو بتلائے کہ ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔ مکہ میں اگر صدہا آدمی انکار کر کے تباہ ہوئے تو بتلاؤ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کا کیا بگاڑ لیا۔ ایک مُرتد ہوتا تو خدا سَو اَور لے آتا کیا یہ غور کی بات نہیں کہ اگر ہمارا کارخانہ خدائی نہ ہوتا تو یہ آج تک کب کا تباہ ہو جاتا۔ ایک وہ وقت تھا کہ مَیں اکیلا پھرتا تھا اور اب وہ وقت ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ آدمی میرے ساتھ ہیں۔ آج سے ۲۲۔۲۳ برس پیشتر اس نے بتلایا جو کہ براہین میں درج ہے کہ مَیں تجھے کامیاب کروں گا اور لاکھوں آدمیوں کو تیرے ساتھ کروں گا۔ اس کتاب کو لے کر دیکھو اور پڑھو اور پھر سوچو کہ کیا یہ انسان کا فعل ہے کہ اس قدر دراز زمانہ پیشتر ایک خبر کو درج کرے اور پھر اس قدر مخالفت ہو اور وہ بات پوری ہو کر رہے پس جو شخص خدا کے اس فعل پر ایمان نہیں لاتا وہ بدبخت مرے گا۔

نشان نمائی کا مطالبہ کرنیوالے

نشان دیکھنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو لیکھرامی کہ شوخی اور شرارت کرتے ہیں اور خدا کی باتوں پر ہنسی اور تمسخر اُن کا کام ہوتا ہے ایسے جہنم واصل ہوتے ہیں جیسے کہ لیکھرام ہوا۔

اور ایک وہ کہ سنّت نبوی کے موافق نشان چاہتے ہیں کہ دُنیا کی حیثیت بھی بنی رہے اور نشان بھی ظاہر ہو یہ نہیں کہ قیامت کا نمونہ اُن کے لیے ظاہر ہو اور خدا تعالیٰ تمام کائنات کو زیر و زبر کر دے (اس صورت میں جب وہ خود مر ہی جائے گا تو نشان کون دیکھے گا) ایمان کی حد یہی ہے کہ عقل بھی خرچ ہو اور انسان فہم و فراست سے کام لے کر قرائنِ مُرجّحہ کو دیکھے۔ نہ یہ چاہے کہ سب کچھ انکشاف ہو جاوے۔ تو پھر اسے ثواب کس بات کا؟ وہ تو ایمان ہی نہیں ہے جس میں پردہ نہیں ہے اس لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ نشان کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان نفع نہ دیگا۔ انسان من وجہ دیکھے کہ زمانہ کی ضرورت کیا تقاضا کرتی ہے۔ وہ ایک مصلح کو چاہتی ہے کہ نہیں۔ پھر ان وعدوں پر نظر ڈالے جو نصرت اور تائید کے خدا نے ہم سے قبل از وقت کئے اور وہ سب پورے ہوئے۔ غرضیکہ ان سب باتوں پر جب یکجائی نظر کر کے پھر بھی کوئی نہیں مانتا تو وہ کبھی نہ مانے گا۔ ایسے ضدی لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا کہ حرامکار لوگ معجزہ طلب کرتے ہیں مگر اُن کو کوئی معجزہ نہ دیا جاوے گا۔ پس ایسی باتوں سے ڈرنا چاہیئے۔ آبائی تقلید اور رسم اور عقائد کی پابندی کا ڈر نہ ہونا چاہیئے یہ کوئی شئے نہیں ہیں۔ نہ اُن سے انسان کو تسلی ملتی ہے۔ وہ نُور جو آسمان سے نازل ہوتا ہے وہ حقیقی تسلی دیتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۸ صفحہ ۳۸۳۔۳۸۴ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء)

۱۲ردسمبر ۱۹۰۳ء

تقریر کی اہمیت

بعد نماز عید الفطر ظہر کے وقت جب حضرت اقدس مسجد میں تشریف لائے تو بعض احباب نے ذکر کیا کہ گورداسپور میں چند ایک شخص ایسے ہیں جن

کو بڑا اشتیاق حضور کی زبان مبارک سے دعویٰ سننے کا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:۔

اگر کوئی تقریب نکل آئی تو انشاء اللہ وہاں ایک مجمع کر کے بیان کر دیئے جاویں گے اصل ذریعہ تبلیغ کا تقریر ہی ہے اور انبیاء اس کے وارث ہیں۔ اب انگریزوں نے اسی کی تقلید کی ہے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں انکا طریق تعلیم یہی ہے کہ تقریروں کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض وقت اس قدر لمبی تقریر فرماتے تھے کہ صبح سے لیکر شام تک ختم نہ ہوتی تھی۔ درمیان میں نمازیں آجاتیں تو آپ ان کو ادا کر کے پھر تقریر شروع کر دیتے تھے۔

ماموریں سے غریب لوگ ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں

اپنے مخالفین اور طبقہ امراء و رؤساء کے متعلق فرمایا کہ:۔

میرا خیال ہے کہ اکثر اُن میں سے بدنصیب ہی مریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کسقدر بادشاہ تھے جو اس وقت آپ کے معاصرین سے تھے لیکن اُن کو قبولیت کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ پھر خدا تعالیٰ نے اُن کے بعد غریبوں کو بادشاہ کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہمارے متبعین پر بھی ایک زمانہ ایسا آویگا کہ عروج ہی عروج ہوگا، لیکن یہ ہمیں خبر نہیں کہ ہمارے دَور میں ہو یا ہمارے بعد ہو۔ خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ سو یہ بات ابھی پوری ہونے والی ہے۔ یہ لوگ اگر اس وقت سمجھ بھی لیویں تو بھی جو اِن کی خود تراشیدہ مصلحتیں ہیں وہ قبولیت کی اجازت نہیں دیتیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ اول گروہ غرباء کو اپنے لیے منتخب کیا کرتا ہے اور پھر انہیں کو کامیابی اور عروج حاصل ہوا کرتا ہے۔ کوئی نبی نہیں گذرا کہ وہ (ظاہری حیثیت سے بھی) دنیا میں ناکامیاب رہا ہو۔ ہمیں اس امر سے ہرگز تعجب نہیں کہ ہمارے متبعین امیر نہ ہوں گے۔ امیر تو یہ ضرور ہونگے لیکن افسوس اس بات سے آتا ہے کہ اگر یہ دولت مند ہو گئے تو پھر انہی لوگوں کے ہمرنگ ہو کر دین سے غافل نہ ہو جاویں اور دنیا کو مقدم کر لیں۔ جب تک کمزوری اور غریبی ہوتی ہے تب تک تقویٰ بھی انسان کے اندر ہوتا ہے۔ صحابہؓ کی بھی اول یہی حالت تھی۔ پھر جب کروڑ ہا مسلمان ہو گئے اور تموّل وغیرہ اُن میں آگیا تو خبیث بھی آکر شامل ہو گئے۔ ہم بھی خدا تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں کہ ہماری جماعت کی تعداد غرباء میں ترقی کر رہی ہے۔

بعد نماز مغرب

مسیح موعود علیہ السلام کی سادگی

بعد ادائیگی نماز مغرب حضرت اقدس نے جلسہ فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد جناب نواب محمد علی خانصاحب کے

صاحبزادہ زریں لباس سے مُلبّس حضور کی خدمت میں نیازمندانہ طریق پر حاضر ہوئے۔ آپ نے اُنکو اپنے پاس جگہ دی۔ ان کو اس ہیئت میں دیکھ کر خدا تعالیٰ کے برگزیدہ نے بڑی سادگی سے جناب نواب صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی کیا رسم ادا ہونی ہے؟ نواب صاحب نے جواب دیا کہ آمین ہے۔ اس اثناء میں ایک سرپوش کا تھال آیا اور وہ حضور علیہ السلام کے روبرو دھرا گیا۔ چند لمحہ کے بعد پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ اب آگے کیا ہونا ہے۔ عرض کی گئی کہ اسے دستِ مبارک لگا دیا جاوے اور دُعا فرمائی جاوے۔ چنانچہ حضور نے ایسا ہی کیا اور پھر فوراً تشریف لے گئے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۰۴ء)

۲۳ر دسمبر ۱۹۰۳ء

اسوۂ عبداللطیف کا اتباع

فرمایا کہ

عبداللطیف صاحب ایک اُسوہ چھوڑ گئے ہیں جس کی اتباع جماعت کو چاہیئے۔

صُحبت کی اہمیّت

ایک انگریز کا ذکر تھا جو کہ اپنی عقیدت حضرت اقدس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ کشمیر میں ایک بڑا ہوٹل بناؤں اور وہاں ہر ملک و دیار کے لوگ جو سیر و سیاحت کے لیے آتے ہیں ان کو تبلیغ کروں۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

ہمیں اس سے دُنیاداری کی بُو آتی ہے۔ اگر اسے سچّا اخلاص خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اس کی غرض تحصیلِ دین ہے تو اوّل یہاں آ کر رہے۔

سُنّت اللہ کے آگے عقل کی بھی کچھ پیش نہیں چلتی۔ عقل تو یہی چاہتی تھی۔ کہ فی الفور ان باتوں کو مان لیا جاوے جو ہم نے پیش کی ہیں مگر سنّت اللہ نہ چاہتی تھی۔ کسی فرقہ میں شامل ہونے کے لیے سچا جوش اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ اوّل کامل وجوہات دل میں جانشین ہوں۔ اس کے بعد پھر وہ شخص ہر ایک بات کو قبول کر لیتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور بڑے بڑے نقصان برداشت کئے۔ اُن کو اس بات کا علم تھا کہ صحبت سے جو بات حاصل ہوتی ہے وہ اَور طرح ہرگز حاصل نہ ہو گی۔ حُسنِ ظن بھی اگرچہ عمدہ شَے ہے مگر افراط تک اسے پہنچانا غلطی ہے۔ ہمارے حصّہ کا جو یورپین ہو گا ہم خود اسے پہچان لیں گے کہ یہ ہے۔

عجائباتِ قدرت دکھلانے کے لیے ضروری ہے کہ مخالفت بھی ہو اور روکنے والے بھی ہوں کیونکہ بغیر اس کے خدا تعالیٰ کی قدرت کے ہاتھ کا پتہ کیسے لگ سکتا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۸ ؍جنوری ۱۹۰۴ء)

۲۴؍دسمبر ۱۹۰۳ء

ایک معجزہ

یہ ایک معجزہ ہے اور بڑی خوبی کا معجزہ ہے۔ بشرطیکہ انصاف سے اس پر نظر کی جاوے کہ آج سے ۲۳ یا ۲۴ برس پیشتر کی کتاب براہین احمدیہ تصنیف شدہ ہے اور اس کی جلدیں اسی وقت کی ہر ایک مذہب اور ملت کے پاس موجود ہیں۔ یورپ بھی بھیجی گئی، امریکہ میں بھی بھیجی گئی لنڈن میں اس کی کاپی موجود ہے۔ اس میں بڑی وضاحت سے یہ لکھا ہوا موجود ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ فوج در فوج تمہارے ساتھ ہوں گے۔ حالانکہ جب یہ کلمات لکھے اور شائع کئے گئے تھے اس وقت فردِ واحد بھی میرے ساتھ نہ تھا۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے ایک دُعا سکھلائی جو کہ بطور گواہ اس میں لکھی ہوئی ہے رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ (الانبیاء : ۹۰) خدا تعالیٰ کا اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ تو اکیلا ہے اور پھر تاکید کی کہ تو مخلوق کی ملاقات سے تھکنا مت اور چیں بجبیں نہ ہونا۔ تو اب غور کرنے کی جا ہے کہ کیا یہ کسی انسان کا اقرار ہو سکتا ہے اور پھر ایک زبان میں نہیں بلکہ چار زبانوں میں یہ الہام فوج در فوج لوگوں کے ساتھ ہونے کا ہے یعنی انگریزی، اُردو، فارسی، عربی میں۔ بڑے بڑے گواہ اگرچہ ہمارے مخالف ہیں۔ موجود ہیں۔ محمد حسین بھی زندہ ہے۔ یہاں کے لوگ بھی جانتے ہیں۔ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ اس وقت کون کون ہمارے ساتھ تھا۔ بلکہ وہ ایک گم زمانہ تھا۔ کوئی مجھے نہ جانتا تھا۔ اب دیکھو کہ وہ بات کیسی پوری ہوئی ہے حالانکہ ہر فرقہ اور ملت کے لوگوں نے ناخنوں تک مخالفت میں زور لگایا اور ہماری ترقی اور کامیابی کو روکنا چاہا لیکن اُن کی کوئی پیش نہ گئی اور اس مخالفت کا ذکر بھی اسی کتاب براہین میں موجود ہے۔ اب بتلا دیں کہ کیا یہ معجزہ ہے کہ نہیں؟ ہم اُن سے نظیر طلب کرتے ہیں کہ آدمؑ سے لے کر اس وقت تک وہ کسی ایسے مفتری کی خبر دیویں کہ اس نے افترا علی اللہ کیا ہو اور اس پر متصرّرہ کر ۲۴ یا ۲۵ سال کا زمانہ پایا ہو۔ یہ ایک بڑا نشان اور معجزہ ہے۔ اسے عقلمندوں اور اہل الرائے کو دکھلاؤ اور اُنکے سامنے پیش کرو کہ وہ اس کی نظیر پیش کریں کہ اس طرح کی پیشگوئی ہو اور باوجود اس قدر مخالفت کے پھر پوری ہو جاوے ایک طالبِ حق کے لیے یہ معجزہ کافی ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۸ ؍جنوری ۱۹۰۴ء)

۲۵ر دسمبر ۱۹۰۳ء

اکرام ضیف

شام کے وقت بہت سے احباب بیرونجات سے آئے ہوئے تھے۔ آپ نے میاں نجم الدین صاحب مہتمم لنگر خانہ کو بلوا کر تاکیداً فرمایا کہ :-

دیکھو بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں ان میں سے بعض کو تم شناخت کرتے ہو اور بعض کو نہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ سب کو واجب الاکرام جان کر تواضع کرو۔ سردی کا موسم ہے چائے پلاؤ اور تکلیف کسی کو نہ ہو۔ تم پر میرا حسنِ ظن ہے کہ مہمانوں کو آرام دیتے ہو۔ ان سب کی خوب خدمت کرو۔ اگر کسی کو گھر یا مکان میں سردی ہو تو لکڑی یا کوئلہ کا انتظام کر دو۔

دینی علوم کی تحصیل کیلئے تقویٰ اور طہارت کی ضرورت ہے

جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے روشنی نہ ہو تب تک انسان کو یقین نہیں ملتا۔ اس کی باتوں میں تناقض ہوگا۔ دینی اور دنیاوی علوم میں یہ فرق ہے کہ دنیاوی علوم کی تحصیل اور اُن کی باریکیوں پر واقف ہونے کے لیے تقویٰ طہارت کی ضرورت نہیں ہے ایک پلید سے پلید انسان خواہ کیسا ہی فاسق فاجر ہو، ظالم ہو، وہ اُن کو حاصل کر سکتا ہے چوڑھے چمار بھی ڈگریاں پا لیتے ہیں، لیکن دینی علوم اس قسم کے نہیں ہیں کہ ہر ایک اُن کو حاصل کر سکے ان کی تحصیل کے لیے تقویٰ اور طہارت کی ضرورت ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ : ۸۰) پس جس شخص کو دینی علوم حاصل کرنے کی خواہش ہے اسے لازم ہے کہ تقویٰ میں ترقی کرے۔ جس قدر وہ ترقی کرے گا اسی قدر لطیف دقائق اور حقائق اس پر کھلیں گے۔

تقویٰ کا مرحلہ بڑا مشکل ہے اُسے وہی طے کر سکتا ہے جو بالکل خدا تعالیٰ کی مرضی پر چلے۔ جو وہ چاہے وہ کرے اپنی مرضی نہ کرے۔ بناوٹ سے کوئی حاصل کرنا چاہے تو ہرگز نہ ہوگا۔ اس لیے خدا کے فضل کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو دُعا کرے اور ایک طرف کوشش کرتا رہے۔ خدا تعالیٰ نے دُعا اور کوشش دونو کی تاکید فرمائی ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں تو دُعا کی تاکید فرمائی ہے۔ اور وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) میں کوشش کی جب تک تقویٰ نہ ہوگا اولیاء الرحمٰن میں ہرگز داخل نہ ہوگا اور جب تک یہ نہ ہوگا حقائق اور معارف ہرگز نہ کھلیں گے۔ قرآن شریف کی عروس اسی وقت پردہ اُٹھاتی ہے جب اندرونی غبار دُور ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جس قدر محنت اور دُعا دنیوی اُمور کے لیے ہوتی ہے خدا تعالیٰ کے لیے اس قدر بالکل نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو عام رسمی رواجی الفاظ میں کہ صرف زبان پر

ہی وہ مضمون ہوتا ہے نہ کہ دل میں۔ اپنے نفس کے لیے تو بڑے سوز اور گداز ش سے دعائیں کرتے ہیں کہ قرض سے خلاصی ہو یا فلاں مقدمہ میں فتح ہو یا مرض سے نجات ملے مگر دین کے لیے ہرگز وہ سوزش و گدازش نہیں ہوتی۔

دُعا صرف لفظوں کا نام نہیں کہ موٹے اور عمدہ عمدہ لفظ بول لیے بلکہ یہ اصل میں ایک موت ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) کے یہی معنے ہیں کہ انسان سوز و گدازش میں اپنی حالت موت تک پہنچا وے مگر جاہل لوگ دُعا کی حقیقت سے ناواقف اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ جب کوئی خوش قسمت انسان ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا اور اس کے افکار کیا شئے ہے۔ اصل بات تو دین ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہوا تو سب ٹھیک ہے۔ ؎

شبِ تنور گذشت و شبِ سمور گذشت

یہ زندگی خواہ تنگی سے گذرے خواہ فراخی سے وہ آخرت کی فکر کرتا ہے۔

کوئی پاک نہیں بن سکتا جب تک خدا تعالیٰ نہ بناوے۔ جب خدا تعالیٰ کے دروازہ پر تذلل اور عجز سے اس کی رُوح گرے گی تو خدا تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے گا اور وہ متقی بنے گا اور اس وقت وہ اس قابل ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو سمجھ سکے۔ اس کے بغیر جو کچھ وہ دین دین کر کے پکارتا ہے اور عبادت وغیرہ کرتا ہے۔ وہ ایک رسمی بات اور خیالات ہیں کہ آبائی تقلید سے سُن سُنا کر بجالاتا ہے۔ کوئی حقیقت اور رُوحانیت اس کے اندر نہیں ہوتی۔

لیلۃ القدر کے معنے اور اس میں عمل کی قدر

اس سے پیشتر بھی مَیں نے لکھا ہے کہ ہم لیلۃ القدر کے دونوں معنوں کو مانتے ہیں ایک وہ جو عُرف عام میں ہیں کہ بعض راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ خدا تعالیٰ اُن میں دُعائیں قبول کرتا ہے اور ایک اس سے مراد تاریکی کے زمانہ کی ہے۔ جس میں عام ظلمت پھیل جاتی ہے۔ حقیقی دین کا نام و نشان نہیں رہتا۔ اس میں جو شخص خدا تعالیٰ کے سچے متلاشی ہوتے ہیں۔ اور اس کی اطاعت کرتے ہیں وہ بڑے قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک بادشاہ ہو اور اس کا ایک بڑا لشکر ہو۔ دشمن کے مقابلہ کے وقت سب لشکر بھاگ جاوے اور صرف ایک یا دو آدمی رہ جاویں اور انہیں کے ذریعہ سے اسے فتح حاصل ہو۔ تو اب دیکھ لو کہ ان ایک یا دو کی بادشاہ کی نظر میں کیا قدر ہوگی۔ پس اس وقت جبکہ ہر طرف دہریت پھیلی ہوئی ہے کوئی تو قول سے اور کوئی عمل سے خدا تعالیٰ کا انکار کر رہا ہے۔ ایسے وقت میں جو خدا تعالیٰ کا حقیقی پرستار ہوگا وہ بڑا قابلِ قدر ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی لیلۃ القدر کا زمانہ تھا۔ اس وقت کی تاریکی اور ظلمت کی بھی کوئی انتہا نہ تھی ایک طرف یہود گمراہ۔ ایک طرف عیسائی گمراہ۔ ادھر ہندوستان میں دیوتا پرستی۔ آتش پرستی وغیرہ۔ گویا سب دنیا میں بگاڑ پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت بھی جبکہ ظلمت انتہا تک پہنچ گئی تھی تو اس نے تقاضا کیا تھا کہ ایک نور آسمان سے نازل

ہو۔ سو وہ نور جو نازل ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ظلمت اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو وہ نور کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے کہ جب چاند کی ۲۹ تاریخ ہو جاتی ہے اور رات بالکل اندھیری ہوتی ہے تو نئے چاند کے نکلنے کا وقت ہوتا ہے تو اس زمانہ کو بھی خدا تعالیٰ نے لیلۃ القدر کے نام سے موسوم کیا ہے جیسے کہ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (القدر: ۲) اسی طرح جب نور اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو پھر وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے جیسے کہ چاند کو دیکھتے ہو اور اسی طرح سے یہ قیامت تک رہے گا کہ ایک وقت نور کا غلبہ ہو گا اور ایک وقت ظلمت کا۔

خدا شناسی کی ضرورت

یہ دنیا چند روزہ ہے اور ایسا مقام ہے کہ آخر فنا ہے۔ اندر ہی اندر اس فنا کا سامان لگا ہوا ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے مگر خبر نہیں ہوتی اس لیے خدا شناسی کی طرف قدم جلد اُٹھانا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کا مزا اُسے آتا ہے جو اسے شناخت کرے اور جو اس کی طرف صدق و وفا سے قدم نہیں اُٹھاتا اس کی دُعا کھلے طور پر قبول نہیں ہوتی۔ اور کوئی نہ کوئی حصہ تاریکی کا اسے لگا ہی رہتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف ذرا سی حرکت کرو گے تو وہ اس سے زیادہ تمہاری طرف حرکت کرے گا لیکن اول تمہاری طرف سے حرکت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ خام خیالی ہے کہ بلا حرکت کئے اس سے کسی قسم کی توقع رکھی جاوے یہ سنت اللہ اسی طریق سے جاری ہے کہ ابتدا میں انسان سے ایک فعل صادر ہوتا ہے۔ پھر اس پر خدا تعالیٰ کا ایک فعل نتیجۃً ظاہر ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنے مکان کے کل دروازے بند کر دے گا تو یہ بند کرنا اس کا فعل ہو گا۔ خدا تعالیٰ کا فعل اس پر یہ ظاہر ہو گا کہ اس مکان میں اندھیرا ہو جاوے گا لیکن انسان کو اس کوچہ میں پڑ کر صبر سے کام لینا چاہیئے۔

بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے سب نیکیاں کیں۔ نماز بھی پڑھی روزے بھی رکھے۔ صدقہ خیرات بھی دیا مجاہدہ بھی کیا مگر ہمیں وصول کچھ نہیں ہوا۔ تو ایسے لوگ شقی ازلی ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ انہوں نے سب اعمال خدا تعالیٰ کے لیے کئے ہوتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کے لیے کوئی فعل کیا جاوے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ضائع ہو اور خدا تعالیٰ اس کا اجر اسی زندگی میں نہ دیوے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ شکوک و شبہات میں رہتے ہیں اور اُن کو خدا تعالیٰ کی ہستی کا کوئی پتہ نہیں لگتا کہ ہے بھی کہ نہیں۔ ایک پارچہ سلا ہوا ہو تو انسان جان لیتا ہے کہ اس کے سینے والا ضرور کوئی ہے۔ ایک گھڑی ہے وقت دیتی ہے۔ اگر جنگل میں بھی انسان کو مل جائے تو وہ خیال کرے گا کہ اس کا بنانے والا ضرور ہے۔ پس اسی طرح خدا تعالیٰ کے افعال کو دیکھو کہ اس نے کس کس قسم کی گھڑیاں بنا رکھی ہیں اور کیسے کیسے عجائباتِ قدرت ہیں ایک طرف تو اس کی ہستی کے عقلی دلائل ہیں۔ ایک طرف نشانات ہیں۔ وہ انسان کو منوا دیتے ہیں کہ ایک عظیم الشان قدرتوں والا خدا موجود ہے وہ پہلے اپنے برگزیدہ

پر اپنا ارادہ ظاہر فرماتا ہے اور یہی بھاری شئے ہے جو انبیاء لاتے ہیں اور جس کا نام پیشگوئی ہے۔ ایک انسان کاغذ کا کبوتر بنا کر دکھلاوے تو اس کی نظیر دوسرے بھی کر کے دکھا دیتے ہیں اور اُسے اعجاز میں شمار نہیں کیا جاتا۔ مگر پیشگوئی کا میدان وسیع ہے۔ اس کی نظیر پیدا کرنا انسان کا کام نہیں۔ ہزار ہزار برس پیشتر اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنے ارادہ سے اطلاع دیتا ہے اور پھر وہ بات اپنے وقت پر پوری ہو کر رہتی ہے۔ مثلاً براہین کی ہی پیشگوئیوں کو دیکھو کہ جسقدر مخالفت ہو رہی ہے۔ مقدمات ہوئے۔ گورنمنٹ تک نوبت پہنچی۔ یہ سب اول سے اس میں درج ہیں اور پھر کامیابی، فتح اور نصرت کی بھی خبر اول سے ہی دیدی۔ کوئی سوچ کر بتلاوے کہ اس میں کیا فریب اور شعبدہ ہے۔ ۲۳-۲۴ سال پیشتر کی چھپی ہوئی یہ کتاب ہے۔ کوئی بتلا سکتا ہے کہ ہمارے پاس اس وقت کون کون ہوتا تھا۔ اگر اہل الرائے کے نزدیک یہ ایک انسانی فعل ہے اور خدا تعالیٰ کا نہیں ہے تو وہ اس کی نظیر پیش کریں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ جبکہ یہ حال ہے تو پھر اُسے کیوں خدا تعالیٰ کا کلام نہ کہا جاوے۔

جس قدر لوگ ہماری صحبت میں رہنے والے ہیں ان میں کوئی اُٹھ کر بتلا دے کہ کیا کوئی ایسا فرد بشر بھی ہے کہ اس نے کوئی نشان نہ دیکھا ہو۔ ہمارے پر سلطنت ایسے لوگوں کی ہے جو پیچے اور کامل خدا سے بالکل بے خبر ہیں۔ دنیاوی امور میں اس قدر مصروفیت ہے کہ دین سے بالکل غافل رہے اور وہی فلسفہ کا زور۔ اس لیے دہریت اُن میں آگئی۔ اب ہمارا بڑا کام یہ ہے کہ نئے سرے سے بنیاد ڈالیں اور ان کو دکھا دیویں کہ خدا ہے۔

ہر ایک ہمارے پاس کسی نہ کسی ضرورت کے لیے آتا ہے مگر اصل میں بڑی ضرورت خدا شناسی کی ہے۔ اسی کے نہ ہونے سے گناہ ہوتا ہے۔ کتا ایک ذلیل سے ذلیل جانور ہے مگر اس سے خوف زدہ ہو کر وہ راہ چھوڑ دیتا ہے اسی طرح جس راہ میں اسے علم ہو کہ سانپ یا بھیڑیا ہے تو اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ ادنیٰ ترین جانوروں سے ڈرتا ہے تو کیا خدا کے وجود کا اسے اتنا بھی خوف نہیں کہ اس سے ڈر کر گناہ سے باز رہے۔ زہر اس کے سامنے ہو تو اُسے نہیں کھائے گا لیکن گناہ کو دیدہ دانستہ کر لیگا۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود پر یقین نہیں ہے۔ حالانکہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اُس نے ایک جہنم یہاں بھی تیار کر رکھا ہے کہ جب کوئی بدکاری کرتا ہے تو اس کی سزا بھی ساتھ ہی پاتا ہے۔ جس کسی کی جہنمی زندگی ہے وہ خوب محسوس کر لیگا۔ سچی بات یہ ہے کہ جرائم پیشہ کو وہ کبھی نہیں چھوڑتا جو شخص دلیری اور چالاکی سے گناہ کرتا ہے اس کا انجام بد ہوتا ہے۔ یہ تو جسمانی طور پر گناہ کی سزا ہے لیکن رُوحانی طور پر بھی جو شخص خدا تعالیٰ کو نہیں پہچانتا وہ جہنم ہی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ حیوانوں کی طرح کھا پی لیا اور عورتوں کے پاس ہو آیا۔ اگر اسی کا نام زندگی ہے تو بتلاؤ کہ حیوانوں میں اور اس میں کیا فرق ہے اور حیوانوں سے زائد قویٰ عقل و فکر وغیرہ کے خدا تعالیٰ نے اُسے کیوں دیئے۔ جو لوگ ان قویٰ سے کام نہیں لیتے ان کو خدا تعالیٰ

اُمتی از اَنعام قرار دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس نے قویٰ کو معطل کر دیا۔ بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ انسان کو حقیقی طور پر معلوم ہو جاوے کہ خُدا ہے۔

جس قدر جرائم۔ معاصی اور غفلت وغیرہ ہوتی ہے ان سب کی جڑ خدا شناسی میں نقص ہے۔ اسی نقص کی وجہ سے گناہ میں دلیری ہوتی ہے۔ بدی کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اور آخر کار بدچلنی کی وجہ سے آتشک کی نوبت آتی ہے پھر اس سے جذام ہوتا ہے جس سے نوبت موت تک پہنچتی ہے۔ حالانکہ اگر بدکار آدمی بدکاری میں لذت حاصل نہ کرے تو خدا تعالیٰ اسے لذت اَور طریق سے دے دیگا یا اس کے جائز وسائل بہم پہنچاوے گا مثلاً اگر چور چوری کرنا ترک کر دے تو خدا تعالیٰ اسے مقدر رزق ایسے طریق سے دیدے گا کہ حلال ہو اور حرامکار حرامکاری نہ کرے تو خدا تعالیٰ نے اس پر حلال عورتوں کا دروازہ بند نہیں کر دیا۔ اسی لیے بدنظری اور بدکاری سے بچنے کے لیے ہم نے اپنی جماعت کو کثرتِ ازدواج کی بھی نصیحت کی ہے کہ تقویٰ کے لحاظ سے اگر وہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنا چاہیں تو کر لیں مگر خدا تعالیٰ کی معصیت کے مرتکب نہ ہوں۔ پھر گناہ کر کے جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۸ر جنوری ۱۹۰۴ء)

۲۶ر دسمبر ۱۹۰۳ء

صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کی شہادت کا درجہ

صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کی نسبت حضرت اقدس نے فرمایا کہ :-

وہ ایک اُسوۂ حسنہ چھوڑ گئے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جاوے تو اُن کا واقعہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ وہ تو مقید نہ تھے۔ نہ اُن کو زنجیریں ڈالی گئی تھیں۔ صرف ایک قسم کا جنگ تھا امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بھی کچھ فوج تھی۔ اگر اُن کے آدمی مارے گئے تو آخر اُنکے آدمیوں نے بھی تو یزید کے آدمیوں کو مارا۔ اور نہ جان بچانے کا کوئی موقعہ اُن کو ملا۔ مگر یہاں عبداللطیف صاحب مقید تھے۔ زنجیریں اُن کے ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں مقابلہ کرنے کی اُن کو قوت نہ تھی اور بار بار جان بچانے کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ یہ اس قسم کی شہادت واقع ہوئی ہے کہ اس کی نظیر تیرہ ۱۳ سو سال میں ملنی محال ہے۔ عام معمولی زندگی کا چھوڑنا محال ہوا کرتا ہے حالانکہ اُن کی زندگی ایک تنعم کی زندگی تھی۔ مال۔ دولت۔ جاہ و ثروت سب کچھ موجود تھا۔ اور اگر وہ امیر کا کہنا مان لیتے تو اُن کی عزت اَور بڑھ جاتی مگر انہوں نے ان سب پر لات مار کر اور دیدہ دانستہ بال بچوں

کو کچل کر موت کو قبول کیا۔ انہوں نے بڑا تعجب انگیز نمونہ دکھلایا ہے اور اس قسم کے ایمان کو حاصل کرنے کی کوشش ہر ایک کو کرنی چاہیئے۔ جماعت کو چاہیئے کہ اس کتاب (تذکرۃ الشہادتین) کو بار بار پڑھیں اور فکر کریں اور دُعا کریں کہ ایسا ہی ایمان حاصل ہو۔

مومنوں کے دو گروہ ہوتے ہیں۔ ایک تو جان کو فدا کرنے والے اور دوسرے جو ابھی منتظر ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ہماری جماعت کے بہت سے لوگوں میں سے وہ چودہ[1] اچھے ہیں جو کہ قید میں ہیں۔ ابھی بہت سا حصہ ایسا ہے جو کہ صرف دنیا کو چاہتا ہے حالانکہ جانتے ہیں کہ مرجانا ہے اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے مگر پھر بھی دنیا کا خیال بہت ہے اس سرزمین (پنجاب) میں بزدلی بہت ہے۔ بہت کم ایسے آدمی ہیں کہ دین کو دنیا پر مقدم رکھتے ہیں۔ اکثر خیال بیوی بچوں کا رہتا ہے۔ دو دو آنہ پر جھوٹی گواہی دیتے ہیں مگر اس کے مقابلہ پر سرزمین کابل میں وفا کا مادہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ لوگ قربِ الٰہی کے زیادہ مستحق ہیں (بشرطیکہ ماموِر من اللہ کی آواز کو گوشِ دل سے سنیں) خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کی ہے جیسا کہ فرمایا ہے اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى (النجم : ۳۸) کہ اس نے جو عہد کیا اسے پورا کرکے دکھایا۔ لوگوں کا دستور ہے کہ حالتِ تنعّم میں وہ خدا تعالیٰ سے برگشتہ رہتے ہیں اور جب مصیبت اور تکلیف پڑتی ہے تو لمبی چوڑی دُعائیں مانگتے ہیں اور ذرا سے ابتلاء سے خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو اس شرط پر ماننے کے لیے تیار ہیں کہ وہ ان کی مرضی کے برخلاف کچھ نہ کرے۔ حالانکہ دوستی کا اصول یہ ہے کہ کبھی اپنی اس سے منوائے اور کبھی اس کی آپ مانے اور یہی طریق خدا تعالیٰ نے بھی بتلایا ہے کہ اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن : ۶۱) کہ تم مانگو تو میں تمہیں دُوں گا یعنی تمہاری بات مانوں گا اور دوسری جگہ اپنی منواتا ہے اور فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (البقرۃ : ۱۵۶) مگر یہاں آج کل لوگ خدا تعالیٰ کو مثل غلام کے اپنی مرضی کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ غوث، قطب، ابدال اور اولیاء وغیرہ جس قدر لوگ ہوئے ہیں۔ اُن کو یہ سب مراتب اسی لیے ملے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھتے چلے آئے۔ چونکہ افغانستان کے لوگوں میں یہ مادہ وفا کا زیادہ پایا جاتا ہے اس لیے کیا تعجب ہے کہ وہ لوگ ان لوگوں (اہلِ پنجاب) سے آگے بڑھ جاویں اور گوئے سبقت لے جاویں اور یہ پیچھے رہ جاویں۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے عہد کے اس قدر پابند ہیں کہ جان تک کی پروا نہیں کرتے نہ مال کی نہ بیوی کی نہ بچے کی جس کا نمونہ ابھی مولوی عبد اللطیف صاحب نے دکھا دیا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۵ مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۰۴ء)

---

[1] صاحبزادہ سیّد عبد اللطیف صاحب کی شہادت کے بعد چودہ آدمی اس وجہ سے بادشاہ کابل نے قید کر دیئے کہ وہ کہتے تھے کہ صاحبزادہ صاحب پر ظلم ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب حق پر تھے۔ (مرتب)

سلسلۂ احمدیہ کے قیام کی غرض

۲۶ دسمبر ۱۹۰۳ء کو بعد نماز ظہر مسجد اقصیٰ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک پُر تاثیر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

مَیں نے اس واسطے چند کلمات کے بیان کرنے کی ضرورت سمجھی ہے کہ چونکہ موت کا اعتبار نہیں ہے اور کوئی شخص اپنی نسبت یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی کس قدر ہے اور کتنے دن باقی ہیں۔ اس لیے مجھے یہ اندیشہ بار بار پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہماری جماعت میں سے کوئی ناواقف ہو تو وہ واقف ہو جائے کہ اس سلسلہ کے قائم کرنے سے اللہ تعالیٰ کی کیا غرض ہے؟ اور ہماری جماعت کو کیا کرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی غلطی ہے کہ کوئی اتنا ہی سمجھ لے کہ رسمی طور پر بیعت میں داخل ہونا ہی نجات ہے۔ اس لیے ضرورت پڑی ہے کہ مَیں اصل غرض بتاؤں کہ خدا تعالیٰ کیا چاہتا ہے۔

سب لوگ یاد رکھو کہ رسمی طور پر بیعت میں داخل ہونا یا مجھ کو امام سمجھ لینا اتنی ہی بات نجات کے واسطے ہرگز کافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کو دیکھتا ہے وہ زبانی باتوں کو نہیں دیکھتا۔

نجات کے واسطے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار فرمایا ہے وہی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اوّل سچے دل سے اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک سمجھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی یقین کرے اور قرآن شریف کو کتاب اللہ سمجھے کہ وہ ایسی کتاب ہے کہ قیامت تک اب اَور کوئی کتاب یا شریعت نہ آئے گی یعنی قرآن شریف کے بعد اب کسی کتاب یا شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو خوب یاد رکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں یعنی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نئی شریعت اور نئی کتاب نہ آئے گی نئے احکام نہ آئیں گے۔ یہی کتاب اور یہی احکام رہیں گے جو الفاظ میری کتابوں[1] میں نبی یا رسول کے میری نسبت پائے جاتے ہیں۔ اس میں ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ کوئی نئی شریعت یا نئے احکام سکھائے جاویں۔ بلکہ منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی ضرورتِ حقّہ کے وقت کسی کو مامور کرتا ہے تو ان معنوں سے کہ مکالمات الٰہیہ کا شرف اس کو دیتا ہے اور غیب کی خبریں اس کو دیتا ہے اس پر نبی[2] کا لفظ بولا جاتا ہے اور وہ مامور نبی کا خطاب پاتا ہے۔ یہ معنے نہیں ہیں کہ نئی شریعت دیتا ہے یا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نعوذ باللہ منسوخ کرتا ہے بلکہ یہ جو کچھ اُسے ملتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سچی اور کامل اتباع سے ملتا ہے اور بغیر اس کے مل سکتا ہی نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جب زمانہ میں گناہ کثرت سے ہوتے ہیں اور اہلِ دنیا ایمان کی حقیقت نہیں سمجھتے اور اُن کے پاس پوست یا ہڈی رہ جاتی ہے اور مغز اور لُب

---

[1] دیکھو البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۲

[2] البدر میں ہے:۔ "مکالمات الٰہیہ کا شرف اُسے دیتا ہے اور غیب کی خبریں اُسے بتلاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس مامور پر بھی نبی کا لفظ بولا جاتا ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۲)

نہیں رہتا۔ ایمانی قوت کمزور ہو جاتی ہے اور شیطانی تسلط اور غلبہ بڑھ جاتا ہے۔ ایمانی ذوق اور حلاوت نہیں رہتی ایسے وقتوں میں عادت اللہ اس طرح پر جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک کامل بندہ کو جو خدا تعالیٰ کی سچی اطاعت میں فنا شدہ اور محو ہوتا ہے۔ اپنے مکالمہ کا شرف بخش کر بھیجتا ہے۔ اور اب اس وقت اس نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں الٰہی محبت بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے[1]

اگرچہ عام نظر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کے بھی قائل ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی زبان سے تصدیق کرتے ہیں۔ بظاہر نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ رُوحانیت بالکل نہیں رہی۔ اور دوسری طرف ان اعمالِ صالحہ کے مخالف کام کرنا ہی شہادت دیتا ہے کہ وہ اعمال اعمالِ صالحہ کے رنگ میں نہیں کئے جاتے بلکہ رسم اور عادت کے طور پر کئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں اخلاص اور روحانیت کا شمہ بھی نہیں ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان اعمالِ صالحہ کے برکات اور انوار ساتھ نہیں ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ جب تک سچے دل سے اور روحانیت کے ساتھ یہ اعمال نہ ہوں کچھ فائدہ نہ ہوگا اور یہ اعمال کام نہ آئیں گے۔ اعمال صالحہ اسی وقت اعمال صالحہ کہلاتے ہیں جب ان میں کسی قسم کا فساد نہ ہو۔ صلاح کی ضد فساد ہے۔ صالح وہ ہے جو فساد سے مبرا منزہ ہو۔ جن کی نمازوں میں فساد ہے اور نفسانی اغراض چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی نمازیں اللہ تعالیٰ کے واسطے ہرگز نہیں ہیں۔ اور وہ زمین سے ایک بالشت بھی اوپر نہیں جاتی ہیں کیونکہ ان میں اخلاص کی رُوح نہیں اور وہ رُوحانیت سے خالی ہیں۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سلسلہ کی ضرورت کیا ہے کیا ہم نماز روزہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ اس طرح پر دھوکا دیتے ہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ بعض لوگ جو ناواقف ہوتے ہیں۔ ایسی باتوں کو سُنکر دھوکا کھا جاویں اور اُن کے ساتھ مِل کر یہ کہدیں کہ جس حالت میں ہم نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور ورد وظائف کرتے ہیں پھر کیوں یہ پھوٹ ڈالدی۔ یاد رکھو کہ ایسی باتیں کم سمجھی اور معرفت کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ میرا اپنا کام نہیں ہے یہ پھوٹ اگر ڈال دی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ڈالی ہے۔ جس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ کیونکہ ایمانی حالت کمزور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایمانی قوت بالکل ہی معدوم ہی ہو گئی ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حقیقی ایمان کی رُوح پھُونکے جو اس سلسلہ کے ذریعہ سے اس نے چاہا ہے۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کا اعتراض بیجا اور بیہودہ ہے۔ پس یاد رکھو کہ ایسا وسوسہ ہرگز ہرگز کسی کے دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ اور اگر پورے غور اور فکر سے کام لیا جاوے تو یہ وسوسہ آ ہی نہیں سکتا۔ غور سے کام نہ لینے کے سبب ہی سے وسوسہ آتا ہے جو ظاہری حالت پر نظر

---

[1] البدر میں اس کے بعد ایک مزید فقرہ یہ ہے کہ:۔
"اور اس کی جگہ دنیا نے لے لی ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۳)

کرکے کہہ دیتے ہیں کہ اَور بھی مسلمان ہیں۔اس قسم کے وسوسوں سے انسان جلد ہلاک ہوجاتا ہے۔
مَیں نے بعض خطوط اس قسم کے لوگوں کے دیکھے ہیں جو بظاہر ہمارے سلسلہ میں ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سے جب یہ کہا گیا کہ دوسرے مسلمان بھی بظاہر نماز پڑھتے ہیں۔ اور کلمہ پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اور نیک معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اس نئے سلسلہ کی کیا حاجت ہے؟ یہ لوگ باوجودیکہ ہماری بیعت میں داخل ہیں ایسے وسوسے اور اعتراض سُنکر لکھتے ہیں کہ ہم کو اس کا جواب نہیں آیا۔ ایسے خطوط پڑھ کر مجھے ایسے لوگوں پر افسوس اور رحم آتا ہے کہ انہوں نے ہماری اصل غرض اور منشا کو نہیں سمجھا وہ صرف دیکھتے ہیں کہ رسمی طور پر یہ لوگ ہماری طرح شعائرِ اسلام بجا لاتے ہیں اور فرائض الٰہی ادا کرتے ہیں حالانکہ حقیقت کی رُوح اُن میں نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ باتیں اور وساوس سحر کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ ایسے وقت نہیں سوچتے کہ ہم حقیقی ایمان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو گناہ کی موت سے بچا لیتا ہے اور ان رسوم و عادات کے پیرو لوگوں میں وہ بات نہیں۔ اُن کی نظر ظاہر پر ہے۔ حقیقت پر نگاہ نہیں۔ اُن کے ہاتھ میں چھلکا ہے جس میں مغز نہیں۔

مامور کے وقت کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے

یاد رکھو اور سمجھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کیا یہود تورات کو چھوڑ بیٹھے تھے اور اس پر ان کا عمل نہ تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہودی تو اب تک بھی تورات کو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ انکی قربانیاں اور رسوم آج بھی اسی طرح ہوتی ہیں جیسے اس وقت کرتے تھے۔ وہ برابر آج تک بیت المقدس کو اپنا قبلہ سمجھتے ہیں اور اسی کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اُن کے بڑے بڑے عالم اور احبار بھی اس وقت موجود تھے اُس وقت پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ دوسری طرف عیسائی قوم تھی۔ ان میں بھی ایک فرقہ لا الٰہ الا اللہ کو مانتا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اور کتاب اللہ کو بھیجا؟ یہ ایک سوال ہے جس پر ہمارے مخالفوں اور ایسا اعتراض کرنے والوں کو غور کرنا چاہیئے اگرچہ یہ ایک باریک مسئلہ ہے لیکن جو لوگ غور اور فکر کرتے ہیں۔ ان کے لیے باریک نہیں ہے۔
یاد رکھو اللہ تعالیٰ رُوح اور رُوحانیت پر نظر کرتا ہے۔ وہ ظاہری اعمال پر نگاہ نہیں کرتا۔ وہ انکی حقیقت اور اندرونی حالت کو دیکھتا ہے کہ ان کے اعمال کی تہہ میں خود غرضی اور نفسانیت ہے یا اللہ تعالیٰ کی سچی اطاعت اور اخلاص مگر انسان بعض وقت ظاہری اعمال کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں تسبیح ہے یا وہ تہجد و اشراق پڑھتا ہے۔ بظاہر ابرار و اخیار کے کام کرتا ہے تو اس کو نیک سمجھ لیتا ہے مگر خدا تعالیٰ کو تو پوست[1] پسند نہیں۔

[1] البدر میں ہے:۔ "ایک انسان تو اس سے دھوکا کھا سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ نہیں کھا سکتا۔ کیونکہ اس کی نظر پوست پر نہیں ہے وہ تو رُوحانیت کو چاہتا ہے جو کہ مغز ہے نہ کہ قشر کو۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۳ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۴ء)

یہ پوست اور قشر ہے اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا اور کبھی راضی نہیں ہوتا جب تک وفاداری اور صدق نہ ہو۔ یے فائدہ کُتے کی طرح ہے جو مُردار دُنیا پر گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر نیک بھی نظر آتے ہوں، لیکن افعالِ ذمیمہ اُن میں پائے جاتے ہیں اور پوشیدہ بد چلنیاں ان میں پائی جاتی ہیں۔ جو نمازیں ریاکاری سے بھری ہوئی ہوں ان نمازوں کو ہم کیا کریں اور اُن سے کیا فائدہ؟[1]

حقیقی نماز

نماز اس وقت حقیقی نماز کہلاتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے سچا اور پاک تعلق ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اطاعت میں اس حد تک فنا ہو اور یہاں تک دین کو دنیا پر مقدم کر لے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان تک دے دینے اور مرنے کے لیے تیار ہو جائے جب یہ حالت انسان میں پیدا ہو جائے اس وقت کہا جائے گا کہ اس کی نماز نماز ہے مگر جب تک یہ حقیقت انسان کے اندر پیدا نہیں ہوتی اور سچے اخلاص اور وفاداری کا نمونہ نہیں دکھلاتا اس وقت تک اس کی نمازیں اور دوسرے اعمال بے اثر ہیں۔

بہت سی مخلوق ایسی ہے کہ لوگ ان کو مومن اور راست باز سمجھتے ہیں مگر آسمان پر اُن کا نام کافر ہے۔[2] اس واسطے حقیقی مومن اور راستباز وہی ہے جس کا نام آسمان پر مومن ہے۔ دنیا کی نظر میں خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ کہلاتا ہو۔ حقیقت میں یہ بہت ہی مشکل گھاٹی ہے کہ انسان سچا ایمان لادے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ کامل اخلاص اور وفاداری کا نمونہ دکھلاوے جب انسان سچا ایمان لاتا ہے تو اس کے بہت سے نشانات ہو جاتے ہیں۔

قرآن شریف نے سچے مومنوں کی جو علامات بیان کی ہیں وہ ان میں پائی جاتی ہیں۔ ان علامات میں سے ایک بڑی علامت جو حقیقی ایمان کی ہے وہ یہی ہے کہ جب انسان دُنیا کو پاؤں کے نیچے کچل کر اس سے اس طرح الگ ہو جاتا ہے جیسے سانپ اپنی کینچلی سے باہر آجاتا ہے۔ اس طرح پر جب انسان نفسانیت کی کینچلی سے باہر

---

[1] البدر میں ہے:۔ "اگر ان کی آرزوئیں اور مرادیں پوری ہوتی رہیں تو وہ خدا کو مانتے رہیں گے اور اگر پوری نہ ہوں تو پھر اس سے ناراض اور شکایت کا دفتر کھلا ہوا ہے تو جن کی یہ حالت ہے اور ان میں صدق و وفا نہیں ہے خدا اُن کی نمازوں کو کیا کرے وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ہرگز نمازی نہیں ہیں اور ان کی نمازیں سوائے اس کے کہ زمین پر ٹکریں ماریں اَور کچھ حکم نہیں رکھتیں۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۳ مورخہ ۱۶ ؍ جنوری ۱۹۰۴ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ مخلوق کے نزدیک راستباز ہیں۔ متقی ہیں۔ نیک بخت ہیں لیکن ان کا تعلق خدا تعالیٰ سے صاف نہیں ہے اور وہ محویت اور دین کا تقدم دنیا پر جو خدا چاہتا ہے ان میں نہیں ہے اس لیے خدا کے نزدیک وہ کافر ہیں۔ سچے ایمانداروں کی جو علامات ہیں اگر اُن سے تم اُن کو پرکھو تو ایک بھی اُن میں نظر نہ آوے گی۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۳)

آجاتا ہے تو وہ مومن ہوتا ہے اور ایمان کامل کے آثار اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (النحل : ۱۲۹) یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو تقویٰ سے بھی بڑھ کر کام کرتے ہیں یعنی محسنین ہوتے ہیں۔

حقیقی نیکی

تقویٰ کے معنے ہیں بدی کی باریک راہوں سے پرہیز کرنا، مگر یاد رکھو نیکی اتنی نہیں ہے کہ ایک شخص کہے کہ مَیں نیک ہوں اس لیے کہ مَیں نے کسی کا مال نہیں لیا۔ نقب زنی نہیں کی۔ چوری نہیں کرتا۔ بدنظری اور زنا نہیں کرتا۔ ایسی نیکی عارف کے نزدیک ہنسی کے قابل ہے کیونکہ اگر وہ ان بدیوں کا ارتکاب کرے اور چوری یا ڈاکہ زنی کرے تو وہ سزا پائے گا۔ پس یہ کوئی نیکی نہیں کہ جو عارف کی نگاہ میں قابل قدر ہو بلکہ اصلی اور حقیقی نیکی یہ ہے کہ نوعِ انسان کی خدمت کرے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں کامل صدق اور وفاداری دکھلائے اور اس کی راہ میں جان تک دے دینے کو تیار ہو۔ اسی لیے یہاں فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے جو بدی سے پرہیز کرتے ہیں اور ساتھ ہی نیکیاں بھی کرتے ہیں۔

یہ خوب یاد رکھو کہ نِرا بدی سے پرہیز کرنا کوئی خوبی کی بات نہیں جب تک اُس کے ساتھ نیکیاں نہ کرے۔ بہت سے لوگ ایسے موجود ہوں گے جنہوں نے کبھی زنا نہیں کیا۔ خون نہیں کیا۔ چوری نہیں کی، ڈاکہ نہیں مارا۔ اور باوجود اس کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی صدق و وفا کا نمونہ انہوں نے نہیں دکھایا یا نوعِ انسان کی کوئی خدمت نہیں کی۔ اور اس طرح پر کوئی نیکی نہیں کی۔ پس جاہل ہوگا وہ شخص جو ان باتوں کو پیش کرکے اُسے نیکوکاروں میں داخل کرے کیونکہ یہ تو بدچلنیاں ہیں صرف اتنے خیال سے اولیاء اللہ میں داخل نہیں ہو جاتا۔[1] بدچلنی کرنے والے۔ چوری یا خیانت کرنے والے، رشوت لینے والے کے لیے عادت اللہ میں ہے کہ اسے یہاں سزا دی جاتی ہے وہ نہیں مرتا جب تک سزا نہیں پا لیتا۔ یاد رکھو کہ صرف اتنی ہی بات کا نام نیکی نہیں ہے۔

تقویٰ ادنیٰ مرتبہ ہے اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کسی برتن کو اچھی طرح سے صاف کیا جاوے تاکہ اس میں اعلیٰ درجہ کا لطیف کھانا ڈالا جائے۔ اب اگر کسی برتن کو خوب صاف کرکے رکھ دیا جائے لیکن اس میں کھانا نہ ڈالا جائے تو کیا اُس سے پیٹ بھر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا وہ خالی برتن طعام سے سیر کر دے گا؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح پر

---

[1] البدر میں یہ فقرہ یوں ہے :۔
”خدا تعالیٰ نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ صرف بدچلنی نہ کرنے والا اس کے اولیاء میں داخل ہوا ہو۔“
(البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۳ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۰۴ء)

تقویٰ کو سمجھو۔ تقویٰ کیا ہے۔ نفسِ امارہ کے برتن کو صاف کرنا۔[1]

نفس کی تین حالتیں

نفس کو تین قسم پر منقسم کیا ہے۔ نفسِ امارہ۔ نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ۔ ایک نفس زکیہ بھی ہوتا ہے مگر وہ بچپن کی حالت ہے جب گناہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لیے اس نفس کو چھوڑ کر بلوغ کے بعد تین نفسوں ہی کی بحث کی ہے۔ نفسِ امارہ کی وہ حالت ہے جب انسان شیطان اور نفس کا بندہ ہوتا ہے اور نفسانی خواہشوں کا غلام اور اسیر ہو جاتا ہے۔ جو حکم نفس کرتا ہے اس کی تعمیل کے واسطے اس طرح تیار ہو جاتا ہے جیسے ایک غلام دست بستہ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ اس وقت یہ نفس کا غلام ہو کر جو وہ کہے یہ کرتا ہے۔ وہ کہے خون کر۔ تو یہ کرتا ہے۔ زنا کہے چوری کہے غرض جو کچھ بھی کہے سب کیلئے تیار ہوتا ہے کوئی بدی کوئی بُرا کام ہو جو نفس کہے یہ غلاموں کی طرح کر دیتا ہے۔ یہ نفسِ امارہ کی حالت ہے اور یہ وہ شخص ہے جو نفسِ امارہ کا تابع ہے۔

اس کے بعد نفسِ لوامہ ہے۔ یہ ایسی حالت ہے کہ گناہ تو اس سے بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ نفس کو ملامت بھی کرتا رہتا ہے اور اس تدبیر اور کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اُسے گناہ سے نجات مل جائے جو لوگ نفسِ لوامہ کے ماتحت یا اس حالت میں ہوتے ہیں وہ ایک جنگ کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی شیطان اور نفس سے جنگ کرتے رہتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفس غالب آکر لغزش ہو جاتی ہے اور کبھی خود نفس پر غالب آجاتے اور اس کو دبا لیتے ہیں۔ یہ لوگ نفسِ امارہ والوں سے ترقی کر جاتے ہیں۔ نفسِ امارہ والے انسان اور دوسرے بہائم میں کوئی فرق نہیں ہوتا جیسے کُتا۔ بلّی جب کوئی برتن ننگا دیکھتے ہیں تو فوراً جا پڑتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ وہ چیز ان کا حق ہے یا نہیں۔ اسی طرح پر نفسِ امارہ کے غلام انسان کو جب کسی بدی کا موقعہ ملتا ہے تو فوراً اسے کر بیٹھتا ہے اور تیار رہتا ہے اگر راستہ میں دو چار روپے پڑے ہوں تو فی الفور اُن کے اُٹھانے کو تیار ہو جائے گا اور نہیں سوچے گا کہ اس کو اُن کے لیے لینے کا حق ہے یا نہیں مگر لوامہ والے کی یہ حالت نہیں۔ وہ حالت جنگ میں ہے جس میں کبھی نفس غالب کبھی وہ، ابھی کامل فتح نہیں ہوئی۔ مگر تیسری حالت جو نفسِ مطمئنہ کی حالت ہے یہ وہ حالت ہے جب ساری لڑائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کامل فتح ہو جاتی ہے اسی لیے اس کا نام نفسِ مطمئنہ رکھا ہے یعنی اطمینان یافتہ۔[2] اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر سچا ایمان لاتا ہے اور وہ یقین

---

[1] البدر میں ہے:۔ ”تقویٰ تو صرف نفسِ امارہ کے برتن کو صاف کرنے کا نام ہے اور نیکی وہ کھانا ہے جو اس میں پڑتا ہے اور جس نے اعضاء کو قوت دے کر انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ اس سے نیک اعمال صادر ہوں اور وہ بلند مراتب قربِ الٰہی کے حاصل کر سکے۔“ (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۳)

[2] البدر میں ہے:۔ ”اس کا نام نفسِ مطمئنہ اس لیے ہے کہ یہ اطمینان یافتہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے ہر ایک قویٰ پر اس کا قابو ہو جاتا ہے اور طبعی طور پر اس سے نیکی کے کام سرزد ہوتے ہیں۔ (ایضاً)

کرتا ہے کہ واقعی خدا ہے۔ نفسِ مطمئنہ کی انتہائی حد خدا تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے کیونکہ کامل اطمینان اور تسلی اسی وقت ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہو۔

یقیناً سمجھو کہ ہر ایک پاکبازی اور نیکی کی اصل جڑ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا ہے جس قدر انسان کا ایمان باللہ کمزور ہوتا ہے اسی قدر اعمالِ صالحہ میں کمزوری اور سُستی پائی جاتی ہے لیکن جب ایمان قوی ہو اور اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ یقین کر لیا جائے اسی قدر عجیب رنگ کی تبدیلی انسان کے اعمال میں پیدا ہو جاتی ہے خدا تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا گناہ پر قادر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ ایمان اس کی نفسانی قوتوں اور گناہ کے اعضاء کو کاٹ دیتا ہے۔ دیکھو اگر کسی کی آنکھیں نکال دی جائیں تو وہ آنکھوں سے بدنظری کیونکر کر سکتا ہے اور آنکھوں کا گناہ کیسے کریگا اور اگر ایسا ہی ہاتھ کاٹ دیئے جائیں شہوانی قویٰ کاٹ دیئے جائیں، پھر وہ گناہ جو ان اعضاء سے متعلق ہیں کیسے کر سکتا ہے ٹھیک اسی طرح پر جب ایک انسان نفسِ مطمئنہ کی حالت میں ہوتا ہے تو نفسِ مطمئنہ اُسے اندھا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں گناہ کی قوت نہیں رہتی۔ وہ دیکھتا ہے پر نہیں دیکھتا۔ کیونکہ آنکھوں کے گناہ کی نظر سلب ہو جاتی ہے۔ وہ کان رکھتا ہے مگر بہرہ ہوتا ہے اور وہ باتیں جو گناہ کی ہیں نہیں سُن سکتا۔ اسی طرح پر اس کی تمام نفسانی اور شہوانی قوتیں اور اندرونی اعضاء کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ اس کی ساری طاقتوں پر جن سے گناہ صادر ہو سکتا تھا ایک موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ بالکل ایک میّت کی طرح ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ ہی کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اس کے سوا ایک قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامل اطمینان اُسے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو انسان کا اصل مقصود ہونا چاہیئے۔ اور ہماری جماعت کو اس کی ضرورت ہے اور اطمینانِ کامل کے حاصل کرنے کے واسطے ایمانِ کامل کی ضرورت ہے۔ پس ہماری جماعت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان حاصل کریں۔

اصلاحِ نفس کا سچا ذریعہ۔ صُحبتِ صادقین

یاد رکھو۔ اصلاحِ نفس کے لیے نری تجویزوں اور تدبیروں سے کچھ نہیں ہوتا ہے جو شخص نری تدبیروں پر رہتا ہے وہ نامراد اور ناکام رہتا ہے کیونکہ وہ اپنی تدبیروں اور تجویزوں ہی کو خدا سمجھتا ہے۔ اس واسطے وہ فضل اور فیض جو گناہ کی طاقتوں پر موت وارد کرتا ہے اور بدیوں سے بچنے اور اُن کا مقابلہ کرنے کی قوت بخشتا ہے وہ انہیں نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ سے آتا ہے جو تدبیروں کا غلام نہیں تھا۔ انسانی تدبیروں اور تجویزوں کی ناکامی کی مثال خود خدا تعالیٰ نے دکھائی ہے۔ یہودیوں کو توریت کے لیے کہا کہ اس میں تحریف و تبدیل نہ کرنا اور بڑی بڑی تاکیدیں اس کی حفاظت کی اُن کو کی گئیں لیکن کم بخت یہودیوں نے تحریف کر دی۔ اس کے بالمقابل مسلمانوں کو کہا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر: ۱۰) یعنی ہم نے اس قرآن مجید

کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ اس نے کیسی حفاظت فرمائی۔ ایک نقطہ اور نقطہ تک پس و پیش نہ ہوا۔ اور کوئی ایسا نہ کر سکا۔ کہ اس میں تحریف تبدیل کرتا۔ صاف ظاہر ہے کہ جو کام خدا کے ہاتھ سے ہوتا ہے وہ بڑا ہی بابرکت ہوتا ہے اور جو انسان کے اپنے ہاتھ سے ہو وہ بابرکت نہیں ہو سکتا۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کا فضل اور اسی کے ہاتھ سے نہ ہو تو کچھ نہیں ہوتا۔ پس محض اپنی سعی اور کوشش سے طہارتِ نفس پیدا ہو جاوے یہ خیال باطل ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ پھر انسان کوشش نہ کرے اور مجاہدہ نہ کرے۔ نہیں بلکہ کوشش اور مجاہدہ ضروری ہے اور سعی کرنا فرض ہے۔ خدا تعالیٰ کا فضل سچی محنت اور کوشش کو ضائع نہیں کرتا۔ اس واسطے ان تمام تدابیر اور مساعی کو چھوڑنا نہیں چاہیئے جو اصلاحِ نفس کے لیے ضروری ہیں مگر یہ تجاویز اور تدابیر اپنے نفس اور خیال سے پیدا کی ہوئی نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ان تدابیر کو اختیار کرنا چاہیئے جن کو خود اللہ تعالےٰ نے بیان کیا ہے اور جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھائی ہیں۔ آپ کے قدم پر قدم مارو اور پھر دعاؤں سے کام لو۔ تم ناپاکی کے کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہو مگر خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر صرف تدبیروں سے صاف چشمہ تک نہیں پہنچ سکتے جو طہارت کا موجب بنے۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو چھوڑتے ہیں اور اپنی تدبیروں پر بھروسہ کرتے ہیں وہ احتیاطیں کرتے کرتے خود مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا فضل ان کے ساتھ نہیں ہوتا اور ان کی دستگیری نہیں کی جاتی۔ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنی تجویز اور خیال سے اگر کوئی اصلاح نفس کرنے کا مدعی ہو وہ جھوٹا ہے۔

اصلاحِ نفس کی ایک راہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبة : ۱۱۹) یعنی جو لوگ قولی، فعلی، عملی اور حالی رنگ میں سچائی پر قائم ہیں اُن کے ساتھ رہو۔ اس سے پہلے فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ (التوبة : ۱۱۹) یعنی ایمان والو۔ تقویٰ اللہ اختیار کرو۔ اس سے یہ مراد ہے کہ پہلے ایمان ہو پھر سنت کے طور پر بدی کی جگہ کو چھوڑ دے اور صادقوں کی صُحبت میں رہے۔ صحبت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے جو اندر ہی اندر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہر روز کنجریوں کے ہاں جاتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ کیا میں زنا کرتا ہوں؟ اس سے کہنا چاہیئے کہ ہاں تو کرے گا اور وہ ایک نہ ایک دن اس میں مبتلا ہو جاوے گا کیونکہ صحبت میں تاثیر ہوتی ہے اسی طرح پر جو شخص شراب خانہ میں جاتا ہے خواہ وہ کتنا ہی پرہیز کرے اور کہے کہ میں نہیں پیتا ہوں لیکن ایک دن آئے گا کہ وہ ضرور پئے گا۔

پس اس سے کبھی بے خبر نہیں رہنا چاہیئے کہ صُحبت میں بہت بڑی تاثیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اصلاحِ نفس کے لیے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کا حکم دیا ہے۔ جو شخص نیک صُحبت میں جاتا ہے خواہ وہ

مخالفت ہی کے رنگ میں ہو لیکن وہ صحبت اپنا اثر کئے بغیر نہ رہے گی اور ایک نہ ایک دن وہ اس مخالفت سے باز آ جائے گا ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ ہمارے مخالف اسی صحبت کے نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہ گئے۔ اگر وہ ہمارے پاس آکر رہتے۔ ہماری باتیں سنتے تو ایک وقت آجاتا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کی غلطیوں پر متنبہ کر دیتا اور وہ حق کو پا لیتے۔ لیکن اب چونکہ اس صحبت سے محروم ہیں اور انہوں نے ہماری باتیں سننے کا موقعہ کھو دیا ہے اس لیے کبھی کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ یہ دہریے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ زانی ہیں۔ اور کبھی یہ اتہام لگاتے ہیں کہ نعوذ باللہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ صحبت نہیں اور یہ قہرالٰہی ہے کہ صحبت نہ ہو۔

لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کی ہے تو صلح حدیبیہ کے مبارک ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کو آپ کے پاس آنے کا موقعہ ملا۔ اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سُنیں تو اُن میں سے صدہا مسلمان ہو گئے۔ جب تک انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں نہ سُنی تھیں۔ اُن میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک دیوار حائل تھی جو آپ کے حُسن و جمال پر اُن کو اطلاع نہ پانے دیتی تھی اور جیسا دوسرے لوگ کذّاب کہتے تھے (معاذ اللہ) وہ بھی کہہ دیتے تھے اور اُن فیوض و برکات سے بے نصیب تھے جو آپ لے کر آئے تھے اس لیے کہ دُور تھے۔ لیکن جب وہ حجاب اُٹھ گیا اور پاس آکر دیکھا اور سُنا تو وہ محرومی نہ رہی اور سعیدوں کے گروہ میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح پر بہتوں کی بدنصیبی کا اب بھی یہی باعث ہے۔ جب اُن سے پوچھا جاوے کہ تم نے اُن کے دعوے اور دلائل کو کہاں تک سمجھا ہے تو بجز چند بہتانوں اور افتراؤں کے کچھ نہیں کہتے جو بعض مفتری سُنا دیتے ہیں اور وہ اُن کو سچ مان لیتے ہیں اور خود کوشش نہیں کرتے کہ یہاں آکر خود تحقیق کریں اور ہماری صحبت میں آکر دیکھیں۔ اس سے اُن کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور وہ حق کو نہیں پا سکتے۔ لیکن اگر وہ تقویٰ سے کام لیتے تو کوئی گناہ نہ تھا کہ وہ آکر ہم سے ملتے جلتے رہتے اور ہماری باتیں سنتے رہتے حالانکہ عیسائیوں اور ہندوؤں سے بھی ملتے ہیں اور ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اُن کی مجلسوں میں جاتے ہیں۔ پھر کونسا امر مانع تھا جو ہمارے پاس آنے سے انہوں نے پرہیز کیا۔

غرض یہ بڑی ہی بدنصیبی ہے اور انسان اس کے سبب محروم ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبۃ : ۱۱۹) اس میں بڑا نکتہ معرفت یہی ہے کہ چونکہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لیے ایک راستباز کی صحبت میں رہ کر انسان راستبازی سیکھتا ہے اور اس کے پاک انفاس کا اندر ہی اندر اثر ہونے لگتا ہے جو اس کو خدا تعالیٰ پر ایک سچا یقین اور بصیرت عطا کرتا ہے۔ اس صحبت میں صدق دل سے رہ کر وہ خدا تعالیٰ کی آیات اور نشانات کو دیکھتا ہے جو ایمان کو بڑھانے کے ذریعے ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱ صفحہ ۲ تا ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء)

جب انسان ایک راستباز اور صادق کے پاس بیٹھتا ہے تو صدق اس میں کام کرتا ہے لیکن جو راستبازوں کی صحبت کو چھوڑ کر بدوں اور شریروں کی صحبت کو اختیار کرتا ہے تو ان میں بدی اثر کرتی جاتی ہے۔ اسی لیے احادیث اور قرآن شریف میں صحبتِ بد سے پرہیز کرنے کی تاکید اور تہدید پائی جاتی ہے اور لکھا ہے کہ جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت ہوتی ہو اس مجلس سے فی الفور اُٹھ جاؤ ورنہ جو اہانت سُنکر نہیں اُٹھتا اس کا شمار بھی ان میں ہی ہوگا۔

صادقوں اور راستبازوں کے پاس رہنے والا بھی ان میں ہی شریک ہوتا ہے۔ اس لیے کس قدر ضرورت ہے اس امر کی کہ انسان کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے پاک ارشاد پر عمل کرے حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو دُنیا میں بھیجتا ہے وہ پاک لوگوں کی مجلس میں آتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھتا ہے کہ تم نے کیا دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مجلس دیکھی ہے جس میں تیرا ذکر کر رہے تھے مگر ایک شخص ان میں سے نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہیں وہ بھی ان میں ہی سے ہے کیونکہ اِنَّھُمْ قَوْمٌ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صادقوں کی صُحبت سے کس قدر فائدے ہیں سخت بدنصیب ہے وہ شخص جو صحبت سے دُور رہے۔

مقامِ نفسِ مطمئنہ

غرض نفسِ مطمئنہ کی تاثیروں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اطمینان یافتہ لوگوں کی صُحبت میں اطمینان پاتے ہیں۔ امارہ والے میں نفسِ امارہ کی تاثیریں ہوتی ہیں اور لوامہ والے میں لوامہ کی تاثیریں ہوتی ہیں اور جو شخص نفسِ مطمئنہ والے کی صُحبت میں بیٹھتا ہے۔ اس پر بھی اطمینان اور سکینت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اندر ہی اندر اسے تسلی ملنے لگتی ہے۔ مطمئنہ والے کو پہلی نعمت یہ دی جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے آرام پاتا ہے جیسے فرمایا یٰۤاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (الفجر ۲۸،۲۹) یعنی اے خدا تعالیٰ میں آرام یافتہ نفس اپنے رب کی طرف آ جا وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔ اس میں ایک باریک نکتہ معرفت ہے جو یہ کہا کہ خدا تجھ سے راضی تُو خدا سے راضی۔ بات یہ ہے کہ جب تک انسان اس مرحلہ پر نہیں پہنچتا اور لوامہ کی حالت میں ہوتا ہے اس وقت تک خدا تعالیٰ سے ایک قسم کی لڑائی رہتی ہے یعنی کبھی کبھی وہ نفس کی تحریک سے نافرمانی بھی کر بیٹھتا ہے لیکن جب مطمئنہ کی حالت پر پہنچتا ہے تو اس جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے صلح ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ خدا سے راضی ہوتا ہے اور خدا اس سے راضی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لڑائی جھگڑائی بالکل جاتی رہتی ہے۔

یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر شخص خدا تعالیٰ سے لڑائی رکھتا ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور دُعائیں کرتا ہے اور بہت ساری امانی اور امیدیں رکھتا ہے لیکن اس کی وہ دُعائیں نہیں سُنی

جاتی ہیں یا خلافِ اُمید کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو دل کے اندر اللہ تعالیٰ سے ایک لڑائی شروع کر دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ پر بدظنی اور اُس سے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے لیکن صالحین اور عباد الرحمٰن کی کبھی اللہ تعالیٰ سے جنگ نہیں ہوتی کیونکہ رضا بالقضا کے مقام پر ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حقیقی ایمان اس وقت تک پیدا ہو ہی نہیں سکتا جب تک انسان اس درجہ کو حاصل نہ کرے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اس کی مرضی ہو جائے دل میں کوئی کدورت اور تنگی محسوس نہ ہو بلکہ شرحِ صدر کے ساتھ اس کی ہر تقدیر اور قضا کے ماننے کو تیار ہو۔ اس آیت میں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کا لفظ اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ رضا کا اعلیٰ مقام ہے جہاں کوئی ابتلا باقی نہیں رہتا۔ دوسرے جسقدر مقامات ہیں وہاں ابتلاء کا اندیشہ رہتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ سے بالکل راضی ہو جاوے اور کوئی شکوہ شکایت نہ رہے اس وقت محبتِ ذاتی پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ سے محبتِ ذاتی پیدا نہ ہو تو ایمان بڑے خطرہ کی حالت میں ہے لیکن جب ذاتی محبت ہو جاتی ہے تو انسان شیطان کے حملوں سے امن میں آجاتا ہے۔

اس ذاتی محبت کو دُعا سے حاصل کرنا چاہیئے جب تک یہ محبت پیدا نہ ہو انسان نفسِ امّارہ کے نیچے رہتا ہے اور اس کے پنجہ میں گرفتار رہتا ہے اور ایسے لوگ جو نفسِ امّارہ کے نیچے ہیں اُن کا قول ہے "ایہہ جہان مٹھا اگلا کن ڈٹھا" یہ لوگ بڑی خطرناک حالت میں ہوتے ہیں اور لوّامہ والے ایک گھڑی میں ولی اور ایک گھڑی میں شیطان ہو جاتے ہیں۔ اُن کا ایک رنگ نہیں رہتا کیونکہ اُن کی لڑائی نفس کے ساتھ شروع ہوتی ہے جس میں کبھی وہ غالب اور کبھی مغلوب ہوتے ہیں تاہم یہ لوگ محلِ مدح میں ہوتے ہیں کیونکہ اُن سے نیکیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور خوفِ خدا بھی ان کے دل میں ہوتا ہے لیکن نفسِ مطمئنّہ والے بالکل فتحمند ہوتے ہیں اور وہ سارے خطروں اور خوفوں سے نکل کر امن کی جگہ میں جا پہنچتے ہیں وہ اس دارالامان میں ہوتے ہیں جہاں شیطان نہیں پہنچ سکتا۔ لوّامہ والا جیسا کہ میں نے کہا ہے دارالامان کی ڈیوڑھی میں ہوتا ہے اور کبھی کبھی دشمن بھی اپنا وار کر جاتا، اور کوئی لاٹھی مار جاتا ہے اس لیے مطمئنّہ والے کو کہا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر: ۳۰) یہ آواز اس وقت آتی ہے جب وہ اپنے تقویٰ کو انتہائی مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے۔ تقویٰ کے دو درجے ہیں۔ بدیوں سے بچنا اور نیکیوں میں سرگرم ہونا۔ یہ دوسرا مرتبہ محسنین کا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے بغیر اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہو سکتا اور یہ مقام اور درجہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

جب انسان بدی سے پرہیز کرتا ہے اور نیکیوں کے لیے اس کا دل تڑپتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی دستگیری کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے دارالامان میں پہنچا دیتا ہے۔ اور فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ کی آواز اُسے آجاتی ہے یعنی تیری جنگ اب ختم ہو چکی ہے اور میرے ساتھ تیری صلح اور آشتی ہو چکی ہے اب آ میرے بندوں میں داخل ہو جو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے مصداق

ہیں اور رُوحانی وراثت سے جن کو حصّہ ملتا ہے میری بہشت میں داخل ہو جا۔

یہ آیت جیسا کہ ظاہرین سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُسے آواز آتی ہے آخرت پر ہی موقوف نہیں بلکہ اسی دُنیا میں اسی زندگی میں یہ آواز آتی ہے۔ اہلِ سلوک کے مراتب رکھے ہوئے ہیں اُن کے سلوک کا انتہائی نقطہ یہی مقام ہے جہاں اُن کا سلوک ختم ہو جاتا ہے اور وہ مقام یہی نفس مطمئنہ کا مقام ہے۔ اہلِ سلوک کی مشکلات کو اللہ تعالیٰ اُٹھا دیتا ہے اور ان کو صالحین میں داخل کر دیتا ہے جیسے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ (العنکبوت: ۱۰) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ہم اُن کو ضرور ضرور صالحین میں داخل کر دیتے ہیں۔

اس پر بعض اعتراض کرتے ہیں کہ اعمال صالحہ کرنے والے صالحین ہوتے ہیں پھر اُن کو صالحین میں داخل کرنے سے کیا مراد ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو بیان فرماتا ہے کہ صلاحیت کی دو قسم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ انسان تکالیف شاقہ اُٹھا کر نیکیوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے نیکیاں کرتا ہے لیکن ان کے کرنے میں اسے تکلیف اور بوجھ معلوم ہوتا ہے اور اندر نفس کے کشاکش موجود ہوتی ہے اور جب وہ نفس کی مخالفت کرتا ہے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن جب وہ اعمالِ صالحہ کرتا ہے[1] اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے جیسا کہ اس آیت کا منشا ہے۔ اس وقت وہ تکالیف شاقہ اور محنتیں جو خود نیکیوں کیلئے برداشت کرتا ہے اُٹھ جاتی ہیں اور طبعی طور پر وہ صلاحیت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے[1] اور وہ تکالیف تکالیف نہیں رہتی ہیں اور نیکیوں کو ایک ذوق اور لذت سے کرتا ہے اور ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ پہلا نیکی کرتا ہے مگر تکلیف اور تکلّف سے اور دوسرا ذوق اور لذّت سے۔ وہ نیکی اس کی غذا ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔[2] اور وہ تکلّف اور تکلیف جو پہلے ہوتی تھی اب ذوق وشوق اور لذّت سے بدل جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے صالحین کا جن کے لیے فرمایا:۔

لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ (العنکبوت: ۱۰)

اس مقام پر پہنچ کر کوئی فتنہ اور فساد مومن کے اندر نہیں رہتا۔ نفس کی شرارتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات پر فتح پا کر مطمئن ہو کر دارالامان میں داخل ہو جاتا ہے۔

---

[1] البدر میں ہے:۔ ’’اعضاء اور قویٰ کی یہ فطرت ہو جاتی ہے کہ ان سے نیک اعمال صادر ہوں‘‘ (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۵)

[2] الحکم جلد ۸ نمبر ۲ صفحہ ۱، ۲ مورخہ ۱۷؍ جنوری ۱۹۰۴ء

ابتلاء اور امتحان ایمان کی شرط ہے

اور اس سے آگے فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (العنکبوت: ۱۱) اور بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبانی تو ایمان کے دعوے کرتے ہیں اور مومن ہونے کی لاف وگزاف مارتے رہتے ہیں لیکن جب معرضِ امتحان وابتلا میں آتے ہیں تو اُن کی حقیقت کُھل جاتی ہے۔ اس فتنہ وابتلا کے وقت اُن کا ایمان اللہ تعالیٰ پر ویسا نہیں رہتا بلکہ شکایت کرنے لگتے ہیں اسے عذابِ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ لوگ بڑے ہی محروم ہیں جن کو صالحین کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہی تو وہ مقام ہے جہاں انسان ایمانی مدارج کے ثمرات کو مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی ذات پر اُن کا اثر پاتا ہے اور نئی زندگی اُسے ملتی ہے لیکن یہ زندگی پہلے ایک موت کو چاہتی ہے اور یہ انعام وبرکات امتحان وابتلاء کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ ہمیشہ عظیم الشان نعمت ابتلاء سے آتی ہے اور ابتلاء مومن کے لیے شرط ہے جیسے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت: ۳) یعنی کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ آمنا ہی کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جاویں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جاویں۔ ایمان کے امتحان کے لیے مومن کو ایک خطرناک آگ میں پڑنا پڑتا ہے مگر اس کا ایمان اس آگ سے اس کو صحیح سلامت نکال لاتا ہے اور وہ آگ اس پر گلزار ہوجاتی ہے۔ مومن ہوکر ابتلاء سے کبھی بے فکر نہیں ہونا چاہیئے اور ابتلاء پر زیادہ ثباتِ قدم دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور حقیقت میں جو سچا مومن ہے ابتلاء میں اس کے ایمان کی حلاوت اور لذت اَور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے عجائبات پر اس کا ایمان بڑھتا ہے اور وہ پہلے سے بہت زیادہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا اور دُعاؤں سے فتحیاب اجابت چاہتا ہے۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ انسان خواہش تو اعلیٰ مدارج اور مراتب کی کرے اور اُن تکالیف سے بچنا چاہے جو اُن کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔

یقیناً یاد رکھو کہ ابتلاء اور امتحان ایمان کی شرط ہے اس کے بغیر ایمان، ایمان کامل ہوتا ہی نہیں اور کوئی عظیم الشان نعمت بغیر ابتلاء ملتی ہی نہیں ہے۔ دنیا میں بھی عام قاعدہ یہی ہے کہ دنیاوی آسائشوں اور نعمتوں کے حاصل کرنے کے لیے قسم قسم کی مشکلات اور رنج وتعب اُٹھانے پڑتے ہیں۔ طرح طرح کے امتحانوں میں سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر کامیابی کی شکل نظر آتی ہے اور پھر بھی وہ محض خدا تعالےٰ کے فضل پر موقوف ہے۔ پھر خدا تعالیٰ جیسی نعمت عظمیٰ جس کی کوئی نظیر ہی نہیں یہ بدُوں امتحان کیسے میسّر آسکے۔

پس جو چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو پاوے اُسے چاہیئے کہ وہ ہر ایک ابتلاء کے لیے تیار ہوجاوے۔ جب

اللہ تعالیٰ کوئی سلسلہ قائم کرتا ہے جیسا کہ اس وقت اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے تو جو لوگ اس میں اوّلاً داخل ہوتے ہیں اُن کو قسم قسم کی تکالیف اُٹھانی پڑتی ہیں۔ ہر طرف سے گالیاں اور دھمکیاں سُننی پڑتی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ یہاں تک کہ اُن کو کہا جاتا ہے کہ ہم تم کو یہاں سے نکال دیں گے یا اگر ملازم ہے تو اس کے موقوف کرانے کے منصوبے ہوتے ہیں۔ جس طرح ممکن ہوتا ہے تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔ اور اگر ممکن ہو تو جان لینے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ ایسے وقت میں جو لوگ ان دھمکیوں کی پروا کرتے ہیں اور امتحان کے ڈر سے کمزوری ظاہر کرتے ہیں۔ یاد رکھو خدا تعالیٰ کے نزدیک اُن کے ایمان کی ایک پیسہ بھی قیمت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ابتلاء کے وقت خدا تعالیٰ سے نہیں انسان سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کی پروا نہیں کرتا وہ بالکل ایمان نہیں لایا۔ کیونکہ دھمکی کو اس کے مقابلہ میں وقعت دیتا اور ایمان چھوڑنے کو تیار ہو جاتا ہے[لہ]۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صالحین میں داخل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے یہ خلاصہ اور مفہوم ہے اس آیت کا۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (العنکبوت: ۱۱)

جماعت کو استقلال اور ہمت کی تلقین

ہماری جماعت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک وہ بزدلی کو نہ چھوڑے گی اور استقلال اور ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہر ایک راہ میں ہر مصیبت و مشکل کے اُٹھانے کے لیے تیار نہ رہے گی وہ صالحین میں داخل نہیں ہو سکتی۔ تم نے اس وقت خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ کے ساتھ تعلق پیدا کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم دُکھ دیئے جاؤ۔ تم کو ستایا جاتا ہے۔ گالیاں سُننی پڑتی ہیں۔ قوم اور برادری سے خارج کرنے کی دھمکیاں ملتی ہیں۔ جو جو تکالیف مخالفوں کے خیال میں آ سکتی ہیں اُس کے دینے کا وہ موقعہ ہاتھ سے نہیں دیتے۔ لیکن اگر تم ان تکالیف اور مشکلات اور ان موذیوں کو خدا نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ کو خدا مانا ہے تو ان تکالیف کو برداشت کرنے پر آمادہ رہو۔ اور ہر ابتلاء اور امتحان میں پورے اُترنے کے لیے کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق اور مدد چاہو تو میں تمہیں یقیناً کہتا ہوں کہ تم صالحین میں داخل ہو کر خدا تعالیٰ کے جیسی عظیم الشان نعمت کو پاؤ گے اور ان تمام مشکلات پر فتح پا کر دارالامان میں داخل ہو جاؤ گے۔

صاحبزادہ عبداللطیف کی شہادت

صاحبزادہ عبداللطیف شہید کی شہادت کا واقعہ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ تذکرۃ الشہادتین کو

لہ البدر میں ہے:۔ "ابتلاء کے وقت جو شخص انسان سے ڈرتا ہے اس کی کچھ بھی قیمت نہیں ہوتی۔ وہ دھمکی دینے والے کو گویا اپنا رب خیال کرتا ہے اور اس کے خوف سے ایمان چھوڑنے کو تیار ہو جاتا ہے تو اب بتلاؤ کہ کیا ایمان ہوا؟"

(البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۵ مورخہ ۱۶ / جنوری ۱۹۰۴ء)

بار بار پڑھو اور دیکھو کہ اُس نے اپنے ایمان کا کیسا نمونہ دکھایا ہے۔ اس نے دُنیا اور اس کے تعلقات کی کچھ بھی پروا نہیں کی۔ بیوی یا بچوں کا غم اس کے ایمان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکا۔ دنیوی عزت اور منصب اور تنعّم نے اس کو بُزدل نہیں بنایا۔ اُس نے جان دینی گوارا کی مگر ایمان کو ضائع نہیں کیا۔ عبداللطیف کہنے کو مارا گیا یا مر گیا مگر یقیناً سمجھو کہ وہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔ اگرچہ اس کو بہت عرصہ صحبت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن اس تھوڑی مدت میں جو وہ یہاں رہا اُس نے عظیم الشان فائدہ اُٹھایا۔ اُس کو قسم قسم کے لالچ دیئے گئے کہ اس کا مرتبہ و منصب بدستور قائم رہے گا مگر اس نے اس عزت افزائی اور دنیوی مفاد کی کچھ بھی پروا نہیں کی ان کو ہیچ سمجھا یہانتک کہ جان جیسی عزیز شئے کو جو انسان کو ہوتی ہے اس نے مقدم نہیں کیا۔ بلکہ دین کو مقدم کیا جس کا اُس نے خدا تعالیٰ کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ مَیں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔ مَیں بار بار کہتا ہوں کہ اس پاک نمونہ پر غور کرو کیونکہ اس کی شہادت یہی نہیں کہ اعلیٰ ایمان کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے بلکہ یہ خدا تعالیٰ کا عظیم الشان نشان ہے جو اَور بھی ایمان کی مضبوطی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ براہین احمدیہ میں ۲۳ برس پہلے سے اس شہادت کے متعلق پیشگوئی موجود تھی۔ وہاں صاف لکھا ہے۔

شَاتَانِ تُذْبَحَانِ وَكُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

کیا اس وقت کوئی منصوبہ ہو سکتا تھا کہ ۲۳ یا ۲۴ سال بعد عبدالرحمٰن اور عبداللطیف افغانستان سے آئیں گے اور پھر وہ وہاں جا کر شہید ہوں گے۔ وہ دل لعنتی ہے جو ایسا خیال کرے۔ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو عظیم الشان پیشگوئی پر مشتمل ہے اور اپنے وقت پر اگر یہ نشان پُورا ہو گیا[1]

اس سے پہلے عبدالرحمٰن جو مولوی عبداللطیف شہید کا شاگرد تھا، سابق امیر نے قتل کرایا محض اس وجہ سے کہ وہ اس سلسلہ میں داخل ہے اور یہ سلسلہ جہاد کے خلاف ہے اور عبدالرحمٰن جہاد کے خلاف تعلیم افغانستان میں پھیلاتا تھا۔ اور اب اس امیر نے مولوی عبداللطیف کو شہید کرا دیا۔ یہ عظیم الشان نشان جماعت کے لیے ہے اس پیشگوئی کے معنے اب مخالفوں سے پوچھو کہ کیا یہ پیشگوئی صریح الفاظ میں نہیں ہے؟ اور کیا یہ اب پوری نہیں ہو گئی ہے؟ کیونکہ انگریزوں کے ملک میں تو کوئی کسی کو بے گناہ ذبح نہیں کرتا ہے اس لیے یہاں تو اس کا

---

[1] البدر سے :۔ "براہینِ احمدیہ میں اس کی نسبت پیشگوئی موجود تھی۔ اور یہ وہ کتاب ہے جو آج سے ۲۳-۲۴ برس قبل ہر ایک جگہ اور ہر ایک فرقہ اور ملت حتٰی کہ امریکہ یورپ وغیرہ میں شائع ہو چکی ہے اور موجود ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ بتلاویں کہ اگر خدا تعالیٰ کی ذات موجود نہیں تو اس واقعہ کی خبر اس قدر عرصہ دراز پیشتر ہونی اور اس کا اسی طرح واقعہ ہونا اس کے کیا معنے ہیں؟" (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۵)

وقوع نہیں ہونا تھا اور علاوہ بریں ہماری تعلیم ایسی تعلیم نہیں تھی کہ کوئی اس کو پکڑ سکے بلکہ یہ تعلیم تو امن کے پھیلانے والی ہے پھر یہ پیشگوئی کیسے پوری ہوتی ؟ اس لیے خدا تعالیٰ نے اس نشان کو پورا کرنے کے لیے کابل کی سرزمین کو مقدر کیا ہوا تھا اور آخر ۲۴ سال کے بعد یہ پیشگوئی ٹھیک اسی طرح پوری ہوئی جس طرح پہلے فرمایا گیا تھا اس سے آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ (البقرۃ : ۲۱۷) یہ ایک قسم کی تسلی ہے ۔یعنی جب ایسا معاملہ ہو تو غم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو اور وہ اچھی نہیں ہوتی ہیں اور بہت سی ایسی ہوتی ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ درحقیقت تمہارے لیے مفید ہوتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد بالکل سچ ہے[1] اور مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ اب وقت آنے والا ہے کہ اس کی شہادت کی حکمت نکلنے والی ہے اور مَیں نے سُنا ہے کہ اس وقت چودہ آدمی قید کئے گئے ہیں ۔جو یہ کہتے ہیں کہ عبد اللطیف کو ناحق شہید کرایا گیا ہے اور یہ ظلم ہوا ہے وہ حق پر تھا اس پر امیر نے ان آدمیوں کو قید کر دیا ہے اور اُن کے وارثوں کو کہا ہے کہ وہ اُن کو سمجھائیں کہ ایسے خیالات سے وہ باز آ جائیں مگر وہ موت کو پسند کرتے ہیں اور اس یقینی بات کو وہ چھوڑنا نہیں چاہتے ۔اگر عبد اللطیف شہید نہ ہوا ہوتا تو یہ اثر کس طرح پیدا ہوتا اور یہ رُعب کس طرح پر پڑتا۔

یقیناً سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے کسی بڑی چیز کا ارادہ کیا ہے اور اس کی بنیاد عبد اللطیف کی شہادت سے پڑی ہے ۔اگر مولوی عبد اللطیف زندہ رہتے تو دس بیس برس تک زندہ رہتے آخر موت آجاتی اور موت آنی ہے اس سے تو آدمی بچ نہیں سکتا مگر یہ موت موت نہیں یہ زندگی ہے اور اس سے مفید نتیجے پیدا ہونے والے ہیں اور یہ مبارک بات ہے دشمن بھی اگر خبیث نہ ہو تو براہین احمدیہ کی پیشگوئی کو پڑھ کر اور اس کے اس طرح پر پوری ہونے کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اگر مفتری ہے اور رات کو جھوٹا الہام بنا کر سنا دیتا ہے تو یہ اثر

---

[1] البدر میں یہ حصہ زیادہ مفصل لکھا ہے :۔

”چونکہ خدا تعالےٰ جانتا تھا کہ اس خون سے مجھ پر اور کل جماعت پر ایک بڑا صدمہ گذرے گا اس لیے پھر اس سے آگے وہ تسلی دیتا ہے کہ اس مصیبت اور اس صدمہ سے تم غمگین اور اُداس مت ہو خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے وہ دو کے عوض ایک قوم تمہارے پاس لائے گا وہ اپنے بندے کے لیے کافی ہے ۔کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر ایک شے پر قادر ہے ۔ان کی شہادت میں حکمتِ الٰہی ہے ۔بہت امور ہیں جو تم چاہتے ہو کہ وقوع میں آویں حالانکہ ان کا واقع ہونا تمہارے لیے اچھا نہیں ۔ اور بہت ہیں جو تم چاہتے ہو کہ واقع نہ ہوں حالانکہ ان کا واقع ہونا تمہارے لیے اچھا ہوتا ہے سو وہ حکمتِ الٰہی عنقریب ظاہر ہو گی اور معلوم ہو گا کہ اس خون میں کس قدر برکات ہیں۔“

(البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۵)

استقامت کیوں ہو اور ۲۳ یا ۲۴ سال کے بعد ایک بات جو بطور پیشگوئی شائع کی گئی تھی کیوں پوری ہو جاتی ہے؟[1]

اس قدر عرصہ دراز تک تو انسان کو اپنی زندگی کی بھی امید نہیں ہو سکتی اور پھر اس کے ماننے والوں میں اسقدر استقامت اور قوت ہے کہ بیوی بچوں تک کی پروا نہیں کرتا، مال اور جان کا خیال تک بھی نہیں کرتا۔ ایمان جیسی دولت پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ایک اہل بصیرت اس سے نتیجہ نکالنے میں غلطی نہیں کرے گا کہ یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کے منشا ہی کے ماتحت ہے۔ ایک سلسلہ جو خود اس نے قائم کیا ہے اور آپ جس نے ایک نشان دیا ہے اُس نے وہ قوت اور استقامت اس شہید کو عطا کی تاکہ اس کی شہادت اس سلسلہ کی سچائی پر زبردست دلیل اور گواہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اب یہ نشان ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے ہدایت اور ترقی ایمان کا موجب ہو گا اور خدا تعالیٰ چاہے تو اس کے آثار ابھی سے نظر آنے لگے ہیں۔ اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ مشہور بات ہے۔ عبد اللطیف کے اس استقلال اور استقامت سے بہت بڑا فائدہ ان لوگوں کو ہو گا جو اس واقعہ پر غور کریں گے۔ چونکہ یہ موت بہت سی زندگیوں کا موجب ہونے والی ہے اس لیے یہ ایسی موت ہے کہ ہزاروں زندگیاں اس پر قربان ہیں۔

پھر اس پیشگوئی میں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ جو فرمایا ہے یہ دشمنوں کیلئے ہے کہ تمہیں بھی کبھی مرنا ہی ہے موت تو کسی کو نہیں چھوڑے گی۔ پھر عبد اللطیف کی موت پر جو موت نہیں بلکہ زندگی ہے تم کیوں خوش ہوتے ہو۔ آخر تمہیں بھی مرنا ہے۔ عبد اللطیف کی موت تو بہتوں کی زندگی کا باعث ہو گی مگر تمہاری جان اکارت جائے گی اور کسی ٹھکانے نہ لگے گی۔

مولوی عبد اللطیف کی شہادت اور استقامت کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ۲۳۔۲۴ برس سے ایک پیشگوئی براہین میں موجود تھی جو پوری ہو گئی اور یہ ہماری جماعت کے ایمان کو ترقی دینے کا موجب ہو گی۔ اسکے سوا اب یہ خون اُٹھنے لگا ہے اور اسکا اثر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے جو ایک جماعت کو پیدا کر دے گا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳ صفحہ ۱، ۲ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۴ء)

یہ خون کبھی خالی نہیں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے مصالح اور حکمتوں کو خوب جانتا ہے لیکن جہانتک پیشگوئی کے الفاظ پر غور کرتا ہوں۔ اس میں عَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّ ھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ایک ہی بڑی تسلی اور اطمینان کی بات ہے کہ جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس خون کے بہت بڑے بڑے نتائج پیدا ہونیوالے

---

[1] البدر میں ہے:۔ ’’اگر ہم مفتری تھے تو اس قدر استقامت ان میں کیوں آ گئی؟ کیا کبھی سُنا ہے کہ ایک مفتری کا مُرید ہو کر پھر کسی نے اس طرح سے جان دی ہو حالانکہ بار بار ان کو جان بچانے کا موقعہ بھی دیا گیا۔ الاستقامۃ فوق الکرامۃ۔ یہ بھی ہمارے سچا ہونے کی ایک دلیل ہے۔‘‘ (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۵)

ہیں۔ مَیں جانتا ہوں اور اس پر افسوس بھی کرتا ہوں کہ جس قسم کا نمونہ صدق و وفا کا عبداللطیف نے دکھلایا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے لیے میرا کانشنس فتویٰ نہیں دیتا کہ ایسے لوگ میری جماعت میں بہت ہیں۔ اس لیے مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب کو اسی قسم کا اخلاص اور صدق عطا کرے کہ وہ دین کو دُنیا پر مقدم کریں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان کو عزیز نہ سمجھیں۔

بُزدلی کو دُور کرو

مَیں ابھی جماعت میں بزدلی کو دیکھتا ہوں اور جب تک یہ بُزدلی دُور نہ ہو۔ اور عبداللطیف کا سا ایمان پیدا نہ ہو۔ یقیناً یاد رکھو کہ وہ اس سلسلہ میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ (البقرۃ:۱۰) میں داخل ہے۔ مومنوں میں وہ اس وقت داخل ہوں گے جب وہ اپنی نسبت یہ یقین کرلیں گے کہ ہم مُردے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب دشمنوں کے مقابلہ پر جاتے تھے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا گھوڑوں پر مُردے سوار ہیں اور وہ سمجھتے تھے کہ اب ہم کو موت ہی اس میدان سے الگ کرے گی۔

اللہ تعالیٰ لاف وگزاف کو پسند نہیں کرتا وہ دل کی اندرونی حالت کو دیکھتا ہے کہ اس میں ایمان کا کیا رنگ ہے۔ جب ایمان قوی ہو تو استقامت اور استقلال پیدا ہوتا ہے اور پھر انسان اپنی جان ومال کو ہرگز اس ایمان کے مقابلہ میں عزیز نہیں رکھ سکتا اور استقامت ایسی چیز ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، لیکن جب استقامت ہوتی ہے تو پھر انعامات الٰہیہ کا دروازہ کُھلتا ہے۔ دُعائیں بھی قبول ہوتی ہیں مکالماتِ الٰہیہ کا شرف بھی دیا جاتا ہے یہانتک کہ استقامت والے سے خوارق کا صدور ہونے لگتا ہے۔ ظاہری حالت اگر اپنی جگہ کوئی چیز ہوتی اور اس کی قدر وقیمت ہوتی تو ظاہرداری میں تو سب کے سب شریک ہیں۔ عام مسلمان نمازوں میں ہمارے ساتھ شریک ہیں، لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک شرف اور بزرگی اندرونہ سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے فرمایا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور بزرگی ظاہری نماز اور اعمال سے نہیں ہے بلکہ اس کی فضیلت اور بزرگی اس چیز سے ہے جو اس کے دل میں ہے حقیقت میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شرف اور علو دل ہی کی بات سے مخصوص ہے۔ مثلاً ایک شخص کے دو خدمتگار ہوں اور ان میں سے ایک خدمت گار تو ایسا ہو جو ہر وقت حاضر رہے اور بڑی جانفشانی سے ہر ایک خدمت کے کرنے کو حاضر اور تیار ہے اور دوسرا ایسا ہے کہ کبھی کبھی آجاتا ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے جو ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے۔ آقا بھی خوب جانتا ہے کہ یہ محض ایک مزدور ہے جو دن پورے ہو جانے پر تنخواہ لینے والا ہے اور اسی کے لیے کام کرتا ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قدر وقیمت اور محبت اسی سے ہوگی جو محنت اور جانفشانی سے کام کرتا ہے نہ کہ اس مزدور سے۔

اخلاص اور وفاداری

پس یاد رکھو کہ وہ چیز جو انسان کی قدر و قیمت کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑھاتی ہے وہ اس کا اخلاص اور وفاداری ہے جو وہ خدا تعالیٰ سے رکھتا ہے ورنہ مجاہدات خشک سے کیا ہوتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیکھا گیا ہے کہ ایسے ایسے لوگ بھی مجاہدات کرتے تھے جو چھت سے رسہ باندھ کر آپ کو ساری رات جاگنے کے لیے لٹکا رکھتے تھے لیکن کیا وہ ان مجاہدات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہو گئے تھے؟ ہرگز نہیں۔

نامرد، بزدل، بیوفا جو خدا تعالیٰ سے اخلاص اور وفاداری کا تعلق نہیں رکھتا بلکہ دغا دینے والا ہے وہ کس کام کا ہے اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہے۔ ساری قیمت اور شرف وفا سے ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو شرف اور درجہ ملا وہ کس بناء پر ملا؟ قرآن شریف نے فیصلہ کر دیا ہے۔ اِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (النجم: ۳۸) ابراہیم وہ جس نے ہمارے ساتھ وفاداری کی آگ میں ڈالے گئے مگر انہوں نے اس کو منظور نہ کیا کہ وہ ان کافروں کو کہہ دیتے کہ تمہارے ٹھاکروں کی پوجا کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کے لیے ہر تکلیف اور مصیبت کو برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ خدا تعالیٰ نے کہا کہ اپنی بیوی کو بے آب و دانہ جنگل میں چھوڑ آ۔ انہوں نے فی الفور اس کو قبول کر لیا۔ ہر ایک ابتلاء کو انہوں نے اس طرح پر قبول کر لیا کہ گویا عاشق اللہ تھا۔ درمیان میں کوئی نفسانی غرض نہ تھی۔ اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتلا پیش آئے۔ خویش و اقارب نے مل کر ہر قسم کی ترغیب دی کہ اگر آپ مال و دولت چاہتے ہیں تو ہم دینے کو تیار ہیں اور اگر آپ بادشاہت چاہتے ہیں تو اپنا بادشاہ بنا لینے کو تیار ہیں۔ اگر بیویوں کی ضرورت ہے تو خوبصورت بیویاں دینے کو موجود ہیں[1]۔ مگر آپ کا جواب یہی تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے شرک کے دور کرنے کے واسطے مامور کیا ہے جو مصیبت اور تکلیف تم دینی چاہتے ہو دے لو میں اس سے رُک نہیں سکتا کیونکہ یہ کام جب خدا تعالیٰ نے میرے سپرد کیا ہے پھر دنیا کی کوئی ترغیب اور خوف مجھ کو اس سے ہٹا نہیں سکتا۔ آپ جب طائف کے لوگوں کو تبلیغ کرنے گئے تو اُن خبیثوں نے آپ کے پتھر مارے جس سے آپ دوڑتے دوڑتے گر جاتے تھے۔ لیکن ایسی مصیبتوں اور تکلیفوں نے آپ کو اپنے کام سے نہیں روکا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صادقوں کے لیے کیسی مشکلات اور مصائب کا سامنا ہوتا ہے اور کیسی مشکل گھڑیاں اُن پر آتی ہیں مگر باوجود مشکلات کے اُن کی قدر شناسی کا بھی ایک دن مقرر ہوتا ہے اس وقت اُن کا صدق روزِ روشن کی طرح کھل جاتا ہے اور ایک دنیا ان کی طرف دوڑتی ہے۔

عبداللطیف کے لیے وہ دن جو اس کی سنگساری کا دن تھا کیسا مشکل تھا۔ وہ ایک میدان میں سنگساری کے لیے لایا گیا اور ایک خلقت اس تماشا کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ دن اپنی جگہ کس قدر قدر و قیمت رکھتا ہے

[1] البدر سے:۔ "مگر اس وعظ اور تبلیغ سے باز آؤ" (البدر جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۶)

اگر اس کی باقی ساری زندگی ایک طرف ہو اور وہ دن ایک طرف، تو وہ دن قدر و قیمت میں بڑھ جاتا ہے زندگی کے یہ دن بہرحال گذر ہی جاتے ہیں اور اکثر بہائم کی زندگی کی طرح گذرتے ہیں۔ لیکن مبارک وہی دن ہے جو خدا تعالیٰ کی محبت اور وفا میں گذرے۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس لطیف اور عمدہ غذائیں کھانے کے لیے اور خوبصورت بیویاں اور عمدہ عمدہ سواریاں سوار ہونے کو رکھتا ہے۔ بہت سے نوکر چاکر ہر وقت خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کا انجام کیا ہے؟ کیا یہ لذتیں اور آرام ہمیشہ کے لیے ہیں؟ ہرگز نہیں ان کا انجام آخر فنا ہے۔ مردانہ زندگی یہی ہے کہ اس زندگی پر فرشتے بھی تعجب کریں۔ وہ ایسے مقام پر کھڑا ہو کہ اس کی استقامت اخلاص اور وفاداری تعجب خیز ہو۔ خدا تعالیٰ نامرد کو نہیں چاہتا۔ اگر زمین و آسمان بھی ظاہری اعمال سے بھر دیں لیکن ان اعمال میں وفا نہ ہو تو اُن کی کچھ بھی قیمت نہیں۔ کتاب اللہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جب تک انسان صادق اور وفادار نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی نمازیں بھی جہنم ہی کو لے جانے والی ہوتی ہیں۔ جب تک پورا وفادار اور مخلص نہ ہو۔ ریاکاری کی جڑ اندر سے نہیں جاتی ہے لیکن جب پُورا وفادار ہو جاتا ہے۔ اس وقت اخلاص اور صدق آتا ہے اور وہ زہریلا مادہ نفاق اور بزدلی کا جو پہلے پایا جاتا ہے دُور ہو جاتا ہے۔

صدق اور خدمت کا آخری موقعہ

اب وقت تنگ ہے میں بار بار یہی نصیحت کرتا ہوں کہ کوئی جوان یہ بھروسہ نہ کرے کہ اٹھارہ یا انیس سال کی عمر ہے اور ابھی بہت وقت باقی ہے۔ تندرست اپنی تندرستی اور صحت پر ناز نہ کرے اسی طرح اَور کوئی شخص جو عمدہ حالت رکھتا ہے وہ اپنی وجاہت پر بھروسہ نہ کرے۔ زمانہ انقلاب میں ہے، یہ آخری زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صادق اور کاذب کو آزمانا چاہتا ہے۔ اس وقت صدق و وفا کے دکھانے کا وقت ہے اور آخری موقعہ دیا گیا ہے۔ یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ وہ وقت ہے کہ تمام نبیوں کی پیشگوئیاں یہاں آکر ختم ہو جاتی ہیں اس لیے صدق اور خدمت کا یہ آخری موقع ہے جو نوعِ انسان کو دیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد کوئی موقع نہ ہوگا۔ بڑا ہی بدقسمت وہ ہے جو اس موقع کو کھو دے۔

نرا زبان سے بیعت کا اقرار کرنا کچھ چیز نہیں ہے بلکہ کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگو کہ وہ تمہیں صادق بنا دے۔ اس میں کاہلی اور سُستی سے کام نہ لو بلکہ مستعد ہو جاؤ۔ اور اس تعلیم پر جو میں پیش کر چکا ہوں عمل کرنے کے لیے کوشش کرو اور اس راہ پر چلو جو میں نے پیش کی ہے۔ عبد اللطیف کے نمونہ کو ہمیشہ مدنظر رکھو کہ اس سے کس طرح پر صادقوں اور وفاداروں کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ نمونہ خدا تعالیٰ نے تمہارے لیے پیش کیا ہے۔

ہمیشہ ملتے رہو۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ ایک دن آتا ہے کہ نہ ہم ہوں گے نہ تم اور نہ کوئی اَور۔ اور یہ سب جنگل ویرانہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ کی کیا حالت ہوگئی۔ ہر ایک حالت میں تبدیلی ہے پس اس تبدیلی کو مدّنظر رکھو اور آخری وقت کو ہمیشہ یاد رکھو۔ آنے والی نسلیں آپ لوگوں کا مُنہ دیکھیں گی اور اسی نمونہ کو دیکھیں گی۔ اگر تم پورے طور پر اپنے آپ کو اس تعلیم کا عامل نہ بناؤ گے تو گویا آنے والی نسلوں کو تباہ کرو گے۔

انسان کی فطرت میں نمونہ پرستی ہے وہ نمونہ سے بہت جلد سبق لیتا ہے۔ ایک شرابی اگر کہے کہ شراب نہ پیُو یا ایک زانی کہے کہ زنا نہ کرو، ایک چور دوسرے کو کہے کہ چوری نہ کرو تو ان کی نصیحتوں سے دوسرے کیا فائدہ اُٹھائیں گے بلکہ وہ تو کہیں گے کہ بڑا ہی خبیث ہے وہ جو خود کرتا ہے اور دوسروں کو اس سے منع کرتا ہے جو لوگ خود ایک بدی میں مبتلا ہو کر اس کا وعظ کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والے اور خود عمل نہ کرنے والے بے ایمان ہوتے ہیں اور اپنے واقعات کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے واعظوں سے دنیا کو بہت بڑا نقصان پہنچتا ہے۔

ایک مولوی کا ذکر ہے کہ اس نے ایک مسجد کا بہانہ کر کے ایک لاکھ روپیہ جمع کیا۔ ایک جگہ وہ وعظ کر رہا تھا اس کے وعظ سے متاثر ہو کر ایک عورت نے اپنی پازیب اُتار کر اس کو چندہ میں دے دی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اے نیک عورت کیا تو چاہتی ہے کہ تیرا دوسرا پاؤں جہنم میں جائے۔ اس نے فی الفور دوسری پازیب بھی اُتار کر اُسے دے دی۔ مولوی صاحب کی بیوی بھی اس وعظ میں موجود تھی۔ اس کا اس پر بھی بڑا اثر ہوا اور جب مولوی صاحب گھر میں آئے تو دیکھا کہ ان کی عورت روتی ہے اور اس نے اپنا سارا زیور مولوی صاحب کو دے دیا کہ اسے بھی مسجد میں لگا دو۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تو کیوں ایسا روتی ہے یہ تو صرف چندہ کی تجویز تھی اَور کچھ نہ تھا۔

غرض ایسے نمونوں سے دُنیا کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہماری جماعت کو ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے تم ایسے نہ بنو۔ چاہیئے کہ تم ہر قسم کے جذبات سے بچو۔ ہر ایک اجنبی جو تم کو ملتا ہے وہ تمہارے مُنہ کو تاڑتا ہے اور تمہارے اخلاق عادات۔ استقامت۔ پابندیٔ احکام الٰہی کو دیکھتا ہے کہ کیسے ہیں۔ اگر عمدہ نہیں تو وہ تمہارے ذریعہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ پس ان باتوں کو یاد رکھو (تَمَّ کَلَامُہٗ الْمُبَارَکُ)۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۴ صفحہ ۱۔۲ مورخہ ۳۱ر جنوری ۱۹۰۴ء)

٭ ٭ ٭

۲۸؍دسمبر ۱۹۰۳ء

دلائل الخیرات اور دیگر وظائف کی نسبت امام الوقت کی رائے

ایک صاحب[1] آمدہ از امروہہ نے دریافت کیا کہ دلائل الخیرات جو ایک کتاب وظیفوں کی ہے اگر اُسے پڑھا جاوے تو کچھ حرج تو نہیں؟ کیونکہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف ہی ہے اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعریف جا بجا ہے۔ فرمایا کہ:۔

انسان کو چاہیئے کہ قرآن شریف کثرت سے پڑھے جب اس میں دُعا کا مقام آوے تو دُعا کرے اور خود بھی خدا تعالیٰ سے وہی چاہے جو اس دُعا میں چاہا گیا ہے اور جہاں عذاب کا مقام آوے تو اس سے پناہ مانگے اور ان بداعمالیوں سے بچے جس کے باعث وہ قوم تباہ ہوئی۔ بلا مدد وحی کے ایک بالائی منصوبہ جو کتاب اللہ کے ساتھ ملاتا ہے۔ وہ اُس شخص کی ایک رائے ہے جو کہ کبھی باطل بھی ہوتی ہے اور ایسی رائے جس کی مخالفت احادیث میں موجود ہو وہ محدثات میں داخل ہوگی۔ رسم اور بدعات سے پرہیز بہتر ہے اس سے رفتہ رفتہ شریعت میں تصرف شروع ہو جاتا ہے۔ بہتر طریق یہ ہے کہ ایسے وظائف میں جو وقت اس نے صرف کرنا ہے وہی قرآن شریف کے تدبّر میں لگاوے۔ دل کی اگر سختی ہو تو اس کے نرم کرنے کے لیے یہی طریق ہے کہ قرآن شریف کو ہی بار بار پڑھے جہاں جہاں دُعا ہوتی ہے وہاں مومن کا بھی دل چاہتا ہے کہ یہی رحمتِ الٰہی میرے بھی شاملِ حال ہو۔ قرآن شریف کی مثال ایک باغ کی ہے کہ ایک مقام سے انسان کسی قسم کا پھول چُنتا ہے۔ پھر آگے چل کر اور قسم کا چُنتا ہے پس چاہیئے کہ ہر ایک مقام کے مناسب حال فائدہ اُٹھاوے۔ اپنی طرف سے الحاق کی کیا ضرورت ہے ورنہ پھر سوال ہوگا کہ تم نے ایک نئی بات کیوں بڑھائی؟ خدا تعالیٰ کے سوا اور کس کی طاقت ہے کہ کہے فلاں راہ سے اگر سُورۂ یٰسٓ پڑھو گے تو برکت ہوگی ورنہ نہیں۔

قرآن شریف سے اعراض کی صورتیں

قرآن شریف سے اعراض کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صوری اور ایک معنوی

صوری یہ کہ کبھی کلام الٰہی کو پڑھا ہی نہ جاوے جیسے اکثر لوگ مسلمان کہلاتے ہیں مگر وہ قرآن شریف کی عبارت تک سے بالکل غافل ہیں اور ایک معنوی کہ تلاوت تو کرتا ہے مگر اس کی برکات و انوار و رحمت الٰہی پر ایمان نہیں ہوتا پس دونو اعراضوں میں سے کوئی اعراض ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

---

[1] الحکم میں ان کا نام قاضی آل احمد صاحب رئیس امروہہ لکھا ہے۔ (مرتب)

امام جعفرؒ کا قول ہے واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے کہ مَیں اس قدر کلام الٰہی پڑھتا ہوں کہ ساتھ ہی الہام شروع ہو جاتا ہے مگر بات معقول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک جنس کی شئی دوسری شئی کو اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ اب اس زمانہ میں لوگوں نے صدہا حاشیے چڑھائے ہوئے ہیں شیعوں نے الگ۔ سنیوں نے الگ۔ ایک دفعہ ایک شیعہ نے میرے والد صاحب سے کہا کہ مَیں ایک فقرہ بتلاتا ہوں وہ پڑھ لیا کرو تو پھر طہارت اور وضو وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اسلام میں کفر۔ بدعت۔ الحاد۔ زندقہ وغیرہ۔ اسی طرح سے آئے ہیں کہ ایک شخصِ واحد کے کلام کو اس قدر عظمت دی گئی۔ جس قدر کہ کلام الٰہی کو دی جانی چاہیئے تھی۔ صحابہ کرامؓ اسی لیے احادیث کو قرآن شریف سے کم درجہ پر مانتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ فیصلہ کرنے لگے تو ایک بوڑھی عورت نے اُٹھ کر کہا۔ حدیث میں یہ لکھا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مَیں ایک بڑھیا کے لیے کتاب اللہ کو ترک نہیں کرسکتا۔

اگر ایسی ایسی باتوں کو جن کے ساتھ وحی کی کوئی مدد نہیں تو وہی عظمت دی جاوے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسیح کی حیات کی نسبت جو اقوال ہیں اُن کو بھی صحیح مان لیا جاوے حالانکہ وہ قرآن شریف کے بالکل مخالف ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۴ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴ ؍جنوری ۱۹۰۴ء)

نیز (الحکم جلد ۸ نمبر ۴ صفحہ ۲ مورخہ ۳۱ ؍جنوری ۱۹۰۴ء)

---

۸ ؍جنوری ۱۹۰۴ء

(بعد نماز جمعہ[۱])

گناہ سے بچنے کا طریق

فرمایا:۔ گلستان میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ؎

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

گناہ اور غفلت سے پرہیز کے لیے اس قدر تدبیر کی ضرورت ہے جو حق ہے تدبیر کا۔ اور اس قدر دُعا کرے جو حق ہے دُعا کا۔ جب تک یہ دونو اس درجہ پر نہ ہوں اس وقت تک انسان تقویٰ کا درجہ حاصل نہیں

---

[۱] بعد نماز جمعہ اعلیٰ حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جناب نواب محمد علی خاں صاحب ڈائرکٹر مدرسہ تعلیم الاسلام قادیان کے برادر معظم اور جناب مشیر اعلیٰ ریاست مالیرکوٹلہ (جو اپنے کسی ضروری کام کے لیے آئے تھے) ملاقات ہوئی۔ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس موقعہ پر یہ تقریر فرمائی۔ (مرتب)

کرتا اور پورا متقی نہیں بنتا۔ اگر صرف دُعا کرتا ہے اور خود کوئی تدبیر نہیں کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا امتحان کرتا ہے یہ سخت گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امتحان نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک زمیندار اپنی زمین میں تردد تو نہیں کرتا اور بدُوں کاشت کے دُعا کرتا ہے کہ اس میں غلہ پیدا ہو جائے۔ وہ حقِ تدبیر کو چھوڑتا ہے اور خدا تعالیٰ کا امتحان کرتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح پر جو شخص صرف تدبیر کرتا ہے اور اسی پر بھروسہ کرتا اور خدا تعالیٰ سے دعا نہیں مانگتا وہ ملحد ہے۔

تدبیر اور دُعا کا اتحاد اسلام ہے

جیسے پہلا آدمی جو صرف دُعا کرتا ہے اور تدبیر نہیں کرتا وہ خطا کار ہے۔ اسی طرح پر یہ دوسرا جو تدبیر ہی کو کافی سمجھتا ہے وہ ملحد ہے مگر تدبیر اور دعا دونو باہم ملا دینا اسلام ہے۔ اسی واسطے مَیں نے کہا ہے کہ گناہ اور غفلت سے بچنے کے لیے اس قدر تدبیر کرے جو تدبیر کا حق ہے اور اس قدر دُعا کرے جو دعا کا حق ہے۔ اسی واسطے قرآن شریف کی پہلی ہی سورۃ فاتحہ میں ان دونو باتوں کو مدِّنظر رکھ کر فرمایا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ (الفاتحۃ:۵) اِيَّاكَ نَعْبُدُ اسی اصل تدبیر کو بتاتا ہے اور مقدم اس کو کیا ہے کہ پہلے انسان رعایتِ اسباب اور تدبیر کا حق ادا کرے مگر اس کے ساتھ ہی دعا کے پہلو کو چھوڑ نہ دے بلکہ تدبیر کے ساتھ ہی اس کو مدِّنظر رکھے۔ مومن جب اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو معاً اس کے دل میں گذرتا ہے کہ مَیں کیا چیز ہوں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں جب تک اُس کا فضل اور کرم نہ ہو۔ اس لیے وہ معاً کہتا ہے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ مدد بھی تجھ ہی سے چاہتے ہیں۔ یہ اک نازک مسئلہ ہے جس کو بجز اسلام کے اَور کسی مذہب نے نہیں سمجھا۔ اسلام ہی نے اس کو سمجھا ہے۔ عیسائی مذہب کا تو ایسا حال ہے کہ اس نے ایک عاجز انسان کے خون پر بھروسہ کر لیا اور انسان کو خدا بنا رکھا ہے۔ ان میں دُعا کے لیے وہ جوش اور اضطراب ہی کب پیدا ہو سکتا ہے جو دعا کے ضروری اجزاء ہیں وہ تو انشاء اللہ کہنا بھی گناہ سمجھتے ہیں لیکن مومن کی روح ایک لحظہ کے لیے بھی گوارا نہیں کرتی کہ وہ کوئی بات کرے اور انشاء اللہ ساتھ نہ کہے۔ پس اسلام کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ اس میں داخل ہونے والا اس اصل کو مضبوط پکڑ لے۔ تدبیر بھی کرے اور مشکلات کے لیے دُعا بھی کرے اور کراوے۔ اگر ان دونو پلڑوں میں سے کوئی ایک ہلکا ہے تو کام نہیں چلتا ہے اس لیے ہر ایک مومن کے واسطے ضروری ہے کہ اس پر عمل کرے مگر اس زمانہ میں مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ وہ تدبیریں تو کرتے ہیں مگر دعا سے غفلت کی جاتی ہے بلکہ اسباب پرستی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تدابیر دنیا ہی کو خدا بنا لیا گیا ہے اور دعا پر ہنسی کی جاتی ہے اور اس کو ایک فضول شے قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سارا اثر یورپ کی تقلید سے ہوا ہے۔ یہ خطرناک زہر ہے جو دنیا میں پھیل رہا ہے مگر خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس زہر کو دُور کرے چنانچہ یہ سلسلہ اس نے اسی لیے قائم کیا ہے تا دُنیا

کو خدا تعالیٰ کی معرفت ہو۔ اور دعا کی حقیقت اور اس کے اثر سے اطلاع ملے۔

آداب الدعاء

بعض لوگ اس قسم کے بھی ہیں جو بظاہر دعا بھی کرتے ہیں مگر اس کے فیوض اور ثمرات سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آداب الدعا سے ناواقف ہوتے ہیں اور دُعا کے اثر اور نتیجہ کے لیے بہت جلدی کرتے ہیں اور آخر تھک کر رہ جاتے ہیں حالانکہ یہ طریق ٹھیک نہیں ہے۔ پس کچھ تو پہلے ہی زمانہ کے اثر اور رنگ سے اسباب پرستی ہو گئی ہے اور دُعا سے غفلت عام ہو گئی۔ خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں رہا۔ نیکیوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور کچھ ناواقفی اور جہالت نے تباہی کر رکھی ہے کہ حق کو چھوڑ کر صراط مستقیم کو چھوڑ کر اَور اَور طریقے اور راہ ایجاد کر لیے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگ بھٹکتے پھر رہے ہیں اور کامیاب نہیں ہوتے۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جس سے دُعا کرتا ہے اس پر کامل ایمان ہو۔ اس کو موجود۔ سمیع۔ بصیر۔ خبیر۔ علیم۔ متصرف۔ قادر سمجھے اور اس کی ہستی پر ایمان رکھے کہ وہ دُعاؤں کو سُنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ مگر کیا کروں کس کو سُناؤں اب اسلام میں مشکلات ہی اَور آ پڑی ہیں کہ جو محبت خدا تعالیٰ سے کرنی چاہیئے وہ دوسروں سے کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا رُتبہ انسانوں اور مُردوں کو دیتے ہیں۔ حاجت روا اور مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک تھی۔ مگر اب جس قبر کو دیکھو وہ حاجت روا ٹھہرائی گئی ہے۔ مَیں اس حالت کو دیکھتا ہوں تو دل میں درد اُٹھتا ہے مگر کیا کہیں کس کو جا کر سُنائیں۔

دیکھو قبر پر اگر ایک شخص بیس برس بھی بیٹھا ہوا پکارتا رہے تو اس قبر سے کوئی آواز نہیں آئے گی مگر مسلمان ہیں کہ قبروں پر جاتے اور اُن سے مُرادیں مانگتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں وہ قبر خواہ کسی کی بھی ہو اس سے کوئی مراد بَر نہیں آسکتی۔ حاجت روا اور مشکل کشا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور کوئی اس صفت کا موصوف نہیں۔ قبر سے کسی آواز کی اُمید مت رکھو۔ برخلاف اس کے اگر اللہ تعالیٰ کو اخلاص اور ایمان کے ساتھ دن میں دس مرتبہ بھی پکارو تو مَیں یقین رکھتا ہوں اور میرا اپنا تجربہ ہے کہ وہ دس دفعہ ہی آواز سُنتا اور دس ہی دفعہ جواب دیتا ہے لیکن یہ شرط ہے کہ پکارے اس طرح پر جو پکارنے کا حق ہے۔

ہم سب ابرار، اخیارِ اُمّت کی عزت کرتے ہیں اور اُن سے محبت رکھتے ہیں لیکن ان کی محبت اور عزت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہم اُن کو خدا بنا لیں اور وہ صفات جو خدا تعالیٰ میں ہیں ان میں یقین کر لیں۔

مَیں بڑے دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ ہماری آواز نہیں سُنتے اور اس کا جواب نہیں دیتے۔ دیکھو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ایک گھنٹہ میں ۷۲ آدمی آپ کے شہید ہو گئے۔ اس وقت آپ سخت نرغہ میں تھے اب طبعاً ہر ایک شخص کا کانشنس گواہی دیتا ہے کہ وہ اس وقت جبکہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے

اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہوں گے کہ اس مشکل سے نجات مل جاوے لیکن وہ دعا اُس وقت منشاء الٰہی کے خلاف تھی اور قضاء و قدر اس کے مخالف تھے اس لیے وہ ایسی جگہ شہید ہو گئے۔ اگر ان کے قبضہ و اختیار میں کوئی بات ہوتی تو انہوں نے کونسا دقیقہ اپنے بچاؤ کے لیے اُٹھا رکھا تھا مگر کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قضا و قدر کا سارا معاملہ اور تصرف تام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے جو اس قدر ذخیرہ قدرت کا رکھتا ہے اور حیّ و قیوم ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو مُردوں اور عاجز بندوں کی قبروں پر جا کر اُن سے مُرادیں مانگتا ہے اس سے بڑھ کر بے نصیب کون ہو سکتا ہے؟

انسان کے سینہ میں دو دل نہیں ہوتے۔ ایک ہی دل ہے وہ دو جگہ محبت نہیں کر سکتا اس لیے اگر کوئی زندوں کو چھوڑ کر مُردوں کے پاس جاتا ہے وہ حفظِ مراتب نہیں کرتا۔ اور یہ مشہور بات ہے۔ ؎

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

خدا تعالیٰ کو خدا تعالیٰ کی جگہ پر رکھو اور انسان کو انسان کا مرتبہ دو۔ اس سے آگے مت بڑھاؤ مگر میں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ حفظِ مراتب نہیں کیا جاتا۔ زندہ اور مُردہ کی تفریق ہی نہیں رہی بلکہ انسان عاجز اور خدائے قادر میں کوئی فرق اس زمانہ میں نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے۔ صدیوں سے خدا تعالیٰ کا قدر نہیں پہچانا گیا اور خدا تعالیٰ کی عظمت و جبروت عاجز بندوں اور بے قدر چیزوں کو دی گئی۔

مجھے تعجب آتا ہے ان لوگوں پر جو مسلمان کہلاتے ہیں لیکن باوجود مسلمان کہلانے کے خدا تعالیٰ کو چھوڑتے ہیں اور اس کی صفات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں جیسا کہ میں دیکھتا ہوں کہ مسیح ابن مریم کو جو ایک عاجز انسان تھا اور اگر قرآن شریف نہ آیا ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوئے ہوتے تو اس کی رسالت بھی ثابت نہ ہوتی بلکہ انجیل سے تو وہ کوئی اعلیٰ اخلاق کا آدمی بھی ثابت نہیں ہوتا لیکن عیسائیوں کے اثر سے متاثر ہو کر مسلمان بھی ان کو خدائی درجہ دینے میں پیچھے نہیں رہے کیونکہ جیسا کہ وہ صاف مانتے ہیں کہ وہ اب تک حیّ و قیوم ہے اور زمانہ کا کوئی اثر اس پر نہیں ہوا، آسمان پر موجود ہے۔ مُردوں کو زندہ کیا کرتا تھا۔ جانوروں کو پیدا کرتا تھا۔ غیب جاننے والا تھا۔ پھر اس کے خدا بنانے میں اَور کیا باقی رہا۔

افسوس مسلمانوں کی عقل ماری گئی جو ایک خدا کے ماننے والے تھے وہ اب ایک مُردہ کو خدا سمجھتے ہیں۔ اور اُن خداؤں کا تو شمار نہیں جو مُردہ پرستوں اور مزار پرستوں نے بنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت اور صورت میں خدا تعالیٰ کی غیرت نے یہ تقاضا کیا ہے کہ اُن مصنوعی خداؤں کی خدائی کو خاک میں ملایا جاوے۔ زندوں اور مُردوں میں ایک امتیاز قائم کر کے دُنیا کو حقیقی خدا کے سامنے سجدہ کرایا جاوے۔ اسی غرض کے لیے اس نے مجھے بھیجا ہے۔ اور اپنے نشانوں کے ساتھ بھیجا ہے۔

یاد رکھو انبیاء علیہم السلام کو جو شرف اور رُتبہ مِلا وہ صرف اسی بات سے ملا ہے کہ انہوں نے حقیقی خدا کو پہچانا اور اس کی قدر کی۔ اسی ایک ذات کے حضور انہوں نے اپنی ساری خواہشوں اور آرزوؤں کو قربان کیا۔ کسی مُردہ اور مزار پر بیٹھ کر انہوں نے مُرادیں نہیں مانگی ہیں۔

دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنے بڑے عظیم الشان نبی تھے اور خدا تعالیٰ کے حضور اُن کا کتنا بڑا درجہ اور رُتبہ تھا اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بجائے خدا تعالیٰ کے حضور گرنے کے ابراہیم کی پُوجا کرتے تو کیا ہوتا؟ کیا آپ کو وہ اعلیٰ درجہ کے مراتب مل سکتے جو اب ملے ہیں؟ کبھی نہیں۔ پھر جبکہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے بزرگ بھی تھے اور آپ نے اُن کی قبر پر جا کر یا بیٹھ کر اُن سے کچھ نہیں مانگا اور نہ کسی اور قبر پر جا کر آپ نے اپنی کوئی حاجت پیش کی تو یہ کس قدر بیوقوفی اور بے دینی ہے کہ آج مسلمان قبروں پر جا کر اُن سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اور اُن کی پُوجا کرتے ہیں۔ اگر قبروں سے کچھ مل سکتا تو اس کے لیے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبروں سے مانگتے۔ مگر نہیں مُردہ اور زندہ میں جس قدر فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ بجز خدا تعالیٰ کے اور کوئی مخلوق اور ہستی نہیں ہے جس کی طرف انسان توجہ کرے اور اس سے کچھ مانگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ذات کے عاشق زار اور دیوانہ ہوئے اور پھر وہ پایا جو دنیا میں کبھی کسی کو نہیں ملا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ سے اس قدر محبت تھی کہ عام لوگ بھی کہا کرتے تھے کہ عَشِقَ مُحَمَّدٌ عَلٰی رَبِّہٖ یعنی محمد اپنے رب پر عاشق ہو گیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حقیقت میں انبیاء علیہم السلام کو جو شرف مِلا اور جو نعمت حاصل ہوئی وہ اسی وجہ سے اور اگر کوئی پا سکتا ہے تو اسی ایک راہ سے پا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دامن پکڑا۔ اور قوم اور برادری کی کچھ بھی پروا نہ کی۔ خدا تعالیٰ نے بھی وہ وفا کی کہ ساری دُنیا جانتی ہے۔ جس مکہ سے آپ نکالے گئے تھے اسی مکہ میں ایک شہنشاہ کی شان اور حیثیت سے داخل ہوئے۔ قوم اور برادری نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ ایذا رسانی کا باقی نہیں چھوڑا۔ لیکن جب خدا تعالیٰ ساتھ تھا وہ کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں اور نبیوں اور رسولوں کی زندگی اس پر گواہ ہے کہ وہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اس لیے وہ نہیں مرتے جب تک کہ اُن کی مرادیں پُوری نہ ہو جائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو لیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کی قبولیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں دنیا کے لیے نہ تھیں بلکہ آپ کی دُعائیں یہ تھیں کہ بُت پرستی دُور ہو جاوے اور خدا تعالیٰ کی توحید قائم ہو اور یہ انقلاب عظیم مَیں دیکھ لوں کہ جہاں ہزاروں بُت پُوجے جاتے ہیں وہاں ایک خدا کی پرستش ہو۔ پھر تم خود ہی سوچو اور مکہ کے اس انقلاب کو دیکھو کہ جہاں بت پرستی کا اس قدر چرچا تھا کہ ہر ایک گھر میں بُت رکھا ہوا تھا۔ آپ کی زندگی ہی میں سارا مکہ مسلمان ہو گیا اور ان بتوں

کے پُجاریوں ہی نے ان کو توڑا۔ اور ان کی مذمت کی۔ یہ حیرت انگیز کامیابی یہ عظیم الشان انقلاب کسی نبی کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کرکے دکھایا۔ یہ کامیابی آپ کی اعلیٰ درجہ کی قوتِ قدسی اور اللہ تعالیٰ سے شدید تعلقات کا نتیجہ تھا۔

ایک وقت وہ تھا کہ آپ مکہ کی گلیوں میں تنہا پھرا کرتے تھے اور کوئی آپ کی بات نہ سُنتا تھا۔ پھر ایک وقت وہ تھا جب آپ کے انقطاع کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یاد دلایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ (النصر: ۲، ۳) آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ جب یہ آیت اُتری تو آپ نے فرمایا کہ اس سے وفات کی بُو آتی ہے کیونکہ وہ کام جو مَیں چاہتا تھا وہ تو ہو گیا ہے اور اصل قاعدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اسی وقت تک دُنیا میں رہتے ہیں جب تک وہ کام جس کے لیے وہ بھیجے جاتے ہیں نہ ہولے جب وہ کام ہو چکتا ہے تو اُن کی رحلت کا زمانہ آجاتا ہے جیسے بندوبست والوں کا جب کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ اس ضلع سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پر جب آیت شریف اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدۃ: ۴) نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جن پر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے اس آیت کو سُنکر رونے لگے۔ صحابہؓ میں سے ایک نے کہا کہ اے بڈھے! تجھے کس چیز نے رُلایا۔ آج تو مومنوں کے لیے بڑی خوشی کا دن ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو نہیں جانتا اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بُو آتی ہے۔

دنیا میں اسی طرح پر قاعدہ ہے کہ جب مثلاً محکمہ بندوبست ایک جگہ کام کرتا ہے اور وہ کام ختم ہو جاتا ہے تو پھر وہ عملہ وہاں نہیں رہتا ہے۔ اسی طرح انبیاء و رُسل علیہم السلام دنیا میں آتے ہیں۔ اُن کے آنے کی ایک غرض ہوتی ہے اور جب وہ پوری ہو جاتی ہے پھر وہ رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دیکھتا ہوں تو آپ سے بڑھ کر کوئی خوش قسمت اور قابلِ فخر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ جو کامیابی آپ کو حاصل ہوئی وہ کسی اَور کو نہیں ملی۔

آپ ایسے زمانہ میں آئے کہ دنیا کی حالت مسخ ہو چکی تھی اور وہ مجذوم کی طرح بگڑی ہوئی تھی اور آپ اس وقت رخصت ہوئے جب آپ نے لاکھوں انسانوں کو ایک خدا کے حضور جُھکا دیا اور توحید پر قائم کر دیا۔ آپ کی قوتِ قدسی کی تاثیر کا مقابلہ کسی نبی کی قوتِ قدسی نہیں کر سکتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسی حالت میں منقطع ہوئے کہ وہ حواری جو بڑی محنت سے تیار کئے تھے جن کو رات دن ان کی صحبت میں رہنے کا موقعہ ملتا تھا وہ بھی پورے طور پر مخلص اور وفادار ثابت نہ ہوئے اور خود حضرت مسیحؑ کو اُن کے ایمان اور اخلاص پر شک ہی رہا

---

۵ الحکم جلد ۸ نمبر ۵ صفحہ ۱ تا ۳ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۴ء، نیز البدر جلد ۳ نمبر ۸ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء

یہاں تک کہ وہ آخری وقت جو مصیبت اور مشکلات کا وقت تھا وہ حواری ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک نے گرفتار کروایا اور دوسرے نے سامنے کھڑے ہو کر تین مرتبہ لعنت کی۔ اس سے بڑھ کر ناکامی اور کیا ہوگی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی بھی راستہ ہی میں فوت ہو گئے اور وہ ارضِ مقدس کی کامیابی نہ دیکھ سکے اور ان کے بعد ان کا خلیفہ اور جانشین اس کا فاتح ہوا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی قابلِ فخر کامیابی کا نمونہ ہے اور وہ کامیابی ایسی عظیم الشان ہے جس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ آپ جس بات کو چاہتے تھے جب تک اس کو پورا نہ کر لیا آپ رخصت نہیں ہوئے۔ آپ کی روحانیت کا تعلق سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے تھا اور آپ اللہ تعالیٰ کی توحید کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کون اس سے ناواقف ہے کہ اس سرزمین میں جو بتوں سے بھری ہوئی تھی ہمیشہ کے لیے بت پرستی دُور ہو کر ایک خدا کی پرستش قائم ہو گئی۔ آپ کی نبوت کے سارے ہی پہلو اس قدر روشن ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔

آپ ایک خطرناک تاریکی کے وقت دنیا میں آئے۔ اور اس وقت گئے جب اس تاریکی سے دُنیا کو روشن کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی قدسی قوت کے کمالات کا یہ بھی ایک اثر اور نمونہ ہے کہ وہ کمالات ہر زمانہ میں اور ہر وقت تازہ بتازہ نظر آتے ہیں اور کبھی وہ قصہ یا کہانی کا رنگ اختیار نہیں کر سکتے۔

اسلام کی برکات اور خوارق ہر زمانہ میں جاری ہیں

اگرچہ مجھے افسوس ہے کہ بدقسمتی سے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ خوارق اور اعجاز اب نہیں ہیں پیچھے ہی رہ گئے ہیں مگر یہ اُن کی بدقسمتی اور محرومی ہے۔ وہ خود چونکہ ان کمالات و برکات سے جو حقیقی اسلام ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اور کامل اطاعت سے حاصل ہوتی ہیں محروم ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تاثیریں اور برکات پہلے ہوا کرتی تھیں اب نہیں۔ ایسے بیہودہ اعتقاد سے یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان پر حملہ کرتے ہیں اور اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس وقت جبکہ مسلمانوں میں یہ زہر پھیل گئی تھی اور خود مسلمانوں کے گھروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کرنے والے پیدا ہو گئے تھے مجھے بھیجا ہے تاکہ مَیں دکھاؤں کہ اسلام کے برکات اور خوارق ہر زمانہ میں تازہ بہ تازہ نظر آتے ہیں۔

اور لاکھوں انسان گواہ ہیں کہ انہوں نے ان برکات کو مشاہدہ کیا ہے اور صدہا ایسے ہیں جنہوں نے خود ان برکات اور فیوض سے حصہ پایا ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایسا بیّن اور روشن ثبوت ہے کہ اس معیار پر آج کسی نبی کا متبع وہ علامات اور آثار نہیں دکھا سکتا جو مَیں دکھا سکتا ہوں۔

☆ ☆ ☆

آنحضرتؐ کے صحابہؓ کا مقام

جس طرح پر یہ قاعدہ ہے کہ وہی طبیب حاذق اور دانا سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ مریض اچھے کرے اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے وہی افضل ہوگا جو رُوحانی انقلاب سب سے بڑھ کر کرنے والا ہو اور جس کی تاثیرات کا سلسلہ ابدی ہو۔

اب اس محک پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی اور مسیحؑ کی کامیابی کو دیکھو۔ ایک موقعہ مسیح پر مشکلات کا آتا ہے وہ قوم اور جماعت جو اُس نے تیار کی تھی وہ اپنا کیا نمونہ دکھاتی ہے۔ انجیل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بارہ خاص شاگرد جو حواری کہلاتے تھے اس کو چھوڑ بیٹھے اور جو اُن میں بھی خاص تھے ایک تیس روپے کے لالچ سے اس کو گرفتار کرانے والا ٹھہرا۔ اور دوسرا جس کو بہشت کی کنجیاں دی گئی تھیں وہ سامنے لعنت بھیجتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر نکلتے ہیں مگر وہ اس قوم کو کجرو کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بات بات پر اعتراض کرنے والے اور انکار کرنے والی قوم تھی یہاں تک کہ کہدیا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ (المائدۃ : ۲۵) مگر اس کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو دیکھو کہ انہوں نے بکریوں کی طرح اپنا خون بہادیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ایسے گم ہوگئے کہ وہ اس کے لیے ہر ایک تکلیف اور مصیبت اُٹھانے کو ہر وقت تیار تھے۔ انہوں نے یہانتک ترقی کی کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ (البینۃ : ۹) کا سرٹیفکیٹ ان کو دیا گیا۔

پس صحابہ کرامؓ کی وہ پاک جماعت تھی جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی الگ نہیں ہوئے اور وہ آپ کی راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے بلکہ دریغ نہیں کیا ان کی نسبت آیا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب : ۲۴) یعنی بعض اپنا حق ادا کرچکے اور بعض منتظر ہیں کہ ہم بھی اس راہ میں مارے جاویں۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و عظمت معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے روشن ثبوت ہیں۔ اب کوئی شخص ان ثبوتوں کو ضائع کرتا ہے۔ تو وہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ضائع کرنا چاہتا ہے پس وہی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی قدر کرسکتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی قدر کرتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی قدر نہیں کرتا۔ وہ ہرگز ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہیں کرتا وہ اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ اگر کہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں کیونکہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو اور پھر صحابہؓ سے دشمنی۔

جو لوگ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بُرا سمجھتے ہیں اور ان سے دشمنی کرتے ہیں وہ فی الحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کرتے ہیں کیونکہ وہ آپ کی نبوت کے روشن دلائل کو توڑتے ہیں۔ جب ایک ٹانگ ٹوٹ جاوے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے سارے زمانہ رسالت میں دو چار آدمی بھی معاذ اللہ ایسے تیار نہیں

کر سکے جو اعلیٰ درجہ کے باخدا انسان ہوں اور جنہوں نے اعلیٰ درجہ کی رُوحانی تبدیلی کرلی ہو تو پھر آپ کی قوتِ قدسی کا کیا ثبوت رہ جاوے گا۔ پھر اگر دوسرے لوگوں کے اعتراضوں کو دیکھا جاوے جو وہ ان پر کرتے ہیں تو پھر معاذ اللہ ایک بھی راستباز آپ کی تعلیم سے ثابت نہیں ہوتا۔ بیاضیہ (خوارج) حضرت علیؓ کو معاذ اللہ مُرتد کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ابوجہل کی لڑکی سے نکاح کرلیا حالانکہ ان کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع بھی فرمایا تھا۔ اس اعتراض کا جواب شیعہ کیا دے سکتے ہیں۔ اسی طرح پر بیاضیہ کے اعتراض ایسے ہیں کہ اُن کو سُنکر بدن پر لرزہ پڑتا ہے۔

ادھر شیعہ ہیں کہ وہ شیخین کی ذات پاک پر شوخی کے ساتھ اعتراضات جمع کرتے ہیں لیکن اگر یہ دونو فریق خدا ترسی اور رُوحانیت سے کام لیتے تو ایسا نہ کرتے۔ وہ دیکھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جسم کی طرح ہیں اور صحابہ کرامؓ آپ کے اعضاء ہیں۔ جب اعضاء کاٹ دیئے جاویں تو پھر باقی کیا رہ گیا۔ جسم ناقص رہ جاتا ہے اور خوبصورتی بھی باقی نہیں رہتی۔

ان باتوں کو سُن سُن کر بدن پر لرزہ پڑتا ہے اور مسلمانوں کی حالت پر افسوس آتا ہے کہ وہ اپنی اس قسم کی کارروائیوں سے بھی دشمنوں کو اسلام پر اعتراض کرنے کا موقعہ دیتے ہیں اور اُن کی زبانیں کُھلتی ہیں بلکہ وہ اپنے ہاتھ سے اسلام کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی اندرونی کمزوریوں اور خرابیوں نے یہ ضرورت پیدا کی کہ خدا تعالیٰ اپنے دین کی تائید اور نصرت کے لیے ایک سلسلہ قائم کر دیتا جو اِن غلط فہمیوں کو دلوں سے دُور کر دیتا۔ یہی غرض ہے میرے آنے کی۔ جو سعید الفطرت ہیں وہ اس حقیقت کو سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ بات بڑی ہی قابلِ غور ہے کہ یہ لوگ جو مسلمان کہلا کر صحابہ کی ذات پر حملہ کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر حملہ کرتے ہیں اور قرآن شریف کی عزت پر حملہ کرتے ہیں غیر قوموں خصوصاً عیسائیوں کے بالمقابل ہمارا یہی زبردست دعویٰ ہے کہ آپ کی پاک تعلیم اور صحبت نے ایسی اعلیٰ درجہ کی رُوحانیت پیدا کی اور بالمقابل مسیح کے بارہ۱۲ حواری بھی درست نہ رہ سکے، لیکن جب یہ عقیدہ ہو کہ بجز ایک یا دو کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صحبت میں کسی کی بھی اصلاح نہیں ہوئی تو پھر ہم کو مُنہ دکھانے کی بھی جگہ نہیں رہتی۔ اس صورت میں ہم اُن کے سامنے کیا پیش کر سکتے ہیں؟ قرآن شریف کی اس سے کیا عزت رہی۔ ایک طرف تو ہم یہ مانتے اور پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم خاتم الکتب ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء۔ اور نبوت ختم ہو چکی۔ دوسری طرف اس کی تاثیرات کو یہانتک ظاہر کرتے ہیں کہ ایک آدمی کے سوا کوئی درست نہ ہو سکا اور جب اس پر ان اعتراضوں کو جمع کیا جاوے جو مخالف کرتے ہیں تو پھر نتیجہ نکلتا

ہے کہ ایک بھی درست نہیں ہوا بلکہ سارے مُرتد ہو گئے۔

اس عقیدہ کی شناعت کو خوب غور سے سوچو کہ اس کا اثر اسلام پر کیا پڑتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تو یہ یوں مخالف ہوئے اور قرآنِ شریف کے برخلاف اس طرح پر ہیں کہ کہتے ہیں کہ اصل قرآن شریف نہیں رہا۔ جو اَب موجود ہے وہ محرّف مبدّل ہو گیا ہے اور اصل قرآن مہدی کسی غار میں لے کر چھپا ہوا ہے اب تک نہیں نکلتا۔ دُنیا گمراہ ہو رہی ہے اور اسلام پر حملے ہو رہے ہیں۔ مخالف ہنسی کرتے ہیں اور خطرناک توہین کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں بقول اُن کے قرآن شریف بھی نہیں ہے اور مہدی ہے کہ وہ غار سے ہی نہیں نکلتا۔ کوئی سمجھدار آدمی خدا تعالیٰ سے ڈر کر ہمیں بتائے کہ کیا یہ بھی دین ہو سکتا ہے اور اس سے کوئی آدمی رُوحانی ترقی کر سکتا ہے۔ یہ محض افسانے اور خیالی باتیں ہیں۔ حقیقت اور سچ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کی رُوحانی قوت اور تاثیر کے ساتھ بھیجا تھا جس کا اثر ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو خدمت اسلام کی کی ہے اور جس طرح پر انہوں نے اپنے خون سے اس باغ کی آبپاشی کی ہے اس کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملے گی اُن کی خدمات اسلام کے لیے نہایت ہی قابلِ قدر اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اور جب خدا تعالیٰ کے دین میں سُستی واقع ہونے لگتی ہے اور کم فہم یا مُرورِ زمانہ کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو کر یہ پاک دین بگڑنے لگتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ ایک شخص کو مامور کر کے بھیجتا ہے جو اُس کے بُلانے بولتا ہے اور رُوح القدس کی تائید اُس کے ساتھ ہوتی ہے وہ ان غلط فہمیوں اور خرابیوں کو دُور کرتا ہے جو علمی طور پر دین میں پیدا ہو جاتی ہیں اور اپنے عملی نمونہ اور قدسی قوت کے ساتھ ایک نیا ایمان دُنیا کو خدا تعالیٰ کی ہستی پر بخشتا ہے[1]

لیکن جب انسان خدا تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اور شعائر اللہ کی پروا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس سے بے پروا ہو جاتا ہے اور اُس شخص اور ایسی قوم کو تباہ کر دیتا ہے چنانچہ چغتائی سلطنت نے جب دین سے غافل ہو کر بہائم کی سی سیرت اختیار کر لی تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ سلطنت جو صدیوں سے چلی آتی تھی اس کا کچھ بھی باقی نہ رہا اور ایک شاعر پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

پس انسان کو ہر وقت خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے۔ کھلی اور چھپی ہوئی بدکاریاں آخر انسان پر وہ گھڑی لے آتی ہیں جس کا اُسے آسایش کے ایام میں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف ہر وقت دل پر رہے اور اس کی عظمت و جبروت سے ڈرتا رہے اور اعمالِ صالحہ کی کوشش کرتا رہے اور پھر دُعا کے ساتھ اس کی توفیق مانگے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۷ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء

اس قدر تقریر اعلیٰ حضرت نے فرمائی تھی کہ مشیر اعلیٰ صاحب نے بڑے تکلف سے ذیل کا سوال آپ سے پوچھا۔

سوال:۔ آپ کی طرف سے نبی یا رسول ہونے کے کلمات شائع ہوئے ہیں اور یہ بھی کہ میں عیسیٰؑ سے افضل ہوں اور اور بھی تحقیر کے کلمات بعض اوقات ہوتے ہیں جن پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

حضرت اقدس:۔ ہماری طرف سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ان باتوں کا خواہشمند نہیں تھا کہ کوئی میری تعریف کرے اور میں گوشہ نشینی کو ہمیشہ پسند کرتا رہا، لیکن میں کیا کروں۔ جب خدا تعالیٰ نے مجھے باہر نکالا۔ یہ کلمات میری طرف سے نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ جب مجھے ان کلمات سے مخاطب کرتا ہے اور میں بالمواجہ اس کا کلام سنتا ہوں پھر میں کہاں جاؤں؟ لوگوں کے اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کی پروا کروں یا اللہ تعالیٰ کے کلام پر ایمان لاؤں؟ میں دنیا اور اس کے اعتراضوں کی کوئی حقیقت اور اثر نہیں سمجھتا۔ لیکن خدا تعالیٰ کو چھوڑنا اور اس کے کلام سے سرگردانی کرنا اس کو بہت ہی بُرا سمجھتا ہوں اور میں اس کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اگر ساری دنیا میری مخالف ہو جائے اور ایک متنفس بھی میرے ساتھ نہ ہو بلکہ کُل کائنات میری دشمن ہو پھر بھی میں اللہ تعالیٰ کے اس کلام سے انکار نہیں کر سکتا۔ دنیا اور اس کی ساری شان و شوکت اس جلیل کلام اور خطاب کے سامنے ہیچ اور مردار ہیں۔ میں ان کی کبھی پروا نہیں کرتا۔ پس کوئی اعتراض کرے یا کچھ کہے میں خدا تعالیٰ کے کلام کو اور خدا کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔

اور یہ بالکل غلط ہے کہ میں انبیاء و رسل یا صلحاءِ اُمّت کی تحقیر کرتا ہوں۔ جیسے میں ابرار و اخیار کا درجہ سمجھ سکتا ہوں اور اُن کے مقام و قرب کا جتنا علم مجھے ہے کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم سب ایک ہی گروہ سے ہیں اور الجنس مع الجنس کے موافق دوسرے اس درجہ کے سمجھنے سے عاری ہیں۔

حضرت عیسٰیؑ اور امام حسینؓ کے اصل مقام اور درجہ کا جتنا مجھ کو علم ہے دوسرے کو نہیں ہے کیونکہ جوہری ہی جوہر کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اس طرح پر دوسرے لوگ خواہ امام حسینؓ کو سجدہ کریں مگر وہ اُن کے رُتبہ اور مقام سے محض ناواقف ہیں اور عیسائی خواہ حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا یا خدا جو چاہیں بنا دیں مگر وہ اُن کے اصل اتباع اور حقیقی مقام سے بے خبر ہیں اور ہم ہرگز تحقیر نہیں کرتے۔

مشیرِ اعلیٰ:۔ عیسائی خواہ خدا بناویں لیکن مسلمان تو نبی سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں ایک نبی کی تحقیر ہوتی ہے۔

حضرت اقدس:۔ ہم بھی حضرت عیسٰیؑ کو خدا تعالیٰ کا سچا نبی یقین کرتے ہیں اور سچے نبی کی تحقیر کرنے والے کو کافر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پر حضرت امام حسینؓ کی بھی جائز عزت کرتے ہیں۔ لیکن جب عیسائیوں سے مباحثہ کیا جاوے وہ راضی نہیں ہوتے۔ جب تک حضرت عیسٰیؑ کو اللہ یا ابن اللہ نہ کہا جاوے۔ اس لیے جو کچھ ان

کی کتاب پیش کرتی ہے۔ وہ دکھانا پڑتا ہے تاکہ ایک کفرِ عظیم کو شکست ہو۔

مشیرِ اعلیٰ:۔ ان کے مقابلہ میں اگر ان کی تردید کی جاوے۔ یہ تو اچھی بات ہے مگر ایک اصول صحیح کو تو ان کی خاطر نہ چھوڑنا چاہیئے۔

حضرت اقدس:۔ اصولِ صحیح وہ ہو سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ قائم کرے۔ ہم ان اصولوں پر چلتے ہیں جن پر ہم کو اللہ تعالیٰ چلاتا ہے۔ اگر کوئی اس وقت ان باتوں کو استہزاء کی نظر سے دیکھتا ہے اور یقین نہیں لاتا تو مرنے کے بعد اس کی حقیقت کھل جائیگی اور خود دیکھ لیگا کہ حق پر کون ہے۔

میرے اس دعویٰ پر کہ میں امام حسینؓ سے افضل ہوں شور مچایا جاتا ہے لیکن اگر پوچھا جاوے کہ آنیوالا مسیح حسینؓ سے افضل ہے یا نہیں؟ تو اس کا کیا جواب ہے۔

مشیرِ اعلیٰ:۔ پھر آپ کے نزدیک کیا ہے؟

حضرت اقدس:۔ خدا تعالیٰ نے تو مجھے یہی بتایا ہے کہ میں افضل ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ موسےٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ اسی طرح آنے والا محمدی مسیح موسوی مسیح سے افضل ہے۔ اس وقت آپ انکار کریں تو کریں لیکن مرنے کے بعد تو سب کچھ ظاہر ہو جائے گا اور پتہ لگ جائے گا کہ کون افضل اور حق پر ہے۔ میں اگر اپنی طرف سے شیخی جتلاتا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر کوئی جھوٹا نہیں لیکن اگر کوئی میرے صدق کے نشانات دیکھ کر بھی جھٹلاتا ہے تو پھر اس کا معاملہ خدا تعالیٰ سے ہے۔ وہ میری تکذیب نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالےٰ اور اس کی آیات کی تکذیب کرتا ہے۔

آپ جو کچھ کہتے ہیں بطور مقلد کے کہتے ہیں۔ ذاتی بصیرت آپ کو نہیں ہے لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں بطور محقق کے کہتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے بصیرت پا کر کہتا ہوں۔ میں خدا تعالیٰ کے مکالمات سُنتا ہوں۔ ہر روز اس کے مخاطبات ہوتے ہیں۔ پھر میں ایک نابینا مقلد کی پیروی کس طرح کروں۔ ہاں اگر کوئی امام حسینؓ کو مجھ سے افضل یقین کرتا ہے اور اس کا کوئی الگ خدا ہے تو پھر میں دیکھ لوں گا کہ وہ میرے مقابل اس افضلیت کے کون سے نشان اپنی ذات سے دکھا سکتا ہے۔ اگر کوئی نشان نہیں دکھا سکتا اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی نہیں دکھا سکتا تو پھر میرے لیے جو تحقیق کی راہ کھلی ہے اس کا انکار نامناسب ہے۔

یہ نری کہنے ہی کی باتیں نہیں ہیں۔ میری زندگی کا کون ذمہ وار ہو سکتا ہے جبکہ میں براہ راست خدا تعالےٰ سے سنتا ہوں۔ خواہ مجھے دوزخ میں ڈال دیا جائے یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے میں اس کی بالکل پروا نہیں کرتا۔ میں کبھی اس امرِ حق کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے ان نشانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہے جن نشانوں

کے ساتھ آدم۔ نوح۔ موسیٰ۔ ابراہیم علیہم السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچانا تھا۔ میں اب اس دامن کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس دروازہ کو چھوڑ کر اور کسی جگہ میں کیونکر جا سکتا ہوں۔

براہین احمدیہ جو بیس برس پہلے کی چھپی ہوئی کتاب موجود ہے وہ شیعوں کے پاس بھی ہے گورنمنٹ کے پاس بھی کاپی ہے اس کو کھول کر پڑھو کہ کس قدر نشان اس میں دیئے گئے تھے اور وہ اس وقت دیئے گئے تھے کہ جب کسی کے وہم و گمان میں بھی وہ باتیں نہ آسکتی تھیں کہ ایسا ہو جائے گا مثلاً اُس میں لکھا ہے کہ آج تو اکیلا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ فوج در فوج لوگ تیرے ساتھ ہوں گے۔ دنیا دار مقابلہ کریں گے مگر وہ اس مقابلہ میں ناکام رہیں گے اور مَیں تجھے کامیاب کروں گا۔ اب کوئی مخالف اس کا جواب دے کہ کیا اس طرح نہیں ہوا۔

جب براہین احمدیہ شائع ہوئی تو سارے ملک میں کوئی آدمی نہیں تھا جو مجھے جانتا ہو۔ قادیان سے باہر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اب دیکھو لو کہ کس قدر رجوع دنیا کا ہو رہا ہے اور اس ملک سے نکل کر امریکہ، آسٹریلیا اور یورپ تک اس سلسلہ کی شہرت ہو گئی ہے کیا لوگوں کو اس سلسلہ میں داخل ہونے سے روکنے کے واسطے کوششیں نہیں کی گئی ہیں۔ کفر کے فتوے دیئے گئے۔ قتل کے مقدمے بنائے گئے۔ جس طرح پر جس کسی کا بس چلا اس نے لوگوں کو باز رکھنا چاہا۔ لیکن جس قدر مخالفت کی گئی اسی قدر زور کے ساتھ اس سلسلہ کی اشاعت ہوئی اور آفاق میں اس کا نام پہنچ گیا۔ اسی کے موافق جو خدا تعالیٰ نے پہلے فرمایا تھا۔ اب ہمیں کوئی جواب دے کہ کیا یہ انسانی کلام ہو سکتا ہے کہ جو بیس برس پیشتر ایسی پیشگوئی کرے اور پھر وہ حرفاً حرفاً پوری ہو جاوے اور وہ پیشگوئی ایسی حالت میں کی جاوے کہ اس وقت کوئی آدمی جاننے والا بھی موجود نہ ہو۔ اگر یہ انسانی کلام ہے تو پھر ایسا دعویٰ کرنے والے کو چاہیئے کہ اس کی نظیر پیش کرے۔

پھر اسی براہین میں درج ہے۔ يَأْتُونَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ وَيَأْتِيْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ اگر اس نشان کو دیکھا جاوے تو اپنی جگہ یہ کوئی دس لاکھ نشان ہوگا۔ ہر آدمی نیا آنے والا مہمان اس نشان کو پورا کرتا ہے اور مختلف دیار و امصار سے خطوط آ رہے ہیں۔ تحائف آ رہے ہیں جس کے واسطے ڈاکخانہ اور محکمہ ریل کی کتابیں بھی گواہ ہیں۔ پھر کیا یہ معمولی نظر سے دیکھی جانے کے قابل باتیں ہیں۔ ایسے ایسے صدہا نہیں ہزاروں نشان ہیں۔ اب نشانوں کے ہوتے ہوئے مَیں خدا تعالیٰ کا انکار کروں اور اس کی باتوں کو چھوڑ دوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا خواہ میری جان بھی چلی جاوے۔

پھر ان نشانات کو الگ رکھو مَیں تو اپنے اللہ تعالیٰ پر ایسا یقین رکھتا ہوں اور اس کا وعدہ ہے کہ اگر کوئی چالیس دن میرے پاس رہے تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی نشان دیکھ لے گا۔ ہماری جماعت اس بات کی گواہ ہے اور ان میں شاید ایک بھی ایسا آدمی نہ نکلے جس نے کوئی نہ کوئی نشان نہ دیکھا ہو پھر آپ ہی بتائیں کہ خدا کی

راہ کو چھوڑ کر میں کس کی بات سُن سکوں۔ اس کے مقابل میں جلتی ہوئی آگ میں کُود پڑنا میرے لیے آسان ہے مگر اس کو چھوڑنا مشکل۔

دیکھو وہ لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان کی رُوحیں ان برکات کو محسوس کرتی ہیں جو اس سلسلہ میں داخل ہونے سے اُن کو ملی ہیں مگر وہ لوگ جو امام حسینؓ کی پُوجا کرتے ہیں۔ اور اُن کے چال چلن کو اختیار نہیں کرتے اور اُن کا اتباع نہیں کرتے وہ یاد رکھیں کہ قیامت کو امام حسینؓ سے الگ بٹھائے جائیں گے۔ اور اُن سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

نواب صاحب:۔ (شیعہ ہیں) ہم تو حضرت امام حسینؓ کو سجدہ نہیں کرتے البتہ نواسہ رسول سمجھ کر مانتے ہیں۔

حضرت اقدس:۔ حضرت امام حسینؓ کے نواسہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یا شہید ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے اور اسی حد تک ان کو ماننا کسی خرابی کا باعث نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی شان میں بہت بڑا غلو کیا گیا ہے۔ میرے ایک اُستاد بھی شیعہ تھے جو آپ کے ہاں بھی جایا کرتے تھے۔ مجھے بہت سا موقعہ ملا ہے کہ میں اس غلوّ کا اندازہ کروں جو وہ امام حسینؓ کی نسبت کرتے ہیں۔ وہ اتنا ہی ہرگز نہیں مانتے کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے یا شہید ہوئے بلکہ وہ حاجت روا اور مشکل کُشا مانتے ہیں۔ لیکن آپ یاد رکھیں کہ جب تک وہ طریق اختیار نہ کیا جاوے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا اور جس پر حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ نے قدم مارا تھا۔ کچھ بھی نہیں مِل سکتا۔ یہ تعزیئے بنانا اور نوحہ خوانی کرنا کوئی نجات کا ذریعہ اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق قائم کرنے کا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ خواہ کوئی ساری عمر ٹکریں مارتا رہے۔ سچی پیروی الگ چیز ہے اور محض مبالغہ ایک الگ امر ہے۔ جب تک انسان انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کے رنگ میں رنگین نہیں ہو جاتا اُن کے ساتھ محبت اور ارادت کا دعویٰ محض ایک خیالی امر ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ے از عمل ثابت کن آں نورے کہ در ایمان تست
دِل چو دادی یوسفے را راہ کنعاں را گزیں

انبیاء و رسل علیہم السلام کے آنے کی غرض

انبیاء علیہم السلام کے آنے کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ اُن کے نمونہ کو اختیار کریں اور اسی رنگ میں رنگین ہو کر اُن کے ساتھ سچی محبت کا اقتضا یہی ہوتا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلیں اور اگر یہ بات نہیں تو سارے دعوے ہیچ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی ایسی ہی مثال ہے جیسے گورنمنٹ مختلف قسم کی صنعتیں وغیرہ یہاں بھیجتی ہے اور لوگوں کو دکھاتی ہے۔ اس سے اس کی یہ غرض تو نہیں ہوتی کہ لوگ ان صنعتوں کو لے کر اُن کی پُوجا کریں بلکہ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ یہاں کے لوگ بھی ان نمونوں کو دیکھ کر اُن

کی تقلید کریں اور ایسے نمونے خود تیار کریں۔ جو تیار کرتے ہیں وہ فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن جو توجہ نہیں کرتے اُنکو کوئی فائدہ ان نمونوں سے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی جو لوگ سچی اطاعت کرتے ہیں اور اُنکے قول و فعل کو اپنے لیے ایک نمونہ قرار دے کر اسی کے موافق اپنا چال چلن اور عملدرآمد کر لیتے ہیں۔ خدا تعالےٰ ان کی مدد کرتا ہے اور ان پر بھی اسی رنگ کے برکات اور فیوض کا دروازہ کھولا جاتا ہے جس قسم کے برکات انبیاء علیہم السلام کو دیئے جاتے ہیں اور جو ان کی اتباع نہیں کرتے وہ نامراد رہتے ہیں۔ یہ نمونہ جب سے انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں برابر چلا آیا ہے۔ اور ہر زمانہ میں اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا بجز اس آدمی کے جس کو خدا پر بھی ایمان اور یقین نہ ہو۔

آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو خدا تعالیٰ کے ماموروں اور راستبازوں کی سچی اتباع کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس طبقہ اور قسم کے لوگ تو بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ دوسری قسم انسانوں کی وہ ہے جو دُنیا کی خواہشوں پر گرے ہوئے ہوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ سے بکلّی دور اور مہجور ہوتے ہیں۔ ان کی ساری اغراض و مقاصد کا منتہیٰ اور انجام دنیا پر ختم ہو جاتا ہے وہ کبھی خیال بھی نہیں کرتے کہ ان کو اس فانی دنیا سے ایک دن قطع تعلق کرنا ہوگا اور مر کر یہ سب کچھ یہاں چھوڑ جانا ہے اور پھر خدا تعالیٰ سے معاملہ ہوگا۔ وہ دنیا اور اس کے دھندوں میں کچھ ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ یہ بہت ہی بدقسمت گروہ ہوتا ہے اور اکثر حصہ اسی میں مبتلا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء و رسل اور اَئمہ کے آنے سے کیا غرض ہوتی ہے وہ دنیا میں اس لیے نہیں آتے کہ ان کو اپنی پوجا کرانی ہوتی ہے۔ وہ تو ایک خدا کی عبادت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی مطلب کے لیے آتے ہیں اور اس واسطے کہ لوگ ان کے کامل نمونہ پر عمل کریں اور اُن جیسے بننے کی کوشش کریں اور ایسی اتباع کریں کہ گویا وہی ہو جائیں مگر افسوس ہے کہ بعض لوگ اُن کے آنے کے اصل مقصد کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ اس سے وہ اَئمہ اور رسل خوش نہیں ہو سکتے کہ لوگ ان کی اسقدر عزت کرتے ہیں کبھی نہیں۔ وہ اس کو کوئی خوشی کا باعث قرار نہیں دیتے۔ ان کی اصل خوشی اسی میں ہوتی ہے کہ لوگ ان کی اتباع کریں اور جو تعلیم وہ پیش کرتے ہیں کہ سچے خدا کی عبادت کرو اور توحید پر قائم ہو جاؤ اس پر قائم ہوں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ہوا۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (اٰل عمران: ۳۲) یعنی اے رسول۔ انکو کہدو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے پیار کرتے ہو تو میری

ل؎ الحکم جلد ۸ نمبر ۸ صفحہ ۱ تا ۳ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۴ء

اتباع کرو۔ اس اتباع کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے پیار کرے گا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کا طریق یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع کی جاوے۔ پس اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام اور ایسا ہی اَور جو خدا تعالیٰ کے راستباز اور صادق بندے ہوتے ہیں وہ دنیا میں ایک نمونہ ہوکر آتے ہیں جو شخص اس نمونہ کے موافق چلنے کی کوشش نہیں کرتا لیکن ان کو سجدہ کرنے اور حاجت روا ماننے کو تیار ہو جاتا ہے وہ کبھی خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قدر نہیں ہے بلکہ وہ دیکھ لے گا کہ مرنے کے بعد وہ امام اس سے بیزار ہوگا۔ ایسا ہی جو لوگ حضرت علیؓ یا حضرت امام حسینؓ کے درجہ کو بہت بڑھاتے ہیں گویا ان کی پرستش کرتے ہیں وہ امام حسین کے متبعین میں نہیں ہیں اور اس سے امام حسینؓ خوش نہیں ہو سکتے۔ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ پیروی کے لیے نمونہ ہوکر آتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ بدوں پیروی کچھ بھی نہیں۔

مَیں ایک دم میں کیا سناؤں جو خیالات سالہا سال کے دل میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں وہ دفعۃً دُور نہیں ہو سکتے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے تو وہ قادر ہے کہ فی الفور تبدیلی کر دے۔ خدا تعالیٰ کی توفیق سے پرانے غلط خیالات کو چھوڑنا بہت ہی سہل ہو جاتا ہے۔

دلائلِ صداقت

مَیں سچ کہتا ہوں کہ میرا دعویٰ جھوٹا نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اور اس کی تائید میرے ساتھ ہے۔ اگر مَیں اس کی طرف سے مامور نہ ہوا ہوتا تو وہ مجھے ہلاک کر دیتا اور میری ہلاکت ہی میرے کذب کی دلیل ٹھہر جاتی لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ میری تھوڑی مخالفت نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے ہر مذہب والے نے میری مخالفت میں حصّہ لیا اور بہت بڑا حصّہ لیا۔ ہر قسم کی مشکلات اور روکیں میری راہ میں ڈالی جاتی ہیں اور ڈالی گئی ہیں لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے ان مشکلات سے صاف نکالا ہے اور ان روکوں کو دُور کر کے وہ ایک جہان کو میری طرف لا رہا ہے اسی وعدہ کے موافق جو براہین احمدیہ میں کیا گیا تھا۔ اس پر بھی مَیں کہتا ہوں کہ آپ دیکھیں کہ اگر ان مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی مَیں کامیاب ہوگیا تو میری سچائی میں کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ مشکلات اور روکیں صرف میری ہی راہ میں نہیں ڈالی گئیں بلکہ شروع سے سنت اللہ اسی طرح پر ہے کہ جب کوئی راستباز اور خدا تعالیٰ کا مامور و مُرسل دُنیا میں آتا ہے تو اُس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اس کی ہنسی کی جاتی ہے اُسے قسم قسم کے دُکھ دیئے جاتے ہیں مگر آخر وہ غالب آتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمام روکوں کو خود اُٹھا دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے مشکلات پیش آئے ابن جریر نے ایک نہایت ہی دردناک واقعہ لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا

دعویٰ کیا تو ابوجہل اور چند اَور لوگ بھڑکے اور مخالفت کے واسطے اُٹھے۔ انہوں نے یہ تجویز کی کہ ابوطالب کے پاس جاکر شکایت کریں۔ چنانچہ ابوطالب کے پاس یہ لوگ گئے کہ تیرا بھتیجا ہمارے بتوں اور معبودوں کو بُرا کہتا ہے اس کو روکنا چاہیئے چونکہ ایک بڑی جماعت یہ شکایت لے کر گئی تھی اس لیے ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا تاکہ ان کے سامنے آپ سے دریافت کریں۔ جہاں یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ ایک چھوٹا دالان تھا اور ابوطالب کے پاس صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ باقی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ چچا کے پاس بیٹھ جائیں مگر ابوجہل نے یہ دیکھ کر کہ آپ یہاں آکر بیٹھیں گے شرارت کی اور اپنی جگہ سے کُود کر وہاں جا بیٹھا تاکہ جگہ نہ رہے اور سب نے مل کر ایسی شرارت کی کہ آپ کے بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ رکھی۔ آخر آپ دروازہ ہی میں بیٹھ گئے۔

اس دردناک واقعہ سے اُن کی کیسی شرارت اور کم ظرفی ثابت ہوتی ہے غرض جب آپ بیٹھ گئے تو ابوطالب نے کہا کہ اے میرے بھتیجے تو جانتا ہے کہ میں نے تجھ کو کس واسطے بلایا ہے۔ یہ مکّہ کے رئیس کہتے ہیں کہ تُو اُن کے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے چچا میں تو ان کو ایک بات کہتا ہوں کہ اگر تم یہ ایک بات مان لو تو عرب اور عجم سب تمہارا ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کونسی ایک بات ہے؟ تب آپ نے فرمایا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ جب انہوں نے یہ کلمہ سُنا تو سب کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور بھڑک اُٹھے اور مکان سے نکل گئے اور پھر آپ کی راہ میں بڑی روکیں اور مشکلات ڈالی گئیں۔

تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کے راستبازوں اور ماموروں کے مقابلہ میں ہر قسم کی کوششیں ان کو کمزور کرنے کے لیے کی جاتی ہیں لیکن خدا اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ساری کوششیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ایسے موقعہ پر بعض شریف الطبع اور سعید لوگ بھی ہوتے ہیں جو کہہ دیتے ہیں۔ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ (المومن: ۲۹)

صادق کا صدق خود اس کے لیے زبردست ثبوت اور دلیل ہوتا ہے۔ اور کاذب کا کذب ہی اس کو ہلاک کر دیتا ہے پس ان لوگوں کو میری مخالفت سے پہلے کم از کم اتنا ہی سوچ لینا چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں یہ ایک راہ راستباز کی شناخت کی رکھی ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔

اس کے سوا اللہ تعالیٰ نے مجھے وعدہ دیا ہے وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۵۶) کہ میں تیری جماعت اور تیرے گروہ کو منکروں پر قیامت تک غالب

رکھوں گا اور اُن میں ترقی اور عروج دوں گا۔
مَیں اس بات کا کیونکر انکار کرسکتا ہوں۔ مَیں بخوبی جانتا ہوں کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ ملوک، ملکدار تاجر اور ہر قسم کے معزز لوگ یہی ہوں گے۔ لوگوں کے نزدیک یہ انہونی بات ہے مگر مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہی ہوگا وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے بلکہ مجھے وہ بادشاہ دکھائے بھی گئے ہیں جو گھوڑوں پر سوار تھے۔
یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ جو اس سلسلہ میں داخل ہوتا ہے اب اس وقت کوئی اس کو باور نہیں کرسکتا۔ لیکن مَیں جانتا ہوں کہ ایسا ہوگا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ دین و دنیا ان میں ہی آجائیں گے اس وقت کسی کو خیال ہوسکتا تھا کیونکہ اتنے آدمی صرف آپ کے ساتھ تھے جو ایک چھوٹے حجرہ میں آجاتے تھے اور لوگ ایسی باتوں کو سُنکر اور گھر جاکر استہزاء کرتے تھے کہ گھر سے نکلنے کا موقعہ نہیں ملتا اور یہ دعوے ہیں۔ آخر سب کو معلوم ہوگیا کہ جو فرمایا تھا وہ سچ تھا۔
مامور اپنی ابتدائی حالت میں ہلال کی طرح ہوتا ہے۔ ہر ایک شخص اس کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جو تیز نظر ہوتے ہیں وہ دیکھ لیتے ہیں اسی طرح پر سعید الفطرت مومن مامور کو اس کی ابتدائی حالت میں جبکہ وہ ابھی مخفی رہتا ہے شناخت کرلیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ماننے والوں کا نام سابقین رکھا ہے لیکن جب بہت سے مسلمان فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے تو ان کا نام صرف ناس رکھا گیا جیسے فرمایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر: ۲،۳)
حقیقت یہی ہے کہ جب حق کُھل جاتا ہے پھر انکار کی گنجائش نہیں رہتی جیسے جب دن چڑھا ہو تو پھر بجز شپّر کے کون انکار کرے گا۔
اصل بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن پر حق کُھل جاتا ہے مگر دُنیا کے تعلقات اور مجبوریوں کو اپنا معبود بنالیتے ہیں اور اس حق سے محروم رہتے ہیں پس ہمیشہ خدا تعالیٰ سے دُعا مانگنی چاہیئے کہ وہ ان ظلموں سے بچاتا رہے اور قبولِ حق کے لیے کوئی روک اس کے واسطے نہ ہو۔
نواب صاحب:۔ آپ میرے لیے ایمان کی دُعا کریں۔ دنیا سے تو آخر ایک دن مَر ہی جانا ہے۔
حضرت اقدس:۔ اچھا مَیں تو دُعا کروں گا مگر آپ کو بھی ان آداب اور شرائط کا لحاظ رکھنا چاہیئے جو دُعا کے واسطے ضروری ہیں۔ میرے دُعا کرنے سے کیا ہوگا جب آپ توجہ نہ کریں۔ بیمار کو چاہیئے کہ طبیب کی ہدایتوں اور پرہیز پر بھی تو عمل کرے۔ پس دُعا کرانے کے واسطے ضروری ہے کہ آدمی خود اپنی اصلاح بھی کرے۔
مشیر اعلیٰ:۔ کیا جناب کو یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ آپ کی عمر کتنی ہوگی۔
حضرت اقدس:۔ ہاں عمر کے متعلق مجھے الہاماً یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اسّی کے قریب ہوگی۔ اور حال میں ایک رؤیا کے ذریعہ

یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۵ سال اَور بڑھانے کے واسطے دُعا کی ہے۔
(اس پر حضرت اقدس نے رؤیا سنایا جو الحکم میں درج ہو چکا ہے۔ ایڈیٹر)
مشیر اعلیٰ:- جناب کی عمر کیا ہو گی؟
حضرت اقدس:- ۶۵ یا ۶۶ سال۔
جب ایک عقیدہ پُرانا ہو جاتا ہے اور دیر سے انسان اس پر رہتا ہے تو پھر اسے اس کے چھوڑنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ وہ اس کے خلاف نہیں سُن سکتا بلکہ خلاف سُننے پر وہ خون تک کرنے کو تیار ہو جاتا ہے کیونکہ پُرانی عادت طبیعت کے رنگ میں ہو جاتی ہے۔ اس لیے مَیں جو کچھ کہتا ہوں اس کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک جمے ہوئے خیال کو یہ لوگ چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔
مشیر اعلیٰ:- اصل میں یہ کام جو آپ کر رہے ہیں، ہے بھی عظیم الشان۔
حضرت اقدس:- یہ میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو خلافتِ الٰہی ہے۔ جو میری مخالفت کرتا ہے وہ میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی اور عملی حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے۔ کہ اس فسق و فجور کی آگ سے ایک جماعت کو بچائے اور مخلص اور متقی گروہ میں شامل کرے۔
یہ انقلابِ عظیم الشان جو مسلمانوں کی اس حالت میں ہونے والا ہے اگر یہ انقلاب ہوا تو سمجھ لو کہ یہ سلسلہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے ورنہ جھوٹا ٹھہرے گا کیونکہ خدا تعالیٰ نے ایسا ہی ارادہ کیا ہے اور خدا تعالیٰ کے کام کو کوئی روک نہیں سکتا۔
مسیح موعود جو نام رکھا ہے اور کسیر الصلیب اس کا کام مقرر فرمایا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ عیسائیت کا زمانہ ہو گا اور عیسائیت نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہو گا۔ چنانچہ اب دیکھ لو کہ تیس لاکھ کے قریب آدمی مُرتد ہو چکے ہیں۔ اور پھر ان مرتدین میں شیخ، سید، مغل، پٹھان ہر قوم ہر طبقہ کے لوگ ہیں۔ عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی ہیں اور بچے بھی ہیں۔ کوئی شہر نہیں جہاں ان کی چھاؤنی نہ ہو اور انہوں نے اپنا سکہ نہ جمایا ہو۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے کہ حقیقی خدا کو چھوڑ کر ایک بناوٹی اور مصنوعی خدا بنایا جاوے اور اس کی پرستش ہو۔ پھر یہی نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کے سچے نبی اور افضل الرسل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی گئیں آپ کی شانِ پاک میں ہر قسم کی گستاخیاں اور ہرزہ گوئیاں روا رکھی گئیں جن کو سُن کر بدن پر لرزہ پڑ جاتا ہے اور کوئی نیک انسان اُن کو سُن ہی نہیں سکتا۔ جب ہم ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو خدا تعالیٰ کی غیرت

کب روا رکھ سکتی ہے کہ یہ گالیاں اسی طرح پڑ دی جائیں اور اسلام کی دستگیری اور نصرت نہ ہو حالانکہ اس نے آپ وعدہ فرمایا تھا۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر: ۱۰) یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ زمانہ کی یہ حالت ہو اور اللہ تعالیٰ باوجود اس وعدہ کے پھر خاموش رہے۔

بے باک اور شوخ عیسائی قرآن شریف کی یہانتک بے ادبی کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ استنجے کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قسم قسم کے افترا باندھتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں اور وہ لوگ اُن میں زیادہ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم لیا اور مسلمانوں کے گھروں میں پرورش پائی اور پھر مُرتد ہو کر اسلام کی پاک تعلیم پر ٹھٹھا کرنا اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ یہ حالت بیرونی طور پر اسلام کی ہو رہی ہے اور ہر طرف سے اس پر تیر اندازی ہو رہی ہے تو کیا یہ وقت خدا تعالیٰ کی غیرت کو جو وہ اپنے پاک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے رکھتا ہے جوش میں لانے والا نہ تھا۔ اس کی غیرت نے جوش مارا اور مجھے مامور کیا۔ اس وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ میں کیا تھا۔[۱]

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس قدر تقریر فرمائی تھی کہ عصر کی اذان ہو گئی اور نواب صاحب اور مشیر اعلیٰ صاحب خاموش ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ:-

اذان میں باتیں کرنا منع نہیں ہیں آپ اگر کچھ اَور بات پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھ لیں کیونکہ بعض باتیں انسان کے دل میں ہوتی ہیں اور وہ کسی وجہ سے ان کو نہیں پوچھتا اور پھر رفتہ رفتہ وہ بُرا نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ جو شکوک پیدا ہوں اُن کو فوراً باہر نکالنا چاہیے۔ یہ بُری غذا کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر نکالی نہ جائیں تو سوءِ ہضمی ہو جاتی ہے۔

جب یہ حضرت فرما چکے تو سلسلہ کلام حسب ذیل طریق پر شروع ہوا۔

مشیر اعلیٰ:- میرے نزدیک اہم امور یہی تھے جو ان الفاظ کے متعلق مَیں نے پوچھے ہیں۔

نواب صاحب:- حضرت کے اشتہار میں بھی یہی ہے اور زبانی بھی وہی ارشاد فرمایا ہے۔

حضرت اقدس۔ دراصل انسان کو بعض اوقات بڑے ہی مشکلات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ ان مشکلات میں پڑ کر ہدایت اور حقیقت کی راہ سے دُور جا پڑتا ہے۔ یہودیوں کو بھی اسی قسم کے مشکلات پیش آئے۔ اُنہوں نے تورات میں بھی پڑھا تھا کہ خاتم الانبیاء ان ہی میں

---

[۱] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۱ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء و البدر جلد ۳ نمبر ۱۶، ۱۷ صفحہ ۳ تا ۶ مورخہ ۲۴ اپریل و یکم مئی ۱۹۰۴ء

ہوگا۔ وہ ان ظاہر الفاظ پر جمے ہوئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو ان کو آپکے قبول کرنے میں بھی دقت اور مشکل پیش آئی کہ خاتم الانبیاء تو ہم میں ہی سے ہوگا مگر ان کو یہی جواب ملا کہ تم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ غلط سمجھا ہے۔ آنے والا خاتم الانبیاء بنی اسمٰعیل میں سے ہونے والا تھا اور وہ بھی تمہارے بھائی ہیں۔ تم اس سوال پر مت جھگڑو بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نبوت کے ثبوت دیکھو اس میں ہیں یا نہیں جبکہ انبیاء علیہم السلام کے خواص اور نشانات اس کے ساتھ ہیں تو پھر تمہیں ماننے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے۔

اسی طرح پر انہوں نے ملاکی نبی کی کتاب میں پڑھا ہوا تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کے آنے سے پہلے ایلیاء آسمان سے اُترے گا لیکن جب حضرت مسیحؑ نے اپنا دعویٰ پیش کیا تو اس وقت یہود اسی ابتلا میں پھنسے۔ انہوں نے مسیحؑ سے یہی سوال پیش کیا کہ ایلیاء کا آسمان سے آنا ضروری ہے۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سچ مچ ہی ایلیاء آئے گا اور ایک طرح پر وہ یہ معنے سمجھنے میں حق پر تھے کیونکہ اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ اور نظیر اُن میں موجود نہ تھی۔ لیکن حضرت مسیحؑ نے یہی کہا کہ آنے والا ایلیاء یوحنا بن زکریا کے رنگ میں آگیا ہے۔ وہ اس بات کو بھلا کب مان سکتے تھے۔ ایک یہودی نے اس مضمون پر ایک کتاب لکھی ہے اور وہ لوگوں کے سامنے اپیل کرتا ہے کہ ان واقعات کے ہوتے ہوئے ہم مسیحؑ پر کس طرح ایمان لائیں بلکہ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر ہم سے مواخذہ ہوگا تو ہم ملاکی نبی کی کتاب کھول کر آگے رکھ دیں گے۔

مامور من اللہ کی شناخت کے معیار

غرض ظاہر الفاظ پر آنے والے بعض اوقات سخت دھوکا کھا جاتے ہیں۔ پیشگوئیوں میں استعارات اور مجازات سے ضرور کام لیا جاتا ہے۔ جو شخص ان کو ظاہر الفاظ پر ہی حمل کر بیٹھتا ہے اسے عموماً ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ آیا جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے کا مدعی ہے وہ ان معیاروں کی رُو سے سچا ٹھہرتا ہے یا نہیں جو راستبازوں کے لیے مقرر ہیں۔ پس اگر وہ ان معیاروں کی رو سے صادق ثابت ہو تو سعادت مند اور متقی کا یہ فرض ہے کہ اس پر ایمان لاوے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء کی شناخت کے لیے تین بڑے معیار ہوتے ہیں:۔

اوّل یہ کہ نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ بھی اس کی مؤید ہیں یا نہیں۔

دوّم اس کی تائید میں سماوی نشانات صادر ہوتے ہیں یا نہیں۔

سوّم نصوصِ عقلیہ اس کے ساتھ ہیں یا نہیں یا آیا وقت اور زمانہ کسی ایسے مدعی کی ضرورت بھی بتاتا ہے یا نہیں۔

ان تینوں معیاروں کو مِلا کر جب کسی مامور اور راستباز کی نسبت غور کیا جائے گا تو حقیقت کُھل جاتی

ہے۔میرا دعویٰ ہے کہ میں خدا کی طرف سے مامور ہو کر آیا ہوں اب میرے دعویٰ کو پرکھ کر دیکھ لو کہ آیا یہ ان تین معیاروں کی رو سے سچا ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا یہ وقت کسی مدعی کی ضرورت کا داعی ہے یا نہیں؟ پس ضرورت تو ایسی صاف ہے کہ اس پر زیادہ کہنے کی ہمیں ضرورت ہی نہیں۔اسلام پر اس صدی میں وہ وہ حملے کئے گئے ہیں جن کے سننے اور بیان کرنے سے ایک مسلمان کے دل پر لرزہ پڑتا ہے۔

سب سے بڑا فتنہ اس زمانہ میں نصاریٰ کا فتنہ ہے جنہوں نے اسلام کے استیصال کے واسطے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہی نہیں کیا اُن کی کتابوں اور رسالوں اور اخباروں اور اشتہاروں کو جو اسلام کے خلاف ہیں اگر جمع کیا جائے تو ایک بڑا پہاڑ بن جاتا ہے اور پھر تیس لاکھ کے قریب مُرتد ہو چکے ہیں۔اس کے ساتھ آریوں، برہموؤں اور دوسرے آزاد خیال لوگوں کو ملایا جائے تو پھر دشمنانِ اسلام کے حملوں کا وزن اَور بھی بڑھ جاتا ہے۔اب ایسی صورت میں کہ اسلام کو پاؤں کے نیچے کچلا جا رہا ہے۔کیا ضرورت نہ تھی کہ خدا تعالےٰ اپنے سچے دین کی حمایت کرتا ۔۔ اور اپنے وعدہ کے موافق اس کی حفاظت فرماتا اور اگر عام حالت کو دیکھا جائے تو وہ ایسی خراب ہے کہ اس کے بیان کرنے سے بھی شرم آتی ہے۔فسق و فجور کا وہ حال ہے کہ علانیہ بازاری عورتیں بدکاری کرتی ہیں۔معاملات کی حالت بگڑی ہوئی ہے۔تقویٰ اور طہارت اُٹھ گیا ہے۔وہ لوگ جو اسلام کے حامی اور محافظِ شرعِ متین کہلاتے تھے۔اُن کی خانہ جنگی اور اپنی عملی حالت کی کمزوری نے اَور بھی ستم برپا کر رکھا ہے عوام جب ان کی حالت بد دیکھتے ہیں تو وہ حدود اللہ کے توڑنے میں اَور بھی دلیری سے کام لیتے ہیں۔غرض اندرونی اور بیرونی حالت بہت ہی خطرناک ہو رہی ہے۔

پھر دیکھنا ہے کہ آیا قرآنِ شریف اور احادیثِ صحیحہ میں کسی آنے والے کا وعدہ دیا گیا ہے سو قرآن شریف نے بڑی وضاحت کے ساتھ دو سلسلوں کا ذکر کیا ہے ایک وہ سلسلہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت مسیح علیہ السلام پر آکر ختم ہوا اور دوسرا سلسلہ جو اسی سلسلہ کے مقابل پر واقع ہوا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ ہے چنانچہ تورات میں بھی آپ کو مثیلِ موسیٰ کہا گیا اور قرآن شریف میں بھی آپ کو مثیلِ موسیٰ ٹھہرایا گیا جیسے فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمّل: ۱۶) پھر جس طرح پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ حضرت مسیح علیہ السلام پر آکر ختم ہو گیا۔اسی سلسلہ کی مماثلت کے لیے ضروری تھا کہ اسی وقت اور اسی زمانہ پر جب حضرت مسیح حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے تھے مسیح محمدی بھی آتا اور یہ بالکل ظاہر اور صاف بات ہے کہ مسیح موسوی

چودہویں صدی میں آیا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسیح محمدی بھی چودہویں صدی میں آتا۔ اگر کوئی اور نشان اور شہادت نہ بھی ہوتی تب بھی اس سلسلہ کی تکمیل چاہتی تھی کہ اس وقت مسیح محمدی آوے مگر یہاں تو صدہا اور نشان اور دلائل ہیں۔ پھر آنے والے کو اسی اُمت میں سے ٹھہرایا گیا ہے جیسے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۶) میں فرمایا گیا ہے اور اسی طرح پر احادیث میں بھی آنے والا اسی اُمت سے ٹھہرایا گیا ہے جبکہ فرمایا ہے و امامکم منکم۔ اب نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ بوضاحت شہادت دیتے ہیں کہ آنے والا مسیح موعود اسی اُمت میں سے ہوگا اور ضرورت بجائے خود داعی ہے کیونکہ اسلام پر سخت حملے ہو رہے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ان مخالفوں کا بس چلے اسلام کو نابود کر دیں۔

پھر دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اس کے آنے کا وقت کونسا ہے بسلسلہ موسوی کے ساتھ مماثلتِ تامہ کا تقاضا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ آنے والا مسیح موعود جو اسی امت میں سے ہوگا۔ چودہویں صدی میں آنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آنے کا وہ وقت ہے جبکہ صلیب پرستی کا غلبہ ہوگا کیونکہ کسرِ صلیب اس کا کام ٹھہرایا گیا ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک انقلاب عظیم کی خبر قرآن شریف سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس وقت آئے گا۔ وہ انقلاب کیا ہے؟ سواری بھی بدل جاوے گی۔ اونٹوں اور اونٹنیوں کی سواریاں بیکار ہو جائیں گی۔ اب دیکھو کہ ریلوے کی ایجاد نے اس پیشگوئی کو کس طرح پُورا کیا ہے اور اب تو یہ حال ہے کہ حجاز ریلوے جو بن رہی ہے تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدینہ اور مکہ کے درمیان بھی ریل ہی دوڑتی نظر آئے گی اور پھر اخبارات اور رسالہ جات کی اشاعت کے اسباب کا پیدا ہو جانا جیسے پریس ہے ڈاک خانہ ہے اور تاروں کے ذریعہ سے کل دُنیا ایک شہر کے حکم میں ہو گئی ہے۔ دریا چیرے گئے ہیں اور نہریں نکالی جا رہی ہیں۔ طبقات الارض کے عالموں نے زمین کے طبقات کو کھود ڈالا ہے۔ غرض وہ تمام ایجادات اور علوم و فنون کی ترقیاں جو مسیح موعود کے زمانہ کی علامتوں میں سے قرار دی گئی تھیں وہ پوری ہو رہی ہیں اور ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد انکار اور شُبہ کی کونسی گنجائش باقی رہتی ہے اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی کا آنا اور مامور ہونا افسوسناک بات نہیں بلکہ افسوسناک یہ امر ہوتا اگر کوئی مامور ہو کر نہ آیا ہوتا۔ ان علامات اور نشانات کو چھوڑ کر ایک اَور بات بھی اس کی تائید میں ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام اولیاء اللہ اور اکابرِ امت جو پہلے ہو گذرے ہیں انہوں نے قبل از وقت میرے آنے کی خبر دی ہے۔ بعض نے میرا نام لے کر پیشگوئی کی ہے اور بعض نے اَور الفاظ میں بھی کی ہے۔ ان میں سے شاہ نعمت اللہ ولی نے

شہادت دی ہے اور میرا نام لے کر بتایا ہے۔ اسی طرح پر ایک اہل اللہ بزرگ گلاب شاہ مجذوب تھے جنہوں نے ایک شخص کریم بخش ساکن جمالپور ضلع لودھیانہ سے میرا نام لے کر پیشگوئی کی ہے اور اس نے کہا کہ وہ قادیان میں ہے کریم بخش کو قادیان کا شبہ پڑا کہ شاید لودھیانہ کے قریب کی قادیان میں ہوں۔ مگر آخر اس نے بتایا کہ یہ قادیان نہیں اور اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ لودھیانہ میں آئے گا اور مولوی اس کی مخالفت کریں گے۔ چنانچہ اس کا یہ سارا بیان چھپ چکا ہے اور کل گاؤں کریم بخش کی راستبازی اور نیکوکاری کی شہادت دیتا تھا اور جس وقت وہ بیان کرتا تھا تو رو پڑتا تھا۔ اس نے گلاب شاہ سے یہ بھی کہا کہ عیسیٰؑ تو آسمان سے آئیگا اس نے جواب دیا کہ جو آسمان پر چلا جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آیا کرتا۔

اس پیشگوئی کے موافق کریم بخش میری جماعت میں داخل ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اس کو روکا اور منع بھی کیا مگر اس نے کہا کہ میں کیا کروں یہ پیشگوئی پوری ہو گئی ہے میں اس شہادت کو کیونکر چھپاؤں۔ غرض اس طرح پر بہت سے اکابرِ امت گذرے ہیں جنہوں نے میرے لیے پیشگوئی کی اور پتہ بتایا۔ بعض نے تاریخِ پیدائش بھی بتائی جو چراغ دین ۱۲۶۸ ہے۔

اور اس کے علاوہ وہ نشان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے تھے وہ بھی پورے ہو گئے۔ منجملہ انکے ایک کسوف وخسوف کا نشان تھا۔ جب تک کہ یہ کسوف وخسوف کا نشان نہیں ہوا تھا یہ مولوی جو اب میری مخالفت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تکذیب کر رہے ہیں اس کی سچائی کے قائل تھے اور یہ نشان بتاتے تھے کہ مسیح و مہدی کا یہ نشان ہو گا کہ رمضان کے مہینہ میں سورج اور چاند کو گرہن ہو گا۔ لیکن جب یہ نشان میرے دعویٰ کی صداقت کی شہادت کے لیے پُورا ہو گیا تو پھر جس منہ سے اقرار کیا کرتے تھے اسی منہ سے انکار کرنے والے ٹھہرے۔ کسی نے تو سرے سے اس حدیث ہی کا انکار کر دیا اور کسی نے اپنی کم سمجھی اور نادانی سے یہ کہدیا کہ چاند کی پہلی تاریخ کو گرہن ہونا چاہیئے حالانکہ پہلی رات کا چاند تو خود گرہن ہی میں ہوتا ہے اور علاوہ بریں حدیث میں تو قمر کا لفظ ہے جو پہلی رات کے چاند پر لولا ہی نہیں جاتا۔

غرض اس طرح پر جس قدر نشان تھے وہ پورے ہو گئے مگر یہ لوگ ہیں کہ محض میری مخالفت کی وجہ سے خدا تعالیٰ اور اس کے سچے اور پاک رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی انکار کر رہے ہیں اور آپ کی تکذیب کی بھی کچھ پروا نہیں کرتے۔ ان نشانوں اور علامات کے بعد پھر یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے کہ کیا مدعی کے اپنے ہاتھ پر کوئی نشان اس کی تصدیق کے لیے ظاہر ہوا ہے یا نہیں؟ اس کے لیے میں کہتا ہوں کہ اس قدر نشان اللہ تعالیٰ نے ظاہر کئے ہیں کہ ان کی تعداد ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں

اور ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے اور اگر میری جماعت کو خدا تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھا جائے تو مَیں امید نہیں کرتا کہ کوئی شخص ایک بھی ایسا نکلے جو یہ کہے کہ مَیں نے کوئی نشان نہیں دیکھا اور پھر یہ کہ نشانوں کی بارش برس رہی ہے۔ اولیاء اللہ کی اسی لیے حرمت اور تکریم کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق کا ایک زندہ اور سچا نمونہ پیش کرتے ہیں یعنی خوارق کا صدور اُن سے ہوتا رہتا ہے اور نشانات ہی سے وہ واجب العزت ہوتے ہیں۔ پھر اس صورت میں مجھے حق ہے کہ وہ لوگ جو میری اس بات سے کہ مَیں امام حسین سے افضل ہوں گھبراتے ہیں بجائے اس کے کہ مجھ پر اعتراض کریں صاف طور پر میرے مقابلہ میں آئیں۔ مَیں ان سے پوچھوں گا کہ جس قسم کے نشانات مَیں اپنی سچائی اور منجانب اللہ ہونے کے پیش کرتا ہوں۔ اس قسم کے نشانات تم بھی پیش کرو اور پھر اسی قدر تعداد میں دکھاؤ۔ مَیں مرثیہ نہیں سُنوں گا بلکہ نشانات کا مطالبہ کروں گا۔ جس کو حوصلہ ہے اور جو امام حسین کو سجدے کرتے ہیں وہ اُن کے خوارق اور نشانات کی فہرست پیش کریں اور دکھائیں کہ کس قدر لوگ ان واقعات کے گواہ ہیں۔ اس مقابلہ میں یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ واقعات میں قافیہ تنگ ہے۔ مبالغہ سے ایک بات کو پیش کر دینا اَور ہے اور حقیقی طور سے واقعات کی بنا پر اُسے ثابت کر دکھانا مشکل ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ کا سچا پرستار ہے اسے کسی دوسرے سے کیا واسطہ؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ ثابت کیا جاوے کہ آیا وہ شخص جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا مدعی ہے اپنے ساتھ دلائل اور نشانات بھی دکھاتا ہے یا نہیں۔ جب ثابت ہو جاوے کہ وہ واقعی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کا فرض ہے کہ اپنی ارادت کو منتقل کرے۔

غرض یہ تین ذریعے ہیں جن سے ہم کسی مامور من اللہ کو شناخت کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ میرا سلسلہ منہاج نبوت پر قائم ہوا ہے۔ اس منہاج کو چھوڑ کر جو اس کو آزمانا چاہے وہ غلطی کھاتا ہے اور اس کو راہ راست مل نہیں سکتا لیکن منہاج نبوت پر میرے ساتھ دلائل و براہین اور آیات اللہ کا زبردست لشکر ہے اگر کوئی اس پر بھی نہ مانے تو مَیں مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ کاروبار اور سلسلہ میرا قائم کردہ تو ہے نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس کو قائم کیا ہے اور وہی اس کی اشاعت کر رہا ہے۔ انسانی تجاویز اور منصوبے چل نہیں سکتے آخر تھک کر رہ جاتے ہیں۔ وہ شخص بڑا ہی ظالم اور خبیث ہے جو خود ایک بات گھڑ لیتا ہے اور پھر لوگوں کو کہتا ہے کہ مجھ کو وحی ہوئی ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں کبھی بامراد اور کامیاب نہیں ہو سکتے۔ خدا تعالیٰ ایسے مفتری اور ظالم کو مہلت نہیں دیتا۔ لیکن اگر ایک شخص خدا تعالیٰ کا نام لے کر ایک وحی پیش کرتا ہے اور خدا تعالیٰ اسے سچا کرتا ہے اور اس کی تائید و نصرت کر رہا ہے تو پھر اس سے انکار کرنا اچھا نہیں۔ پس

انسان کو چاہیئے کہ شپرّ کی طرح نہ ہو۔ عجب روشنی اس وقت پھیل رہی ہے۔ اس سے مُنہ موڑنا خوب نہیں ہر شخص جو اعتراض اور نکتہ چینیاں رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ اس دروازہ پر بیٹھ کر اپنے شکوک کو رفع کرے لیکن جو یہاں تو بیٹھتا نہیں اور دریافت نہیں کرتا اور گھر جا کر نکتہ چینیاں کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی تلوار کے سامنے آتا ہے جس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

دیکھو افتراء کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مفتری ہمیشہ خائب و خاسر رہتا ہے۔ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی (طٰہٰ :۶۲) اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر تو افترا کرے تو تیری رگِ جان ہم کاٹ ڈالیں گے اور ایسا ہی فرمایا مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا (الانعام: ۲۲) ایک شخص ان باتوں پر ایمان رکھ کر افتراء کی جرأت کیونکر کر سکتا ہے۔ ظاہری گورنمنٹ میں ایک شخص اگر فرضی چپڑاسی بن جائے تو اس کو سزا دی جاتی ہے اور وہ جیل میں بھیجا جاتا ہے تو کیا خدا تعالےٰ ہی کی مقتدر حکومت میں یہ اندھیر ہے؟ کہ کوئی محض جھوٹا دعویٰ مامور من اللہ ہونے کا کرے اور پکڑا نہ جاتے بلکہ اس کی تائید کی جائے۔ اس طرح تو دہریت پھیلتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی ساری کتابوں میں لکھا ہے کہ مفتری ہلاک کیا جاتا ہے۔ پھر کون نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ ۲۵ سال سے قائم ہے اور لاکھوں آدمی اس میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ باتیں معمولی نہیں بلکہ غور کرنے کے قابل ہیں۔ محض ذاتی خیالات بطور دلیل مانے نہیں جاسکتے۔ ایک ہندو جو گنگا میں غوطہ مار کر نکلتا ہے اور کہتا ہے کہ میں پاک ہو گیا۔ بلا دلیل اس کو کون مانے گا؟ بلکہ اس سے دلیل مانگے گا۔ پس میں نہیں کہتا کہ بلا دلیل میرا دعویٰ مان لو۔ نہیں منہاجِ نبوت کے لیے جو معیار ہے اس پر میرے دعویٰ کو دیکھو۔ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں خدا سے وحی پاتا ہوں اور منہاجِ نبوت کے تینوں معیار میرے ساتھ ہیں اور میرے انکار کے لیے کوئی دلیل نہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۲ صفحہ ۳ تا ۷ مورخہ ۱۰ را پریل ۱۹۰۴ء) و

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۰، ۲۱ صفحہ ۳ تا ۵ مورخہ ۲۴ رمئی و یکم جون ۱۹۰۴ء)

---

۱۳ رجنوری ۱۹۰۴ء

صبح کے وقت منشی اروڑا صاحب نقشہ نویس ریاست کپور تھلہ نے حضرت اقدس سے نیاز حاصل کیا تو آپ نے فرمایا:۔

میں نے آواز تو رات کو ہی شناخت کر لی تھی مگر طبیعت کو تکلیف تھی اس لیے بُلا نہ سکا۔

منشی صاحب موصوف نے جناب خانصاحب محمد خاں صاحب افسر بگی خانہ سرکار کپورتھلہ کی وفات کا واقعہ سنایا جس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:۔

نیکی کرنے والے کی اولاد کو بھی اس کی نیکی کا حصّہ ملتا ہے۔ یہ دُنیا فنا کا مقام ہے اگر ایک مرجاتا ہے تو پھر دوسرے نے کونسا ذمہ لیا ہے کہ وہ نہ مریں گے۔ دُنیا کی وضع ایسی ہی ہے کہ آخر قضا و قدر کو ماننا پڑتا ہے۔ دُنیا ایک سرائے ہے اگر اس میں آتے ہی جاویں اور نہ نکلیں تو کیسے گذارہ ہو۔

انبیاء کے وجود سے زیادہ عزیز کوئی دوسرا وجود قدر کے لائق نہیں لیکن آخر ان کو بھی جانا پڑا۔

موت کے وقت انسان کو دہشت ہوتی ہے مگر جب مجبوراً وقت قریب آتا ہے تو اسے قضا و قدر پر راضی ہونا پڑتا ہے اور نیک لوگوں کے دلوں سے تعلقات دنیاوی خود اللہ تعالیٰ توڑ دیتا ہے کہ ان کو تکلیف نہ ہو۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۴ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ ؍جنوری ۱۹۰۴ء)

۳۰ ؍جنوری ۱۹۰۴ء

بعد نماز مغرب

خدا تعالیٰ پر سچے ایمان کی ضرورت

طاعون کا ذکر ہوتا رہا کہ اب فروری کا مہینہ آگیا ہے اس کا زور ہوگا چنانچہ مختلف مقامات سے اس کی خبریں آنی شروع ہوگئی ہیں۔ فرمایا کہ

ضروری بات خدا شناسی ہے کہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور جزا سزا پر ایمان ہو۔ اسی کی کمی سے دُنیا میں فسق و فجور ہو رہا ہے لوگوں کی توجہ دُنیا کی طرف اور گناہوں کی طرف بہت ہے دن اور رات یہی فکر ہے کہ کسی طرح دنیا میں دولت، وجاہت عزت ملے جس قدر کوشش ہے خواہ کسی پیرایہ میں ہی ہو مگر وہ دُنیا کے لیے ہے خدا تعالیٰ کے لیے ہرگز نہیں۔ دین کا اصل لُب اور خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو مگر اب مولوی وعظ کرتے ہیں تو ان کے وعظ کی بھی علت غائی یہ ہوتی ہے کہ اسے چار پیسے مل جاویں جیسے ایک چور باریک در باریک حیلے چوری کے لیے کرتا ہے ویسے ہی یہ لوگ کرتے ہیں ایسی حالت میں بجز اس کے کہ عذاب الٰہی نازل ہو اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک اعتراض ہم پر یہ ہوتا ہے کہ اپنی تعریف کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مُطہّر و برگزیدہ قرار دیتے ہیں۔ اب لوگوں سے کوئی پوچھے کہ خدا تعالیٰ جو امر ہمیں فرماتا ہے کیا ہم اس کی نافرمانی کریں۔ اگر ان باتوں کا اظہار نہ کریں تو معصیت میں داخل ہو۔ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیا کیا الفاظ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں فرمائے

ہیں۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق تو وہ بھی خودستائی ہوگی۔

خودستائی کرنے والا حق سے دُور ہوتا ہے مگر جب خدا تعالیٰ فرمائے تو پھر کیا کیا جائے۔ یہ اعتراض ان نادانوں کا صرف مجھ پر ہی نہیں ہے بلکہ آدم سے لے کر جس قدر نبی۔ رسول۔ ازکیا اور مامور گذرے ہیں، سب پر ہے۔ ذرا غور کرنے سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ جسے خدا تعالیٰ مامور کرتا ہے ضرور ہے کہ اس کے لیے اجتباء اور اصطفاء ہو اور کچھ نہ کچھ اس میں ضرور خصوصیت چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کل مخلوق میں سے اسے برگزیدہ کرے۔

خدا تعالیٰ کی نظر خطا جانے والی نہیں ہوتی۔ پس جب وہ کسی کو منتخب کرتا ہے وہ معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ قرآن شریف میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (سورۃ الانعام: ۱۲۵) اس سوال کا آخر ماحصل یہ ہے کہ وہ ہمیں مفتری کہیں گے مگر پھر ان پر سوال ہوتا ہے کہ عجب خدا ہے کہ اس قدر عرصہ دراز سے برابر افترا کا موقعہ دیئے چلا جاتا ہے اور جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ وقوع میں آتا ہے۔ اگر مفتریوں کیساتھ خدا تعالیٰ کے یہ سلوک ہیں اور اس طرح سے اُن کی تائید اور نصرت کی جاتی ہے جیسے کہ ہماری تو پھر کل انبیاء کو بھی انہیں مفتری قرار دینا پڑے گا۔ وہی علامات اور براہین جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ کی صداقت کے نشان اور دلیل تھے وہی اب بھی موجود ہیں جسے خدا تعالیٰ منتخب کرے اگر وہ اس کی تعریف نہ کرے تو کیا گند کھے؛ اس سے خدا پر حرف آتا ہے کہ اس کا انتخاب گندا ٹھہرتا ہے۔

اگر دنیا کے مجازی حکام اعلیٰ کو بھی دیکھو تو وہ بھی حتی الوسع کمشنری۔ لفٹننٹی۔ ڈپٹی کمشنری وغیرہ کے عہدوں کے لیے انہیں کو انتخاب کرتے ہیں جو کہ ان کی نظر میں لائق ہوتے ہیں۔ اگر وہ حکام اعلیٰ کی نظر میں نالائق اور ذمہ داریوں کی بجاآوری کے ناقابل ہوں تو انتخاب نہیں کئے جاتے۔ پس اسی طرح مامورین وغیرہ خدا تعالیٰ کی نظروں میں نالائق اور نکمے اور اشقیاء ہوں تو پھر لوگوں کو مزکّی بنانے کی خدمت اُن سے کیسے لی جاوے۔

یہ ایک نکتہ ہے کہ ان کا جو اعتراض ہوتا ہے وہ صرف میری ذات پر نہیں ہوتا۔ بلکہ عام ہوتا ہے کہ آدم سے لے کر جس قدر نبی اس وقت تک گذرے ہیں، سب اُس میں شامل ہوتے ہیں۔ بھلا وہ ایک اعتراض تو کرکے دکھلاویں جو سابقہ انبیاء میں سے کسی پر نہ ہوا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ایمان کے لوازم تمام اس وقت ردّی ہو گئے تھے۔ دل حلاوت ایمان سے خالی ہیں۔ دنیا کی زیب و زینت کے خیال نے دلوں پر تصرف کر لیا ہے ایک گہرے بحر ظلمات میں لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت بڑی ضرورت اور احتیاج اس امر کی ہے کہ وہ تقویٰ جس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور کتاب اللہ نازل ہوئی، حاصل ہو۔ ایک مُردہ ایمان لوگوں کے پاس ہے۔ اس لیے اس ایمان کی کوئی نشانی بھی ہاتھ میں نہیں ہے اور اسی باعث سے یہ وبال ان لوگوں پر ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ کیا ہم نماز ادا نہیں کرتے، روزہ نہیں رکھتے۔ کلمہ نہیں پڑھتے۔ ان کم بختوں کو اتنی خبر نہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

مبعوث ہوئے تھے تو یہود بھی تو سب عبادتیں کرتے تھے پھر وہ کیوں مغضوب ہوئے؟

ان کی نہایت بدقسمتی اور شقاوت ہے کہ بھلا دیا ہے کہ اسلام کیا ہے، دین کیا ہے۔ کب کہا جاتا ہے کہ فلاں متقی ہے، فلاں مومن ہے۔ صرف چھلکے اور پوست پر نازاں ہیں اور مغز کو ہاتھ سے کھو دیا ہے جو کہ دین کی اصل روح ہے۔ اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ روح دوبارہ پیدا کرے۔ اگر ان لوگوں میں تقویٰ اور معرفت ہو تو یہ اعتراض کر کے خود ہی نادم ہوں۔

سوادِ اعظم کی حقیقت

ایک یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سوادِ اعظم حیاتِ مسیح کا قائل ہے۔ اگر سوادِ اعظم کے یہ معنے ہیں کہ ایک گروہ کثیر ایک طرف ہو تو اس کی بات سچی ہوتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود و عیسائی قوم کا بھی سوادِ اعظم تھا۔ وہ اہلِ کتاب ہی تھے۔ بڑے بڑے عالم۔ فاضل۔ عابد اُن میں موجود تھے۔ اِن کے معیار سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اُن کی شہادت معتبر مان لینی چاہیئے۔

اصل سوادِ اعظم وہ لوگ ہیں جو حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور علیٰ وجہ البصیرت خدا تعالیٰ پر ان کا ایمان ہے اور ان کی شہادت معتبر ہوتی ہے۔ بھلا سوچ کر دیکھو کہ جس راہ میں بچھو۔ سانپ اور درندے وغیرہ ہوں۔ کیا دس ہزار اندھے اس کی نسبت کہیں کہ یہ راہ اختیار کرو تو کوئی ان کی بات مانے گا؟ اور جو اُن کے پیچھے چلیں گے وہ سب مریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مَیں علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہوں اگرچہ آپ ایک فردِ واحد تھے لیکن آپ کے مقابل ہزارہا منکرین کی بات قابلِ اعتبار نہ تھی جو آپ کی مخالفت کرتے تھے۔

اب اس وقت ایک سوادِ اعظم نہیں ہے بلکہ کئی سوادِ اعظم ہیں۔ افیونیوں، بھنگیوں، چرسیوں، شرابیوں وغیرہ کا بھی ایک سوادِ اعظم ہے۔ مخلوق پرستوں کا بھی ایک سوادِ اعظم ہے تو کیا ان لوگوں کے اقوال کو سند پکڑا جاوے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سورۃ سبا: ۱۴) کہ شاکر اور سمجھدار بندے ہمیشہ کم ہوتے ہیں جو کہ حقیقی طور پر قرآنِ مجید پر چلنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ان کو اپنی محبت اور تقویٰ عطا کیا ہے وہ خواہ قلیل ہوں مگر اصل میں وہی سوادِ اعظم ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اُمَّةً کہا ہے۔ حالانکہ وہ ایک فرد واحد تھے مگر سوادِ اعظم کے حکم میں تھے۔

یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ شرارتوں، منصوبوں اور حیلہ بازیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا عمل ایک بالشت بھی آسمان پر جا سکے اور وہ ان نیک بندوں کے برابر ہوں۔ جن کی عظمت خدا تعالیٰ کی نظر میں ہے۔ عبداللطیف کی ہی ایک نظیر دیکھ لو کہ بار بار موقعہ ملا کہ جان بچاوے مگر اس نے یہی کہا کہ مَیں نے حق کو پا لیا اس کے آگے جان کیا شئے ہے۔ سوچ کر دیکھو کیا جھوٹ کے واسطے دیدہ دانستہ کوئی جان جیسی عزیز شئے دے سکتا ہے۔

اکثریت کی بدنصیبی

ایک بدنصیبی ان لوگوں کی یہ ہے کہ آکر صحبت حاصل نہیں کرتے اور دُور دُور رہتے ہیں۔ان کے اسلام کی مثال ایک تصویر کی مثال ہے کہ اس میں نہ ہڈی نہ گوشت، نہ پوست، نہ خون، نہ روح۔ پھر اسے انسان کہا جاتا ہے۔ اپنی کثرت پر ناز کرتے ہیں۔کتاب اللہ کی عزت نہیں کرتے حالانکہ اس کثرت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔آپ نے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے ایک اپنا اور ایک مسیح موعود کا۔اور درمیانی زمانہ کو جس میں ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچی اور کثرت ہوئی فیج اعوج کہا ہے پھر اصل میں یہ کثرت بھی نہیں ہے خود ان میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ہرایک کا الگ الگ مذہب ہے۔ ایک دوسرے کی تکفیر کر رہا ہے۔جب یہ حال ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہ آوے گا؟ خود انہی میں سے ہیں جو مانتے چلے آئے ہیں کہ مسیح اسی اُمّت میں سے ہوگا حدیثوں میں اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ موجود ہے۔ سورہ نُور میں مِنْکُمْ ہے۔

معراج میں آپ نے اسرائیلی مسیح کا حُلیہ اَور دیکھا اور آنے والے اپنے مسیح کا اَور حُلیہ تبلایا۔پھر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس بات پر اجماع ہوچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر سب انبیاء فوت ہوچکے ہیں۔ان تمام ثبوتوں کے بعد اَور ان کو کیا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ئہ)

نیز (البدر جلد ۳ نمبر ۶ صفحہ ۲ مورخہ ۸ فروری ۱۹۰۴ئہ و نمبر ۷ صفحہ ۲ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ئہ)

---

۱۳ جنوری ۱۹۰۴ئہ

صبح کی سیر

عذاب الٰہی کی ضرورت

اِنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا نَحْنُ مُہْلِکُوْھَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اَوْ مُعَذِّبُوْھَا عَذَابًا شَدِیْدًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل: ۵۹) یہ اسی زمانہ کے لیے ہے کیونکہ اس میں ہلاکت اور عذاب مختلف پیرایوں میں ہے، کہیں طوفان ہے کہیں زلزلوں سے کہیں آگ کے لگنے سے۔اگرچہ اس سے پیشتر بھی یہ سب باتیں دُنیا میں ہوتی رہی ہیں مگر آج کل ان کی کثرت خارقِ عادت کے طور پر ہو رہی ہے جس کی وجہ سے یہ ایک نشان ہے اس آیت میں طاعون کا نام نہیں ہے۔صرف ہلاکت کا ذکر ہے خواہ کسی قسم کی ہو۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس قوت اور پوری توجہ سے لوگوں نے دنیا اور اس کے ناجائز وسائل کو مقدم رکھا

ہوا ہے اور عظمتِ الٰہی کو دلوں سے اُٹھا دیا ہے۔ اب صرف وعظوں کا کام نہیں ہے کہ اس کا علاج کر سکیں۔ عذابِ الٰہی کی ضرورت ہے۔

بابو شاہدین صاحب نے عرض کیا کہ حضور عذاب سے بھی لوگ عبرت نہیں پکڑتے کہتے ہیں کہ ہمیشہ بیماریاں وغیرہ ہوا ہی کرتی ہیں۔ فرمایا:۔

قرآن شریف میں طوفانِ نوح کا ذکر ہے۔ بجلی کا ذکر ہے اور یہ سب حادثات دُنیا میں ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ کیا اُن کے نزدیک یہ عذاب الٰہی نہ تھے؟ جن کا ذکر خدا تعالیٰ نے کیا ہے اور ان سب کا ہمیشہ دنیا میں وجود رہتا ہے مگر جب کثرت ہو اور ہولناک صورت سے ظاہر ہوں اور ایک دنیا میں تہلکہ پڑ جاوے تب یہ نشان ہیں۔ وحی بھی اسی طرح سے ہمیشہ سے ہے۔ ہمیشہ لوگوں کو سچے خواب آتے ہیں تو پھر انبیاء کی خصوصیت کیا ہوئی۔ خصوصیت ہمیشہ کثرت اور درجہ کمال سے ہوتی ہے۔ اب اس وقت جو ہلاکت مختلف طور سے ہو رہی ہے اس کی نظیر یہ دکھلا دیں۔

گذشتہ دنوں عالیجناب احسان علی خانصاحب برادر نواب محمد علی خانصاحب مالیر کوٹلہ سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے حضرت اقدس سے نیاز بھی حاصل کیا تھا اور آپ نے ایک جامع تقریر بھی اس وقت فرمائی تھی جس سے ان کے اکثر شبہات و شکوک کا قلع قمع ہوا تھا۔ انہیں کا ذکر ہوتا رہا کسی کی طرف سے یہ اعتراض بھی پیش ہوا کہ ان کے ایک مصاحب نے یہ کہا ہے کہ ابھی مہدی و مسیح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں۔

اس پر آپ نے فرمایا کہ:

عام طور پر دلوں میں دہریت گھر کر گئی ہے۔ لاکھوں مسلمان عیسائی ہو گئے ہیں۔ صلیبی فتنہ بڑھ رہا ہے۔ اگر اب بھی ضرورت نہیں۔ تو کیا یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا نام ونشان نہ رہے اس کی تو وہی مثال ہے کہ ایک میّت موجود ہو اس میں روح کا نام ونشان نہ ہو اور صرف اس کے آنکھ۔ کان۔ ناک وغیرہ اعضاء دیکھ کر کہا جائے کہ یہ میّت نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو اور چار دن رکھ کر دیکھ لو۔ جب سڑے گا اور بدبُو پھیلے گی تو خود پتہ لگ جائے گا کہ رُوح کا نام ونشان نہیں صرف پوست ہی پوست ہے۔ ابھی کہتے ہیں کہ ضرورت نہیں۔

اہلِ تشیع کو جو محبت حضرت امام حسین سے ہے اور آپ کے واقعہ شہادت کو سُنکر جس طرح ان کے جگر پارہ پارہ ہوتے ہیں اس میں سے تکلف اور تصنع کو دُور کر کے باقی ان لوگوں کے حق میں جو دلی خلوص سے امام صاحب سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی شان میں ہر ایک قسم کے غلو کو معیوب قرار دیتے ہیں۔ فرمایا کہ اس سے ہم منع نہیں کرتے کہ کوئی کسی بزرگ کی محبت یا جدائی میں آنسوؤں سے رو لے۔

فرمایا کہ

ہدایت کے تین طریق ہیں۔ بعض لوگ تو کلمات طیبات سُنکر ہدایت پاتے ہیں۔ بعض تہدید کے محتاج ہوتے ہیں بعض کو آسمانی نشان اور تائید نظر آجاتی ہے کیونکہ

شنیدہ کے بُوَد مانند دیدہ

اب اس وقت جو خدا تعالیٰ دکھلا رہا ہے وہ چشم دید ہے دوسرے نقول ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۲ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء)

یکم فروری ۱۹۰۴ء

(صبح کی سیر)

اِتمامِ حُجّت کی ضرورت

فرمایا کہ

قویٰ خواہ کتنے ہی قوی ہوں اور عمر کس قدر ہی اوائل میں کیوں نہ ہو مگر تاہم عمر کا اعتبار نہیں ہے۔ نہیں معلوم کہ کس وقت موت آجاوے۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اگرچہ اپنے فرض کا ایک حصہ بذریعہ تحریروں کے ہم نے پورا کردیا ہے مگر تاہم ایک بڑا ضروری حصہ باقی ہے کہ عوام الناس کے کانوں تک ایک دفعہ خدا تعالیٰ کے پیغام کو پہنچا دیا جاوے کیونکہ عوام الناس میں ایک بڑا حصہ ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جو کہ تعصب اور تکبّر وغیرہ سے خالی ہوتے ہیں اور محض مولویوں کے کہنے سُننے سے وہ حق سے محروم رہتے ہیں۔ جو کچھ یہ مولوی کہہ دیتے ہیں۔ اُسے آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہہ کر مان لیتے ہیں۔ ہماری طرف کی باتوں اور دعووں اور دلیلوں سے محض ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے ارادہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں جاکر بذریعہ تقریر کے لوگوں پر اتمامِ حجّت کی جاوے اور ان کو بتلایا جاوے کہ ہمارے مامور ہونے کی غرض کیا ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں۔

دراصل یہ ایک لمبی تقریر تھی جس کا خلاصہ مَیں نے درج کر دیا ہے۔ حضرت اقدس علیہ السلام بہت دُور نکل گئے تھے اور مَیں پیچھے پہنچا۔ حافظ روشن علی صاحب برادر ڈاکٹر رحمت علی صاحب مرحوم کی زبانی یہ خلاصہ سُنکر درج کیا گیا ہے جس کی تصدیق دیگر احباب نے بھی کی۔ اس اتمام حجّت کے بعد پنجاب کے بڑے بڑے شہر یا تو خدا تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہوں گے اور بصورتِ انکار سخت غضب کے۔

خدا تعالیٰ کی بے نیازی پر ایمان

فرمایا کہ عمر کی نسبت اگرچہ مجھے الہام بھی ہوا ہے اور خوابیں بھی آئی ہیں مگر جب اللہ تعالیٰ کی بے نیازی پر نظر پڑتی ہے تو مجھے اپنی عمر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ پھر جیسے لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ ان کو عمر کا کوئی وعدہ بھی نہیں ملا ہوا مگر پھر بھی وہ ایسے عمل کرتے ہیں جیسے کہ مطلق موت آنی ہی نہیں۔ سعادت یہ ہے کہ موت کو قریب جاننے تو سب کام خود بخود درست ہو جاویں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے بہت سے آثار بتلائے مگر تاہم اگر ذرا سخت آندھی چلتی یا بارش ہوتی تو آپ گھبرا جاتے اور خیال کرتے کہ کیا قیامت تو نہیں آئی۔ اس وقت آپ کی نظر خدا تعالیٰ کی بے نیازی پر ہوتی۔ جنگِ بدر میں فتح کا وعدہ تھا مگر تاہم رو رو کر دُعائیں کرتے۔ آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ فتح کا وعدہ تو ہے مگر شاید کوئی شرط اس میں ایسی پنہاں ہو جس کا مجھے علم نہیں تو پھر فتح نہ ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کیسا تھ کیا کیا وعدے تھے مگر آخر قوم کی قوم جنگلوں میں مر کھپ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ الٰہی وعدے جن شرائط کے ساتھ مشروط تھے ان کے برعکس قوم نے کارروائی کی۔

جماعت کی شامتِ اعمال کا اثر مامور پر پڑتا ہے۔ جنگِ اُحد میں ایک طائفہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا نہ مانا تو آپ کو کس قدر تکلیف ہوئی۔ زخم آپ کو لگے۔ دانت شہید ہوا۔ خُود اس قدر سر میں دھنس گئی کہ صحابہؓ زور لگا کر اسے نکالتے نہ نکلتی۔ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کے آگے کسی کی کیا پیش چل سکتی ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۲-۳ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ء)

نیز (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۲-۳ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء)

---

۲ تا ۴ فروری ۱۹۰۴ء

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طبیعت علیل رہی اور بایں وجہ سیر بھی ملتوی رہی برد اطراف چکر وغیرہ کے دماغی امراض جو آپ کو مصلحتِ الٰہی سے لاحق ہیں۔ اُن کے دورے رہے۔ مختلف اوقات میں آپ شریک نماز باجماعت ہوتے رہے اور جو اذکار ان اوقات میں ضبط ہوئے وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

رحمت علی مرحوم

مرحوم رحمت علی کے ذکر پر آپ نے فرمایا کہ:
یہ اس کی پاکیزہ فطرت کی نشانی ہے کہ افریقہ میں غائبانہ طور پر ہمیں قبول کیا اور اس چھوٹی سی عمر میں ترقی اخلاص میں بھی کی۔

اس سال میں اَور بھی ہمارے مخلص دوست فوت ہوئے ہیں۔

شہد کے خواص

شہد کے تذکرے پر آپ نے فرمایا کہ:
دوسری تمام شیرینیوں کو تو اطباء نے عفونت پیدا کرنے والی لکھا ہے مگر یہ اُن میں سے نہیں ہے۔ آم وغیرہ اور دیگر پھل اس میں رکھ کر تجربے کئے گئے ہیں کہ وہ بالکل خراب نہیں ہوتے سالہا سال ویسے ہی پڑے رہتے ہیں۔

فرمایا کہ
ایک دفعہ میں نے انڈے پر تجربہ کیا تو تعجب ہوا کہ اس کی زردی تو ویسی ہی رہی مگر سفیدی انجماد پا کر مثل پتھر کے سخت ہو گئی جیسے پتھر نہیں ٹوٹتا ویسے ہی وہ بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔

خدا تعالیٰ نے اسے شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کہا ہے۔ واقعہ میں عجیب اور مفید شئے ہے تو کہا گیا ہے۔ یہی تعریف قرآن شریف کی فرمائی ہے۔ ریاضت کش اور مجاہدہ کرنے والے اکثر اسے استعمال کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہڈیوں وغیرہ کو محفوظ رکھتا ہے۔

اس میں اَلْ جو ناس کے اوپر لگایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اس کے اپنے (یعنی خدا تعالیٰ کے) ناس (بندے) ہیں اور اس کے قرب کے لیے مجاہدے اور ریاضتیں کرتے ہیں ان کے لیے شفا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ تو ہمیشہ خواص کو پسند کرتا ہے عوام سے اسے کیا کام؟

مرنے والوں کے اَمثال

فرمایا:-
کوئی عمدہ آدمی فوت ہو تو صدمہ ضرور ہوتا ہے لیکن دُنیا ایسی جگہ ہے کہ اس میں پھر ویسے اَمثال پیدا ہو جاتے ہیں نیکوں کے بھی، بدوں کے بھی۔ اسی لیے بعض نے دُنیا کو دَوری لکھا ہے کہ جن صفات کے لوگ اس کے ایک دَور میں گذر جاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کے لوگ وہی سیرتیں اور صورتیں لے کر دوسرے دَور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

مخدوم حضرت مولوی نورالدین صاحب نے عرض کی کہ حضور یہیں سے ٹھوکر کھا کر لوگ تناسخ کے قائل ہو گئے ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۳ مورخہ ۱۶ ؍فروری ۱۹۰۴ء)
و (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷ ؍فروری ۱۹۰۴ء)

۵-۶ فروری ۱۹۰۴ء

۵ تاریخ کو حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام سیر کو تشریف لے گئے لیکن میں اس سیر میں ایک مغالطہ کی وجہ سے شریک نہ ہوسکا۔ (ڈائری نویس)

۶ تاریخ کو عصر کے وقت آپ نے مجلس فرمائی۔ مختلف تذکرے ہوتے رہے۔ سرسید کا ذکر آگیا فرمایا:

مداہنت

دوسری قوم کے رُعب میں آکر اوران کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ آپ آخر ایام میں تثلیث کے ماننے والوں کو بھی نجات یافتہ قرار دے گئے مداہنہ کی انتہا یہی ہوا کرتی ہے کہ آخر اسی قوم کا انسان کو بننا پڑتا ہے۔ قرآن شریف میں اسی لیے ہے لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (سورۃ البقرۃ: ۱۲۱) دوسرے کو راضی کرنے کے لیے انسان کو اس کے مذہب کو بھی اچھا کہنا پڑتا ہے اسی لیے مداہنہ سے مومن کو پرہیز کرنا چاہیئے۔

فرمایا کہ:۔

مخالفین کا رویہ

مجھے بھی یہ الہام ہوا ہے جیسے کہ براہین میں درج ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت ان لوگوں (یعنی مخالفوں) میں سے شاذ و نادر ہی ہوگا جو ہم سے راضی ہو اور ہمارے ساتھ اخلاق سے پیش آنا چاہتا ہو۔ ہاں اگر شخصی طور پر کسی کی ذات میں اخلاق سرشت ہوا ہو تو وہ شاید ہم سے اخلاق سے پیش آجاوے ورنہ قومی طور پر ہم سے ہرگز اخلاق سے پیش آنا نہیں چاہتے۔

اجتہاد میں غلطی ہو جانا نبوت کے خلاف نہیں

کسی صاحب نے لودھیانہ سے حضرت صاحب کو مخالفین کا یہ اعتراض لکھا کہ شَاتَانِ تُذْبَحَانِ کا الہام جواب شہزادہ عبداللطیف صاحب شہید کے بارے میں لکھا گیا ہے وہ قبل ازیں کسی تصنیف میں مرزا احمد بیگ اور اس کے داماد پر چسپاں ہو چکا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

اگر ہم سے اجتہاد میں غلطی ہو جاوے تو حرج کیا ہے؟ اجتہاد اَور شئے ہے اور تفہیم الٰہی اَور شئے۔ اگر ہم نے ایک معنی اپنی رائے اور فکر سے کر دیئے تو آخر اپنے وقت پر خدا تعالیٰ نے اصل اور حقیقی معنے بتلا دیئے۔ اس الہام میں یہ الفاظ بھی لکھے ہیں عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ کیا احمد بیگ جیسے منکرین کی زندگی ہماری محبوبات سے تھی یا مکروہات سے؟ اگر ہماری کوئی غلطی ہو تو اس میں تنقیح طلب امر یہ ہے کہ آیا ایسی غلطیاں انبیاء سے ہوتی رہیں کہ نہیں جیسے کہ خواب میں ابوجہل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انگور کا

خوشہ دیا تو آپ نے اس کے یہ معنے سمجھے کہ ابوجہل کسی وقت مسلمان ہو جاوے گا لیکن وہ تو مسلمان نہ ہوا۔ آخر عکرمہ اس کا بیٹا جب مسلمان ہوا تو خواب کے معنے پورے طور پر سمجھ میں آ گئے۔

سلسلہ کی صداقت

ایک مفتری کی زندگی حُباب کی طرح ہوتی ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں سچائی کی خوشبو ہے کہ نہ واعظ ہیں (نہ کانفرنسیں جو مختلف مقاموں پر ہوتی ہیں) نہ لیکچرار ہیں۔ لیکن ہماری صداقت خود بخود لوگوں کے دلوں میں پڑتی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے بہتیرا واویلا کیا اور روکتے رہے اور اب بھی کرتے اور روکتے ہیں لیکن پھر بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکے۔

اب باریک نظر سے غور سے دیکھو تو ہمارا سلسلہ دن بہ دن ترقی کر رہا ہے اور یہی نشانی ہے اس بات کی کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہمارے مخالف آج تک کب کے کامیاب ہو جاتے۔ ہم یہاں چپ چاپ بیٹھے ہیں کسی تدبیر اور ایسی طاقت سے کام نہیں لیتے کہ اثر انداز ہو۔ نہ دورے لگا رہے نہ کچھ۔ مگر تاہم ایک حرکت شروع ہے۔ روز جو ڈاک آتی ہے شاذ و نادر ہی کوئی دن ایسا ہو تو ہو ورنہ ہر روز بلا ناغہ بیعت کے خطوط آتے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں چڑھتا کہ اس میں کوئی نہ کوئی بیعت کے لیے تیاری نہ کرتا ہو۔

تین قسم کے لوگ

فرمایا کہ

اس وقت تین قسم کے لوگ ہیں :۔

ایک وہ جو بغض و حسد میں جلے ہوئے ہیں اور ضد اور تعصب سے مخالفت پر آمادہ ہیں۔ ان کی تعداد تو بہت ہی کم ہے۔

دوسرے وہ جو اس طرف رجوع کرتے ہیں ان کی تعداد تو ترقی پر ہے۔

تیسرے وہ جو خاموش ہیں نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔ ان کی تعداد کثیر ہے وہ مُلّاؤں کے زیر اثر نہیں ہیں اور نہ ان کے ساتھ مل کر سبّ و شتم کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ہماری مد میں ہیں۔

فرقۂ معاندین کی افادیت

یہ فرقہ جو معاندین کا ہے اگر نہ ہوتا تو چُپ رہنے والے اہل میں کوئی شئے نہیں ہیں انہیں کی وجہ سے تحریک ہوتی ہے وہ شور ڈال ڈال کر ان لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں چونکہ آسمانی تائید نہیں ہوتی اس لیے تناقض ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کچھ فرماتا ہے اور یہ کچھ کہتے ہیں۔ قال کچھ ہے اور حال کچھ ہے۔ آخر شور شرابا سُنکر بعض کو تحریک ہوتی ہے کہ دیکھیں تو سہی ہے کیا۔ پھر جب وہ تحقیق کرتے ہیں تو حق ہماری طرف ہوتا

ہے آخر اُن کو ماننا پڑتا ہے۔

معاندین ہم پر کیا کیا الزام لگاتے ہیں۔کہیں کہتے ہیں کہ یہ پیغمبروں کو گالیاں دیتے ہیں۔کہیں کہتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ادا نہیں کرتے۔ آخر کار تنقید پسند طبائع ان باتوں سے فائدہ اُٹھا کر ہماری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس جماعتِ معاندین کے ہونے سے ہمارا برسوں کا کام دنوں میں ہو رہا ہے۔لوگ آ گئے ہی منتظر ہیں۔ وقت خود شہادت دے رہا ہے اور اُن کی آنکھیں اس طرف لگی ہوئی ہیں کہ آنے والا آوے۔جب یہ معاندین ایک مفتری کے رنگ میں ہمیں پیش کرتے ہیں تو تحقیق کرتے کرتے خود حق پا لیتے ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۱۶؍فروری ۱۹۰۴ء)

نیز (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍فروری ۱۹۰۴ء)

۷؍فروری ۱۹۰۴ء

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب لاہور سے تشریف لائے تھے۔حضرت اقدس نے باہر تشریف لاتے ہی ڈاکٹر صاحب سے اپنی ناسازیٔ طبیعت کا ذکر فرمایا[1] اور اسی سلسلہ میں فرمایا:۔

عوارض میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت

انسان کا اصل طبیب اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے اس کو بنایا ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ہماری کمزوری کا سِر یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کیا ہوا تھا کہ اس وقت جہاد کے خیالات کو دُور کیا جاوے اور ہم کو اس سے الگ رکھنا تھا۔اس لیے اس نے عوارض اور کمزوری کے ساتھ بھیجا اور یہ بھی کہ اپنی کسی کارروائی پر گھمنڈ نہ ہو بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ ہی کے فضل کے خواستگار رہیں۔

نزول کے لفظ میں بھی یہی سِر ہے گویا آسمان سے اُترا ہے یعنی سب کام خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں۔اس میں انسانی دخل نہیں ہے اور جب انسانی ارادوں اور منصوبوں سے الگ ہوئے تو وہ سب امورِ خارقِ عادت ٹھہرے۔

عام طور پر بھی کہا کرتے ہیں کہ خدا اُتر کر لڑا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ ہمارے مخالفوں نے سب باتوں

---

[1] البدر میں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کچھ ادویہ ان کے متعلق عرض کیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۴ مورخہ ۱۶؍فروری ۱۹۰۴ء)

کو جسمانی بنا لیا ہے۔ ادھر یہ مان لیا ہے کہ دو زرد چادریں پہنے ہوئے اُترے گا۔[1] معلوم نہیں ان بھگوے کپڑوں کے پہننے سے اس کی کیا غرض ہوگی۔ یہ چادریں شاید حضرت ادریس نے سی کر دی ہوں گی۔ پھر تعجب ہے کہ وہ کبھی میلی نہ ہوں گی اور نہ وہ کبھی اُن کو اُتاریں گے اور نہ وہ پھٹیں گی۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں جن کو سُنکر ہنسی آتی ہے ادھر یہ لباس تجویز کیا اور خدمت یہ تجویز کی کہ وہ جنگلوں میں خنزیر مارتا پھرے۔[2]

پردہ میں افراط وتفریط سے بچنے کی تلقین

حضرت اُم المومنین کی طبیعت کسی قدر ناساز رہا کرتی تھی۔ آپ نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ فرمایا کہ اگر وہ ذرا باغ میں چلی جایا کریں تو کچھ حرج تو نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ

دراصل مَیں تو اس لحاظ سے کہ معصیت[3] نہ ہو کبھی کبھی گھر کے آدمیوں کو اس لحاظ سے کہ شرعاً جائز ہے اور

---

[1] البدر میں ہے:۔
"یہ لوگ ظاہر پر حمل کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء نہیں ہے یہ منتظر ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے آویں اور دو زرد چادریں اوڑھی ہوئی ہوں ایک اُوپر اور ایک نیچے۔ لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ آیا وہ چادریں آسمان پر رنگی جاویں گی یا یہاں سے ہی فرشتے لیکر آسمان پر پہنچاویں گے اور وہ اوڑھ کر نیچے اُتریں گے۔ ان چادروں سے مراد امراض ہیں اور یہی دونو امراض ہمیں لگے ہوئے ہیں۔ نیچے کی چادر سے مراد پیشاب کی بیماری ہے اور اُوپر سے مراد سَر کی بیماری ہے۔ ان دونوں میں مَیں ہمیشہ مبتلا رہتا ہوں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۲)

[2] البدر میں ہے:۔"ان میں ضدین کو جمع کیا ہے ادھر بھگوے کپڑے پہناتے ہیں ادھر ہاتھ میں نیزہ۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۲)

[3] البدر میں ہے:۔ عورتوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے جب موسم متعفّن ہوتا ہے تو ان کو اسی چار دیواری کے حبس میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ لوگ اگرچہ ملامت کرتے ہیں اور بُرا جانتے ہیں لیکن جبکہ ایک امر خدا تعالیٰ کی رضا کے برخلاف نہیں ہے تو ہمیں اس کے بجالانے میں کیا تامل ہے۔ جبکہ خدا تعالیٰ نے مرد و عورت میں مساوات رکھی ہے، تو اسی خیال سے کہ کہیں ان کو حبس میں رکھنا معصیت کا موجب نہ ہوئیں گا ہے گا ہے اپنے گھر سے چند دوسری عورتوں کے ساتھ باغ میں سیر کے لیے لے جایا کرتا تھا اور اب بھی ارادہ ہے کہ لے جایا کروں۔
یورپ کے اعتراض پردہ پر بیحیائی کے ہیں اور اُن میں تفریط ہے اور مسلمانوں میں افراط ہے کہ گھروں کو عورتوں کے لیے بالکل حبس بنا دیا ہے۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حضرت عائشہؓ کو باہر اپنے ساتھ لیجایا کرتے تھے۔ جنگوں میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے جو پردہ کہ سمجھا گیا ہے وہ غلط ہے۔ قرآن شریف نے جو پردہ بتلایا ہے وہ ٹھیک ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۶ مورخہ ۱۶ / فروری ۱۹۰۴ء)

اس پر کوئی اعتراض نہیں رعایتِ پردہ کے ساتھ باغ میں لے جایا کرتا تھا اور مَیں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتا۔ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ بہار کی ہوا کھاؤ۔ گھر کی چار دیواری کے اندر ہر وقت بند رہنے سے بعض اوقات کئی قسم کے امراض حملہ کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضؓ کو لیجایا کرتے تھے جنگوں میں حضرت عائشہ ساتھ ہوتی تھیں۔

پردہ کے متعلق بڑی افراط تفریط ہوئی ہے۔ یورپ والوں نے تفریط کی ہے اور اب ان کی تقلید سے بعض نیچری بھی اسی طرح چاہتے ہیں حالانکہ اس بے پردگی نے یورپ میں فسق و فجور کا دریا بہا دیا ہے اور اس کے بالمقابل بعض مسلمان افراط کرتے ہیں کہ کبھی عورت گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں۔ حالانکہ ریل پر سفر کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ غرض ہم دونو قسم کے لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو افراط اور تفریط کر رہے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۵ مورخہ ۱۷؍فروری ۱۹۰۴ء)

۸؍فروری ۱۹۰۴ء

(صبح کی سیر)

حسبِ معمول حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سیر کے لیے تشریف لائے۔ سلسلہ کلام مقدمات کے متعلق شروع ہوا۔ اور چند منٹ کے بعد سلسلہ کلام کا رُخ بدل گیا۔ جس کو ہم اپنے الفاظ اور طرز پر مرتب کرکے لکھتے ہیں:۔

آخری فتح دُعا سے ہوگی

مَیں دیکھتا ہوں کہ یہ زمانہ[1] اس قسم کا آگیا ہے کہ انصاف اور دیانت سے کام نہیں لیا جاتا اور بہت ہی تھوڑے لوگ ہیں جن کے واسطے دلائل مفید ہوسکتے ہیں ورنہ دلائل کی پرواہ ہی نہیں کی جاتی۔ اور قلم کام نہیں دیتا۔ ہم ایک کتاب یا رسالہ لکھتے ہیں۔ مخالف اس کے جواب میں لکھنے کو تیار ہوجاتے ہیں[2]۔ اس لیے مَیں سمجھتا ہوں کہ دُعا سے آخری فتح

۱؎ البدر میں ہے:۔ "زمانہ کی حالت آپ نے بتلائی کہ جس کو دیکھو رُو بدنیا ہے دین کی فکر اور اس کیلئے سوز و گداز ہرگز نہیں۔ دُنیا کے کیڑے بنے ہوئے ہیں۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۷ ص۵)

۲؎ البدر میں یُوں لکھا ہے:۔ "عیسویت کے مہلک فتنہ کی نسبت آپ نے فرمایا کہ بہت غور اور فکر کے بعد مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اب صرف قلموں اور کاغذوں کا ہی کام نہیں ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوگی اور انبیاء علیہم السلام کا یہی طرز رہا ہے کہ جب دلائل اور حجج کام نہیں دیتے تو ان کا آخری حربہ دُعا ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا وَ اسۡتَفۡتَحُوۡا وَ خَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ۔ (سورۃ ابراھیم: ۱۶) یعنی جب ایسا وقت آجاتا ہے کہ انبیاء و رُسل کی بات لوگ نہیں مانتے تو پھر دُعا کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے مخالف متکبر و سرکش آخر نامراد اور ناکام ہو جاتے ہیں۔

ایسا ہی مسیح موعود کے متعلق جو یہ آیا ہے وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَجَمَعۡنٰہُمۡ جَمۡعًا (سورۃ الکھف: ۱۰۰) اس سے بھی مسیح موعود کی دُعاؤں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ نزول از آسمان کے یہی معنے ہیں کہ جب کوئی امر آسمان سے پیدا ہوتا ہے تو کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اُسے رد نہیں کر سکتا۔ آخری زمانہ میں شیطان کی ذرّیت بہت جمع ہو جائے گی کیونکہ وہ شیطان کا آخری جنگ ہے مگر مسیح موعود کی دُعائیں اس کو ہلاک کر دیں گی۔

نوحؑ کے زمانہ سے مناسبت

اسی طرح نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب حضرت نوح تبلیغ کرتے کرتے تھک گئے تو آخر انہوں نے دُعا کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طوفان آیا جس نے شریروں کو ہلاک کر دیا اور اس طرح پر فیصلہ ہو گیا۔ آخر ان کی کشتی ایک پہاڑ پر جا ٹھہری جس کو اب اراراٹ کہتے ہیں۔ اراراٹ کی اصل یہ ہے۔ اَرَا رَات یعنی میں پہاڑ کی چوٹی کو دیکھتا ہوں[ل]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کہ وہ اس فتنہ کو فرو کر سکے۔ کتابیں ہم نے لکھیں تو اس کے مقابل پر انہوں نے بھی لکھ دیں۔ لوگ اپنے اپنے نفس کی فکر میں اس قدر مصروف ہیں کہ ان کو مقابلہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی اور جب انہوں نے مقابلہ ہی نہ کیا تو پھر حق کیسے کھلے۔ اس لیے اب میرا ارادہ ہے کہ ایک لمبا سلسلہ دُعا اور انقطاع کا شروع کیا جاوے نرے وعظ اور تبلیغ سے کیا ہوتا ہے۔ انبیاء بھی جب وعظ اور تبلیغ سے تھک گئے اور دیکھا کہ ابھی فتنہ برقرار ہے تو پھر انہوں نے دُعا کی طرف توجہ کی تاکہ توجہ باطنی سے فتنہ کو پاش پاش کیا جاوے جیسے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَ اسۡتَفۡتَحُوۡا وَ خَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ (سورۃ ابراھیم: ۱۶) یعنی جب رسولوں نے دیکھا کہ وعظ اور پند سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو انہوں نے ہر ایک بات سے کنارہ کش ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور اس سے فیصلہ چاہا تو پھر فیصلہ ہو گیا۔"

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۵ مورخہ ۱۶ ر فروری ۱۹۰۴ء)

ل البدر میں ہے:۔ "راٹ عبرانی زبان میں پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور اَرَیٰ بمعنے میں نے دیکھ لیا۔ نوحؑ نے جب خشکی کی تلاش میں چاروں طرف نظر ماری اور پانی ہی پانی نظر آیا تو چونکہ کچھ پانی اُتر چلا تھا اس لیے جُودی پہاڑ کی چوٹی اُن کو نظر آئی۔ اور اسی وجہ سے اس کا نام (ارارت پڑ گیا"

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۵ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ء)

انہوں نے ایک پہاڑ کا سرا دیکھ کر کہا تھا اور اب اسی نام سے یہ مشہور ہوگیا اور بگڑ کر ارارات بن گیا۔ یہ زمانہ بھی نوح علیہ السلام کے زمانہ سے مشابہ ہے خدا تعالیٰ نے میرا نام بھی نوح رکھا ہے اور وہی الہام جو کشتی کا نوح کو ہوا تھا یہاں بھی ہوا ہے۔ اسی طرح پر اب خدا تعالیٰ نے فیصلہ کرنا چاہا ہے اور حقیقت میں اگر ایسا نہ ہوتا تو ساری دنیا دہریہ ہو جاتی اقبال اور کثرت نے دُنیا کو اندھا کر دیا ہے۔

عیسائی مذہب کا خاتمہ

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ جو کہا گیا ہے بالکل سچ ہے انسان جب سلطنت اور حکومت کو دیکھتا ہے تو اس کے خوش کرنے کے لیے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے واسطے وہی رنگ اختیار کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس وقت عیسائیوں کی کثرت، ان کی قومی ثروت اور اقبال نے لوگوں کو خیرہ کر دیا ہے اور ان وجوہات سے بہت سے لوگوں کو ادھر توجہ ہو گئی ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس مذہب کا خاتمہ ہو جاوے اور اس کے لیے دُعا کی بہت ضرورت ہے۔ عیسائی[ل] خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ انکے مذہب کو ہلاک کر دے گا۔

پادریوں کی نظر میں ہماری جماعت

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ پادری جس قدر ہماری جماعت کو بُرا سمجھتے ہیں اور اس سے دشمنی کرتے ہیں وہ دوسرے مسلمانوں کو اس قدر بُرا نہیں سمجھتے جہاں کہیں ہمارا ذکر ہو گالیاں دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی فطرت خود تسلیم کرتی ہے کہ یہ سلسلہ ان کو ہلاک کر دینے والا ہے جیسے بلی کا منہ جب چوہا دیکھتا ہے حالانکہ اس نے پہلے کبھی اس پر حملہ نہ بھی کیا ہو فوراً ہی سمجھ جاتا ہے کہ یہ میری دشمن ہے۔ بکری نے کبھی شیر کو دیکھا بھی نہ ہو، لیکن جونہی اسے نظر آجاوے وہ گھبرا کر کھانا پینا چھوڑ دیگی اسی طرح پر عیسائی ہمارے سلسلہ کے کسی آدمی کو دیکھ کر ہی اس سے بیزار ہو جاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن سے کوئی امید ان کو نہیں ہے۔ ان کی فطرت ہی ان کو بتا دیتی ہے۔

فَطَرَ کے معنے پھاڑنے کے ہیں اور فطرت سے یہ مراد ہے کہ انسان خاص طور پر پھاڑا گیا ہے جب آسمان سے قوت آتی ہے تو نیک قوتیں پھٹنی شروع کر دیتی ہیں۔ براہینِ احمدیہ میں جو یہ الہام ہے بڑا ہی پُرزور اور مبشر ہے۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَتْرُکَکَ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ۔ یعنی خدا ایسا نہیں ہے

ل البدر میں ہے:۔ ان لوگوں نے تاڑ لیا ہے کہ عیسائی مذہب کے دشمن اگر ہیں تو ہم ہی ہیں اور کوئی فرقہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۵ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ء)

جو تجھے چھوڑ دے جب تک پاک اور پلید میں فرق کر کے نہ دکھا دے۔ یہ الہام بڑا ہی مبشر ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ عظیم الشان فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔

کسرِ صلیب کیلئے دُعا کی اہمیت

اگرچہ یہ سچی بات ہے کہ جب سے عیسائیوں کا قدم آیا ہے مسلمانوں نے اپنی طرف سے کمی نہیں کی اور کسی نہ کسی حد تک ان کا مقابلہ کرتے رہے ہیں اور کتابیں اور رسالے لکھتے رہے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی ان کی جماعت بڑھتی ہی گئی یہانتک کہ اب شاید تیس لاکھ کے قریب مرتد ہو چکے ہیں اس لیے میں یقیناً سمجھتا ہوں کہ کسرِ صلیب جانکاہ دعاؤں پر موقوف ہے۔ دُعا میں ایسی قوت ہے کہ جیسے آسمان صاف ہو اور لوگ تضرع وابتہال کے ساتھ دُعا کریں تو آسمان پر بدلیاں سی نمودار ہو جاتی ہیں اور بارش ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح پر مَیں خوب جانتا ہوں کہ دُعا اس باطل کو ہلاک کر دے گی اور لوگوں کو تو کوئی غرض نہیں ہے[1] کہ وہ دین کے لیے دُعا کریں مگر میرے نزدیک بڑا چارہ دُعا ہی ہے اور یہ بڑا خطرناک جنگ ہے جس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے ؎

لَنِعْمَ مَاقِیْلَ۔ اندریں وقت مصیبت چارہ ہائے بیکساں
جز دُعائے بامداد و گریۂ اسحار نیست

پھر ان دُعاؤں کے لیے گوشہ نشینی کی بڑی ضرورت ہے۔ کئی دفعہ یہ بھی خیال آیا ہے کہ باغ میں کوئی الگ مکان دُعاؤں کے واسطے بنالیں۔

غرض یہ تو مَیں نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ محض قلم سے کچھ نہیں بنتا[2]۔ اغراضِ نفسانی نے انسان کو دبایا ہوا ہے بہت سے لوگ نوکری کی غرض سے عیسائی ہو رہے ہیں اور بعض اور نفسانی غرض کی وجہ سے اور بعض لوگ گورنمنٹ کے تعلقات کی وجہ سے۔

آسائش کی حقیقی راہ

اس طریق پر سچی راحت اور آسائش نہیں مل سکتی۔ مومن کو حقیقی راحت اور آسائش کے لیے رُو بخدا ہونا چاہیئے۔ جو مومن آسائش کی زندگی

---

[1] البدر میں ہے:۔ "ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس قسم کی دُعا سے مطلب ہی کیا ہے کہ اس فتنہ کے بطلان اور استیصال کے لیے دُعائیں کریں ان کی تو کل دُعائیں اپنے نفس کی ضروریات تک محدود ہیں حالانکہ اس زمانہ میں دُعا ایک بڑا جنگ ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۵ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ء)

[2] البدر سے:۔ "کیونکہ پادریوں کے پاس روپیہ بہت ہے اور لوگوں کو اغراض نے دبا رکھا ہے کسی نے نوکری کے لیے کسی نے حاجت کے لیے اپنے آپ کو ان کا دست نگر بنا رکھا ہے اس لیے دلائل وغیرہ کا جو اثر دلوں پر ہونا چاہیئے وہ نہیں ہوتا۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۷ صفحہ ۵)

چاہتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کریں اور اس کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ کریں یقیناً یاد رکھیں کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں پر بھروسہ کرنے والے کو سچا خیر خواہ نہ پائیں گے۔

مسیح اول اور مسیح آخر کی دُعا

مجھے خیال آتا ہے کہ حضرت مسیح نے جب دیکھا کہ صلیب کا واقعہ ٹلنے والا نہیں تو اُن کو اس امر کا بہت ہی خیال ہوا کہ یہ موت لعنتی موت ہوگی پس اس موت سے بچنے کے لیے انہوں نے بڑی دُعا کی۔ دلِ بریاں اور چشم گریاں سے انہوں نے دُعا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آخر وہ دُعا قبول ہوگئی چنانچہ لکھا ہے فَسُمِعَ لِتَقْوٰہُ ہم کہتے ہیں کہ جیسے پہلے مسیح کی دُعا سُنی گئی ہماری بھی سُنی جاوے گی مگر ہماری دُعا اور مسیح کی دُعا میں فرق ہے۔ اس کی دُعا اپنی موت سے بچنے کے لیے تھی اور ہماری دُعا دنیا کو موت سے بچانے کے لیے۔ ہماری غرض اس دُعا سے اعلائے کلمۃ الاسلام ہے۔ احادیث میں بھی آیا ہے کہ آخر مسیح ہی کی دعا سے فیصلہ ہوگا[1]

دُعا کیساتھ دلائل کی اہمیت

اگرچہ فیصلہ دُعاؤں سے ہی ہونیوالا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ دلائل کو چھوڑ دیا جاوے۔ نہیں دلائل کا سلسلہ بھی برابر رکھنا چاہیئے اور قلم کو روکنا نہیں چاہیئے۔ نبیوں کو خدا تعالیٰ نے اسی لیے اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ کہا ہے کیونکہ وہ ہاتھوں سے کام لیتے ہیں۔ پس چاہیئے کہ تمہارے ہاتھ اور قلم نہ رُکیں اس سے ثواب ہوتا ہے[2] جہانتک بیان اور لسان سے کام ہے سکو کام لیے جاؤ اور جو جو باتیں تائید دین کے لیے سمجھ میں آتی جاویں انہیں پیش کیئے جاؤ وہ کسی نہ کسی کو فائدہ پہنچائیں گی۔

میری غرض اور نیت بھی یہی ہے کہ جب وہ وقت آوے تو اپنے وقت کا ایک حصہ اس کام کے لیے بھی رکھا جاوے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب تبتّلِ تام اور انقطاعِ کلی سے دُعا کرے تو ایسے ایسے خارقِ عادت اور سماوی امور کھلتے ہیں اور سُوجھتے ہیں کہ وہ دُنیا پر حجت ہوجاتے ہیں۔ اس لیے اس دعا کے وقت جو کچھ خدا تعالیٰ ان کے استیصال کے وقت دل میں ڈالے وہ سب پیش کیا جاوے۔

درازئ عمر کا نسخہ

فرمایا کہ:-
کھانسی جب شدت سے ہوتی ہے تو بعض وقت دم رُکنے لگتا ہے اور

---

[1] البدر میں ہے:- "حدیثوں میں جو یہ مذکور ہے کہ جب کسی کو دجال کے مقابلہ کی طاقت نہ رہے گی اور ہر جگہ اس کا تسلط ہوگا تو آخر کار مسیح دعا کریگا اور اس دُعا سے وہ ہلاک ہوگا۔"

(البدر جلد ۳ نمبر ۸ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء)

[2] البدر سے:- "ہاں یہ ضرور ہے کہ تدابیر پر بھروسہ نہ کرے۔ نظر خدا پر رکھے۔" (البدر حوالہ مذکورہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان کندن کی سی حالت ہے۔ چنانچہ اس شدت کھانسی میں مجھے اللہ تعالیٰ کی غناءِ ذاتی کا خیال گذرا اور مَیں سمجھتا تھا کہ اب گویا موت کا وقت قریب ہے۔ اس وقت الہام ہوا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔

(سورۃ النصر: ۲، ۳)

اس کے یہ معنے سمجھائے گئے کہ ایسا خیال اس وقت غلط ہے بلکہ اس وقت جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کا نظارہ دیکھ لو۔ اس وقت تو کوچ ضروری ہوجاتا ہے۔ سب کے لیے یہی اُصول ہے کہ جب وہ کام جس کے لیے اس کو بھیجا جاتا ہے۔ ختم ہوجاتا ہے تو پھر وہ رُخصت ہوتا ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

تو سچ ہے مگر سب آدمی اپنے اپنے کام اور غرض سے جس کے لیے وہ آئے ہیں واقف نہیں ہوتے۔ بعض کا اتنا ہی کام ہوتا ہے کہ چوپایوں کی طرح کھا پی لینا وہ سمجھتے ہیں کہ اتنا گوشت کھانا ہے۔ اس قدر کپڑا پہننا ہے وغیرہ اور کسی بات کی ان کو پروا اور فکر ہی نہیں ہوتی۔ ایسے آدمی جب پکڑے جاتے ہیں تو پھر یک دفعہ ہی انکا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ لیکن جو لوگ خدمتِ دین میں مصروف ہوں اُن کے ساتھ نرمی کی جاتی ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک وہ اس کام اور خدمت کو پورا نہ کریں۔

انسان اگر چاہتا ہے کہ اپنی عمر بڑھائے اور لمبی عمر پائے تو اُس کو چاہیئے کہ جہانتک ہو سکے خالص دین کے واسطے اپنی عمر کو وقف کرے۔ یہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے دھوکا نہیں چلتا جو اللہ تعالیٰ کو دغا دیتا ہے وہ یاد رکھے کہ اپنے نفس کو دھوکا دیتا ہے وہ اس کی پاداش میں ہلاک ہوجاوے گا۔

پس عمر بڑھانے کا اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہے کہ انسان خلوص اور وفاداری کیساتھ اعلاء کلمۃ الاسلام میں مصروف ہوجاوے اور خدمتِ دین میں لگ جاوے اور آج کل یہ نسخہ بہت ہی کارگر ہے کیونکہ دین کو آج ایسے مخلص خادموں کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر عمر کا کوئی ذمہ دار نہیں ہے یونہی چلی جاتی ہے۔

ایک صحابی کا ذکر ہے کہ اس کے ایک تیر لگا اور اس سے خون جاری ہوگیا۔ اس نے دُعا کی کہ اے اللہ عمر کی تو مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ البتہ مَیں یہود کا انتقام دیکھنا چاہتا تھا جنھوں نے اس قدر اذیتیں اور تکلیفیں دی ہیں۔ لکھا ہے کہ اسی وقت اس کا خون بند ہوگیا جب تک کہ وہ یہود ہلاک نہ ہوئے اور جب وہ ہلاک ہوگئے تو خون جاری ہوگیا اور اس کا انتقال ہوگیا[1]

---

[1] البدر میں یہ واقعہ یوں درج ہے :۔

ایک صحابی کو جنگ میں تیر لگا۔ وہ اپنی جان سے مایوس ہوئے۔ اسی وقت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حقیقت میں سب امراض اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی مرض اس کے حکم کے بغیر پیش دستی نہیں کرسکتا۔ اس لیے ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرے۔ یہی اقبال کی راہ ہے مگر افسوس ہے جن راہوں سے اقبال آتا ہے ان کو انسان بدظنی کی نظر سے دیکھتا ہے اور نحوست کی راہوں کو پسند کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر گر جاتا ہے۔" (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ صفحہ ۵، ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء)

---

۹ فروری ۱۹۰۴ء

(قبل از عشاء)

صاحبزادہ عبداللطیفؓ کا نمونہ

عشاء سے پیشتر آپ نے مجلس فرمائی اور فرمایا:۔ کمال کیسا تھ عیوب جمع نہیں ہوسکتے۔ اس زمانہ میں ایک عبداللطیف کا ہی نمونہ دیکھ لو کہ جس حالت میں اس نے جان جیسی عجیب شئے سے دریغ نہ کیا تو اب جان کے بعد اس پر کیا نکتہ چینی کرسکتے ہیں۔ خواہ کوئی ہزار پردہ ڈالے مگر ان کی استقامت پر شک نہیں ہوسکتا۔ یہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

خدا سے دُعا مانگی اور کہا کہ مجھے عمر کا تو فکر نہیں ہے تھوڑی ہو یا بہت۔ مگر جن یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اُن سے انتقام لوں۔ وہ اسی وقت اچھے ہوگئے اور پھر برابر زندہ رہے حتّٰی کہ اُن یہودیوں سے انتقام لیا۔ خدا کی قدرت جب انتقام لے چکے تو اسی مقام سے خون جاری ہوگیا اور وہ فوت ہوگئے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۸ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء)

ل البدر میں مزید لکھا ہے:۔

اس زمانہ میں مومن کا فرض

میرا مذہب یہ ہے کہ اگرچہ بہت لوگوں نے اس باطل کی تردید میں آزادانہ مضامین بھی لکھے ہیں مگر ابھی تک یہ حالت ہے جیسے سفید بیل کی کھال پر کوئی بال سیاہ ہو کیونکہ قومی تعصب نے گھر کیا ہوا ہے۔ اگر کوئی نیک بخت انگریز ہو اور وہ اسلامی شعار کا قائل ہو تو اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرسکتا اور یہ فتنہ اس قدر بڑھ گیا ہوا ہے کہ اگر کل درخت قلمیں بن جاویں تو بھی اُسے کفایت نہیں کرسکتیں۔ دُنیا کا وہ حصہ جو کہ وحشیانہ زندگی بسر کرتا ہے چھوڑ کر باقی میں نصف کے قریب عیسائی ہیں۔ اب اس وقت ہر ایک مومن کا کام یہ چاہیئے کہ جب تک دم میں دم ہے اس باطل مذہب کا مقابلہ کرتا رہے اور اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہاتھ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔" (البدر حوالہ مذکور)

بچوں، مال وجاہ کی پروا نہ کرنا اور یہاں سے جاکر اُن میں سے کسی سے نہ ملنا ایسی استقامت ہے کہ سُن کر لرزہ آتا ہے۔ دنیا میں بھی اگر ایک نوکر خدمت کرے اور حقِ وفا کا ادا کرے تو جو محبت اس سے ہوگی وہ دوسرے سے کیا ہوسکتی ہے جو صرف اس بات پر ناز کرتا ہے کہ میں نے کوئی اچک پنا نہیں کیا حالانکہ اگر کرتا تو سزا پاتا۔ اتنی بات سے حقوق قائم نہیں ہوسکتے۔ حقوق تو صرف صدق و وفا سے قائم ہوسکتے ہیں۔ جیسے اِبْرَاهِيْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (سورۃ النجم: ۳۸)
(البدر جلد ۳ نمبر ۸ صفحہ ۷ مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۰۴ء)

۱۱ر فروری ۱۹۰۴ء

(بوقت شام)

حضرت سید احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کا تذکرہ

فرمایا: سید احمد صاحب سرہندی کا ایک خط ہے جس میں انہوں نے بتلایا ہے کہ اس قدر اَحْمَدْ مجھ سے پیشتر گذر چکے ہیں اور ایک آخری اَحْمَدْ ہے۔ پھر آپ نے اس کی ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے اور خود اس کے زمانہ سے پیشتر ہونے پر افسوس کیا ہے اور لکھا ہے یَا اَسَفَا عَلٰی لِقَائِہٖ۔

پھر فرمایا کہ

ان کا ایک قول میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کرامات اس وقت صادر ہوتی ہیں جب کہ سالک الی اللہ کا صعود تو اچھا ہو مگر نزول اچھا نہ ہو اور اگر نزول بھی اچھا ہو تو پھر کرامات صادر نہیں ہوتیں۔ گویا کرامات کے صدور کا وہ ادنیٰ درجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ جس قدر انبیاء آئے ہیں اُن سے بارش کی طرح کرامات صادر ہوتی رہی ہیں۔ اُن کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پردہ پوشی کرتے ہیں اور خود ان کو اس کوچہ میں دخل نہیں تھا۔

فتوح الغیب کو اگر دیکھا جاوے تو بہت سیدھے سادے رنگ میں سلوک اور توحید کی راہ بتلاتی ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ قائل ہیں کہ جو شخص ایک خاص تعلق اور پیوند خدا تعالیٰ سے کرتا ہے اس سے ضرور مکالمہ الٰہی ہوتا ہے۔ یہ کتاب ایک اور رنگ میں ان کے اپنے سوانح معلوم ہوتے ہیں جیسے جیسے خدا تعالیٰ کا فضل ان پر ہوتا رہا اور وہ ترقی مراتب کرتے رہے ویسے ویسے بیان کرتے رہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد رضی اللہ عنہ کا نیک بچپن

صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحب اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے مسجد میں آگئے اور اپنے ابا جان (مسیح موعود علیہ السلام) کے پاس ہو بیٹھے اور اپنے لڑکپن کے باعث کسی بات کے یاد آجانے پر آپ دبی آواز سے کھل کھلا کر ہنس پڑتے تھے اس پر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

مسجد میں ہنسنا نہیں چاہیئے

جب دیکھا کہ ہنسی ضبط نہیں ہوتی تو اپنے باپ کی نصیحت پر یوں عمل کیا کہ صاحبزادہ صاحب اسی وقت اُٹھ کر چلے گئے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۸ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۰۴ء)

۱۵ر فروری ۱۹۰۴ء

کوئی آٹھ بجے رات کا وقت تھا کہ بمقام گورداسپور حضرت اقدس کے کمرہ میں چند احباب بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روئے سخن جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب احمدی انچارج پلیگ ڈیوٹی گورداسپور کی طرف تھا کہ تقویٰ کے مضمون پر حضرت اقدس نے ایک تقریر فرمائی۔ وہ تقریر اس وقت لکھی تو نہیں گئی مگر جو کچھ نوٹ اور یاد داشت زبانی یاد رہ سکے ان کو عمل درآمد کیلئے درج اخبار کیا جاتا ہے۔

توکل انسان کو چاہیئے کہ تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دیوے اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھے تو پھر اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ انسان تدبیر کو ہاتھ سے چھوڑ دے بلکہ یہ معنے ہیں کہ تدبیر پوری کر کے پھر انجام کو خدا تعالیٰ پر چھوڑے اس کا نام توکل ہے۔ اگر وہ تدبیر نہیں کرتا اور صرف توکل کرتا ہے تو اس کا توکل پھوکا (جس کے اندر کچھ نہ ہو) ہوگا۔ اور اگر نری تدبیر کر کے اس پر بھروسہ کرتا ہے اور خدا تعالیٰ پر توکل نہیں ہے تو وہ تدبیر بھی پھوکی (جس کے اندر کچھ نہ ہو) ہوگی۔ ایک شخص اونٹ پر سوار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے دیکھا۔ تعظیم کے لیے نیچے اُترا اور ارادہ کیا کہ توکل کرے اور تدبیر نہ کرے چنانچہ اُس نے اونٹ کا گھٹنا نہ باندھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آیا تو دیکھا کہ اونٹ نہیں ہے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ مَیں نے توکل کیا تھا لیکن میرا اونٹ جاتا رہا آپ نے فرمایا کہ تُو نے غلطی کی۔ پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھتا اور پھر توکل کرتا۔ تو ٹھیک ہوتا۔

تدبیر

تدبیر سے مُراد وہ ناجائز وسائل نہیں ہیں جو کہ آج کل لوگ استعمال کرتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے احکام کے موافق ہر ایک سبب اور ذریعہ کی تلاش کا نام تدبیر ہے۔ ایسے ہی انسان کو اپنے نفس کے تزکیہ کے لیے تدبیر سے کام لینا چاہیئے اور شیطان جو اس کے پیچھے ہلاک کرنے کو لگا ہے اس کو دُور کرنے کے واسطے تدابیر بھی سوچنی چاہئیں بلکہ صوفیاء نے لکھا ہے کہ کسی سے فریب کرنا اگرچہ ناجائز ہے، لیکن شیطان کے ساتھ یہ جائز ہے۔ غرضیکہ متقی بننے کے لیے دعا بھی کرو اور تدابیر بھی کرو۔ دُعا سے خدا تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے لیکن اگر انسان نے تدابیر سے کچھ تیاری نہ کی ہوئی ہو تو وہ فضل کس کام آوے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسان اپنی زمین کی کلبہ رانی تو نہ کرے نہ اسے صاف کرے نہ سہاگہ وغیرہ پھیرے صرف دُعا کرتا رہے کہ بارش ہو جاوے اور اناج تیار ملے تو اس کی دُعا کس کام آوے گی؟ دُعا اس وقت فائدہ دے گی جب وہ کلبہ رانی کر کے زمین کو تیار رکھیگا۔

عُجب اور ریا

عجب اور ریا بہت مہلک چیزیں ہیں ان سے انسان کو بچنا چاہیئے انسان ایک عمل کر کے لوگوں کی مدح کا خواہاں ہوتا ہے۔ بظاہر وہ عمل عبادت وغیرہ کی صورت میں ہوتا ہے جس سے خدا تعالیٰ راضی ہو مگر نفس کے اندر ایک خواہش پنہاں ہوتی ہے کہ فلاں فلاں لوگ مجھے اچھا کہیں اس کا نام ریا ہے اور عُجب یہ کہ انسان اپنے عمل سے اپنے آپ کو اچھا جانے کہ نفس خوش ہو ان سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہئیں کہ اعمال کا اجر اُن سے باطل ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر ڈاکٹر محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے عرض کی کہ حضور شیطان سے فریب کی کوئی مثال بیان فرمائی جاوے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی ذکر میں مثال یوں بیان فرمائی کہ

ایک مولوی ایک جگہ وعظ کر رہے تھے انہوں نے ایک دینی خدمت کے واسطے کئی ہزار روپیہ چندہ جمع کرنا تھا۔ اُن کے وعظ اور ضرورت دینی کو دیکھ کر ایک شخص اُٹھا اور دو ہزار روپیہ کی ایک تھیلی لاکر مولوی صاحب کے سامنے رکھدی۔ مولوی صاحب نے اسی وقت مجلس میں اس کے سامنے اس کی تعریف کی کہ دیکھو یہ بڑا نیک بخت انسان ہے اس نے ابھی اپنا گھر جنّت میں بنا لیا اور یہ ایسا ہے ویسا ہے جب اُس نے اپنی تعریف سُنی تو اُسی وقت گھر گیا اور جھٹ واپس آکر باآواز بلند اس نے کہا کہ مولوی صاحب اس روپے کے دینے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ اصل میں یہ مال میری والدہ کا ہے اور مَیں اس کی بے اجازت لے آیا تھا، لیکن اب وہ مطالبہ کرتی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا اچھا لے جاؤ۔ چنانچہ وہ شخص اسی وقت روپیہ اُٹھا کر لے گیا۔ یا تو لوگ اس کی تعریف کرتے تھے اور یا اسی وقت اس کی مذمت شروع کر دی کہ بڑا بیوقوف ہے۔ روپیہ لانے سے اوّل کیوں نہ ماں سے دریافت کیا۔ کسی نے کہا جھوٹا ہے۔ روپیہ دے کر افسوس ہوا تو اب یہ بہانہ بنا لیا وغیرہ وغیرہ۔

جب مولوی صاحب وعظ کرکے چلے گئے تو رات کو ڈیڑھ بجے وہ شخص وہ روپیے کر ان مولوی صاحب کے گھر گیا اور جگا کر اُن کو کہا کہ اس وقت تم نے میری تعریف کرکے سارا اجر میرا باطل کرنا چاہا۔ اس لیے میں نے شیطان کے وسوسوں سے بچنے کی یہ تدبیر کی تھی۔ اب یہ روپیہ تم لو مگر تم سے قسمیہ عہد لیتا ہوں کہ عمر بھر میرا نام کسی کے آگے نہ لینا کہ فلاں نے یہ روپیہ دیا۔ اب مولوی حیران ہوا اور کہا کہ لوگ تو ہمیشہ لعنت کرتے رہیں گے اور تم کہتے ہو کہ میرا نام نہ لینا۔ اُس نے کہا مجھے یہ لعنتیں منظور ہیں مگر ریا سے بچنا چاہتا ہوں۔

تو یہ ریا اور عُجب بڑی بیماریاں ہیں۔ ان سے بچنا چاہیئے اور بچنے کے لیے تدابیر بھی کرنی چاہئیں اور دُعا بھی کرنی چاہیئے۔

شیطان سے فریب کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے گھر کو آگ لگے تو وہ اپنے دوسرے حقے مکانات کے بچانے کے لیے ایک مکان کو خود بخود گراتا ہے۔

تدابیر انسان کو ظاہری گناہ سے بچاتی ہیں لیکن ایک کشمکش اندر قلب میں باقی رہ جاتی ہے اور دل ان مکروہات کی طرف ڈانواں ڈول ہوتا رہتا ہے اُن سے نجات پانے کے لیے دُعا کام آتی ہے کہ خدا تعالیٰ قلب پر ایک سکینت نازل فرماتا ہے۔

تقویٰ

ہر ایک کامیابی کی جڑ تقویٰ اور سچا ایمان ہے اس کے نہ ہونے سے گناہ صادر ہوتے ہیں۔ مُقدّر جو انسان کا ہے وہ اُسے مل کر رہتا ہے پھر نہیں معلوم کہ خلافِ تقویٰ امور کی ضرورت کیوں درپیش آتی ہے۔ ایک چور چوری کرکے اپنا مقدر حاصل کرنا چاہتا ہے اگر وہ چوری نہ کرتا تو بھی حلال بذریعہ سے وہ اُسے مل کر رہتا۔ اسی طرح ایک زانی زنا کرکے عورتوں کی لذات حاصل کرتا ہے۔ اگر وہ زنا نہ کرے تو جس قدر عورتوں کی لذات اُس کیلئے مقدر ہیں وہ کسی نہ کسی حلال ذرائع سے اُسے مل کر رہتیں لیکن سارا فساد ایمان کا نہ ہونا ہے۔ اگر تقویٰ پر قدم ماریں اور ایمان پر قائم رہیں تو کبھی کسی کو تکلیف نہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ سب کی حاجت روا کرتا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۷ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

---

۲۰ ؍ فروری ۱۹۰۴ء

(دربارِ شام)

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ[1]

انسان اگر اپنے نفس کی پاکیزگی اور طہارت کی فکر کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ کر گناہوں سے بچتا رہے تو

---

[1] سورۃ النور : ۲۷

تو اللہ تعالیٰ یہی نہیں کہ اس کو پاک کر دے گا بلکہ وہ اس کا مُتکفّل اور مُتوَلّی بھی ہو جائے گا[1] اور اسے خبیثات سے بچائے گا۔ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ[2] (سورۃ النور : ۲۷) کے یہی معنے ہیں۔ اندرونی معصیت، ریاکاری، عُجب، تکبر، خوشامد، خود پسندی، بدظنی اور بدکاری وغیرہ وغیرہ خباثتوں سے بچنا چاہیئے۔ اگر اپنے آپ کو ان خباثتوں سے بچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پاک و مطہّر کر دے گا۔

تقویٰ اور اسکے حصول کا طریق

مگر ضروری امر یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھ لے کہ تقویٰ کیا چیز ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ تو یہ ہے کہ باریک در باریک پلیدگی سے بچے اور اس کے حصول کا یہ طریق ہے کہ انسان ایسی کامل تدبیر کرے کہ گناہ کے کنارہ تک نہ پہنچے۔ اور پھر نری تدبیر ہی کو کافی نہ سمجھے بلکہ ایسی دُعا کرے جو اس کا حق ہے کہ گداز ہو جاوے بیٹھ کر، سجدہ میں، رکوع میں، قیام میں اور تہجد میں۔ غرض ہر حالت اور ہر وقت اسی فکر و دُعا میں لگا رہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ اور معصیت کی خباثت سے نجات بخشے۔ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے کہ انسان گناہ اور معصیت سے محفوظ اور معصوم ہو جاوے اور خدا تعالیٰ کی نظر میں راست باز اور صادق ٹھہر جاوے۔

تدبیر اور دُعا کا کامل اتحاد

لیکن یہ نعمت نہ تو نری تدبیر سے حاصل ہوتی ہے اور نہ نری دُعا سے بلکہ یہ دعا اور تدبیر دونو کے کامل اتحاد سے حاصل ہو سکتی ہے جو شخص نری دُعا ہی کرتا ہے اور تدبیر نہیں کرتا وہ شخص گناہ کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کو آزماتا ہے ایسا ہی جو نری تدبیر کرتا ہے اور دُعا نہیں کرتا وہ بھی شوخی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے استغنا ظاہر کر کے اپنی تجویز اور تدبیر اور زور بازو سے نیکی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

لیکن مومن اور سچے مسلمان کا یہ شیوہ نہیں وہ تدبیر اور دُعا دونو سے کام لیتا ہے۔ پوری تدبیر کرتا ہے اور پھر معاملہ خدا تعالیٰ پر چھوڑ کر دُعا کرتا ہے اور یہی تعلیم قرآن شریف کی پہلی ہی سورۃ میں دی گئی ہے چنانچہ فرمایا ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ[3] (الفاتحۃ : ۵) جو شخص اپنے قویٰ سے کام نہیں لیتا وہ نہ صرف

---

[1] البدر سے :۔ "اس لیے اندرونی پلیدی کا خیال رکھو کہ وہ تمہارے سارے قلب کو پلید نہ کر دیوے"۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۵ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

[2] البدر سے :۔ "بیباک ہو کر خدا تعالیٰ کے احکام کو توڑنا اور شوخی اور شرارت سے اوامر کا انکار کرنا بڑی خباثتیں ہیں جن سے بچنا نہایت ضروری ہے"۔ (حوالہ مذکور)

[3] البدر سے :۔ "جیسے کہ خدا تعالیٰ نے تعلیم دی ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ جس کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ قویٰ خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا کئے ہیں اُن سے پورا کام لے کر پھر وہ انجام کو خدا کے سپرد کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے عرض کرتا ہے کہ جہاں تک تو نے مجھے توفیق عطا کی تھی۔ اس حد تک تو مَیں نے اس سے کام لے لیا یہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے معنے ہیں اور پھر اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر خدا سے امداد چاہتا ہے کہ باقی مرحلوں کیلئے مَیں تجھ سے امداد طلب کرتا ہوں"۔ (حوالہ مذکور)

اپنے قویٰ کو ضائع کرتا اور اُن کی بے حُرمتی کرتا ہے بلکہ وہ گناہ کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ہے جو کنجروں کے ہاں جاتا ہے اور اسی بدصُحبت میں اپنا دن رات بسر کرتا ہے اور پھر دُعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے گناہ سے بچا ایسا شوخ انسان خدا تعالیٰ سے مسخری کرتا ہے اور اپنی جان پر ظلم۔ اس سے اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا اور آخر یہ خیال کر کے کہ میری دُعا سُنی نہیں گئی۔ وہ خدا سے بھی منکر ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انسان بعض اوقات تدبیر سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن تدبیر پر کلّی بھروسہ کرنا سخت نادانی اور جہالت ہے جب تک تدبیر کے ساتھ دُعا نہ ہو کچھ نہیں اور دعا کے ساتھ تدبیر نہ ہو تو کچھ فائدہ نہیں۔ جس کھڑکی کی راہ سے معصیت آتی ہے۔ پہلے ضروری ہے کہ اس کھڑکی کو بند کیا جاوے۔ پھر نفس کی کشاکش کے لیے دُعا کرتا رہے[1] اسی کے واسطے کہا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۷۰) اس میں کس قدر ہدایت تدابیر کو عمل میں لانے کے واسطے کی گئی ہے تدابیر میں بھی خدا کو نہ چھوڑے۔ دوسری طرف فرماتا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) پس اگر انسان پورے تقویٰ کا طالب ہے تو تدبیر کرے اور دعا کرے۔ دونوں کو جو بجالانے کا حق ہے۔ بجالائے۔ تو ایسی حالت میں خدا اس پر رحم کرے گا لیکن اگر ایک کرے گا اور دوسری کو چھوڑیگا تو محروم رہے گا۔

تقویٰ کے ثمرات

انسان ایسے طریق سے تقویٰ پر قائم ہوتا ہے اور تقویٰ اللہ ہر ایک عمل کی جڑ ہے جو اس سے خالی ہے وہ فاسق ہے۔ تقویٰ سے زینتِ اعمال پیدا ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب ملتا ہے اور اسی کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی بن جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (الانفال: ۳۵)[3]

---

[1] البدر سے:۔ جو ذرائع معصیت کے ہیں ان کو ترک کرنا لازمی ہے ان ذرائع سے علیحدہ ہونے کے بعد ایک کشاکشِ نفس میں رہتی ہے کہ اُسے بار بار خیال اُس بدی کے ارتکاب کا آتا ہے یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ ایک عرصہ اس میں گذار چکا ہے اس سے نجات پانے کا ذریعہ دعا ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۳)

[2] البدر سے:۔ جَاھَدُوْا فِیْنَا کے یہی معنے ہیں کہ حصولِ تقویٰ کے لیے حتی الوسع تدبیر کو کام میں لاوے اور پھر دوسری جگہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) کہہ کر بتلا دیا کہ جب تدابیر کر چکو تو پھر خدا سے دُعا مانگو وہ قبول ہوگی۔ (البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر سے:۔ ولایت کا حصہ تقویٰ ہی پر ہے۔ خدا تعالیٰ سے ترساں اور لرزاں ہو کر اگر اسے حاصل کرو گے تو کمال تک پہنچ جاؤ گے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۷ صفحہ ۷ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء)

تقویٰ حقیقت میں ایک موت ہے

کامل طور پر جب تقویٰ کا کوئی مرحلہ باقی نہ رہے تو پھر یہ اولیاء اللہ میں داخل ہو جاتا ہے اور تقویٰ حقیقت میں اپنے کامل درجہ پر ایک موت ہے کیونکہ جب نفس کی سارے پہلوؤں سے مخالفت کرے گا تو نفس مر جاوے گا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا۔ نفس[1] توسن گھوڑے کی طرح ہوتا ہے اور جو لذت تبتّل اور انقطاع میں ہوتی ہے اس سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے جب اس پر موت آجاوے گی تو چونکہ خلا محال ہے اس لیے دوسری لذات جو تبتّل اور انقطاع میں ہوتی ہیں شروع ہو جائیں گی۔ یہی وہ بات ہے جس کی ہماری ساری جماعت کو ہر وقت مشق کرنی چاہیئے[2] جیسے بچے جب تختیوں پر بار بار لکھتے ہیں تو آخر خوش نویس ہو جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا (العنکبوت: ۷۰) میں مجاہدہ سے مراد یہی مشق ہے کہ ایک طرف دُعا کرتا رہے دوسری طرف کامل تدبیر کرے۔ آخر اللہ تعالیٰ کا فضل آجاتا ہے اور نفس کا جوش و خروش دب جاتا اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے آگ پر پانی ڈال دیا جاوے۔ بہت سے انسان ہیں جو نفسِ امارہ ہی میں مبتلا ہیں۔

اپنے بھائیوں کی پردہ پوشی کرو

مَیں دیکھتا ہوں کہ جماعت میں باہم نزاعیں بھی ہو جاتی ہیں اور معمولی نزاع سے پھر ایک دوسرے کی عزت پر حملہ کرنے لگتا ہے اور اپنے بھائی سے لڑتا ہے۔ یہ بہت ہی نامناسب حرکت ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایک اگر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے تو کیا حرج ہے۔

---

[1] البدر میں ہے:۔
"نفس ظاہری لذات کا دلدادہ ہوتا ہے۔ پنہانی لذات سے یہ بالکل بے خبر ہے اسے خبردار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اول ظاہری لذات پر ایک موت وارد ہو اور پھر نفس کو پنہانی لذات کا علم ہو۔ اس وقت الٰہی لذت جو کہ جنتی زندگی کا نمونہ ہے شروع ہو گی۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۳ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "ہماری جماعت کو چاہیئے کہ نفس پر موت وارد کرنے اور حصولِ تقویٰ کے لیے وہ اول مشق کریں جیسے بچے خوش خطی سیکھتے ہیں تو اوّل اوّل ٹیڑھے حرف لکھتے ہیں لیکن آخر کار مشق کرتے کرتے خود ہی صاف اور سیدھے حروف پڑنے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کو بھی مشق کرنی چاہیئے جب خدا تعالیٰ ان کی محنت کو دیکھے گا تو خود ان پر رحم کرے گا۔" (البدر حوالہ مذکور)

بعض آدمی ذرا ذرا سی بات پر دوسرے کی ذلت کا اقرار کئے بغیر پیچھا نہیں چھوڑتے[1]۔ ان باتوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ خدا تعالیٰ کا نام ستار ہے۔ پھر یہ کیوں اپنے بھائی پر رحم نہیں کرتا اور عفو اور پردہ پوشی سے کام نہیں لیتا۔ چاہیئے کہ اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرے اور اس کی عزت و آبرو پر حملہ نہ کرے۔

ایک چھوٹی سی کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک بادشاہ قرآن لکھا کرتا تھا۔ ایک مُلّا نے کہا کہ یہ آیت[2] غلط لکھی ہے بادشاہ نے اُس وقت اس آیت پر دائرہ کھینچ دیا کہ اس کو کاٹ دیا جائے گا۔ جب وہ چلا گیا تو اُس دائرہ کو کاٹ دیا۔ جب بادشاہ سے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا کہ دراصل وہ غلطی پر تھا مگر مَیں نے اس وقت دائرہ کھینچ دیا کہ اس کی دلجوئی ہو جاوے[3]

یہ بڑی رعونت کی جڑ اور بیماری ہے کہ دوسرے کی خطا پکڑ کر اشتہار دیدیا جاوے[4]۔ ایسے امور سے نفس خراب ہو جاتا ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ غرض یہ سب امور تقویٰ میں داخل ہیں اور اندرونی بیرونی امور میں تقویٰ سے کام لینے والا فرشتوں میں داخل کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں کوئی سرکشی باقی نہیں رہ جاتی۔ تقویٰ حاصل کرو کیونکہ تقویٰ کے بعد ہی خدا تعالیٰ کی برکتیں آتی ہیں۔ متقی دنیا کی بلاؤں سے بچایا جاتا ہے۔ خدا اُن کا پردہ پوش ہو جاتا ہے جب تک یہ طریق اختیار نہ کیا جاوے کچھ فائدہ نہیں۔ ایسے لوگ میری بیعت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے[5]۔ فائدہ ہو بھی تو کس طرح جب کہ ایک ظلم تو اندر ہی رہا۔ اگر وہی جوش، رعونت، تکبر، عُجب، ریاکاری،

---

[1] البدر ہے:۔ "ابھی تک بہت سے آدمی جماعت میں ایسے ہیں کہ تھوڑی سی بات بھی خلافِ نفس سُن لیتے ہیں تو اُن کو جوش آجاتا ہے حالانکہ ایسے تمام جوشوں کو فرو کرنا بہت ضروری ہے تاکہ حلم اور بُردباری طبیعت میں پیدا ہو۔ دیکھا جاتا ہے کہ جب ایک ادنیٰ سی بات پر بحث شروع ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی فکر میں ہوتا ہے کہ کسی طرح مَیں فاتح ہو جاؤں ایسے موقعہ پر جوشِ نفس سے بچنا چاہیئے اور رفعِ فساد کے لیے ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں دیدہ دانستہ خود ذلت اختیار کر لینی چاہیئے۔ اس امر کی کوشش ہرگز نہ کرنی چاہیئے کہ مقابلہ میں اپنے دوسرے بھائی کو ذلیل کیا جاوے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۳، ۴ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

[2] البدر میں یوں لکھا ہے:۔ "یہ لفظ تم نے غلط لکھا ہے۔" (مرتب)

[3] البدر میں ہے:۔ "دیکھو اس نے بادشاہ ہو کر ایک غریب مُلّاں کا دل نہ دُکھانا چاہا۔" (حوالہ مذکور صفحہ ۴)

[4] البدر میں ہے:۔ "اپنے بھائی پر فتح پانے کا خیال رعونت کی ایک جڑ ہے اور بڑی بھاری مرض ہے کہ وہ اپنے ایک بھائی کے عیب کے مشتہر کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔" (البدر حوالہ مذکور)

[5] البدر میں ہے:۔ "یاد رکھو بیعت کا زبانی اقرار کچھ شئے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تزکیۂ نفس چاہتا ہے۔" (البدر حوالہ مذکور)

سریع الغضب ہونا باقی ہے جو دوسروں میں بھی ہے تو پھر فرق ہی کیا ہے۔ ؎ سعید اگر ایک ہی ہو اور وہ سارے گاؤں میں ایک ہی ہو تو لوگ کرامت کی طرح اس سے متاثر ہوں گے۔ نیک انسان جو اللہ تعالیٰ سے ڈر کر نیکی اختیار کرتا ہے اس میں ایک ربانی رُعب ہوتا ہے اور دلوں میں پڑ جاتا ہے کہ یہ باخدا ہے۔ ؎ یہ بالکل سچی بات ہے کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے خدا تعالیٰ اپنی عظمت سے اس کو حصہ دیتا ہے اور یہی طریق نیک بختی کا ہے۔

پس یاد رکھو کہ چھوٹی چھوٹی باتوں ؎ میں بھائیوں کو دُکھ دینا ٹھیک نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمیع اخلاق کے متمم ہیں اور اس وقت خدا تعالیٰ نے آخری نمونہ آپ کے اخلاق کا قائم کیا ہے۔ اس وقت بھی اگر وہی درندگی رہی تو پھر سخت افسوس اور کم نصیبی ہے۔ پس دوسروں پر عیب نہ لگاؤ کیونکہ بعض اوقات انسان دوسرے پر عیب لگا کر خود اس میں گرفتار ہو جاتا ہے اگر وہ عیب اس میں نہیں لیکن اگر وہ عیب سچ مچ اس میں ہے تو اس کا معاملہ پھر خدا تعالیٰ سے ہے۔

بہت سے آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں پر معاً ناپاک الزام لگا دیتے ہیں۔ ان باتوں سے پرہیز کرو۔ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچاؤ اور اپنے بھائیوں ؎ سے ہمدردی، ہمسایوں سے نیک سلوک کرو۔ اور اپنے بھائیوں سے نیک معاشرت کرو اور سب سے پہلے شرک سے بچو کہ یہ تقویٰ کی ابتدائی اینٹ ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ صفحہ ۷-۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء)

۱۲؍ فروری ۱۹۰۴ء

(بوقت ظہر)

ابتلاء اور دشواریاں

مقدمات کے تذکرہ پر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ:-

---

؎ البدر سے:- "اس لیے اپنے نفسوں میں تبدیلی کرو اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ حاصل کرو۔"

(البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۴ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

؎ البدر سے:- "خواہ کیسی ہی دشمنی ہو رفتہ رفتہ سب خود بخود اس کے تابع ہو جاویں گے اور بجائے حقارت کے اس کی عظمت کرنے لگ جاویں گے۔" (البدر حوالہ مذکور)

؎ البدر سے:- "چھوٹی چھوٹی باتوں میں طول دینا اور بھائیوں کو رنج پہنچانا بہت بُری بات ہے۔" (البدر حوالہ مذکور)

؎ البدر میں "بھائیوں" کی بجائے "بیویوں سے عمدہ معاشرت کرو" لکھا ہے۔ (خاکسار مرتب)

انبیاء ورسل کے سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں ہمیشہ مکروہات آجایا کرتے ہیں طرح طرح کی ناکامیاں پیش آتی ہیں۔ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (الاحزاب : ۱۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ کی ناکامی کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہ شکست اور ہزیمت نہیں ہوا کرتی۔ ابتلاء میں ماموِر کا صبر و استقلال اور جماعت کی استقامت اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے وہ خود فرماتا ہے کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلة : ۲۲) لفظ کَتَبَ سنت اللہ پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ضرور ہی غلبہ دیا کرتا ہے۔ درمیانی دشواریاں کچھ شے نہیں ہوتیں اگرچہ وہ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ (التوبة : ۱۱۸) کا ہی مصداق کیوں نہ ہو۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۴ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

(دربارِ شام)

وباؤں اور بلاؤں کے آنے کا سبب

موسمی بلاؤں اور وباؤں کے تذکرہ پر فرمایا:۔

"جب دنیا میں فسق و فجور پھیل جاتا ہے تو یہ وبائیں دنیا میں آتی ہیں۔ لوگ اللہ تعالیٰ سے لاپروا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی پروا نہیں کرتا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ابھی ان شوخیوں اور شرارتوں میں کوئی فرق نہیں آیا باوجودیکہ طاعون ایک کھا جانے والی آگ کی طرح بھڑک رہی ہے لیکن وہی مکر و فریب اور بدکاری کے بازار گرم ہیں بلکہ ان میں زیادتی ہی نظر آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی کیا مرضی ہے۔ اللہ تعالیٰ تھکتا نہیں۔ پہلے زمانہ میں بھی جب لوگ گناہ سے باز نہیں آئے تو زمین کے تختے پلٹ دیئے گئے ہیں اور شہروں کے نام و نشان مٹا دیئے گئے ہیں۔

جب طاعون پہلے پہل پھیلا ہے تو لوگ سمجھتے تھے کہ یونہی ایک اتفاقی بیماری ہے بہت جلد نابود ہو جائیگی لیکن جیسے اللہ تعالیٰ نے اس وقت جبکہ ابھی اس کا نام و نشان بھی نہ تھا مجھے اطلاع دی تھی کہ یہ وبا آنے والی ہے ویسے ہی ابھی یہ خوفناک عذاب بمبئی ہی میں پھیلا ہوا تھا جو مجھ پر ظاہر کیا گیا کہ یہ وبا سارے پنجاب میں پھیل جائے گی۔ اس پر ناعاقبت اندیش لوگوں نے ہنسی اور ٹھٹھے اڑائے۔ مگر اب دیکھ لو کوئی جگہ ایسی نہیں جو اس سے خالی ہو اور اگر کوئی جگہ ایسی ہے بھی تو اس کے اردگرد آگ لگی ہوئی ہے اس کے محفوظ رہنے کا کوئی معاہدہ نہیں ہو چکا۔

حقیقت میں یہ بڑے ہی اندیشہ اور فکر کی بات ہے جبکہ کوئی علاج بھی اس کا کارگر نہیں ہوا اور زمینی تدابیر میں ناکامی ہوئی ہے تو پھر کس قدر ضروری ہے کہ لوگ سوچیں کہ یہ بَلا کیوں آئی ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے جب تک لوگ سچی توبہ اور رجوع الی اللہ نہیں کرتے اور ان شوخیوں اور

شرارتوں سے باز نہیں آتے جو خدا کی باتوں سے کی جاتی ہیں یہ عذاب پیچھا چھوڑتا نظر نہیں آتا، لیکن جب انسان توبہ اور استغفار کرتا ہے اور اپنے اندر ایک پاک تبدیلی کا نمونہ دکھاتا ہے تو پھر خدا تعالیٰ بھی رجوع برحمت کرتا ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اسی طرح فسق و فجور کا بازار گرم ہے اور قسم قسم کے گناہ اس زمین پر ہو رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی عذاب الٰہی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پہلی کتابوں میں بھی اس وبا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ قیامت کے قریب عام مری پڑے گی سو اب وہ دن قریب آ گئے ہیں اور مری پڑ رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب زمانہ کا آخر ہے۔

اس بات کو ککر یاد رکھو کہ جب بخل و حسد اور فسق و فجور کی زہریلی ہوا پھیل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت سرد ہو جاتی ہے اور جس طرح پر اللہ تعالیٰ سے ہراساں و ترساں ہونا چاہیئے وہ نہیں رہتا۔ یہ ہوا ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے بعض اوقات ہیضہ کی زہریلی ہوا پھیلتی ہے اور تباہ کرتی جاتی ہے اس وقت بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض جو بچ رہتے ہیں ان کا بھی یہ حال ہوتا ہے کہ صحت درست نہیں رہتی۔ ہاضمہ کا فتور یا اور اسی قسم کی خرابیاں ہوا سے متاثر ہو کر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح پر جب گناہ کی وبا پھیلتی ہے تو بعض تو اس میں بالکل ہلاک ہو جاتے ہیں اور جو بچ رہتے ہیں اُن کی بھی رُوحانی صحت میں فرق آجاتا ہے۔ سو یہی حال اب ہو رہا ہے۔ اکثر ہیں جو کُھلے طور پر بے حیائیوں اور بدکاریوں میں مبتلا ہیں اور وہ تقویٰ اور خدا ترسی سے ہزاروں کوس دور جا پڑے ہیں اور جو کسی طور پر دیندار کہلاتے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ کتاب و سنت سے الگ ہو رہے ہیں۔ اپنے خیال اور رائے سے جو جی میں آتا ہے کر گذرتے ہیں۔ اور حقیقت اور مغز کو چھوڑ کر پوست اور ہڈیوں کو لیے بیٹھے ہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے اپنی سنت کے موافق ایک عذاب بھیجا ہے کیونکہ وہ ایسی حالت میں قیامت سے پہلے اسی دنیا کو قیامت بنا دیتا ہے اور ایسی خوفناک صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ زندگی قیامت کا نمونہ ہو جاتی ہے اور اب یہ وہی دن ہیں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ سچائی سے بجائے محبت کے بغض کیا جاتا ہے اور عملی حالتیں خراب ہو چکی ہیں۔ غلط اعتقادات پر ایسا زور دیا گیا ہے کہ حدِ اعتدال سے بہت تجاوز ہو گیا ہے اور اس حالت پر پہنچ گیا ہے جس کو اعتداء کہتے ہیں۔

اسلام پر عیسائیت کی یلغار

ساری قوموں کو دیکھو کہ تیرہ سو برس سے بالکل خاموش اور چُپ چاپ تھے اگرچہ اسلام کے ساتھ اُن کی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں مگر وہ شوخیاں اور شرارتیں جو اب اسلام کے استیصال اور نابُود کرنے کے واسطے کی جاتی ہیں نہیں کی جاتی تھیں اور وہ مذہبی زہر نہ تھا جو آج ہے۔ پچاس برس پہلے اگر ان کتابوں کو تلاش کریں جو اسلام کے خلاف لکھی گئی تھیں تو شاید ایک[1] بھی نہ ملے، لیکن اب اس قدر کتابیں۔ اخبارات اور رسالے۔ اشتہارات نکلتے ہیں کہ

---

[1] البدر میں ہے:۔ اور آج سے ایک صد سال پہلے تلاش کرو تو ایک سو کتب بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اگر اُن کو جمع کیا جاوے تو ایک پہاڑ بن جاوے ۔بعض پرچے عیسائیوں کے کئی کئی لاکھ طبع ہوتے ہیں[1]۔ جن میں ایک عاجز انسان کو خدا بنایا گیا ہے ۔ایسا مجدد مصلح اور پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو ایسے وقت آیا جبکہ دنیا نجاست سے بھری گئی تھی اس وقت آپ نے دُنیا کو پاک صاف کیا اور اس مُردہ عالم کو زندہ کیا اس کی پاک شان میں وہ فحش گالیاں دی جاتی ہیں جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر میں سے کسی کو بھی نہیں دی گئیں ۔

مجھے تعجب آتا ہے کہ ان کم بختوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو نشانہ بنایا ہے ایک عاجز ابن آدم کو خدا بنایا جاتا ہے اور بدعملی اور بے حیائی اور جرأت سے کیا جاتا ہے ۔ اُم الخبائث (شراب) پانی کی طرح پی جاتی ہے[2] مگر اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پاک و مطہر انسان کی پاک ذات پر حملے کرنے کے لیے زبان کشائی کرتے ہیں۔ ان کے ملکوں میں جاکر اگر کوئی عفت اور پارسائی کا نمونہ دیکھنا چاہے تو اسے معلوم ہو گا کہ کفارہ کے کیا کیا برکات ان پر نازل ہوئے ہیں۔

جو بڑے مہذب کہلاتے ہیں[3] اُن کی یہ حالت ہے کہ وہ ہمہ تن دُنیا ہی کی طرف جھکے ہوئے ہیں اور ایسے سرنگوں دنیا کے سامنے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دُنیا ہی کو خدا سمجھ لیا ہے ۔ان کے نزدیک انشاء اللہ کہنا بھی ہنسی کی بات ہے توجہ الی اللہ اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنا خطرناک غلطی اور حماقت ہے اور ان کے اثر سے ہزاروں لاکھوں انسان تباہ ہو رہے ہیں اور باوجودیکہ یہ حالت ان لوگوں کی ہو چکی ہے لیکن اسلام کے استیصال کے لیئے وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں مگر یاد رکھو کہ اسلام ان کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتا ۔اس کا محافظ خود اللہ تعالیٰ ہے۔

⁂

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

ان کی ایسی نہ ملیں گی جو تردید اسلام میں یہاں شائع ہوئی ہوں" (البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۴ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء)

[1] البدر سے : بعض دفعہ ایک ہی بار لاکھ لاکھ کتب چھاپ کر ان لوگوں نے مفت شائع کی ہیں" (البدر حوالہ مذکور)

[2] البدر سے :-

"نصاریٰ کے اعتقاد کا تو یہ حال ہے ۔اب عملی حالت کی طرف نظر کرو کہ کنجریوں سے بدتر ہیں ۔عفت وغیرہ کا نام و نشان نہیں شراب پانی کی طرح پی جاتی ہے ۔کُھلی زناکاری کُتوں اور کُتیوں کی طرح ہو رہی ہے اگر کفارے کے اثر کا پورا نقشہ دیکھنا ہو تو یورپ کے ملکوں کی سیر کی جاوے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۴)

[3] البدر میں یوں لکھا ہے :" پھر ان کے علاوہ ایک اَور فرقہ ہے جو اپنے آپ کو مہذب کہتا ہے ۔ان لوگوں نے دُنیا کو خدا بنا رکھا ہے" (البدر حوالہ مذکور)

علماء اسلام کی حالت

اب اسلام کی اندرونی حالت دیکھو۔ فیض کا چشمہ علماء[1] تھے مگر انکی حالت ایسی قابلِ رحم ہوگئی کہ اس کے بیان کرنے سے بھی شرم آجاتی ہے۔ جس غلطی پر کوئی اڑ گیا ہے یا جو کچھ اس کے منہ سے نکل گیا ہے۔ ممکن نہیں کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ اس غلطی کو جس نے ظاہر کیا۔ جھٹ پٹ اُسے کافر اور دجّال کا خطاب مل گیا۔ حالانکہ[2] صادق اور راستباز کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جہاں اسے کسی اپنی غلطی کا پتہ ملا وہ اسے وہیں چھوڑ دیتا ہے اسے ضد اور اصرار اپنی غلطی پر نہیں ہوتا۔ مختلف فرق بندیاں باہمی تحقیر، قرآن اور اسلام سے بے خبری صاف طور پر ان کی حالت کو بتا رہی ہے۔ جو باتیں صرف دُنیا تک ہیں اُن کی سزا اور اثر بھی دُنیا ہی تک محدود ہے مگر جو امور عاقبت کے متعلق ہیں اُن میں اگر سُستی اور بے پروائی کی جاوے تو اس کا نتیجہ جہنم ہوتا ہے۔

مَیں بعض وقت ان لوگوں کی حالت دیکھ کر سخت حیران ہو جاتا ہوں اور خیال گذرتا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر یقین نہیں[3]۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ آیات ونشانات دیکھتے ہیں۔ ہم دلائل پیش کرتے ہیں مگر ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا مومن کے سامنے اگر اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کیا جاوے وہ فوراً ڈر جاتا ہے اور جرأت سے اس کی تکذیب پر لب کشائی نہیں کرتا مگر ان کی عجب حالت ہے کہ ہم اپنی تائید میں اول تو یہ پیش کرتے ہیں کہ خدا نے مجھے مامور کیا ہے اور پھر اپنی تائید دعوے میں ہم آیات قرآنیہ پیش کرتے ہیں لیکن یہ دونوں سے انکار کرتے ہیں اور پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت پیش کرتے ہیں اس سے ہی ترساں ہو جاتے مگر اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ

---

[1] البدر میں ہے:۔ "فیوض و برکات کا سرچشمہ علماء ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے عام مخلوق ہدایت پاتی ہے"۔
(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳ مورخہ ۸ ، مارچ ۱۹۰۴ء)

[2] البدر میں ہے:۔ "حالانکہ فاسق اور متقی میں یہی فرق ہوا کرتا ہے کہ متقی کو جب غلطی کا پتہ لگ جاوے تو وہ اسے فوراً ترک کر دیتا ہے اور فاسق نہیں کرتا۔ ہر ایک شخص یا قوم کی غلطیاں ایک حد تک معلوم ہو جاتی ہیں مگر ان کی غلطیوں اور خباثتوں کا کوئی انتہا نظر نہیں آتا ہے۔ (البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر سے:۔ "دعویٰ تو قرآن، حدیث اور خدا پر ایمان کا ہے مگر اُن کے آگے جب یہ پیش کیا جاوے اور کہا جاوے کہ غلطی چھوڑ دو تو ایک بات کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ بھلا بتلاؤ کہ ایک مومن کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اس کے آگے قرآن شریف پیش کیا جاوے۔ احادیث پیش کی جاویں۔ نشانات پیش کئے جاویں علاوہ اس کے عقل بھی کام کی شئے ہے اس سے بھی نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے اس سے بھی سمجھایا جاوے مگر اُن کو کسی سے فائدہ نہیں پہنچتا"۔ (البدر حوالہ مذکور)

کے نشان دیکھتے ہیں مگر تکذیب کرتے ہیں۔ عقلی دلائل کا اثر نہیں۔ غرض جو طریق ایک راستباز کی شناخت کے ہوسکتے ہیں وہ سب پیش کئے جاتے ہیں لیکن ایک بھی نہیں مانتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ لکھا ہے[1] کہ وہ ایک مرتبہ بھاگتے جاتے تھے کسی نے پوچھا کہ کیوں بھاگتے جاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ جاہلوں سے بھاگتا ہوں۔ اُس نے کہا ان پر وہ اسم اعظم[2] کیوں نہیں پھونکتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اسم اعظم بھی ان پر اثر نہیں کرتا۔

حقیقت میں جہالت بھی ایک خطرناک موت ہے مگر یہاں تو سمجھ نہیں آتا کہ یہ کیسا جہل ہے۔ قرآن پڑھتے ہیں تفسیریں کرتے ہیں۔ حدیث کی سند رکھتے ہیں مگر جب ہم پیش کرتے ہیں تو انکار کر جاتے ہیں یہ نہ خود مانتے ہیں اور نہ اَوروں کو ماننے دیتے ہیں۔

یہ ایسا زمانہ آگیا ہے کہ انسان کی ہستی کی غرض و غایت کو بالکل بھلا دیا گیا ہے خود خدا تعالیٰ انسانی خلقت کی غرض تو یہ بتاتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذّٰریٰت : ۵۷)

مگر آج عبودیت سے نکل کر ناداں انسان خود خدا بننا چاہتا ہے اور وہ صدق و وفا، راستی اور تقویٰ جس کو خدا چاہتا ہے مفقود ہے۔ بازار میں کھڑے ہو کر اگر نظر کی جاوے تو صدہا آدمی اِدھر سے آتے اور اُدھر چلے جاتے ہیں لیکن ان کی غرض اور مقصد محض دُنیا ہے۔

خدا تعالیٰ کی خاطر امورِ دنیا کی بجا آوری

خدا تعالیٰ اس سے تو منع نہیں کرتا کہ انسان دنیا میں کام نہ کرے[3] مگر بات یہ ہے کہ دُنیا کیلئے نہ کرے بلکہ دین کے لیے کرے تو وہ موجبِ برکات ہو جاتا ہے مثلاً خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ بیویوں سے نیک سلوک کرو۔ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النّسآء : ۲۰) لیکن اگر انسان محض اپنی ذاتی اور نفسانی اغراض کی بنا پر وہ سلوک کرتا ہے تو فضول ہے اور وہی سلوک اگر اس حکمِ الٰہی کے واسطے ہے تو موجبِ برکات۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ محض دنیا کے لیے کرتے ہیں۔ محبّتِ دنیا ان سے کراتی ہے۔ خدا کے واسطے نہیں کرتے

---

[1] البدر میں ہے:۔ ”مثنوی میں مولنا روم نے ایک قصہ لکھا ہے۔“ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳)

[2] البدر سے:۔ ”اس نے کہا جس اسم اعظم کے ذریعے سے معجزات دکھلاتے ہو وہی ان پر بھی پڑھ کر پھونک دو کہا کئی مرتبہ پھونک چکا ہوں مگر ان پر اس کا بھی اثر نہیں ہے۔“ (البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر سے:۔ ”ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ تجارت وغیرہ ذرائع معاش کو ترک کر دیا جاوے اور نہ ہم ان باتوں سے کسی کو منع کرتے ہیں۔“ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳)

اگر اولاد کی خواہش کرے تو اس نیت سے کرے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان : ۷۵) پر نظر کرکے کرے کہ کوئی ایسا بچہ پیدا ہو جائے جو اعلاء کلمۃ الاسلام کا ذریعہ ہو۔ جب ایسی پاک خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ زکریا کی طرح اولاد دیدے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی کہ ہمارا باغ ہے یا اَور مِلک ہے وہ اس کا وارث ہو اور کوئی شریک اس کو نہ لے جائے مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ کمبخت جب تو مر گیا تو تیرے لیے دوست دشمن اپنے بیگانے سب برابر ہیں۔ مَیں نے بہت سے لوگ ایسے دیکھے اور کہتے سُنے ہیں کہ دعا کرو کہ اولاد ہو جائے جو اس جائداد کی وارث ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد کوئی شریک لے جاوے۔ اولاد ہو جائے خواہ وہ بدمعاش ہی ہو۔ یہ معرفت اسلام کی رہ گئی ہے۔ برخلاف اس کے مومن اگر مکان بناتا ہے تو اس میں بھی اس کی نیت دین ہی کی ہوتی ہے۔ لباس، خوراک، اس کا پھرنا غرض ہر کام دین ہی کے واسطے ہوتا ہے۔ وہ خوراک کھاتا ہے مگر موٹا ہونے کے واسطے نہیں بلکہ اس طرح پر جیسے یکہ بان کچھ دُور جا کر اپنے ٹٹو کو نہاری اور خوراک دیتے ہیں تاکہ وہ اگلی منزل چلنے کے واسطے تیار ہو جائے اور دم نہ نکل جائے۔ مومن کی غرض بھی خوراک سے یہی ہوتی ہے کیونکہ نفس کا بھی تو ایک حق ہوتا ہے اور اہل و عیال کا بھی اور پھر خدا تعالیٰ کا حق الگ ہے۔ اگر نفس کے حق کی رعایت نہ ہو تو پھر وہ مَر جائے گا اور یہ جوابدہ ہے۔

پس یاد رکھو کہ مومن کی غرض ہر آسائش، ہر قول و فعل، حرکت و سکون سے گو بظاہر نکتہ چینی ہی کا موقعہ ہو مگر دراصل عبادت ہوتی ہے۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں کہ جاہل اعتراض سمجھتا ہے مگر خدا کے نزدیک عبادت ہوتی ہے[۱] لیکن اگر اس میں اخلاص کی نیت نہ ہو تو نماز بھی لعنت کا طوق ہو جاتی ہے۔

مومنوں کو كُلُوْا وَاشْرَبُوْا (الطور : ۲۰) کا حکم دیا اور جو خدا کے لیے نماز نہیں پڑھتے اُن کو وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (الماعون : ۵) فرمایا كُلُوْا ایک امر ہے جب مومن اس کو امر سمجھ کر بجا لاوے تو اس کا ثواب ہوگا۔ اسی طرح عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء : ۲۰) امر کی بجاآوری سے ثواب ہوتا ہے لیکن اگر ریا کاری سے نماز بھی ادا کرے تو پھر اس کے لیے ویل[۲] ہے۔

---

[۱] البدر سے :۔ "اور اس کے ان کاموں کا ثواب اسے ویسا ہی ملتا ہے جیسے نماز کا ثواب۔"

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳)

[۲] البدر میں ہے :۔ "کل اوامر کے بجا لانے کا ثواب ملتا ہے۔ جس قدر کاموں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے اور ان کے موافق کرے گا ان سب کا اجر پاوے گا ورنہ باقی امور پر جو ریا وغیرہ کے لیے کئے جاتے ہیں اگرچہ بظاہر ان کی صورت اوامر کے مطابق ہوتی ہے عذاب اور ویل ہیں۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳)

احیاءِ دین کا سلسلہ

اس وقت اسلام جس چیز کا نام ہے اس میں فرق آگیا ہے تمام اخلاقِ ذمیمہ بھر گئے ہیں اور وہ اخلاص جس کا ذکر مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (البینۃ: ۶) میں ہوا ہے آسمان پر اُٹھ گیا ہے[1]

خدا تعالیٰ کے ساتھ صدق، وفاداری، اخلاص، محبت اور خدا پر توکّل کالعدم ہو گئے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ پھر نئے سرے سے ان قوتوں کو زندہ کرے وہ خدا جو ہمیشہ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الحدید: ۱۸) کرتا رہا ہے اس نے ارادہ کیا ہے اور اس کے لیے کئی راہیں اختیار کی گئی ہیں۔ ایک طرف مامور کو بھیج دیا ہے جو نرم الفاظ میں دعوت کرے اور لوگوں کو ہدایت کرے۔ دوسری طرف علوم و فنون کی ترقی ہے اور عقل آتی جاتی ہے اب وہ وحشیانہ حالت سکھوں کے زمانہ کی سی نہیں رہی اور لوگ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک طرف اتمامِ حجت کے لیے آسمان نشان ظاہر کر رہا ہے چنانچہ جب کتاب نزول المسیح چھپ کر شائع ہوگی۔ اس وقت سب کو پتہ لگ جائے گا کیونکہ اس میں ڈیڑھ سَو کے قریب ایسے نشانات لکھے ہیں جن کے ہزاروں لاکھوں گواہ موجود ہیں۔

اور پھر قہری نشانات کا سلسلہ بھی رکھا گیا ہے جن میں سے طاعون کا بھی ایک نشان ہے اور اب جو اس شدت سے پھیل رہی ہے کہ کبھی گذشتہ نسلوں نے نہ دیکھی ہوگی اور بہت سے لوگ ہیں جو ان نشانات اور آیات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں کوئی دن نہیں جاتا کہ لوگ بذریعہ خطوط یا خود حاضر ہو کر داخل بیعت نہیں ہوتے اگرچہ دُنیا میں فسق و فجور اور شوخی و آزادی اور خود روی بہت بڑھ گئی ہوئی ہے تاہم یہ لوگ جو ہمارے سلسلہ میں آتے ہیں یہ بھی اسی جماعت میں سے نکل نکل کر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعید بھی انہی میں ملے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو نکال لے گا اور اُن کو سمجھ دے گا اور کچھ طاعون کا نشانہ ہو جائیں گے اسی طرح پر دُنیا کا انجام ہوگا اور اتمامِ حجت ہوگی[2]

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ صفحہ ۸، ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء)

اس مقام پر جناب محمد ابراہیم خاں صاحب ابن حاجی موسیٰ خاں برادر زادہ خان بہادر مراد خاں مرحوم نے کراچی (علاقہ سندھ) کا ذکر کیا کہ وہاں کے لوگ بہت غافل ہیں اور ان کو ان باتوں کا علم ہی نہیں ہے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ

---

[1] البدر میں ہے:۔ "اب یہ زمانہ ہے کہ اس میں ریاکاری، عُجب، خود بینی، تکبر، نخوت، رعونت وغیرہ صفات رذیلہ تو ترقی کر گئے ہیں اور مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینۃ: ۵) وغیرہ صفات حسنہ جو تھے وہ آسمان پر اُٹھ گئے ہیں (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳)

[2] یہاں تک کی ڈائری الحکم سے لی گئی ہے۔ اس کے بعد اسی تاریخ یعنی ۱۲ فروری ۱۹۰۴ء کی ڈائری البدر سے درج کی جاتی ہے۔ کیونکہ الحکم میں بقیہ ڈائری کہیں درج نہیں۔ معلوم ہوتا ہے سہواً رہ گئی ہے۔ (مرتب)

مطلق جاہل سے انسان گھبرا جاتا ہے۔ بہر حال کچھ تو پڑھے لکھے وہاں ہیں اور انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اگرچہ انگریزوں کی تعلیم کا مضر اثر کتنا ہی کیوں نہ ہو مگر تاہم یہ فائدہ ضرور ہے کہ فہم میں وسعت اور باتوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور ہمیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ رفتہ رفتہ پیدا ہو ہی جاویں گے۔ وحشی لوگ جن کو کھانے پینے کے سوا اَور کوئی کام نہیں ہے۔ ان سے انسان کیا کلام کرسکتا ہے۔ اس تعلیمیافتہ گروہ پر اگرچہ دنیا کا حجاب ہے مگر تاہم سعید فطرت لوگ سمجھ سمجھ کر ہماری طرف آرہے ہیں۔ اب ہماری جماعت کا ایک حصّہ انہی میں سے ہے۔ ہم خود تو کسی کو یہاں بیٹھے ہوئے بُلا نہیں رہے آخر خود ہی سمجھ کر آرہے ہیں۔

غرضکہ فہم اور عقل والے پر بڑی اُمید ہوتی ہے۔ نرے ڈنگر (بیل) سے انسان نے کیا بات کرنی ہے۔ لوگوں کو کچھ ملّاؤں نے خراب کیا ہے کچھ جاہل فقیروں نے اور بعض لوگ لنگوٹی پوشوں کے معتقد ہوتے ہیں۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو خدا تعالیٰ کے کام رُکا نہیں کرتے۔ اگر ایک شخص زمین پر باغ بناتا ہے تو اوّل دیکھ لیتا ہے کہ باغ کے قابل زمین ہے کہ نہیں۔ اگر اسے بنجر پاتا ہے تو صاف کرتا اور پھوڑتا اور ڈھیلوں کو توڑتا تاڑتا ہے تب باغ بناتا ہے۔ پس وہ مالک الملک جو کہ اب یہ باغ تیار کرنے لگا ہے آخر اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ کچھ سعید طبائع بھی ہیں اسی تعلیم کی برکت سے کئی لوگ ہماری کتب کو دیکھ کر ہدایت پاگئے ہیں حالانکہ ابتدا میں سخت مخالف تھے۔

خدا کے وعدے برحق ہیں

ایک عقلمند بیشک گھبراہٹ میں پڑتا ہے کہ صلیبی فتنے اور کارروائیاں حد درجہ تک ترقی کر چکے ہیں۔ اُن کی کتابیں دور دُور تک پھیل گئی ہیں۔ مجموعی حالت میں ان کی جان توڑ کوششوں کو دیکھا جاتا ہے تو نا امیدی ہو جاتی ہے کہ الٰہی اُن کا استیصال کیسے ہوگا اور صفحۂ زمین پر توحید کیسے پھیلے گی؟ کُل اسباب اسلام کے ضعف کے موجود ہیں اور صلیب کا زور ہے مگر ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کا ارادہ ہو کر رہتا ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ: ۱۰۷) صرف ایک ہی بات ہے جو بھروسہ دلاتی ہے۔ اگرچہ کیسی ہی مشکلات آپڑیں اور عقل فتوے دیوے کہ اب اسلام دوبارہ قائم نہیں ہوسکتا۔ لیکن مَیں اس بات کو نہیں مانتا جب خدا تعالیٰ ارادہ کرتا ہے تو کر کے رہتا ہے۔ اس قسم کی رائیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں اور غلط بھی ثابت ہو رہی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے کیا ان کی نسبت اہل الرائے کی یہ رائے تھی؟ کون تھا جو یقین کرتا کہ ایک غریب جس کے پاس نہ قوت نہ شوکت نہ فوج نہ مال ہے اور ہر طرف مخالفت ہے وہ کامیاب ہو کر رہے گا اور جو وعدے فتح اور نصرت اور اقبالمندی کے وہ دیتا ہے پورے ہو کر رہیں گے مگر باوجود اس ناامیدی کے پھر کیسی امید بندھ گئی اور تمام وعدے پورے ہوگئے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (المائدۃ: ۴) کی گواہی مل گئی اور پھر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ (النصر: ۲) کی سورۃ نازل ہوئی۔ ایسے ہی ممکن ہے کہ کوئی ہماری

جماعت کا یہ خیال کر بیٹھے کہ اس صلیبی جال کا ٹوٹنا محال ہے مگر مَیں سُناتا ہوں کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ ابھی اس کے پاس بہت سی راہیں ہوں گی جن سے یہ فتنہ مٹے گا اور اُن کا ہمیں علم نہیں۔ ہمارا اس بات پر ایمان چاہیئے کہ اس کے وعدے برحق ہیں۔ اگر تمام اسباب اس کے منافی نظر آویں پھر بھی اس کا وعدہ سچا ہے۔ اگر ایک آدمی بھی ہمارے ساتھ نہ ہو پھر بھی اس کا وعدہ سچا ہے۔ وعدہ اس کا کمزور ہو سکتا ہے جس کی قدرت اور اختیار کمزور ہو۔ ہمارے خدا میں کوئی کمزوری نہیں ہے وہ بڑا قادر ہے اور اس کی حرکت جاری ہے ہماری جماعت کو چاہیئے کہ اسی ایمان کو ہاتھ میں رکھے۔

بعض وقت جماعت پر ابتلا بھی آتے ہیں اور تفرقہ پڑ جایا کرتا ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مکہ سے مدینہ اور حبشہ کی طرف منتشر ہو گئے لیکن آخر خدا تعالیٰ نے اُن کو پھر ایک جا جمع کر دیا۔ ابتلا اس کی سنت ہے اور ایسے زلزلے آتے ہیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ (البقرۃ : ۲۱۵) کہنا پڑتا ہے اور بعض کا خیال اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے وہ وعدے غلط ہوں مگر انجام کار خدا کی بات سچی نکلتی ہے۔

حقانیتِ احمدیت

یہ سلسلہ اپنے وقت پر آسمان سے قائم ہوا ہے اگر اَور سب دلائل کو نظر انداز کر دیا جاوے تو صرف وقت ہی بڑی دلیل ہے صدی سے بیس سال بھی گذر گئے خدا کا وعدہ قرآنِ شریف اور احادیث میں ہے کہ وہ مسیح صلیبی فتنہ کے وقت پیدا ہوگا۔ اب ان فتنوں کا زور دیکھ لو۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیس لاکھ مُرتد موجود ہے حالانکہ اس سے پیشتر اہلِ اسلام میں ایک مُرتد ہوتا تو قیامت آجاتی۔ کیا اس وقت بھی خدا خبر نہ لے؟ پھر عملی حالت کو دیکھ لو کہ کس قدر ردّی ہے۔ نام کو تو مسلمان ہیں مگر کرتوت یہ ہے کہ بھنگ چرس وغیرہ نشوں میں مبتلا ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں ہے؟ عیسائی لوگ بھی منتظر ہیں اور یہی وقت بتلاتے ہیں۔ اہلِ کشف نے بھی یہی لکھا ہے۔ قرائن وعلامات بھی اسی کو بتلا رہے ہیں۔ اگر اس وقت خدا خبر نہ لیتا تو دنیا میں یا ضلالت ہوتی یا عیسویت۔ جو قرآن پر اور اللہ پر ایمان لاتا ہے اسے ماننا پڑتا ہے لیکن جو یہود کی طرح وقت کو ٹالنے والے ہیں وہ محروم رہتے ہیں۔

سوادِ اعظم کی حقیقت

پھر ایک دلیل سوادِ اعظم کی پیش کرتے ہیں کہ وہ برخلاف ہے۔ نادان اتنا نہیں جانتے کہ مصلح تو اسی وقت آتا ہے جب لوگ بگڑ جاویں۔ اب بگڑے ہوؤں کا اتفاق اور شہادت کیا حکم رکھتی ہے؟ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مَیں مسیح کو معراج میں مُردوں میں دیکھ آیا ہوں اور پھر قرآنِ شریف سے وفات ثابت ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اور خدا تعالیٰ کا قول دونوں سے وفات ثابت ہے۔ یحییٰ تو مر چکے ہیں اُن کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کو دیکھا ہے۔ پس اتنی دیر تک جو مُردہ کے پاس بیٹھا رہا وہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں خدا تعالیٰ

فرماتا ہے کہ بلا نظیر کے کوئی بات قبول نہ کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے لیے اس نے نظائر پیش کئے۔ مسیح کی حیات کے لیے بھی کوئی نظیر ہونی چاہیئے تھی۔

یہ زمانہ اسلام کی بہار کا ہے۔ اگر ہم چُپ بھی کریں تو خدا تعالیٰ باز نہ آوے گا اور اصل میں ہم کیا کرتے ہیں وہ تو سب کچھ خدا ہی کر رہا ہے۔ ہم تو صرف اسی لیے بولتے اور لکھتے ہیں کہ ثواب ہو اب اس کے فضل کا دروازہ کھل گیا ہے اور خدا نے جو ارادہ کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دیکھو نہ ہمارے واعظ ہیں نہ لیکچرار ہیں نہ انجمنیں ہیں مگر جماعت ترقی کر رہی ہے۔ ہزاروں نے صرف خواب کے ذریعہ سے بیعت کی۔ کوئی ان کو بتلانے اور سمجھانے والا نہ تھا۔ آخر خدا نے دستگیری کی۔ کیا ہماری طاقت تھی کہ ہم یہ سب کچھ کر لیتے؟ یہ اسی کا ہاتھ ہے جو کر رہا ہے۔ صدق ایسی شئے ہے کہ انسان کے دل کے اندر جب گھر کر جاوے تو اس کا نکلنا مشکل ہے۔ جو لوگ ہمارے عقاید کو بعد تحقیق قبول کر لیتے ہیں تو جان سے زیادہ اُن کو عزیز جانتے ہیں ایک نمونہ مولوی عبداللطیف ہیں کہ ہزاروں مرید رکھتے تھے۔ ریاست ان کی تھی۔ دولت بھی بے شمار تھی۔ شاہی دستار بند تھے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موت قبول کی۔ کیا یہ قوت اور برکت جھوٹ میں ہو سکتی ہے؟ کیا بجز سچائی کے اور بھی کسی میں یہ طاقت ہے؟ یہاں (پنجاب میں بھی) بہت سے لوگ ہیں کہ صرف ایمان کے لیے تکلیف دیئے جاتے ہیں۔ قوم، برادری اور گاؤں والے ان کو طرح طرح کی اذیت صرف اس لیے دیتے ہیں کہ انہوں نے سچ کو قبول کیا ہے پس اگر خدا تعالیٰ دلوں میں نہیں ڈالتا تو وہ ان مصائب کو کیونکر برداشت کرتے ہیں یہانتک کہ حقیقی باپ اور بھائی بھی ان لوگوں سے الگ ہو جاتے ہیں بعض ایسے ہیں کہ ڈیڑھ آنے روز محنت کر کے کماتے ہیں اور اس میں سے دو پیسے ہمیں چندہ دیتے ہیں۔ تہجد پڑھتے ہیں نمازوں کے پابند ہیں۔ خدا تعالیٰ کے آگے تضرع اور ابتہال کرتے ہیں۔ اب سوائے اس کے کہ خدا تعالیٰ اُن کو نورِ ایمان عطا کرے اور دلوں میں صدق ڈالے یہ سب کچھ کب حاصل ہو سکتا ہے۔

دیکھنے اور سمجھنے کے لیے تو ایک نشان کتاب براہین ہی بس ہے جیسے کہتے ہیں کہ ؎

حرفے بس است اگر در خانہ کس است

سمجھ دار آدمی کے لیے ایک ہی بات کافی ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے عمر کا وعدہ دیا۔ بتلاؤ کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں اتنے برس ضرور زندہ رہوں گا۔ پھر جتنے وعدے براہین میں تھے ان میں سے اکثر پورے ہو گئے ہیں اور کچھ ابھی باقی ہیں۔ اگر انسان کا کاروبار ہوتا تو اس قدر نصرت کب شاملِ حال ہو سکتی؟ اور وہ وعدے اگر خدا کی طرف سے نہ تھے تو کیسے پورے ہو کر رہتے؟

پس وقت کو، زمانہ کو، ضلالت کو اندرونی اور بیرونی حالت کو دیکھو تو خود پتہ لگ جاتا ہے۔ مخالفوں سے ہم ناراض نہیں ہیں کیونکہ راستی کا مقابلہ جان توڑ کر ہوا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھو کس قدر مقابلہ ہوا لیکن کیا

مسیلمہ کی بھی مخالفت ہوئی۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء)

---

۲۲ مارچ ۱۹۰۴ء

(بوقت شام)

ماموریں کی زندگی میں ابتلاء

مقدمات کی نسبت آپ نے فرمایا کہ

یہ ایک منجانب اللہ ابتلا تھا جو کہ پیش آگیا سنت اللہ اسی طرح سے ہے کہ ماموریں کی زندگی یونہی اسی طرح آسائش سے نہیں گذرتی کہ وہ دنیا میں بیکار رہیں۔

پھر آپ نے مولویوں کی حالت پر فرمایا کہ

ان لوگوں کے اعمال اور منبروں پر چڑھ چڑھ کر خطبے پڑھنے سے ہمیں تعجب آتا ہے کہ آخر اُن کے اعمال کا نتیجہ کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال پر بھی زنگ ہوتا ہے۔ جس سے انسان کے صحیح عقائد بھی نظر نہیں آسکتے۔

وفاتِ مسیح علیہ السلام

اس سے بڑھ کر اَور کیا ہوگا کہ کتاب اللہ جس کا ایک ایک لفظ یقینی ہے وہ وفاتِ مسیح کو بیان کرتی ہے۔ احادیث کا اجماع بھی یہی ہے اگر کوئی زندہ ہوتا تو صحابہؓ کو اس سے بڑھ کر اَور کیا رنج ہوتا کہ صاحبِ شریعت سرورِ انبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو زمین میں مدفون ہوں اور ایک نبی جو کہ صاحبِ شریعت نہیں اور موسوی شریعت کا تابع وہ آسمان پر زندہ موجود ہو اور اس اُمت کے اختلاف مٹانے اور فیصلہ کرنے کے لیے وہی آسمان سے آوے۔ اب پوچھو کہ خاتم الانبیاء کون ہوا؟ حضرت مسیح یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم؟ مگر پھر بھی یہ لوگ جو باز نہیں آتے تو معلوم ہوا کہ شامتِ اعمال ہے۔ تقویٰ تو نہیں رہا تھا، عقلِ سلیم بھی اُن میں نہیں رہی دنیوی عقل کے لیے تقویٰ کی ضرورت نہیں ہے مگر دین کے لیے ضرورت ہے۔ اس لیے یہ لوگ دین کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ خدا تعالیٰ اسی کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ: ۸۰) یعنی اندر گھسنا تو درکنار مَس کرنا بھی مشکل ہے۔ جب تک انسان مطہّر یعنی متقی نہ ہولے۔

احادیث میں مِنْكُمْ ہے، قرآن میں مِنْكُمْ ہے۔ پھر بغیر نظیر کے کوئی بات نہیں مانی جاتی۔ عیسائیوں نے جب مسیح کے بن باپ ہونے سے اس کی خدائی کا استدلال کیا تو خدا تعالیٰ نے نظیر بتلا کر ان کی بات کو رد کر دیا۔ فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (آل عمران: ۶۰) کہ اگر بن باپ ہونے سے انسان خدا ہوسکتا ہے تو آدمؑ کی تو ماں بھی نہ تھی اسے خدا کیوں نہیں مان لیتے۔ پس جب نصاریٰ کی اس بات کو خدا نے رد کر دیا تو اگر مسیح بھی

واقعی آسمان پر زندہ ہوتا اور عیسائی اسے خدائی کی دلیل گردانتے تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی رد کرتا اور چند ایک نظائر پیش کرتا کہ فلاں فلاں اور نبی زندہ آسمان پر موجود ہیں۔ ہر ایک پہلو سے ان لوگوں پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے۔ اب یہ لوگ مصداق صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کے ہیں۔ بھلا دیکھو تو جس حال میں کہ میں زندہ موجود ہوں کیا یہ ان کا حق نہ تھا کہ مجھ سے آکر سوال کرتے پوچھتے اور اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے۔ میں نے بارہا لکھا کہ ان کے اخراجاتِ سفر دینے کو میں تیار ہوں یہاں آویں مکان بھی دوں گا حتی الوسع مہمان نوازی بھی کروں گا لیکن یہ لوگ اِدھر رُخ نہیں کرتے۔ ہمیں کہتے ہیں کہ قرآن سے باہر ہیں حالانکہ قرآن ہی نے تو ہمیں اس کوچہ میں کھینچا ہے صرف فرق اتنا ہے کہ ہمیں قرآن کے معنے وحی نے بتلائے ہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے دیدہ دانستہ کیسے اپنی آنکھوں کو پھوڑیں۔

خدا تعالیٰ کا یہ فرض تھا کہ اگر عیسائی لوگ مسیح کو خدائی کے لیے خصوصیت پیدا کریں تو وہ اس کا رد کرتا جیسے آدم کی مثال بیان کی۔ کیا خدا کو اس خصوصیت کا علم نہ تھا کہ مسیح آسمان پر زندہ ہے پھر اس کا اُس نے کیوں رد نہ کیا؟ اس طرح سے قرآن پر حرف آتا ہے اگر مسیح آسمان پر زندہ ہوتا اور عیسائی لوگ اس سے خدائی کی دلیل پکڑتے تو خدا تعالیٰ ضرور بیان کرتا کہ فلاں فلاں انبیاء بھی آسمان پر زندہ موجود ہیں اس سے کوئی خدا نہیں بن سکتا جبکہ چالیس کروڑ انسان اسے آگے ہی خدا مان کر گمراہ ہو رہے ہیں تو تم نے اُن کے ساتھ مل کر اور ہاں میں ہاں ملا کر اس کی خدائی پر اَور مُہر لگا دی۔ اس کا باعث صرف ان لوگوں کی بدعملی ہے کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اَور اور کھانے کے اَور۔ اور ایک ایک روپیہ لے کر فتوے بدل دیتے ہیں۔ اندرونی راستبازی بالکل نیست و نابود ہو گئی اور اب حدیث شریف کے موافق بالکل یہودی ہو گئے ہیں۔ یہ اُمید تو ہے نہیں کہ یہ لوگ ان سچائیوں کو مانیں ہاں ان کی ذریت مانے تو مانے۔

اس کے بعد آپ نے مقدمات کا تذکرہ کیا کہ

ان کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ کس طرح اول کرم دین نے مولوی عبدالکریم صاحب کو بذریعہ خطوط اطلاع دی کہ مہر علی شاہ نے فیضی متوفی کی کتاب سے سرقہ کیا ہے۔ اس کی اطلاع پر کتاب نزول المسیح لکھی گئی۔ پھر اس نے اپنے خطوط کے برخلاف ایک مضمون سراج الاخبار میں لکھ کر سب و شتم کیا اور اُن کو اپنی طرف منسوب کرنے سے انکاری ہوا۔ اس طرح سے ہمارا چلتا کام بند ہو گیا۔ تنگ آکر حکیم صاحب نے دعویٰ کیا۔ پھر کرم دین نے جہلم میں ہم پر ایک مقدمہ کیا وہ بڑا خطرناک مقدمہ تھا۔ اس کے متعلق میں نے اول ہی خواب دیکھے تھے جو کہ شائع ہو چکے ہوئے تھے اور قبل از وقت اس میں کامیابی کی خبر بھی خدا تعالیٰ سے پاکر ہم نے شائع کر دی تھی۔ اس میں ہمیں کامیابی ہوئی۔ پھر کرم دین نے خود ہم پر استغاثہ دائر کیا۔ وہ مقدمات ابھی چل رہے ہیں۔ منصف حاکم کو تو خود خبر نہیں ہوتی کہ انجام کار مقدمہ کی کیا صورت ہوگی۔ ہماری تائید تو ہمیشہ خدا تعالیٰ سے ہوتی ہے ورنہ جمہوری طور پر تو حکّام کا میلان ہماری طرف کم ہی ہوتا

ہے اور سوائے پروردگار کے اُور کس کی ذات ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ زمین پر کیسے ہی آثار نظر آویں مگر بار بار جو حکم آسمان سے آتا ہے کہ تَریٰ نَصْراً مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ وہ آخر ہو کر رہے گا۔

بنگر کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۵ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء)

---

۲۳ ؍ فروری ۱۹۰۴ء

(بوقت شب)

ہر ایک معجزہ ابتلاء سے وابستہ ہے

مقدمہ کی موجودہ صورت پر حضور مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ

یہ ایک ابتلا ہے۔ کوئی مامور نہیں آتا جس پر ابتلا نہ آئے ہوں۔ مسیح علیہ السلام کو قید کیا گیا اور کیا کیا اذیت دی گئی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا گیا۔ مگر بات یہ ہے کہ عاقبت بخیر ہوتی ہے اگر خدا کی سنت یہ ہوتی کہ مامورین کی زندگی ایک تنعّم اور آرام کی ہو اور اس کی جماعت پلاؤ زردے وغیرہ کھاتی رہے تو پھر اُور دنیا داروں میں اور اُن میں کیا فرق ہوتا؟ پلاؤ زردے کھا کر حمداً لِلّٰہ و شکراً لِلّٰہ کہنا آسان ہے اور ہر ایک بے تکلف کہہ سکتا ہے لیکن بات یہ ہے جب مصیبت میں بھی وہ اسی دل سے کہے۔

مامورین اور ان کی جماعت کو زلزلے آتے ہیں ہلاکت کا خوف ہوتا ہے۔ طرح طرح کے خطرات پیش آتے ہیں۔ کُذِبُوْا کے یہی معنے ہیں دوسرے ان واقعات سے یہ فائدہ ہے کہ کچوں اور پکوں کا امتحان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچے ہوتے ہیں اُن کا قدم صرف آسودگی تک ہی ہوتا ہے۔ جب مصائب آئیں تو وہ الگ ہو جاتے ہیں۔

میرے ساتھ یہی سنت اللہ ہے کہ جب تک ابتلا نہ ہو تو کوئی نشان ظاہر نہیں ہوتا۔ خدا کا اپنے بندوں سے بڑا پیار یہی ہے کہ اُن کو ابتلا میں ڈالے جیسے کہ وہ فرماتا ہے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ (البقرۃ: ۱۵۶، ۱۵۷) یعنی ہر ایک مصیبت اور دُکھ میں اُن کا رجوع خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے انعامات انہی کو ملتے ہیں جو استقامت اختیار کرتے ہیں۔ خوشی کے ایام اگرچہ دیکھنے کو لذیذ ہوتے ہیں مگر انجام کچھ نہیں ہوتا۔ رنگ رلیوں میں رہنے سے آخر خدا کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ خدا کی محبت یہی ہے کہ ابتلا میں ڈالتا ہے اور اس سے اپنے بندے کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے مثلاً

کسریٰ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کا حکم نہ دیتا تو یہ معجزہ کہ وہ اسی رات مارا گیا کیسے ظاہر ہوتا اور اگر مکہ والے لوگ آپ کو نہ نکالتے تو اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (الفتح ۲:) کی آواز کیسے سنائی دیتی۔ ہر ایک معجزہ ابتلا سے وابستہ ہے۔ غفلت اور عیاشی کی زندگی کو خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کامیابی پر کامیابی ہو تو تفرع اور ابتہال کا رشتہ تو بالکل رہتا ہی نہیں ہے حالانکہ خدا تعالیٰ اسی کو پسند کرتا ہے اس لیے ضرور ہے کہ دردناک حالتیں پیدا ہوں۔

نو مبایعین کیلئے نصیحت

اسکے بعد عالی جناب محمد ابراہیم خان صاحب ابن موسیٰ خان صاحب برادر زادہ مراد خان صاحب مرحوم آمدہ از کراچی اور خان صاحب گلزار خاں اور دیگر چند ایک احباب نے بیعت کی۔ بعد بیعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذیل کی تقریر فرمائی:۔

ضروری نصیحت یہ ہے کہ ملاقات کا زمانہ بہت تھوڑا ہے خدا معلوم بعد جدائی کے دوبارہ ملنے کا اتفاق ہو یا نہ ہو۔ یہ دُنیا ایسی جگہ ہے کہ دم کا بھروسہ نہیں ہے۔ اگر رات ہے تو کل کے دن کی زندگی کا علم نہیں ہے۔ اگر دن ہے تو رات کی زندگی کی خبر نہیں۔ اس لیے سمجھنا چاہیئے کہ اس سلسلہ کے دو حصے ہیں۔

ایک حصہ تو عقائد کا ہے۔ مختصراً یاد رکھو کہ جو بدعات ان میں حال کے لوگوں یا درمیانی لوگوں نے ملا دیئے ہیں اُن سے پرہیز کیا جاوے۔ یہ تصرف اسی قسم کا ہے کہ کچھ تو بدعات تک رہا ہے اور کچھ اس سے بڑھ کر شرک ہو گیا ہے۔ جیسے عیسیٰؑ کو ایک خاص خصوصیت کل بنی نوع انسان و انبیاء و رسل سے دی جاتی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باہر رکھا جاتا ہے جس سے آپ کی بڑی توہین لازم آتی ہے حالانکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اور جب عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے اخلاق کیا ہیں تو اس نے کہا قرآن شریف آپ کا خُلق ہے جیسے عیسائی لوگ مسیح کی تعظیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں۔ ویسے ہی آج کل کے مسلمان بھی کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ مسیح کو خدا بناتے ہیں اور یہ خدا کے برابر اسے قرار دیتے ہیں جیسے ایک میّت پڑی ہوئی ہو تو ایک شخص تو اسے مُردہ کہے گا دوسرا مُردہ نہ کہے بلکہ مُردہ والے صفات سب اس میں بتلاوے۔

مسیح کے بارے میں اس قدر غلو کیا گیا ہے کہ گویا عیسائیوں کے ساتھ ہاتھ ملا دیا ہے وہ توحید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے اس کا نام تک ان میں نہیں رہا۔ صلیبی مذہب کس زور سے پھیل رہا ہے جس کا ذکر میں نے ابھی چند دن ہوئے کیا تھا۔ پس جب یہ حال ہے تو عقائد کی درستی بہت ضروری شئے ہے۔ سچا، صحیح اور خدا کی مرضی کے موافق یہی مسئلہ ہے کہ مسیح علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں اور اگر وہ زندہ ہیں تو قرآن شریف باطل ٹھہرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت جو بہت عزت کے قابل ہے یہ ہے کہ آپ اُسے اموات میں یحییٰؑ کے پاس دیکھ

آئے۔ اگر اُن کی رُوح قبض نہیں ہوئی تھی تو دوسرے عالَم میں کیسے چلے گئے۔ تیام توحید کے لیے یہ مسئلہ بہت ضروری ہے کہ مسیح فوت ہو گئے اور جو اسے پورے یقین سے نہیں مانتا خطرہ ہے کہ وہ کہیں عیسائیت سے حصہ نہ لے یا ایک دن عیسائی ہی نہ ہو جائے انسان اسی طرح مُرتد ہوا کرتا ہے کہ ایک ایک جزو چھوڑتا ہوا آخر کار کُل چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے عقائد میں بہت اختلاف نہیں ہے۔ صرف یہی عظیم الشان بات ہے جو خدا نے بتلائی ہے کہ مسیح فوت ہو گیا ہے۔

جو لوگ اس بارہ میں ہماری مخالفت کرتے ہیں اُن کے ہاتھ میں بجُز اقوال کے اَور کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ کہیں کہ قرآن کے مخالف احادیث میں نزول کا لفظ موجود ہے تو جواب ہے۔ کہ اوّل تو وہاں مِنَ السَّمَاءِ نہیں لکھا کہ وہ ضرور آسمان سے ہی آوے گا۔ دوسرے احادیث تو مِنْكُمْ سے بھی بھری پڑی ہیں۔ نزول اصل میں اکرام اور اجلال کا لفظ ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اپنے لیے استعمال فرمایا ہے حتٰی کہ احادیث میں تو دجّال کے لیے بھی نزول کا لفظ آیا ہے۔ پھر کیا یہ سب آسمان سے آئے اور آویں گے۔ قرآن شریف سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ مسیح دوبارہ نہ آوے گا بلکہ یہ بھی کہ وہ مرگیا جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (المائدۃ : ۱۱۸) بتلا رہی ہے۔

دوسرا حصہ یہ ہے کہ انسان صرف عقائد سے ہی نجات نہیں پاتا۔ بلکہ اس کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ خدا نے اس بات پر ہی کفایت نہیں کی کہ انسان کے لیے صرف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُنہ سے کہہ دینا ہی کافی ہو ورنہ قرآن شریف اس قدر ضخیم کتاب نہ ہوتی ایک فقرہ ہی ہوتا۔ عقائد کی مثال ایک باغ کی ہے جس کے بہت عمدہ پھل اور پھول ہوں اور اعمالِ صالحہ وہ مصفّٰی پانی ہے جس کے ذریعہ سے اس باغ کا قیام اور نشو ونما ہوتا ہے ایک باغ خواہ کتنا ہی اعلٰی درجہ کا کیوں نہ ہو لیکن اس کی آبپاشی اگر عمدہ نہ ہو تو آخر خراب ہو جاوے گا۔ اسی طرح اگر عقیدہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو لیکن عمل صالح اگر اس کے ساتھ نہ ہوگا تو شیطان آکر تباہ کر دیگا۔

تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی تک کُل اہلِ اسلام کا یہی مذہب رہا ہے کہ کل نبی فوت ہو گئے ہیں چنانچہ صحابہ کرامؓ کا بھی یہی مذہب تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ حضرت عمرؓ وفات کے منکر تھے اور وہ آپ کو زندہ ہی مانتے تھے۔ آخر ابوبکرؓ نے آکر مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران : ۱۴۵) کی آیت سنائی تو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کو آپ کی موت کا یقین آیا اور اگر صحابہ کرامؓ کا یہ عقیدہ ہوتا کہ کوئی نبی زندہ ہے تو سب اُٹھ کر ابوبکرؓ کی خبر لیتے کہ ہمارا عقیدہ مسیح کی نسبت ہے کہ وہ زندہ ہے تو تُو کیسے کہتا ہے کہ سب نبی فوت ہو گئے؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہ ہوں۔ اگر بعض مرتے اور بعض زندہ ہوتے تو کسی قسم کا افسوس نہ ہوتا۔ مگر غریب سے لے کر امیر تک سب مرتے ہیں پھر مسیح کو کیسے زندہ مانا جاوے۔ تیسری صدی کے بعد حیاتِ مسیح کا اعتقاد مسلمانوں میں شامل ہوا

ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ نئے نئے عیسائی مسلمان ہو کر اُن میں ملتے گئے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک نئی قوم کسی مذہب میں داخل ہو تو اپنے مذہب کی رسوم اور بدعات جو وہ ہمراہ لاتی ہے۔ اس کا کچھ حصّہ نئے مذہب میں مل جاتا ہے۔ ایسے ہی عیسائی جب مسلمان ہوئے تو یہ خیال ہمراہ لائے اور رفتہ رفتہ وہ مسلمانوں میں پختہ ہو گیا ہاں جن لوگوں نے ہمارا زمانہ نہیں پایا نہ اس مسئلہ پر انہوں نے بحث کی وہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (البقرة: ۱۳۵) کے مصداق ہوئے لیکن اب جو ہمارے مقابلہ پر آئے اور اتمام حجّت ان پر ہوا وہ قابلِ اعتراض ٹھہر گئے ہیں اگر ان لوگوں کے اعمال صالحہ ہوتے تو یہ عقیدہ ان میں رواج نہ پاتا۔ جب وہ چھوٹ گئے تو ایسے ایسے عقائد شامل ہو گئے۔

اعمالِ صالحہ کثرت سے بجا لائیں۔

پس جو شخص ایمان کو قائم رکھنا چاہتا ہے وہ اعمالِ صالحہ میں ترقی کرے۔ یہ روحانی اُمور ہیں اور اعمال کا اثر عقائد پر پڑتا ہے جن لوگوں نے بدکاری وغیرہ اختیار کی ہے ان کو دیکھو تو آخر معلوم ہو گا کہ اُن کا خدا پر ایمان نہیں ہے۔ حدیث شریف میں اسی لیے ہے کہ چور جب چوری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور زانی جب زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ اس کی بداعمالی نے اُس کے سچے اور صحیح عقیدہ پر اثر ڈال کر اُسے ضائع کر دیا ہے۔ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ اعمالِ صالحہ کثرت سے بجا لاوے۔ اگر اس کی بھی یہی حالت رہی جیسے اوروں کی تو پھر امتیاز کیا ہوا؟ اور خدا تعالیٰ کو ان کی رعایت اور حفاظت کی کیا ضرورت؟ خدا تعالیٰ اسی وقت رعایت کرے گا جب تقویٰ، طہارت اور سچی اطاعت سے اُسے خوش کرو گے۔ یاد رکھو کہ اس کا کسی سے کچھ رشتہ نہیں ہے۔ محض لاف اور یاوہ گوئی سے کوئی بات نہیں بنا کرتی۔

سچی اطاعت ایک موت ہے جو نہیں بجا لاتا وہ خدا تعالیٰ سے شطرنج بازی کرتا ہے کہ مطلب کے وقت تو خدا سے خوش ہوتا ہے اور جب مطلب نہ ہو تو ناراض ہو گیا۔ مومن کا یہ دستور نہیں چاہیئے۔ بھلا غور تو کرو کہ اگر خدا تعالیٰ ہر ایک میدان میں کامیابی دیتا رہے اور کوئی ناکامی کی صورت کبھی پیش نہ آوے تو کیا سب جہان موحد نہیں ہو سکتا؟ اور خصوصیت کیا رہے گی۔ اسی لیے جو مصیبت میں وفا اور صدق رکھے گا خدا تعالیٰ اسی سے خوش ہو گا۔

نماز کو سنوار کر ادا کریں

نماز ایسے ادا نہ کرو جیسے مُرغی دانے کے لیے ٹھونگ مارتی ہے بلکہ سوز و گداز سے ادا کرو اور دعائیں بہت کیا کرو۔ نماز مشکلات کی کُنجی ہے۔ ماثورہ دُعاؤں اور کلمات کے سوا اپنی مادری زبان میں بھی بہت دُعا کیا کرو تا اس سے سوز و گداز کی تحریک ہو اور جب تک سوز و گداز نہ ہو اسے ترک مت کرو کیونکہ اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور سب کچھ ملتا ہے۔ چاہیئے کہ نماز کی جس قدر جسمانی صورتیں ہیں ان سب کے ساتھ دل بھی ویسے ہی تابع ہو۔ اگر جسمانی طور پر کھڑے ہو تو دل

بھی خدا کی اطاعت کے لیے ویسے ہی کھڑا ہو۔ اگر جُھکو تو دل بھی ویسے ہی جُھکے۔ اگر سجدہ کرو تو دل بھی ویسے ہی سجدہ کرے۔ دل کا سجدہ یہ ہے کہ کسی حال میں خدا کو نہ چھوڑے جب یہ حالت ہو گی تو گناہ دُور ہونے شروع ہو جاویں گے۔ معرفت بھی ایک شئے ہے جو کہ گناہ سے انسان کو روکتی ہے۔ جیسے جو شخص سم الفار، سانپ اور شیر کو ہلاک کرنے والا جانتا ہے تو وہ ان کے نزدیک نہیں جاتا۔ ایسے جب تم کو معرفت ہو گی تو تم گناہ کے نزدیک نہ پھٹکو گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یقین بڑھاؤ اور وہ دعا سے بڑھے گا اور نماز خود دُعا ہے نماز کو جس قدر سنوار کر ادا کرو گے اسی قدر گناہوں سے رہائی پاتے جاؤ گے۔ معرفت صرف قول سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بڑے بڑے حکیموں نے خدا کو اس لیے چھوڑ دیا کہ ان کی نظر مصنوعات پر رہی اور دعا کی طرف توجہ نہ کی جیسا کہ ہم نے براہین میں ذکر کیا ہے۔ مصنوعات سے تو انسان کو ایک صانع کے وجود کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ ایک فاعل ہونا چاہیئے لیکن یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ ہے بھی۔ "ہونا چاہیئے" اَور شئے ہے اور "ہے" اَور شئے ہے اس "ہے" کا علم سوائے دُعا کے نہیں حاصل ہوتا۔ عقل سے کام لینے والے "ہے" کے علم کو نہیں پا سکتے۔ اسی لیے ہے کہ خدا را بخدا تواں شناخت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے بھی یہی معنے ہیں کہ وہ صرف عقلوں کے ذریعہ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا بلکہ خود جو ذریعے (اس) نے بتلائے ہیں ان سے ہی اپنے وجود کو شناخت کرواتا ہے اور اس امر کے لیے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ ۶، ۷) جیسی اور کوئی دُعا نہیں ہے۔

اپنے بھائی کی غلطی دیکھ کر اس کیلئے دُعا کرو

صلاح تقویٰ، نیک بختی اور اخلاقی حالت کو درست کرنا چاہیئے۔ مجھے اپنی جماعت کا یہ بڑا غم ہے کہ ابھی تک یہ لوگ آپس میں ذرا سی بات سے چڑ جاتے ہیں عام مجلس میں کسی کو احمق کہہ دینا بھی بڑی غلطی ہے اگر اپنے کسی بھائی کی غلطی دیکھو تو اس کے لیے دعا کرو کہ خدا اسے بچالیوے۔ یہ نہیں کہ منادی کرو۔ جب کسی کا بیٹا بدچلن ہو تو اس کو سر دست کوئی ضائع نہیں کرتا بلکہ اندر ایک گوشہ میں سمجھاتا ہے کہ یہ بُرا کام ہے اس سے باز آجا۔ پس جیسے رفق، حلم اور ملائمت سے اپنی اولاد سے معاملہ کرتے ہو ویسے ہی آپس میں بھائیوں سے کرو۔ جس کے اخلاق اچھے نہیں ہیں مجھے اس کے ایمان کا خطرہ ہے کیونکہ اس میں تکبر کی ایک جڑ ہے اگر خدا راضی نہ ہو تو گویا یہ برباد ہو گیا۔ پس جب اس کی اپنی اخلاقی حالت کا یہ حال ہے تو اُسے دوسرے کو کہنے کا کیا حق ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے[1]

---

[1] البدر میں یہاں جگہ چھوٹی ہوئی ہے جو کاتب سے لکھنی رہ گئی ہے اور وہ آیت یہ معلوم ہوتی ہے۔ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (البقرۃ: ۴۵) (مرتب)

اس کا یہی مطلب ہے کہ اپنے نفس کو فراموش کر کے دوسرے کے عیوب کو نہ دیکھتا رہے بلکہ چاہیئے کہ اپنے عیوب کو دیکھے۔ چونکہ خود تو وہ پابند ان امور کا نہیں ہوتا اس لیے آخر کار لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الصف:۳) کا مصداق ہو جاتا ہے۔

تقویٰ حاصل کرنے کا طریق

اخلاص اور محبت سے کسی کو نصیحت کرنی بہت مشکل ہے لیکن بعض وقت نصیحت کرنے میں بھی ایک پوشیدہ بغض اور کبر ملا ہوا ہوتا ہے اگر خالص محبت سے وہ نصیحت کرتے ہوتے تو خدا تعالےٰ اُن کو اس آیت کے نیچے نہ لاتا۔ بڑا سعید وہ ہے جو اوّل اپنے عیوب کو دیکھے۔ ان کا پتہ اس وقت لگتا ہے جب ہمیشہ امتحان لیتا رہے۔ یاد رکھو کہ کوئی پاک نہیں ہو سکتا جب تک خدا اسے پاک نہ کرے۔ جب تک اتنی دُعا نہ کرے کہ مَر جاوے تب تک سچی تقوےٰ حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے دُعا سے فضل طلب کرنا چاہیئے۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ اُسے کیسے طلب کرنا چاہیئے تو اس کے لیے تدبیر سے کام لینا ضروری ہے جیسے ایک کھڑکی سے اگر بدبُو آتی ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ یا اس کھڑکی کو بند کرے یا بدبُودار شئے کو اُٹھا کر دُور پھینک دے۔ پس کوئی اگر تقویٰ چاہتا ہے اور اس کے لیے تدبیر سے کام نہیں لیتا تو وہ بھی گستاخ ہے کہ خدا کے عطا کردہ قویٰ کو بیکار چھوڑتا ہے۔ ہر ایک عطاء الٰہی کو اپنے محل پر صَرف کرنا اس کا نام تدبیر ہے جو ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ ہاں جو نری تدبیر پر بھروسہ کرتا ہے وہ بھی مشرک ہے اور اسی بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے جس میں یورپ ہے۔ تدبیر اور دُعا دونو کا پورا حق ادا کرنا چاہیئے تدبیر کر کے سوچے اور غور کرے کہ مَیں کیا شئے ہوں۔ فضل ہمیشہ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ ہزار تدبیر کرو ہرگز کام نہ آوے گی جب تک آنسو نہ بہیں۔ سانپ کے زہر کی طرح انسان میں زہر ہے اس کا تریاق دُعا ہے جس کے ذریعہ سے آسمان سے چشمہ جاری ہوتا ہے۔ جو دُعا سے غافل ہے وہ مارا گیا۔ ایک دن اور رات جس کی دُعا سے خالی ہے وہ شیطان سے قریب ہوا۔ ہر روز دیکھنا چاہیئے کہ جو حق دُعاؤں کا تھا وہ ادا کیا ہے کہ نہیں۔ نماز کی ظاہری صورت پر اکتفا کرنا نادانی ہے۔ اکثر لوگ رسمی نماز ادا کرتے ہیں اور بہت جلدی کرتے ہیں جیسے ایک ناواجب ٹیکس لگا ہوا ہے۔ جلدی گلے سے اُتر جاوے۔ بعض لوگ نماز تو جلدی پڑھ لیتے ہیں لیکن اس کے بعد دعا اس قدر لمبی مانگتے ہیں کہ نماز کے وقت سے دُگنا تگنا وقت لے لیتے ہیں حالانکہ نماز تو خود دُعا ہے جس کو یہ نصیب نہیں ہے کہ نماز میں دُعا کرے اس کی نماز ہی نہیں۔ چاہیئے کہ اپنی نماز کو دُعا سے مثل کھانے اور سرد پانی کے لذیذ اور مزیدار کر لو ایسا نہ ہو کہ اس پر وَیل ہو۔

فضائلِ نماز

نماز خدا کا حق ہے اُسے خوب ادا کرو اور خدا کے دشمن سے مداہنہ کی زندگی نہ برتو۔ وفا اور صدق کا خیال رکھو۔ اگر سارا گھر غارت ہوتا ہو تو ہونے دو مگر نماز

کو ترک مت کرو۔ وہ کافر اور منافق ہیں جو کہ نماز کو منحوس کہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ نماز کے شروع کرنے سے ہمارا فلاں فلاں نقصان ہوا ہے۔ نماز ہرگز خدا کے غضب کا ذریعہ نہیں ہے۔ جو اُسے منحوس کہتے ہیں اُن کے اندر خود زہر ہے جیسے بیمار کو شیرینی کڑوی لگتی ہے ویسے ہی اُن کو نماز کا مزا نہیں آتا۔ یہ دین کو درست کرتی ہے۔ اخلاق کو درست کرتی ہے۔ دُنیا کو درست کرتی ہے۔ نماز کا مزا دنیا کے ہر ایک مزے پر غالب ہے۔ لذاتِ جسمانی کے لیے ہزاروں خرچ ہوتے ہیں اور پھر ان کا نتیجہ بیماریاں ہوتی ہیں اور یہ مفت کا بہشت ہے جو اُسے ملتا ہے۔ قرآن شریف میں دو جنتوں کا ذکر ہے ایک ان میں سے دنیا کی جنت ہے اور وہ نماز کی لذت ہے۔

نماز خواہ نخواہ کا ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبودیت کو ربوبیت سے ایک ابدی تعلق اور کشش ہے۔ اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے خدا تعالیٰ نے نماز بنائی ہے اور اس میں ایک لذّت رکھدی ہے جس سے یہ تعلق قائم رہتا ہے۔ جیسے لڑکے اور لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے اگر اُن کے ملاپ میں ایک لذت نہ ہو تو فساد ہوتا ہے۔ ایسے ہی اگر نماز میں لذّت نہ ہو تو وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ دروازہ بند کرکے دُعا کرنی چاہیئے کہ وہ رشتہ قائم رہے اور لذت پیدا ہو۔ جو تعلق عبودیت کا ربوبیت سے ہے وہ بہت گہرا اور اَنوار سے پُر ہے جس کی تفصیل نہیں ہو سکتی۔ جب وہ نہیں ہے تب تک انسان بہائم ہے۔ اگر دو چار دفعہ بھی لذّت محسوس ہو جائے تو اس چاشنی کا حصہ مل گیا، لیکن جسے دو چار دفعہ بھی نہ ملا وہ اندھا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل:۷۳) آئندہ کے سب وعدے اسی سے وابستہ ہیں۔ ان باتوں کو فرض جان کر ہم نے بتلا دیا ہے۔

اپنی ہمدردی کو صرف مسلمانوں تک محدود نہ رکھو

تکبر دوسرے کا حقیقی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ اپنی ہمدردی کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ رکھو بلکہ ہر ایک کے ساتھ کرو۔ اگر ایک ہندو سے ہمدردی نہ کرو گے تو اسلام کے سچے وصایا اُسے کیسے پہنچاؤ گے؟ خدا سب کا رب ہے۔ ہاں مسلمانوں کی خصوصیت سے ہمدردی کرو اور پھر متقی اور صالحین کی اس سے زیادہ خصوصیت سے۔ مال اور دُنیا سے دل نہ لگاؤ۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ تجارت وغیرہ چھوڑ دو بلکہ دل با یار اور دست با کار رکھو۔ خدا کاروبار سے نہیں روکتا ہے بلکہ دنیا کو دین پر مقدم رکھنے سے روکتا ہے۔ اس لیے تم دین کو مقدم رکھو۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۵ تا ۷ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء)

۲۷؍فروری ۱۹۰۴ء

(دربارِشام)

آج اعلیحضرت حجۃ اللہ علی الارض علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسجد کے بالائی حصہ پر نماز مغرب ادا کی اور بعد ادائے نماز مغرب شہ نشین پر اجلاس فرما ہوئے۔ چند مہمانوں نے اجازت روانگی حاصل کی۔ بعض احباب خصوصاً سید تفضل حسین صاحب اٹاوی (جو گیارہ سال کے بعد آئے تھے) کو خطاب کر کے فرمایا کہ:

آمدن بارادت رفتن باجازت۔ آپ تو سمجھتے ہی ہیں کہ کب تک آپ کو ٹھہرنا چاہیئے۔[1]

اسی ضمن میں طاعون کی شدت کا ذکر ہوگیا۔ اس پر آپ نے سلسلہ کلام یوں فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ کیساتھ معاملہ صاف کرو

حقیقت میں سچے مسلمان بننے کا اب وقت آیا ہے۔[2] یقین بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ پر جس قسم کا یقین انسان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ پس ضروری امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف کرو تا وہ بھی تم پر رحم کرے۔ کیونکہ سچ یہی ہے۔ مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ۔

طاعون سے وفات

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ بھی طاعون سے فوت ہوئے۔[3] لیکن اُن کے لیے وہ شہادت تھی، مومن کے واسطے یہ شہادت

---

[1] البدر میں یہ ڈائری یوں درج ہے:۔

چند ایک احباب نے اپنی واپسی کی اشد ضروریات پیش کیں۔ ان کو رُخصت عطا فرمائی گئی لیکن عالیجناب محمد ابراہیم خاں صاحب شریف بن حاجی موسیٰ خاں صاحب برادر زادہ خاں بہادر مراد خاں مرحوم آمدہ از کراچی کی رخصت طلبی پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ "یہ چند دن اور رہیں آمدن بارادت رفتن باجازت" اور اسی طرح جناب تفضل حسین صاحب پنشنر تحصیلدار۔ رئیس اٹاوہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ

"اب توان کو بھی فراغت ہے اور ایک عرصہ کے بعد آئے ہیں۔ یہ بھی چند دن رہیں"

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۳ مورخہ ۱۶؍مارچ ۱۹۰۴ء)

[2] البدر سے:۔ "اس کے سوا گذارہ نہیں" (البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر میں ہے:۔ "بعض صحابہ اور اُن کی اولاد بھی طاعون سے فوت ہوئے تھے" (البدر حوالہ مذکور)

ہی ہے - پہلی اُمّتوں پر رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (البقرۃ: ۶۰) تھی ۔صحابہؓ کس قدر اعلیٰ درجہ رکھتے تھے لیکن ان میں سے بھی اس کا نشانہ ہو گئے ۔ اس سے اُن کے مومن ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ ابو عبیدہ بن الجراح جیسے صحابی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بڑے ہی عزیز تھے طاعون ہی سے شہید ہوئے تھے ۔ طاعون سے مرنا عام مومنوں کے لیے تو کوئی حرج نہیں ۔ البتہ جہاں انتظامِ الٰہی میں فرق آتا ہے وہاں خدا تعالیٰ ایسا معاملہ نہیں کرتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا کوئی مامور و مرسل طاعون کا شکار نہیں ہو سکتا اور نہ کسی اَور خبیث مرض سے ہلاک ہوتا ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے انتظام میں بڑا نقص اور خلل پیدا ہوتا ہے ۔ پس انبیاء و رسل اور خدا کے ماموران امراض سے بچائے جاتے ہیں اور یہی نشان ہوتا ہے ۔

صحابہؓ کی خصوصیت پر ضمنی تذکرہ

حضرت حکیم الامت نے عرض کی کہ حضور یہ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہؓ میں سے ایک بھی بہرہ نہ تھا۔[1]

اس پر امام الملۃ نے فرمایا کہ

چونکہ اس وقت خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہو رہا تھا اور اس امر کی ضرورت تھی کہ صحابہؓ اُسے سُنیں اور روایت کرکے دوسروں تک پہنچائیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے صحابہؓ کو اس بہرہ پن سے محفوظ رکھا ۔ ایسے وقت اگر آنکھ نہ ہو تو کام ہو سکتا ہے لیکن کان کے بغیر کام نہیں چل سکتا ۔ ان حقائق و معارف کو جو خدا تعالیٰ کا مرسل لے کر آتا ہے سننے کی بہت بڑی ضرورت ہوتی ہے ۔

پہلے کلام کی طرف رجوع

غرض یہ مقام ڈرنے کا ہے کیونکہ طاعون بڑی شدت کے ساتھ پھیل رہی ہے اور جو اس وقت بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ صاف نہیں کرتا وہ بڑے خطرہ کی حالت میں ہے ۔ نفاق کام نہیں دیگا ۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ (الانعام: ۸۳) بعض وقت انسان موجودہ حالتِ امن پر بھی بے خطر ہو جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ امن میں زندگی گذارتا ہوں مگر یہ غلطی ہے کیونکہ یہ تو معلوم نہیں ہے کہ سابقہ زندگی میں کیا ہوا ہے اور کیا کیا بے اعتدالیاں اور کمزوریاں ہو چکی ہیں ۔ اسی واسطے مومن کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ کبھی بے خوف نہ ہو اور ہر وقت توبہ اور استغفار کرتا رہے کیونکہ استغفار سے انسان بدیوں کے بُرے نتائج سے بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے بچ رہتا ہے ۔ یہ سچی بات ہے کہ توبہ اور

---

[1] البدر میں ہے :۔ "ہاں اندھے تھے" (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۳)

استغفارؔ سے گناہ بخشے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔ (البقرۃ: ۲۲۳)

سچی توبہ کرنے والا معصوم کے رنگ میں ہوتا ہے۔ پچھلے گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں پھر آئندہ کے لیے خدا سے معاملہ صاف کرلے۔ اس طرح پر خدا کے اولیاء میں داخل ہو جائیگا اور پھر اس پر کوئی خوف وحزن نہ ہوگا جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (یونس: ۶۳)

اولیاء اللہ

خدا تعالیٰ نے اُن کو اپنا ولی کہا ہے حالانکہ وہ بے نیاز ہے۔ اس کو کسی کی حاجت نہیں۔ اس لیے استغناء ایک شرط کے ساتھ ہے وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ (بنی اسرائیل: ۱۱۲) یہ بالکل سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ تھڑ کر کسی کو ولی نہیں بناتا؎ بلکہ محض اپنے فضل اور عنایت سے اپنا مقرب بنالیتا ہے۔ اس کو کسی کی کوئی حاجت نہیں ہے اس ولایت اور قرب کا فائدہ بھی اسی کو پہنچتا ہے۔ ہزاروں ہزار فوائد اور امور ہوتے ہیں جو اس کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسکی دُعائیں قبول کرتا ہے اور نہ صرف اسکی دُعائیں قبول کرتا ہے بلکہ اس کے اہل وعیال۔ اس کے احباب کے لیے بھی برکات عطا کرتا ہے اور صرف یہانتک ہی نہیں بلکہ ان مقاموں میں برکت دی جاتی ہے جہاں وہ ہوتے ہیں اور اُن زمینوں میں برکت رکھی جاتی ہے اور ان کپڑوں میں برکت دی جاتی ہے جن میں وہ ہوتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ولی اللہ بننا ہی مشکل ہے بلکہ اس مقام کا سمجھنا ہی دشوار ہوتا ہے کہ یہ کس حالت میں کہا جاوے گا کہ وہ خدا کا ولی ہے۔ انسان انسان کے ساتھ ظاہرداری میں خوشامد کرسکتا ہے اور اس کو خوش کرسکتا ہے خواہ دل میں ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہو۔ ایک شخص کو خیر خواہ کہہ سکتے ہیں مگر حقیقت میں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ خیر خواہ ہے یا کیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو خوب جانتا ہے کہ اس کی اطاعت ومحبت کس رنگ سے ہے

؎ البدر سے:۔ اللہ تعالیٰ میں یہ صفت مومن کے لیے بہت ہی مفید ہے کہ توبہ اور استغفار سے اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو پھر انسان کی بالکل تباہی ہو جاتی۔ یہ بہت ہی بڑی صفت ہے کہ اسکی بارگاہ میں سچی توبہ کرنے سے انسان بالکل معصوم ہو جاتا ہے گویا اس نے کبھی کوئی گناہ کیا ہی نہ تھا"

(البدر جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۳)

؎ البدر میں ہے:۔ "خدا تعالیٰ کی ولایت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کو کوئی ایسی احتیاج ہے جیسے ایک انسان کو دوست کی ہوتی ہے یا تھڑ کر خدا تعالیٰ کسی کو اپنا دوست بنالیتا ہے بلکہ اس کے معنے ہیں فضل اور عنایت سے خدا تعالیٰ کسی کو اپنا بنالیتا ہے اور اس سے اس شخص کو فائدہ پہنچتا ہے نہ کہ خدا کو" (البدر جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۳)

پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ فریب اور دغا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس کو دھوکا نہیں دے سکتا۔[1] جب تک سچے اخلاص اور پوری وفاداری کے ساتھ یک رنگ ہو کر خدا تعالیٰ کا نہ بن جاوے کچھ فائدہ نہیں۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا اجتبا اور اصطفا فطرتی جوہر سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے گذشتہ زندگی میں وہ کوئی صغائر یا کبائر رکھتا ہو لیکن جب اللہ تعالیٰ سے اس کا سچا تعلق ہو جاوے تو وہ کل خطائیں بخش دیتا ہے اور پھر اس کو کبھی شرمندہ نہیں کرتا نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ کس قدر احسان اللہ تعالیٰ کا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ درگذر کرتا اور عفو فرماتا ہے پھر اس کا کبھی ذکر ہی نہیں کرتا۔ اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ پھر باوجود ایسے احسانوں اور فضلوں کے بھی اگر وہ منافقانہ زندگی بسر کرے تو پھر سخت بدقسمتی اور شامت ہے۔

صفائی قلب

برکات اور فیوضِ الٰہی کے حصول کے واسطے دل کی صفائی کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے۔ جب تک دل صاف نہ ہو کچھ نہیں۔ چاہیئے کہ جب اللہ تعالیٰ دل پر نظر ڈالے تو اس کے کسی حصہ یا کسی گوشہ میں کوئی شعبہ نفاق کا نہ ہو۔ جب یہ حالت ہو تو پھر الٰہی نظر کیساتھ تجلیات آتی ہیں اور معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ایسا وفادار اور صادق ہونا چاہیئے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنا صدق دکھایا یا جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونہ دکھایا۔ جب انسان اس نمونہ پر قدم مارتا ہے تو وہ بابرکت آدمی ہو جاتا ہے۔ پھر دُنیا کی زندگی میں کوئی ذلت نہیں اُٹھاتا اور نہ تنگیٔ رزق کی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ اس پر خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو لعنتی زندگی[2] سے ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ جو خدا تعالیٰ سے سچا اور کامل تعلق رکھتا ہو تو خدا تعالیٰ اس کی ساری مرادیں پوری کر دیتا ہے اسے نامراد نہیں رکھتا۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ قادر و کریم کا اقتضاء

اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں بڑی قابلِ غور ہیں اور ان صفات پر ایمان لانے سے بھی اُمید وسیع ہوتی اور مومن کا یقین زیادہ ہوتا ہے۔ وہ صفات اس کے قادر اور کریم ہونے کی ہیں جب تک یہ دونوں باتیں نہ ہوں۔ کوئی فیض نہیں ملتا ہے دیکھو اگر کوئی شخص کریم تو ہو اور اس کے پاس ہو تو ہزاروں روپیہ دے دینے میں بھی اُسے تامل اور دریغ نہ ہو لیکن اس کے گھر میں کچھ بھی نہ ہو تو اس کی صفتِ کریمی کا کیا فائدہ؟ یا اس کے پاس روپیہ تو بہت ہو مگر کریم نہ ہو پھر اس سے کیا حاصل؟ مگر خدا تعالیٰ میں یہ دونوں باتیں ہیں وہ قادر ہے اور کریم بھی ہے

---

[1] البدر سے:۔ "وہ خوب جانتا ہے کہ ہر ایک کا اندرونہ کیسا ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۳)

[2] البدر میں ہے:۔ "تب خدا تعالیٰ اسے لعنتی موت سے محفوظ رکھتا ہے۔" (ایضاً)

اوران دونوں صفتوں میں بھی وہ وحدہ لاشریک ہے۔

پس جب ایسی قادر اور کریم ذات کے ساتھ کوئی کامل تعلق پیدا کرے تو اس سے بڑھ کر خوش قسمت کون ہوگا؛ بڑا ہی مبارک اور خوش قسمت ہے وہ شخص جو اس کا فیصلہ کرلے۔ سرمد نے کیا اچھا کہا ہے ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے یار می باید کرد
یا قطع نظر زیار می باید کرد

حقیقت میں اس نے سچ کہا ہے۔ بیمار اگر طبیب کی پوری اطاعت نہیں کرتا تو اس سے کیا فائدہ؛ ایک عارضہ نہیں تو دوسرا اس کو لگ جائے گا اور وہ اس طرح پر تباہ اور ہلاک ہوگا۔ دنیا میں اس قدر آفتوں سے انسان گھرا ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل اس کے شامل حال نہ ہو اور اس کے ساتھ سچا تعلق نہ ہو تو پھر سخت خطرہ کی حالت ہے۔ پنجابی میں بھی ایک مصرعہ مشہور ہے ؎

جے توں میرا ہو رہیں سب جگ تیرا ہو

یہ مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ ہی کا ترجمہ ہے۔

جب انسان خدا تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو پھر کچھ شک نہیں۔ ساری دُنیا اُس کی ہو جاتی ہے مگر اس وقت بڑے بڑے مشکلات آکر پڑتے ہیں لوگ ہمارے سلسلہ کی مخالفت کے لیے کیا کیا کوشش نہیں کرتے۔ اس کی عدم ضرورت کے واسطے کہہ دیتے ہیں کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ ہم نماز اور کلمہ نہیں پڑھتے؛ جو لوگ اس قسم کے اعتراض کرتے ہیں وہ آخر بے نصیب رہ جاتے ہیں۔

برکاتِ نماز کا حصول

اس میں شک نہیں کہ نماز میں برکات ہیں مگر وہ برکات ہر ایک کو نہیں مل سکتے نماز بھی وہی پڑھتا ہے جس کو خدا تعالیٰ نماز پڑھاوے ورنہ وہ نماز نہیں نرا پوست ہے جو پڑھنے والے کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو مغز سے کچھ واسطہ اور تعلق ہی نہیں اسی طرح کلمہ بھی وہی پڑھتا ہے جس کو خدا تعالیٰ کلمہ پڑھوائے۔ جب تک نماز اور کلمہ پڑھنے میں آسمانی چشمہ سے گھونٹ نہ ملے تو کیا فائدہ؟ وہ نماز جس میں حلاوت اور ذوق ہو اور خالق سے سچا تعلق قائم ہو کر پوری نیاز مندی اور خشوع کا نمونہ ہو اس کے ساتھ ہی ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جس کو پڑھنے والا فوراً محسوس کر لیتا ہے کہ اب وہ وہ نہیں رہا جو چند سال پہلے تھا۔

ؒ

ابدال

جب یہ تبدیلی اس کی حالت میں پیدا ہوتی ہے اس وقت اس کا نام ابدال ہوتا ہے احادیث میں جو ابدال آیا ہے اس سے یہی مراد لی گئی ہے کہ کامل انقطاع اور تبتل کے ساتھ جب خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے اپنی حالت میں تبدیلی کرے جیسے قیامت میں بہشتیوں میں تبدیلیاں ہوں گی کہ وہ چاند یا ستاروں کی مانند ہوں گے اسی طرح پر اس دنیا میں بھی ان کے اندر ہونی ضروری ہے تاکہ وہ اس تبدیلی پر شہادت ہو۔ اسی لیے فرمایا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ (الرحمٰن: ۴۷) چونکہ اس دنیا میں بھی ایک بہشت ہے جو مومن کو دیا جاتا ہے۔ اس کے موافق ایک تبدیلی بھی یہاں ہوتی ہے اس کو ایک خاص قسم کا رُعب دیا جاتا ہے جو الٰہی تجلیات کے پرتو سے ملتا ہے۔ نفسِ امارہ کے جذبات سے اس کو روک دیا جاتا ہے اور نفسِ مطمئنہ کی سکینت اور اطمینان اس کو ملتا ہے۔ اس کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہانتک کہ جیسے ابراہیم علیہ السلام کو کہا گیا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ (الانبیاء: ۷۰) اسی طرح پر اس کے لیے کہا جاتا ہے یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا (الانبیاء: ۷۰) اس آواز پر اس کے سارے جوشوں کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ میں ایک راحت اور اطمینان پالیتا ہے اور ایک تبدیلی اس میں پیدا ہو جاتی ہے جب تک یہ تبدیلی نہ ہو نماز، روزہ، کلمہ، زکوٰۃ وغیرہ ارکان محض رسمی اور نمائشی طور پر ہیں۔ ان میں کوئی روح اور قوت نہیں ہے اور ایسا انسان خطرہ کی حالت سے نکل کر امن میں آجاتا ہے۔

یاد رکھو جب انسان کا وجود خدا کی محبت میں گم ہو جائے اس وقت وہ جان لے کہ خدا سچی محبت رکھتا ہے کیونکہ دل را بدل رہیست مشہور ہے۔

اہل و عیال کا تہیہ

بہت سے لوگ جو اہل و عیال کا تہیہ کرتے ہیں اور ان کے سارے ہم و غم اسی پر آکر ختم ہو جاتے ہیں کہ اُن کی اولاد ان کے بعد اُن کے مال و اسباب اور جائیداد کی مالک اور جانشین ہو۔ اگر انسان اسی حد تک محدود ہے اور وہ خدا کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا تو یہ جہنمی زندگی ہے اس کو اس سے کیا فائدہ ؟ جب یہ مر گیا تو پھر کیا دیکھنے آئے گا کہ اس کی جائیداد کا کون مالک ہوا ہے اور اس سے اس کو کیا آرام پہنچے گا اس کا تو قصہ پاک ہو چکا اور یہ کبھی پھر دنیا میں نہیں آئیگا اس لیے ایسے ہمّ و غم سے کیا حاصل جو دنیا میں جہنمی زندگی کا نمونہ ہے اور آخرت میں بھی عذاب دینے والا۔

مُردوں کا واپس آنا

قرآن شریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردوں کے واپس نہ آنے کے دو وعدے ہیں۔ ایک جہنمیوں کے لیے جیسے فرمایا وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (الانبیاء: ۹۶) اَهْلَكْنٰهَا عذاب پر بھی آتا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ خراب زندگی کے لوگ پھر واپس نہیں آئیں گے اور ایسا ہی بہشتیوں کے لیے بھی آیا ہے ۔

لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (الکھف: ۱۰۹)

مسیح کا عدمِ رجوع

دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور دونو کا عدمِ رجوع ثابت ہے پر معلوم نہیں کہ مسیح کو کس طرح پر واپس لاتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کا پھر آنا فضول ہے اور جو شخص قرآنِ کریم کی اس شہادت اور پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کو منظور نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مُردوں میں یحییٰ کے پاس دیکھ آئے ہیں اس پر بھی جو انکار کرتا ہے وہ خبیث ہے۔

اولاد اور دوسرے متعلّقین کی مناسب خبر گیری

غرض جبکہ یہ ثابت ہے کہ پھر اس دُنیا میں واپس آنا نہیں ہے اور یہاں سے سب قصّہ تمام کر کے جائیں گے اور پھر دُنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا تو املاک و اسباب کا خیال کرنا کہ اس کا وارث کوئی ہو یہ شرکاء کے قبضہ میں نہ چلے جاویں فضول اور دیوانگی ہے۔ ایسے خیالات کے ساتھ دین جمع نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ منع نہیں بلکہ جائز ہے کہ اس لحاظ سے اولاد اور دوسرے متعلّقین کی خبر گیری کرے کہ وہ اس کے زیر دست ہیں تو پھر یہ بھی ثواب اور عبادت ہی ہوگی اور خدا تعالیٰ کے حکم کے نیچے ہوگا جیسے فرمایا ہے وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (الدھر: ۹) اس آیت میں مسکین سے مراد والدین بھی ہیں کیونکہ وہ بوڑھے اور ضعیف ہو کر بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس وقت اُن کی خدمت ایک مسکین کی خدمت کے رنگ میں ہوتی ہے اور اسی طرح اولاد جو کمزور ہوتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی اگر یہ اُس کی تربیت اور پرورش کے سامان نہ کرے تو وہ گویا یتیم ہی ہے پس ان کی خبر گیری اور پرورش کا تہیہ اس اصول پر کرے۔ تو ثواب ہوگا۔

اور بیوی اسیر کی طرح ہے اگر یہ عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء: ۲۰) پر عمل نہ کرے تو وہ ایسا قیدی ہے جس کی کوئی خبر لینے والا نہیں ہے۔

غرض ان سب کی غور و پرداخت میں اپنے آپ کو بالکل الگ سمجھے اور اُن کی پرورش محض رحم کے لحاظ سے کرے نہ کہ جانشین بنانے کے واسطے بلکہ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (الفرقان: ۷۵) کا لحاظ ہو کہ یہ اولاد دین کی خادم ہو[1] لیکن کتنے ہیں جو اولاد کے واسطے یہ دُعا کرتے ہیں[2] کہ اولاد دین کی پہلوان ہو۔ بہت ہی تھوڑے

---

[1] البدر سے:۔"کہ اس کے بعد اس کے حق میں دعا کرے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۴)

[2] البدر سے:۔"سوچ کر دیکھو کہ کتنے ایسے ہیں جو اس نیت اور ارادہ سے اولاد کی خواہش کرتے ہیں اور تہجد کے وقت اُٹھ کر خدا تعالیٰ سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے مولا تو ایسی اولاد دے جو متقی ہو۔ تیری راہ میں جان دینے والی ہو۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۵)

ہوں گے جو ایسا کرتے ہوں۔ اکثر تو ایسے ہیں کہ وہ بالکل بے خبر ہیں کہ وہ کیوں اولاد کے لیے یہ کوششیں کرتے ہیں اور اکثر ہیں جو محض جانشین بنانے کے واسطے اور کوئی غرض ہوتی ہی نہیں صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شریک یا غیر ان کی جائداد کا مالک نہ بن جاوے مگر یاد رکھو کہ اس طرح پر دین بالکل برباد ہو جاتا ہے۔

اولاد کی خواہش

غرض اولاد کے واسطے صرف یہ خواہش ہو کہ وہ دین کی خادم ہو۔ اسی طرح بیوی کرے تاکہ اس سے کثرت سے اولاد پیدا ہو اور وہ اولاد دین کی سچی خدمت گزار ہو اور نیز جذباتِ نفس سے محفوظ رہے۔ اس کے سوا جس قدر خیالات ہیں وہ خراب ہیں رحم اور تقویٰ مدِنظر ہو تو بعض باتیں جائز ہو جاتی ہیں[1] اس صورت میں اگر مال بھی چھوڑتا ہے اور جائداد بھی اولاد کے واسطے چھوڑتا ہے تو ثواب ملتا ہے لیکن اگر صرف جانشین بنانے کا خیال ہے اور اس نیت سے سب ہم و غم رکھتا ہے تو پھر گناہ ہے۔ اس قسم کے قصور اور کسریں ہوتی ہیں جن سے تاریکی میں ایمان رہتا ہے لیکن جب ہر حرکت وسکون خدا ہی کے لیے ہو جاوے تو ایمان روشن ہو جاتا ہے اور یہی غرض ہر مسلمان مومن کی ہونی چاہیئے کہ ہر کام میں اس کے خدا ہی مدنظر ہو۔ کھانے پینے۔ عمارت بنانے۔ دوست دشمن کے معاملات غرض ہر کام میں خدا تعالیٰ ملحوظ ہو تو سب کاروبار عبادت ہو جاتا ہے لیکن جب مقصود منفرق ہوں پھر وہ شرک کہلاتا ہے مگر مومن دیکھے کہ خدا تعالیٰ کی طرف نظر ہے یا اور قصد ہے۔ اگر اَور طرف ہے تو سمجھے کہ دُور ہو گیا ہے۔ صید نزدیک است و دور انداختہ۔ بات مختصر ہوتی ہے مگر اپنی بدقسمتی سے لمبی بنا کر محروم ہو جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف تبتّل کرنا اور اس کو مقصود بنانا اہل و عیال کی خدمت اسی لحاظ سے کرنا کہ وہ امانت ہے اس طرح پر دین محفوظ رہتا ہے کیونکہ اس میں خدا کی رضا مقصود ہوتی ہے لیکن جب دنیا کے رنگ میں ہو اور غرض

---

[1] البدر سے :۔ "رحم اور شفقت کی نظر سے یہ نیت بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے لیے کچھ املاک چھوڑ جاؤں تاکہ ضائع نہ ہوں اور در بدر بھیک نہ مانگتے پھریں یا افلاس سے تنگ آکر تبدیل مذہب نہ کریں اور اگر ان نیتوں سے باہر جاتا ہے تو دین سے باہر جاتا ہے اور ایمان کو تاریکی میں رکھ کر اس کے ثمرات اور برکات سے بے نصیب رہتا ہے" (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۴)

[2] البدر سے :۔ "انسان کو چاہیئے کہ ہر ایک کاروبار میں تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (المزمل : ۹) کا مصداق ہو یعنی ہر ایک کام کو اس طرح سے بجا لاوے گویا وہ خود اس میں نفسانی حظ کوئی نہیں رکھتا۔ صرف خدا تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی وجہ سے بجا لا رہا ہے اور اسی نیت سے مخلوق کے حقوق کو ادا کرنا دین ہے ہر ایک بات اور کام کا آخری نقطہ خدا تعالیٰ کی رضامندی ہونی چاہیئے۔ اگر دنیا کے لیے ہے تو خدا تعالیٰ کا غضب کماتا ہے۔" (البدر حوالہ مذکور)

وارث بنانا ہو تو اس طرح پر خدا کے غضب کے نیچے آجاتا ہے۔

سچا مُسلم

اولاد تو نیکوکاروں اور ماموروں کی بھی ہوتی ہے۔ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد بھی دیکھو کس قدر کثرت سے ہوئی کہ کوئی گن نہیں سکتا۔ مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کا خیال اَور طرف تھا، بلکہ ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع تھا۔ اصل اسلام اسی کا نام ہے جو ابراہیم کو بھی کہا کہ اَسْلِمْ[1]۔ جب ایسے رنگ میں ہو جاوے تو وہ شیطان اور جذباتِ نفس سے الگ ہو جاتا ہے یہانتک کہ وہ خدا کی راہ میں جان تک کے دینے میں بھی دریغ نہ کرے۔ اگر جاں نثاری سے دریغ کرتا ہے تو خوب جان لے کہ وہ سچا مسلم نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ بیحد اطاعت ہو اور پوری عبودیت کا نمونہ دکھاوے یہانتک کہ آخری امانت جان بھی دیدے۔ اگر بخل کرتا ہے تو پھر سچا مومن اور مسلم کیسے ٹھہر سکتا ہے؟ لیکن اگر وہ جانبازی کرنے والا ہے تو پھر خدا تعالیٰ کو بڑا ہی پیارا اور محبوب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے۔ صحابہؓ نے یہی کیا۔ انہوں نے اپنی جان کی پروا نہ کی[2] اور اپنے خون بہا دیئے۔ شہید بھی وہی ہوتا ہے جو جان دینے کا قصد کرتا ہے اگر یہ نہیں تو پھر کچھ نہیں۔

یہ چند کلمے ناگہانی آفات سے بچنے اور سچا مسلم بننے کے لیے ہیں اور اگر انسان ان پر عمل کرے تو طاعون سے بچانے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہیں۔

بلاؤں کے نزول کے وقت دُعاؤں میں لگے رہیں

یاد رکھو قہرِ الٰہی کو کوئی روک نہیں سکتا وہ سخت چیز ہے۔ خبیث قوموں پر جب نازل ہوا ہے تو وہ تباہ ہو گئی ہیں۔ اس قہر سے ہمیشہ کامل ایمان بچا سکتا ہے۔ ناقص ایمان بچا نہیں سکتا بلکہ کامل ایمان ہو تو دُعائیں بھی قبول ہوتی ہیں اور اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ٦١) خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہوتا کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (آل عمران: ١٠) اس کا فرمان ہے پس ایسے وقت میں کہ آفت نازل ہو رہی ہے ایک تو یہ چاہیئے کہ دُعائیں کرتے رہیں[3]۔ دوسرے صغائر کبائر سے جہاں تک ممکن ہو بچتے رہیں۔ تدبیروں اور دُعاؤں میں لگے رہیں۔ گناہ کا زہر بڑا خطرناک ہے۔ اس کا مزا اسی

---

[1] البدر سے:۔ "جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اَسْلَمْتُ (البقرۃ: ١٣٢) کہہ دیا تھا ویسے ہی اطاعت اللہ تعالیٰ کی کی جاوے اور کسی غیر کو اس میں شریک نہ کیا جاوے۔" (البدر جلد ٣ نمبر ١١ صفحہ ٤)

[2] البدر سے:۔ "خدا تعالیٰ اس کا تذکرہ فرماتا ہے کہ ان میں سے بہتوں نے جان دے دی اور بعض ابھی تک منتظر ہیں۔" (البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر سے:۔ دُعا کرتے رہیں کہ خدا تعالیٰ شماتتِ اعداء سے بچاوے۔ (البدر حوالہ مذکور)

دنیا میں چکھنا پڑتا ہے۔ گناہ دو طرح پر ہوتے ہیں۔ ایک گناہ غفلت سے ہوتے ہیں جو شباب میں ہو جاتے ہیں[1]۔ دوسرے بیداری کے وقت میں ہوتے ہیں۔ جب انسان پختہ عمر کا ہو جاتا ہے ایسے وقت میں جب گناہوں سے راضی نہیں ہوگا اور ہر وقت استغاثہ کرتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر سکینت نازل کرے گا اور گناہوں سے بچائے گا۔

گناہوں سے پاک ہونے کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فضل درکار ہے جب اللہ تعالیٰ اس کے رجوع اور توبہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں غیب سے ایک بات پڑ جاتی ہے اور وہ گناہ سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اس حالت کے پیدا ہونے کے لیے حقیقی مجاہدہ کی ضرورت ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۷۰)

جو مانگتا ہے اس کو ضرور دیا جاتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دعا جیسی کوئی چیز نہیں۔ دُنیا میں دیکھو کہ بعض خرگدا ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہر روز شور ڈالتے رہتے ہیں۔ ان کو آخر کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو قادر اور کریم ہے جب یہ اَڑ کر دُعا کرتا ہے تو پالیتا ہے کیا خدا انسان جیسا بھی نہیں۔

قبولیتِ دُعا کا راز

یہ قاعدہ یاد رکھو کہ جب دُعا سے باز نہیں آتا اور اس میں لگا رہتا ہے تو آخر دُعا قبول ہو جاتی ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ باقی ہر قسم کی دُعائیں طفیلی ہیں اصل دُعائیں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے کرنی چاہئیں۔ باقی دُعائیں خود بخود قبول ہو جائیں گی کیونکہ گناہ کے دُور ہونے سے برکات آتی ہیں۔ یوں دُعا قبول نہیں ہوتی جو نری دُنیا ہی کے واسطے ہو[2]۔ اس لیے پہلے خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے دُعائیں کرے اور وہ سب سے بڑھکر دُعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ[3] (الفاتحۃ: ۶) ہے جب یہ دُعا کرتا رہے گا تو وہ مُنْعَمْ عَلَیْہِمْ کی جماعت میں داخل

---

[1] البدر سے:۔ "اگر ان کے بعد انسان نے عمر پائی اور پھر بھی باز نہ آیا تو یہ بہت ہی بُری بات ہے۔ گناہ بہت بُری شئے ہے۔ جس قدر امراض جسمانی ہیں شاید اتنے ہی گناہ بھی ہیں۔ اور امراض کی طرح بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کی جزو ہوتے ہیں۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۴)

[2] البدر سے:۔ "انسان کی ضرورتوں اور خواہشوں کی تو کوئی حد نہیں اور بعض لوگ انہی کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں اور ان کو خدا کو راضی کرنے اور گناہ سے بچنے کی دُعا کا موقعہ ہی نہیں پیش آتا لیکن اصل بات یہ ہے کہ دنیا کے لیے جو دعا کی جاتی ہے وہ جہنم ہے۔ دُعا صرف خدا کو راضی کرنے اور گناہوں سے بچنے کی ہونی چاہیئے باقی جتنی دُعائیں ہیں وہ خود اس کے اندر آجاتی ہیں۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۴)

[3] البدر سے:۔ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ بڑی دُعا ہے۔ صراط مستقیم گویا خدا کو شناخت کرنا ہے اور اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کل گناہوں سے بچنا ہے اور صالحین میں داخل ہونا ہے۔" (البدر حوالہ مذکور)

ہوگا جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے دریا میں غرق کر دیا ہے۔ ان لوگوں کے زمرہ میں جو منقطعین ہیں داخل ہوکر یہ وہ انعامات الٰہی حاصل کرے گا جیسی عادت اللہ ان سے جاری ہے۔ یہ کبھی کسی نے نہیں سُنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک راستباز متقی کو رزق کی مار دے بلکہ وہ تو سات پشت تک بھی رحم کرتا ہے۔ قرآن شریف میں خضر و موسیٰ کا قصہ درج ہے کہ انہوں نے ایک خزانہ نکالا اس کی بابت کہا گیا کہ اَبُوْ ھُمَا صَالِحًا (الکہف : ۸۳) اس آیت میں ان کے والدین کا ذکر تو ہے لیکن یہ ذکر نہیں کہ وہ لڑکے خود کیسے تھے۔ باپ کے طفیل سے اس خزانہ کو محفوظ رکھا تھا اور اس لیے ان پر رحم کیا گیا۔ لڑکوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ ستاری سے کام لیا۔

توریت اور ساری آسمانی کتابوں میں پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ متقی کو ضائع نہیں کرتا اس لیے پہلے ایسی دعائیں کرنی چاہئیں جن سے نفسِ امارہ، نفسِ مطمئنہ ہوجاوے۔ اور اللہ تعالیٰ راضی ہوجاوے۔ پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحۃ : ۶) کی دُعائیں مانگو کیونکہ اس کے قبول ہونے پر جو یہ خود مانگتا ہے خدا تعالےٰ خود دیتا ہے۔

سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جب انسان سچی توبہ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالےٰ یہ دیتا ہے۔ یہ دیتا ہے۔ آخر کہتے ہیں کہ بیوی بھی دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات وہ اپنے بیان کرتے ہیں اور یہ ہے بالکل سچ کہ خدا تعالیٰ خود متعہد ہو جاتا ہے اس کے موافق میرا بھی ایک الہام ہے۔

ہر چہ باید نوعروسے را ہماں ساماں کنم

غرض[۱] جب متولی اور متکفل خدا ہو تو پھر کیا ہی مزا آتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ صفحہ ۵ تا ۷ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء)

استفسارات اور انکے جوابات

سوال اوّل :۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ ہرگز نہیں یہ توحید کے برخلاف ہے۔

سوال ۲ :۔ جبکہ غائب اور حاضر دونو کو خطاب کر لیتے ہیں پھر اس میں کیا حرج ہے ؟

جواب :۔ دیکھو بٹالہ میں لوگ زندہ موجود ہیں اگر ان کو یہاں سے آواز دو تو کیا وہ کوئی جواب دیتا ہے پھر بغداد میں سید عبدالقادر جیلانی کی قبر پر جاکر آواز دو تو کوئی جواب نہیں آئے گا خدا تعالیٰ تو جواب دیتا ہے جیسا کہ

---

[۱] البدر میں ہے :۔ "غرضیکہ خدا اس کا کفیل مثل ماں باپ کے ہوجاتا ہے اور جب خدا متولی اور کفیل ہو تو کسقدر مزے کی بات ہے۔" (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۵)

فرمایا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن : ۶۱) مگر قبروں والوں میں سے کون جواب دیتا ہے۔ پھر کیوں ایسا فعل کرے جو توحید کے خلاف ہے۔

سوال ۴ :۔ جب کہ یہ لوگ زندہ ہیں پھر ان کو مُردہ تو نہیں کہہ سکتے ؛

جواب :۔ زندگی ایک الگ امر ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہماری آواز بھی سُن لیں۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ یہ لوگ خدا کے نزدیک زندہ ہیں مگر ہم نہیں مان سکتے کہ ان کو سماع کی قوت بھی ہے۔ حاضر ناظر ہونا ایک الگ صفت ہے جو خدا ہی کو حاصل ہے دیکھو ہم بھی زندہ ہیں مگر لاہور یا امرتسر کی آوازیں نہیں سُن سکتے۔ خدا تعالیٰ کے شہید اور اولیاء اللہ بیشک خدا کے نزدیک زندہ ہوتے ہیں مگر ان کو حاضر ناظر نہیں کہہ سکتے دُعاؤں کا سننے والا اور قدرت رکھنے والا خدا ہی ہے۔ اس کو یقین کرنا یہی اسلام ہے جو اس کو چھوڑتا ہے وہ اسلام کو چھوڑتا ہے۔ پھر کس قدر قابل شرم یہ امر ہے کہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی تو کہتے ہیں۔ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، یا ابابکر، یا عمر نہیں کہتے۔ البتہ یا علی کہنے والے ان کے بھائی موجود ہیں۔ یہ شرک ہے کہ ایک تخصیص بلا وجہ کی جاوے۔ جب خدا کے سوا کسی چیز کی محبت بڑھ جاتی ہے تو پھر انسان صُمٌّ بُکْمٌ ہو جاتا ہے جو اسلام کے خلاف ہے جب توحید کے خلاف چلے تو پھر مسلمان کیسا؟ تعجب کی بات ہے کہ جن لوگوں کو یہ خدا کا حصہ دار بناتے ہیں خود ان کو بھی یہ مقام توحید ہی کے ماننے سے ملا تھا۔ اگر وہ بھی ایسے "یا" کہنے والے ہوتے تو ان کو یہ مقام ہرگز نہ ملتا بلکہ انہوں نے خدائے تعالیٰ کی اطاعت اختیار کی تب یہ رتبہ ان کو ملا یہ لوگ شیعوں اور عیسائیوں کی طرح ایک قسم کا شرک کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء)

---

۲۸ فروری ۱۹۰۴ء

(بوقت ظہر)

تدبیر اور توکّل

تدبیر اور توکّل پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ فِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (الذّٰریات : ۲۳) سے ایک نادان دھوکا کھاتا ہے اور تدابیر کے سلسلہ کو باطل کرتا ہے حالانکہ سورۃ جمعہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (الجمعۃ : ۱۱) کہ تم زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کے فضل کی تلاش کرو۔ یہ ایک بہت ہی نازک معاملہ ہے کہ ایک طرف تدابیر کی رعایت ہو اور دوسری طرف توکّل بھی پورا ہو۔ اور اس کے اندر شیطان کو وساوس کا بڑا موقعہ ملتا ہے (بعض لوگ ٹھوکر کھا کر اسباب پرست ہو جاتے ہیں اور بعض خدا تعالیٰ کے

عطاکردہ قویٰ کو بیکار محض خیال کرنے لگ جاتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ کو جاتے تو تیاری کرتے ۔گھوڑے، ہتھیار بھی ساتھ لیتے بلکہ آپ بعض اوقات دو دو زرہ پہن کر جاتے ۔تلوار بھی کمر سے لٹکاتے حالانکہ ادھر خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ : ۶۸) بلکہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تجویز فرمایا کہ اگر شکست ہو تو آپ کو جلد مدینہ پہنچا دیا جاوے ۔اصل بات یہ ہے کہ قوی الایمان کی نظر استغناءِ الٰہی پر ہوتی ہے اور اُسے خوف ہوتا ہے کہ خدا کے وعدوں میں کوئی ایسی مخفی شرط نہ ہو جس کا اسے علم نہ ہو جو لوگ تدابیر کے سلسلہ کو بالکل باطل ٹھہراتے ہیں ان میں ایک زہریلا مادہ ہوتا ہے ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر بلا آوے تو دیدہ دانستہ اس کے آگے جا پڑیں اور جس قدر پیشہ والے اور اہلِ حرفت ہیں وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاویں۔

بعض فقہی مسائل

ایک شخص نے چند مسائل دریافت کئے وہ اور ان کے جواب جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیئے ان کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر البدر)

سوال :۔ میت کے قل جو تیسرے دن پڑھے جاتے ہیں اُن کا ثواب اُسے پہنچتا ہے یا نہیں؟

جواب :۔ قل خوانی کی کوئی اصل شریعت میں نہیں ہے ۔صدقہ، دُعا اور استغفار میت کو پہنچتے ہیں ۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ملانوں کو اس سے ثواب پہنچ جاتا ہے ۔سو اگر اُسے ہی مُردہ تصور کر لیا جاوے (اور واقعی ملاں لوگ روحانیت سے مُردہ ہی ہوتے ہیں) تو ہم مان لیں گے)

ہمیں تعجب ہے کہ یہ لوگ ایسی باتوں پر اُمید کیسے باندھ لیتے ہیں ۔ دین تو ہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہے اس میں ان باتوں کا نام تک نہیں ۔صحابہ کرامؓ بھی فوت ہوئے کیا کسی کے قل پڑھے گئے ۔صدہا سال کے بعد اَور بدعتوں کی طرح یہ بھی ایک بدعت نکل آئی ہوئی ہے ۔

ایک طریق اسقاط کا رکھا ہے کہ قرآن شریف کو چکر دیتے ہیں ۔یہ اصل میں قرآن شریف کی بے ادبی ہے انسان خدا سے سچا تعلق رکھنے والا نہیں ہو سکتا جب تک سب نظر خدا پر نہ ہو۔

سوال :۔ ایک عورت تنگ کرتی ہے کہ سودی روپیہ لے کر زیور بنا دو اور اس کا خاوند غریب ہے ۔

جواب :۔ وہ عورت بڑی نالائق ہے جو خاوند کو زیور کیلئے تنگ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ سُود لے کر بنا دے ۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا اور آپ کی ازواج نے آپ سے بعض دنیوی خواہشات کی تکمیل کا اظہار کیا تو خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کو یہ فقیرانہ زندگی منظور نہیں ہے تو تُو اُن کو کہدے کہ آؤ تم کو الگ کر دُوں ۔انہوں نے فقیرانہ زندگی اختیار کی ۔آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہی بادشاہ ہو گئیں ۔ وہ صرف خدا کی

آزمائش تھی۔

سوال:۔ ایک عورت اپنا مہر نہیں بخشتی۔

جواب:۔ یہ عورت کا حق ہے اُسے دینا چاہیئے۔اول تو نکاح کے وقت ہی ادا کرے ورنہ بعد ازاں ادا کرنا چاہیئے پنجاب اور ہندوستان میں یہ شرافت ہے کہ موت کے وقت یا اس سے پیشتر اپنا مہر خاوند کو بخش دیتی ہیں یہ صرف رواج ہے جو مروت پر دلالت کرتا ہے۔

سوال:۔ اور جن عورتوں کا مہر مچھر کی دومن چربی ہو وہ کیسے ادا کیا جاوے؟

جواب:۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرۃ: ۲۸۷) اس کا خیال مہر میں ضرور ہونا چاہیئے۔خاوند کی حیثیت کو مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ اگر اس کی حیثیت دس روپے کی نہ ہو تو وہ ایک لاکھ روپے کا مہر کیسے ادا کریگا اور مچھروں کی چربی تو کوئی مہر ہی نہیں۔یہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا میں داخل ہے۔

سوال:۔ میّت کے لیے فاتحہ خوانی کے لیے جو بیٹھتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں؟

جواب:۔ یہ درست نہیں ہے۔بدعت ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ اس طرح صف بچھا کر بیٹھتے اور فاتحہ خوانی کرتے تھے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۶-۵ مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۰۴ء)

۶ر مارچ ۱۹۰۴ء

دربار شام

نصیحت بعد البیعت

۶ر مارچ ۱۹۰۴ء کی شام کو اعلیحضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر چند احباب نے بیعت کی جس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی: (ایڈیٹر)

بیعت کو نبھائیں

تم لوگوں نے اس وقت جو بیعت کی ہے اس کا زبان سے کہہ دینا اور اقرار کر لینا تو بہت ہی آسان ہے مگر اس اقرار بیعت کا نبھانا اور اس پر عمل کرنا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ نفس اور شیطان انسان کو دین سے لاپروا بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ دنیا اور اس کے فوائد کو آسان اور قریب دکھاتے ہیں لیکن قیامت کے معاملہ کو دور دکھاتے ہیں جس سے انسان سخت دل ہو جاتا ہے اور پچھلا حال پہلے سے بدتر بن جاتا ہے۔اس لیے یہ بہت ہی ضروری امر ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کو راضی کرنا ہے تو جہاں تک کوشش ہو سکے ساری ہمت اور توجہ سے اس اقرار کو نبھانا چاہیئے اور

گناہوں سے بچنے کے لیے کوشش کرتے رہو۔

گناہوں کی حقیقت

گناہ کیا چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خلاف مرضی کرنا اور ان ہدایتوں کو جو اس نے اپنے پیغمبروں خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دی ہیں توڑنا اور دلیری سے اُن ہدایتوں کی مخالفت کرنا یہ گناہ ہے جبکہ ایک بندہ کو خدا تعالیٰ کی ہدایتوں کا علم دیا جاوے اور اس کو سمجھا دیا جاوے۔ پھر اگر وہ ان ہدایتوں کو توڑتا اور شوخی اور شرارت سے گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت ناراض ہوتا ہے اور اس ناراضگی کا یہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ مرنے کے بعد دوزخ میں پڑے گا بلکہ اسی دنیا میں بھی اس کو طرح طرح کے عذاب آتے اور ذلت اُٹھانی پڑتی ہے۔

دنیاوی حکام کا بھی یہی حال ہے کہ وہ ایک قانون مشتہر کر دیتے ہیں اور پھر اگر کوئی ان کے احکام کو توڑتا اور خلاف ورزی کرتا ہے تو پکڑا جاتا اور سزا پاتا ہے لیکن دنیوی حکام کے عذاب سے اور اُن کے قوانین و احکام کی خلاف ورزی کی سزا سے آدمی کسی دوسری عملداری میں بھاگ جانے سے بچ بھی سکتا ہے اور اس طرح پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ مثلاً اگر انگریزی عملداری میں کوئی خلاف ورزی کی ہے تو وہ فرانس یا کابل کی عملداری میں بھاگ جانے سے بچ سکتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی خلاف ورزی کر کے انسان کہاں بھاگ سکتا ہے کیونکہ یہ زمین و آسمان جو نظر آتا ہے یہ تو اسی کا ہے اور کوئی اور زمین و آسمان کسی اَور کا کہیں نہیں ہے۔ جہاں تم کو پناہ مل جاوے اس واسطے یہ بہت ضروری امر ہے کہ انسان ہمیشہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اس کی ہدایتوں کے توڑنے یا گناہ کرنے پر دلیر نہ ہو کیونکہ گناہ بہت بُری شئے ہے اور جب انسان اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اور گناہ پر دلیری کرتا ہے تو پھر عادت اللہ اس طرح پر جاری ہے کہ اس جرأت و دلیری پر خدا تعالیٰ کا غضب آتا ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

دو قسم کے دُکھ

دنیا میں دو قسم کے دُکھ ہوتے ہیں۔ بعض دُکھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں تسلّی دی جاتی ہے اور صبر کی توفیق ملتی ہے۔ فرشتے سکینت کیساتھ اُترتے ہیں۔ اس قسم کے دُکھ نبیوں اور راست بازوں کو بھی ملتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور ابتلا آتے ہیں جیسا کہ اُس نے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (البقرۃ: ۱۵۶) میں فرمایا ہے۔ ان دکھوں کا انجام راحت ہوتا ہے اور درمیان میں بھی تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ خدا کی طرف سے صبر اور سکینت ان کو دی جاتی ہے مگر دوسری قسم دُکھ کی وہ ہے جس میں یہی نہیں کہ دُکھ ہوتا ہے بلکہ اُس میں صبر و ثبات کھویا جاتا ہے۔ اس میں نہ انسان مرتا ہے نہ جیتا ہے اور سخت مصیبت اور بلا میں ہوتا ہے۔ یہ شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ: ۳۱) اور اس قسم کے دکھوں

سے بچنے کا یہی طریق اور علاج ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کیونکہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے اور اس زندگی میں شیطان اس کی تاک میں لگا رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کو خدا سے دُور پھینک دے اور نفس اس کو دھوکا دیتا رہتا ہے کہ ابھی بہت عرصہ تک زندہ رہنا ہے لیکن یہ بڑی بھاری غلطی ہے۔ اگر انسان اس دھوکے میں آکر خدا تعالیٰ سے دُور جا پڑے اور نیکیوں سے دستکش ہو جاوے۔ موت ہر وقت قریب ہے اور یہی زندگی دارالعمل ہے۔ مرنے کے ساتھ ہی عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور جس وقت یہ زندگی کے دم پورے ہوئے پھر کوئی قدرت اور توفیق کسی عمل کی نہیں ملتی خواہ تم کتنی ہی کوشش کرو مگر خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے کوئی عمل نہیں کر سکو گے اور ان گناہوں کی تلافی کا وقت جاتا رہے گا اور اس بدعملی کا نتیجہ آخر بھگتنا پڑے گا۔

خوش قسمت کون ہے؟

خوش قسمت وہ شخص نہیں ہے جس کو دنیا کی دولت ملے اور وہ اس دولت کے ذریعہ ہزاروں آفتوں اور مصیبتوں کا مورد بن جائے بلکہ خوش قسمت وہ ہے جس کو ایمان کی دولت ملے اور وہ خدا کی ناراضگی اور غضب سے ڈرتا رہتے اور ہمیشہ اپنے آپ کو نفس اور شیطان کے حملوں سے بچاتا رہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی رضا کو وہ اس طرح پر حاصل کرے گا۔ مگر یاد رکھو کہ یہ بات یونہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم نمازوں میں دُعائیں کرو کہ خدا تعالیٰ تم سے راضی ہو جاوے اور وہ تمہیں توفیق اور قوت عطا فرمائے کہ تم گناہ آلود زندگی سے نجات پاؤ۔ کیونکہ گناہوں سے بچنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی توفیق شاملِ حال نہ ہو اور اس کا فضل عطا نہ ہو اور یہ توفیق اور فضل دُعا سے ملتا ہے۔ اس واسطے نمازوں میں دُعا کرتے رہو کہ اے اللہ ہم کو ان تمام کاموں سے جو گناہ کہلاتے ہیں اور جو تیری مرضی اور ہدایت کے خلاف ہیں بچا اور ہر قسم کے دُکھ اور مصیبت اور بلا سے جو ان گناہوں کا نتیجہ ہے بچا اور سچے ایمان پر قائم رکھ (آمین) کیونکہ انسان جس چیز کی تلاش کرتا ہے وہ اس کو ملتی ہے اور جس سے لاپرواہی کرتا ہے اس سے محروم رہتا ہے۔ جوئندہ یابندہ مثل مشہور ہے مگر جو گناہ کی فکر نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے وہ پاک نہیں ہو سکتے۔ گناہوں سے وہی پاک ہوتے ہیں جن کو یہ فکر لگی رہتی ہے۔

اخلاقی گناہ

بہت سے آدمی اس دُنیا میں ایسے ہیں کہ اُن کی زندگی ایک اندھے آدمی کی سی ہے کیونکہ وہ اس بات پر کوئی اطلاع ہی نہیں رکھتے کہ وہ گناہ کرتے ہیں یا گناہ کے

---

[1] البدر سے :۔ "اور جان لے کہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی ایک جہنمی زندگی ہے۔"
(البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۶ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء)

کہتے ہیں عوام تو عوام بہت سے عالموں فاضلوں کو بھی پتہ نہیں کہ وہ گناہ کر رہے ہیں حالانکہ وہ بعض گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ گناہوں کا علم جب تک نہ ہو اور پھر انسان اُن سے بچنے کی فکر نہ کرے تو اس زندگی سے کوئی فائدہ نہ اس کو ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو۔ خواہ سو برس کی عمر بھی کیوں نہ ہو جاوے لیکن جب انسان گناہ پر اطلاع پالے اور ان سے بچے تو وہ زندگی مفید زندگی ہوتی ہے مگر یہ ممکن نہیں ہے جبتک انسان مجاہدہ نہ کرے اور اپنے حالات اور اخلاق کو ٹٹولتا نہ رہے کیونکہ بہت سے گناہ اخلاقی ہوتے ہیں جیسے غصہ، غضب، کینہ، جوش، ریا، تکبر، حسد وغیرہ یہ سب بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو جہنم تک پہنچا دیتی ہیں۔ انہی میں سے ایک گناہ جس کا نام تکبر ہے شیطان نے کیا تھا۔ یہ بھی ایک بدخلقی ہی تھی جیسے لکھا ہے اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ (البقرۃ: ۳۵) اور پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا وہ مردودِ خلائق ٹھہرا۔ اور ہمیشہ کے لیے لعنتی ہوا۔ مگر یاد رکھو کہ یہ تکبر صرف شیطان ہی میں نہیں ہے بلکہ بہت ہیں جو اپنے غریب بھائیوں پر تکبر کرتے ہیں اور اس طرح پر بہت سی نیکیوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ تکبر کئی طرح پر ہوتا ہے کبھی دولت کے سبب سے کبھی علم کے سبب سے کبھی حُسن کے سبب سے اور کبھی نسب کے سبب سے، غرض مختلف صورتوں سے تکبر کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ وہی محرومی ہے اور اسی طرح پر بہت سے بُرے خُلق ہوتے ہیں جن کا انسان کو کوئی علم نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ کبھی اُن پر غور نہیں کرتا اور نہ فکر کرتا ہے۔ انہیں بداخلاقیوں میں سے ایک غصہ بھی ہے[1]۔ جب انسان اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ دیکھے کہ اس کی نوبت کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ ایک دیوانہ کی طرح ہوتا ہے۔ اس وقت جو اس کے مُنہ میں آتا ہے کہہ گذرتا ہے اور گالی وغیرہ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ اب دیکھو کہ اسی ایک بداخلاقی کے نتائج کیسے خطرناک ہوجاتے ہیں۔ پھر ایسا ہی ایک حسد ہے کہ انسان کسی کی حالت یا مال و دولت کو دیکھ کر کُڑھتا اور جلتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کے پاس نہ رہے اس سے بجز اس کے کہ وہ اپنی اخلاقی قوتوں کا خون کرتا ہے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ پھر ایک بداخلاقی بُخل کی ہے۔ باوجودیکہ خدا تعالیٰ نے اسکو مقدرت دی ہے مگر یہ انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔ ہمسایہ خواہ ننگا ہو بھوکا ہو مگر اس کو اس پر رحم نہیں آتا۔ مسلمانوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتا۔ وہ بجز اس کے کہ دنیا میں مال و دولت جمع کرتا رہے اور کوئی کام دوسروں کی ہمدردی اور آرام کے لیے نہیں رکھتا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا اور کوشش کرتا تو اپنے قویٰ اور دولت سے دوسروں کو فائدہ

---

[1] اعلیٰ حضرت جب تقریر فرماتے فرماتے اس مقام پر پہنچے تو ایک بھائی آپ کی پُر تاثیر تقریر سے متاثر ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا وہ کچھ عرض کرنا چاہتا تھا مگر پاس ادب سے خاموش رہا۔ جب حضرت تقریر کر چکے تو عرض کیا حضور مجھ میں غصہ بہت ہے دُعا کریں۔ فرمایا۔ "اچھا دعا کریں گے" (ایڈیٹر الحکم)

پہنچا سکتا تھا۔ مگر وہ اس بات کی فکر نہیں کرتا۔

غرضیکہ طرح طرح کے گناہ ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ یہ تو موٹے موٹے گناہ ہیں جن کو گناہ ہی نہیں سمجھا پھر زنا، چوری، خون وغیرہ بھی بڑے بڑے گناہ ہیں۔ اور ہر قسم کے گناہوں سے بچنا چاہیئے۔

گناہوں سے بچنا

گناہوں سے بچنا یہ تو ادنیٰ سی بات ہے اس لیے انسان کو چاہیئے کہ گناہوں سے پرہیز کر نیکی کرے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کرے جب وہ گناہوں سے بچے گا اور خدا کی عبادت کرے گا تو اس کا دل برکت سے بھر جائے گا اور یہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ دیکھو اگر کسی کپڑے کو پاخانہ لگا ہوا ہو تو اس کو صرف دھو ڈالنا ہی کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ اُسے چاہیئے کہ پہلے اُسے خوب صابن سے ہی دھو کر صاف کرے اور میل نکال کر اُسے سفید کرے اور پھر اُس کو خوشبو لگا کر معطر کرے تاکہ جو کوئی اُسے دیکھے خوش ہو۔ اسی طرح پر انسان کے دل کا حال ہے وہ گناہوں کی گندگی سے ناپاک ہو رہا ہے اور گھناؤنا اور متعفن ہو جاتا ہے۔ پس پہلے تو چاہیئے کہ گناہ کے چرک کو توبہ واستغفار سے دھو ڈالے اور خدا تعالیٰ سے توفیق مانگے کہ گناہوں سے بچتا رہے۔ پھر اس کی بجائے ذکرِ الٰہی کرتا رہے اور اس سے اس کو بھر ڈالے۔ اس طرح پر سلوک کا کمال ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے وہی مثال ہے کہ کپڑے سے صرف گندگی کو دھو ڈالا ہے لیکن جب تک یہ حالت نہ ہو کہ دل کو ہر قسم کے اخلاق ردیہ رذیلہ سے صاف کر کے خدا کی یاد کا عطر لگا دے اور اندر سے خوشبو آوے اس وقت تک خدا تعالیٰ کا شکوہ نہیں کرنا چاہیئے لیکن جب اپنی حالت اس قسم کی بناتا ہے تو پھر شکوہ کا کوئی محل اور مقام ہی نہیں رہتا۔

آج کل وبا کے دن ہیں اس لیے لاپرواہ نہیں ہونا چاہیئے۔ سچی تبدیلی کرنی چاہیئے بہت سے آدمی اعتراض کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے بیعت کی تھی وہ مر گیا۔ مگر یہ اعتراض فضول ہے کیا وہ نہیں جانتے کہ صحابہؓ بھی جنگوں میں شریک ہو کر شہید ہو جاتے تھے۔ حالانکہ وہی جنگ مخالفوں کے لیے بطور عذاب تھی لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ بیعت کے بعد اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ بیعت کے بعد حجت پوری ہو جاتی ہے پھر اگر اپنی اصلاح اور تبدیلی نہیں کرتا تو سخت جوابدہ ہے پس ضرورت اس بات کی ہے کہ سچے مسلمان بنو تاکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمہاری کوئی قدر و قیمت ہو۔ جو چیز کارآمد ہوتی ہے اسی کی قدر کی جاتی ہے۔ دیکھو اگر تمہارے پاس ایک دُودھ دینے والی بکری ہو جس سے تمہارے بیوی بچے پرورش پاتے ہوں تو تم بھی اسکو ذبح کرنے کے لیئے تیار نہیں ہو جاتے، لیکن اگر وہ کچھ بھی دُودھ نہ دے بلکہ نری چارہ دانہ کی چٹی ہو تو تم فوراً اس کو ذبح کر لو گے۔ اسی طرح پر جو آدمی اللہ تعالیٰ کا سچا فرمانبردار، نیک کام کرنے والا اور دوسروں کو نفع پہنچانے والا نہ ہو اس وقت تک خدا تعالیٰ اس کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ وہ اس بکری کی طرح ذبح کے لائق ہوتا ہے جو دُودھ

نہیں دیتی ہے اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ تم اپنے آپ کو مفید ثابت کرو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے بندوں کو نفع پہنچاؤ۔

اعمالِ صالحہ کی ضرورت

انسان سمجھتا ہے کہ نرا زبان سے کلمہ پڑھ لینا ہی کافی ہے یا نرا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ کہہ دینا ہی کافی ہے مگر یاد رکھو زبانی لاف وگزاف کافی نہیں ہے۔ خواہ انسان زبان سے ہزار مرتبہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ کہے یا سو مرتبہ تسبیح پڑھے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ خدا نے انسان کو انسان بنایا ہے طوطا نہیں بنایا۔ یہ طوطے کا کام ہے کہ وہ زبان سے تکرار کرتا رہے اور سمجھے خاک بھی نہیں۔ انسان کا کام تو یہ ہے کہ جو کچھ منہ سے کہتا ہے اس کو سوچ کر کہے اور پھر اس کے موافق عملدرآمد بھی کرے، لیکن اگر طوطے کی طرح بولتا جاتا ہے تو یاد رکھو نری زبان سے کوئی برکت نہیں ہے جب تک دل سے اُس کے ساتھ نہ ہو اور اس کے موافق اعمال نہ ہوں۔ وہ نری باتیں سمجھی جائیں گی جن میں کوئی خوبی اور برکت نہیں کیونکہ وہ نرا قول ہے خواہ قرآنِ شریف اور استغفار ہی کیوں نہ پڑھتا ہو۔ خدا تعالیٰ اعمال چاہتا ہے اس لیے بار بار یہی حکم دیا کہ اعمالِ صالحہ کرو۔ جب تک یہ نہ ہو خدا کے نزدیک نہیں جا سکتے۔ بعض نادان کہتے ہیں کہ آج ہم نے دن بھر میں قرآن ختم کر لیا ہے لیکن کوئی اُن سے پوچھے کہ اس سے کیا فائدہ ہوا؟ نری زبان سے تم نے کام لیا مگر باقی اعضاء کو بالکل چھوڑ دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمام اعضاء اس لیے بنائے ہیں کہ اُن سے کام لیا جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض لوگ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن اُن پر لعنت کرتا ہے کیونکہ ان کی تلاوت نرا قول ہی قول ہوتا ہے اور اس پر عمل نہیں ہوتا۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کے موافق اپنا چال چلن نہیں بناتا ہے وہ ہنسی کرتا ہے کیونکہ پڑھ لینا ہی اللہ تعالیٰ کا منشا نہیں وہ تو عمل چاہتا ہے۔ اگر کوئی ہر روز تعزیراتِ ہند کی تلاوت تو کرتا رہے مگر ان قوانین کی پابندی نہ کرے بلکہ جرائم کو کرتا رہے اور رشوت وغیرہ لیتا رہے تو ایسا شخص جس وقت پکڑا جاوے گا تو کیا اس کا یہ عذر قابلِ سماعت ہوگا کہ مَیں ہر روز تعزیرات کو پڑھا کرتا ہوں؟ یا اس کو زیادہ سزا ملے گی کہ تُو نے باوجود علم کے پھر جُرم کیا ہے اس لیے ایک سال کی بجائے چار سال کی سزا ہونی چاہیئے۔

غرض نری باتیں کام نہ آئیں گی۔ پس چاہیئے کہ انسان پہلے اپنے آپ کو دُکھ پہنچائے تا خدا تعالیٰ کو راضی کرے اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی عمر بڑھا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں تخلّف نہیں ہوتا۔ اس نے جو وعدہ فرمایا ہے کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد: ۱۸) یہ بالکل سچ ہے عام طور پر بھی یہی قاعدہ ہے کہ جو چیز نفع رساں ہو اس کو کوئی ضائع نہیں کرتا۔ یہانتک کہ کوئی گھوڑا، بیل یا گائے، بکری اگر مفید ہو اور اس سے فائدہ پہنچتا ہو۔ کون ہے جو اس کو ذبح کر ڈالے، لیکن جب وہ ناکارہ ہو جاتا ہے اور

اور کسی کام نہیں آسکتا تو پھر اس کا آخری علاج ہی ذبح ہے اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر اور نہیں تو دو چار روپیہ کو کھال ہی بک جائے گی اور گوشت بھی کام آجائے گا۔ اسی طرح پر جب انسان خدا تعالیٰ کی نظر میں کسی کام کا نہیں رہتا اور اس کے وجود سے کوئی فائدہ دوسرے لوگوں کو نہیں ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا بلکہ خس کم جہاں پاک کے موافق اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ غرض یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ نری لاف و گزاف اور زبانی قیل و قال کوئی فائدہ اور اثر نہیں رکھتی جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہ ہو اور ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء سے نیک عمل نہ کئے جاویں جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ شریف بھیج کر صحابہؓ سے خدمت لی۔ کیا انہوں نے صرف اسی قدر کافی سمجھا تھا کہ قرآن کو زبان سے پڑھ لیا یا اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا تھا انہوں نے تو یہاں تک اطاعت و وفاداری دکھائی کہ بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے اور پھر انہوں نے جو کچھ پایا اور خدا تعالیٰ نے اُن کی جسقدر قدر کی وہ پوشیدہ بات نہیں ہے۔

فضل اور فیضان حاصل کرنے کا طریق

خدا تعالیٰ کے فضل اور فیضان کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ ورنہ نکمی شئے کی طرح تم پھینک دیئے جاؤ گے۔ کوئی آدمی اپنے گھر کی اچھی چیزوں اور سونے چاندی کو باہر نہیں پھینک دیتا بلکہ ان اشیاء کو اور تمام کارآمد اور قیمتی چیزوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہو لیکن اگر گھر میں کوئی چوہا مرا ہوا دکھائی دے تو اس کو سب سے پہلے باہر پھینک دو گے۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ہمیشہ عزیز رکھتا ہے۔ اُن کی عمر دراز کرتا ہے اور ان کے کاروبار میں ایک برکت رکھ دیتا ہے۔ وہ ان کو ضائع نہیں کرتا اور بے عزتی کی موت نہیں مارتا، لیکن جو خدا تعالیٰ کی ہدایتوں کی بے حُرمتی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے اگر چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہاری قدر کرے تو اس کے واسطے ضروری ہے کہ تم نیک بن جاؤ تا خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قدر ٹھہرو۔ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کے حکموں کی پابندی کرتے ہیں وہ ان میں اور ان کے غیروں کے درمیان ایک فرقان رکھ دیتا ہے۔ یہی راز انسان کے برکت پانے کا ہے کہ وہ بدیوں سے بچتا رہے۔ ایسا شخص جہاں رہے وہ قابلِ قدر ہوتا ہے کیونکہ اس سے نیکی پہنچتی ہے وہ غریبوں سے سلوک کرتا ہے۔ ہمسایوں پر رحم کرتا ہے۔ شرارت نہیں کرتا۔ جھوٹے مقدمات نہیں بناتا۔ جھوٹی گواہیاں نہیں دیتا بلکہ دل کو پاک کرتا ہے اور خدا کی طرف مشغول ہوتا ہے اور خدا کا ولی کہلاتا ہے۔

اخلاقی کمزوریوں کو دُور کریں

خدا کا ولی بننا آسان نہیں بلکہ بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے لیے بدیوں کا چھوڑنا بُرے ارادوں اور جذبات کو چھوڑنا ضروری ہے اور یہ بہت مشکل کام ہے۔ اخلاقی کمزوریوں اور بدیوں کو چھوڑنا بعض اوقات بہت ہی مشکل

ہو جاتا ہے۔ایک خونی خون کرنا چھوڑ سکتا ہے۔چور چوری کرنا چھوڑ سکتا ہے لیکن ایک بداخلاق کو غصہ چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے یا تکبر والے کو تکبر چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں دوسروں کو جو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے پھر خود اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ جو خدا تعالیٰ کی عظمت کے لیے اپنے آپ کو چھوٹا بنا دے گا خدا تعالیٰ اس کو خود بڑا بنا دے گا۔یہ یقیناً یاد رکھو کہ کوئی بڑا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ کو چھوٹا نہ بنائے۔یہ ایک ذریعہ ہے جس سے انسان کے دل پر ایک نُور نازل ہوتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف کھینچا جاتا ہے۔

جس قدر اولیاء اللہ دُنیا میں گذرے ہیں اور آج لاکھوں انسان جن کی قدر و منزلت کرتے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو ایک چیونٹی سے بھی کمتر سمجھا جس پر خدا تعالیٰ کا فضل اُن کے شاملِ حال ہوا اور ان کو وہ مدارج عطا کئے جس کے وہ مستحق تھے۔تکبر، بخل، غرور وغیرہ بداخلاقیاں بھی اپنے اندر شرک کا ایک حصہ رکھتی ہیں۔اس لیے ان بداخلاقیوں کا مرتکب خدا تعالیٰ کے فضلوں سے حصہ نہیں لیتا بلکہ وہ محروم ہو جاتا ہے۔برخلاف اس کے عجز و انکسار کرنے والا خدا تعالیٰ کے رحم کا مورد بنتا ہے۔

تکبّر کی قسمیں

تکبّر کئی قسم کا ہوتا ہے۔کبھی یہ آنکھ سے نکلتا ہے جبکہ دوسرے کو گھور کر دیکھتا ہے تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔کبھی زبان سے نکلتا ہے اور کبھی اس کا اظہار سر سے ہوتا ہے اور کبھی ہاتھ اور پاؤں سے بھی ثابت ہوتا ہے۔غرضیکہ تکبّر کے کئی چشمے ہیں اور مومن کو چاہیئے کہ ان تمام چشموں سے بچتا رہے اور اس کا کوئی عضو ایسا نہ ہو جس سے تکبّر کی بُو آوے اور وہ تکبر ظاہر کرنے والا ہو۔[1]

صوفی کہتے ہیں کہ انسان کے اندر اخلاقِ رذیلہ کے بہت سے جنّ ہیں اور جب یہ نکلنے لگتے ہیں تو نکلتے رہتے ہیں مگر سب سے آخری جنّ تکبر کا ہوتا ہے جو اس میں رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل اور انسان کے سچے مجاہدہ اور دُعاؤں سے نکلتا ہے۔

بہت سے آدمی اپنے آپ کو خاکسار سمجھتے ہیں لیکن ان میں بھی کسی نہ کسی نوع کا تکبر ہوتا ہے۔اس لیے تکبر کی باریک در باریک قسموں سے بچنا چاہیئے۔بعض وقت یہ تکبر دولت سے پیدا ہوتا ہے۔دولتمند متکبر دوسروں کو کنگال سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کون ہے جو میرا مقابلہ کرے۔بعض اوقات خاندان اور ذات کا تکبر ہوتا ہے

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۱ صفحہ ۳ تا ۵ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء

نوٹ از مرتب :۔ الحکم کے اس پرچہ کے بعض صفحات پر تاریخ غلط درج ہے۔۳۱ مارچ کی بجائے ۱۷ مارچ لکھا ہے اور ٹائٹل پیج پر بھی ایسا ہی ہے اور نیز نمبر ۱۱ کی بجائے نمبر ۹ لکھا ہے۔

سمجھتا ہے کہ میری ذات بڑی ہے اور یہ چھوٹی ذات کا ہے۔ ایک عورت سیدانی تھی۔ اُسے پیاس لگی۔ وہ دوسرے کے گھر میں جا کر کہنے لگی کہ اُمّتی تو پانی تو پلا مگر پیالہ کو دھو لینا کیونکہ تم اُمّتی ہو اور مَیں سیدانی اور آلِ رسول ہوں۔

بعض وقت تکبّر علم سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص غلط بولتا ہے تو یہ جھٹ اس کا عیب پکڑتا ہے اور شور مچاتا ہے کہ اس کو تو ایک لفظ بھی صحیح بولنا نہیں آتا۔ غرض مختلف قسمیں تکبّر کی ہوتی ہیں اور یہ سب کی سب انسان کو نیکیوں سے محروم کر دیتی ہیں اور لوگوں کو نفع پہنچانے سے روک دیتی ہیں۔ ان سب سے بچنا چاہیئے۔

کامل تبدیلی کی ضرورت

مگر ان سب سے بچنا ایک موت کو چاہتا ہے۔ جب تک انسان اس موت کو قبول نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ کی برکت اس پر نازل نہیں ہو سکتی اور نہ خدا تعالیٰ اس کا متکفّل ہو سکتا ہے۔ اور اگر انسان پورے درجہ کی صفائی نہیں کرتا اور کامل تبدیلی نہیں کرتا تو اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ اس دیوار میں سوئی کے برابر شگاف کر دیں خواہ ایسے سوراخ دس ہزار بھی کیوں نہ ہوں لیکن ان سوراخوں کے ذریعہ سے وہ روشنی اندر نہیں آجائے گی جو کل مکان کو خوب روشن اور منور کر دے۔ لیکن جب ایک اچھا روشندان اس میں کھولا جائے تو اس سے کافی روشنی اندر آئے گی اور سارے مکان کو منوّر کر دے گی۔ اسی طرح پر جب تک تم سچے دل سے مسلمان ہو کر پوری تبدیلی نہیں کرتے اور دل کا دروازہ اللہ تعالیٰ کی طرف کامل طور پر نہیں کھولو گے اس وقت تک خدا تعالیٰ کا وہ نور جو اندر داخل ہو کر ایک سکینت اور اطمینان بخشتا ہے اور جو بدیوں اور بُرائیوں کا امتیاز عطا کرتا ہے نازل نہیں ہوتا اور سچے مسلمان بننے کا موقعہ نہیں ملتا ہے اور جب تک سچا مسلمان نہیں ہوتا اس وقت تک اللہ تعالےٰ کے اُن وعدوں سے جو سچے مومنوں اور متقیوں سے اُس نے کئے ہیں کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور چونکہ ان وعدوں سے اُسے حصہ نہیں ملتا اور وہ خود محروم رہتا ہے اس لیے شکایت کر بیٹھتا ہے کہ سچے مسلمانوں سے کیا وعدے ہوئے ہیں میری دُعا تو قبول نہیں ہوتی لیکن وہ کمبخت نہیں سوچتا کہ مَیں سچا مسلمان تو ہوا ہی نہیں پھر ان وعدوں کا ایفاء کس طرح چاہوں۔ اس کی مثال اس بیمار کی سی ہے جس نے ابھی پوری صحت تو حاصل نہیں کی اور نہ تندرستوں کی طرح اس کے قویٰ میں طاقت آئی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تندرستوں کی طرح بھوک نہیں لگتی اور مَیں چل پھر نہیں سکتا۔ تو اُسے یہی کہا جائے گا کہ ابھی تو پورا تندرست نہیں ہوا۔ جب تک تندرست نہ ہو تندرستوں کے لوازمات تجھے کیونکر حاصل ہو جاویں۔ پس اسی طرح پر جب تک کہ ایک شخص سچا مسلمان نہ بن جاوے اُسے اللہ تعالیٰ کی کوئی شکایت نہیں کرنی چاہیئے لیکن مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ جب ایک شخص سچا مسلمان

بن جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ پر پُورا ایمان لاتا ہے اور اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے ماتحت کر لیتا ہے وہ یقیناً یقیناً ان وعدوں کو پورا پاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص اور مومن بندوں سے کئے ہیں۔ وہ اپنی جان پر ان وعدوں کو پورا ہوتا ہوا پاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ سچا مسلمان بننا ہی تو مشکل ہے۔ سچا مسلمان بننا اور اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکلنا ایک ہی بات ہے۔ جب تک یہ نفس اونٹ کی طرح موٹا ہے یہ اس میں سے نکل نہیں سکتا، لیکن جب دُعا اور تضرع کے ساتھ نفس کو مار لیتا ہے اور وہ جسم جو عارضی طور پر اس پر چڑھا ہوا ہوتا ہے دور ہو جاتا ہے تو یہ لطیف ہو کر اس میں سے نکل جاتا ہے اس کے لیے ضرورت ہے دُعا کی پس ہر وقت دُعا کرتا رہے کیونکہ دُعا تو ایک ایسی چیز ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ دُعا کے ساتھ مُشکل سے مُشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو دُعا کی قدر و قیمت معلوم نہیں وہ بہت جلد ملول ہو جاتے ہیں اور ہمت ہار کر چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ دُعا ایک استقلال اور مداومت کو چاہتی ہے جب انسان پوری ہمت سے لگا رہتا ہے تو پھر ایک بد خُلقی کیا ہزاروں بد خُلقیوں کو اللہ تعالیٰ دُور کر دیتا ہے اور اُسے کامل مومن بنا دیتا ہے لیکن اس کے واسطے اخلاص اور مجاہدہ شرط ہے جو دُعا ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

یاد رکھو نری بیعت سے کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس رسم سے راضی نہیں ہوتا جب تک کہ حقیقی بیعت کے مفہوم کو ادا نہ کرے اس وقت تک یہ بیعت بیعت نہیں نری رسم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بیعت کے حقیقی منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرو۔ یعنی تقویٰ اختیار کرو۔ قرآن شریف کو خوب غور سے پڑھو اور اس پر تدبر کرو اور پھر عمل کرو کیونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نرے اقوال اور باتوں سے کبھی خوش نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حاصل کرنے کے واسطے ضروری ہے کہ اس کے احکام کی پیروی کی جاوے اور اس کے نواہی سے بچتے رہو اور یہ ایک ایسی صاف بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بھی نری باتوں سے خوش نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی خدمت ہی سے خوش ہوتا ہے۔ سچے مسلمان اور جھوٹے مسلمان میں یہی فرق ہوتا ہے کہ جھوٹا مسلمان باتیں بناتا ہے کرتا کچھ نہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں حقیقی مسلمان عمل کر کے دکھاتا ہے باتیں نہیں بناتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ میرا بندہ میرے لیے عبادت کر رہا ہے اور میرے لیے میری مخلوق پر شفقت کر رہا ہے تو اس وقت اپنے فرشتے اس پر نازل کرتا ہے اور سچے اور جھوٹے مسلمان میں جیسا کہ اس کا وعدہ ہے فرقان رکھ دیتا ہے۔

گناہ دُور کرنے کا طریق

اصل غرض انسان کی پیدائش کی یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرے اور اُن باتوں سے جو گناہ کہلاتے ہیں بچتا رہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ گناہوں اور بدیوں سے بچے۔ لیکن ان کے دُور کرنے کا کیا طریق ہے؟ یاد رکھو کہ ہر گناہ اور بدی نری اپنی کوشش سے دور نہیں ہو سکتے جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال نہ ہو۔ پس اسکے واسطے

ضرورت ہے کہ گناہوں کے ترک کرنے کے لیے اس قدر تدبیر کرے جو تدبیر کا حق ہے اور اس قدر دُعا کرے جو دُعا کا حق ہے۔ تدبیر کے لیے چاہیئے کہ گناہوں کو یاد رکھے کہ فلاں فلاں بات گناہ کی ہے اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ رات دن ان بدیوں کو دُور کرنے کی فکر میں لگے رہو۔ اور ان اسباب پر غور کرو جو ان بدیوں کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر ہان بدیوں کا موجب بد صحبت ہے تو اس صحبت کو چھوڑ دو اور اگر خُلق بد اس کا باعث ہے تو اس خُلق کو چھوڑ دو۔ ہر ایک چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اور اسے چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ اُس سبب کو نہ چھوڑے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ بعض وقت انسان ان اسباب اور وجوہ کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن وہ عاجز ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑنا چاہتا ہے مگر اس کے چھوڑنے میں قادر نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں دُعا سے کام لینا چاہیئے اور خدا تعالیٰ سے توفیق مانگے تا وہ اُسے اس گناہ کی زندگی سے رہائی دے۔

یاد رکھو گناہ کی زندگی سے موت اچھی ہے کیونکہ گناہ کی زندگی مجرمانہ زندگی ہے۔ اگر اس پر موت وارد نہ ہو تو یہ سلسلہ لمبا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب موت آجاتی ہے تو کم از کم گناہ کا سلسلہ لمبا تو نہیں ہوتا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان خودکشی کر لیوے بلکہ انسان کو چاہیئے کہ اس زندگی کو اس قدر قبیح خیال کرکے اس سے نکلنے کے لیے کوشش کرے اور دُعا سے کام لے کیونکہ جب وہ حق تدبیر کا ادا کرتا ہے اور پھر سچی دُعاؤں سے کام لیتا ہے تو آخر اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے دیتا ہے اور وہ گناہ کی زندگی سے نکل آتا ہے۔ کیونکہ دُعا بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک موت ہی ہے۔ جب اس موت کو انسان قبول کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مجرمانہ زندگی سے جو موت کا موجب ہے بچا لیتا ہے اور اسکو ایک پاک زندگی عطا کرتا ہے۔

دُعا کیا ہے اور کس طرح کرنی چاہیئے

بہت سے لوگ دُعا کو ایک معمولی چیز سمجھتے ہیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ دُعا یہی نہیں کہ معمولی طور پر نماز پڑھ کر ہاتھ اُٹھا کر بیٹھ گئے اور جو کچھ آیا منہ سے کہہ دیا۔ اس دُعا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ دُعا نری ایک منتر کی طرح ہوتی ہے نہ اس میں دل شریک ہوتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں پر کوئی ایمان ہوتا ہے۔

یاد رکھو دُعا ایک موت ہے اور جیسے موت کے وقت اضطراب اور بے قراری ہوتی ہے اسی طرح پر دُعا کے لیے بھی ویسا ہی اضطراب اور جوش ہونا ضروری ہے اس لیے دُعا کے واسطے پورا پورا اضطراب اور گدازش جب تک نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ پس چاہیئے کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر نہایت تضرع اور زاری و ابتہال کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حضور اپنی مشکلات کو پیش کرے اور اس دُعا کو اس حد تک پہنچاوے کہ ایک موت کی سی صورت واقع ہو جاوے اس وقت دُعا قبولیت کے درجہ تک پہنچتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ سب سے اوّل اور ضروری دعا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کی دُعا کرے۔ ساری دُعاؤں کا اصل اور جزو یہی دعا ہے کیونکہ جب یہ دُعا قبول ہو جاوے اور انسان ہر قسم کی گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک صاف ہو کر خدا تعالیٰ کی نظر میں مطہّر ہو جاوے تو پھر دوسری دُعائیں جو اس کی حاجات ضروریہ کے متعلق ہوتی ہیں وہ اس کو مانگنی بھی نہیں پڑتیں وہ خود بخود قبول ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بڑی مشقّت اور محنت طلب یہی دُعا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاوے اور خدا تعالیٰ کی نظر میں متقی اور راستباز ٹھہرایا جاوے۔ یعنی اوّل اوّل جو حجاب انسان کے دل پر ہوتے ہیں ان کا دُور ہونا ضروری ہے۔ جب وہ دور ہو گئے تو دوسرے حجابوں کے دُور کرنے کے واسطے اس قدر محنت اور مشقت کرنی نہیں پڑے گی کیونکہ خدا تعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال ہو کر ہزاروں خرابیاں خود بخود دُور ہونے لگتی ہیں اور جب اندر پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود بخود اس کا متکفّل اور متولّی ہوتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کسی حاجت کو مانگے اللہ تعالیٰ خود اس کو پُورا کر دیتا ہے۔ یہ ایک باریک سِر ہے جو اس وقت کھلتا ہے جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے اس سے پہلے اس کی سمجھ میں آنا بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن یہ ایک عظیم الشان مجاہدہ کا کام ہے کیونکہ دُعا بھی ایک مجاہدہ کو چاہتی ہے۔ جو شخص دُعا سے لاپرواہی کرتا ہے اور اس سے دور رہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی پروا نہیں کرتا اور اس سے دُور ہو جاتا ہے۔ جلدی اور شتاب کاری یہاں کام نہیں دیتی۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جو چاہے عطا کرے اور جب چاہے عنایت فرمائے سائل کا کام نہیں ہے کہ وہ فی الفور عطا نہ کئے جانے پر شکایت کرے اور بدظنی کرے بلکہ استقلال اور صبر سے مانگتا چلا جاوے۔ دنیا میں بھی دیکھو کہ جو فقیر اَڑ کر مانگتے ہیں خواہ اس کو کتنی ہی جھڑکیاں دو اور جتنا چاہو گھُر کو مگر وہ مانگتے چلے جاتے ہیں اور اپنے مقام سے نہیں ہٹتے یہانتک کہ کچھ نہ کچھ لے ہی مرتے ہیں اور بخیل سے بخیل آدمی بھی اُن کو کچھ نہ کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پر انسان جب اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا ہے اور بار بار مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو کریم رحیم ہے وہ کیوں نہ دے، دیتا ہے اور ضرور دیتا ہے مگر مانگنے والا بھی ہو۔

انسان اپنی شتاب کاری اور جلد بازی کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بالکل سچا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ پس تم اس سے مانگو اور پھر مانگو اور پھر مانگو۔ جو مانگتے ہیں ان کو دیا جاتا ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ دُعا ہو نری بک بک نہ ہو اور زبان کی لاف زنی اور چرب زبانی ہی نہ ہو۔ ایسے لوگ جنہوں نے دُعا کے لیے استقامت اور استقلال سے کام نہیں لیا اور آدابِ دُعا کو ملحوظ نہیں رکھا جب ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا تو آخر وہ دُعا اور اس کے اثر سے منکر ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ سے بھی منکر ہو بیٹھے کہ اگر خدا ہوتا تو ہماری دُعا کو کیوں نہ سنتا۔ ان احمقوں کو اتنا معلوم نہیں کہ خدا تو ہے مگر تمہاری دُعائیں بھی دُعائیں ہوتیں۔ پنجابی زبان میں

ایک ضرب المثل ہے جو دُعا کے مضمون کو خوب ادا کرتی ہے اور وہ یہ ہے :۔

جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جا

یعنی جو مانگنا چاہتا ہے اس کو ضروری ہے کہ ایک موت اپنے اوپر وارد کرے اور مانگنے کا حق اسی کا ہے جو اوّل اس موت کو حاصل کرلے۔ حقیقت میں اسی موت کے نیچے دُعا کی حقیقت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دُعا کے اندر قبولیت کا اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ انتہائی درجہ کے اضطرار تک پہنچ جاتی ہے۔ جب انتہائی درجہ اضطرار کا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی قبولیت کے آثار اور سامان بھی پیدا ہو جاتے ہیں پہلے سامان آسمان پر کئے جاتے ہیں اس کے بعد وہ زمین پر اثر دکھاتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں بلکہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس کو خدائی کا جلوہ دیکھنا ہو اسے چاہیئے کہ دُعا کرے[1]

ان آنکھوں سے وہ نظر نہیں آتا بلکہ دُعا کی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ کیونکہ اگر دُعا کے قبول کرنے والے کا پتہ نہ لگے تو جیسے لکڑی کو گھن لگ کر وہ نکمّی ہو جاتی ہے ویسے ہی انسان پُکار پکار کر تھک کر آخر دہریہ ہو جاتا ہے ایسی دُعا چاہیئے کہ اس کے ذریعہ ثابت ہو جاوے کہ اس کی ہستی برحق ہے۔ جب اس کو یہ پتہ لگ جاوے گا تو اس وقت وہ اصل میں صاف ہو گا یہ بات اگرچہ بہت مشکل نظر آتی ہے لیکن اصل میں مشکل بھی نہیں ہے۔ بشرطیکہ تدبیر اور دُعا دونوں سے کام لیوے جیسے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (الفاتحۃ : ۵) کے معنوں میں (ابھی تھوڑے دن ہوئے) تلایا گیا ہے۔ نماز پوری پڑھو۔ صدقہ اور خیرات دو تو پوری نیت سے دو کہ خدا راضی ہو جاوے اور توفیق طلب کرتے رہو کہ ریاکاری عُجب وغیرہ زہریلے اثر جس سے ثواب اور اجر باطل ہوتا ہے دور ہو جاویں اور دل اخلاص سے بھر جاوے خدا پر بدظنی نہ کرو وہ تمہارے لیے ان کاموں کو آسان کرسکتا ہے وہ رحیم کریم ہے۔ با کریماں کارہا دشوار نیست۔ اگر پیچھے لگے رہو گے تو اسے رحم آ ہی جائے گا۔

خدا یابی سے محروم رہنے کے اسباب

بہت لوگ ہیں کہ سیدھی نیت سے طلب نہیں کرتے۔ تھوڑا طلب کرکے تھک جاتے ہیں۔

دیکھو اگر ایک زمین میں چالیس ہاتھ کھودنے سے پانی نکلتا ہے تو تین چار ہاتھ کھود کر جو شکایت کرے کہ پانی نہیں

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۳ صفحہ ۳ تا ۶ مورخہ ۱۷/ اپریل ۱۹۰۴ء۔ نوٹ :۔ الحکم کے اس پرچہ میں بھی غلطی سے ۲۴/ اپریل کی تاریخ درج ہے جو دراصل ۱۷/ اپریل ہے۔ (مرتب)

[2] یہ مضمون جو گذشتہ مضمون کے تسلسل میں ہے البدر سے لیا گیا ہے کیونکہ الحکم میں یہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ (مرتب)

نکلا اسے تم کیا کہو گے؟ اس قسم کے بدقسمت انسان ہوتے ہیں کہ وہ دو چار دن دُعا کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ کیوں نہ لگا اور اس طرح ایک دنیا گمراہ ہو گئی ہے۔ وظیفے اور مجاہدے کرتے رہے مگر جس حد تک کھودنے سے پانی نکلنا تھا اس حد تک نہ کھودا یعنی نہ پہنچے تو خدا کی ذات سے منکر ہو گئے اور آخر کار خلقت کا رجوع اپنی طرف دیکھ کر ٹھگ بن گئے۔ اس کا باعث یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کی طرف جس رفتار سے چلنا چاہیئے تھا اس رفتار سے نہ چلے اور اس کے عطا کردہ دوسرے قویٰ اور اعضاء سے کام نہ لیا اور طوطے کی طرح وظیفوں پر زور لگانے لگے آخر کار لعنتی ہو گئے۔

گر نباشد بدوست راہ بردن ؎ شرطِ عشق است در طلب مُردن

اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کی راہ پر چلا جاوے یہانتک کہ مر جاوے۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ کے یہی معنے ہیں۔ وہ موت جب آتی ہے تو ساتھ ہی یقین بھی آجاتا ہے۔ موت اور یقین ایک ہی بات ہے۔

غرضکہ اس کمزوری اور کسل نے لوگوں کو خدایابی سے محروم کر دیا ہے کہ پورا حق تلاش کا ادا نہ کیا۔ راستہ میں چھلکا مل گیا اسی پر راضی ہو گئے اور دو کاندار بن گئے۔

راستبازوں کے لباس

اطاعت، عبادت، خدمت میں اگر صبر سے کام لو تو خدا کبھی ضائع نہ کرے گا۔ اسلام میں ہزاروں ہوئے ہیں کہ لوگوں نے صرف اُن کے نُور سے ان کو شناخت کیا ہے۔ اُن کو مکاروں کی طرح بھگوے کپڑے یا لمبے چوغے اور خاص خاص تمیز کرنے والے لباس کی ضرورت نہیں ہے اور نہ خدا کے راستبازوں نے ایسی وردیاں پہنی ہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص ایسا لباس نہ تھا جس سے آپ لوگوں میں متمیز ہو سکتے۔ بلکہ ایک دفعہ ایک شخص نے ابوبکرؓ کو پیغمبر جان کر ان سے مصافحہ کیا اور تعظیم و تکریم کرنے لگا آخر ابوبکرؓ اُٹھ کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو پنکھا جھلنے لگ گئے اور اپنے قول سے نہیں بلکہ فعل سے بتلا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں میں تو خادم ہوں۔ جب انسان خدا کی بندگی کرتا ہے تو اسے رنگدار کپڑے پہننے، ایک خاص وضع بنانے اور مالا وغیرہ لٹکا کر چلنے کی کیا ضرورت ہے ایسے لوگ دُنیا کے کُتے ہوتے ہیں۔ خدا کے طالبوں کو اتنی ہوش کہاں کہ وہ خاص اہتمام پوشاک اور وردی کا کریں وہ تو خلقت کی نظروں سے پوشیدہ رہنا چاہتے ہیں۔ بعض بعض کو خدا تعالیٰ اپنی مصلحت سے باہر کھینچ لاتا ہے کہ اپنی الوہیت کا ثبوت دیوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہرگز خواہش نہ تھی کہ لوگ آپ کو پیغمبر کہیں اور آپ کی اطاعت کریں اور اسی لیے ایک غار میں جو قبر سے زیادہ تنگ تھی جا کر آپ عبادت کیا کرتے تھے اور آپ کا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ اس سے باہر آویں۔ آخر خدا نے اپنی مصلحت سے آپ کو خود باہر نکالا اور آپ کے ذریعے سے دُنیا پر اپنے نُور کو ظاہر کیا۔

انبیاء۔ تلامیذ الرحمٰن

انبیاء تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں ان کا کوئی مرشد وغیرہ نہیں ہوتا وہ دُنیا سے بالکل فانی ہوتے ہیں وہ ہرگز اپنا اظہار نہیں چاہتے۔ مگر خدا انکو

زبردستی باہر لاتا ہے انسان کیا وہ تو فرشتوں سے بھی اخفاء چاہتے ہیں اور ان کی فطرت ہی اس قسم کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ خدا کے نزدیک زندہ ہوتے ہیں لیکن جن کو دنیا کا خیال ہوتا ہے اور چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو اچھا جانیں وہ خدا کے نزدیک مُردار ہوتے ہیں اور ہزاروں قسم کی تصنعات سے ان کو کام لینا پڑتا ہے وہ شیطان ہوتے ہیں اُن سے دُور رہنا چاہیئے وہ لوگ جن کو دیکھکر خدا یاد آتا ہے وہ اَور ہیں نہ کہ یہ۔

پس یاد رکھو کہ زبان سے خدا کبھی راضی نہیں ہوتا اور بغیر ایک موت کے کوئی اس کے نزدیک زندہ نہیں ہوتا جس قدر اہل اللہ ہوتے ہیں سب ایک موت قبول کرتے ہیں۔ اور جب خدا اُن کو قبول کرتا ہے تو زمین پر بھی ان کی قبولیت ہوتی ہے۔ پہلے خدا تعالیٰ خاص فرشتوں کو اطلاع دیتا ہے کہ فلاں بندے سے مَیں محبت کرتا ہوں۔ اور وہ سب اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی محبت زمین کے پاک دلوں میں ڈالی جاتی ہے اور وہ اسے قبول کرتے ہیں۔ جب تک ان لوگوں میں سے کوئی نہیں بنتا تب تک وہ پیتل اور تانبا ہے اور اس قابل نہیں کہ اس کی قدر کی جاوے۔

سچوں کی مخالفت

یاد رکھو خدا کے بندوں کا انجام کبھی بد نہیں ہوا کرتا۔ اس کا وعدہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلة: ۲۲) بالکل سچا ہے اور یہ اسی وقت پورا ہوتا ہے جب لوگ اس کے رسولوں کی مخالفت کریں۔ فریبی مکاروں کی دنیا مخالفت نہیں کیا کرتی کیونکہ دُنیا دُنیا سے مل جاتی ہے۔ لیکن جسے خدا برگزیدہ کرے اس کی مخالفت ہونی ضروری ہے سچے کے ساتھ ایک بڑے طوفان کے بعد لوگ ملا کرتے ہیں اور عقلمند لوگ جان جاتے ہیں کہ اگر یہ خدا تعالےٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اتنی مخالفت پر کیسے کامیاب ہوتا۔ یہ سب امور مخالفت وغیرہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور اس میں وہ اپنے بندے کا صبر دیکھتا ہے اور دکھلاتا ہے کہ دیکھو جس کو مَیں انتخاب کرتا ہوں وہ کیسے بہادر ہیں کیونکہ جھوٹے کے لیے پانچ چھ دشمن ہی کافی ہوتے ہیں، لیکن ان کے مقابلہ پر ایک دنیا دشمن ہوتی ہے اور پھر یہ غالب آتے ہیں۔ ایک جھوٹا تحصیلدار اگر ایک گاؤں میں چلا جاوے اور ایک ادنیٰ سا آدمی بھی یہ کہدے کہ مجھے اس کی تحصیلداری میں شک ہے تو آخر کار وہ اسی دن وہاں سے کھسک جاوے گا کہ میرا پول کُھل گیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مَیں چور ہوں۔ جھوٹے کی استقامت کچھ نہیں ہوتی لیکن خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی استقامت کا فوق الکرامت نمونہ دکھاتا ہے اور اسے دیکھ دیکھ کر لوگ تنگ آجاتے ہیں اور آخر کار بول اُٹھتے ہیں کہ یہ سچوں کی استقامت ہے۔ سچائی پر اگر ہزار گرد و غبار ڈالا جاوے پھر بھی وہ باہر نکل کر اپنا جلوہ دکھائے گی۔

نصائح

فتنہ کی بات نہ کرو۔ شر نہ کرو۔ گالی پر صبر کرو۔ کسی کا مقابلہ نہ کرو۔ جو مقابلہ کرے اس سے سلوک اور نیکی سے پیش آؤ۔ شیریں بیانی کا عمدہ نمونہ دکھلاؤ۔ سچے دل سے

ہر ایک حکم کی اطاعت کرو کہ خدا تعالیٰ راضی ہو اور دشمن بھی جان لے کہ اب بیعت کر کے یہ شخص وہ نہیں رہا جو کہ پہلے تھا۔ مقدمات میں سچی گواہی دو۔ اس سلسلہ میں داخل ہونے والے کو چاہیئے کہ پورے دل، پوری ہمت اور ساری جان سے راستی کا پابند ہو جاوے۔ دنیا ختم ہونے پر آئی ہوئی ہے۔

اس کے بعد آپ نے کسوف خسوف اور طاعون کا ذکر کیا کہ

ایک آسمانی نشان ہے اور ایک زمینی

پھر تاکید فرمائی کہ

خدا سے معاملہ صاف رکھو

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ صفحہ ۸، ۹ مورخہ ۱۶ رمارچ ۱۹۰۴ء)

مَلْفُوْظَاتٌ

حضرت امام الزمان علیہ الصلوٰۃ والسّلام جو کہ آپ نے مارچ کے آخر نصف میں فرمائے

(ایڈیٹر بدر)

صبر اور تقویٰ کے نتائج اگر دیکھنے ہوں تو سورۃ یوسف کو غور سے مطالعہ کرو کہ جسے بھائیوں نے غلام بنا کر فروخت کیا تھا آخر کار خدا نے اُسے تخت پر بٹھا دیا۔

گناہ کی طاعون اور اس کا علاج

اس وقت جبکہ بدی کمال انتشار پر ہے اور اس کی ہوا ہی چلی ہوئی ہے اس سے الگ ہونا بھی ایک مرد کا کام ہے۔ ہر ایک میں یہ طاقت نہیں کہ جوانمردی سے اس سے الگ ہو جاوے جب انسان ہر کس و ناکس کو فسق و فجور میں مبتلا دیکھتا ہے تو اُس کا اثر اس کے قلب پر پڑتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ سب دنیا جو ایسا کرتی ہے تو یہ کوئی بُری بات نہیں اس لیے بدی کی طرف میلان ہو جاتا ہے اُس پر خدا کا بڑا فضل ہے جس کی یہ آنکھ کھلے اور وہ بدی کو بدی جان کر الگ ہو۔

اس وقت جیسے طاعون پھیلی ہے اور سوائے خدا کے خاص فضل کے نجات نہیں۔ اسی طرح گناہ کی طاعون ہے اور اس سے بچنے کے لیے بھی خدا کے فضل کی ضرورت ہے۔ جیسے جسمانی حالت اور قویٰ میں دیکھا جاتا ہے کسی کی کوئی قوت کمزور ہوتی ہے اور کسی کی کوئی۔ یہی حال گناہوں کا ہے کہ بعض انسان خاص گناہوں کے

ترک پر تو قادر ہوتے ہیں اور دوسرے گناہوں کے ترک میں کمزور۔ پس جس گناہ کے چھوڑنے میں جو اپنے آپ کو کمزور پاوے اس کو نشانہ بنا کر دُعا کرے تو اُسے فضلِ خدا سے قوت عطا ہوگی۔

سنتِ الٰہی یہی ہے کہ ابتدا کافروں کی ہوتی چلی آئی ہے اور انجام کار متقی فریق کامیاب ہوتا رہا ہے۔

صحابہ کرامؓ کی مراتب شناسی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مراتب پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو کچھ اسلام کا بنا ہے وہ اصحابِ ثلاثہ سے ہی بنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا ہے وہ اگرچہ کچھ کم نہیں مگر ان کی کارروائیوں سے کسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خفت نہیں ہوسکتی کیونکہ کامیابی کی پٹڑی تو صدیق اکبرؓ نے ہی جمائی تھی اور عظیم الشان فتنہ کو انہوں نے ہی فرو کیا تھا۔ ایسے وقت میں جن مشکلات کا سامنا حضرت ابوبکرؓ کو پڑا وہ حضرت عمرؓ کو ہرگز نہیں پڑا۔ پس صدیقؓ نے رستہ صاف کر دیا تو پھر اس پر عمرؓ نے فتوحات کا دروازہ کھولا۔

آخر عمر میں ایمان سلامت لے جانے کے لیے نہ علم کی ضرورت ہے اور نہ کسی اَور شئے کی۔ استغفار بہت کرنی چاہیئے اور نماز میں اُٹھتے بیٹھتے ہر حال میں دُعا میں مصروف رہنا چاہیئے۔

اسلام اس بات کا نام ہے کہ قرآن شریف کی اِتباع سے خدا کو راضی کیا جاوے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۵ صفحہ ۳ مورخہ ۱۶؍ اپریل ۱۹۰۴ء)

۲۹؍ مارچ ۱۹۰۴ء

باہر سے آنیوالوں کا حق

چند ایک احباب بیرون جات سے آئے ہوئے تھے اور حضرت اقدس کے قریب بیٹھنے کے لیے ایکدوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ حضرت اقدس نے قادیانی احباب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ

ان لوگوں کو جگہ دو۔ نئے آدمیوں کی تو خدا تعالیٰ نے اوّل ہی سے سفارش کر رکھی ہے۔ جیسے براہین میں یہ الہام موجود ہے کہ کثرت سے لوگ تیرے پاس آویں گے تو ان سے تنگدل نہ ہونا۔

استقامت

بعدازاں چند احباب نے بیعت کی جس پر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذیل کی تقریر ایک ایسے شخص کے سوال پر فرمائی جس نے حضور سے استقامت کے لیے دعا کی درخواست کی تھی۔ فرمایا کہ

استقامت خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے ہم نے دُعا کی ہے اور کریں گے لیکن تم بھی خدا تعالیٰ سے استقامت کی توفیق طلب کرو۔ استقامت کے یہ معنے ہیں کہ جو عہد انسان نے کیا ہے اسے پورے پر نبھائے یاد رکھو کہ عہد کرنا آسان ہے مگر اس کا نباہنا مشکل ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ باغ میں تخم ڈالنا آسان مگر اس کے نشوونما کے لیے ہر ایک ضروری بات کو ملحوظ رکھنا اور آبپاشی کے اوقات پر اس کی خبرگیری کرنی مشکل ہے ایمان بھی ایک پودا ہے جسے اخلاص کی زمین میں بویا جاتا ہے اور نیک اعمال سے اس کی آبپاشی کی جاتی ہے اگر اس کی ہر وقت اور موسم کے لحاظ سے پوری خبرگیری نہ کی جاوے تو آخر کار تباہ اور برباد ہو جاتا ہے دیکھو باغ میں کیسے ہی عمدہ پودے تم لگاؤ لیکن اگر لگا کر بھول جاؤ اور اُسے وقت پر پانی نہ دو یا اس کے گرد باڑ نہ لگاؤ تو آخر کار نتیجہ یہی ہوگا کہ یا تو وہ خشک ہو جاویں گے یا اُن کو چور لے جاویں گے۔ ایمان کا پودا اپنے نشوونما کے لیے اعمال صالحہ کو چاہتا ہے اور قرآن شریف نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے وہاں اعمال صالحہ کی شرط لگا دی ہے کیونکہ جب ایمان میں فساد ہوتا ہے تو وہ ہرگز عنداللہ قبولیت کے قابل نہیں ہوتا۔ جیسے غذا جب باسی ہو یا سڑ جاوے تو اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح ریا، عُجب، تکبر ایسی باتیں ہیں کہ اعمال کو قبولیت کے قابل نہیں رہنے دیتیں کیونکہ اگر اعمال نیک سرزد ہوتے ہیں تو وہ بندے کی اپنی طرف سے نہیں بلکہ خاص خدا کے فضل سے ہوتے ہیں۔ پھر اس میں کیا تعلق کہ وہ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے اُن کو ذریعہ ٹھہراتا ہے یا اپنے نفس میں خود ہی اُن سے کبر کرتا ہے جس کا نام عُجب ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء: ۲۹) یعنی انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس میں بذاتِ خود کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے جب تک خدا تعالیٰ خود عطا نہ فرمائے۔ اگر آنکھیں ہیں اور تم اُن سے دیکھتے ہو یا کان ہیں اور تم اُن سے سنتے ہو یا زبان ہے اور تم اس سے بولتے ہو تو یہ سب خدا کا فضل ہے کہ یہ سب قوٰی اپنا اپنا کام کر رہے ہیں ورنہ اکثر لوگ مادر زاد اندھے یا بہرے یا گونگے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض بعد پیدائش کے دوسرے حوادثات سے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر تمہاری آنکھیں بھی نہیں دیکھ سکتیں جب تک روشنی نہ ہو اور کان نہیں سُن سکتے جب تک ہوا نہ ہو۔ پس اس سے سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ دیا گیا ہے جب تک آسمانی تائید اس کے ساتھ نہ ہو تب تک

تم محض بیکار ہو۔ایک بات کو تم کتنے ہی صدق دل سے قبول کرو مگر جب تک فضل الٰہی شامل حال نہیں تم اس پر قائم نہیں رہ سکتے ۔

احمدیت

بیعت توبہ اور بیعت تسلیم جو تم نے آج کی ہے اور اس میں جو اقرار کیا ہے اُسے سچے دل سے بہت مضبوط پکڑو اور پختہ عہد کرو کہ مرتے دم تک تم اس پر قائم رہو گے۔ سمجھ لو کہ آج ہم نفس کی خود رویوں سے باہر آگئے ہیں اور جو جو ہدایت ہو گی اس پر عمل کرتے رہیں گے ہم کوئی نئی ہدایت یا نیا دین یا نیا عمل نہیں لائے ۔ ہدایت بھی وہی ہے ، دین بھی وہی ہے ، عمل بھی وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دے گئے ہیں۔کوئی نیا کلمہ تم کو تلقین نہیں کیا جاتا اور نہ کوئی نیا خاتم النبیین بنایا جاتا ہے۔ ہاں اس پر سوال ہوتا ہے کہ جب نئی بات کوئی نہیں تو پھر فرق کیا ہوا اور ایک جماعت کیوں تیار ہو رہی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا نے جو ارادہ کیا تھا کہ وہ ایک مسیح موعود بنا کر بھیجے گا اور وہ اس وقت آوے گا جب کہ دُنیا سخت تاریکی میں ہو گی ۔ ہر طرف سے کفر کے حملے ہوں گے۔ اسلام کو ہر ایک پہلو سے نقصان پہنچانے کی کوشش ہوگی ۔تو اس کے آنے کے دو فائدے ہوں گے ۔

ایک فائدہ تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسا زمانہ ہے کہ اسلام بدعات سے پُورا حصہ لے چکا ہے۔ ہر ایک بدعت تیسری صدی ہجری سے شروع ہو کر چودھویں صدی تک کمال کو پہنچ گئی اور پوری دجالی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ حدیثیں بلند آواز سے اس زمانہ کی نسبت خبر دے رہی ہیں ۔ جیسے ایک حمل کی مدت نو ماہ ہوتی ہے اس مناسبت سے تیسری صدی کے بعد جب نو صد سال گذر گئے تو خدا نے ایک مامور کو مبعوث کیا کہ ان بدعات اور مفاسد کو دور کرے کیونکہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کے مطابق لَيْسُوا مِنِّي وَلَسْتُ مِنْهُمْ کے مصداق ہو گئے تھے اور اسلام کا صرف نام ہی نام ان کی زبانوں پر رہ گیا تھا جیسے ایک باغ کے عمدہ عمدہ بُوٹوں کو دوسرے خراب بُوٹے اور گھاس وغیرہ پیدا ہو کر دبا لیتے ہیں ایسے ہی ردّی گھاس اور بُوٹے اسلام کے باغ میں ہو گئے تھے اور اس کا حقیقی نشوونما اور آب و تاب بالکل جاتی رہی تھی۔ مکار درویش گدی نشین اور فقیر وغیرہ اس ردّی گھاس کی طرح ہیں جو کہ برائے نام تو مسلمان ہیں لیکن اصل میں دشمنِ اسلام ہیں ۔خود ان کا قول تھا کہ مسیح اور مہدی چودھویں صدی کے سر پر ہو گا وہ پورا ہو گیا۔ پھر طاعون بھی نشان تھا وہ بھی پورا ہو گیا ۔ نئی سواری جسے ریل کہتے ہیں۔ یہ بھی نشان تھی جو کہ چلتی دیکھتے ہو۔ سُورج اور چاند کا گرہن بھی ماہ رمضان میں ہو گیا ۔ ایک بڑی بدعت جس کی مثال جانوروں میں سے ہاتھی کی مثال ہے یہ پڑ گئی تھی کہ نصاریٰ کا زور ہو گیا اور اسلام پر حملے شروع ہوئے ۔ ۳۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان مُرتد ہو چکے ۔کیا یہ ممکن تھا کہ اسلام کے قادرِ مطلق خدا کو چھوڑ کر ایک عاجز انسان اور پھر میّت کو خدا مانا جاوے ۔کیا کسی کی عقل و فکر

میں یہ بات آسکتی تھی مگر تاہم لوگ اس دھوکہ میں آ گئے۔ اس کا باعث عیسائیوں کی شرارت ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی ایک بڑا حصّہ اس کا اس طرح سے لیا ہوا ہے کہ مسیح کو تو آسمان پر زندہ مانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیرِ زمین دفن شدہ تسلیم کیا اور اس طرح سے ہر ایک پہلو اور بات میں یہ خود عیسائیوں کی مدد کر رہے ہیں اور ان کا ایک دست و بازو بنے ہوئے ہیں۔ اوّل تو قرآن شریف کے برخلاف ایک بات کرتے ہیں اور پھر وہ بات جس سے عیسائیوں کو تقویت ہو۔ قرآن شریف پیش کرتے ہیں کہ اس میں اس کا آسمان پر اُٹھایا جانا لکھا ہے حالانکہ قرآن شریف تو بڑے زور سے اس کی وفات ثابت کرتا ہے۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (المائدۃ : ۱۱۸) اور قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (اٰل عمران: ۱۴۵) اور أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا (المرسلات : ۲۶) وغیرہ بہت سی آیات ہیں جن سے وفات ثابت ہوتی ہے۔ پھر کمبخت ناوان ایک اور بات کہتے ہیں کہ صرف مسیح اور اس کی ماں مَسِّ شیطان سے پاک ہیں۔ یہ اصل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینا ہے کہ ایک بنی اسرائیل کی عورت مریم تو مَسِّ شیطان سے پاک ہو اور نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پاک نہ ہوں۔ اگر یہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہوتے اور یہ بات کہتے تو پھر دیکھتے کہ اس بے ادبی کی کیا سزا پاتے۔

مسیح اور مریم کو مَسِّ شیطان سے پاک قرار دینے کی وجہ

اصل بات یہ ہے کہ حضرت مسیح اور ان کی ماں مریم پر یہود کا اعتراض تھا۔ مسیح کو وہ لوگ ناجائز ولادت کا الزام لگاتے اور مریم کو زانیہ کہتے تھے۔ قرآن شریف کا کام ہے کہ انبیاء پر سے اعتراضات کو رفع کرے اس لیے اس نے مریم کے حق میں زانیہ کی بجائے صدیقہ کا لفظ رکھا اور مسیح کو مَسِّ شیطان سے پاک کہا۔ اگر ایک محلہ میں صرف ایک عورت کا تبریہ کیا جاوے اور اس کی نسبت کہا جاوے کہ وہ بدکار نہیں ہے تو اس سے یہ التزام لازم نہیں آتا کہ باقی کی سب ضرور بدکار ہیں۔ صرف یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس پر جو الزام ہے وہ غلط ہے یا اگر ایک آدمی کو کہا جاوے کہ وہ بھلا مانس ہے تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہوتے کہ باقی کے سب لوگ بھلے مانس نہیں بلکہ بدکار ہیں اسی طرح یہ ایک مقدمہ تھا کہ مسیح اور اس کی ماں پر الزام لگائے گئے تھے۔ خدا نے شہادت دی کہ وہ الزاموں سے بَری اور پاک ہیں۔ کیا عدالت اگر ایک ملزم کو قتل کے مقدمہ میں بَری کر دے تو اس سے یہ لازم آوے گا کہ باقی سب لوگ اس شہر کے ضرور قاتل اور خونخوار ہیں۔ غرضیکہ اس قسم کی بدعات اور فساد پھیلے ہوئے تھے جن کے دُور کرنے کے لیے خدا نے ہمیں مبعوث کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ، طہارت، خدا کی طرف رجوع، خدا کی محبت اور ہر بدکاری کے وقت

اس کے خوف اور عظمت کو مدنظر رکھ کر گنارہ کش ہونا یہ باتیں اُٹھ گئی تھیں اور اسلام صرف برائے نام رہ گیا تھا۔ اب خدا نے چاہا کہ سچی پاکیزگی حاصل ہو۔

عقائد کا اثر اعمال پر

اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جاوے اور اس کے احسانوں کے بدلے میں اس کی پوری اطاعت کی جاوے ورنہ خدا تعالیٰ جیسے محسن و مربی سے جو روگردانی کرتا ہے وہ شیطان ہے۔

دوسرا حصہ یہ ہے کہ مخلوق کے حقوق شناخت کرے اور کما حقہٗ اس کو بجا لاوے۔ جن قوموں نے موٹے موٹے گناہ جیسے زنا، چوری، غیبت، جھوٹ وغیرہ اختیار کئے آخر وہ ہلاک ہوگئیں اور بعض قومیں صرف ایک ایک گناہ کے ارتکاب سے ہلاک ہوتی رہیں مگر چونکہ یہ اُمّت مرحومہ ہے اس لیے خدا تعالیٰ اُسے ہلاک نہیں کرتا۔ ورنہ کوئی معصیت ایسی نہیں ہے جو یہ نہیں کرتے۔ بالکل ہندوؤں کی طرح ہو گئے ہیں۔ ہر ایک نے الگ معبود بنا لیے ہیں عیسیٰ کو مثلِ خدا کے حیّ و قیوم مانا جاتا ہے پرندوں کا اُسے خالق مانا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ عقیدے اچھے ہوتے ہیں تو انسان سے اعمال بھی اچھے صادر ہوتے ہیں۔ دیکھو ہندوؤں نے ۳۳ کروڑ دیوتا بنائے تو آخر نیوگ وغیرہ جیسے مسائل کو بھی ماننے لگ گئے اور ذرہ ذرہ کو خدا مان لیا۔ اس نیوگ اور حرامکاری کی کثرت کا باعث یہی اعتقاد کا نقص ہے۔ جو انسان سچا اور بے نقص عقیدہ اختیار کرتا ہے اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تو اس سے اعمال خود بخود ہی اچھے صادر ہوتے ہیں اور یہی باعث ہے کہ جب مسلمانوں نے سچے عقاید چھوڑ دیئے تو آخر دجال وغیرہ کو خدا ماننے لگ گئے کیونکہ دجال میں تمام صفات خدائی کے تسلیم کرتے ہیں پس جب اس میں تمام صفات خدائی کے مانتے ہو تو جو اسے خدا کہے اس کا اس میں کیا قصور ہوا؟ خود ہی تو تم خدائی کا چارج دجال کو دیتے ہو۔ پروردگار چاہتا ہے کہ جیسے عقائد درست ہوں ویسے ہی اعمالِ صالحہ بھی درست ہوں اور ان میں کسی قسم کا فساد نہ رہے۔ اس لیے صراطِ مستقیم پر ہونا ضروری ہے خدا نے بار بار مجھے کہا ہے کہ اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ فِی الْقُرْاٰنِ اس کی تعلیم ہے کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور جو قرآن نے کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔

جماعت اور امام کی ضرورت

اور ایک ضروری بات یہ ہے کہ تقویٰ میں ترقی کرو ترقی انسان خود نہیں کر سکتا تھا جب تک ایک جماعت اور ایک اس کا امام نہ ہو۔ اگر انسان میں یہ قوت ہوتی کہ وہ خود بخود ترقی کر سکتا تو پھر انبیاء کی ضرورت نہ تھی۔ تقویٰ کے لیے ایک ایسے انسان کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے جو صاحبِ کشش ہو اور بذریعہ دُعا کے وہ نفسوں کو پاک کرے۔ دیکھو اس قدر حکماء گذرے ہیں کیا کسی نے صالحین کی جماعت بھی بنائی ہرگز نہیں

اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ صاحب کشش نہ تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بنا دی۔ بات یہ ہے کہ جسے خدا تعالیٰ بھیجتا ہے اس کے اندر ایک تریاقی مادہ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ پس جو شخص محبت اور اطاعت میں اس کے ساتھ ترقی کرتا ہے تو اس کے تریاقی مادہ کی وجہ سے اس کے گناہ کی زہر دُور ہوتی ہے اور فیض کے ترشحات اس پر بھی گرنے لگتے ہیں۔ اس کی نماز معمولی نماز نہیں ہوتی۔ یاد رکھو کہ اگر موجودہ ٹکروں والی نماز ہزار برس بھی پڑھی جاوے تو ہرگز فائدہ نہ ہوگا۔ نماز ایسی شئے ہے کہ اس کے ذریعہ سے آسمان انسان پر جُھک پڑتا ہے۔ نماز کا حق ادا کرنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ مَیں مرگیا اور اس کی روح گداز ہو کر خدا کے آستانہ پر گر پڑی ہے۔ اگر طبیعت میں قبض اور بدمزگی ہو تو اس کے لیے بھی دُعا ہی کرنی چاہیئے کہ الٰہی تو ہی اُسے دُور کر اور لذّت اور نور نازل فرما۔ جس گھر میں اس قسم کی نماز ہوگی وہ گھر کبھی تباہ نہ ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر نوحؑ کے وقت میں یہ نماز ہوتی تو وہ قوم کبھی تباہ نہ ہوتی۔ حج بھی انسان کے لیے مشروط ہے روزہ بھی مشروط ہے۔ زکوٰۃ بھی مشروط ہے مگر نماز مشروط نہیں۔ سب ایک سال میں ایک ایک دفعہ ہیں مگر اس کا حکم ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کا ہے۔ اس لیے جب تک پوری پوری نماز نہ ہوگی تو وہ برکات بھی نہ ہوں گی جو اس سے حاصل ہوتی ہیں اور نہ اس بیعت کا کچھ فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر بھوک یا پیاس لگی ہو تو ایک لقمہ یا ایک گھونٹ سیری نہیں بخش سکتا۔ پوری خوراک ہوگی تو تسکین ہوگی۔ اسی طرح ناکارہ تقویٰ ہرگز کام نہ آوے گا۔ خدا تعالیٰ انہیں سے محبت کرتا ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (اٰل عمران: ۹۳) کے یہ معنے ہیں کہ سب سے عزیز شئے جان ہے۔ اگر موقعہ ہو تو وہ بھی خدا کی راہ میں دیدی جاوے نماز میں اپنے اوپر جو موت اختیار کرتا ہے وہ بھی بِرّ کو پہنچتا ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۵ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۱۶؍اپریل ۱۹۰۴ء)

۱۹؍اپریل ۱۹۰۴ء

دُعا کی توفیق بھی خدا سے ہی ملتی ہے

باوجود اس کے کہ انسان اپنے نفس کے اندر اختیار اور قدرت کا ایک مادہ پاتا ہے مگر پھر بھی وہ الٰہی قدرت کے تصرفات سے باہر نہیں ہے اور اسے ہر وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ تمام قوتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ جو اللہ کریم کی ذات ہے وہ اس سے قوت طلب کرے۔ اس طلب کرنے میں بھی اُسے خدا تعالیٰ کے فضل کی خاص ضرورت ہے

بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ایک ضرورت کو محسوس کرتا ہے جانتا ہے کہ اس کیلئے دُعا کرنی چاہیئے، لیکن باوجود اس علم اور قدرت کے وہ دُعا نہیں کرتا اور اس کے لیے انشراحِ صدر حاصل نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اس باریک سِر اور تصرفاتِ الٰہی کو مدّنظر نہ رکھ کر دُعا پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے ایسے اعتراضات پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

اگر دُعا اپنے اختیار میں ہوتی تو انسان جو چاہتا کر لیتا۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ فلاں دوست یا رشتہ دار کے حق میں ضرور فلاں بات ہو ہی جاوے گی۔ بعض وقت باوجود سخت ضرورت محسوس کرنے کے دُعا نہیں ہوتی اور دل سخت ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس کے سِر سے لوگ واقف نہیں ہوتے اس لیے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس پر ایک شُبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر جفّ القلم والی بات (یعنی مسئلہ تقدیر جس رنگ میں سمجھا گیا ہے) ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے علم میں سب ضرور ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ فلاں کام ضرور ہی کر دیوے۔ اگر ان لوگوں کا یہی اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہونا تھا وہ سب ہو چکا اور ہماری محنت اور کوشش بیسود ہے تو درد سر کے وقت علاج کی طرف کیوں رجوع کرتے ہیں۔ پیاس کے لیے ٹھنڈا پانی کیوں پیتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ انسان کے تردّد[1] پر بھی کچھ نہ کچھ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

دعا عمدہ شئے ہے اگر توفیق ہو تو ذریعہ مغفرت کا ہو جاتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ مہربان ہو جاتا ہے۔ دُعا کے نہ کرنے سے اوّل زنگ دل پر چڑھتا ہے پھر قساوت پیدا ہوتی ہے پھر خدا سے اجنبیت۔ پھر عداوت۔ پھر نتیجہ سلبِ ایمان ہوتا ہے۔

جس مہدی کو لوگ مانتے ہیں وہ شکّی ہے اور اس کی نسبت احادیث میں بہت تعارض ہے لیکن ہمارا دعویٰ اُس مہدی کا ہے جس کی نسبت کوئی شک نہیں۔

خدا بڑا رحیم کریم ہے اگر لوگ رات دن تضرع کریں۔ خیرات اور صدقات دیں تو شاید وہ رحم کرکے اس عذاب سے ان کو نجات دے۔ اگر جماعت متفق ہو کر تضرع کی طرف متوجہ ہو تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارا آخری حصہ عمر کا ہے اور ہمیشہ تجربہ ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی غالب ہوتا ہے وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلیٰٓ

---

[1] تردد بمعنے کوشش۔ جدوجہد (مرتب)

اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (یوسف : ۲۲) یوسف علیہ السلام کا قصہ ہی دیکھو کہ سب بھائی مصیبت زدہ ہو کر اُسی کے سامنے پیش ہوتے ہیں لیکن اُسے شناخت نہیں کرسکتے۔ اگر یہ ہمارا مقدمہ ایک انسانی کاروبار ہوتا تو سب سے اوّل بیزار ہونے والا اس سے مَیں ہوتا مگر جبکہ اس کے قدم قدم پر خدا کا الہام ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے اسی کی طرف سے ایک امر ہے۔

فرمایا :-

رابعہ بصری کو اسی دن غم ہوتا تھا جس دن خدا کی راہ میں انہیں کوئی غم نہ ہوتا مومن کسی نہ کسی ابتلاء میں ضرور رہتا ہے ؎

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ ٭ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی

زندگی بڑھانے کے لیے ایسے کام کرنے چاہئیں جو خدا کی راہ میں ہوں۔ وہ احمق ہیں جو دُنیا کو معشوق و محبوب بنالیتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ آخر اُسے کیا کام آنا ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸ - ۱۹ صفحہ ۳ مورخہ ۸/۱۶ مئی ۱۹۰۴ء)

---

۱۹ اپریل کی شام

زندگی کی اصل غرض

"زندگی کے فیشن سے بہت دُور جا پڑے ہیں"۔

یہ الہام آج اعلیحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوا تھا۔ اس پر فرمایا کہ

زندگی کی اصل غرض اور مقصود تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے مگر اس وقت مَیں دیکھتا ہوں کہ عام طور پر لوگ اس غرض اور مقصود کو فراموش کر چکے ہیں اور کھانے پینے اور حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے سوا اَور کوئی مقصود نہیں رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دنیا کو پھر اس کی زندگی کی غرض سے آگاہ کرے اور یہ فناءِ قہری اس کو رجوع کرائے گی۔

خوفِ خدا

اس لیے ہر شخص کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرے اور اللہ تعالیٰ کا خوف اس کو بہت سی نیکیوں کا وارث بنائے گا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے

وہی اچھا ہے کیونکہ اس خوف کی وجہ سے اس کو ایک بصیرت ملتی ہے جس کے ذریعہ وہ گناہوں سے بچتا ہے بہت سے لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انعام اور اکرام پر غور کر کے شرمندہ ہو جاتے ہیں اور اس کی نافرمانی اور خلاف ورزی سے بچتے ہیں، لیکن ایک قسم لوگوں کی ایسی بھی ہے جو اُس کے قہر سے ڈرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اچھا اور نیک تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی پرکھ سے اچھا نکلے۔ بہت لوگ ہیں جو اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم متقی ہیں مگر اصل میں متقی وہ ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ کے دفتر میں متقی ہو۔

اس وقت اللہ تعالیٰ کے اسم ستّار کی تجلّی ہے۔ لیکن قیامت کے دن جب پردہ دری کی تجلی ہوگی اس وقت تمام حقیقت کُھل جائے گی۔ اس تجلی کے وقت بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو آج بڑے متقی اور پرہیزگار نظر آتے ہیں قیامت کے دن وہ بڑے فاسق فاجر نظر آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملِ صالح ہماری اپنی تجویز اور قرارداد سے نہیں ہو سکتا۔ اصل میں اعمال صالحہ وہ ہیں جن میں کسی نوع کا کوئی فساد نہ ہو کیونکہ صالح فساد کی ضد ہے۔ جیسے غذا طیّب اس وقت ہوتی ہے کہ وہ کچی نہ ہو نہ سڑی ہوئی ہو اور نہ کسی ادنیٰ درجہ کی جنس کی ہو بلکہ ایسی ہو جو فوراً جزوِ بدن ہو جانے والی ہو۔ اسی طرح پر ضروری ہے کہ عملِ صالح میں بھی کسی قسم کا فساد نہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہو اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہو اور پھر نہ اس میں کسی قسم کا کسل ہو نہ عُجب ہو نہ ریا ہو نہ وہ اپنی تجویز سے ہو۔ جب ایسا عمل ہو تو وہ عملِ صالح کہلاتا ہے اور یہ کبریتِ احمر ہے۔

شیطان سے بچنا

شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اور اس کے اعمال کو فاسد بنانے کے واسطے ہمیشہ تاک میں لگا رہتا ہے یہانتک کہ وہ نیکی کے کاموں میں بھی اس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اور کسی نہ کسی قسم کا فساد ڈالنے کی تدبیریں کرتا ہے نماز پڑھتا ہے تو اس میں بھی ریا وغیرہ کوئی شعبہ فساد کا ملانا چاہتا ہے۔ ایک امامت کرانے والے کو بھی اس بلا میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ پس اس کے حملہ سے کبھی بے خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے حملے فاسقوں فاجروں پر تو کُھلے کھلے ہوتے ہیں وہ تو اس کا گویا شکار ہیں۔ لیکن زاہدوں پر بھی حملہ کرنے سے وہ نہیں چُوکتا اور کسی نہ کسی رنگ میں موقعہ پاکر اُن پر بھی حملہ کر بیٹھتا ہے جو لوگ خدا کے فضل کے نیچے ہوتے ہیں اور شیطان کی باریک در باریک شرارتوں سے آگاہ ہوتے ہیں وہ تو بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرتے ہیں لیکن جو ابھی خام اور کمزور ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ریا اور عُجب وغیرہ سے بچنے کے واسطے ایک ملامتی فرقہ ہے جو اپنی نیکیوں کو چھپاتا ہے اور سیئات کو ظاہر کرتا رہتا ہے وہ اس طرح پر سمجھتے ہیں کہ ہم

شیطان کے حملوں سے بچ جاتے ہیں مگر میرے نزدیک وہ بھی کامل نہیں ہیں۔ ان کے دل میں بھی غیر ہے اگر غیر نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ انسان معرفت اور سلوک میں اس وقت کامل ہوتا ہے جب کسی نوع اور رنگ کا غیر اُن کے دل میں نہ رہے اور یہ فرقہ انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ یہ ایسا کامل گروہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں غیر کا وجود بالکل معدوم ہوتا ہے۔

محبّتِ ذاتی کا مقام

اصل بات یہ ہے کہ غیر کے وجود کو کالعدم سمجھنا یہ بھی اختیاری نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حالت عشقیہ ہے جو از خود پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی جڑ محبتِ ذاتی ہے۔ جب محبتِ ذاتی کے مقام پر انسان پہنچتا ہے تو پھر یہ عشقیہ حالت پیدا ہو کر غیر کے وجود کو جلا دیتی ہے اور پھر کسی کے مدح و ذم یا عذاب و ثواب کی بھی پروا نہیں ہوتی۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اپنی مدح بھی سُن لیا کرتے تھے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ آپ کو اس مدح کی پروا ہوتی تھی۔ سخت غلطی ہے آپ کو ان باتوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا اور کوئی اثر اس کا آپ پر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک محلِ مدح ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے کو ہلاک کر دیتا ہے لیکن آپ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ تعلق اور رشتہ تھا کہ کسی دوسرے کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا تھا پس آپ کسی انسان کی مدح سے کیا خوش ہو سکتے تھے ایسا ہی ذم کا حال ہے۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کی محبتِ ذاتی میں فنا ہو چکے تھے۔ خارجی احساس باقی ہی نہیں رہا تھا۔ اس لیے سارے مقام ختم ہو چکے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جو مقامِ امن کہلاتا ہے۔ زاہد خشک کی مدح کرنے والا اس کو ہلاک کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مدح سے خوش ہو کر اپنے وجود کو بھی کوئی شئے سمجھنے لگتا ہے اور اپنے اعمال پر ایک ناز کرنے لگتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ مراتب بھی وہبی ہیں کوشش سے نہیں ملتے اور انسان کامل اسی مقام پر ہوتا ہے۔ صوفی کہتے ہیں کہ جب تک محبّتِ ذاتی نہ ہو جاوے ایسی محبت کہ بہشت اور دوزخ پر بھی نظر نہ ہو اس وقت تک کامل نہیں ہوتا اس سے پہلے اس کا خدا بہشت اور دوزخ ہوتے ہیں لیکن جب وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کے لیے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۱) کا حکم ہوتا ہے کیونکہ ان کی رضا خدا کی رضا ہوتی ہے۔ جب تک یہ حال نہ ہو اندیشہ ہوتا ہے کہ نیکی ضائع نہ ہو جائے۔

ذاتی محبت والے سے اگر اس کی غرض پوچھی جاوے کہ تو کیوں خدا کی عبادت کرتا ہے تو وہ کچھ بھی بتا نہیں سکتا کیونکہ اسے کوئی ذاتی غرض محسوس ہی نہیں ہوتی بلکہ اگر اس کے لیے دوزخ کی وعید بھی ہو کہ تو اگر عبادت کرے گا تو دوزخ ملے گا تب بھی وہ رُک نہیں سکتا کیونکہ اس کے رگ و ریشہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت اور محبت ہوتی ہے وہ بے اختیار ہو کر اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اُسے نہیں معلوم کہ کیوں کھنچا جاتا ہے یہی وجہ ہے

کہ نہ وہ ثواب و عذاب کی پروا کرتا ہے اور نہ مدح و ذم کا اثر اس پر ہوتا ہے۔ انبیاء و رسل اسی مقام پر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مخالفت اور خطرناک مصائب اور مشکلات ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکتے۔ میں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اس مقام کو سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا دارالامان ہے کہ شیطان اس جگہ نہیں آسکتا۔ ایک زاہد بعض وقت مغضوب کے زمرہ میں آسکتا ہے لیکن جو اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے مقام پر پہنچ گیا وہ محفوظ ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبتِ ذاتی کی آگ غیر کے وجود کو مطلقاً جلا دیتی ہے اور اس کو امن میں داخل کر دیتی ہے استجابتِ دُعا بھی اسی مقام پر ہوتا ہے۔ یہ ایسا ارفع اور اعلیٰ مقام ہے کہ اس کی تصریح بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک کیفیت ہے جو دوسرے کو اچھی طرح سمجھا بھی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے گلہ کرنے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ ان تعلقات سے محض ناآشنا ہوتا ہے جو انبیاء و رُسل اور اللہ تعالیٰ میں ہوتے ہیں اس لیے کسی ایسے امر کو جو ہماری سمجھ اور دانش سے بالاتر اور بالاتر ہے، اپنی عقل کے پیمانہ سے ناپنا صریح حماقت ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا گلہ کرنے لگے کہ انہوں نے درختِ ممنوع کا پھل کھایا یا عَبَسَ وَ تَوَلّٰی کو لے بیٹھے۔ ایسی حرکت آداب الرسل کے خلاف ہے اور کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے چونکہ خدا تعالیٰ ان کا محبوب ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ کسی بات پر گویا رُوٹھ جاتا ہے وہ باتیں عام قانون جرائم و ذنوب سے الگ ہوتی ہیں۔ ۳۰ سال کے قریب کا عرصہ ہوتا ہے کہ ایک مقرب فرشتہ کو مَیں نے دیکھا جس نے مجھے ایک تُوت کی چھڑی ماری پھر مَیں نے اس کو دیکھا کرسی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ یہ ایک نسبت بتائی ہے کہ جیسے بعض اوقات والدہ بچہ کو مارتی ہے پھر رقت سے خود ہی رونے لگتی ہے۔ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جو مجھ پر ظاہر کیا گیا ہے۔

نبی اور خُدا کا تعلق

میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ان تعلقات کو جو انبیاء و رسل اور اللہ تعالیٰ میں ہوتے ہیں کس طرح ظاہر کیا جاوے۔ یہ تعلقات ایسے شدید اور گہرے ہوتے ہیں کہ بجز کامل الایمان ہونے اور اس کوچہ سے آشنا ہونے کے ان کی سمجھ آ ہی نہیں سکتے اس لیے صوفیوں نے لکھا ہے کہ اُن کے افعال اور اعمال عام قانون جرائم و ذنوب سے الگ ہوتے ہیں۔ ان کو اس ضمن ذنوب میں ذکر کرنا بھی سلب ایمان کا موجب ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا حساب تعلقات کا ہے۔ ذنب محمدی کی حقیقت کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ عام طور پر عاشق و معشوق کے تعلقات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اور یہ تعلقات تو اس سے بھی لطیف تر ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار

احمق حقیقت سے ناآشنا استغفار کے لفظ پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ جسقدر

یہ لفظ پیارا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اندرونی پاکیزگی پر دلیل ہے وہ ہمارے وہم وگمان سے بھی پرے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عاشقِ رضا ہیں اور اس میں بڑی بلند پروازی کے ساتھ ترقیات کر رہے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تصور کرتے ہیں اور اظہار شکر سے قاصر پاکر تدارک کرتے ہیں۔ یہ کیفیت ہم کس طرح ان عقل کے اندھوں اور مجذوم القلب لوگوں کو سمجھائیں ان پر وارد ہو تو وہ سمجھیں جب ایسی حالت ہوتی ہے۔ احساناتِ الٰہیہ کی کثرت آکر اپنا غلبہ کرتی ہے تو روح محبت سے پُر ہو جاتی ہے اور وہ اُچھل اُچھل کر استغفار کے ذریعہ اپنے قصورِ شکر کا تدارک کرتی ہے۔ یہ لوگ خشک منطق کی طرح اتنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ قویٰ جن سے کوئی کمزوری یا غفلت صادر ہو سکتی ہے وہ ظاہر نہ ہوں نہیں وہ ان قویٰ پر تو فتح حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تصور کر کے استغفار کرتے ہیں کہ شکر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لطیف اور اعلیٰ مقام ہے جس کی حقیقت سے دوسرے لوگ ناآشنا ہیں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے حیوانات گدھے وغیرہ انسانیت کی حقیقت سے بے خبر اور ناواقف ہیں۔ اسی طرح پر انبیاء و رُسل کے تعلقات اور ان کے مقام کی حقیقت سے دوسرے لوگ کیا اطلاع رکھ سکتے ہیں۔ یہ بڑے ہی لطیف ہوتے ہیں اور جس جس قدر محبتِ ذاتی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر یہ اَور بھی لطیف ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھو حضرت یوسفؑ نے صرف یہی کیا تھا کہ تم بادشاہ سے میرا ذکر بھی کرنا۔ صرف اتنی بات پر ایک عرصہ تک زندان میں رہنا پڑا۔ حالانکہ عام نظر میں یہ ایک معمولی سی بات ہو سکتی ہے مگر نہیں یہ ان تعلقاتِ محبت کے منافی تھی۔ غرض یہ ایک لطیف سِر ہے جس پر ہر ایک مطلع نہیں ہو سکتا۔ یہی ایک مقام ہے جس کی طلب ہر ایک کو کرنی چاہیئے۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴ و ۱۵ صفحہ ۱، ۲ مورخہ ۳۰ راپریل، ۱۰ رمئی ۱۹۰۴ء)

---

۱۲ راپریل ۱۹۰۴ء

(دربارِ شام)

اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ عَرْشِیْ

یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تازہ وحی ہے۔ عرش کے متعلق ۱۲ راپریل کی شام کو فرمایا کہ:۔

عرش عرش اللہ تعالیٰ کی جلالی وجمالی صفات کا مظہر اتم ہے۔ عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق کے متعلق مَیں کچھ نہیں کہتا۔ اس کی تفصیل حوالہ بخدا کرنی چاہیئے۔ جنہوں نے مخلوق کہا ہے انہوں نے بھی غلطی کھائی ہے کیونکہ پھر اس سے وہ محدود لازم آتا ہے اور جو غیر مخلوق کہتے ہیں وہ توحید کے خلاف کہتے ہیں کیونکہ اَلَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ اگر یہ غیر مخلوق ہو تو پھر اس سے باہر رہ جاتا ہے۔ مومن موحد اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جیسے اُفْطِرُ وَاَصُوْمُ یا اُخْطِی وَاُصِیْبُ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ استعارات کے ذریعہ کلام کرتا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی کیفیت کو حوالہ بخدا کرتے ہیں۔ پس ہمارا مذہب عرش کے متعلق یہی ہے کہ اس کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث میں دخل نہ دو۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کی جلالی وجمالی تجلیات کا مظہر ہے۔

امن است در مکانِ محبت سرائے ما

اس الہام کو سناتے وقت فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ

محبت بھی ایک نار ہوتی ہے اور طاعون بھی ایک نار ہے۔ اس لیے دو نار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی ہیں اسی لیے معبّرین نے بھی لکھا ہے کہ جو شخص دیکھے کہ اس کے دل سے شعلۂ نار بھڑکتا ہے وہ عاشق ہو جائیگا۔ عشق کو بھی نار کہتے ہیں۔

پس اگر اللہ تعالیٰ کی محبت ذاتی اور عشق پیدا ہو جاوے اور اس کے ساتھ وفاداری، اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو محفوظ کر لے گا۔[1]

وباؤں کا عذاب جب دنیا میں فسق وفجور پھیل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے لوگ دُور جا پڑتے ہیں اور اس سے لاپروا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی پروا نہیں کرتا ہے۔ ایسی صورت میں پھر اس قسم کی وبائیں بطور عذاب نازل ہوتی ہیں ان بلاؤں اور وباؤں کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہوتی ہے کہ دُنیا پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت ظاہر ہو اور فسق وفجور سے لوگ نفرت کر کے نیکی اور راستبازی کی طرف توجہ کریں اور خدا تعالیٰ کے مامور کی طرف جو اس وقت دُنیا میں موجود ہوتا ہے توجہ کریں۔ اس زمانہ میں بھی فسق وفجور کے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ راستبازی، تقوے،

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴، ۱۵ صفحہ ۳ مورخہ ۳۰؍ اپریل، ۱۰؍ مئی ۱۹۰۴ء

عفت اور خدا ترسی اور خدا شناسی بالکل اُٹھ گئی تھی۔ دین کی باتوں پر ہنسی کی جاتی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے موافق جو اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی زبان پر کیا تھا کہ مسیح موعود کے وقت دنیا میں مری بھیجوں گا اس طاعون کو اصلاحِ خلق کے لیے مسلط کیا ہے۔ طاعون کو بُرا کہنا بھی گناہ ہے۔ یہ تو خدا تعالیٰ کا ایک مامور ہے جیسا کہ مَیں نے ہاتھی والی رؤیا میں دیکھا تھا، لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ بعض دیہات بالکل برباد ہو گئے ہیں اور ہر جگہ یہ آفت برپا ہے تو بھی ان شوخیوں، شرارتوں اور بیباکیوں میں فرق نہیں آیا۔ جو اس سے پہلے بھی تھیں۔ مکر و فریب، ریاکاری بدستور پھیلی ہوئی ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۶ صفحہ ۱ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۴ء)

---

۲۳ اپریل ۱۹۰۴ء

ایک شخص نے حفاظتِ طاعون کے لیے دُعا کی درخواست کی۔ فرمایا کہ اوّل اپنے اعمال درست کرو پھر دُعا کا اثر ہوگا۔

مکر اللہ

مکر اللہ کے یہی معنے ہیں کہ انسان کی باریک در باریک تدابیر اور تجاویز پر آخر کار خدا کی تجاویز غالب آجاویں اور انسان کو ناکامی ہو۔ اگر کوئی کتاب اللہ سے اس فلاسفی کو نہیں مانتا تو دنیا میں بھی اس کی نظیر موجود ہے اور اس کے اسرار پائے جاتے ہیں چور کیسی باریک در باریک تدابیر کے نیچے اپنا کام اور اپنی حفاظت کرتا ہے لیکن گورنمنٹ نے جو تجاویز باریک در باریک اس کی گرفتاری کی رکھی ہیں آخر وہ غالب آجاتی ہیں تو خدا کیوں غالب نہ آوے۔

رعایتِ اسباب ضروری ہے

اگرچہ سوائے اذن الٰہی کے کچھ نہیں ہوتا مگر تاہم احتیاط کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے لیے بھی حکم ہی ہے۔ احادیث میں جو متعدی امراض کے ایک دوسرے سے لگ جانے کی نفی ہے اس کے بھی یہی معنے ہیں ورنہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امورِ مشہودہ اور محسوسہ کا انکار کیا جاوے۔ اس سے کوئی یہ نہ دھوکا کھاوے کہ ہمارا اعتقاد قال اللہ و قال الرسول کے برخلاف ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہم تو قرآن شریف کی اس آیت پر عمل کرتے ہیں وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود: ۱۱۴) رعایتِ اسباب کرنی قدیم سنت انبیاء کی ہے جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں جاتے تو خُود زرہ وغیرہ پہنتے خندق کھودتے، بیماری میں دوائیں استعمال کرتے۔ اگر کوئی ترکِ اسباب کرتا ہے تو وہ خدا کا امتحان کرتا

ہے جو کہ منع ہے۔

سخت دل ہر ایک فاسق سے بدتر ہوتا ہے اور وہ خدا سے اَبْعَد ہوتا ہے جو ٹیڑھی راہ اختیار کرتا ہے وہ بلا تلخی دیکھنے کے مرتا نہیں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ صفحہ ۳ مورخہ ۸-۱۶ مئی ۱۹۰۴ء)

۲۵؍اپریل ۱۹۰۴ء

(بوقت شام)

خوارقِ عادت امور

شام کے وقت اس امر کا ذکر ہو رہا تھا کہ خدا تعالیٰ کہاں تک اپنے بندہ کی نصرت اور حفاظت کرتا ہے۔ اس پر حضور نے اپنا ایک واقعہ سنایا۔ فرمایا کہ

مَیں ایک دفعہ زحیرِ قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہوگیا۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ زندگی سے بالکل مایوسی ہوگئی اور گھر کے سب لوگ اپنی طرف سے مجھے مُردہ تصور کر بیٹھے حتّٰی کہ سورۂ یٰسٓ بھی سنادی گئی اور رونے کے لیے اردگرد چٹائیاں بچھا دیں لیکن مجھے دراصل ہوش تھی اور مَیں سب کچھ دیکھ اور سُن رہا تھا، لیکن چونکہ سخت تپش اور جلن تھی اس لیے بول نہ سکتا تھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ اگر میں زندہ بھی رہا تو اس قسم کی صعوبت اور موت کی تلخی پھر بھی دیکھنی پڑے گی کہ اسی اثنا میں مجھے الہام ہوا۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِشِفَآءٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ اور تسبیح پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ مَیں تسبیح پڑھ پڑھ کر شکم پر اور درد کی جگہ پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ ایک سکینت حاصل ہوتی جاتی تھی اور درد و اَلَم وغیرہ رفع ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ اس سے بالکل آرام ہوگیا۔

فرمایا:۔

خوارقِ عادات کا علم اَور ہے اور یہ امور بہت ہی دقیق در دقیق ہیں۔ معمولی زندگی اور اسباب پرستی کی زندگی دہریّت کی رگ سے اصل میں ملی ہوئی ہوتی ہے حقیقی اور اصلی زندگی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان حاصل ہو جاوے۔ ایمان قوی اسی وقت ہوتا ہے جب خصوصیت کے ساتھ خوارقِ عادت اور کثرت سے ہوں۔

ہماری خواہش یہ ہے کہ الٰہی تجلیات ظاہر ہوں جیسے کہ موسیٰ نے اَرِنِيْ کہا تھا ورنہ ہمیں تو بہشت کی

ضرورت ہے اور نہ کسی اَور شئے کی۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۸؍۱۶ مئی ۱۹۰۴ء)

۲۸؍ اپریل ۱۹۰۴ء

مومن کی نظر اعمالِ صالحہ پر ہونی چاہیئے

ایک نوجوان نے اپنے کچھ رؤیا اور الہامات سنانے شروع کئے جب وہ سُنا چکا تو آپ نے فرمایا۔

مَیں تمہیں نصیحت کے طور پر کہتا ہوں۔ اسے خوب یاد رکھو کہ ان خوابوں اور الہامات ہی پر نہ رہو بلکہ اعمالِ صالحہ میں لگے رہو۔ بہت سے الہامات اور خواب سبز و پھل کی طرح ہوتے ہیں جو کچھ دنوں کے بعد گِر جاتے ہیں اور پھر کچھ باقی نہیں رہتا ہے۔ اصل مقصد اور غرض اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا اور بے ریا تعلق۔ اخلاص اور وفاداری ہے جو نرے خوابوں سے پُوری نہیں ہوسکتی مگر اللہ سے کبھی بے خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ہوسکے صدق و اخلاص و ترکِ ریا و ترکِ منہیات میں ترقی کرنی چاہیئے اور مطالعہ کرتے رہو کہ ان باتوں پر کس حد تک قائم ہو۔ اگر یہ باتیں نہیں ہیں تو پھر خوابیں اور الہامات بھی کچھ فائدہ نہیں دیں گے بلکہ صوفیوں نے لکھا ہے کہ اوائل سلوک میں جو رؤیا یا وحی ہو اس پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے وہ اکثر اوقات اس راہ میں روک ہوجاتی ہے۔ انسان کی اپنی خوبی اس میں تو کوئی نہیں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو وہ کسی کو کوئی اچھی خواب دکھاوے یا کوئی الہام کرے اس نے کیا کیا؟ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت وحی ہوا کرتی تھی لیکن اس کا کہیں ذکر بھی نہیں گیا گیا کہ اس کو یہ الہام ہوا یہ وحی ہوئی۔ بلکہ ذکر کیا گیا ہے تو اس بات کا کہ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى۔ وہ ابراہیم جس نے وفاداری کا کامل نمونہ دکھایا۔ یا یہ کہ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۰۶) یہ بات ہے جو انسان کو حاصل کرنی چاہیئے۔ اگر یہ پیدا نہ ہو تو پھر رؤیا و الہام سے کیا فائدہ؟ مومن کی نظر ہمیشہ اعمال صالحہ پر ہوتی ہے اگر اعمال صالحہ پر نظر نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ مکر اللہ کے نیچے آجائے گا۔ ہم کو تو چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کو راضی کریں اور اس کے لیے ضرورت ہے اخلاص کی، صدق و وفا کی، نہ یہ کہ قیل و قال تک ہی ہماری ہمت و کوشش محدود ہو۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ بھی برکت دیتا ہے اور اپنے فیوض و برکات کے دروازے کھول دیتا ہے اور رؤیا اور وحی کو القاءِ شیطانی سے پاک کر دیتا ہے اور اضغاث احلام سے بچا لیتا ہے پس اس بات

کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ رؤیا اور الہام پر مدار صلاحیت نہیں رکھنا چاہیئے۔ بہت سے آدمی دیکھے گئے ہیں کہ ان کو رؤیا اور الہام ہوتے رہے لیکن انجام اچھا نہیں ہوا۔ جو اعمالِ صالحہ کی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اس تنگ دروازہ سے جو صدق و وفا کا دروازہ ہے گذرنا آسان نہیں۔ ہم کبھی ان باتوں سے فخر نہیں کر سکتے کہ رؤیا یا الہام ہونے لگے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہیں اور مجاہدات سے دستکش ہو رہیں اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا وہ تو فرماتا ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم: ۴۰) اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ مجاہدہ کرے اور وہ کام کر کے دکھلاوے جو کسی نے نہ کیا ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ صبح سے شام تک مکالمہ کرے تو یہ فخر کی بات نہیں ہوگی کیونکہ یہ تو اس کی عطا ہوگی۔ دھیان یہ ہوگا کہ خود ہم نے اس کے لیے کیا کیا۔

بلعم کتنا بڑا آدمی تھا۔ مستجاب الدعوات تھا۔ اس کو بھی الہام ہوتا تھا لیکن انجام کیسا خراب ہوا اللہ تعالیٰ اسے کُتّے کی مثال دیتا ہے اس لیے انجام کے نیک ہونے کے لیے مجاہدہ اور دُعا کرنی چاہیئے اور ہر وقت لرزاں ترساں رہنا چاہیئے۔

مومن کو اعتقاد صحیح رکھنا اور اعمال صالحہ کرنے چاہئیں اور اس کی ہمت اور سعی اللہ تعالیٰ کی رضا اور وفاداری میں صرف ہونی چاہیئے۔

مومن کی صحیح رؤیا کی تعبیر یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق ہو۔ اس کے اَوَامر نواہی اور وصایا میں پورا اُترے اور ہر مصیبت و ابتلاء میں صادق مخلص ثابت ہو یاد رکھو ابتلا بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ابتلاء شریعت کے اوامر و نواہی کا ہوتا ہے۔ دوسرا ابتلا قضا و قدر کا ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (البقرۃ: ۱۵۶)

پس اصل مرد میدان اور کامل وہ ہوتا ہے جو ان دونو قسم کے ابتلاؤں میں پورا اُترے۔ بعض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اوامر و نواہی کی رعایت کرتے ہیں لیکن جب کوئی ابتلا مصیبت قضا و قدر کا پیش آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرتے ہیں۔ ایسا ہی بعض فقیر دیکھے گئے ہیں کہ ہمیں نفس کشی کی اس قدر مشق ہے کہ سارے دن میں صرف ایک مرتبہ سانس لیتے ہیں لیکن وہ ابتلاء کے وقت بہت ہی بودے اور کمزور ثابت ہوتے ہیں تو وہی ہے جو اعتقاد صحیح رکھتا ہو۔ اعمالِ صالحہ کرنے والا ہو اور مصائب و شدائد میں پورا اُترنے والا ہو اور یہی جوانمردی ہے۔ جب تک عبودیت میں پورا اور کامل نہیں رؤیا یا الہامات پر اس کا فخر بے جا ہے کیونکہ اس میں اپنی کوئی خوبی نہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور اس امر میں کامیابی کے لیے ایک زمانہ دراز چاہیئے جلدی کبھی نہیں چاہیئے جیسے کوئی شخص درخت لگاتا ہے تو پہلے اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک بکری بھی منہ مار کر اُسے

کھا سکتی ہے۔ پھر اگر وہ اس سے بچے تو مختلف قسم کی آندھیاں اس پر چلتی ہیں اور اس کو اکھاڑنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن اگر وہ ان سے بھی بچ رہے تو پھر کہیں جا کر اُسے پھول لگتے ہیں اور پھر وہ پھول بھی ہوا سے گرتے ہیں اور کچھ بچتے ہیں۔ آخر الامر پھل لگتا ہے اور اس پر بھی بہت سی آفتیں آتی ہیں کچھ یونہی گر جاتے ہیں اور کچھ آندھیوں میں تباہ ہوتے ہیں[1]۔ جو پکتے ہیں اور کھانے کے کام آتے ہیں۔

اسی طرح پر ایمانی درخت کا حال ہے۔ اس سے پھل کھانے کے لیے بھی بہت سی صعوبتوں اور مشکلات میں ثابت قدم رہنا ضروری ہے۔ صوفی بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ جب تک موت نہ آوے زندگی حاصل نہیں ہوتی۔ قرآنِ شریف نے صحابہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب: ۲۴) یعنی بعض صحابہؓ میں سے ایسے ہیں جو اپنی جان دے چکے ہیں اور بعض ابھی منتظر ہیں۔ جب تک اس مقام پر انسان نہیں پہنچتا۔ بامراد نہیں ہو سکتا۔

دو قسم کے آدمی دراصل جان سلامت لے جاتے ہیں ایک وہ جو دین العجائز رکھتے ہیں یعنی جیسے ایک بڑھیا عورت ایمان لاتی ہے کہ اللہ ایک محمدؐ برحق ہے۔ وہ اسرارِ شریعت کی تہہ تک پہنچنے کی ضرورت نہیں سمجھتی ہے۔

اور ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو سلوک کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ بڑے بڑے خونخوار دشت و بیابان ان کی راہ میں آتے ہیں مگر وہ ہزاروں موتیں برداشت کر کے پہنچ جاتا ہے۔ اس کی جوانمردی اور ہمت قابلِ تعریف ہے۔

لیکن ایک اور گروہ ہوتا ہے جو نہ تو دین العجائز اختیار کرتا ہے اور نہ اس راہ کو اختیار کر کے انجام تک پہنچتا ہے بلکہ اس دشتِ خونخوار میں پڑ کر راستہ ہی میں ہلاک ہو گیا۔ ایسے لوگ وہی ہوتے ہیں جو مکر اللہ کے نیچے آ جاتے ہیں۔ غرض اس راہ کا طے کرنا بہت ہی مشکل ہے اس کے لیے چاہیئے کہ دُعا میں مشغول ہو اور قرآن شریف کو پڑھ کر دیکھتے رہو کہ آیا اس کے حکموں پر چلتے ہو یا نہیں جس حکم پر نہیں چلتے اس پر چلنے کے لیے مجاہدہ کرو اور خدا تعالیٰ سے دُعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

غرض اعمالِ صالحہ بڑی چیز ہے۔ قرآن شریف کو دیکھو جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے اسے اعمالِ صالحہ سے وابستہ کیا ہے۔ اس میں متوجہ ہو کہ خدا تعالیٰ راضی ہو جاوے جب تک یہ بات نہ ہو کچھ نہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸-۱۹ صفحہ ۱۰ مورخہ ۸-۱۶؍ مئی ۱۹۰۴ء)

نیز (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴، ۱۵ صفحہ ۲ مورخہ ۳۰؍ اپریل و یکم مئی ۱۹۰۴ء و نمبر ۱۶ صفحہ ۱۶ صفحہ ۱ مورخہ ۱۷؍ مئی ۱۹۰۴ء)

---

[1] الحکم میں آگے یہ الفاظ ہیں۔ "کچھ جانور کھا جاتے ہیں آخر تھوڑے ہوتے ہیں جو پکتے ہیں۔"

۲۹ ؍اپریل ۱۹۰۴ء

(بوقت شام)

اَلطَّرِیْقَۃُ کُلُّھَا اَدَبٌ

ایک شخص نومسلم چکڑالوی کے خیالات کا متبع آیا ہوا تھا۔اس نے نشان دیکھنا چاہا حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے سوال کو طریق ادب وطالب کے خلاف پاکر حکم دیا تھا کہ تم واپس چلے جاؤ۔ اس پر اُس نے ایک معافی نامہ پیش کیا جس پر حضرت حجۃ اللہ نے فرمایا:۔

یہ بات محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے کہ کوئی بات کسی کو سمجھادے لیکن اُسے سمجھ دیتا ہے جو ادب کے طریق پر سچا طالب ہوکر تلاش کرتا ہے۔ اَلطَّرِیْقَۃُ کُلُّھَا اَدَبٌ خدا تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ ہے کہ جو شخص صدق دل اور نیک نیتی کے ساتھ اس کی راہ کی تلاش کرتے ہیں وہ ان پر ہدایت ومعرفت کی راہیں کھول دیتا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہم میں ہوکر مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ ہم میں ہوکر سے یہ مراد ہے کہ محض اخلاص اور نیک نیتی کی بناء پر خدا جوئی اپنا مقصد رکھ کر۔ لیکن اگر کوئی استہزاء اور ٹھٹھے کے طریق پر آزمائش کرتا ہے۔ وہ بدنصیب محروم رہ جاتا ہے۔ پس اسی پاک اُصول کی بنا پر اگر تم سچے دل سے کوشش کرو اور دُعا کرتے رہو تو وہ غفورٌ رحیم ہے لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی پروا نہیں کرتا وہ بے نیاز ہے۔

صبر واستقلال کی ضرورت

دنیا فنا کا مقام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اس فانی مقام پر دلدادہ نہ ہو بلکہ آخرت کی فکر کرے جو ابدی ہے اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لاوے اور اس کی مرضی کو مقدم کرکے اس پر چلے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کو مقدم نہیں کرتا اور اس پر نہیں چلتا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ جیسے ہزاروں لاکھوں کیڑے مرجاتے ہیں یہ بھی مرجاتا ہے اور اس کا کوئی خیال نہیں ہوتا، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کرتا ہے اور دُعاؤں سے کام لیتا ہے اور تھکتا نہیں تو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اس پر اپنی راہ کے دروازے کھول دیتا ہے۔ یہی اُصول یہاں بھی ہے کیونکہ مجھے اس خدا نے مامور کرکے بھیجا ہے۔ پس اگر کوئی یہاں آتا ہے اس لیے کہ وہ شعبدہ بازی دیکھے اور پھونک ملد کرولی بنا دیا جاوے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ ہم پھونک مار کر ولی نہیں بناتے۔ جو شخص جلد بازی سے کام لیتا ہے وہ خدا تعالیٰ کو آزماتا ہے۔ خدا اس کی پروا نہیں کرتا تو مجھے اس کی کیا پروا۔ اتنا ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا غفور ورحیم ہے بلکہ اس کے

ساتھ یہ بھی ماننا چاہیئے کہ وہ غنی بھی ہے۔ اگر ساری دنیا اتقٰی قلب لے کر آوے تو اس کی الوہیت کی شان ایک ذرہ بھر بھی بڑھ نہ گی اور اگر اتقٰی نہ ہو تو اس سے کچھ کم نہ ہوگا۔ اس لیے طالبِ صادق کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی بے نیاز ہے اسکو حاجت اس امر کی نہیں کہ میں اسکی طرف رجوع کروں بلکہ مجھے حاجت اور ضرورت ہے کہ اسکی طرف رجوع کروں اور اسکے آستانہ الوہیت پر گروں جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا کو میری حاجت نہیں مجھے خدا کی حاجت ہے تو اس میں ایک طلب صادق کا جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ خدا کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے۔ پس اگر کوئی میرے پاس آتا ہے تو اُسے بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میرا کام تو صرف پہنچا دینا ہے منوا دینا میرا کام نہیں۔ اگر کوئی اپنی بھلائی اور بہتری چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ایک دن مرنا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور جانا ہے تو اس کا فرض ہونا چاہیئے کہ صبر اور صدق کے ساتھ اس راہ کو تلاش کرے اور گھبرائے اور تھکے نہیں، لیکن جب کوئی حد سے زیادہ شرارت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی باتوں پر ہنسی کرتا اور انہیں ٹھٹھے میں اُڑانا چاہتا ہے تو اُس کا علاج اس نے اور رکھا ہوا ہے۔ اب بھی یہی ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے۔ کتوں اور کیڑوں کی طرح لوگ مر رہے ہیں اور مریں گے۔

دیکھو دس روپیہ کا مقدمہ بھی ہو تو انسان اپنی عقل پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ دوسروں سے مشورہ لیتا ہے اور ان پر بھروسہ کرتا ہے۔ پھر وکیل تلاش کرتا ہے وکیل بھی اعلیٰ درجہ کا۔ پھر حکام رس لوگوں کی تلاش کرتا اور ان کی خوشامد کرتا اور جائز و ناجائز وسائل کے استعمال سے بھی نہیں چوکتا۔ جب ایک تھوڑی سی متاع کے لیے وہ اس قدر جد و جہد اور کوشش کرتا ہے۔ پھر اُسے شرم کرنی چاہیئے کہ دین کے لیے اس کا دسواں حصہ بھی سعی نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اسرارِ دین اس پر کھل جاویں اور وہ دم زدن میں ولی بن جاوے چند منٹ کے لیے ایک شخص ہماری مجلس میں آکر بیٹھتا ہے اور باہر نکل کر فتویٰ دیتا ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے، یہ سب کچھ دکانداری ہے ہم ایسے فتووں اور ایسی رائوں کی کیا پروا کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور الہام کے مقابلہ میں جو روشن نشانوں اور دلائل کے ساتھ ہو رہا ہے ایسی بے سروپا رائوں اور فتووں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے مگر ایسی رائے دینے والے کو مرنے کے بعد پتہ لگ جاوے گا کہ ان کے فتووں کی کیا حقیقت ہے۔ اس وقت سارے پردے اور حجاب اُٹھ جاویں گے اور حقیقت کھل جائے گی میں دنیا کی حالت پر سخت تعجب اور افسوس کرتا ہوں کہ اگر کسی کو کہہ دیا جاوے کہ تجھے جذام کا اندیشہ ہے تو وہ طبیب تلاش کرتا ہے اور نسخے پر نسخہ استعمال کرتا چلا جاتا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کی بیماری کے لیے تو یہ جد و جہد کی جاتی ہے پر اس کے مقابلہ پر دین کے لیے کوئی فکر اور کوشش نہیں کی جاتی جوئندہ یابندہ ایک عام مثل ہے مگر اس کے لیے یہ بھی تو ضروری ہے کہ جو سچی تلاش اور طلب کا حق ہے وہ ادا کرے۔ یہ تو نہیں

کہ ایک شخص آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ مجھے کوئی نشان دکھا دو۔ میں شام کو واپس جانا چاہتا ہوں۔ ایسی جلد بازی اور اقتراح خدا کو پسند نہیں ہے دیکھو زمیندار کس قدر محنت کرتا ہے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر سخت سے سخت زمین میں ہل چلاتا ہے پھر تخم ریزی کرتا ہے، آبپاشی کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے۔ تب جاکر کہیں پھل اُٹھاتا ہے یہ کوشش اور محنت دنیا کے لیے تو ہے جو آج ہے کل نہ ہوگی مگر دین کے لیے کچھ بھی نہیں۔ چونکہ نفس میں خباثت ہوتی ہے اور تلاشِ حق مطلوب نہیں ہوتی اس لیے جلد فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں نے سمجھ لیا ہے۔ یہ بے انصافی اور ظلم نہیں تو کیا ہے؟ مگر یہ سچ ہے وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (البقرۃ: ۵۸) ایک شخص جو کنواں کھودنے لگا ہے وہ اگر دو چار ہاتھ کھود کر شکایت کرے کہ پانی نہیں نکلا تو کیا اس کو احمق نہ کہا جاویگا اور ملامت نہ ہوگی کہ ابھی تو اس حد تک پہنچا تو ہے ہی نہیں جہاں پانی نکلتا ہے ابھی سے شکایت کرتا ہے یہ تو تیرا اپنا ہی قصور اور نادانی ہے۔ ہر ایک امر کے لیے ایک قانونِ قدرت اور وقت ہے خواہ وہ امر دینی ہو یا دنیوی۔ پھر دنیوی امور میں تو ان قوانینِ قدرت کو نگاہ رکھنا ہے لیکن دینی امور میں آکر عقل ماری جاتی ہے اور جلدی کر کے ایک دم میں سب کچھ چاہتا ہے۔ یہ جلد باز اور شتابکار لوگ جب خدا تعالیٰ کے ماموروں کے پاس جاتے ہیں تو وہاں بھی اس شتابکاری سے کام لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ایک پھونک مار کر ان کو آسمان پر چڑھا دے۔ ایسے نشان مانگتے ہیں کہ ایمان ایمان ہی نہ رہے اگر کوئی شخص چاند یا سورج پر ایمان لاوے تو بتاؤ اس کو اس ایمان سے کیا فائدہ اور ثواب ہوگا۔ ایمان تو یہ ہوتا ہے کہ من وجہٍ مجوب ہو اور من وجہٍ منکشف۔ اگر ایمان کی حد سے بڑھ کر ہوتا تو پھر ثواب ہی نہ ملتا۔ ثواب کا وعدہ اسی صورت میں ہے کہ عقلمند آدمی عقلِ صحیح سے کام لے کر قرائن قویہ کو پاکر سمجھ لیتا ہے کہ یہ حق ہے۔ لیکن اگر اس طریق کو چھوڑتا ہے تو وہ پھر کسی ثواب کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ایسا ہی حجاب اُٹھ جاوے کہ آفتاب کی طرح ایک شئے روشن ہو جاوے تو کون احمق ہوگا۔ جو کہے کہ اب آفتاب نہیں اور دن چڑھا ہوا نہیں ہے۔ اگر ایسا انکشاف ہو تو پھر کافر اور مومن میں کیا فرق ہوا؟ مومن تو کہتے ہی اس کو ہیں جو من وجہٍ مجوب پر ایمان لے آتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اسی بات پر صدیق کہلائے۔

پس قانونِ قدرت یہی ہے جو شخص جلد بازی کرتا ہے اور صبر اور استقلال کے ساتھ کوشش نہیں کرتا اور حُسنِ ظن سے کام نہیں لیتا وہ ہمارا کیا بگاڑے گا اپنی ہی شقاوت کا نشانہ ہوگا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ ایک بیمار کسی طبیب کے پاس آوے اور طبیب اس کی مرض کی تشخیص کر کے کہے کہ تجھے دو مہینے تک میرے پاس رہ کر علاج کرنا پڑے گا مگر وہ کہے کہ نہیں دو مہینے تک تو میں رہ نہیں سکتا۔ تم ابھی کوئی قطرہ ایسا دو کہ یہ ساری مرض جاتی رہے۔ ایسا جلد باز مریض کیا خاک فائدہ اُٹھائے گا وہ تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اس کیلئے

قانونِ قدرت تو بدل نہیں جائے گا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (الفتح : ۲۴) پس یہ بڑی بدبختی ہے کہ دنیا کے کاموں میں عقل سے کام لیتا ہے لیکن دین کے کاموں میں عقل کو بیکار اور معطل کر دیتا ہے۔ یہ خطرناک مرض ہے اس کا علاج یہی ہے کہ کثرت سے استغفار کرتا رہے۔ نیک صُحبت میں رہے اور دُعاؤں میں لگا رہے۔ اگر یہ نہیں کرتا تو وہ ہلاک ہو جاوے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا لیکن جو صدق دل اور نیک نیتی کے ساتھ خدا کی طرف قدم اُٹھاتا ہے اور اس راہ میں تھکتا اور گھبراتا نہیں۔ دُعاؤں میں لگا رہتا ہے اُمید ہے کہ وہ ایک دن گوہر مقصود کو پا لے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ صفحہ ۲-۳ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۴ء)

اپریل کے آخری ایام

مامور اور نشان نمائی

[سنّت اللہ سے ناواقف ہونا بھی ایک موت ہے کیونکہ اس جہالت کی وجہ سے بعض اوقات انسان خدا تعالیٰ کے ماموروں برگزیدوں کے سامنے ایسی جرأت اور شوخی کر بیٹھتا ہے جو اسے قبولِ حق سے محروم کر دیتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دستگیری نہ کرے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور بعض اوقات ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ اواخر اپریل میں ایک نومسلم یہاں آیا اور اس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور بڑی دلیری سے نشان بینی کی درخواست کی جس پر حضرت اقدس نے فرمایا:]

ہر ایک مامور کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ڈالا جاتا ہے وہ اس کی مخالفت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہی بالکل سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو دنیا میں مامور کر کے بھیجتا ہے تو اس کی تائید میں خارق عادت نشان بھی ظاہر کرتا ہے چنانچہ اس جگہ بھی اس نے میری تائید کے لیے بہت سے نشان ظاہر کئے ہیں جن کو لاکھوں انسانوں نے دیکھا ہے اور وہ اس پر گواہ ہیں۔ تاہم میں اپنے خدا پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ اس نے انہیں نشانوں پر حصر نہیں کیا اور آئندہ اس سلسلہ کو بند نہیں کیا وقتاً فوقتاً وہ اپنے ارادہ سے جب چاہتا ہے نشان ظاہر کرتا ہے۔ ایک طالبِ حق کے لیے وہ نشان تھوڑے نہیں ہیں مگر اس پر بھی اگر دل شہادت نہ دے کہ ایک شخص واقعی طالبِ حق ہے اور صدقِ نیت سے وہ نشان کا خواہشمند ہے تو ہم اس کے لیے توجہ کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں کہ کوئی امر ظاہر کر دے لیکن اگر یہ بات نہ ہو اور خدا تعالیٰ

کے پہلے نشانوں کی بے قدری کی جاوے اور انہیں ناکافی سمجھا جاوے تو توجہ کے لیے جوش پیدا نہیں ہوتا اور ظہورِ نشان کے لیے ضروری ہے کہ اس میں توجہ کی جاوے اور اقبال الی اللہ کے لیے جوش ڈالا جاوے اور یہ تحریک اس وقت ہوتی ہے جب ایک صادق اور مخلص طلبگار ہو۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ نشان عقلمندوں کے لیے ہوتے ہیں ان لوگوں کے واسطے نشان نہیں ہوتے جو عقل سے کوئی حصّہ نہیں رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نشانات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ہدایت محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہو اور وہ فضل نہ کرے تو خواہ کوئی ہزاروں ہزار نشان دیکھے اُن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ پس جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ نشانات گذشتہ سے اُس نے کیا فائدہ اُٹھایا ہے ہم آئندہ کے لیے کیا اُمید رکھیں۔

نشانات کا ظاہر ہونا یہ ہمارے اختیار میں تو نہیں ہے اور نشانات کوئی شعبدہ باز کی چابکدستی کا نتیجہ تو نہیں ہوتے یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور مرضی پر موقوف ہے وہ جب چاہتا ہے نشان ظاہر کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے۔

اس وقت جو سوال نشان نمائی کا کیا جاتا ہے اس کے متعلق میرے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہی ڈالا ہے کہ یہ اقتراح اسی قسم کا ہے جیسا ابوجہل اور اس کے امثال کیا کرتے تھے انہوں نے کیا فائدہ اُٹھایا؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نشان صادر نہیں ہوئے تھے۔ اگر کوئی ایسا اعتقاد کرے تو وہ کافر ہے۔ آپ کے ہاتھ پر لاانتہا نشان ظاہر ہوئے مگر ابوجہل وغیرہ نے ان سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا۔ اسی طرح پر یہاں نشان ظاہر ہو رہے ہیں جو طالبِ حق کے لیے ہر طرح کافی ہیں۔ لیکن اگر کوئی فائدہ نہ اُٹھانا چاہے اور ان کو ردّی میں ڈالا جائے اور آئندہ خواہش کرے اس سے کیا امید ہو سکتی ہے؛ وہ خدا تعالیٰ کے نشانات کی بے حرمتی کرتا ہے اور خود اللہ تعالیٰ سے ہنسی کرتا ہے۔

طریقِ ادب

طریقِ ادب تو یہ ہے کہ پہلے کتابوں کو دیکھا جاتا اور دیانتداری اور خدا ترسی سے ان میں غور کیا جاتا۔ وہ نشانات جو ان میں درج کئے گئے ہیں ان پر فکر کی جاتی اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سلیم دل لے کر میری کتابوں کو پڑھے گا اور ان نشانوں پر غور کرے گا۔ تو اس کا دل بول اُٹھے گا کہ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ ایسے جلیل القدر نشان دکھا سکے لیکن ان کتابوں کو دیکھا نہیں جاتا اور تقویٰ سے کام نہیں لیا جاتا۔ پھر شوخی سے کہا جاتا ہے کہ نشان دکھاؤ۔ اگر یہ ضروری ہوتا کہ ہر شخص کے لیے ایک جدا نشان ہو اور پھر ایک لمبا اور لاانتہا سلسلہ شروع ہو جاوے۔ ہر ایک شخص آ کر کہے کہ پہلا نشان میرے لیے کافی نہیں ہے مجھے کوئی اَور نشان دکھایا جاوے جو اس قسم کی جرأت کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کو آزماتا

ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کیلئے ہدایت بھی نہیں ہے کیونکہ اس سے صریح بُو آتی ہے کہ خدا کے پہلے نشانوں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

نشانوں کی ایک حد ہوتی ہے اور ان کی شناخت کے لیے ایک قوت شامہ دی جاتی ہے جو وہ قوت نہیں رکھتا ہے جس سے اس کو پہچانے اس کے سامنے خواہ کتنے ہی نشان ظاہر ہوں وہ کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ اسلام کی سچائی پر یُوں تو ہر زمانہ میں لاکھوں تازہ بتازہ نشان ہوتے ہیں مگر کیا یہ نشان بجائے خود کم ہے کہ جس توحید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس شرک و بدعت کو آپ نے دُور کیا ہے دنیا میں کبھی کسی مذہب نے نہیں کیا۔ ایک عقلمند کے لیے تو یہ نشان ایسا عظیم الشان ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی لیکن ایک غبی اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

مفتری مہلت نہیں پاسکتا

ایک ولی اللہ ذات کے قصاب تھے ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ مَیں تب مانتا ہوں اگر آپ کوئی نشان دکھائیں۔ انہوں نے اس کو کیا عمدہ جواب دیا ہے کہ باوجودیکہ تیرا خیال ہے کہ ہم ایسے ہیں اور پھر باوصف ایسے گنہگار ہونے کے تُو دیکھتا ہے کہ ہم ابتک غرق نہیں ہوگئے۔ اسی طرح پر ہم بھی کہتے ہیں کہ کیا یہ نشان ہمارا کم ہے کہ ہم کو مفتری کہا جاتا ہے لیکن پچیس سال سے بھی زیادہ سے یہ سلسلہ چلا آتا ہے اور دن بہ دن اس کی ترقی ہو رہی ہے اور ہم غرق نہیں ہوگئے۔ دانشمند اگر خدا ترس دل لے کر سوچے تو اس کے لیے یہ بھی کوئی چھوٹا سا نشان نہیں ہے۔

جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ بہت سے مفتری بچ گئے ہیں یہ محض افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں خلاف نہیں ہوسکتا۔ کبھی کوئی مفتری مہلت نہیں پاسکتا ورنہ پھر خدا تعالیٰ کے راستبازوں اور مفتریوں میں فرق کرنا مشکل ہوجائیگا۔ خدا تعالیٰ کی سلطنت میں اندھیر نہیں ہے۔ اس دنیا کی سلطنت میں اگر کوئی شخص مصنوعی چپڑاسی بھی بن جاوے تو فی الفور پکڑا جاتا اور اسے عبرتناک سزا دی جاتی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت میں ایسا اندھیر ہو کہ کوئی شخص خدا کا مامور ہونے کا مدعی ہو اور جھوٹے الہام خود ہی بنا کر خلق اللہ کو گمراہ کرے اور اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہ کرے بلکہ اس کی تائید میں نشان بھی ظاہر کردے اور اس کی پیشگوئیوں کو بھی پورا کرکے دکھاوے۔ کیا یہ حیرت انگیز اور تعجب کی جگہ نہیں ہوسکتا۔ خدا تعالیٰ کبھی کسی مفتری کو مہلت نہیں دیتا۔ پس اس اصول پر ہمارا اب تک قائم رہنا اور اس سلسلہ کا نشوونما پانا اور دن بدن ترقی کرنا بھی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی خدا ترسی سے اس پر غور کرے تو اس کے لیے کم نشان نہیں ہے مگر جس شخص کو ہزاروں دوسرے نشان فائدہ نہیں پہنچا سکے اور اُن سے اُس نے کوئی سبق نہیں سیکھا آئندہ اس سے کیا اُمید ہوسکتی ہے؟

عیسائیت کا مستقبل

فرمایا۔ عیسائی مذہب کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہے۔ عیسائی مذہب اپنی جگہ آدم زاد کی خدائی منوانی چاہتا ہے اور ہمارے نزدیک وہ اصل اور حقیقی خدا سے دُور پڑے ہوئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان عقائد کی (جو حقیقی خدا پرستی سے دور پھینک کر مُردہ پرستی کی طرف لیجاتے ہیں) کافی تردید ہو اور دُنیا آگاہ ہوجاوے کہ وہ مذہب جو انسان کو خدا بناتا ہے خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتا اور بظاہر اسباب عیسائی مذہب کی اشاعت اور ترقی کے جو اسباب ہیں وہ انسان پرست انسان کو کبھی یقین نہیں دلاتے کہ اس مذہب کا استیصال ہوجاویگا لیکن ہم اپنے خدا پر یقین رکھتے ہیں کہ اس نے ہم کو اس کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے اور یہ میرے ہاتھ پر مقدر ہے کہ میں دنیا کو اس عقیدہ سے رہائی دوں۔ پس ہمارا فیصلہ کرنے والا یہی امر ہوگا۔ یہ باتیں لوگوں کی نظر میں عجیب ہیں مگر میں یقین رکھتا ہوں کہ میرا خدا قادر ہے۔

میں اصل میں دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ مامور کے آنے کا کیا مدعا ہوتا ہے اور میں اس امر کو بھی خوب جانتا ہوں کہ اس کا دعویٰ بناوٹ اور تکلف سے نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے دنیا اپنی جگہ پر سمجھتی ہے کہ شائد یہ اپنی شہرت کے لیے کرتا اور کہتا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ دنیا کی تعریف اور شہرت سے بالکل مستغنی ہوتا ہے وہ مجبور کیا جاتا ہے کہ باہر دنیا میں نکلے ورنہ اگر یہ سوزش اور گدازش جو اسے مامور کرکے خلق اللہ کی بہتری اور بہبودی کی لگادی جاتی ہے اُسے نہ لگائی جاتی۔ تو وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تنہائی میں اپنی زندگی بسر کرے اور کوئی اس کو نہ جانے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی ایسے انسان کو منتخب کرتا ہے جو اس کے منشاء کے موافق کام کرسکتا ہے تو وہ اسے حجرہ سے باہر لاتا ہے اور پھر اس کو عظیم الشان استقلال اور ثباتِ قدم عنایت کرتا ہے۔ دنیا اور اس کی مخالفتوں کی اُسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ ہر ایک قسم کی تکالیف اور مصائب میں بھی قدم آگے بڑھاتا اور اپنے مقصد کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ میں اپنے دل کو دیکھتا ہوں کہ بالطبع وہ شہرت اور باہر آنے سے متنفر تھا۔ لیکن میں کیا کروں خدا تعالیٰ نے مجھے اپنی خدمت کے لیے چُن لیا اور باہر نکال دیا۔ اب خواہ کوئی کچھ بھی کہے میں اس کی پروا نہیں کرسکتا اور میں کسی کی تعریف یا مذمت کی پروا کروں تو اس کے یہی معنے ہیں کہ میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اَور کو بھی اپنے پہلو میں رکھتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ جس کام کے لیے اس نے مقرر کیا ہے اس کے حسب حال جوش اور سوزش بھی میرے سینہ میں پیدا کردی ہے میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس ظلم صریح کو دیکھ کر جو ایک عاجز انسان کو خدا بنایا گیا ہے میرے دل میں کس قدر درد اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ ہزاروں ہزار انسان ہیں جو اپنے اہل وعیال اور دوسری حاجتوں کیلئے دعائیں کرتے اور تڑپتے ہیں مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میرے لیے اگر کوئی غم ہے تو یہی ہے کہ نوعِ انسان کو اس

ظلم صریح سے بچاؤں کہ وہ ایک عاجز انسان کو خدا بنانے میں مبتلا ہو رہی ہے اور اس سچے اور حقیقی خدا کے سامنے ان کو پہنچاؤں جو قادر اور مقتدر خدا ہے۔

میری فطرت میں کسی اَور امر کے لیے کوئی اور میلان ہی نہیں رکھا گیا اور نہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اَور کسی چیز کی حاجت میرے لیے رہنے دی ہے اس لیے میری بڑی دُعا اور آرزو یہی ہے کہ میں اس باطل کا استیصال دیکھ لوں جو خدا تعالیٰ کی مسند پر ایک عاجز انسان کو بٹھایا جاتا ہے اور حق ظاہر ہو جاوے۔ میں اس جوش اور درد کو جو مجھے اس حق کے اظہار کے لیے دیا گیا ہے بیان کرنے کے واسطے الفاظ نہیں پاتا۔ اگر یہ بھی مان لیا جاوے کہ کوئی اَور مسیح بھی آسمان سے اُترنے والا ہے تو بھی مَیں اپنے دل پر نظر کرکے کہہ سکتا ہوں کہ جو گدازش اور جوش مجھے اس مذہب کے لیے دیا گیا ہے کبھی کسی کو نہیں دیا گیا۔

مجھے بشارت دی گئی ہے کہ یہ عظیم الشان بوجھ جو میرے دل پر ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہلکا کر دے گا اور ایک حی و قیوم خدا کی پرستش ہونے لگے گی۔ وہ خدا جو ہماری ہزاروں دعائیں قبول کرتا ہے کبھی ہو سکتا ہے کہ وہ دُعائیں جو اس کے جلال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی کے اظہار کے لیے ہم کرتے ہیں قبول نہ کرے؟ نہیں وہ قبول کرتا ہے اور کریگا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جس قدر عظیم الشان مرحلہ اور مقصد ہو اسی قدر وہ دیر سے حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ عظیم الشان کام ہے اس لیے اس کے حسبِ منشا ہونے میں ایک وقت اور مہلت مطلوب ہے لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ اب وہ وقت قریب آ رہا ہے اور اس کی خوشبودار ہوائیں آ رہی ہیں اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری ان دُعاؤں کو جو مَیں ایک عرصہ دراز سے کر رہا ہوں قبول کر لیا ہے۔

جس قدر دل بیساختہ ان ہموم و غموم میں مبتلا ہوں۔ اسی قدر اضطراب پیدا ہو تو یاد رکھنا چاہیئے کہ قبولیت کی تیاری آسمان پر ہوتی ہے کیونکہ جب تک قبولیت کی تیاری آسمان پر نہ ہو وہ خشوع خضوع اور درد و جوش جو حقیقی اضطراب کو پیدا کرتا ہے پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس وقت جو مَیں اس اضطراب اور کرب و قلق کو دل میں پاتا ہوں مجھے کامل یقین ہوتا ہے کہ مصنوعی خدا کے خاتمہ کا وقت آ گیا ہے۔

اس وقت ان باتوں پر ایمان لانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے مگر ایک وقت آتا ہے کہ لوگ ان باتوں کو دیکھ لیں گے۔ مَیں اپنے قادر خدا پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ جس بات کے لیے اُس نے میرے دل میں یہ جوش اور اضطراب ڈالا ہے وہ اس کو ضائع نہیں کرے گا اور زیادہ دیر تک دنیا کو تاریکی میں نہیں رہنے دے گا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان نہیں لاتے یا نہیں لانے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بے شک انہونی باتیں ہیں مگر جو شخص اس کی عجیب در عجیب قدرتوں اور طاقتوں کے تماشے دیکھ چکا ہو اور جس کی اپنی ذات پر ہزارہا نشان صادر ہو چکے ہوں۔ ہاں جس نے خود اس کی آوازیں سُنی ہوں وہ کیونکر کہہ

سکتا ہے کہ یہ مشکل ہے یا یہ انہونی ہے۔ کبھی نہیں۔ وہ پکار کر انکار کرنے والے کو کہتا ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (البقرۃ : ۱۰۷)

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ مشکل ہے کہ مصنوعی خدا پر موت آوے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا نہیں۔ وہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖۤ (الانعام : ۹۲) کے پورے مصداق ہیں۔ دنیا میں اگر کوئی ابتلا پیدا ہوتا ہے تو اس کے مصالح اور اسباب کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وقت دنیا بہت تاریکی میں پھنسی ہوئی ہے اور اس کو مُردہ پرستی نے ہلاک کر ڈالا ہے، لیکن اب خدا نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کو اس ہلاکت سے نجات دے اور اس تاریکی سے اس کو روشنی میں لاوے یہ کام بہتوں کی نظروں میں عجیب ہے مگر جو یقین رکھتے ہیں کہ خدا قادر ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ خدا جس نے ایک کُن کے کہنے سے سب کچھ کر دیا کیا۔ قادر نہیں کہ اپنے قدیم ارادہ کے موافق ایسے اسباب پیدا کرے جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو دنیا تسلیم کر لے۔

سلسلہ کی مخالفت اور نشان نمائی کے مطالبات

مجھے ان لوگوں پر سخت تعجب اور افسوس آتا ہے جو عالم کہلاتے ہیں، مولوی اور صوفی بنتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ ہر طرف سے اس پر حملے ہو رہے ہیں اور اسلام ایک سخت ضعف اور کمزوری کی حالت میں ہے اس وقت چاہیئے تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو مدنظر رکھ کر اس وقت وہ خود منتظر ہوتے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت اسلام کی حمایت اور نصرت کے لیے کیا سامان کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی نصرت کا استقبال کرتے مگر افسوس ہے کہ وہ عیسائیوں کے حملوں کو دیکھتے ہیں جو وہ اسلام پر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی عام حالت کو دیکھتے ہیں لیکن آسمان سے کسی مدد کے نزول کے لیے ان کے دل نہیں پگھلتے۔ وہ انتظار کی بجائے خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ پر ہنسی کرتے اور ٹھٹھے مارتے ہیں اور اس کو تباہ کرنے کے منصوبے سوچتے ہیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ ان منصوبوں سے خدا تعالیٰ کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے؟ خدا تعالیٰ نے خود جس کام کا ارادہ فرمایا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ ان کی اس منصوبہ بازی اور خطرناک مخالفت کو دیکھ کر مجھے بھی ان پر رحم آتا ہے کہ ان کی حالت ایسی نازک ہو گئی ہے کہ یہ اپنی بیماری اور کمزوری کو بھی محسوس نہیں کر سکتے ورنہ بات کیا تھی؟ خدا تعالیٰ نے ہر طرح کے سامان ان کے سمجھنے اور سوچنے کے لیے مہیا کر دیئے تھے۔ وقت پکار پکار کر مصلح کی ضرورت بتاتا ہے اور پھر جس قدر نشان اور آیات صحائف انبیاء اور قرآن شریف اور احادیث کی رو سے اس وقت کے لیے مقرر تھے وہ ظاہر ہو چکے۔ نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ برابر تائید کرتے ہیں، عقل شہادت دیتی ہے اور آسمانی نشان بجائے خود مؤید ہیں مگر یہ عجیب لوگ ہیں کہ نشان دیکھتے ہیں اور منہ پھیر کر کہہ دیتے ہیں کہ کوئی نشان دکھاؤ۔ مَیں ایسے لوگوں کو کیا کہوں بجز اس کے کہ تم خدا تعالیٰ کے فعل کو حقارت

اور تعجب کی نظر سے دیکھتے ہو جو نشان پہلے اُس نے ظاہر کئے ہیں کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے نہیں ہیں۔ کیا وہ نشان انسانی طاقت کے اندر ہیں اور کوئی اُن کا مقابلہ کر سکتا ہے کیا منہاجِ نبوت پر وہ نشان ایک شخص کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہیں۔ جو نئے نشان مانگے جاتے ہیں خدا سے ڈرو اور اس سے مقابلہ نہ کرو۔ یہ تو ظلم صریح ہے کہ اسکی آیات کی ایسی بیقدری کرو کہ ان کو تسلیم ہی نہ کرو۔ پہلے یہ فیصلہ کرو کہ آیا خدا تعالیٰ نے کوئی نشان دکھایا ہے یا نہیں۔ اگر دکھایا ہے اسی طرح پر جو وہ انبیاء کے وقتوں میں دکھاتا آیا ہے تو سعادت مندین کر اُسے قبول کرو اور اس نعمت کی قدر کرو۔ اگر کوئی نشان نہیں دکھایا گیا ہے تو مانگو بیشک مانگو میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ قادر خدا نشان پر نشان دکھائے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس نے ہزاروں نشان ظاہر کئے مگر ان لوگوں نے ان کو استہزاء کی نظر سے دیکھا اور کافرِ نعمت ہو کر ٹال دیا اور پھر کہتے ہیں کہ اَور دکھاؤ۔ یہ اقتراح مناسب نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کامل طور پر اتمامِ حجت کرتا ہے اور اب طاعون کے ذریعہ کر رہا ہے کیونکہ جن لوگوں نے رحمت کے نشانوں سے فائدہ نہیں اُٹھایا وہ اب غضب کے نشانوں کو دیکھ لیں۔

مَیں بڑی صفائی سے کہہ رہا ہوں کہ تم نے جو اسلام کو قبول کیا ہے کونسا معجزہ اس کا دیکھا تھا۔ جسقدر معجزات اسلام کے تم بیان کرو گے وہ سماعی ہوں گے تمہارے چشمدید نہیں لیکن یہاں تو وہ باتیں موجود ہیں جن کے دیکھنے والے ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں انسان ہیں۔ جو ابھی زندہ موجود ہیں۔ دو گواہوں سے ایک شخص پھانسی پا سکتا ہے، لیکن تعجب کی بات ہے کہ یہاں لاکھوں انسان موجود ہیں جو ان نشانوں کے گواہ ہیں اور انکی شہادت کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر ظلم اور حق کا خون کیا ہوگا۔ اگر خدا ترسی اور حق پسندی غرض ہے اور جس مطلب کے لیے ہندو مذہب کو چھوڑ کر[1] اسلام قبول کیا ہے تو ایسے اقتراحوں سے کیا حاصل؟ یہ سعادتمندی کی راہ نہیں۔ یہ تو ہلاکت کی راہ ہے کیونکہ جو اس قدر نشانات کے ہوتے ہوئے بھی پھر کہتا ہے کہ مجھے نشان دکھاؤ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافر ہی مرے گا۔

ہماری موت کے بعد اگر کوئی کہتا تو البتہ اُسے معذور سمجھ لیتے کہ اس کے سامنے جو نشانات ہیں وہ منقول ہیں اور ان پر صدیاں گذر گئی ہیں مگر اس وقت تو ہم زندہ موجود ہیں۔ اور ان نشانات کو دیکھنے والے بھی زندہ موجود ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ نشان دکھاؤ۔ ایسی ہی حالت ہوگی جب حضرت مسیح کو کہنا پڑا ہوگا کہ اس زمانہ کے حرامکار مجھ سے نشان مانگتے ہیں۔ حقیقت میں انسان جب دیکھتا ہوا نہیں دیکھتا اور سنتا ہوا نہیں سُنتا تو اس کی حالت بہت خطرناک ہوتی ہے۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ جب تم اس وقت اس قدر آیات اللہ کے

---

[1] سائل نومسلم تھا۔ (مرتب)

ہوتے ہوئے بھی انکار کرتے ہو اور جدید نشان کے طلبگار ہو تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے ماننے کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اسے ذرا بیان تو کرنا چاہیئے یا اگر ان کو صرف حُسنِ ظن کے طور پر سُن کر مان لیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت ان تازہ آیات کا انکار کیا جاتا ہے؟ اور ان میں شک کیا جاتا ہے۔ کیوں ان کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہاں بیشک یہ دیکھ لو کہ آیا وہ بشری طاقتوں کے اندر ہیں یا ان سے بڑھ کر ہیں اور منہاجِ نبوت پر ہیں یا نہیں۔[1]

رؤیت کا انکار کرنا کتنا بڑا ظلم ہے۔ ہزاروں ہزار نشان خدا تعالیٰ نے اپنے بندہ کی تصدیق کے لیے ظاہر کئے اور ان کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اُن کو ردّ کر دیا جاتا ہے اور جدید نشانوں کی خواہش کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ اَور نشانات دکھلا دے لیکن سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ ایسے اقتراح کرنے والے اور اپنے ایمان کو مشروط کرنے والے ٹھوکر کھا جاتے ہیں پچھلے نشانوں کو ترک کر کے آئندہ کے لیے سوال کرنا آیات اللہ کی بے حرمتی اور خدا تعالیٰ کے حضور سُوءِ ادبی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراھیم: ۸) اگر تم میری نعمت کا شکر کرو گے تو مَیں اُسے بڑھاؤں گا اور پھر فرمایا وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراھیم: ۸) اور اگر انکار اور کفر کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔ اب بتاؤ کہ ان آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور ان کو چھوڑ کر جدید کی طلب اور اقتراح یہ عذاب الٰہی کو مانگنا ہے یا کیا؟

سلسلہ کی تائید میں عظیم نشانات کا ظہور

دیکھو مَیں سچ کہتا ہوں کہ تم خدا تعالیٰ کی آیات کی بے ادبی مت کرو اور انہیں حقیر نہ سمجھو کہ یہ محرومی کے نشان ہیں اور خدا تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ لیکھرام خدا تعالیٰ کے عظیم الشان نشان کے موافق مارا گیا۔ کروڑوں آدمی اس پیشگوئی کے گواہ ہیں۔ خود لیکھرام نے اسے شہرت دی وہ جہاں جاتا اُسے بیان کرتا۔ یہ نشان اسلام کی سچائی کے لیے اُس نے خود مانگا تھا اور اس کو سچے اور جھوٹے مذہب کے لیے بطور معیار قائم کیا تھا۔ آخر وہ خود اسلام کی سچائی اور میری سچائی پر اپنے خون سے شہادت دینے والا ٹھہرا۔ اس نشان کو جھٹلانا اور اس کی پروا نہ کرنا۔ یہ کسقدر بے انصافی اور ظلم ہے۔ پھر ایسے کھلے کھلے نشان کا انکار کرنا تو خود لیکھرام بننا ہے اَور کیا۔

مجھے بہت ہی افسوس ہوتا ہے کہ جس حال میں خدا تعالیٰ نے ایسا فضل کیا ہے کہ اس نے ہر قوم کے متعلق

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۶ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۴ء۔ نیز البدر جلد ۳ نمبر ۲۰-۲۱ صفحہ ۶ تا ۸ مورخہ ۲۴ مئی و یکم جون ۱۹۰۴ء

نشانات دکھائے۔ جلالی اور جمالی ہر قسم کے نشان دیئے گئے۔ پھر اُن کو ردی کی طرح پھینک دینا یہ تو بڑی ہی بدبختی اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا مورد بننا ہے جو آیات اللہ کی پروا نہیں کرتا۔ وہ یاد رکھے اللہ تعالیٰ بھی اس کی پروا نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو نشان ظاہر ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک عقلمند خدا ترس ان کو شناخت کر لیتا ہے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن جو فراست نہیں رکھتا اور خدا کے خوف کو مدِ نظر رکھ کر اس پر غور نہیں کرتا وہ محروم رہ جاتا ہے کیونکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ دُنیا دُنیا ہی نہ رہے اور ایمان کی وہ کیفیت جو ایمان کے اندر موجود ہے نہ رہے۔ ایسا خدا تعالیٰ کبھی نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہودیوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ حضرت مسیح کا انکار کرتے۔ موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیوں ہوتا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر تکالیف کیوں برداشت کرنی پڑیں۔ خدا تعالیٰ کی یہ عادت ہی نہیں کہ وہ ایسے نشان ظاہر کرے جو ایمان بالغیب ہی اُٹھ جاوے۔ ایک جاہل وحشی سنت اللہ سے ناواقف تو اس چیز کو معجزہ اور نشان کہتا ہے جو ایمان بالغیب کی حد سے نکل جاوے مگر خدا تعالیٰ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ ہماری جماعت کے لیے اللہ تعالےٰ اللہ تعالیٰ نے کمی نہیں کی۔ کوئی شخص کسی کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہوسکتا۔ جس قدر لوگ اس سلسلہ میں داخل ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں جو یہ کہہ سکے کہ مَیں نے کوئی نشان نہیں دیکھا۔

براہینِ احمدیہ کو پڑھو اور اس پر غور کرو۔ اس زمانہ کی ساری خبریں اس میں موجود ہیں۔ دوستوں کے متعلق بھی ہیں اور دشمنوں کے متعلق بھی۔ اب کیا یہ انسانی طاقت کے اندر ہے کہ تیس برس پہلے جب ایک سلسلہ کا نام ونشان بھی نہیں اور خود اپنی زندگی کا بھی پتہ نہیں ہوسکتا کہ مَیں اس قدر عرصہ تک رہوں گا یا نہیں۔ ایسی عظیم الشان خبریں دے اور پھر وہ پوری ہو جائیں نہ ایک نہ دو بلکہ ساری کی ساری براہین احمدیہ احمدی لوگوں کے گھروں میں بھی ہے عیسائیوں اور آریوں اور گورنمنٹ تک کے پاس موجود ہے اور اگر خدا کا خوف اور سچ کی تلاش ہے تو مَیں کہتا ہوں کہ براہین کے نشانات پر ہی فیصلہ کرلو۔ دیکھو اس وقت جب کوئی مجھے نہیں جانتا تھا اور کوئی یہاں آتا بھی نہیں تھا۔ ایک آدمی بھی میرے ساتھ نہ تھا اس جماعت کی جو یہاں موجود ہے خبر دی۔ اگر یہ پیشگوئی خیالی اور فرضی تھی تو پھر آج یہاں اتنی بڑی جماعت کیوں ہے؟ اور جس شخص کو قادیان سے باہر ایک بھی نہیں جانتا تھا اور جس کے متعلق براہین میں کہا گیا تھا حَانَ اَنْ تُعَانَ وَ تُعْرَفَ بَیْنَ النَّاسِ۔ آج کیا وجہ ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عرب، شام، مصر سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک دنیا اس کو شناخت کرتی ہے۔ اگر یہ خدا کا کلام نہیں تھا اور خدا کے منشاء کے خلاف ایک مفتری کا منصوبہ تھا تو خدا نے اس کی مدد کیوں کی؟ کیوں اس کے لیے ایسے سامان اور اسباب پیدا کر دیئے؟ کیا یہ سب مَیں نے خود بنا لیے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر کسی مفتری کی تائید کیا کرتا ہے تو پھر راستبازوں کی سچائی کا معیار کیا ہے۔ تم خود ہی اس کا جواب دو۔

سورج اور چاند کو رمضان میں گرہن لگنا گیا یہ میری اپنی طاقت میں تھا کہ مَیں اپنے وقت میں کر لیتا اور جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سچے مہدی کا نشان قرار دیا تھا اور خدا تعالیٰ نے اس نشان کو میرے دعویٰ کے وقت پورا کر دیا۔ اگر مَیں اس کی طرف سے نہیں تھا تو کیا خدا تعالیٰ نے خود دُنیا کو گمراہ کیا؟ اس کا سوچکر جواب دینا چاہیئے کہ میرے انکار کا اثر کہاں تک پڑتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور پھر خدا تعالیٰ کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اسی طرح پر اس قدر نشانات ہیں کہ اُن کی تعداد دو چار نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں تک ہے تم کس کس کا انکار کرتے جاؤ گے؟

اسی براہین میں یہ بھی لکھا ہے یَأْتُوْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ اب تم خود آئے ہو۔ تم نے ایک نشان پورا کیا ہے۔ اس کا بھی انکار کرو۔ اگر اس نشان کو جو تم نے اپنے آنے سے پورا کیا ہے مٹا سکتے ہو تو مٹاؤ۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ دیکھو آیات اللہ کی تکذیب اچھی نہیں ہوتی اس سے خدا تعالےٰ کا غضب بھڑکتا ہے میرے دل میں جو کچھ تھا مَیں نے کہہ دیا ہے۔ اب ماننا نہ ماننا تمہارا اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ مَیں صادق ہوں اور اسی کی طرف سے آیا ہوں [1]

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۴ء

اِنڈیکس

مرتّبہ: سیّد عبدالحی

کلیدِ مضامین

ملفوظات

جلد ۳

تاریخی واقعات

تفسیر

آیاتِ قرآنیہ
ترتیب بلحاظ سورۃ

اسماء

اپنی صداقت پر یقین کامل

سیرت و شمائل

مقامات

م

ن

ہ

ی